تاریخِ اسلام

دولتِ اُمویہ اُندلس

حکیم محمود احمد ظفر

نشریات

دولتِ اُمویّہ اُندلس

دولتِ اُمویّہ اُندلس

حکیم محمود احمد ظفر

نشریات
الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون: 0321-4589419

۲۰۱۷ء

نام کتاب: .... دولت امویہ اندلس

مصنف: .... حکیم محمود احمد ظفر

اہتمام: .... نشریات

کمپوزنگ: .... دعا گرافکس

مطبع: .... عمیر عثمان شفیق، پریس

صفحات: ۵۶۸

جلد ساز: .... بنیامین

ترتیب

پیش آہنگ

تاریخ اسلام کی یہ جلد جو آپ کے ہاتھ میں ہے، چوتھی جلد ہے۔ پہلی جلد جناب رسول اللہ ﷺ سے لے کر سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی خلافت تک ہے جب کہ دوسری جلد حکومت سُفیانیہ پر مشتمل ہے۔ اس میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ، یزید بن معاویہ اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور سیدنا مروان بن الحکم رضی اللہ عنہ کے ادوار حکومت پر بحث کی گئی ہے۔ تیسری جلد دولت مروانیہ کے تمام خلفاء کے ادوار حکومت کا احاطہ کیے ہوئے اور یہ چوتھی جلد بنو امیہ کے ان خلفاء پر مشتمل ہے جنھوں نے اندلس پر حکومت کی، اور اتنے اچھے طریقے سے حکومت کی کہ آج بھی ان کی یادگاریں ان کی عظمت وسطوت کا پتہ دیتی ہیں۔ بلکہ یورپ کی ساری علمی ترقی اندلس کے ان مسلمان خلفاء کی وجہ سے ہے جیسا کہ کتاب میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

اندلس جس کو آج کل اسپین کہتے ہیں یورپ کے جنوب مغربی کونے پر واقع ہے۔ یہاں کے انسانی تمدن کی تاریخ قریباً بیس ہزار سال پرانی ہے، اور دو ہزار سال قبل مسیح کے آثار سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں زراعت بہت قدیم زمانے سے موجود تھی۔

پہلی صدی ہجری کے آخر میں اموی فوجیں مشہور سپہ سالار موسیٰ بن نصیر کی قیادت میں شمالی افریقہ کے بہت سے علاقوں پر قابض ہو گئیں۔ اگرچہ شمالی افریقہ میں قرطاجنہ کے سقوط کے بعد رومی سلطنت کی طاقت کا بھرم ٹوٹ چکا تھا تاہم شمالی افریقہ کا ساحلی شہر سبتہ بدستور رومی سلطنت کا حصہ تھا۔ اندلس میں اس زمانے میں رزریق کی حکومت تھی لیکن وہ اپنے مظالم اور وعدہ خلافیوں کے باعث اندلس میں بالکل غیر مقبول ہو چکا تھا۔ اس کے آئے روز کے مظالم سے تنگ آ کر اندلس کے بہت سے باشندے نقل مکانی کر کے سبتہ اور افریقہ کے ساحلی شہروں میں اکٹھے ہو رہے تھے۔ جولین جو سبتہ کا حاکم تھا اس کو بھی رزریق کے خلاف بہت شکایات تھیں۔ چنانچہ سنہ ۷۱۰ء میں جب موسیٰ بن نصیر کا ایک جرنیل طریف اس راستے سے اندلس کی طرف بڑھا تو جولین نے نہ صرف مسلمانوں کو خوش آمدید کہا بلکہ ان کی کافی حد تک مدد بھی کی۔

ایک سال کے بعد دوسرا جرنیل طارق بن زیاد سنہ ۷۱۱ء میں سمندر عبور کر کے ایک ساحلی پہاڑی پر اترا جس کا نام بعد میں ''جبل الطارق'' پڑ گیا اور آج کل اسے جبرالٹر کہتے ہیں۔ یہیں سے اس نے اندلس پر اپنے

حملوں کا آغاز کیا اور ۱۹ ؍جولائی سنہ ۷۱۱ء کو قوطی بادشاہ رزریق کو وادی لطہ میں شکست فاش دی۔ اس کے بعد اس نے نہایت تیزی کے ساتھ اندلس کے دوسرے شہروں پر قبضہ کر لیا۔ سنہ ۷۱۱ء میں قرطبہ اور طلیطلہ فتح ہوئے اور ۷۱۲ء میں اشبیلیہ، مارده اور سرقسطہ پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ اب یہ سارا علاقہ اموی خلافت کا ایک حصہ بن گیا۔ اندلس کا گورنر براہ راست دمشق کی مرکزی حکومت کو جواب دہ ہوتا تھا لیکن بعد میں اندلس کو افریقہ کی حکومت میں شمار کیا جانے لگا اور یہ قیروان کے والی کے ماتحت ہو گیا۔ اندلس کی حکومت کا یہ دور اموی امراء کا عہد ہے جو سنہ ۷۱۱ء سے ۷۵۶ء تک محیط ہے۔ اس عرصہ میں اندلس کی مقامی ثقافت اور اسلامی تہذیب کی روایات کے امتزاج سے زراعت، آب پاشی اور تجارت کو خوب فروغ حاصل ہوا۔

اسی عہد میں مسلمان جرنیل عبدالرحمٰن الغافقی نے سنہ ۷۱۹ء میں یورپ میں شمال کی طرف مسلسل پیش قدمی کی اور مسلمان تربونہ اور طلوشہ سے گزر کر برگنڈی تک پہنچ گئے۔ یہ سنہ ۷۲۵ء کا واقعہ ہے کہ مسلمان اندلس کی سرحدیں عبور کر کے فرانس میں دور تک نکل گئے۔ پھر سنہ ۷۳۲ء میں غافقی کا مقابلہ فرانسیسی سپہ سالار چارلس مارٹل سے ہوا جس میں عبدالرحمٰن الغافقی شہید ہو گیا اور مسلمان فوجیں واپس اندلس میں آ گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے یورپ کی طرف بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس لیے یورپی مؤرخین اس واقعہ کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔

جب سنہ ۷۵۶ء میں اموی خلافت ختم ہوئی تو اس وقت اندلس کا والی یوسف بن عبدالرحمٰن الفہری تھا۔ عباسی خلافت قائم ہونے کے ساتھ ہی امویوں پر اسی طرح جبر و تشدد ہونا شروع ہو گیا جیسا فردی نند نے سقوط غرناطہ کے بعد مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا۔ عباسی خلیفہ سفاح نے بنوامیہ کے لوگوں کو چن چن کر مارنا شروع کر دیا۔ اسی قسم کا سلوک امویوں کے ساتھ سفاح کے گورنروں ابومسلم خراسانی وغیرہ نے کیا، ان لوگوں نے نہ صرف بنوامیہ کے افراد کو قتل کرنا شروع کر دیا بلکہ ہر عرب کو موت کے گھاٹ اتارنا اپنا فرض سمجھ لیا۔ ایک اموی شہزادہ عبدالرحمٰن بن معاویہ جو اموی خلیفہ ہشام کا پوتا تھا، عباسیوں سے بمشکل اپنی جان بچا کر افریقہ آ گیا۔ افریقہ سے وہ اندلس پہنچا اور یہاں تھوڑی سی فوج جمع کر کے ۱۰ ؍مئی ۷۵۶ء کو عبدالرحمٰن الفہری کو قرطبہ کے باہر شکست دے کر اندلس میں اموی امارت کا اعلان کر دیا۔ عبدالرحمٰن کے دور امارت میں اندلس نے زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ترقی کی۔ یہ چونکہ اندلس میں سب سے پہلا اموی امیر داخل ہوا تھا لہٰذا یہ ''عبدالرحمٰن الداخل'' اور ''عبدالرحمٰن الاول'' کے نام سے معروف ہوا۔ اسی نے اندلس کی مشہور مسجد قرطبہ کی بنیاد رکھی اور دہری محرابوں کا فن تعمیر دنیا میں روشناس کرایا جس کی صدیوں سے تعریف کی جا رہی ہے۔ اس کے بعد اس کے جانشین ابوالولید ہشام اور الحکم الاول کے کردار بھی بہت نمایاں ہیں۔ عبدالرحمٰن الثانی نے اموی سلطنت کو مزید مستحکم اور وسیع کیا اور شامی نظام حکومت کو ترک کر کے عباسی طرز کے نظام کو رائج کیا۔

اموی اندلس کی تاریخ میں عبدالرحمٰن الناصر کا دور اموی حکومت اور ثقافت کا نقطۂ عروج تھا۔ ابھی تک

اندلس کے اموی حکمران ''امیر'' کہلاتے تھے، لیکن عبدالرحمٰن الناصر نے اموی خلافت کا باقاعدہ اعلان کر کے اندلس میں اموی خلافت کا احیاء کیا۔ اس نے اندلس میں پچاس سال نہایت کامیاب طریقے سے حکومت کی اور ملک میں عیسائیوں اور بربروں کے حملوں اور بغاوتوں کو روک کر ملکی سرحدوں کو پرامن بنا لیا۔ ملک میں آب پاشی کا وسیع اور ملک گیر نظام متعارف کرایا جس کے نتیجے میں زراعت نے بڑی ترقی کی۔ صنعت وحرفت نے نشوونما پائی اور اس کے دور خلافت میں اندلس یورپ کا نہایت ترقی یافتہ ملک بن گیا۔ اسی بنا پر قسطنطنیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی اور دیگر ہمسایہ ملکوں نے خیرسگالی کے طور پر اپنے سفیر قرطبہ بھیج رکھے تھے۔ عبدالرحمٰن الناصر کے بعد الحکم المستنصر باللہ کے لقب سے خلیفہ بنا۔ وہ خود ایک بہت بڑا عالم تھا، لہٰذا اس نے علماء اور حکماء کی ایک بہت بڑی تعداد دربار سے وابستہ کی۔ اس کے عہد میں ادب وثقافت کو بہت فروغ اور عروج حاصل ہوا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ الحکم الثانی کے بعد ہی اموی خلافت کا زوال شروع ہوا اور آخرکار سنہ ۱۰۲۳ء میں یہ اموی خلافت ختم ہوگئی۔ خلافت اموی کے دور زوال میں اندلس میں باغی سرداروں نے اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ یہ اندلس میں سیاسی تشتت وانتشار کی علامت تھیں۔ تاریخ میں اس دور کو ''طوائف الملوکی'' کا دور کہا جاتا ہے۔ اس طوائف الملوکی کے نتیجے میں جنوب میں بربر امراء اور شمالی علاقوں کے عیسائی بادشاہوں کو اندلس پر حملے کا موقع مل گیا۔ مسلمانوں کے آپس کے اس انتشار اور خلفشار کی وجہ سے شمال کے عیسائی بادشاہ اندلس کی طرف فوجی پیش قدمی کرتے رہے، اس طرح اندلس کو دوبارہ فتح کرنے کا وہ عمل شروع ہوا جو آخرکار مسلمانوں کے اندلس سے مکمل انخلا پر منتج ہوا۔ عیسائی بادشاہ الفانسو ششم نے ۱۰۸۵ء میں طلیطلہ پر بغیر کسی جنگ کے قبضہ کر لیا اور پھر مختلف ذرائع سے اتنی قوت حاصل کر لی کہ مختلف شہروں کے مسلمان حکمران جو طوائف الملوکی کی پیداوار تھے، اسے اپنا ثالث اور معاون بنانے لگے۔ ان مسلمان حکمرانوں کا اولین ہدف صرف اپنے اقتدار کی حفاظت تھا۔ چنانچہ یہ کٹھ پتلی عیسائی حکمرانوں کی مدد سے دوسرے مسلمان بادشاہوں کو نیچا دکھاتے اور اپنے اقتدار کی حفاظت کرتے۔ پھر گیارہویں صدی عیسوی میں ایک وقت ایسا آیا جب بعض حکمرانوں نے اپنے مخالفین کے لیے افریقہ میں المرابطون کے امیر یوسف بن تاشفین کو اندلس پر حملے کی دعوت دی۔ یوسف بن تاشفین نے ۱۰۸۶ء میں جنگ زلاقہ میں الفانسو کو عبرتناک شکست دی۔ یوسف بن تاشفین نے جب ملوک الطوائف کی باہمی رقابتوں اور عداوتوں میں کوئی فرق نہ پایا تو اس نے ان حکمرانوں کو معزول کر کے اندلس کے بہت بڑے حصے کو المرابطون کی سلطنت میں شامل کر لیا۔ سنہ ۱۱۳۳ء میں قشتالہ کے بادشاہ الفانسو ہفتم نے قرطبہ کو تاخت وتاراج کر دیا اور مسجد قرطبہ کی بے حرمتی کی۔ اسی طرح اور بھی کئی شہر تباہی کا نشانہ بنے اور ۱۱۴۴ء تک اندلس کا شیرازہ بکھر گیا اور مسلم حکمرانوں کا اقتدار زیروزبر ہوگیا تھا۔ ادھر افریقہ میں المرابطون کی جگہ الموحدون کی حکومت قائم ہوگئی۔ انھوں نے اندلس میں عیسائیوں کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کو اپنے لیے بھی خطرے کا باعث سمجھا۔ چنانچہ جب اندلس کے امراء نے الموحدون کو اندلس پر حملے کی دعوت دی تو انھوں نے ان کی اس دعوت کو فوری طور پر قبول

کیا اور سنہ ۱۱۴۷ء میں الموحدین نے المرابطون کی حکومت کو ختم کر کے اندلس کو متحد کرنا شروع کیا۔ چنانچہ الموحدین نے تھوڑے ہی عرصے میں اندلس کے بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کر کے اپنی حکومت کو مستحکم اور مضبوط کر یا۔ المختصر یہ کہ خلیفہ ابو یعقوب یوسف نے اپنے مختصر دور حکومت میں اشبیلیہ کو بام ترقی پر پہنچا دیا، لیکن ابو یعقوب عیسائیوں کے خلاف ایک جنگ میں ۱۱۸۴ء میں زخمی ہو کر شہید ہو گیا جس کے ساتھ ہی عیسائیوں کے حملوں اور فتح میں تیزی آ گئی۔ عیسائی ریاستیں متحد ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوتی رہیں یہاں تک کہ ۱۷ر جولائی ۱۲۱۲ء میں مسلمانوں کو بہت بڑی شکست ہوئی جس کے نتیجے میں ۱۲۳۶ء میں قرطبہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

عیسائی حکومتوں کے اس اتحاد اور مسلمانوں کے انتشار اور خلفشار کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں پر اندلس میں عرصۂ حیات تنگ ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ اندلسی مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد شمالی افریقہ کی طرف ہجرت کر گئی اور مسلمان اندلس کے جنوبی علاقوں میں سمٹتے چلے گئے۔ یہاں بھی چند چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں جو خود اپنا دفاع بھی کر سکتی تھیں۔ ان چھوٹی ریاستوں کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی تھی اور وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے عیسائی حکومتوں سے مدد کی طلب گار رہتی تھیں۔ ان چھوٹی ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقتور سلطنت غرناطہ کی تھی۔ سنہ ۱۲۳۷ء میں اجونہ کے قلعہ دار محمد بن یوسف نے جو ابن الاحمر کے نام سے معروف تھا، غرناطہ پر قبضہ کر کے ''الغالب باللہ'' کے لقب سے سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ خاندان بنونصر اور بنواحمر کے ناموں سے مشہور ہوا۔ غرناطہ کی مختلف شاہی عمارتیں اسی خاندان کی تعمیر کردہ ہیں جن پر "لاغالب الا اللہ" کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ اس خاندان کی حکومت دو سو سال تک قائم رہی لیکن اس کو سیاسی توازن حاصل نہ ہو سکا۔

ارغون کے بادشاہ فردی نند اور قشتالہ کی ملکہ از بیلا مذہبی جوش و جذبے کے ساتھ اندلس کی فتح ثانی کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ بازہ کا حکمران الزغل غرناطہ کے حکمران ابو عبداللہ محمد کا چچا تھا۔ اس نے کئی بار ابو عبداللہ کو اس بات کی دعوت دی کہ اپنے تمام اختلافات اور تنازعات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے متحد و متفق ہو کر عیسائیوں کا مقابلہ کیا جائے لیکن ابو عبداللہ نے اس کی بات نہ مانی۔ شاید اس کو یہ خطرہ تھا کہ الزغل کی نگاہیں غرناطہ پر ہیں، اس لیے وہ الزغل کی اس دعوت کو ٹالتا رہا۔ فردی نند اور از بیلا نے ان دونوں کو الگ الگ رکھ کر ان سے الگ الگ مقابلہ کیا۔ پہلے انھوں نے الزغل کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا اور پھر غرناطہ کے راستے کی ساری رکاوٹیں دور کر کے غرناطہ پر جو اب قصر الحمراء تک محدود ہو چکا تھا، قبضہ کر لیا۔

غرناطہ پر قبضے کے بعد فردی نند اور از بیلا نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا اور ان کو زبردستی عیسائی بنانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس سلسلے میں بے شمار مسلمانوں کو تہ تیغ کیا گیا۔ مسلمانوں کی بہت تھوڑی تعداد نے بظاہر عیسائیت قبول کر لی لیکن خفیہ طور پر وہ اسلام پر قائم رہے۔ عیسائیت قبول کرنے والے مسلمانوں کی کڑی نگرانی کی جاتی تھی اور جس کے متعلق یہ سمجھا جاتا کہ وہ اندر سے مسلمان ہے اس کو آگ میں جلا دیا جاتا۔

چنانچہ غرناطہ، قرطبہ اور اشبیلیہ میں بہت عرصے تک آگ کے الاؤ بھڑکتے رہے۔

اندلس میں مسلمانوں نے قریباً آٹھ سو سال حکومت کی۔ اس عرصے میں انھوں پورے ملک میں بہترین نظم ونسق قائم کیا جس سے نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی نہایت مطمئن تھے۔ زراعت کو ترقی دی گئی۔ اموی امراء نے شام کے آب پاشی کے طریقوں کو یہاں رواج دیا جس سے زراعت کا انحصار صرف بارش پر نہ رہا۔ آب پاشی کے لیے مسلمانوں نے جو طریقے اندلس میں متعارف کرائے، ان کے نام ہسپانوی زبان میں اب بھی وہی ہیں۔

صنعت وحرفت کو بھی اسلامی اندلس میں بہت فروغ ملا۔ عربی زبان وادب نے اندلس میں نئے اسلوب ایجاد کیے۔ لسانیات پر بڑی عمدہ کتابیں لکھی گئیں۔ بے شمار شعراء اور ادیب پیدا ہوئے جنھوں نے عربی زبان وادب کو مالا مال کیا۔ سقوط غرناطہ کے بعد بھی عربی زبان کافی عرصے تک عیسائی بادشاہوں کی سرکاری زبان رہی۔ اس کے بعد بھی مختلف سرکاری پابندیوں کے باوجود عربی زبان خفیہ طور پر مروج رہی۔ یورپی علوم میں بیشتر علمی اصطلاحات جو ہسپانوی زبان کے ذریعے یورپی دانش کدوں میں داخل ہوئیں، عربی زبان سے متاثر ہیں۔ اندلس میں عربی شعراء میں ابن زیدون (۱۰۷۰ء) کا نام بہت مشہور ہے۔

اندلسی ثقافت میں علم تاریخ، علم تفسیر، علم فقہ اور فلسفہ وکلام نے بہت ترقی کی۔ تاریخ میں ابن خلدون کے علاوہ ابن حبان، ابن الابار، ابوسعید عبداللہ البکر، ابن بشکوال، ابن سعدی، لسان الدین ابن الخطیب وغیرہ کی ایک طویل فہرست ہے۔ مقدمہ ابن خلدون علم التاریخ اور عمرانیات کی ایک گراں قدر تصنیف شمار کی جاتی ہے۔ ابن الخطیب نے کئی کتابیں لکھیں جن میں تین جلدوں پر مشتمل کتاب ''الاحاطہ'' ہے جس میں غرناطہ کے علماء اور فقہاء کی تاریخ بھی شامل ہے۔

تاریخ میں ابوالمنذر ربلنسی اور ابن زید القرطبی نے گھوڑوں کے نسب پر ایک کتاب لکھی۔ ابن بطوطہ سیاح یہیں کا تھا۔ عبید البکری انوبی نے ایک ردیف وار کتاب فن جغرافیہ پر لکھی۔ ابن حسان نے اندلس کی دو تاریخیں لکھیں۔ ایک دس جلدوں میں اور دوسری ساٹھ جلدوں میں۔ صرف اندلس کی تاریخ ایک ہزار سے زیادہ مؤرخین نے لکھی ہے۔ ابن احمد الطیسی نے ایک کتاب تمام قبائل کی مکمل تاریخ میں لکھی۔

فلسفہ وکلام میں ابن باجہ اور ابن طفیل جیسے قدآور لوگ موجود ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت ابن رشد کو ہوئی۔ ابن رشد نے مذہب کی عقلی بنیادوں پر جو توجیہ کی تھی، اس کے یورپ پر گہرے اثرات پڑے۔ دینی علوم میں ایک ممتاز نام ابن حزم کا ہے جس کی تصانیف ادب، تفسیر، کلام، اصول فقہ پر مشتمل ہیں۔ تفسیر میں امام قرطبی اور حدیث میں حافظ ابن عبدالبر کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ امام شاطبی کی الموافقات اور الاعتصام نے اصول فقہ میں ایک نیا اسلوب پیش کیا۔ اندلس کی علمی سرگرمیوں کا پورے یورپ میں چرچا تھا۔ اندلس کی یونیورسٹیوں میں یورپ کے دوسرے ملکوں سے بھی طلباء آتے تھے۔ عیسائیوں نے جن شہروں پر قبضہ

کیا ان میں سے بعض کی تعلیمی سرگرمیاں اسی طرح برقرار رہیں ان میں طلیطلہ اور برشلونہ قابل ذکر ہیں۔ یہاں کے کتب خانوں کو عیسائیوں نے کھنگال ڈالا۔ بہت سی کتابوں کے لاطینی میں ترجمے کیے۔

یہاں ایک بات کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اندلس میں علمی طور پر صرف مردوں ہی کو عظمت حاصل نہیں ہوئی بلکہ عورتیں بھی علم و ادب کی ترقی میں بہت مشہور تھیں۔ شہزادہ احمد کی بیٹی عائشہ کو نظم میں کمال حاصل تھا۔ وہ ایک فصیح و بلیغ خطیب بھی تھیں۔ خاندان موحدین کی شہزادی ولیدہ خوبی جمال، شاعری اور علم بلاغت و بیان میں شہرت رکھتی تھی۔ اشبیلیہ کی عفیفہ صنفیہ شاعری میں صاحب کمال تھی۔ ام سعد قرطبہ کی مشہور محدثہ تھیں۔ خاتون لبانہ علم ہندسہ کی بڑی ماہر تھیں۔ الجبرا اور مساحت کے نہایت پیچیدہ سوالات وہ باتوں باتوں میں حل کر دیتی تھیں۔ الحکم ثانی نے ان کو اپنا پرائیویٹ سیکریٹری مقرر کیا۔ زینب اور حمدا جود دارالحمیہ کے زیاد کتب فروش کی بیٹیاں تھیں، علم و فضل میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ ابن عباد اپنی تصنیف تحفۃ القدیم میں لکھتا ہے:

''باوجود حسن، عصمت اور دولت کے نامی علماء کی مجلس میں یہ شریک ہوتیں۔ حفصہ نے خوش نویسی میں کمال پیدا کیا تھا اور العاروضیہ معنی و بیان کی فاضلہ تھیں۔''

مریم بنت یعقوب الانصاری اشبیلی شاعری اور ادب میں بلند پایہ مقام کی حامل تھیں۔ غرض کہ کوئی فن ایسا نہ تھا جس میں خواتین اندلس نے مہارت حاصل نہ کی ہو۔

مختصر یہ کہ اندلسی ثقافت تاریخ انسانیت کا وہ دور ہے جس میں اسلامی ثقافت نے فروغ علم کی مشعل اندلس تک پہنچائی جہاں سے یورپ کی ترقی کا مرحلہ شروع ہوا۔

جو کچھ اس پیش آہنگ میں اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے تاریخ اسلام کی اس جلد میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اندلس کے مسلمانوں کے عروج و زوال کی اس داستان میں ہمیں جہاں جہاں سے بھی مواد ملا ہم نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ خلفاء اور امرائے اندلس کے سلسلے میں ہم نے مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی کی تاریخ اسلام سے بہت استفادہ کیا ہے اور مولانا موصوف نے خلفائے اندلس کے بارے میں اپنی تاریخ میں بہت قیمتی لوازمہ اور وقیع مواد اکٹھا کیا ہے جو تاریخ کی بڑی بڑی کتابوں میں بھی نہیں ملتا۔

حکیم محمود احمد ظفر
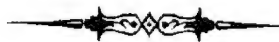
بنو امیہ کے خلاف تحریک

بنو ہاشم اور بنو عباس خلافت اسلامیہ کو اپنا خاندانی حق سمجھتے تھے اور جو قوم یا خاندان وراثتاً حکومت کو اپنا حق سمجھے وہ سخت غلطی میں مبتلا ہوتا ہے۔ بنو ہاشم یا بنو عباس اگر اس کو اپنا خاندانی حق سمجھتے تھے تو یہ ان کی غلطی تھی، لیکن دنیا میں اکثر و بیشتر لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں اور وہ حکومت میں بھی حق وراثت کو جاری و ساری سمجھتے ہیں، اس لیے جو شخص کسی کو غاصب سمجھتے ہوئے اس سے اپنا حق یعنی حکومت چھینتا ہے وہ اکثر قتل و تشدد سے کام لیتا ہے، لیکن اس قتل و تشدد کو بنو عباس نے بنو امیہ کے حق میں جس طرح روا رکھا ہے اس کی مثال اسلام کی تاریخ میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔ عباسیوں کے خراسانی سپہ سالار بنو امیہ کے قتل و غارت میں ان کو آمادہ کرتے تھے۔ بنو امیہ سے خلافت اسلامی کو چھیننا کوئی جرم نہ تھا، لیکن بنو امیہ سے خلافت چھین کر دوسرے خاندان کو خلافت اسلامیہ کو اس طرح سپرد کر دینا ہرگز کوئی خوبی کی بات نہ تھی۔ اسلام اور عالم اسلام کو خلافت کی اس تبدیلی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا لیکن بنو عباس کو نہایت ہی قابل شرم خون ریزی اور قتل و غارت کا ارتکاب کرنا پڑتا۔ ابو مسلم خراسانی اور قحطبہ بن شعیب اور دوسرے نقبائے اہل بیت نے خراسان کے شہروں میں جس قدر بنو امیہ اور ان کے حامیوں کے قتل عام کا بازار گرم کیا اس کا اجمالی تذکرہ گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ امام ابراہیم نے خود ابو مسلم کو اپنے آخری خط میں تاکیدی طور پر لکھا تھا کہ خراسان میں کسی عربی بولنے والے کو زندہ نہ رہنے دیا جائے۔ اس سے بھی مقصد ان کا یہی تھا کہ بنو امیہ اور ان کے کسی حامی اور طرف دار کو زندہ نہ چھوڑا جائے کیونکہ بنو امیہ کے حامی وہی عربی قبائل تھے جو فاتحانہ طور پر خراسان میں سکونت پذیر تھے۔ امام ابراہیم کے اس خط کی وجہ سے خراسان میں عربی قبائل کی کثیر تعداد جو آباد تھی اور جس نے اس ملک کی معاشرت اور تمدن کو عربی بنانے میں کامیابی حاصل کی تھی، وہ ساری کی ساری قتل ہوگئی اور عربی عنصر جو تمام ملک کو اپنا ہم رنگ اور ہم آہنگ بنا رہا تھا، یک لخت بے اثر و ناپید ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی زبان و تمدن، ایرانی معاشرت اور ایرانی اخلاق جو جان بلب ہو گئے تھے، پھر زندہ ہو گئے اور ایران اور خراسان جو مصر کی طرح آج عربی ملک ہوتے، پھر فارسی اور ایرانی ملک بن گئے۔ ابو مسلم خراسانی جو ایرانی تھا، اس کے لیے عربوں کے قتل سے زیادہ اور کوئی دلچسپ کام نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ ایرانی ہونے کے ناطے عربوں سے اپنے گذشتہ معاملات کا انتقام لینا چاہتا تھا جس کی تفصیل ہم

نے اپنی کتاب ''سیرۃ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ '' میں دی ہے۔ پھر امام ابراہیم نے خط کے ذریعے اس کو تاکید بھی کی تھی کہ کسی عربی بولنے والے کو زندہ نہیں چھوڑنا۔ اب تو ابو مسلم خراسانی کو عربوں کے قتل عام کی کھلی چھٹی مل گئی تھی۔ لہٰذا اس نے ہر اس قبیلے کو جس کا تعلق بنوامیہ یا ان کے حامیوں سے تھا، موت کے گھاٹ اتارنے سے دریغ نہ کیا۔

دوسری طرف عبداللہ سفاح کا چچا عبداللہ بن علی ۵ر رمضان المبارک ۱۳۲ھ کو دمشق میں داخل ہوا تو اس نے اپنی فوج کو قتل عام کا حکم دے دیا۔ جب آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد بوصیر میں قتل ہو چکا تھا تو عباسیوں کے لیے سب سے ضروری کام بنوامیہ کا کلی استیصال تھا۔ اگرچہ بنوامیہ کی نسل کا تخم سوخت ہونا ممکن نہیں تھا لیکن ابو مسلم خراسانی اس کام پر کمر ہمت باندھ چکا تھا۔ اس نے عبداللہ سفاح اور عباسی سرداروں کو بار بار لکھا کہ بنوامیہ کے کسی فرد کو چاہے وہ کیسا ہی ہو، تمھاری حکومت کا ہمدرد اور بہی خواہ ہونے کا دعویٰ بھی کرے، اس کو ہرگز زندہ نہ چھوڑا جائے۔ اس مشورے پر کافی حد تک عمل ہوا لیکن بعض ایسے افراد تھے جنھوں نے بڑی بڑی جمعیت کے ساتھ خطرناک مواقع پر عیسائیوں کی مدد اور اُموی خلیفہ کے خلاف بغاوت کر کے عباسیوں کو نہایت اہم امداد پہنچائی تھی، ان کو قتل کرنے سے انسانی شرافت مانع تھی، لہٰذا وہ موت کے گھاٹ اترنے سے بچ گئے۔ ابو مسلم خراسانی نے یہ اہتمام کیا کہ شاعروں اور مصاحبوں کو جو عباسی خلیفہ کے دربار میں آمدورفت رکھتے تھے، رشوتیں دے کر بنو عباس کے دربار میں بھیجا اور انھیں یہ تعلیم دے کر بھیجا کہ عباسی دربار میں جا کر ایسے اشعار پڑھیں اور ایسی باتیں کریں جن سے بنوامیہ کی بابت بنو عباس کا غصہ بھڑکے اور ان کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہو اور وہ بے دریغ بنوامیہ کو قتل کریں کیونکہ اس زمانے میں شعراء کا مقام موجودہ زمانے کے میڈیا کا تھا۔ ابو مسلم کی یہ کوشش کامیاب رہی، چنانچہ عباسیوں نے چن چن کر بنوامیہ کو قتل کیا۔ عبداللہ سفاح نے سلیمان بن ہشام بن عبدالملک کو سر دربار ایک ایسے ہی شاعر کے اشتعال انگیز اشعار پر قتل کر دیا حالانکہ سلیمان بن ہشام عبداللہ سفاح کا ہمدرد اور حامی تھا۔ عبداللہ بن علی جن دنوں فلسطین کی طرف تھا، وہاں نہر ابی قطرس کے کنارے دستر خوان پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اور اسی نوے کے قریب بنوامیہ کے لوگ اس کے ساتھ کھانے میں شریک تھے۔ اسی اثناء میں شبل بن عبداللہ آیا اور اس نے ایسے اشعار پڑھنے شروع کیے جن میں بنوامیہ کی مذمت اور ان کی خرابیوں کا بیان تھا اور امام ابراہیم کے قید ہونے کا ذکر کر کے بنوامیہ کے قتل کی ترغیب دی گئی تھی۔ عبداللہ بن علی (عبداللہ سفاح کا چچا) نے اسی وقت حکم دیا کہ بنوامیہ کے ان سب لوگوں کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کے نوکروں نے اس کے حکم کی تعمیل میں ان کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ان میں کچھ تو بالکل مر گئے اور کچھ زخمی ہو کر گر پڑے لیکن ابھی ان میں دم باقی تھا۔ عبداللہ بن علی نے ان سب مقتولوں اور زخمیوں کی لاشوں کو برابر لٹا کر ان کے اوپر دستر خوان بچھوایا اور اس دستر خوان پر کھانا چنا گیا۔ عبداللہ بن علی اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔ یہ لوگ ابھی کھانا کھا رہے تھے کہ دستر خوان کے نیچے سے دو زخمی کراہ رہے تھے۔ ان لوگوں نے ان کے کراہنے کی آواز سنی لیکن یہ کھانے میں مصروف رہے جب یہ کھانا

کھا چکے تو دیکھا کہ دسترخوان کے نیچے سب زخمی مر چکے تھے۔ان مرنے والوں میں محمد بن عبدالملک بن مروان، معز بن یزید، عبدالواحد بن سلیمان، سعید بن عبدالملک اور ابوعبیدہ ولید بن عبدالملک بھی تھے۔بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ ابراہیم معزول خلیفہ بھی انھی میں شامل تھا۔اس کے بعد عبداللہ بن علی بن عبداللہ بن عباس نے خلفائے بنوامیہ کی قبروں کو آ کر کھدوایا۔عبدالملک کی قبر سے اس کی کھوپڑی برآمد ہوئی۔سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی قبر بھی کھدوائی گئی بعض قبروں سے بعض لوگوں کی نعشیں برآمد ہوئیں۔ہشام بن عبدالملک کی قبر کھودی گئی تو اس کی تمام لاش صحیح و سالم نکلی صرف ناک کی اونچی ہڈی ضائع ہوئی تھی۔عبداللہ بن علی نے اس لاش کو کوڑے لگوائے۔پھر اس کو سولی پر چڑھایا، اور اس کو جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی۔

عبداللہ بن علی کے بھائی سلیمان بن علی بن عبداللہ بن عباس نے بصرہ میں بنوامیہ کے ایک گروہ کو قتل کر کے لاشوں کو راستہ میں پھینک دیا اور دفن کرنے سے روک دیا۔ان لاشوں کو مدتوں کتے کھاتے رہے۔عبداللہ بن علی کے ایک دوسرے بھائی یعنی عبداللہ سفاح کے چچا داؤد بن علی نے مکہ، مدینہ اور حجاز و یمن میں چن چن کر ایک ایک اموی کو قتل کرا دیا اور بنوامیہ میں سے کسی کا نام ونشان باقی نہ رکھا۔مختصر یہ کہ تمام محروسہ شہروں میں یہ حکم جاری کر دیا گیا کہ جہاں بھی بنوامیہ کا کوئی آدمی نظر آئے اس کو فوری طور پر قتل کر دیا جائے۔صوبوں کے گورنر اور شہروں کے حاکم جو اکثر و بیشتر عباسی تھے، اپنی اپنی جگہ اس بات کا تجسس کرنے لگے کہ کہیں کسی اموی کا پتہ چلے تا کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔لوگوں نے اپنی نظروں سے دیکھا کہ جس طرح کسی درندے کا شکار کرنے کے لیے لوگ گھروں سے نکلتے ہیں، اسی طرح بنوامیہ کے لوگوں کا شکار کرنے کے لیے لوگ روزانہ اپنے گھروں سے نکلتے۔بنوامیہ کے لیے کوئی مکان، کوئی قصبہ اور کوئی شہر جائے پناہ نہ رہا اور کئی برس تک لوگ ان کو تلاش کر کے قتل کرتے رہے۔خراسان میں ابو مسلم نے یہ گھناؤنا کام اور بھی زیادہ اہتمام اور جرأت و ہمت کے ساتھ انجام دیا تھا۔اس نے نہ صرف بنوامیہ کو قتل کیا بلکہ ان لوگوں کو بھی بے دریغ قتل کروایا جنہوں نے کسی موقع پر بنوامیہ کی کوئی خدمت انجام دی تھی۔اس قتل عام میں جو لوگ بھاگ سکے انھوں نے بھی اپنا بھیس، نام اور حلیہ بدل کر مختلف سرحدوں کی طرف رخ کیا۔خراسان کے صوبوں اور شہروں میں یہ قتل عام چونکہ بہت زیادہ شدید تھا، اس لیے یہاں جو بنوامیہ اور ان کے حامی قبائل تھے، وہ سندھ، کوہِ سلیمان اور کشمیر کی طرف بھاگ کر پناہ گزیں ہو گئے، کیونکہ انھیں عباسی حکومت کے حدود میں امن اور پناہ ملنا ناممکن تھا۔یہ اور دیگر عربی قبائل جو سندھ، کشمیر اور پنجاب وغیرہ کی طرف جان بچانے کے لیے بھاگ کر آئے تھے، کہا جاتا ہے کہ ان کی نسلیں آج تک ہندوستان میں موجود ہیں اور اپنے بدلے ہوئے ناموں، پیشوں اور قبیلوں کی وجہ سے عربی نژاد ہونے کو بھول گئی ہیں۔بنوامیہ کا ایک شخص عبدالرحمٰن بن معاویہ بن ہشام قتل ہوتے ہوئے کسی طریقے سے بچ گیا اور وہ فرار ہو کر مصر اور قیروان ہوتا ہوا اندلس پہنچ گیا۔وہاں بنوامیہ کے خیر خواہ اور ہوا خواہ بکثرت موجود تھے، لہٰذا وہ اندلس پہنچتے ہی اس ملک پر قابض ہو گیا اور وہاں وہ ایک ایسی سلطنت اور خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کو عباسی کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔

بنوعباس کے پاس خلافت کیسے آئی؟

تاریخ اسلام کے ابتدائی واقف کاروں کو اس بات کا علم ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی جانشینی کے مسئلے پر پہلے تو انصار اور مہاجرین میں اختلاف ہوا، لیکن سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بیان اور سرکار دو عالم ﷺ کی اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد کہ "الائمۃ من قریش" (امام قریش میں سے ہوں گے) انصار اپنے موقف سے ہٹ گئے اور انھوں نے کبھی بھی خلافت کا مطالبہ نہیں کیا لیکن بنو ہاشم کے دل میں خلافت کی کچھ تمنا تھی جس کا اظہار بعض مواقع پر ہوتا رہا تاہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اخلاص اور حسن نیت نے اس اختلاف کو ابھرنے نہ دیا اور اتفاق و اتحاد کا دور قائم رہا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں عبداللہ بن سباء نے ایرانیوں سے مل کر اسلام کے خلاف ایک سازش تیار کی۔ کیونکہ ایرانی اور یہودی دونوں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے سخت نالاں تھے۔ وجہ یہ تھی کہ انھوں نے ساسانی سلطنت کو تہس نہس کر دیا تھا اور اس کا سارا مال و متاع یہاں تک کہ اس کے دربار کے قالین اور فانوس بھی مال غنیمت کے طور پر لائے گئے تھے اور ان کی لڑکیاں لونڈیاں بنا کر مدینہ طیبہ لائی گئی تھیں۔ چنانچہ مشہور انگریز مؤرخ اور دانش ور ایڈورڈ براؤن نے لکھا ہے کہ:

"خلفائے راشدین میں سے دوسرے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جو اہل عجم (ایرانی) متنفر ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ غارت گر عجم تھے۔ اگرچہ اس نفرت کو مذہبی رنگ دے دیا گیا، لیکن اصل حقیقت اندر سے صاف نظر آتی ہے۔" (تاریخ ادبیات ایران، اردو ترجمہ: ۱/۲۱۷)

یہی ڈاکٹر براؤن ایک اور مقام پر اس چیز کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جو عداوت ہے اس کا سبب یہ نہیں کہ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حقوق کو غصب کیا تھا بلکہ یہ کہ انھوں نے ایران کو فتح کر کے ساسانی خاندان کا خاتمہ کر دیا تھا۔" (تاریخ ادبیات ایران: ۴/۴۸)

اس سلسلے میں ڈاکٹر براؤن نے ایرانی شاعر رضائے کرد کے یہ دو شعر بھی نقل کیے ہیں ؎

بشکست عمر پشت ہژبران رجم را   برباد فنا دار رگ و ریشہ جم را
ایں عربدہ برغصب خلافت زعلی نیست   باآل عمر کینہ قدیم است عجم را

یعنی عمر رضی اللہ عنہ نے جنگل کے شیروں یعنی ایرانیوں کی پشت توڑ کر رکھ دی اور جمشید کے خاندان کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ (ایرانیوں کا) یہ سارا جھگڑا اس لیے نہیں ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت غصب کر لی بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اہل ایران کو آل عمر رضی اللہ عنہ سے پرانی دشمنی چلی آ رہی ہے۔

(تاریخ ادبیات ایران: ۴/۴۹)

غرض کہ اس سیاسی پرخاش اور عربوں کے اس سیاسی تفوق کی وجہ سے اہل ایران نے سیدنا فاروق

اعظم رضی اللہ عنہ کے خلاف عبداللہ بن سباء اور دیگر مسلم نما یہودیوں کے ساتھ مل کر سازشوں کے زمین دوز بم (Mines) بچھانے شروع کر دیے (جس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب ''سیرۃ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ میں دی ہے) اس کے نتیجے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور آخر میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔ اور بنو ہاشم کے ذہنوں میں یہ بات ڈال دی گئی کہ خلافت اسلامیہ پر تمھارا حق ہے۔ تمھارے علاوہ جو کوئی زمام خلافت ہاتھ میں لے گا وہ غاصب ہے۔ جب کہ اس عظیم الشان حکومت کے قائم کرنے میں عرب کے تمام قبائل کی کوششیں برابر کی شریک تھیں، جبکہ بعض قریشی نوجوان اس خلافت کو تنہا اپنی ملک سمجھتے تھے۔ البتہ یہ چیز آزاد اور مساوات پسند عربوں پر سخت شاق گزرتی تھی۔ مزید برآں یہ کہ شام اور مصر کو عربوں نے جب فتح کیا تھا تو وہاں رومیوں کی غیر قومی حکومت قائم تھی جس کے مٹنے اور ختم ہونے کا ان کو اور ان کے باشندوں کو کوئی زیادہ افسوس نہ تھا لیکن اس کے برعکس ایران میں جو حکومت قائم تھی وہ کتنی ہی خراب اور بری سہی لیکن پھر بھی وہ ان کی اپنی قومی حکومت تھی جس کے چھن جانے کا غم اور افسوس ایرانیوں کے دلوں سے آسانی سے محو نہیں ہو سکتا تھا۔ حکومت کھو جانے کے بعد اگرچہ وہ عربوں کے زیر دست اور ماتحت ہو گئے تھے لیکن حکومت کے چھینے جانے کا داغ ان کے دلوں سے نہ مٹا تھا اور حکومت کو دوبارہ حاصل کرنے کا جذبہ اور داعیہ ان کے دلوں میں برابر پرورش پاتا رہا۔ انھوں نے دیکھا کہ چند ہی سالوں میں اسلامی حکومت کی بنیادیں اس قدر پختہ، مضبوط اور راسخ ہو گئیں کہ ان کے لیے انھیں ہلانا نہ صرف مشکل ہو گیا بلکہ ناممکن ہو گیا۔ اب ان کے لیے صرف ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ وہ اسلامی حکومت کو کسی ایسی شکل میں تبدیل کر دیں کہ ان کو اس میں زیادہ سے زیادہ حقوق حاصل ہو جائیں، لیکن اسے ایسی شکل میں تبدیل کرنا بھی مذہب کی آڑ لیے بغیر ممکن نہ تھا، اور اس وقت اسلام پر کوئی زیادہ زمانہ بھی نہیں گزرا تھا۔ اس وجہ سے مسلمانوں کے عقائد میں بھی کوئی بڑی تفریق اور تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ البتہ سیاسی اختلافات کی تفریقیں پیدا ہو رہی تھیں اور انھی تفریقوں کو ابھارنے سے کسی نئے انقلاب کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی۔ چنانچہ ان تفریقوں کو غیر ضروری ہوا دی گئی۔

قریش کے دو خاندان نمایاں اور ممتاز حیثیت کے حامل تھے یعنی بنو امیہ اور بنو ہاشم۔ زمانۂ جاہلیت میں ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلام کے پہلے غزوہ بدر میں قریش کے اکثر رئیس مارے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ کی ریاست تنہا ابوسفیان اموی کے حصے میں آئی۔ دوسری طرف بنو ہاشم میں خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ تھے۔ بنو امیہ کے پاس قریش کی سپہ سالاری کا عہدہ تھا، اس وجہ سے غزوۂ بدر سے لے کر فتح مکہ تک بنو امیہ اور بنو ہاشم باہم برسر پیکار رہے اور سنہ ۸ ھ میں فتح مکہ پر بنو امیہ کی ریاست کا خاتمہ ہو گیا اور وہ اسلامی حکومت کا ایک جزو بن گئے جن میں قبائلی تفریق کا کوئی سوال نہ تھا بلکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائلی تفریق کو یک قلم مٹا دیا تھا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو ہاشم کو کوئی بڑا عہدہ اور منصب بھی نہیں دیا جس سے دوسرے قبائل کو انگلی اٹھانے کا موقع ملے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی

تین صاحب زادیاں بنو امیہ میں بیاہیں اور ایک صاحب زادی بنو ہاشم میں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ہر قسم کی قبائلی اور خاندانی تفرقہ اندازیوں کا قلع قمع کر دیا۔ آپ ﷺ کے انتقال کے بعد دو خلیفہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو ہاشم اور بنو امیہ سے نہیں تھا۔ لہٰذا ان کے زمانے میں بھی کسی نے قبائلی اور خاندانی تفریق کی بات نہ کی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے داماد تھے لیکن ان کا تعلق بنو امیہ سے تھا، لہٰذا ان کی خلافت کے آخری چھ سالوں میں ایرانیوں اور مسلم نما یہودیوں نے بعض بنو ہاشم اور کچھ دوسرے لوگوں کو ساتھ ملا کر اموی اور ہاشمی کا سوال اٹھا دیا۔ یہ سوال جان بوجھ کر پیدا کیا گیا تا کہ مسلمانوں میں مذہبی نہیں تو سیاسی دراڑ پڑ جائے۔ شام میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہی کے عہد خلافت سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ گورنر چلے آ رہے تھے اور وہ نہایت قابلیت اور اہلیت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ چونکہ ایک مدت سے وہاں کے گورنر چلے آ رہے تھے اس وجہ سے وہاں ان کا اثر پوری طرح قائم تھا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک دو اور اموی گورنر مقرر فرمائے جن پر بعض لوگوں نے جو مسلمانوں میں سیاسی تفریق کی تحریک چلا رہے تھے، اعتراض کیا۔ مختصر یہ کہ ان لوگوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو دار الخلافہ میں دن دیہاڑے شہید کر دیا اور پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ لوگوں نے بیعت اس جلد بازی میں کی کہ بہت سے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بیعت کرنے والے وہی لوگ تھے جو قتل عثمان رضی اللہ عنہ میں ملوث تھے جیسے مالک الاشتر اور محمد ابن ابی بکر وغیرہ۔ (البدایہ والنہایہ: ۷/۲۲۶) سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بہت روکا، لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ باغیوں کے سرغنہ مالک الاشتر اور اس کے ساتھیوں نے جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنا چاہی تو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو نہایت سختی سے منع کیا اور کہا کہ آپ ان بلوائیوں کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھیں کیونکہ ''بخدا! اگر آج آپ ان باغیوں کے ساتھ خلافت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو کل کو لوگ آپ پر قتل عثمان رضی اللہ عنہ کا الزام لگا دیں گے''، لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس بات پر بھی کوئی دھیان نہ دیا۔ (ابن اثیر: ۳/۱۰۱، طبری: ۵/۱۶۰) باغیوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر کے ان کو امیر المومنین تو بنا دیا لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک اچھی خاصی تعداد نے آپ کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔

(منہاج السنہ: ۲/۲۲۷)

چنانچہ اس ضمن میں سید مودودی نے لکھا ہے:

''سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے میں وہ لوگ شریک تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش برپا کرنے کے لیے باہر سے آئے ہوئے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنھوں نے بالفعل جرم قتل کا ارتکاب کیا، اور وہ بھی جو قتل کے محرک اور اس میں اعانت کے مرتکب ہوئے، اور اس لیے مجموعی طور پر اس فساد کی ذمہ داری ان سب پر عائد ہوتی ہے۔ خلافت کے کام میں ان کی شرکت

ایک بہت بڑے فتنے کی موجب بن گئی۔'' (خلافت وملوکیت: ص۱۲۳)

اس وجہ سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا پورا عہد خلافت اسی جنگ و جدل میں بسر ہو گیا، لوگ امن و امان کو ترسنے لگے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنے انھی ساتھیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے اور آپ کے بعد سیدنا حسن رضی اللہ عنہ عراق و عجم کے خلیفہ ہوئے۔ خلیفہ بننے کے چھ ماہ بعد انھوں نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر کے زمام خلافت ان کے سپرد کر دی، بنی ہاشم بلکہ آپ کے بھائی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے بھی اس صلح کو پسند نہ کیا، لیکن سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے سامنے ان کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ بنی ہاشم جو جاہلیت کی اصطلاح تھی، اب وہ اہل بیت نبوت کی مذہبی اصطلاح میں تبدیل ہو گئی اور اب مقابلہ بنو امیہ اور اہل بیت نبوت میں ہو گیا۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں اہل بیت نبوی کی پوری خاطر مدارات کی اور ان کی ہر قسم کی دل جوئی، لیکن جب ملکی حالات کے پیش نظر انھوں نے اپنی وفات کے بعد اپنے لڑکے یزید کو اپنا جانشین نامزد کیا تو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس کی مخالفت کی تاہم باقی پوری مملکت اسلامیہ کے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس جانشینی کو تسلیم کرتے ہوئے یزید کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر لی۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے تو یزید کی بیعت کر لی لیکن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے بیعت سے انکار کر دیا البتہ بعد میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ بھی بیعت یزید پر راضی ہو گئے جس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب ''سیدنا حسین رضی اللہ عنہ تاریخ کے آئینہ میں'' بیان کر دی ہے۔ آپ کے یزید کی بیعت پر آمادہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو ان کے عراق کے طرف داروں اور حامیوں نے کوفہ آنے کی دعوت دی اور بارہ ہزار اور ایک روایت کے مطابق اٹھارہ ہزار دعوتی خط انھیں لکھے، لیکن جب آپ کوفہ پہنچے تو آپ کے وہاں پہنچنے سے قبل ہی تمام اہل کوفہ آپ کی بیعت سے منحرف ہو گئے اور یزید کے حامی و ناصر ہو گئے جس کے نتیجے میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں کو میدان کربلا میں جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ البتہ آپ کے منجھلے صاحب زادے سیدنا علی بن حسین المعروف بہ زین العابدین باقی رہ گئے۔ آپ کے اس صاحب زادے کے علاوہ آپ کے ایک بھائی جو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بعد کی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ایک اور بیوی سیدہ حنفیہ کے بطن سے تھے ان کا نام تاریخ میں محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ لکھا ہے۔ یہ اگرچہ میدان کربلا میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہیں تھے، لیکن آخر آپ کے بھائی تھے، لہٰذا ان کی ساری ہمدردیاں اپنے بھتیجے سیدنا زین العابدین رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھیں۔

میدان کربلا کے جان گداز سانحہ کے بعد سیدنا زین العابدین تو سجادۂ عبادت پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے سجادۂ عبادت کو چھوڑ کر سیاسی میدان میں قدم رکھنا گوارا نہ فرمایا۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے حجاز میں خلافت کا دعویٰ کر دیا۔ اسی اثنا میں یزید کا انتقال ہو گیا اور اس کے بیٹے معاویہ نے سیاسی میدان کو چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کر لی کیونکہ وہ شاید اپنے آپ کو تخت شاہی کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ چنانچہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے

چند ہی سال بعد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے خاندان کی خلافت ختم ہو گئی، اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے حجاز اور عراق میں اپنی حکومت قائم کر لی، لیکن ادھر شام میں خاندان بنوامیہ کے ایک اور شخص مروان بن الحکم رضی اللہ عنہ نے جو سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے داماد بھی تھے، موقع انتخاب میں خود کو پیش کر کے کامیابی حاصل کر لی، لیکن وہ خلافت حاصل کرنے کے بعد ہی انتقال کر گئے۔ ان کا لڑکا عبدالملک بن مروان نہایت مدبر، سیاست کے نشیب وفراز سے آشنا اور جرأت و ہمت کا حامل تھا۔ اس نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حکومت ختم کر کے اور دوسری تمام بغاوتوں کا استیصال کر کے پھر سے بنوامیہ کی نئی حکومت قائم کر دی اور نئی فتوحات کا دروازہ کھول دیا۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی المناک شہادت کے بعد آپ کے صاحب زادے سیدنا زین العابدین سیاسی زندگی سے یک قلم کنارہ کش ہو گئے اور طرف دارانِ اہل بیت جن کا اصطلاحی نام شیعہ تھا، ان کی امامت اور راہ نمائی سیدنا محمد بن حنیفہ رضی اللہ عنہ کی طرف منتقل ہو گئی جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے غیر فاطمی صاحب زادے تھے۔ اس وقت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں دو اصطلاحیں پیدا ہو گئیں۔ ایک فاطمی جو سیدہ فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھے اور دوسرے علوی جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی دوسری بیویوں سے تھے۔ چنانچہ یہ سلسلۂ خلافت فاطمی اہل بیت سے علویوں میں منتقل ہو گیا۔ محمد بن حنیفہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد ان کے لڑکے ابو ہاشم عبداللہ ان کے قائم مقام ہوئے۔ اتفاق سے ان کو ایک ایسے مقام (حمیمہ ملک شام) میں مرض الموت پیش آیا جہاں اس وقت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد کے سوا اہل بیت کا اور کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پوتے محمد بن علی اس وقت موجود تھے۔ اس لیے ابو ہاشم عبداللہ نے یہ امانت محمد بن علی کے سپرد کر کے ان کو اپنا جانشین بنایا اور اپنے خراسانی متبعین اور انصار کو وصیت کی کہ میرے بعد محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس میرے جانشین ہوں گے۔ تم لوگ ان کی اتباع کرنا اور ان کی طرف رجوع کرنا۔ اس وصیت کے مطابق ابو ہاشم کے انتقال کے بعد خراسانیوں نے محمد بن علی کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس طریقے سے خلافت و امامت کا استحقاق سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اولاد سے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد میں منتقل ہو گیا۔ گویا علویوں سے خلافت و امامت عباسیوں میں منتقل ہو گئی۔ یہ عباسی حکومت کا بنیادی پتھر تھا۔

بعض روایات میں ہے اہل کوفہ کے کہنے پر سیدنا زین العابدین کے فرزند سیدنا زید بن علی رضی اللہ عنہ مدعی خلافت ہوئے۔ اہل کوفہ نے ان کو نصرت وحمایت کا یقین دلایا، لیکن سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے غلطی سے اہل کوفہ کو اپنا حامی سمجھ لیا جب کہ ان میں وفاداری اور وفا شعاری کا کوئی جرثومہ نہیں تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جن کے اباء واجداد نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ غداری کی تھی۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر پندرہ ہزار کوفیوں نے جان دینے کی بیعت کی، لیکن جب وقت آیا تو صرف ۲۱۸ افراد ان کے ساتھ رہ گئے۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے اہل کوفہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کی دعوت لے کر کھڑا ہوا ہوں۔ تمھیں میری اعانت و

امداد کرنی چاہیے۔"

یوسف بن عمر ایک بہت بڑی جمعیت کے ساتھ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں آیا لیکن سیدنا زید رضی اللہ عنہ کی ایک انتہائی مختصر جماعت اس کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی۔ انجام کار سیدنا زید رضی اللہ عنہ پیشانی پر ایک مہلک پتھر لگنے کے باعث شہید ہو گئے۔

بنو فاطمہ کے دعوئ خلافت کے ساتھ ساتھ بنو عباس کو بھی خلافت سے دل چسپی ہو گئی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے فرزند علی بن عبداللہ کو تو اس کا خیال نہ آیا لیکن ان کے بیٹے محمد کو ابو ہاشم کی تحریک کے باعث مسئلہ خلافت و امامت سے بے حد لگاؤ پیدا ہو گیا۔

شیعان علی [1] نے امامت کا ایک عجیب شاخسانہ کھڑا کر دیا تھا۔ انھوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں پہلے سیدنا زین العابدین کو امام بنایا اور پھر کچھ لوگوں نے سیدنا زید رضی اللہ عنہ کو بعض نے سیدنا باقر رضی اللہ عنہ کو منصب امامت پر فائز کر دیا۔ ان شیعہ حضرات نے سیدنا زین العابدین کو بھی اپنا آلۂ کار بنانا چاہا، لیکن وہ چونکہ میدان کربلا میں ان لوگوں کی بے وفائیوں اور غداریوں کا حال دیکھ چکے تھے، اس لیے وہ ان کے دام فریب میں نہ آئے۔ پھر ان لوگوں نے سیدنا محمد بن حنفیہ پر امامت کے ڈورے ڈالے۔ چنانچہ مختار ثقفی نے ان کی امامت سے اپنا اقتدار قائم کرنے میں بہت مدد لی۔ سیدنا محمد بن حنفیہ نے تو عبدالملک بن مروان کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر لی، لیکن شیعہ ان کو بھی امام تسلیم کرتے رہے۔

سیدنا محمد بن حنفیہ کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے ابو ہاشم عبداللہ ان کے جانشین ہوئے۔ انھیں سلیمان بن عبدالملک کے عمال سے کچھ شکایات تھیں۔ لہٰذا وہ دمشق کو چھوڑ کر ایک مقام حمیمہ تشریف لے گئے۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ نیز ان کی علالت کے وقت بنو ہاشم میں سے کوئی فرد ان کے پاس موجود نہ تھا، اس لیے انھوں نے اپنا جانشین محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کو بنا دیا۔ محمد بن حنفیہ کے متبعین اور حامی عراق اور خراسان میں کثیر تعداد میں تھے۔ آپ نے ان کو بھی یہ وصیت کی کہ وہ محمد بن علی کو اپنا امام تسلیم کریں اور ان کے ہاتھ پر بیعت کریں اور ہر معاملے میں ان کی اعانت و امداد کریں۔ اس طرح منصب امامت جو پہلے فاطمیوں سے علویوں میں آیا، اب علویوں سے عباسیوں میں منتقل ہو گیا۔

محمد بن علی کا باپ علی بن عبداللہ بھی اجلہ تابعین میں سے تھا۔ یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی رات رمضان المبارک سنہ ۴۰ھ میں پیدا ہوئے، لہٰذا یادگار کے طور پر ان کا نام علی رکھ دیا گیا۔ یہ علمی اعتبار سے کوئی قابل ذکر شخصیت نہیں تھے، چونکہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے تھے اس وجہ سے علم کی دولت سے بالکل تہی دامن بھی نہ تھے۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک حصہ ان کے حافظہ میں محفوظ تھا۔ ابن سعد نے ان کو قلیل

---

[1] یہاں شیعان علی سے مراد موجودہ زمانے کے اثنا عشری شیعہ نہیں ہیں بلکہ اس زمانے میں جو لوگ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دے رہے تھے وہ اپنے کو شیعان علی رضی اللہ عنہ کہتے تھے یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا گروہ۔

الحدیث تابعین میں لکھا ہے۔ ان کا میدان عملی حجرۂ عبادت تھا۔ وہ اپنے عہد کے بڑے عابد و مرتاض بزرگوں میں سے تھے۔ کثرت عبادت کے باعث ان کا لقب ''سجاد'' پڑ گیا تھا۔ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ ہر روز ایک ہزار رکعتیں پڑھتے تھے۔ عبادت کا یہ ذوق وانہماک آخری لمحۂ حیات تک قائم رہا۔

(طبقات ابن سعد: ۲۲۹/۵، تہذیب الاسماء: ۳۵۰/۱)

ان کے مذہبی کمالات کی وجہ سے قریش ان کی بڑی عزت وتکریم کرتے تھے۔ جب وہ مکہ جاتے تھے تو ان کے احترام میں سارا خاندان قریش ان پر ٹوٹ پڑتا تھا۔ (شذرات الذہب: ۴۹/۱)

ابن خلکان وغیرہ نے لکھا ہے کہ علی بن عبداللہ سید، شریف اور بلیغ تھے۔ یہ سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے چھوٹے صاحب زادے تھے۔ روئے زمین پر قریش میں سب سے زیادہ حسین وجمیل اور خوبصورت تھے اور نہایت بلند و بالا تھے۔ (ابن خلکان: ۳۲۳/۴، ابن سعد: ۲۳۱/۵)

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ ابوالہاشم عبداللہ نے اپنے انتقال کے وقت محمد بن علی کو اپنا جانشین بنایا۔ اس طرح خلافت و امامت کا استحقاق سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اولاد سے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد میں منتقل ہو گیا۔ محمد بن علی سنہ ۶۲ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ عالیہ خاتون سیدنا عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب کی پوتی تھیں۔ یہ نہایت متبحر عالم تھے، حدیث اور تفسیر میں انھیں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ ان کا شمار اجلہ تبع تابعین میں ہوتا ہے۔ جب عبداللہ ابو ہاشم نے انھیں اپنا جانشین بنایا تو آپ نے منصب امامت پر فائز ہوتے ہی دعوت بنی عباس کا آغاز کر دیا اور مختلف مقامات پر اپنے داعی بھیج دیے۔

یہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا عہد خلافت تھا۔ اس وقت ان کی طرف سے خراسان کا حاکم جراح بن عبداللہ حکمی تھا۔ امام نے دعاۃ کو روانہ کرتے وقت یہ ہدایت کی:

''میری اور میرے اہل بیت کی طرف لوگوں کو ترغیب دینا اور عام طور پر اس بات کی طرف متوجہ کرنا کہ امام میں ہی ہوں، اور جو تمھاری دعوت قبول کر لیں ان کے دستخط بھی لے لینا۔''

تمام دعاۃ نے خراسان پہنچتے ہی خفیہ طور پر ہزارہا نفوس کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور امام کی بیعت کے دستخط بھی لیتے گئے۔ یہ دستخطی تحریر خفیہ طور پر عراق، امام کے غلام ''میسرہ'' کے پاس روانہ کی گئی اور اس نے یہ تحریر امام محمد بن علی کے پاس بھیج دی۔'' امام کے ایک مصاحب ابومحمد صادق نے خراسانیوں میں امام کی مقبولیت دیکھ کر امام کو یہ مشورہ دیا کہ بارہ (۱۲) نقیب خراسان اور اس کے مختلف علاقوں میں اور جانے چاہییں۔ محمد بن علی نے یہ رائے پسند کی اور بارہ مزید نقیب خراسان میں بھیج دیے۔ ان نقباء کے علاوہ ستر (۷۰) آدمی ان کی معاونت کے لیے مقرر کیے گئے جن کا کام لوگوں سے بیعت امامت لینا بھی تھا۔ سنہ ۱۰۳ھ میں میسرہ نے عراق سے خراسان چند اور آدمی بھیجے جنھیں دعوت آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی۔ اس زمانے میں خراسان کا حاکم سعید نامی شخص تھا۔ ایک روز ایک شخص تمیمی عمران گورنر سعید کے پاس آیا اور اسے یہ اطلاع دی کہ یہاں کچھ لوگ باہر سے

آئے ہوئے ہیں اور وہ خفیہ طور پر لوگوں کو حکومت کے خلاف برانگیختہ کر رہے ہیں۔ سعید نے ان تمام لوگوں کو بلایا اور ان سے دریافت حال کیا۔ انھوں نے جھوٹ بولا اور کہا کہ ہم تاجر ہیں اور تجارت کی غرض سے یہاں آئے ہوئے ہیں اور آپ ہمارے اس امر کی تصدیق سرداران قبیلہ ربیعہ سے کر لیں۔ چنانچہ ان سرداروں کو بلایا گیا۔ انھوں نے ان کے بیانات کی تصدیق کی اور ان نقیبوں کو چھڑا کر لے گئے۔

سنہ ۱۰۲ھ میں جب یزید بن عبدالملک کا زمانۂ خلافت تھا تو امام محمد کے ہاں ابو العباس عبداللہ پیدا ہوا۔ چند روز کے بعد ابو محمد صادق اپنے چند دعاۃ کے ساتھ خراسان سے امام محمد کی زیارت کے لیے حمیمہ آیا اور امام کی قدم بوسی کے لیے ان کے در دولت پر حاضر ہوا۔ امام محمد نومولود ابو العباس کو کپڑے میں لپیٹ کر محل سرائے سے باہر آیا اور ان دعاۃ کو مخاطب کر کے کہا:

''واللہ! یہی وہ شخص ہے جس پر تمھارا دعوت آل محمد کا کام مکمل ہوگا اور یہی تمھارے دشمنوں سے انتقام لے گا۔''

تمام حاضرین نے امام کے کلمات سن کر عبداللہ کے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دیا اور حلف اٹھا کر کہا: ''بے شک ہم کو پورا پورا یقین ہے کہ یہ امام زادہ دشمنان اہل بیت سے ضرور بدلہ لے گا۔'' اس نومولود ابو العباس نے جو انتقام لیا اس کی تفصیل آگے آرہی ہے اور اس کی تفصیل رقم کرنے سے قلم بھی خون کے آنسو روتا ہے کہ مسلمانوں پر اس شخص نے کیسے کیسے ظلم و ستم کیے۔

امام محمد نے بنوامیہ کے خلاف اس تحریک کو نہایت تحمل و برداشت اور کامیابی سے چلایا۔ آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ بنوامیہ کے لیے حکومت چلانا مشکل ہو گیا۔ ۱۰۹ھ میں امام محمد نے بنوعباس کی تحریک کو کامیابی سے ہم کنار ہوتے دیکھ کر اپنے معتبر داعی زیاد کو خراسان بھیجا اور اس نے خراسان میں تحریک کے لیے بہت کام کیا اور خصوصی طور پر ابو مسلم خراسانی نے اس تحریک کو کامیاب کرنے کے لیے اپنے روز و شب ایک کر دیے۔ مختصر یہ کہ بنوامیہ کی خلافت کے خلاف بغاوت کامیاب ہوئی، اور خلافت اموی کا ایک ایک شہر ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

سنہ ۱۲۶ھ میں امام محمد بن علی نے وفات پائی تو اس کا لڑکا ابراہیم اس کا جانشین ہوا۔ ان دونوں کے ذریعے عباسی دعوت روز بروز ترقی کرتی گئی۔ ابراہیم کو گرفتار کر لیا گیا اور اس نے قید ہی میں وفات پائی۔ ابراہیم کی گرفتاری کے بعد ۱۲۹ھ میں اس کا چھوٹا بھائی ابو العباس عبداللہ بن محمد بن علی اس کا جانشین ہوا، اور عباسی خلافت کا سب سے پہلا خلیفہ وہی مقرر ہوا۔

مرکز میں خلافت کی تبدیلی

مرکز میں کافی عرصے سے بنوامیہ کے خلاف ایک تحریک چل رہی تھی کیونکہ بنو ہاشم اپنے کو خلافت کا زیادہ حق دار سمجھتے تھے لیکن جیسا کہ بتایا گیا سانحۂ کربلا کے بعد سیدنا زین العابدین عراقیوں سے سخت مایوس ہوکر مدینہ طیبہ مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے اور اب سیاست سے انھوں نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ہشام بن عبدالملک کے عہد خلافت میں سیدنا زید بن علی رضی اللہ عنہ نے ۱۲۲ھ میں لوگوں سے مخفی طور پر بیعت لینا شروع کر دی۔ سبب اس کا یہ ہوا کہ ہشام بن عبدالملک اور اس سے قبل بھی خلافت بنوامیہ نہایت اچھے طریقے سے اپنے فرائض منصبی ادا کر رہی تھی۔ ہشام نے بیس (۲۰) سال حکومت کی۔ اس کا دور بظاہر نہایت امن وسکون اور اطمینان کا زمانہ تھا۔ اب عراق وحجاز میں حجاج بن یوسف ثقفی اور عبیداللہ بن زیاد وغیرہ سخت گیر اور تشدد پسند حکمران بھی نہ تھے، بنو ہاشم کو رہ رہ کر اپنی بربادیوں اور بنوامیہ کی کامیابیوں کا خیال آتا تھا۔ وہ ان تمام لوگوں کو جو براہ راست حکومت وقت سے کوئی غیر معمولی فائدہ نہیں اٹھا رہے تھے، اپنا ہمدرد سمجھتے تھے۔ خوف و دہشت کا پتھر بھی چھاتی سے اتر چکا تھا، لہٰذا بنو ہاشم نے بنوامیہ کی حکومت ختم کرنے اور خود حکومت حاصل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ان کو تجربہ ہو گیا تھا کہ حکومت کے ہٹانے اور فنا کرنے کے لیے تلوار سے زیادہ تدبیر کارگر ہوتی ہے۔ لہٰذا سازشوں اور خفیہ کارروائیوں کا سلسلہ زور وشور سے شروع ہو گیا۔ یہ کام بنو ہاشم کے دو خاندانوں نے ایک ہی وقت میں شروع کیا۔ علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی اولاد نے الگ الگ کوششیں شروع کیں۔ عباسیوں کی مساعی کا تذکرہ قدرے کر دیا گیا ہے، لیکن علویوں یعنی فاطمیوں کی ایک کوشش کا تذکرہ مقصود ہے۔ یوسف بن عمر ثقفی کو ہشام بن عبدالملک نے عراق کا حاکم مقرر کیا۔ اس کے عہد امارت سنہ ۱۲۲ھ میں زید بن علی رضی اللہ عنہ نے مخفی اور پوشیدہ طور پر لوگوں سے بیعت لینا شروع کی۔ ہاشمیوں کے پراپیگنڈہ اور کچھ اور اسباب سے بھی بنوامیہ کی مقبولیت کمزور ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس وجہ سے سیدنا زید بن علی رضی اللہ عنہ کو اس بیعت میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ شہر کوفہ میں زید بن علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر پندرہ ہزار آدمیوں نے بیعت کی۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بھی سیدنا زید رضی اللہ عنہ کے حامیوں میں سے تھے۔ جو لوگ گذشتہ حالات پر گہری نگاہ رکھتے تھے انھوں نے زید بن علی رضی اللہ عنہ کو اس خروج سے باز

رکھنے اور ابھی انتظار کرنے کا مشورہ دیا۔ مشورہ ان کا نہایت صائب اور درست تھا لیکن زید بن علی رضی اللہ عنہ نے اس مشورے کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور انھوں نے صرف پندرہ ہزار کوفیوں کے بیعت کرنے پر کوفہ میں بنو امیہ کے خلاف خروج کر دیا۔ حالانکہ انھی کوفہ والوں نے ۸۰ ہزار کی تعداد میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی لیکن ابن زیاد کی ایک ہی دھمکی سے بیعت فسخ کر کے نہ صرف ابن زیاد سے مل گئے بلکہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے خانوادے کو دشت کربلا میں نہایت مظلومی کی حالت میں شہید کرا دیا۔ اہل بصیرت حضرات اہل کوفہ کی ان بے وفائیوں اور غداریوں سے بخوبی واقف تھے، لیکن سیدنا زید بن علی رضی اللہ عنہ نے نہ تو ماضی سے سبق سیکھا اور نہ ہی اہل بصیرت کے مشوروں پر عمل کیا اور پندرہ ہزار کوفیوں کی جمعیت کے بل بوتے پر بنو امیہ کی حکومت کے خلاف خروج کر دیا۔ یوسف بن عمر ثقفی گورنر کوفہ نے اس بغاوت کو دبانے کی کوشش کی، پہلے فہمائش کی، نہ ماننے کی صورت میں معرکہ آرائی تک نوبت پہنچی۔ کوفیوں نے اپنی روش کے مطابق جس طرح انھوں نے حسین بن علی رضی اللہ عنہ اور مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کو دھوکہ دیا تھا، اسی طرح زید بن علی رضی اللہ عنہ کو بھی دھوکہ اور فریب دیا۔ جب تلوار چلانے اور مردانگی دکھانے کا وقت آیا تو انھوں نے لڑائی سے پیچھا چھڑانے کے لیے سیدنا زید رضی اللہ عنہ سے طالب علمانہ کج بحثی شروع کر دی۔ ان سے پوچھا کہ پہلے آپ یہ فرمائیں کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو آپ کیسا سمجھتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے اپنے خاندان میں کسی کو بھی ان دونوں حضرات کی نسبت برا کہتے ہوئے نہیں سنا۔ اس پر کوفیوں نے کہا کہ جب خلافت کے اصل حق دار آپ کے خاندان کے لوگ تھے اور ان دونوں کے خلافت پر قابض ہو جانے سے وہ ناراض نہ ہوئے تو اب اگر بنو امیہ نے بجائے آپ کے خلافت پر قبضہ کر لیا ہے تو آپ ان کو کیوں برا بھلا کہتے اور ان سے لڑتے ہیں؟ یہ کہہ کر بیعت فسخ کر کے چل دیے اور زید بن علی رضی اللہ عنہ نے ان کو "رافضی" کا خطاب دیا۔

ان پندرہ ہزار آدمیوں بلکہ فدا کاروں میں سے صرف دو سو بیس شخص آپ کے ساتھ رہ گئے۔ ان ۲۲۰ آدمیوں سے سیدنا زید بن علی رضی اللہ عنہ نے یوسف ثقفی کی کئی ہزار فوج کا مقابلہ کیا لیکن آخر کب تک؟ غرض کہ وہ کوفہ کی گلیوں میں ایک ایک شخص کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر اپنی بیعت یاد دلاتے رہے لیکن کوفہ کے لوگوں میں وفا کہاں؟ نہ آپ کی دستک پر کسی نے دروازہ کھولا اور نہ آپ کی آواز پر کسی نے لبیک کہا۔ آخر ان کی پیشانی پر ایک تیر آ کر لگا جس سے وہ جان بر نہ ہو سکے اور جام شہادت نوش فرمایا۔ زید بن علی کے صاحب زادے یحییٰ بن زید باپ کے شہید ہونے کے بعد نینوا کی طرف جا کر روپوش ہو گئے۔ پھر موقع پر پا کر خراسان چلے گئے۔

سیدنا زید بن علی رضی اللہ عنہ کی یہ کوشش عجلت اور ناعاقبت اندیشی اور ان کے لوگوں پر اعتماد کرنے کے باعث جنھوں نے ان کے بزرگوں کے ساتھ بھی غداری اور بے وفائی کی تھی، ناکام ہو گئی۔ لیکن اس ناکام کوشش سے عباسیوں نے فائدہ اٹھانے میں کمی نہیں کی۔ ان کو زیادہ احتیاط برتنے اور زیادہ دور اندیشی سے کام لینے کی ترغیب ہوئی اور وہ اس بات کا بھی صحیح اندازہ کر سکے کہ ملک میں بنو امیہ کے اثر و اقتدار کی اب کیا کیفیت ہے۔

زید بن علی کی وفات نے بھی زیادہ لوگوں کی ہمدردی کو بنو ہاشم کی طرف مائل کر دیا کیونکہ بعض روایات کے مطابق ہشام بن عبدالملک نے زید بن علی کے کٹے ہوئے سر کو دمشق کے دروازے پر لٹکایا اور یوسف ثقفی نے زید بن علی کے ساتھیوں کی لاشوں کو کوفہ میں سولی پر لٹکا دیا، اس چیز نے لوگوں کو بنو امیہ سے اور زیادہ متنفر کر کے بنو ہاشم کا ہمدرد بنا دیا کیونکہ خاندان نبوت سے ناطہ ہونے کے باعث لوگوں کو فطری طور پر ان سے ایک گونہ ہمدردی ہوتی تھی۔

عباسیوں کی سازش:

ابو ہاشم عبداللہ بن محمد حنیفہ بن علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کی اموی خلیفہ سلمان بن عبدالملک وغیرہ خلفائے بنو امیہ بہت عزت و تکریم کیا کرتے تھے، لیکن بنو امیہ سے ان کو بھی ہاشمی ہونے کے ناطے ایک گونہ تعصب تھا اور وہ دلی طور پر بنو امیہ کی حکومت ہٹانے اور بنو ہاشم کو برسر اقتدار لانے کے خواہاں تھے کیوں وہ بھی خلافت بنو ہاشم کا استحقاق سمجھتے تھے۔ ان کی کوشش ایک محدود پیمانے تک تھی اور وہ یہ کہ اپنے معتقدوں اور دوستوں میں جس کو اہل پاتے اسے اپنے خیالات سے آگاہ کر دیتے تھے، اس قسم کے لوگ انھیں آہستہ آہستہ کافی دستیاب ہو گئے تھے۔

دوسری طرف محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی بنو امیہ کو حکومت سے ہٹانے اور بنو عباس کی خلافت قائم کرنے کی فکر میں ہر وقت مصروف رہتے تھے۔ ایک مرتبہ سلیمان بن عبدالملک کے عہد خلافت میں ابو ہاشم عبداللہ بن محمد خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے پاس دمشق گئے۔ وہاں سے واپسی پر وہ حمیمہ کے مقام پر جو علاقہ بلقاء میں واقع ہے محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کے پاس ٹھہرے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ وہ وہیں بیمار ہو کر فوت ہو گئے۔ فوت ہوتے وقت انھوں نے محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو وصیت کی کہ تم خلافت اسلامیہ کے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اس وصیت نے محمد بن علی کو بہت فائدہ پہنچایا یعنی وہ تمام لوگ جو ابو ہاشم عبداللہ بن محمد حنفیہ کے معتقد اور ہم راز تھے، محمد بن علی کے ہاتھ پر خفیہ طور پر آ کر بیعت ہو گئے۔ اس کے بعد سنہ ۱۰۰ھ میں سیدنا عمر بن عبدالعزیز کے عہد خلافت میں محمد بن علی نے اپنے کارندے عراق، خراسان، حجاز یمن اور مصر وغیرہ کی طرف روانہ کیے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اگرچہ بنو امیہ کی نسبت اس عداوت و نفرت کو جو اکثر لوگوں کے دلوں میں تھی بہت کم کر دیا تھا لیکن پھر بھی محمد بن علی کی تحریک برابر مصروف عمل رہی۔ چنانچہ محمد بن علی کی طرف سے میسرہ عراق میں، ابو محمد صادق خراسان میں عباسیوں کی خلافت کے لیے برابر دعوت کا کام کرتے رہے۔ محمد بن علی نے مضافات بلقاء میں سکونت اختیار کر کے وہیں سے اپنی تحریک کو ممالک اسلامیہ میں پھیلایا۔ چند روز بعد اس نے اپنے بارہ نقیب مقرر کیے اور انھیں چاروں طرف اسلامی صوبوں میں روانہ کیا۔ ان لوگوں کو ہر جگہ کامیابی حاصل ہوئی جس کا کچھ تذکرہ گذشتہ صفحات میں بھی کیا جا چکا ہے۔ سنہ ۱۰۲ھ اور ایک دوسری

روایت کے مطابق سنہ ۱۰۴ھ میں ابو محمد صادق خراسان سے وہاں کے چند با اثر لوگوں کو جنھوں نے اس دعوت کو قبول کر لیا تھا، اپنے ساتھ لے کر محمد بن علی کے پاس آیا۔ انھی ایام میں محمد بن علی اپنے اس لڑکے کو جس کی عمر صرف پندرہ دن تھی لے کر آیا اور ان لوگوں سے کہا کہ یہی تمھارا سردار اور امام ہوگا۔ یہ لڑکا ابو العباس عبداللہ سفاح تھا۔ اس کے بعد بکر بن ماہان جو سندھ میں عبید کے ساتھ تھا، وہاں سے کوفہ آیا اور ابو محمد صادق سے ملا۔ اس نے بکیر کو دعوت دی جو اس نے فوراً قبول کر لی۔ یہاں تک کہ یہ تحریک کامیابی سے ہم کنار ہوگئی اور دمشق کی مرکزی حکومت میں انقلاب عظیم آ گیا یعنی بنو امیہ کی حکومت ختم ہوگئی اور بنو عباس برسر اقتدار آ گئے۔

امیر یوسف بن عبدالرحمٰن فہری اگرچہ خود کسی فریق میں شامل نہ تھا لیکن اندلس کے اندر جب بنو امیہ کی خلافت کے ختم ہونے اور عباسیوں کی خلافت کے قائم ہونے کی خبر پہنچی تو جگہ جگہ شامیوں اور ان امیروں کے خلاف جو بنو عباس کے ہوا خواہ اور خیر خواہ تھے برسر پیکار ہو گئے۔ جو لوگ بنو امیہ کے خیر خواہ نہیں تھے انھوں نے ضمیل بن حاتم کو بنو امیہ کا خیر خواہ سمجھ کر چاروں طرف سے گھیر لیا۔ آخر قبیلہ قیس کے لوگوں نے ضمیل بن حاتم کی جان بچائی۔ ضمیل بن حاتم نے جب امیر یوسف عبدالرحمٰن سے امداد طلب کی تو اس نے امداد دینے سے انکار کر دیا۔ بہر حال ضمیل بن حاتم نے اپنے آپ کو دشمنوں کے پنجے سے بچا لیا۔ اس طرح ملک میں جابہ جا ہنگامہ آرائیاں شروع ہوگئیں۔ اندلس میں جو لوگ بنو امیہ کے خیر خواہ تھے ان میں دو شخص ابو عثمان عبیداللہ بن عثمان اور عبداللہ بن خالد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں حضرات صوبہ اندلوسیہ کے شہر البیرہ میں رہتے تھے اور وہاں حکمران تھے، اس شہر میں شامیوں کی آبادی زیادہ تھی۔ ان کے علاوہ یوسف بن بخت اور حسین بن ملک کلبی بھی مشہور سردار تھے۔ ضمیل بن حاتم کو جب امیر یوسف بن عبدالرحمٰن نے مدد نہ دی تو ابو عثمان اور عبداللہ بن خالد اس کی مدد کے لیے چلے گئے۔ ان دونوں کی روانگی سے قبل عبدالرحمٰن الداخل (جس کا تذکرہ آگے آرہا ہے) کا غلام بدر ان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ انھوں نے ضمیل بن حاتم کو عبدالرحمٰن الداخل کے اندلس بلانے کے خیال میں شریک کر لیا۔ ضمیل نے یوسف بن عبدالرحمٰن سے بظاہر بگاڑ کرنا مناسب نہ سمجھ کر یوسف کی رفاقت اور ہمدردی کے اظہار میں کوتاہی نہیں کی۔ ضمیل بن حاتم سے رخصت ہو کر ابو عثمان اور عبداللہ بن خالد دونوں البیرہ میں واپس آئے اور بتدریج اپنے دوستوں اور ہوا خواہوں میں اس خیال اور ارادے کی اشاعت خفیہ طور پر شروع کر دی۔ بعد میں ان کو پتہ چلا کہ ضمیل اپنے وعدے اور ارادے پر قائم نہیں ہے بلکہ وہ یوسف بن عبدالرحمٰن ہی کی حکومت کو پسند کرتا ہے۔ اس طرح قبیلہ قیس اور قبیلہ فہر کے آدمیوں سے امید حمایت یکم قلم منقطع ہوگئی، مگر ابو عثمان نے یہ ہوشیاری کی کہ ان دونوں قبیلوں کے خلاف یمنی قبائل میں مخالفت کا جوش بلند کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یمنی سرداروں نے علم بغاوت بلند کیے اور امیر یوسف بن عبدالرحمٰن اور ضمیل بن حاتم ان کی سرکوبی اور مدافعت میں مصروف ہو گئے۔

عبدالرحمٰن الداخل کی حکومت کا قیام

جب ابوعثمان نے یہ دیکھا کہ یمنی قبائل قتال و جدال میں مصروف ہوگئے ہیں تو اس نے فوری طور پر عبدالرحمٰن الداخل کے غلام بدر کو بلایا اور اس کو گیارہ آدمیوں کے ساتھ ایک جہاز میں سوار کرا کر افریقہ بھیج دیا۔ روانہ کرتے وقت انھیں یہ تاکید کی کہ بلا توقف عبدالرحمٰن الداخل کو جو اس وقت افریقہ میں مقیم تھا، اپنے ہمراہ اندلس لے آؤ۔ چنانچہ عبدالرحمٰن الداخل ربیع الثانی سنہ ۱۳۸ھ میں اندلس پہنچا اور بندر ضقات علاقہ البیرہ میں جہاز سے اترا۔ اس کے استقبال کو ابوعثمان اور بنو امیہ کے تمام خیر خواہان موجود تھے۔ ابوعثمان عبدالرحمٰن الداخل کو البیرہ میں اپنے مکان پر لے گیا اور لوگوں کو اکٹھا کر کے ایک معقول جمعیت بہم پہنچائی۔ یوسف بن عبدالرحمٰن اس وقت صوبہ سرقسطہ کی جانب باغیوں سے نبرد آزما تھا۔ وہ عبدالرحمٰن کے اندلس میں داخل ہونے کی خبر سن کر اور باغیوں کو شکست دے کر طلیطلہ کی طرف آیا۔ یہاں آ کر وہ ضمیل بن حاتم سے ملا اور غلطی یہ کی کہ ان تمام قیدیوں کو جن کو جان کی امان دے چکا تھا، قتل کر دیا۔ اس سے اس کی فوج کے بہت سے سردار غصے اور ناراض ہو گئے اور یوسف کا ساتھ چھوڑ کر البیرہ کی جانب روانہ ہو گئے جہاں عبدالرحمٰن الداخل چھیننے آیا تھا۔ اس خبر کے مشہور ہوتے ہی جگہ جگہ سے عرب سردار خصوصاً یمنی قبائل جو یوسف کے خلاف تھے، عبدالرحمٰن الداخل کے جھنڈے تلے اکٹھے ہو گئے۔ اب یوسف اور ضمیل ابن حاتم صرف فہری اور قیسی لوگوں کے ساتھ باقی رہ گئے۔ شامی لوگوں کی ہمدردی تو عبدالرحمٰن الداخل کے ساتھ ہونی ہی چاہیے تھی مگر یمنی لوگ جو شامیوں کے حریف اور مخالف تھے، اس لیے عبدالرحمٰن کے ساتھ شامل ہو گئے کہ وہ یوسف کے مخالف تھے۔ عبدالرحمٰن الداخل یوسف سے اندلس کی حکومت چھیننے آیا تھا۔ اس طرح فہری اور قیسی بھی صرف یوسف اور ابن حاتم کی زبردست شخصیتوں کے باعث ان کے ساتھ تھے، ورنہ وہ بھی خاندان بنو امیہ کے اس شہزادے کو پسند کرتے تھے۔ عبدالرحمٰن الداخل کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ اس کے اعلیٰ اخلاق کی شہرت پہلے سے ہی اندلس میں ہو چکی تھی، اور عبدالملک بن قطن کے عہد امارت میں بعض شخصوں نے دمشق سے آ کر وہاں کے جو حالات بیان کیے تھے ان میں عبدالرحمٰن کو بنو امیہ کے اندر سب سے بہتر نوجوان بتایا اور یہ بھی بیان کیا کہ اس کو حجازی اور یمنی عربوں سے بہت ہمدردی ہے۔ اس شہرت نے اس وقت بڑا کام دیا اور ان لوگوں نے بھی جو بنو امیہ کے مخالف

تھے، عبدالرحمٰن کو محبت کی نگاہ سے دیکھا۔

آخر کار ابن حاتم اور یوسف دونوں طلیطلہ سے قرطبہ کی جانب روانہ ہوئے، ادھر سے عبدالرحمٰن الداخل اپنی جمعیت کو لے کے قرطبہ کی طرف بڑھا۔ دریائے وادیٔ الکبیر کے کنارے قرطبہ کے متصل میدان مصارت میں دونوں فوجوں کا مقابلہ عیدالاضحیٰ کے روز یعنی ۱۰ رذی الحجہ سنہ ۱۳۸ھ مطابق ۱۴ رمئی سنہ ۷۵۶ء کو ہوا۔ بڑی خون ریز جنگ صبح سے شام تک رہی۔ آخر عبدالرحمٰن الداخل کو فتح نصیب ہوئی۔ امیر یوسف بن عبدالرحمٰن کا بیٹا عبدالرحمٰن اور دوسرے سردار گرفتار ہوئے، لیکن ابن حاتم اور یوسف دونوں بچ کر نکل گئے۔ ابن حاتم نے مریدہ میں اور یوسف نے جیان میں پناہ لی۔ عبدالرحمٰن الداخل اس میدان سے روانہ ہو کر قرطبہ میں داخل ہوا اور اعلان کیا کہ جو شخص اطاعت کا اقرار کرے گا اس کو کوئی آزار نہ پہنچایا جائے گا۔ لوگوں نے بطیّب خاطر اطاعت کا اقرار کیا۔ ابن حاتم اور یوسف نے پھر فوجیں فراہم کیں لیکن آخر کار اطاعت ہی پر رضا مند ہو گئے۔ عبدالرحمٰن الداخل نے ان کو اس شرط پر امان دی کہ وہ قرطبہ ہی میں سکونت اختیار کریں گے اور روزانہ ایک مرتبہ عبدالرحمٰن الداخل کے ہاں حاضر ہو کر اپنی صورت دکھایا کریں گے۔ بس اس کے بعد سے عبدالرحمٰن الداخل اور اس کی اولاد کی حکومت اندلس میں شروع ہوئی اور عہد امارت یعنی اندلس کی اسلامی حکومت کا پہلا دور ختم ہو گیا۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اندلس کا ملک مرکز خلافت یعنی دمشق سے بہت زیادہ فاصلے پر واقع تھا۔ اندلس تک پہنچنے کے لیے مسلمانوں کو قبطیوں اور بربریوں وغیرہ کئی قوموں کو زیر کرنا پڑا تھا۔ مرکز خلافت سے کوئی حکم اندلس پہنچنے میں کئی ہفتے بلکہ کئی مہینے لگ جاتے تھے۔ جس زمانے میں اندلس کو فتح کیا گیا اس زمانے میں بارگاہ خلافت اور مسلمانوں کے نامور سپہ سالاروں اور مدبروں کی توجہ خانگی جھگڑوں میں بہت زیادہ صرف ہو رہی تھی۔ عراق، شام اور ایران کے صوبوں نے مرکزی خلافت کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر رکھا تھا، اس لیے اندلس کی طرف کوئی خاص توجہ منعطف نہ ہو سکی، اس وجہ سے اندلس زیادہ تر گورنر افریقہ ہی کے ماتحت رہا۔ وہاں اگرچہ اس کی اپنی آزاد حکومت نہیں تھی لیکن چونکہ اندلس کی سرسبزی و شادابی کی شہرت عام طور پر ممالک اسلامیہ میں ہو گئی تھی، اس لیے فتح اندلس کے بعد اندلس میں وہ لوگ جن کو حجاز، شام اور عراق میں کوئی خاص خدمت سپرد نہ تھی، اندلس چلے گئے اور وہاں جا کر آباد ہوتے گئے۔ ان نو وارد عربوں کو اندلس میں ایک فاتح قوم کی حیثیت سے نہایت عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ان کو بڑے بڑے معزز عہدے بھی آسانی سے مل جاتے تھے۔ اس لیے جو اندلس گیا وہ پھر واپس نہیں آیا بلکہ وہیں کا ہو رہا۔ افریقہ کے بربری قبائل شروع میں ایک کثیر تعداد میں اندلس پہنچ گئے تھے، اور بعد میں وہ جاتے اور آباد ہوتے رہے، لہٰذا اندلس تھوڑے عرصے ہی میں مسلمانوں کی ایک نو آبادی بن گیا۔ عیسائی لوگ جنھوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی تھی اس ملک کے باشندے تھے جن میں یہودیوں کی بھی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ اس طرح اندلس کی مخلوط آبادی میں مختلف عناصر شامل تھے۔ پچاس سال کے عرصے میں بیسیوں حاکم تبدیل ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانان اندلس

کے دلوں میں آزادی اور خودسری بھی قائم رہی اور شان جمہوریت برابر ترقی کرتی ہوئی نظر آئی۔ عیسائی آبادی کو کسی وقت بھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ ان کے لیے صرف اقرار اطاعت ہی ہر قسم کے مصائب سے نجات کا باعث ہوگیا اور ان کو اقتصادی اور علمی ترقیات کا خوب موقع ملتا رہا۔

شروع شروع میں مسلمانوں میں فتوحات کا جوش غالب رہا اور وہ ملک فرانس کے مرکز تک فاتحانہ پہنچ گئے۔ ابھی یہاں اسلامی حکومت کو قائم ہوئے زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان خانہ جنگیوں نے مسلمانوں کی فتوحات کو روک دیا۔ فرانس کے ان عیسائیوں کو جو مسلمانوں کی حملہ آوری کے خوف سے لرزاں اور ترساں تھے، سوچنے سمجھنے اور اپنی حالت پر غور وفکر کرنے کا موقع مل گیا۔ اس پچاس سالہ دور حکومت میں مختلف قبائل اور مختلف قابلیتوں اور مختلف دل و دماغ کے لوگ اندلس کے امیر ہوتے رہے، تاہم اندلس کی آبادی، سرسبزی اور علوم فنون میں بہت کچھ ترقیات ہوئیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کا وجود اور ان کے کردار کا اعلیٰ نمونہ ہی اندلس کے باشندوں کے لیے کافی تھا، مگر اس سے بھی بڑھ کر اندلس کی رعایا کو یہ فائدہ پہنچا کہ فاتحین نے مفتوحین کی عورتوں سے شادیاں کرنا شروع کر دیں۔ جب مسلمانوں کے گھر عیسائی عورتوں سے آباد ہو گئے تو ذلت اور حقارت کا وہ خیال جو عیسائی مفتوحین کی نسبت مسلم فاتحین کے دلوں میں ہونا چاہیے تھا، خود بخود معدوم ہوگیا۔ مسلمانوں کو عیسائیوں سے ایک گونہ ہمدردی پیدا ہوگئی اور وہ ان کو تعلیم و تربیت اور اعلیٰ اخلاق کی ترغیب دینے لگے یہاں تک کہ فرانس کے بعض حکمران جب آپس میں لڑتے تو اپنے مسلمان ہمسایوں سے فوجی امداد حاصل کیا کرتے تھے۔

شروع شروع میں جب مسلمان سرزمین اندلس میں داخل ہوئے اور عیسائیوں کی گاتھ سلطنت کا چراغ گل ہوگیا تو بہت سے پادری اور پادری مزاج عیسائی اور مسلمانوں کا مقابلہ کرنے والے فوجی سپہ سالار بھاگ بھاگ کر شمال کی جانب چلے گئے۔ اندلس کا جنوبی حصہ، گرم، زرخیز اور خوش سواد زیادہ تھا۔ مسلمان جنوب ہی کی طرف سے اندلس میں داخل ہوئے تھے لہٰذا وہ جنوبی صوبوں میں کثرت سے آباد ہو گئے۔ شمالی حصہ پہاڑی ہونے کے ناطے زیادہ سرد تھا۔ عربوں کو یہ شمالی حصہ پسند نہ آیا اور بہت ہی کم مسلمان اندلس کے شمالی شہروں میں سکونت پذیر ہوئے کیونکہ یہ لوگ گرم ملکوں کے رہنے والے تھے اس وجہ سے سرد حصہ انھیں پسند نہ آیا۔ پھر پہاڑی علاقہ زیادہ زرخیز اور قیمتی بھی نہیں تھا۔ مسلمانوں نے اندلس کو فتح کر کے اپنی حکومت تو قائم کی لیکن اس کو زیادہ محبوب اور قیمتی نہ سمجھا۔ جبل البرتات کے دروں میں وہ مفرورین کا تعاقب کرتے ہوئے پہنچے تھے لیکن گاتھ سرداروں کی جمعیت اور مفرورین کے اجتماع نے جبل البرتات کے شمالی میدان یعنی فرانس کے جنوبی حصے میں مسلمانوں کو دعوت دی تو ایک اور نئے ملک میں سلسلۂ جنگ جاری ہوا جس کا نتیجہ ابھی اسی قدر ظاہر ہونے پایا تھا کہ صوبہ اربونیہ اور شہر ناربون اور اس کے شمالی میدانوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی، لیکن اس کے بعد مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی نے اس کام کو آگے ترقی کرنے نہ دی۔

ایک معمولی غلطی کے بدنتائج:

اسی حملہ آوری اور پیش قدمی کے سلسلے میں ایک معمولی سی فروگزاشت سے مسلمانوں کو انجام کار سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ ہوا یہ کہ امیر عنبسہ نے پلیو نامی ایک عیسائی لیٹرے کو جبل البرتات کے دروں میں ناقابل التفات سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ اس غارت گر نے جب جبل البرتات میں اپنی مستقل قیام گاہ قائم کرلی تو وہ عیسائی جو مسلمانوں کے خوف سے آوارہ پھر رہے تھے، اور وہ پادری جو اپنے ساتھ اندلس کے گرجاؤں سے تبرکات لے کر بھاگے تھے، پلیو کے پاس آ آ کر اکٹھے ہونے لگے۔ اس طرح پلیو کی جمعیت نے اچھی خاصی ترقی کرلی اور وہ پہاڑوں کے مابین ایک نہایت دشوار گزار مقام میں مضبوط ہو کر بیٹھ گئے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ پہاڑ کے جس چند مربع میل رقبے میں پلیو مقیم تھا، اس کے چاروں طرف اسلامی حکومت تھی۔ مغرب کی جانب بھی اسلامی علاقہ تھا۔ پہاڑ کے اس جزیرے میں ان عیسائی متمردین کا استیصال کر دینا کوئی بڑی بات اور دشوار کام نہ تھا۔ وہ ہر طرف سے مسلمانوں کے محاصرے میں تھے، لیکن مسلمانوں کے ہر ایک سردار، امیر اور ہر ایک سپہ سالار نے اس جگہ فوج لے جانا اور حملہ آور ہونا اپنی بے عزتی سمجھی اور اس کو اس حال پر یہ سمجھ کر رہنے دیا کہ اس سے کسی مسلمان کو کوئی نقصان کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ حقیقت بھی کچھ یوں ہی تھی کہ پلیو کو پہاڑ سے نیچے اترنے اور میدانی علاقے میں نکلنے کی کبھی جرأت بھی نہ ہوئی اور نہ ایسی جرأت عیسائیوں کو مسلمانوں کا مقابلہ کرنے میں ہو سکتی تھی، لیکن ان پادریوں نے جو اپنے مذہبی تبرکات لے لے کر پلیو کے پاس پہنچ گئے تھے، پلیو کو ایک مذہبی سردار اور عیسوی تبرکات کا محافظ قرار دیا۔ بارہ تیرہ سال تک وہ اسی چھوٹے سے پہاڑی علاقے میں رہا اور اطراف و جوانب کے عیسائیوں سے اس کو سامان رسد کی امداد پہنچتی رہی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا عیسائیوں میں پلیو کی عظمت، محبت اور شہرت ترقی کرتی گئی اور بہت سے عیسائی تکالیف برداشت کر کے بھی پلیو کے پاس پہنچتے اور تبرکات کی زیارت کرنے کو ضروری سمجھتے رہے۔ پلیو اب ایک لٹیرے سے ایک سپہ سالار اور لیڈر بن گیا۔ مسلمان ہمیشہ یہ سمجھتے رہے کہ چند عیسائی وحشی پہاڑ کی کھوہ میں ہمارے خوف سے اپنی جان بچا کر چھپ گئے ہیں۔ ہماری صورت دیکھ کر فرار ہوتے اور خوف کے مارے ہمارے سایہ سے بھاگتے ہیں ان کو پڑا رہنے دو۔ اس بے اعتنائی، لاپروائی اور کم التفاتی نے ان عیسائیوں میں بتدریج جرأت و ہمت پیدا کر دی اور وہ اپنی چھوٹی سی پہاڑی جائے پناہ کو ایک سلطنت سمجھنے لگے اور انھوں نے پلیو کو اپنا بادشاہ اور دین عیسوی کا محافظ و نگہبان سمجھ لیا۔

پلیو کچھ عرصہ بعد انھی پہاڑوں میں مر گیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے کو انھوں نے اپنا بادشاہ بنایا۔ دو تین سال کے بعد وہ بھی فوت ہو گیا تو پلیو کے داماد الفانسو نامی کو عیسائیوں نے اپنا بادشاہ بنا لیا۔ ادھر مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی اور آپس کے کشت و خون نے مسلمانوں کو شمالی صوبوں میں اور جبل البرتات کے متصلہ علاقوں کی طرف مطلق توجہ نہ کرنے دی۔ اس فرصت سے الفانسو نے بہت فائدہ اٹھایا اور جلیقیہ، ارگوان

اور اربونیہ کے علاقوں سے عیسائیوں کو اس پہاڑی علاقے میں آنے اور آباد ہونے کی دعوت دی۔ جب عیسائیوں نے اپنے سرسبز کھیتوں اور شاداب باغوں اور زرخیز میدانی علاقوں کو چھوڑنا اور زاہدانہ زندگی بسر کرنا پسند نہ کیا تو الفانسو نے اردگرد کے علاقوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیے اور ڈاکہ زنیوں میں صرف لوٹ مار ہی پر اکتفا نہیں کرتا تھا بلکہ عیسائی آبادیوں پر چھاپے مار کر عیسائیوں کو پکڑ پکڑ کے لے جاتا اور اپنے پہاڑی علاقوں میں سکونت اختیار کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ ان عیسائیوں کی نظر بندوں کی طرح نگرانی بھی ہوتی تھی اور وہ کسی طرح اس پہاڑ سے نکل کر بھاگ نہ سکتے تھے۔ پھر ان کے ذہنوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت کے جراثیم داخل کیے جاتے۔ اس طرح جبریہ طور پر ایک آبادی پہاڑ کے اندر قائم کر دی گئی جو ایسٹریاس کے نام سے موسوم ہوئی۔ اور یہی الفانسو کا دارالحکومت بنا۔ یہاں پادریوں کے رات دن کے وعظ وتقریر نے ان گرفتار شدہ عیسائیوں کو بتدریج اس پہاڑی زندگی پر رضا مند کر لیا، اور رفتہ رفتہ یہاں اس قدر آدمی جمع ہو گئے کہ وہ تنگ دامن ان کے لیے کافی نہ رہا۔ اب الفانسو نے جبل البرتات کے شمالی دامن کی طرف اس علاقے میں لوٹ مار مچائی جو مسلمانوں کے قبضے میں تھا، مگر وہ میدان میں جم کر مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم اس نے بتدریج جبل البرتات کے جنوبی دامن سے شمالی دامن تک کا پہاڑی علاقہ اپنے قبضے میں کر لیا اور ایک چھوٹی ریاست قائم کر کے عیسائیوں کے لیے پناہ گاہ بن گیا۔ مسلمان اگرچہ آپس میں لڑ بھڑ رہے تھے لیکن اگر ان کا کوئی ایک سردار چاہتا تو جبل البرتات کے پہاڑی سلسلے میں سے اس کانٹے کو نہایت آسانی سے نکال کر پھینک سکتا تھا۔ لیکن وہ اس حالت میں بھی عزم و ارادہ کرتے تو صوبہ اربونیہ سے آگے ملک فرانس کی فتح کا ارادہ کرتے تھے۔ درمیان کے ایک عیسائی جتھے کو ہی قابل التفات نہیں جانتے تھے جس میں مذہبی تعصب کے دریا موج زن تھے اور جس کو عیسائیوں کے پادریوں نے مسلمانوں کی فطرت سے مخمور اور مدہوش بنانے میں انتہائی جوش و سرگرمی سے کام لیا تھا۔ اس طرح اندلس کے دور امارت میں اندلس کے شمال کو ہی سلسلے میں عیسائیوں کی ایک خود مختار ریاست کی بنیاد قائم ہو گئی جس کا دارالحکومت ایسٹریاس تھا۔ اس عیسائی ریاست کو نہ تو فرانس کی حکومت سے کوئی تعلق تھا، نہ اٹلی کے پوپ سے، لیکن اس کا مذہبی نعرہ سب سے بڑھا ہوا تھا، اور آئین حکمرانی پادریوں کے ہاتھ میں تھا۔ سنہ ۱۳۸ھ میں عبدالرحمٰن الداخل نے اندلس میں داخل ہو کر اندلس کے دور امارت کا خاتمہ کیا، اور اسی سال ریاست ایسٹریاس کا حاکم الفانسو اول فوت ہوا۔

امیر عبدالرحمٰن بن معاویہ الداخل اموی

امیر عبدالرحمٰن الداخل کا تعلق بنوامیہ سے تھا۔ مؤرخین نے بنوامیہ کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ انھوں نے بنوامیہ کے خلفاء کے مثالب کو اپنی کتابوں میں زیادہ اجاگر کیا ہے اور ان کے محاسن کو یا تو بالکل نظر انداز کر دیا یا پھر ان کی طرف کم توجہ کی۔

تاریخ کا اگر گہری نگاہ سے مطالعہ کیا جائے تو خلفائے بنوامیہ کے بعد والے شاہان عالم کے مقابلے میں ان کا درجہ بہت بلند نظر آتا ہے، لیکن مؤرخین نے ان کا مقابلہ خلفائے راشدین سے کیا جو کہ ایک نہایت غلط بات تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ عصر نبوت سے جتنا دور ہوتے گئے معاشرے میں وہ پاکیزگی، متانت، روحانیت اور وہ سادگی باقی نہ رہی جو خلفائے راشدین کے زمانے میں تھی۔ بنوامیہ کے زمانے میں حالات کے نشیب وفراز نے ان کو تمدنی تکلفات پر مجبور کر دیا لیکن پھر بھی ان کے تمدنی تکلفات میں وہ طمطراق نہ تھا جو اس زمانے کے شاہان عجم میں تھا۔ ان کی حکومت میں عربوں کی جملہ خصوصیات پائی جاتی تھیں بلکہ انھوں نے ان اقدار وخصوصیات کے تحفظ کا کلی لحاظ رکھا اور بقول علامہ ابن خلدون ان میں عربی عصبیت پوری طرح موجود تھی۔ بنوامیہ کا دارالخلافہ دمشق (شام) تھا۔ یہ رومیوں کا ملک تھا۔ اگرچہ مسلمان اس سے متاثر ہوئے لیکن پھر بھی وہ ان کے پرتکلف تمدن سے بچے رہے اور مؤرخین اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ ان پر ان کی تہذیب وتمدن کا غلبہ نہ ہونے پایا، لیکن اس کے برعکس بنوعباس عجمی تمدن سے پوری طرح اثر پذیر ہو گئے۔ پھر بنوامیہ کا نظام بسالت اور عربی شجاعت پر قائم رہا۔ پھر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اموی دور خلافت میں فتوحات کو جس قدر وسعت ہوئی، تاریخ اسلام میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

اندلس کی فتح بھی انھیں کا ایک کارنامہ ہے۔ خلافت راشدہ میں اگرچہ اسلام کی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا تاہم مسلمان مجاہدین حدود عرب، دیار شام اور مصر و ایران سے آگے نہ بڑھ سکے، لیکن بنوامیہ کے خلفاء کے دور میں طرابلس، طنجہ، اندلس، چین، برصغیر پاک و ہند، قسطنطنیہ، عراق، تیونس، مراکش، خراسان، فارس، توران، طبرستان، جرجان، سجستان، افغانستان سبھی اسلام کے زیر نگین آ گئے۔ اندلس کی فتح کے ساتھ ساتھ فرانس کی سرحدوں پر بھی مسلمانوں کے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں بلکہ کچھ علاقہ بھی

مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا اور دنیا نے دیکھا کہ بحر و بر میں ان کا کوئی مدمقابل نہ رہا۔ اگر وہ آپس کی خانہ جنگی کا شکار نہ ہوتے تو کیا عجب کہ تمام دنیا پر مسلمانوں کا تسلط قائم ہو جاتا اور بقول لیبان جس طرح عرب تھوڑے عرصے میں ملک کے ایک بہت بڑے حصے پر قابض ہو گئے اسی طرح وہ علوم وفنون پر بھی چھا گئے۔ اور اسی موسیو لیبان نے یہ بھی لکھا ہے:

''خلفائے بنوامیہ کے زمانہ میں شام کا تمدن ایک اعلیٰ درجے پر پہنچ گیا۔ عربوں نے اپنی رعایا کے ساتھ نہایت انصاف اور انسانیت سے برتاؤ کیا اور ان کو پوری آزادی مذہب دے رکھی تھی۔ ان کے عہد میں کلیسا مشرقی اور مغربی دونوں کے رئیس اساقطہ کو اس قدر آرام ملا کہ انھیں اس وقت تک اپنے علوئے حکومت میں ہرگز نصیب نہ ہوا تھا۔ شام کے تمام بڑے شہر بیت المقدس، صیدون، دمشق وغیرہ بہت ہی سرسبز ہو گئے اور حرفت وفلاحت نے بے انتہا ترقی کی۔ فتح ہونے کے ساتھ ہی اس ملک میں اعلیٰ درجے کی ترقی شروع ہو گئی۔ عربوں کو یونان و روم کے علوم کا ایسا ہی جوش پیدا ہو گیا جیسا کہ انھیں لڑنے کا جوش تھا۔ ہر طرف کثرت سے مدارس قائم ہو گئے اور چند روز میں شاگرد استادوں کا مقابلہ کرنے لگے، اور علوم وشاعری اور صنعت میں نمایاں ترقی ہونے لگی، اور دمشق جو بنو امیہ کا دارالخلافہ تھا وہ تجارت کا مرکزی شہر بن گیا۔ یہاں علمی اور حرفتی ترقی کی شہرت دور دور تک تھی۔ طبی مدرسہ اور شاہی محلات تمام عالم میں مشہور ومعروف تھے۔ (تمدن عرب: ص ۱۴۹)

خلفائے بنوامیہ میں ولید کا زمانہ فتوحات کے لیے ایک خصوصی زمانہ ہے۔ اس کے زمانے میں بڑی فتوحات حاصل ہوئیں۔ (تاریخ الخلفاء، سیوطی: ص ۲۲۴) یہ فتوحات ہشام کے زمانے تک وسعت اختیار کرتی رہیں۔ چنانچہ مسعودی نے لکھا ہے:

''ہشام نے عمدہ لباس، عمدہ فرش اور عمدہ آلاتِ حرب وضرب تیار کرائے، اور فوجی کام کے لیے سپاہی تیار کیے اور سرحدوں کو نہایت مضبوط کیا۔'' (مروج الذہب: ۱۲۱/۵)

بنوامیہ کے عہد خلافت میں بھی نظام حکومت شورائی رہا، لیکن ان کے زمانے میں سلطنت اسلامیہ کا دائرۂ عمل چونکہ وسیع ہو گیا تھا اس لیے انھوں نے انتظام حکومت کے لیے پانچ صوبے بنا دیے۔ فوجی نظام کو کمال کی حد تک پہنچا دیا۔ عبدالملک بن مروان نے جبری بھرتی کا قانون نافذ کیا۔ اس عہد میں فوج میں عربی عنصر زیادہ تھا لیکن بلاد اندلس کی فتح اور تسخیر کے بعد بربروں سے بھی خدمات حاصل کی گئیں۔

پولیس کے نظام کو بھی اس زمانے میں وسعت دی گئی۔ پولیس آفیسر کو ''صاحب شرطہ'' کہتے تھے۔ ہشام بن عبدالملک نے اس محکمے کو بہت توسیع دی۔ ایک نیا محکمہ نظام احداث قائم کیا گیا اور خراج وصول کرنے کے لیے باقاعدہ افسر مقرر تھے۔ خراج کا نظم ونسق بنوامیہ نے اعلیٰ پیمانے پر کیا۔ عبدالملک خراج کے بددیانت افسروں کو برطرف کرنے کے بعد نہایت سختی سے ان کی مالی حیثیت کا جائزہ لیتا تھا۔

جزیہ کی رقم ایک معین مقدار کا نام ہے جو ذمیوں سے ان کی جان و مال کی حفاظت کے عوض لی جاتی ہے۔ خراج اور جزیہ میں فرق یہ ہے کہ خراج زمین سے لیا جاتا ہے اور جزیہ جانوں کا ٹیکس ہوتا ہے جو اسلام لانے پر معاف ہو جاتا ہے۔ اس کی مقدار مختلف زمانوں اور مختلف حیثیتوں سے مختلف ہوتی ہے۔ معذور لوگوں کو یہ معاف ہوتا ہے۔ چنانچہ وہاں جزیہ وصول کرنے میں عدل و انصاف اور نرمی کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔

حکومت کا نظام چار بڑے بڑے محکموں میں تقسیم تھا۔ دیوان خراج، دیوان رسل و رسائل، دیوان خاتم، غلہ اور دوسری پیداوار کے انتظام کا محکمہ۔

تمام صوبوں میں عربی زبان رائج نہ تھی۔ عبدالملک نے تمام صیغوں کی زبان عربی کر دی۔ (ادب السلطانیہ: ص ۱۱۰) حجاج بن یوسف کے دفتر میں ایک شخص صالح نامی تھا جس نے دفتر کو فارسی سے عربی میں منتقل کیا ورنہ فارسی اور یونانی میں دفتری کام ہوتے تھے۔ شام میں ولید کے زمانے میں سلیمان بن سعید کاتب نے دفتر کو سریانی سے عربی میں منتقل کیا۔ مصر میں ولید بن عبدالملک کے عہد میں والی مصر عبداللہ بن عبدالملک نے ابن یربوع فزاری حمصی سے قبطی سے دفتر عربی میں ترجمہ کرائے۔ اس طرح تمام دفاتر مختلف زبانوں سے عربی میں منتقل ہو گئے۔

محکمۂ قضاۃ بھی پوری طرح قائم تھا۔ دارالخلافے کے لیے قاضی کا انتخاب خلیفہ خود کرتا۔ دوسرے علاقوں میں بھی قاضی دارالخلافے سے منتخب ہو کر جاتے تھے۔

ملک کا انتظام نہایت اعلیٰ قسم کا تھا۔ رعایا کی فلاح و بہبود کا پورا پورا انتظام کیا گیا تھا۔ تمام ملک کی تمدنی اور معاشرتی حالت درست تھی۔ زراعت کا انتظام نہایت معقول تھا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ذرائع آب پاشی کو نہایت ترقی دی۔ مدینہ طیبہ اور اس کے اطراف میں بہت سی نہریں جاری تھیں۔ پہاڑوں کی بعض گھاٹیوں کے گرد بند بندھوا کر ان کو بھی تالاب کی صورت میں بدل دیا گیا جن میں پانی جمع ہوتا تھا اور اس سے زراعت کی پیداوار کو بہت ترقی ہوئی۔ چنانچہ ان نہروں کے ذریعے سے ڈیڑھ لاکھ وسق خرما اور ایک لاکھ وسق گندم کی پیداوار ہوئی۔ سلیمان بن عبدالملک نے مکہ میں میٹھے پانی کا ایک چشمہ جاری کرایا جس کا پانی نل کے ذریعے مسجد الحرام تک پہنچایا جاتا تھا۔ یہ پانی ایک فوارے کے ذریعے ایک پتھر کے حوض میں گرتا تھا جو رکن اور اسود اور زمزم کے درمیان تیار کرایا گیا تھا۔ ہشام نے بھی مکہ مکرمہ کے راستہ میں کئی حوض اور تالاب تیار کرائے۔ یزید نے بصرہ کے لوگوں کے لیے نہر عمر کے نام سے ایک نہر کھدوائی۔ بنی امیہ کے عمال نے بصرہ میں نہریں کثرت سے کھدوائیں۔

ولید بن عبدالملک نے رفاہ عام کے جہاں اور بہت سے کام کیے وہاں عرب کے پہاڑی علاقوں میں راستوں کو ہموار کرایا اور جگہ جگہ پر کنویں کھدوائے۔ بنو امیہ کے عہد میں مختلف شہروں میں مہمان خانے تعمیر کروائے گئے اور مریضوں کے علاج معالجے لیے ہسپتال بنوائے گئے۔ (یعقوبی: ۳۴۸/۲) یتامیٰ، گداگروں اور

اپاہجوں کے لیے وظائف جاری کیے گئے۔ یتیموں کی تعلیم و تربیت کے لیے استاد، اندھوں کی راہ نمائی کے لیے آدمی اور اپاہجوں کی خدمت کے لیے خدام دیے جوان کی ضروریات زندگی کو پورا کرتے تھے۔ عہد اموی میں شاندار عمارتیں بنوائی گئیں کیونکہ یہ وقت کا تقاضا تھا۔ عبدالملک فاتح ہونے کے علاوہ فن تعمیر کا مربی تھا۔ اس نے مدینہ کی مسجد نبوی اور یروشلم میں قبۃ الصخریٰ اور مسجد اقصیٰ مصر کے سات سالہ خراج کے خرچ سے تعمیر کروائیں۔

(تمدن عرب: ص ۷۳)

ان مساجد کی تعمیر کے لیے عبدالملک نے شاہ روم کو معماروں کے لیے لکھا۔ اس کے بیٹے ولید نے مسجد اقصیٰ کو ترقی دی اور جامع مسجد دمشق پر آٹھ کروڑ ۳۴ لاکھ روپے صرف کیے اور مسجد نبوی ﷺ کی توسیع و تعمیر کروائی۔ اس کو عمارات اور قلعے وغیرہ بنوانے کا بہت شوق تھا۔ (آداب السلطانیہ: ص ۱۱۴)

حجاج بن یوسف ثقفی نے عبدالملک کے عہد خلافت میں کوفہ اور بصرہ کے درمیان ''واسط'' نامی شہر بسایا۔ سلیمان نے رملہ آباد کیا، محل تعمیر کرایا، مسجدیں اور کنویں بنوائے اور تالاب کھدوائے جن سے زراعت کو خاصی ترقی ہوئی۔ عقبہ بن نافع نے قیروان (افریقہ) آباد کیا جو کئی سالوں تک افریقہ اور اندلس کا صدر مقام رہا۔ محکمہ ڈاک قائم کیا گیا۔ اس غرض کے لیے مختلف مقامات پر تیز رفتار گھوڑے بارہ بارہ میل پر مقرر تھے جن کے ذریعے سے خبر رسانی میں بہت آسانیاں پیدا ہوئیں۔ دیوان خاتم کے نام سے ایک محکمہ قائم کیا گیا۔ اس محکمے سے فرمان صادر ہوتے اور ان کی باضابطہ دفتر میں نقل رہتی۔ فرمان پر مہر لگتی۔ زیاد نے اپنی گورنری کے عہد میں اس محکمہ کو بڑی ترقی دی۔ فرامین لکھنے کے لیے بڑے فصیح عرب حضرات کو مقرر کیا گیا۔ عبدالملک نے رومی سکوں کے بجائے سونے کا دینار اور چاندی کا درہم اپنے نام سے تیار کروایا۔ پہلی ٹکسال دمشق میں قائم ہوئی۔ پھر دوسرے کئی شہروں میں ٹکسالیں قائم کی گئیں۔

صنعت و حرفت میں اموی دور میں بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ کپڑے کے کارخانے قائم ہوئے۔ لکھا ہے کہ اس زمانے میں یمن، کوفہ، اسکندریہ اور دوسرے کئی ایک شہروں میں رنگین اور عمدہ کپڑے بننے کے کارخانے قائم کیے گئے اور لوگوں نے ان کپڑوں کے جبے، چادریں، پاجامے، عمامے اور ٹوپیاں بنوا کر پہنیں۔

(مروج الذہب: ۶۱۱/۱)

حکومت کی طرف سے ایک محکمہ دیوان طراز کے نام سے قائم کیا گیا۔ یہ محکمہ شاہی پارچہ بافی اور ان کے اسماء والقاب کو خوش نما بننے کے لیے کارخانوں میں انتظام کرتا اور اہل حرفہ کی تنخواہ کی تقسیم بھی اسی دفتر سے متعلق تھی۔ پارچہ بافی کے کارخانوں کے علاوہ کاغذ سازی کے کارخانے بھی قائم کیے گئے۔ سنہ ۸۸ھ میں یوسف بن عمر نے مکہ مکرمہ میں روئی سے کاغذ بنانے کا کارخانہ قائم کیا۔ موسیٰ بن نصیر نے مغرب کے علاقے میں کاغذ بنانے کا طریقہ رائج کیا۔ دیگر چیزوں کے علاوہ ریشم سے بھی کاغذ بنایا جاتا تھا۔ اسی دور میں ایسے کاغذ بھی تیار ہونے لگے تھے جس میں آدمی کو اپنا چہرہ تک نظر آ سکتا تھا۔

غرض کہ رعایا کی خوش حالی اور رفاہ عامہ کے لیے اس عہد میں بہت سے کام کیے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ نہایت فارغ البالی سے اپنی زندگی بسر کرنے لگے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے صرف اڑھائی سال حکومت کی لیکن اس مختصر مدت میں فارغ البالی کی یہ حالت تھی کہ لوگ ان کے عمال کے پاس کثرت سے مال لے کر آتے تھے کہ یہ فقراء اور مساکین کو دے دیں لیکن کوئی لینے والا نہیں تھا اور ان کو اپنا مال واپس لے کر جانا پڑتا۔ لکھا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کا دور حکومت دنیا کے کل بادشاہوں سے زیادہ کامیاب رہا۔ طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے حکم دیا کہ مستحقین میں صدقہ تقسیم کیا جائے لیکن دوسرے سال دیکھا گیا کہ جو لوگ صدقہ قبول کرتے تھے وہ خود صدقہ دینے کے قابل ہو گئے۔ رعایا کی خبر گیری خلیفہ خود کرتا تھا اور رعایا کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ دی جاتی۔ اشیاء کے نرخ کی نگرانی بھی خلیفہ خود کرتا۔ ولید خود بازاروں میں جا کر چیزوں کی قیمتیں طے کر کے مقرر کرتا۔

اموی خلفاء کے دور میں علوم و فنون میں بہت ترقی ہوئی۔ قرآن حکیم پر اعراب ان کے زمانے میں لگائے گئے۔ (ابن خلکان تذکرہ حجاج بن یوسف) حفظ قرآن کی وسیع پیمانے پر ترویج کی گئی۔ ولید بذات خود لوگوں کو حفظ قرآن کی ترغیب دیتا۔ حفاظ کو فیاضانہ صلے عطا کرتا۔ (عقد الفرید اخبار ولید)

تفسیر اور تدوین حدیث کا انتظام و انصرام بھی بنو امیہ کے دور میں ہوا، اور تفسیر کی پہلی کتاب سعید بن جبیر اسدی نے عبدالملک کے حکم سے لکھی۔ عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عہد خلافت میں ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم کو حدیث لکھنے کے لیے کہا۔ فرمایا: ''میں ڈرتا ہوں کہ کہیں علم حدیث مٹ نہ جائے اور علماء فنا نہ ہو جائیں۔''
(بخاری کتاب العلم)

ابن شہاب زہری کو بھی احادیث نبویؐ جمع کرنے کا حکم دیا۔ مغازی میں کتاب تالیف کی گئی۔ سعد بن ابراہیم قاضی مدینہ فرماتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے ہم کو احادیث جمع کرنے کا حکم دیا۔ ہم نے دفتر کے دفتر لکھے اور آپ نے ملک میں اس کی نشر و اشاعت کی۔ (زرقانی: ص ۱۰) سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایات کا مجموعہ بھی وہب تابعی نے اسی دور میں تیار کیا، اور روایات ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا مجموعہ ہمام بن منبہ نے تیار کیا جو ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کی کوششوں سے چھپ گیا ہے۔ اصول لغت کی تدوین بھی اسی دور میں ہوئی اور نحو کے قواعد بھی اسی دور خلافت میں ابوالاسد دوئلی نے وضع کیے۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے پوتے خالد بن یزید کو حکومت سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اس نے دینی علوم حاصل کرنے میں سعی بلیغ کی۔ رجاء بن حیاۃ اور شہاب زہری جیسے حضرات اس کے شاگرد تھے۔ خالد نے طب کی علمی کتابوں کے عربی میں ترجمے کروائے۔ خالد علم کیمیا (کیمسٹری) میں بھی بہت ماہر تھا۔ اس نے ایک لیبارٹری بھی قائم کی۔

ابن اثال نے یونانی زبان سے طب کی کئی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ ہشام کے عہد خلافت

میں کئی علوم وفنون کی کتابوں کا یونانی سے عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ عہد بنوامیہ میں شعروشاعری نے بھی فروغ حاصل کیا۔ اس عہد کی شاعری میں بلند اور نازک تخیلات سے عربی شاعری میں ایک لطافت اور سلاست پیدا ہوئی۔ عہد بنوامیہ کی اس علمی اور تمدنی ترقی کو مؤرخین نے نظر انداز کیا ہے جو کہ قابل افسوس ہے۔

بنوامیہ کے عہد میں اس قدر علمی اور تمدنی ترقی ہونے کے باوجود بھی لوگ عباسی تحریک کے دام میں آ کر بنوامیہ کو مسند خلافت سے ہٹانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور بالآخر ابومسلم خراسانی جیسے لوگوں کی کاوشوں سے ابوالعباس عبداللہ سفاح مسند حکومت پر براجمان ہو گیا اور اس نے بنوامیہ کے ایک ایک فرد کو چن چن کر قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ ہزاروں لوگوں کو ناحق قتل کیا گیا۔ آخر کار عبدالرحمٰن بن معاویہ اپنی جان بچانے کے لیے چھپتا چھپاتا افریقہ چلا آیا اور بعد میں یہی عبدالرحمٰن الداخل کے نام سے اندلس میں اموی خلافت کے قیام کا بانی ہوا۔

عبدالرحمٰن بن معاویہ بن ہشام ۱۱۳ھ میں پیدا ہوا۔ عبدالرحمٰن کا باپ معاویہ عنفوان شباب میں سنہ ۱۱۸ھ میں ۲۱ سال کی عمر میں اس جہان فانی سے انتقال کر گیا۔ اس وقت عبدالرحمٰن کی عمر صرف ۵ سال تھی۔ عبدالرحمٰن کے دادا ہشام بن عبدالملک نے اپنے اس پوتے کی نہایت اعلیٰ طریقے پر تعلیم وتربیت کی۔ ہشام کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے بعد اپنے اس پوتے کو اپنا ولی عہد بنائے۔ (خلافت اندلس: ص ۷۵) اس وجہ سے اس شہزادے کو نہایت اعلیٰ قسم کی تعلیم وتربیت دی گئی۔ چنانچہ اپنے کنبے میں عبدالرحمٰن ایک نہایت بلند حوصلہ اور عالی عزم شہزادہ تھا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن کی عمر جب دس سال کی تھی تو ایک روز وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ رضافہ گیا۔ رصافہ قنسرین کے علاقے میں ایک بڑا عالی شان قصر تھا جہاں خلیفہ ہشام اکثر سکونت رکھا کرتے تھے۔ یہ بچے جب اس قصر کے دروازے کے پاس پہنچے تو ادھر سے ہشام کا بھائی مسلمہ گھوڑے پر سوار آ رہا تھا۔ اس نے بچوں کو دیکھ کر گھوڑے کو روکا اور پوچھا: ''یہ کس کے بچے ہیں؟'' بتایا گیا کہ یہ معاویہ مرحوم کے بچے ہیں۔ یہ سن کر مسلمہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور یہ کہہ کر کہ ''یہ معاویہ کے یتیم ہیں'' ملازم کو حکم دیا کہ ان بچوں کو قریب سے دکھاؤ۔ ان بچوں میں سے اسے عبدالرحمٰن سب سے بھلا لگا۔ وہ اس کو اپنے سامنے گھوڑے پر بٹھا کر نہایت شفقت ومحبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اسی وقت اتفاق سے خلیفہ ہشام قصر سے باہر نکلے۔ مسلمہ سے پوچھا کہ یہ کس کے بچے کو گھوڑے پر بٹھا کر لا رہے ہو؟ مسلمہ نے کہا کہ یہ آپ کے مرحوم بیٹے معاویہ کا بیٹا ہے۔ مسلمہ نے ہشام کی طرف جھک کر کہا: ''وہ امر اب عنقریب پیش آنے والا ہے جس کا ذکر میں از روئے علم نجوم کر چکا ہوں، اور یہی بچہ وہ مرد نکلے گا جس کی نسبت آپ کو مجھ سے خاص خاص باتیں معلوم ہو چکی ہیں۔ خلیفہ ہشام نے پوچھا: ''کیا واقعی تم کو اس کا یقین ہے؟'' مسلمہ نے پُر اعتماد لہجے میں کہا کہ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اس بچے کے چہرے اور گردن پر اس بات کی صاف صاف علامتیں موجود ہیں۔ مسلمہ بن

عبدالملک علم نجوم کا بڑا ماہر تھا۔ اس نے عبدالرحمٰن کے چہرے کو دیکھ کر پیش گوئی کر دی تھی کہ یہ ایک عظیم المرتبت انسان ہوگا۔ مسلمہ کی اس پیش گوئی کے باعث خلیفہ ہشام کی نظریں اس پر کچھ زیادہ رہنے لگیں۔ ہشام بچوں کو جو چیزیں بھیجتا، ان میں عبدالرحمٰن کے لیے خصوصی اشیاء بھیجتا۔

شومئی قسمت سے عبدالرحمٰن کی عمر صرف بارہ (۱۲) سال کی تھی کہ دادا کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا یعنی ہشام بن عبدالملک راہی ملک بقا ہو گیا اور اس کے بعد ہشام کا بھتیجا ولید بن یزید تخت خلافت پر بیٹھا۔ ابتداء ہی سے عبدالرحمٰن کے اندر سرداری اور امارت کے آثار موجود تھے۔ وہ ہر قسم کی عادات بد اور خصائل رذیلہ سے یک قلم مبرا اور پاک تھا۔ علاوہ ازیں علوم مروجہ اور آئین جہاں بانی، حق گوئی اور بے باکی سے اسے پوری پوری آشنائی حاصل تھی۔ وقت کے علماء اور امرائے سلطنت کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور ان کی صحبتیں اسے ہر وقت میسر تھیں۔ جوان ہونے کے بعد فنون سپہ گری، جنگی قابلیت اور اہلیت سے بھی اسے پوری پوری واقفیت حاصل ہو گئی۔ بری صحبتوں سے اسے طبعی طور پر نفرت اور اخلاق فاضلہ سے ہمیشہ محبت رہی۔ ویسے دادا نے بڑے پاکیزہ اور صاف ستھرے ماحول میں اور اس کو اپنا ولی عہد بنانے کے پیش نظر اس کی نہایت اعلیٰ تعلیم و تربیت کا خاص طور پر اہتمام کیا تھا۔ اراکین سلطنت اور دمشق کے علماء کی عزت و حرمت کو ملحوظ رکھتے اور اس کو خاندان خلافت کا ایک بہترین اور علم اور آداب علم سے واقف شخص جانتے تھے۔

مؤرخین کے بیان کے مطابق ہشام بن عبدالملک کی وفات کے بعد بنو امیہ کی حکومت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا۔ جب مروان بن محمد کے ہاتھ میں خلافت کی باگ ڈور آئی اور رہی سہی حکومت کا شیرازہ بھی مکمل طور پر بکھر گیا تو ابوالعباس عبداللہ نے براہ راست حکومت سے ٹکر لینے کا ارادہ کیا۔ دوسری طرف شام کی رعایا بھی اموی خلیفہ سے باغی ہو چکی تھی، اہل کوفہ نے ابوالعباس کی اطاعت اور فرمان برداری کسی نہ کسی طریقے سے قبول کر لی تھی اور ان کو سلطنت اسلامیہ کا حق دار سمجھتے ہوئے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی اور وہ بیعت کس طرح کی تھی اس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آ چکا ہے۔ رعایا نے ان کو خلافت اور سلطنت کا حق دار سمجھ لیا۔ اگرچہ اموی خلیفہ نے ابوالعباس کے مقابلے کے لیے سپاہ روانہ کی لیکن فتح اب ابوالعباس کے مقدر میں تھی۔ بالآخر بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان کی افواج کو ابوالعباس مسلسل شکستیں دیتا ہوا دمشق میں داخل ہو گیا۔ چنانچہ سنہ ۱۳۲ھ مطابق ۷۴۲ء میں خلافت بنو امیہ کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا اور بعد ازیں عباسی دور حکومت شروع ہو گیا۔ جونہی عباسی برسراقتدار آئے بنو امیہ کے ہر خاندان اور ہر گھر کو تباہی و بربادی اور قتل و خون ریزی کا سامنا پڑا۔ گویا ''شامت اعمال ما صورت عبداللہ گرفت'' والا معاملہ تھا۔ ابوالعباس عبداللہ نے حکومت کے تاج و تخت پر قبضہ کرتے ہی ممالک محروسہ میں یہ حکم صادر کر دیا کہ بنو امیہ کے خاندان کا ایک شخص بھی پوری سلطنت عباسیہ میں زندہ نہ رہنے پائے۔ اس حکم کی تعمیل میں جہاں کہیں بھی اس خاندان کا کوئی شخص نظر آتا خواہ اس کا حکومت سے تعلق تھا یا نہیں فوری طور پر قتل کر دیا جاتا بلکہ بعض لوگ تو اس شبے میں قتل کر دیے گئے کہ ان کا بنو امیہ سے تعلق

ہے حالانکہ ان کا تعلق نہیں ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود ان کو بھی گردن زدنی قرار دے کر قتل کر دیا جاتا۔

جب پوری مملکت اسلامیہ میں اس طرح کا کشت و خون اور دار و گیر کا عمل ہو رہا تھا، اس وقت عبدالرحمٰن بن معاویہ کی عمر ۲۰ سال تھی۔ دریائے فرات کے کنارے عبدالرحمٰن کی ایک جاگیر تھی۔ جب ملک میں بنوامیہ کا قتل عام ہو رہا تھا، اس زمانے میں عبدالرحمٰن دمشق میں موجود نہیں تھا ورنہ یہ بھی موت کے گھاٹ اتر جاتا۔ یہ اس وقت اپنی جاگیر پر تھا۔ عبدالرحمٰن کو جب یہ معلوم ہوا کہ بنوامیہ اور اس کے ہمدردوں کو چن چن کر قتل کیا جا رہا ہے اور قاتلوں کے دلوں سے رحم کا آخری جراثیم بھی مر چکا ہے۔ اس ہولناک مرحلے پر عبدالرحمٰن ازراہ احتیاط گاؤں کے باہر درختوں کے کنج میں خیمہ نصب کر کے رہنے لگا اس لیے کہ گاؤں پر خدانخواستہ اگر کوئی آفت آئے تو وہ خطرے سے واقف ہو کر اپنی جان بچانے کی فکر کر سکے گا وہ بنوامیہ کا ایک عام فرد نہیں تھا بلکہ شاہی خاندان سے اس کا تعلق تھا اس لیے اس کو زندہ چھوڑنے کا تو خیال تک عباسی سپاہیوں کا ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا بلکہ اس کو قتل کرنے سے ان کو انعام ملنے کی امید ہو سکتی تھی۔

وہ ایک روز اپنے خیمے میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس کا تین چار سال کا لڑکا جو باہر کھیل رہا تھا نہایت خوف زدہ ہو کر خیمے کے اندر بھاگا آیا۔ عبدالرحمٰن اس کے خوف زدہ ہونے کا سبب معلوم کرنے کے لیے خیمے سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ عباسیوں کا سیاہ جھنڈا ہوا میں لہرا رہا ہے اور اس خیمے کی جانب آ رہا ہے۔ تمام گاؤں میں ہلچل مچی ہوئی اور ایک افراتفری کا عالم ہے اور گاؤں کا ہر شخص اپنی جان بچانے کی فکر میں سرگرداں ہے۔ عبدالرحمٰن نے یہ دیکھ کر کہ عباسی لشکر قتل عام کرنے کو پہنچ گیا ہے، وہ اپنے چار سالہ بچے کو گود میں اٹھا کر دریا کی طرف بھاگا۔ ابھی وہ دریا تک نہ پہنچنے پایا تھا کہ دشمنوں نے اس کا تعاقب کیا اور چلا چلا کر کہنے لگے: ''تم بھاگو مت، ہم تمھیں کوئی آزار نہیں دیں گے اور ہر طرح سے تمھاری مدد و اعانت کریں گے۔'' عبدالرحمٰن کے پیچھے پیچھے اس کا بھائی بھی تھا۔ عبدالرحمٰن نے دشمنوں کی ان باتوں کی طرف کوئی دھیان نہ دیا کیونکہ دشمن دشمن ہی ہوتا ہے اور اس کا دل ہمیشہ رحم سے خالی ہوتا ہے، جونہی وہ دریا کے کنارے پہنچا اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ لیکن عبدالرحمٰن کا بھائی دشمنوں کی باتوں کے فریب میں آ کر دریا کے کنارے پر کھڑا ہو گیا۔ وہ رک کر کچھ سوچنے لگا اور پھر مڑ کے پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ دشمنوں نے اس کے قریب پہنچتے ہی تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا۔ عبدالرحمٰن نے مطلق پس و پیش نہ کیا اور دریا میں تیرتا ہوا اور اپنے چار سالہ بیٹے کو چھاتی سے لگائے ہوئے دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ دشمنوں نے دریا میں تیرنے کی کوشش نہ کی، ہو سکتا ہے کہ وہ عبدالرحمٰن کی اہمیت کو نہ پہچانتے ہوں اور اس کو ایک عام آدمی سمجھتے ہوں۔ اس وجہ سے دشمن کے سپاہیوں نے دریا میں تیرنے کی ضرورت محسوس نہ کی اور دریا کے کنارے پر کھڑے ہو کر ہی تماشا دیکھنے لگے۔

دریائے فرات کی موجوں سے بچتا بچاتا اور دشمن کی نظروں سے چھپتا چھپاتا عبدالرحمٰن چل پڑا۔ کبھی کسی گاؤں میں مسافر بن کر ٹھہر جاتا، کبھی کسی جنگل میں کسی درخت کے نیچے پڑا رہتا، غرض کہ بھیس بدل کر اور

اپنے چار سالہ بچے کو ساتھ لیے ہوئے پیدل بڑی بڑی منزلیں طے کرتا ہوا فلسطین کے علاقے میں پہنچ گیا۔ وہاں اتفاقاً اس کے باپ کا غلام بدر اسے مل گیا۔ وہ بھی اسی حالت میں اپنی جان بچاتا اور دشمنوں کی نظروں سے چھپتا چھپاتا مصر کی طرف جا رہا تھا۔ بدر کے پاس عبدالرحمٰن کی ہمشیرہ کے کچھ زیورات اور مال بھی تھا جو اس نے عبدالرحمٰن کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس طرح عبدالرحمٰن کی تنگی مال اور خرچ کی تکلیف دور ہوگئی کیونکہ عبدالرحمٰن کے پاس تو اس وقت پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ اس سے غلام بدر کی وفا شعاری، ایمان داری اور دیانت بھی ثابت ہوگئی۔ اب اس نے مکمل طور پر اپنا بھیس بدل کر اور معمولی سوداگروں کی حالت بنا کر بدر کی معیت میں سفر شروع کیا۔ مصر پہنچ کر بنو امیہ کے حامیوں اور ہمدردوں سے ملاقات ہوئی۔ یہاں چند روز قیام کے بعد عبدالرحمٰن نے افریقہ کا قصد کیا۔ شاید مصر کو بھی اس نے اپنے لیے محفوظ نہ سمجھا۔

عبدالرحمٰن کا افریقہ میں حکومت بنانے کا منصوبہ:

کئی دنوں کا سفر کر کے عبدالرحمٰن اپنے خاندانی غلام بدر کے ہمراہ افریقہ پہنچا۔ گورنر افریقہ کو جب عبدالرحمٰن کی افریقہ آمد کا حال معلوم ہوا تو وہ نہایت عزت واحترام کے ساتھ پیش آیا لیکن اسے چند روز کے بعد یہ معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن تو افریقہ میں اپنی حکومت قائم کرنے میں مصروف ہے۔ دوسری طرف گورنر افریقہ کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مرکز میں اموی خلافت ختم ہو کر عباسی خلافت قائم ہوگئی ہے اور ابوالعباس عبداللہ مسند خلافت پر بیٹھا ہے اور وہ امیوں کا قتل عام کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ سن کر گورنر افریقہ نے بھی عبدالرحمٰن کو گرفتار کر کے عباسی خلیفہ سفاح کے پاس بھیجنے کا ارادہ کیا۔ عبدالرحمٰن کو عین وقت پر اس کے اس ارادۂ بد کی اطلاع ہوگئی، اور وہ اپنے غلام بدر اور بیٹے کو لے کے فوراً روپوش ہوگیا اور پھر موقع پا کر وہاں سے فرار ہوگیا۔ گورنر افریقہ کو جب عبدالرحمٰن کے روپوش ہونے کا علم ہوا تو اس نے اس کی گرفتاری کے لیے گراں قیمت انعام رکھا۔ چنانچہ اس انعام کو حاصل کرنے کے لیے جگہ جگہ عبدالرحمٰن کی تلاش شروع ہوگئی، لہٰذا عبدالرحمٰن کو اپنی جان بچانے کے لیے بڑی بڑی تکالیف اور مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ وہ کئی کئی روز تک بھوکا رہا۔ افریقہ کے مختلف صحراؤں کے گوشوں میں ہفتوں اور مہینوں روپوش رہنا پڑا۔ تاہم پولیس عبدالرحمٰن کو گرفتار نہ کر سکی۔ ایک مرتبہ عبدالرحمٰن نے ایک بربری عورت کی کوٹھری میں پناہ لی اور گرفتار کرنے والے متلاشی وہاں پہنچ گئے۔ وہ بوڑھی عورت عبدالرحمٰن کو بچانا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے عبدالرحمٰن کو ایک کونے میں بٹھا کر اس کے اوپر بہت سے پرانے کپڑے ڈال دیے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کونے میں پرانے کپڑوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اس طرح تلاش کرنے والے سپاہی نظر ڈال کر چلے گئے اور عبدالرحمٰن ان کے آہنی پنجہ سے محفوظ ہوگیا۔ اس افراتفری اور چھپنے چھپانے میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا دستیاب ہونا مشکل ہوگیا۔ غرض اس طرح پریشانی اور تباہ حالی میں چار پانچ سال تک عبدالرحمٰن افریقہ میں چھپتا چھپاتا رہا۔ آخر کار وہ بربری قوم کے قبیلہ زمانے کی ایک شاخ بنونفوسہ میں

پہنچا۔ ان لوگوں کو جب یہ پتہ چلا کہ عبدالرحمٰن کی ماں ہمارے ہی قبیلہ کی ایک عورت تھی تو انھوں نے عبدالرحمٰن کو اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کی طرح اپنے یہاں بطور مہمان رکھا اور اس کو پورا پورا اطمینان دلایا کہ ہم تمھاری ہر طرح حفاظت بھی کریں گے اور موقع آنے پر امداد بھی کریں گے۔ عبدالرحمٰن نے سبطہ میں جہاں قبیلہ بنونفوسہ کی آبادی زیادہ تھی، قیام کیا۔ اس چار پانچ سال کے تجربہ سے عبدالرحمٰن کو پتہ چل گیا تھا کہ گورنر افریقہ سے افریقہ کا ملک چھیننا اور یہاں اپنی حکومت قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ سبطہ میں جا کر اس کو اندلس کے حالات کے بارے میں زیادہ واقفیت حاصل ہوئی کیونکہ یہ مقام جزیرہ نمائے اندلس سے بہت ہی قریبی اور قوی تعلق رکھتا تھا۔ اب عبدالرحمٰن کو یہ معلوم ہوا کہ اندلس میں بدامنی اور باہمی خانہ جنگی موجود ہے اور وہاں کا حاکم یوسف باغیوں کی سرکوبی میں مصروف اور پریشان ہے۔ حالات کے اس قسم کے نشیب و فراز سن کر عبدالرحمٰن کی اولوالعزم طبیعت اور بلند ہمت میں ایک تحریک اور ارتعاش پیدا ہوا۔ اس نے فوراً اپنے غلام بدر کو اندلس بھیجا اور ان لوگوں کے نام جو خلافت بنوامیہ میں سرداری اور عزت و عظمت کا مرتبہ رکھتے تھے اور بنوامیہ کے ہمدرد اور بہی خواہ تھے، خطوط لکھے اور اپنے غلام بدر کو وہ تمام خطوط لکھ دیے اور ان لوگوں تک ان خطوط کو پہنچانے کی تاکید کی۔

عبدالرحمٰن سرزمین اندلس میں:

غلام بدر نے اندلس پہنچ کر ابوعثمان اور عبداللہ بن خالد سے ملاقات کی اور نہایت قابلیت کے ساتھ انھیں اپنی خواہش کے مطابق آمادہ کر لیا۔ ابوعثمان نے شامی اور عربی سرداروں کو اکٹھا کر کے یہ مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا اور وہ سب عبدالرحمٰن کو اموی حکومت کا چشم و چراغ سمجھتے ہوئے اسے اندلس بلانے اور اس کی ہر قسم کی امداد کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ابوعثمان نے بدر کو اپنے گیارہ آدمیوں کے ہمراہ ایک کرایے کا جہاز لے کر سبطہ کی جانب روانہ کیا تاکہ شہزادہ عبدالرحمٰن کو ہماری طرف سے اطمینان دلاؤ اور جس قدر ممکن ہو سکے اسے یہاں لے آؤ۔ یہ بھی ایک انتہائی خوش قسمتی کی بات تھی کہ یہ لوگ جو بنوامیہ کے ہمدرد اور خیر خواہ ہو سکتے تھے، زیادہ تر اندلس کے جنوبی اور مشرقی ساحلوں کی طرف آباد تھے، اس لیے عبدالرحمٰن کو اندلس پہنچنے میں اور بھی آسانی ہوگئی۔ اندلس سے آنے والا یہ جہاز جس میں غلام بدر اندلس کے گیارہ آدمیوں کے ساتھ آ رہا تھا، جب ساحل سبطہ کے قریب پہنچا تو اس وقت عبدالرحمٰن نماز پڑھنے میں مصروف تھا۔ یہ لوگ جہاز سے اتر کر بدر کی راہ نمائی میں عبدالرحمٰن کے سامنے گئے۔ سب سے پہلے اندلس کے گیارہ آدمیوں کے امیر وفد ابوغالب التمام نے آگے بڑھ کر عبدالرحمٰن کو سلام کیا اور مؤدبانہ درخواست کی کہ اہل اندلس آپ کے منتظر ہیں۔ عبدالرحمٰن نے اس کا نام دریافت کیا۔ جب نام سنا تو عبدالرحمٰن خوش ہوگیا اور جوش مسرت سے بے اختیار کہہ اٹھا کہ ہم ان شاء اللہ ضرور غالب ہوں گے۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن نے مطلق کوئی تامل نہ کیا اور فوراً جہاز میں سوار ہوگیا۔ اپنے چند جاں نثاروں کو جو سبطہ میں موجود تھے اور اس سے محبت اور ہمدردی رکھتے تھے، اپنے ساتھ لیا اور اندلس کی

سرزمین کے ساحل پر جا اترا۔ وہاں پہلے سے ہزار ہا لوگ اس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن افریقہ پہنچ کر اپنے غلام بدر اور اپنی بہن ام الاسباغ سے ملا مگر یہاں بھی فضا خراب تھی۔ والیٔ افریقہ عبدالرحمٰن بن حبیب الفہری بنی عباس کا حامی و خیر خواہ اور بنو امیہ کا دشمن اور بدخواہ تھا۔ اس نے بھی بنو امیہ کے افراد کے خلاف ظلم و ستم شروع کر دیے۔ عبدالرحمٰن اپنے ساتھیوں کو لے کر بنی رستم کے پاس فروکش ہوا۔ اس شخص کا تعلق قبیلہ بربر سے تھا۔ عبدالرحمٰن نے یہاں قیام کر کے اندلس کے حالات کا جائزہ لیا کیونکہ اسے یہاں افریقہ کے والی کی بنو امیہ کے خلاف شدت پسندی کے باعث کامیابی کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے خاندان کے افراد اندلس میں علم برداری کے عہدہ پر مامور تھے۔ چنانچہ غلام بدر کے ہاتھ ابو عثمان عبیداللہ بن عثمان اور عبداللہ بن خالد کو خطوط روانہ کیے جن میں وہ تمام احسانات درج تھے جو خلفائے بنی امیہ نے بنو عباس کے ساتھ کیے تھے۔ اس کے بعد اپنے استحقاق حکومت کا اظہار کیا اور ان سے ان کی معاونت کے بارے میں استفسار کیا، اور جن امور پر ان کی کامیابیاں منحصر ہیں، ان کا تذکرہ بھی کیا، اور یہ بھی یقین دلایا کہ آج کل اہل یمن اور بنی مضر میں کچھ تنازعہ ہے، اس وجہ سے وہ آپس کی خانہ جنگیوں میں مصروف ہیں۔ اگر تم لوگ ہماری معاونت کرو گے تو ان شاء اللہ ہم کامیابی سے ہم کنار ہوں گے۔

ابو عثمان کو جب عبدالرحمٰن کا خط موصول ہوا تو اس نے خط پڑھنے کے بعد عبدالرحمٰن کو اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا اور امیر ضمیل ابن حاتم سے بھی مشورہ کرنا چاہا۔ امیر یوسف اندلس کا خود مختار گورنر تھا۔ اس سے اور ابن حاتم سے اس کی کشیدگی تھی۔ ابو عثمان نے ابن حاتم سے اس بات کا اظہار کیا۔ ابوالجوشن ابن حاتم نے امیر یوسف کی شکایت کی اور کہا: ”ہم تمھاری مدد کو موجود ہیں، شہزادہ عبدالرحمٰن کو یہاں اندلس آنے کے لیے کہو۔ میں اس کے اندلس میں داخل ہوتے ہی امیر یوسف کو اس امر پر آمادہ کروں گا کہ وہ عبدالرحمٰن کو شاہانہ استقبال سے شہر میں لائے اور اس کو صحیح پروٹوکول دے اور اپنی بیٹی کا نکاح اس سے کر دے۔ اگر امیر اس پر راضی ہو گیا تو پھر بغیر کشت و خون ہی کے تمھارا مطلب پورا ہو جائے گا اور اگر وہ راضی نہ ہوا تو اسے عہدۂ امارت اندلس سے علیحدہ کر کے تمھارے دوست عبدالرحمٰن کو اندلس کا خلیفہ بنا دیں گے۔ اس قرار داد اور وعدہ وعید کے بعد ابوالجوشن صوبہ طلیطلہ روانہ ہوا۔ ابو عثمان اور عبداللہ بن خالد البیرہ آئے اور انھوں نے راستے میں یہ طے کیا کہ یمانیہ سے مل کر بنی معد سے باہمی چپقلش کرا دی جائے۔ اسی اثناء میں ابن حاتم نے ان کو مطلع کیا کہ میری رائے اب وہ نہیں ہے لیکن ابو عثمان نے ہمت نہ ہاری، ان دونوں نے اس بات کا مصمم ارادہ کر لیا کہ انجام خواہ کچھ ہی ہو شہزادہ عبدالرحمٰن کو اندلس میں بلانا ضروری ہے۔ یمانیہ اور بنی معد میں کچھ روز قبل شقندہ پر جنگ ہوئی تھی جس میں یمانیہ کو شکست ہوئی، اس وجہ سے وہ بھی بنی معد سے انتقام لینا چاہتے تھے۔

گورنر اندلس امیر یوسف شمالی علاقے میں مصروف پیکار تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بنو امیہ کے موالی نے اپنے آقا شہزادہ عبدالرحمٰن کو اندلس میں مدعو کرنے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ انھوں نے ایک جہاز

خرید کر ابو غالب تمام کو گیارہ آدمیوں اور پانچ سو دینار کے ساتھ غلام بدر کی معیت میں شہزادہ عبدالرحمٰن کو اندلس بلانے کے لیے افریقہ روانہ کر دیا۔ عبدالرحمٰن بدر کا شدت سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ قبیلہ بنو نفوسہ سے الگ ہو کر ''بربر قبیلہ'' میں چند روز سے جو بحر متوسط کے ساحل پر واقع ہے، قیام پذیر تھا۔ ایک روز عبدالرحمٰن نماز عصر کے بعد ساحل سمندر پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ اسے کنارے پر ایک جہاز نظر آیا۔ دیکھا کہ ایک شخص اس میں سے کود کر جلد اس کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ عبدالرحمٰن نے تیراک کو پہچان لیا کہ یہ بدر کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ جب وہ قریب آیا تو اس سے پوچھا: ''کیا خبر لائے؟'' اس نے کہا: ''بہت اچھی خبر لایا ہوں'' اور تمام حالات عبدالرحمٰن کو سنا دیئے اور سرداروں کے نام بھی بتائے جو دل سے شہزادہ کی نصرت و امداد کے لیے تیار تھے۔ بدر نے مزید کہا کہ یہ جہاز آپ کو لینے کے لیے آیا ہے۔ ساتھیوں کو شہزادہ کے سامنے پیش کیا گیا، اور ان کے سردار کے بارے میں بتایا کہ یہ ابو غالب تمام بن علقمہ ہے۔ نفح الطیب میں لکھا ہے:

''بدر نے اپنے آقا کے پاس پہنچ کر معاملے کے مستحکم اور استوار ہونے کی خوش خبری سنائی اور تمام بن علقمہ نے بڑھ کر اس کی تائید کی۔ عبدالرحمٰن نے پوچھا: ''تمھارا نام کیا ہے؟'' اس نے کہا: ''تمام'' عبدالرحمٰن نے پوچھا: ''کنیت؟'' کہا: ''ابو غالب'' شہزادہ عبدالرحمٰن نے کہا: ''اللہ اکبر! اب ہمارا تمام کام پورا ہو گیا اور ہم اللہ کے حول اور قوت سے غالب آئے۔'' (ص ۱۸۵)

اپنے ملنے والے بربریوں میں روپیہ تقسیم کیا گیا اور شہزادہ عبدالرحمٰن کو جہاز میں سوار کر کے اندلس روانہ ہوئے۔ جہاز کو رنگ برنگ کی جھنڈیوں سے سجایا گیا۔ چند روز کے سفر کے بعد جہاز اندلس کے ساحل پر پہنچا۔ بندرگاہ بندر المنقاب میں شہزادہ خیریت سے جہاز سے اترا۔ یہ ربیع الاول سنہ ۱۳۸ھ کے اوائل کا واقعہ ہے۔ اندلس کی سرزمین پر شہزادے کا پورے پروٹوکول کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ ابوعثمان، ابو خالد یوسف، ابو عبیدہ، حسین بن مالک کلبی اور دوسرے امرائے بنوامیہ ساحل سمندر پر موجود تھے۔ سب سے زیادہ شہزادے کی آمد کی ابو عبیدہ اور ابن خالد کو مسرت ہوئی۔ شہزادہ باغ الفتین میں اقامت پذیر ہوا جو عبداللہ بن خالد کی نزہت گاہ تھا اور جزونہ اور البیرہ کے درمیان شہر لوشہ سے قریب واقع تھا۔ کچھ دنوں بعد قلعہ طرش میں یہ سب حضرات آ گئے۔ شہزادہ کے اندلس میں آنے کی خبر دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ امیر یوسف کو جب شہزادے کے آنے کی خبر ملی تو اس نے کچھ تحفے روانہ کیے اور اپنے کنبہ میں شادی کا پیغام دیا، لیکن ایک ناگوار واقعے نے صورت حال کو تبدیل کر دیا۔ یوسف نے امیر حاتم سے مشورہ کیا۔ اس نے جواب دیا کہ وہیں چل کر شہزادے سے دو دو ہاتھ کر کے فیصلہ کر لو۔ اس نے کہا: پہلے قرطبہ میں فوج درست کی جائے پھر نبٹا جائے۔ رات سو سواروں کے ساتھ رتبہ آیا۔ یہاں کے لوگ اس کی معاونت کے لیے تیار ہو گئے۔ حاکم شہر عیسیٰ بن مسادو نے اطاعت قبول کر لی۔

یہاں سے شدونہ اور مورد و ہوتے ہوئے یہ لوگ اشبیلیہ میں داخل ہوئے۔ ان شہروں کے حاکم اور سردار اہل یمن اظہار فرمان برداری کر کے اپنی اپنی فوج کے ساتھ شہزادہ عبدالرحمٰن کے لشکر میں شامل ہو گئے۔

شہزادہ اس ملک میں نیا تھا اور ویسے بھی اسلام نے مشورے کا حکم دیا ہے، اس وجہ سے اس نے تمام سرداروں سے مشورہ کیا۔ ان سب نے قرطبہ پر حملے کی رائے دی۔ چنانچہ قرطبہ پر یورش کر دی گئی۔ امیر یوسف مقابلے کے لیے شہر سے باہر نکلا۔ دونوں فوجیں دریائے وادی کبیر کے متصل میدان میں نبرد آزما ہوئیں۔ امیر یوسف کو شکست فاش کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کا بیٹا عبدالرحمٰن بن یوسف گرفتار ہوا۔ ابن حاتم اور امیر یوسف فہری دونوں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ابو الصباح فریب اور دغا دینے پر آمادہ ہوا، لیکن شہزادہ عبدالرحمٰن بہادر اور بلند اقبال تھا، اس لیے ابو الصباح کی چلی نہیں۔ شہزادہ دارالسلطنت قرطبہ کی طرف روانہ ہوا۔ شہر میں داخل ہوا اور اعلان کیا کہ جو شخص اطاعت کرے گا، اس کو معافی ہے اور لوٹنے والوں کو روک دیا گیا آخر کار شہزادہ امیر یوسف کے محل میں داخل ہو گیا۔

محل میں جس قدر مستورات تھیں ان کی حالت بھی خطرناک تھی۔ یمانیہ کے فوجی کچھ لحاظ نہ کرتے تھے۔ یوسف کی بیوی ام عثمان اور اس کی دو لڑکیوں نے عبدالرحمٰن سے امان چاہی۔ ام عثمان نے کہا: ''اے بنی عم! ہمارے ساتھ ایسا ہی اچھا سلوک کرو جیسا اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا ہے۔ عبدالرحمٰن نے جواب دیا: ''آپ کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔''

اس وقت صاحب الصلوٰۃ کو حکم دیا اور موالیانِ یوسف تھے ان کو بلا کر ان کی تمام بیگمات کا سامان دلوایا، اور اس کے بعد یہ ان کے مہمان رہے۔ غرض کہ چند روز ہی میں شہزادہ عبدالرحمٰن اپنے حسن اخلاق کے باعث ہر دل عزیز ہو گیا۔ حتیٰ کہ اس ملک کے بڑے حاکموں نے اس کی بھی اطاعت قبول کر لی۔

(عبرت نامہ اندلس: ۱/۲۹۶)

سابق امیر اندلس اور ابن حاتم پھر مقابل آئے لیکن شہزادہ نے ان دونوں کو رام کر لیا۔ اس کے بعد ۱۳۱ھ میں خلافت اندلس باقاعدہ طور پر شروع ہوئی۔

اندلس کی یہ خلافت عبدالرحمٰن نے اتنی آسانی سے حاصل نہیں کی۔ اس کے لیے اس کو اپنی جان کی بازی لگانی پڑی۔ اندلس پہنچنے پر ہوا خواہانِ بنو امیہ اور اہل شام اس کی آمد کا سن کر دوڑے اور عبدالرحمٰن کی اطاعت و فرمانبرداری کے حلف اٹھائے اور اردگرد کے شہروں اور قصبات پر تو نہایت آسانی سے قبضہ ہو گیا، لیکن ساتھ ہی موسم برسات شروع ہو گیا جس کے باعث یوسف جلد قرطبہ نہ آ سکا۔ اس لیے شہزادہ عبدالرحمٰن کو یوسف کے ساتھ فیصلہ کن جنگ کے لیے سات ماہ کی مہلت مل گئی۔ آخر کار عیدالاضحیٰ کے روز جنگ ہوئی اور دارالسلطنت قرطبہ پر عبدالرحمٰن کا قبضہ ہو گیا۔ جب عبدالرحمٰن کو اس لڑائی میں فتح حاصل ہوئی تو یمنی لوگوں کے ایک سردار ابو الصباح نامی نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ یوسف سے تو ہم بدلہ لے چکے ہیں، اب موقع ہے کہ اس نوجوان آدمی یعنی عبدالرحمٰن کو قتل کر دو اور بجائے اس کے کہ یہاں امویوں کی حکومت قائم ہو اپنی قوم کی حکومت قائم کرو، لیکن چونکہ عبدالرحمٰن کے لشکر میں شامیوں اور بربریوں کی تعداد کافی تھی اس لیے

یمنی لوگ علانیہ کوئی مخالفت یا بغاوت نہ کر سکے اور خاموش ہو کر خفیہ طور پر عبدالرحمٰن کی ذات پر حملہ کرنے کی تدابیر سوچنے لگے۔ اتفاق سے عبدالرحمٰن کو بھی ان لوگوں کے ان ارادوں کا علم ہوگیا۔ اس نے صرف یہ کیا کہ اپنا ایک باڈی گارڈ یعنی محافظ دستہ قائم کرلیا اور بظاہر چشم پوشی اور عفو و درگزر سے کام لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ چند ماہ بعد ابو الصباح کو اس کی غلطی کی سزا میں قتل کر دیا گیا۔

عبدالرحمٰن الداخل جو ایک نوعمر شہزادہ تھا اور دوسرے اس ملک میں وہ ایک اجنبی تھا اس کو یہاں کے امراء، عمال، رعایا اور یہاں کے قبائل وغیرہ اور ان کی خصوصیات، طرز معاشرت سے پوری آشنائی نہ تھی، لہٰذا اس کی حکومت کے آغاز ہی میں حکومت اور سرداری کے عہدوں پر جو لوگ مقرر و مامور ہوئے تھے، ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جو اہل اندلس کی ناراضی کا باعث ہوئے تھے۔ بعض ایسے اشخاص تھے جن کو یہ توقع تھی کہ ہم کو بڑے بڑے عہدے ملیں گے، لیکن ان کی توقع کے مطابق انھیں وہ عہدے نہیں ملے۔ اس طرح ایک بڑی تعداد ملک میں ایسی پیدا ہوگئی جو عبدالرحمٰن کی حکومت سے بھی کبیدہ خاطر اور پریشان تھی۔ علاوہ ازیں یوسف فہری سابق امیر اندلس اور ضمیل ابن حاتم کے دوست احباب اور متعلقین اور حامی تو بہت ہی ناخوش تھے۔

بغاوتیں:

شہزادہ عبدالرحمٰن بن معاویہ اگرچہ کسی گروہ اور کسی فریق سے کوئی خصوصی تعلق نہیں رکھتا تھا اس لیے وہ سب لوگوں سے خواہ اس کا تعلق کسی قبیلہ یا کسی گروہ سے ہوتا، یکساں برتاؤ کرتا اور یکساں برتاؤ کرنا چاہتا تھا، لیکن جو لوگ پہلے سے اندلس میں اپنی سرداری چمکا رہے تھے، انھیں عبدالرحمٰن کی موجودگی کسی حال میں بھی گوارا نہیں تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ عبدالرحمٰن کو اپنی حکومت کے شروع ہی میں بغاوتوں، سرکشیوں اور شورشوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ یوسف فہری، امیر اندلس معاہدے کے مطابق قرطبہ میں مقیم یا نظر بند تھا۔ قرطبہ پر قابض ہونے کے بعد عبدالرحمٰن کو دو سال تک ملک کے مختلف صوبوں پر تسلط قائم کرنے اور سرکشوں اور شورش پسندوں کو اطاعت پر مجبور کرنے پر صرف کرنے پڑے۔ اسی دوران میں عبدالرحمٰن کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے ہم قوموں کو جہاں کہیں وہ بنوعباس کی شمشیر ظلم شعار سے بچ گئے ہوں، اپنے پاس بلوائے اور ایسے بربریوں کی ایک فوج مرتب کرے جن سے اس کو حمایت اور ہمدردی کی پوری پوری توقع ہو۔ خاندان بنوامیہ کا ایک شخص عبدالملک بن عمر بن مروان بن حکم اور اس کا بیٹا عمر بن عبدالملک عباسیوں کی شمشیر خون ریز سے بچے ہوئے ابھی تک مصر میں موجود تھے۔ انھوں نے جب اندلس پر عبدالرحمٰن بن معاویہ کے قبضے کا حال سنا تو وہ مصر سے روانہ ہوئے اور بنوامیہ کے دس اور آدمی بھی جو ادھر ادھر اپنی جان بچانے کے لیے چھپے ہوئے تھے، ان کے ساتھ شامل ہوگئے تاکہ وہ بھی کسی پرامن جگہ پر اپنی باقی ماندہ زندگی کے ایام مستعار پرسکون طریقے سے گزار سکیں۔ اس طرح بارہ آدمیوں پر مشتمل یہ قافلہ اندلس میں عبدالرحمٰن الداخل کے پاس پہنچ گیا۔ عبدالرحمٰن

اپنے ان رشتہ داروں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ عبدالملک بن عمر کو اشبیلیہ کی اور عمر بن عبدالملک کو مرورو کی حکومت پر مامور کیا۔

اس اجنبی ملک میں عبدالرحمٰن الداخل بالکل تنہا تھا اور اندلس کے مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور گروہوں سے اس کو یہ ہرگز توقع نہ تھی کہ وہ سب کے سب عباسیوں کی مخالفت پر آمادہ ہوسکیں گے۔ اس لیے اس نے اول اول اپنے آپ کو اسی طرح ایک امیر اندلس کی حیثیت میں رکھا جیسا کہ قبل ازیں اندلس کے امیر ہوتے تھے۔ خطبے میں وہ عباسی خلیفہ ہی کا نام لیتا تھا حالانکہ دل سے وہ عباسیوں کا سخت دشمن تھا کیونکہ عباسیوں کے ظلم وستم ہی نے اس کو یہاں تک پہنچایا تھا۔ وہ خود بھی ان کو اپنا دشمن جانتا تھا۔ ان ہم قوم اور ہم قبیلہ بلکہ اپنے نہایت قریبی رشتہ داروں کو اس نے اپنے لیے بہت ہی غنیمت اور نعمت غیر مترقبہ تصور کیا، اور ان کو بڑے بڑے عہدے جو وہ بلا تامل دے سکتا تھا، دیے۔ اندلس میں امیر عبدالرحمٰن کی حکومت قائم ہونے کے بعد فوراً ہی بہت سے ایسے لوگ پیدا ہو چکے تھے جو دل سے عبدالرحمٰن کی حکومت سے خوش نہ تھے۔ اب جب کہ عبدالرحمٰن نے سنہ ۱۴۱ھ میں عبدالملک اور اس کے بیٹے عمر کو اشبیلیہ وغیرہ کی حکومت عطا کی تو ان لوگوں کو آزادانہ اور پہلے سے زیادہ چہ میگوئیوں اور کانا پھوسی کا موقع مل گیا اس طرح بغاوت کی تحریک جلد جلد نشوونما پا کر ایک خطرناک صورت اختیار کر گئی۔

یوسف کا قتل:

ہوا یہ کہ یوسف بن عبدالرحمٰن سابق امیر اندلس کو لوگوں نے مشتعل کیا۔ وہ قرطبہ سے چھپ کر بھاگ نکلا، لیکن اس کے دونوں بیٹے ابو زید عبدالرحمٰن اور ابوالاسود قرطبہ سے نہ نکل سکے بلکہ وہ قرطبہ ہی میں رہ گئے۔ ضمیل بن حاتم یوسف بن عبدالرحمٰن فہری کا وزیر بھی قرطبہ ہی میں رہ گیا۔ وہ قرطبہ سے نہ نکل سکا۔ یہ تینوں گرفتار کر کے قید کر لیے گئے۔ یوسف قرطبہ سے بھاگ کر طلیطلہ پہنچا۔ وہاں قرارداد اور عہد کے مطابق ہر طرف سے لوگ آ کر اس کے گرد جمع ہونے شروع ہو گئے۔ آخر وہ اندلس کا سابق امیر تھا۔ لوگوں میں اس کا خاصا اثر و رسوخ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی بیس ہزار فوجیوں پر مشتمل لشکر اس کے جھنڈے کے نیچے طلیطلہ میں جمع ہو گیا۔ یوسف بن عبدالرحمٰن اس لشکر کے ساتھ اشبیلیہ پر حملہ آور ہوا اور عبدالملک بن عمر کا محاصرہ کر لیا۔ عبدالملک مدافعت پر آمادہ ہو گیا۔ یوسف نے اشبیلیہ کی فتح میں زیادہ وقت صرف کرنا مناسب نہ سمجھا اور اشبیلیہ کا محاصرہ اٹھا لیا اور قرطبہ کی فتح کے ارادے سے قرطبہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ادھر عبدالملک کا بیٹا عمر اپنے باپ کے محصور ہونے کی خبر سن کر اشبیلیہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ دونوں باپ بیٹوں نے مل کر یوسف بن عبدالرحمٰن کی فوج کا تعاقب کیا، دوسری طرف خلیفہ عبدالرحمٰن الداخل کو جب یہ معلوم ہوا کہ یوسف بیس ہزار فوج کے ساتھ قرطبہ پر حملہ کرنے کے لیے آ رہا ہے تو وہ قرطبہ سے نکل کر خود یوسف کی طرف بڑھا۔ راستے میں دونوں فوجوں کا مقابلہ

ہوا۔ سامنے سے عبدالرحمٰن حملہ آور تھا اور پیچھے سے عبدالملک اور عمر آ گئے۔ یوسف کی فوج کے بہت سے آدمی کام آئے۔ یوسف شکست کھا کر بے سروسامانی کے عالم میں طلیطلہ کی طرف بھاگا۔ ابھی وہ طلیطلہ نہیں پہنچا تھا بلکہ اس کے قریب ہی تھا کہ اس کی فوج کے یمنی لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اگر ہم یوسف کو قتل کر کے اس کا سر عبدالرحمٰن الداخل کے پاس بطور علامت لے جائیں تو وہ اس خدمت کے صلے میں ہم کو انعام بھی دیں گے اور ہم سے خوش بھی ہوں گے، اور وہ ہماری اس غلطی اور خطا کو کہ ہم نے بغاوت میں شرکت کر کے یوسف کی معاونت کی ہے، معاف کر دے گا۔ چنانچہ یمنیوں نے یوسف کو طلیطلہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی قتل کر دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ ابن عمر انصاری نے اس کی شمع حیات گل کر دی اور یہ لوگ اس کا سر لے کر عبدالرحمٰن کے ہاں پہنچ گئے۔ اس طرح امیر یوسف فہری کا خطرہ عبدالرحمٰن کے سر سے ہمیشہ کے لیے ٹل گیا۔

تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ امیر یوسف فہری بڑا بہادر، جرأت مند اور نامور سپہ سالار تھا۔ وہ دو مرتبہ اندلس کا امیر رہ چکا تھا۔ اس مرتبہ بھی پہلے تو اس کا خیال یہی تھا کہ امیر کے بجائے اب خلیفہ بنوں۔ چنانچہ اس مرتبہ اس نے فریب کھایا اور لوگوں کی باتوں میں آ کر فضول تگ و دو میں اپنی جان گنوا دی۔ اگر وہ عبدالرحمٰن کے ساتھ تعاون کا ہاتھ بڑھاتا تو وہ اس کی قدر کر کے اس کو کسی صوبے کا گورنر لگا دیتا لیکن زیادہ کی حرص آدمی کو ذلیل و خوار کر کے رکھ دیتی ہے۔

اس تلخ تجربے کے بعد عبدالرحمٰن الداخل کے لیے یہ جائز ہو گیا تھا کہ وہ ضمیل بن حاتم اور یوسف کے دونوں بیٹوں کو قتل کرا دے۔ چنانچہ ابن حاتم اور ابوزید بن یوسف تو قتل کر دیے گئے لیکن ابوالاسود کو اس کی چھوٹی سی عمر کے باعث قرطبہ کے متصل ایک پہاڑی قلعے میں نظر بند کر دیا گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ سلطان عبدالرحمٰن نے ابن حاتم اور یوسف کے لڑکوں ابوالاسود محمد اور عبدالرحمٰن کو نظر بند کر دیا۔ کچھ روز بعد ابن حاتم شراب نوشی کی کثرت کے باعث مر گیا۔ چند ماہ بعد یوسف کے لڑکے نگران کو دھوکہ دے کر فرار ہو گئے۔ عبدالرحمٰن تو چلتے ہوئے گرفتار ہو گیا لیکن ابوالاسود سنہ ۱۶۹ھ تک سلطان کا مقابلہ کرتا رہا اور بالآخر طبعی موت مر گیا۔

یوسف فہری کے فتنہ کے فرو ہو جانے کے بعد باغیوں اور سرکشوں کی ہمتیں جواب دے گئیں اور بظاہر امیر عبدالرحمٰن کا تسلط پورے طور پر اندلس پر قائم ہو گیا۔ فہری خاندان کے سرکشوں کی لاشوں کو دیکھ کر لوگوں پر بظاہر ہیبت طاری ہو گئی لیکن اندر ہی اندر فہریوں کی ہمدردی کا جذبہ بھی پرورش پاتا رہا۔

تاریخ کی کتابوں میں ایک روایت یہ بھی ہے یوسف فہری کا بیٹا ابوالاسود صغرسنی کے باعث قرطبہ کے باہر ایک قلعے میں قید تھا۔ اس نے ایک عرصہ کے بعد اپنے آپ کو نابینا مشہور کیا اور یہ ظاہر کیا کہ میری بصارت جاتی رہی ہے۔ محافظوں نے اسے واقعی اندھا سمجھ کر نگرانی ڈھیلی کر دی۔ وہ صبح کو قلعہ سے باہر ندی کے کنارے قضائے حاجت کے لیے لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا جاتا اور وہاں سے فارغ ہو کر آواز دیتا کہ ہے کوئی اللہ کا بندہ جو اندھے کو راستہ دکھائے اور قلعے تک پہنچا دے۔ اسی وقت اس طرف بہت سے فوجی بھی حوائج ضروریہ سے فارغ

ہونے کے لیے جایا کرتے تھے، ان میں سے کوئی شخص اس مصنوعی اندھے کا ہاتھ یا لاٹھی پکڑ کر قلعے کے دروازے تک پہنچا دیا کرتا تھا۔ اس کے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی نگرانی کرنے والے بالکل بے فکر اور مطمئن ہو گئے کہ یہ کہیں بھاگ کر نہیں جا سکتا۔ ابوالاسود کے پاس اس کا ایک غلام ندی کے کنارے آنے لگا۔ اس کی معرفت ابوالاسود نے اپنے ہمدردوں اور ہواخواہوں کو سلام و پیام بھیجنے شروع کر دیے، اور ایک روز گھوڑوں کی ڈاک بٹھا کر سنہ ۱۶۴ھ میں اس قید سے فرار ہو گیا۔

ملک کا اندرونی نظام:

یوسف فہری کی اس شورش اور بغاوت سے فارغ ہو کر عبدالرحمٰن نے ملک کے اندرونی انتظام کی طرف توجہ کی اور ہر قسم کی شاہانہ علامات فراہم کرنے کے بعد سنہ ۱۴۶ھ میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے عباسی خلیفہ کا نام خطبے سے خارج کر دیا۔ عباسیوں کی خلافت مشرق میں ابھی نئی نئی قائم ہوئی تھی اور ابھی تک وہ مشرق کے جھگڑوں اور فتنوں سے مکمل طور پر فارغ نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے عبدالرحمٰن کے اندلس پر قابض ہونے کا حال سن کر رنجیدہ تو ضرور ہوئے لیکن اس قدر دور دراز علاقے میں کوئی مہم بھیجنا اور ان کے لیے ممکن بھی نہیں تھا اور سود مند بھی نہیں تھا۔ عبدالرحمٰن کا اندلس سے بے دخل کرنا ان کے بس کا کام نہیں تھا، اس لیے وہ اسی کو غنیمت سمجھتے رہے کہ ہمارے نام کا خطبہ وہاں پڑھا جاتا رہے۔

عباسیوں کی اندلس پر فوج کشی:

عبدالرحمٰن جب خود مختاری کا اعلان کرنے کے بعد جب خطبے سے عباسی خلیفہ کا نام ختم کر دیا تو اس سے عباسی خلیفہ منصور کو سخت صدمہ ہوا۔ اس نے علاء بن مغیث سپہ سالار افریقہ کو ایک خط لکھا اور ایک سیاہ جھنڈا بھی اس کے پاس بھیجا کہ وہ فوج لے کر اندلس پر چڑھائی کرے۔ سپہ سالار علاء بن مغیث نے افریقہ سے اندلس کا قصد کیا۔ یہ قصد ابوجعفر منصور کے حکم کی تعمیل میں تھا۔ دوسری طرف اندلس میں یوسف بن عبدالرحمٰن فہری کا ایک رشتے دار ہاشم بن عبدربہ فہری جو طلیطلہ شہر کا رئیس تھا، فہریوں کی عبدالرحمٰن کے ہاتھوں ذلت ونکبت پر نہایت افسردہ خاطر تھا۔ اس نے بہت سے بربریوں کو جو اس کے قریب آباد تھے، لالچ دے کر اپنے ساتھ شریک کر لیا اور وہ لوگ جو فہریوں کی عبرتناک تباہی سے زیادہ متاثر تھے، خود آ کر ہاشم کے پاس اکٹھے ہونے لگے۔

ادھر اندلس میں ہاشم فہری نے عبدالرحمٰن کے خلاف بہت سے لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کر لیا۔ دوسری طرف اس نے علاء بن مغیث کے حوصلے کو بلند کر دیا۔ عبدالرحمٰن الداخل کو افریقہ کی طرف سے اس حملے کے بارے میں مطلق کوئی علم اور اطلاع نہ تھی۔ سنہ ۱۴۶ھ میں ہاشم الفہری نے عبدالرحمٰن کی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور وہ شمالی اندلس پر قابض و متصرف ہو کر طلیطلہ کو خوب مضبوط کر لیا۔ عبدالرحمٰن قرطبہ سے فوج لے

کر اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے روانہ ہوا اور طلیطلہ کا محاصرہ کر لیا۔ طلیطلہ کے باغیوں نے نہایت مستعدی اور جواں مردی سے مقابلہ کیا۔ اس محاصرے نے کئی ماہ تک طول کھینچا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ دوسری طرف علاء بن مغیث اپنی فوجوں کو لے کر دریا کے راستے باجہ کے علاقہ میں اترا۔ اس کے پاس عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کا ارسال کردہ سیاہ جھنڈا اور فرمان موجود تھا۔ اندلس کے باشندے علاء بن مغیث کو خلیفۃ المسلمین کا قائم مقام سمجھ کر اس کے جھنڈے کے نیچے اکٹھے ہونے شروع ہوئے اور امیر عبدالرحمٰن کو خلافت کا باغی سمجھنے لگے۔ امیر عبدالرحمٰن کو جب اس بات کا پتہ چلا تو سخت پریشان ہوا اور بات بھی واقعی پریشانی کی تھی۔ یہ نہایت ہی نازک موقع تھا کیونکہ شمالی اندلس کے باغی ابھی تک قابو میں نہیں آئے تھے کہ جنوبی اندلس میں علاء بن مغیث جیسا طاقتور دشمن داخل ہو گیا اور رعایا اس کی طرف متوجہ ہونے لگی اور عبدالرحمٰن کو حکومت کا باغی اور غدار سمجھنے لگی۔ عبدالرحمٰن نے طلیطلہ سے محاصرہ اٹھا لیا اور نو وارد دشمن علاء بن مغیث کی طرف متوجہ ہوا۔ اشبیلیہ کے قریب قرمونہ کے مقام پر ہی ابھی وہ پہنچا تھا کہ علاء بن مغیث اپنے لشکر جرار کو لیے ہوئے عبدالرحمٰن کے مقابلے میں آ پہنچا۔ علاء کے قریب پہنچتے ہی خود عبدالرحمٰن کی فوج کے بہت سے فوجی علاء بن مغیث کی فوج میں جا کر شامل ہو گئے۔ ادھر طلیطلہ کے باغیوں نے محاصرے سے آزاد ہوتے ہی علاء بن مغیث کی فوج میں شامل ہونے کے لیے سپاہ کی ایک معتد بہ تعداد روانہ کی اور اس طرح اپنی حمایت اور ہوا خواہی کا یقین دلایا۔ ان حالات کے پیش نظر عبدالرحمٰن کو مجبوراً قرمونہ میں محصور ہونا پڑا۔

علاء بن مغیث نے قرمونہ کا محاصرہ کر لیا اور اپنی فوج کے دستوں کو لوٹ مار کے لیے ادھر ادھر بھیجنا شروع کر دیا۔ اندلس کے بربر باشندے اور دوسرے لوگ یہ رنگ دیکھ کر لوٹ مار پر پل پڑے۔ اس طرح تمام اندلس میں قتل و غارت، بدامنی اور انارکی کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ شہزادہ عبدالرحمٰن دو ماہ تک قرمونہ کے قلعے میں محصور رہا۔ سامان رسد ختم ہو جانے کے باعث لوگ بھوک سے مرنے لگے اور کشود کار کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ یاس اور ناامیدی کی اس حالت میں امیر عبدالرحمٰن نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم لوگ بھوک کی شدت سے مرنے یا دشمنوں کے ہاتھوں زندہ گرفتار ہونے کی بجائے کہ اس طرح وہ ہمیں ذلیل و خوار کر کے قتل کریں، لڑ کر اپنی جان دیں اور ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دیں۔ چنانچہ اس وقت آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ روشن کر کے صرف سات سو آدمیوں نے اپنی تلواروں کی نیامیں اس میں ڈال کر جلا دیں جو اس بات کی علامت تھی کہ دشمن سے لڑتے لڑتے مر جائیں گے یا پھر فتح و نصرت سے ہم کنار ہوں گے۔ اس کے بعد قلعے کا دروازہ کھول کر یکا یک دشمن پر پل پڑے۔ محاصر فوج دو ماہ سے قلعے کو گھیرے میں لیے ہوئے پڑی تھی۔ اس کو یہ معلوم تھا کہ محصورین کی تعداد بہت قلیل ہے، اس لیے وہ غافل اور بے فکر تھی۔ چنانچہ ان سات سو بھوکے جانبازوں اور شیروں نے نکل کر اس طرح قتل کا بازار گرم کیا کہ محاصر دشمن اپنی سات ہزار لاشیں قلعہ کے عین سامنے چھوڑ کر بھاگ نکلا اور میدان خالی ہو گیا اور ذرا سی دیر میں اندلس کی

حکومت جو امیر عبدالرحمٰن کے قبضہ اور تسلط سے نکل چلی تھی، پھر اس کے قبضے میں آ گئی۔

تاریخ کی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ اس موقع پر عبدالرحمٰن نے علاء بن مغیث اور عباسی لشکر کے تمام بڑے بڑے جرنیلوں اور سپہ سالاروں کے سر کاٹ کر ہر ایک کے کان میں سوراخ کر کے ان کے ساتھ ایک ایک پرچہ باندھ دیا جس میں اس سردار کا نام اور عہدہ درج تھا۔ پھر ان سروں کو صندوقوں میں بڑی احتیاط کے ساتھ بند کرا کر حاجیوں کے قافلوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اس طرح یہ صندوق مکہ مکرمہ پہنچے اور وہاں سے ایک حجازی نے ان کو ابوجعفر منصور عباسی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ خلیفہ منصور نے جب ان صندوقوں کو کھولا تو جس صندوق میں علاء بن مغیث کا سر تھا، اس میں وہ خط بھی تھا جو منصور نے علاء بن مغیث کے نام اندلس پر حملہ کرنے کے لیے لکھا تھا۔ ساتھ ہی اس سیاہ علم کے پرزے اور دھجیاں بھی تھیں جو منصور نے علاء بن مغیث کے پاس بھیجا تھا۔ منصور نے ان سروں کو دیکھا اور صرف یہ کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ میرے اور عبدالرحمٰن کے درمیان سمندر حائل ہے۔ پھر ایک روز کہا کہ مجھ کو عبدالرحمٰن کی جرأت، ہمت، دانائی اور حسن تدبیر پر حیرت ہے کہ اس نے کس بے سروسامانی کے عالم میں اتنے دور دراز اور دشوار گزار ملک میں جا کر اپنی حکومت و ریاست قائم کی۔

جنگ قرمونہ سنہ ۱۴۶ھ کے اواخر میں ہوئی۔

یہ روایت ہمارے خیال میں نہ روایتاً صحیح ہے اور نہ درایتاً، لیکن اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو یہ دراصل جواب تھا اس خون ریزی اور قتل و غارت کا جو خلیفہ منصور عباسی کے بھائی ابوالعباس عبداللہ سفاح اور اس کے ابومسلم خراسانی جیسے گورنروں نے بنوامیہ کے لوگوں کے ساتھ کی کہ ان کو شہروں اور دیہات سے چن چن کر مارا اور نہ صرف بنوامیہ بلکہ ابومسلم خراسانی کو امام ابراہیم نے حکم دیا تھا کہ کسی عربی بولنے والے کو زندہ نہیں چھوڑنا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابومسلم خراسانی نے اپنے ایرانی آباؤ اجداد کا انتقام ان بے گناہ اور معصوم عربی بولنے والوں سے لیا۔ گویا یہ انتقام جنگ قادسیہ اور جنگ مدائن کا تھا۔ اب اس کا ردعمل یہ تھا جو عبدالرحمٰن نے علاء بن مغیث اور منصور کے دوسرے سپہ سالاروں کے ساتھ کیا۔

فتح قرمونہ کے بعد امیر عبدالرحمٰن نے اپنے غلام بدر اور تمام بن علقمہ کو فوج کو دے کر طلیطلہ کی جانب بھیجا تاکہ وہاں کے باغیوں کا استیصال کیا جا سکے۔ چنانچہ ایک سخت اور خون ریز جنگ کے بعد بدر اور تمام کو طلیطلہ کے باغیوں پر فتح مبین حاصل ہوئی اور ان کے تمام جرنیلوں اور سرداروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان سرداروں کو لے کر جب بدر اور تمام قرطبہ کے قریب پہنچے تو شہر سے باہر ہی ان باغی سرداروں کے سر اور ریش مونڈ کر اور گدھوں پر سوار کر کے شہر کے اندر لایا گیا جہاں امیر عبدالرحمٰن کے حکم سے انھیں قتل کر دیا گیا۔

علاء بن مغیث نے جب علم بغاوت بلند کیا تو بہت سے یمنی قبائل بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر تو عبدالرحمٰن اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں جنگ قرمونہ میں قتل ہو گئے۔ یمنی لوگوں کو اپنے ان مقتولین کا قصاص لینے کی بڑی خواہش اور آرزو تھی۔ چنانچہ اسی سال یعنی سنہ ۱۴۷ھ میں سعید یحصبی نے

جو مطری کے نام سے مشہور تھا، خروج کیا اور شہر لبلہ میں فوجیں اکٹھی کر کے اشبیلیہ پر قابض ہو گیا۔ امیر عبدالرحمٰن کو جب اس خروج اور بغاوت کا پتہ چلا تو قرطبہ سے فوج لے کر مطری کی سرکوبی کے لیے اشبیلیہ کی جانب روانہ ہوا۔ مطری نے اشبیلیہ کے ایک قلعے میں بند ہو کر مدافعت شروع کی اور عبدالرحمٰن نے اشبیلیہ کا محاصرہ کر لیا۔ عتاب بن علقمی شہر شدونہ میں تھا۔ وہ مطری کے ساتھ اس بغاوت میں شرکت کا وعدہ کر چکا تھا۔ چنانچہ مطری کے محصور ہونے کی خبر سن کر عتاب بن علقمی شدونہ سے فوج لے کر روانہ ہوا۔ امیر عبدالرحمٰن کو جب اس خبر کا پتہ چلا تو اس نے اپنے غلام بدر کو فوج کی ایک بٹالین دے کر ابن علقمی کی طرف اس غرض سے روانہ کیا تاکہ وہ عتاب کو مطری تک نہ پہنچنے دے اور دونوں کے درمیان خود حائل رہے۔ ادھر مطری مارا گیا۔ اہل قلعہ نے ایک شخص خلیفہ بن مروان کو اپنا سردار بنا لیا، لیکن آخر کار مجبور ہو کر امن کی درخواست کی۔ عبدالرحمٰن نے اس درخواست کو منظور کرتے ہوئے قلعہ کو مسمار کرا دیا اور خود قرطبہ کی جانب واپس آ گیا۔ اس کے بعد ہی علاقۂ جہان میں عبداللہ بن خراشہ اسدی نے علم بغاوت بلند کیا اور امیر عبدالرحمٰن کے مقابلے کے لیے فوجیں جمع کیں۔ امیر عبدالرحمٰن نے بغاوت کی یہ اطلاع پا کر فوج کی ایک بٹالین اس طرف روانہ کی۔ عبداللہ کے ساتھیوں نے یہ سن کر کہ عبدالرحمٰن کی فوج آ رہی ہے، عبداللہ اسدی کا ساتھ چھوڑ دیا۔ عبداللہ اسدی نے جب اپنی فوج کی یہ علیحدگی دیکھی تو ہوش ٹھکانے آ گئے اور فوراً امیر عبدالرحمٰن سے معافی کی درخواست کی۔ امیر عبدالرحمٰن نے اس کو معافی دے دی۔ سنہ ۱۵۰ھ میں غیاث بن میر اسدی نے علم بغاوت بلند کیا۔ ولایت باجہ کے گورنر نے فوجیں فراہم کر کے اس کا مقابلہ کیا۔ معرکۂ کارزار میں غیاث مارا گیا۔ اس کی فوج شکست کھا کر منتشر ہو گئی۔ عامل باجہ نے غیاث کا سر کاٹ کر ایک بشارت نامے کے ساتھ عبدالرحمٰن کی خدمت میں بھیج دیا۔ اسی سال یعنی سنہ ۱۵۰ھ میں امیر عبدالرحمٰن نے قرطبہ شہر کی شہر پناہ کا سنگ بنیاد رکھا۔

سنہ ۱۵۱ھ میں ایک شخص شقنہ بن عبدالواحد نے جو بربر کے قبیلہ مکناسہ سے تعلق رکھتا تھا اور تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے معلمی کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھا، یہ دعویٰ کیا کہ میں سیدنا حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہوں اور میرا نام عبداللہ بن محمد ہے۔ اس شخص کو عباسیوں کی سازشی کارروائیوں اور کامیابیوں کا علم تھا۔ نیز علویوں کے دعاۃ مکناسہ اور علاقہ بربر میں آتے رہتے تھے جن کا اس کو علم تھا، لہٰذا اس نے اندلس کی حکومت کو درہم برہم کرنے کی جرأت و جسارت کی۔ اس کی یہ اولوالعزمی کچھ زیادہ عجیب نہ تھی کیونکہ بہت جلد بربریوں کی ضعیف الاعتقاد قوم اس کے گرد جمع ہو گئی۔ بربریوں کے علاوہ بعض اور لوگ بھی اس کے معتقد ہو گئے۔ ابن عبدالواحد نے اپنی کچھ کرامات اور خرق عادت باتوں کا بھی ان لوگوں کو یقین دلایا۔ جب اس کے معتقدین کی ایک بہت بڑی اکثریت فراہم ہو گئی تو اس نے امیر عبدالرحمٰن کی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اندلس کے مشرقی صوبہ بلنسیہ کے مقام شیطران پر قابض ہو گیا۔ امیر عبدالرحمٰن یہ خبر سن کر اس کی سرکوبی کے لیے خود قرطبہ سے روانہ ہوا۔ ابن عبدالواحد امیر عبدالرحمٰن کی آمد کا حال سن کر اپنی جماعت کے ساتھ پہاڑوں میں

جا چھپا اور امیر عبدالرحمٰن سے مقابلہ نہیں کیا۔ امیر عبدالرحمٰن قرطبہ کی طرف واپس لوٹ آیا۔ طلیطلہ کی حکومت پر حبیب بن عبدالملک کو مامور کر کے ابن الواحد کی سرکوبی کی ہدایت کی۔ حبیب بن عبدالملک نے اپنی طرف سے سلیمان بن عثمان کو عبدالواحد کی گرفتاری اور سزا دہی کے لیے مامور کیا۔ سلیمان فوج لے کر ابن عبدالواحد کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ ابن عبدالواحد نے مقابلہ کیا اور سلیمان کو گرفتار کر کے قتل کر ڈالا اور اطراف قوریہ میں چلا گیا۔ یہ سلیمان بن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی نسل سے تھا۔ یہ حالت دیکھ کر سنہ ۱۵۲ھ میں امیر عبدالرحمٰن نے قرطبہ سے خود کوچ کیا اور ابن عبدالواحد امیر عبدالرحمٰن کی آمد کی خبر سن کے فوراً پہاڑوں میں بھاگ گیا، اور امیر عبدالرحمٰن پریشان ہو کر پھر واپس چلا آیا۔ سنہ ۱۵۳ھ میں امیر عبدالرحمٰن نے اپنے خادم بدر کو فوج کی ایک بٹالین دے کر روانہ کیا، اور بدر جب قلعہ شیطران کے قریب پہنچا تو ابن عبدالواحد شیطران کو خالی چھوڑ کر پہاڑوں میں چلا گیا۔ سنہ ۱۵۴ھ میں پھر امیر عبدالرحمٰن خود اس کی سرکوبی کے لیے آیا لیکن حسب سابق شقنہ بن عبدالواحد ہاتھ نہ آیا۔

سنہ ۱۵۵ھ میں امیر عبدالرحمٰن نے ابو عثمان عبید اللہ بن عثمان کو ایک زبردست فوج دے کر روانہ کیا لیکن اس مرتبہ بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا بلکہ ابن عبدالواحد نے ابو عثمان کی فوج کے بڑے حصے کو دھوکہ دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا اور کئی شہروں کو لوٹ لیا۔ مجبور ہو کر امیر عبدالرحمٰن سنہ ۱۵۶ھ میں پھر قرطبہ سے خود ہی فوج لے کر روانہ ہوا اور قرطبہ میں اپنے بیٹے سلیمان کو اپنے بجائے حاکم مقرر کر آیا۔ جب وہ قلعہ شیطران کے قریب پہنچا تو خبر ملی کہ یمنی قبائل اور اہل اشبیلیہ نے علم بغاوت بلند کر دیا ہے۔ مجبوراً امیر عبدالرحمٰن شیطران اور ابن عبدالواحد کو ان کے حال پر چھوڑ کر اشبیلیہ کی جانب متوجہ ہوا اور عبدالملک بن عمر کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر اشبیلیہ پر حملہ کرے۔

عبدالملک نے اشبیلیہ کے قریب پہنچ کر اپنے بیٹے امیہ بن عبدالملک کو اہل اشبیلیہ پر شب خون مارنے کے لیے بطور ہراول دستے کے آگے روانہ کیا۔ امیہ نے اہل اشبیلیہ کو ہوشیار پا کر اور ان کی کثرت تعداد کو دیکھ کر شب خون نہ مارا، اور باپ کے پاس واپس گیا۔ عبدالملک نے واپسی کی وجہ پوچھی؟ امیہ سے کہا کہ شب خون غافلوں پر مارا جاتا ہے اور اہل اشبیلیہ ہوشیار تھے اور اس حالت میں حملہ کرنے کا موقع نہیں تھا۔ عبدالملک نے بیٹے سے کہا کہ تو نے موت سے ڈر کر حملہ نہیں کیا تو بڑا بزدل ہے۔ میں کسی بزدل کو محبوب نہیں رکھتا۔ یہ کہہ کر اس نے اسی وقت اپنے بیٹے کی گردن اڑا دی اور پھر اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا کہ تم جانتے ہو کہ ہم لوگ کس طرح قتل کیے گئے اور اب وطن سے بے وطن ہوئے۔ اتفاق سے اس قدر دور دراز فاصلے پر زمین کا ایک ٹکڑا یعنی اندلس ہاتھ آیا ہے جو مشکل سے ہماری گزران کے لیے کافی ہے۔ بزدلی کے ساتھ اس کو بھی ہاتھ سے کھو دینا اور ضائع کرنا کسی طرح شایان شان نہیں ہے۔ مناسب یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کو موت پر ترجیح نہ دیں اور بہادری کے ساتھ لڑ کر مارے جائیں۔ سب فوجیوں نے اس کی تائید کی اور مرنے مارنے کی قسمیں کھائیں۔ پھر انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ عبدالملک نے اپنے بیٹے کو بزدلی کے الزام میں

اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیا تھا، اشبیلیہ میں یمنی قبائل کی نہایت زبردست جمعیت اور کثیر تعداد اور پوری قوت فراہم تھی، اور یہ ان کی طاقت وقوت کی گویا آخری نمائش تھی، لہٰذا اشبیلیہ کو فتح کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا، لیکن اس کو فتح کرنا بھی ہمیشہ کے لیے ایک دردسر تھا۔ آخر کار عبدالملک بن عمر نے اشبیلیہ پر حملہ کر دیا اور اس کی فوج نے اس حملے میں نہایت جواں مردی، جرأت و ہمت اور اتفاق واتحاد سے اس کا ساتھ دیا۔ یہی سب چیزیں فتح و نصرت کی تمہید ہوتی ہیں۔ دونوں طرف کی فوجیں جان توڑ کر لڑیں، بڑی خون ریز بلکہ خوفناک جنگ ہوئی۔ آخر کار اہل اشبیلیہ کو شکست فاش ہوئی۔ عبدالملک اتنی بہادری سے لڑا کہ اس کے جسم پر کئی زخم آئے، لیکن اس نے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارنے میں حیرت انگیز طور پر تیز دستی اور بہادری دکھائی۔ لڑائی کے خاتمے پر جب عبدالملک نے تلوار ہاتھ سے رکھنا چاہی تو اس کی انگلیاں نہیں کھل سکیں اور تلوار ہاتھ سے نہیں چھوٹی۔ اسی حالت میں امیر عبدالرحمٰن بھی موقع پر پہنچ گیا۔ اس نے عبدالملک کے ہاتھ میں خون آلود تلوار دیکھ کر اور لڑائی کی روداد سن کر کہا: ''بھائی عبدالملک! میں اپنے لڑکے ہشام کی شادی آپ کی صاحب زادی سے کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد امیر عبدالرحمٰن نے عبدالملک بن عمر کو اپنا وزیر بنا لیا۔

بعض روایات میں ہے عبدالملک کے بیٹے امیہ نے مخالف فوج کی کثرت تعداد دیکھ کر گھبرا کر پیچھے ہٹنا شروع کیا تاکہ اپنے باپ کی فوج کے ساتھ مل جائے۔ عبدالملک نے دیکھا کہ بیٹا باغیوں کے سامنے سے بھاگ آیا ہے تو سخت غضب ناک ہوا اور بیٹے سے کہا: ''بزدل اور پست ہمت! کیا میں نے اس دن کے لیے تجھے اپنی فوج کے ہراول دستے کا امیر مقرر کیا تھا۔ اہل اندلس اور اہل افریقہ یہ نہیں جانتے کہ ہم نے کس محنت و مشقت سے خونِ جگر دے کر اپنی جان عزیز کے عوض اس ملک کو خریدا ہے۔ یہ کہہ کر اسی وقت بیٹے کو قتل کر دیا اور خود مقابلے کے لیے آگے بڑھا۔ اور ایک جگہ اپنے دوستوں، رشتہ داروں اور افسران فوج کو اکٹھا کر کے یہ کہا:

''کیا ہم سرزمین مشرق سے اس ملک کی انتہا تک بغیر محنت ومشقت کے پہنچ گئے تھے؟ اور کیا ہم نے ان مشکلات کو فراموش کر دیا جو ہم کو اپنی کامیابی و کامرانی اور مختلف فتوحات میں سہنی پڑی تھیں؟ کیا ہمارے جسم میں اس خون کی گردش باقی نہیں رہی جس نے ہم کو ہمیشہ فتوحات اور اپنے ارادوں میں کامیاب کیا تھا؟ اپنی اپنی تلواروں کو میانوں سے نکالو اور مردانہ وار لڑ کر میدان جنگ میں مرنا قبول کرو۔''

عبدالملک کے ان الفاظ نے ہی فوجیوں کو تڑپا کر رکھ دیا اور اس تقریر سے متاثر ہو کر انھوں نے یمنیوں پر اس زور سے حملہ کیا اور اس حملے کے نتیجے میں ایسی خون ریز جنگ ہوئی کہ دونوں طرف کے قریباً تیس (۳۰) افراد میدان جنگ میں کام آئے۔ عبدالملک اگرچہ شدید زخمی ہوا لیکن کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ سلطان کو پتہ چلا کہ عبدالملک نے جنگ کا میدان مار لیا ہے تو اسے انتہائی خوشی ہوئی اور وہ خود زخمی عبدالملک سے ملنے کے لیے آیا۔ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا، اور عبدالملک کو مخاطب کر کے کہا:

''اے بھائی! اس وقت اس فتح کی وجہ سے میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں، تیرے اس خلوص اور تیری

اس جرأت و بہادری کو دیکھ کر میری یہ تمنا اور خواہش ہے کہ میں اپنے بیٹے ولی عہد ہشام کے ساتھ تیری بیٹی کی شادی کر دوں اور اسے اپنی بہو بنالوں۔''

اس جرأت و شجاعت سے لڑائی ہوئی۔ کامیاب اور فتح مند جنگ کے صلے میں سلطان عبدالرحمٰن نے اپنے اس وفا شعار اور ہمدرد امیر کو اپنا وزیر باتدبیر اور مشیر سلطنت بنالیا اور دولت دنیا سے مالا مال کر دیا۔

بعض حضرات نے اس واقعہ کو سنہ ۱۵۱ھ کے ضمن میں درج کیا ہے لیکن دراصل یہ واقعہ سنہ ۱۵۵ھ میں وقوع پذیر ہوا۔

اہل اشبیلیہ کے دو یمنی سردار عبدالغفار بن حامد حاکم شہر نبیلہ اور حیوہ بن فلاقش حاکم اشبیلیہ اور عمرو حاکم بیجہ اس معرکے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انھوں نے پھر اپنے گرد عربی قبائل کو جمع کر لیا۔ تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ لیڈر لوگ شروع ہی سے عوام کو بے وقوف بنا کر اپنے مفادات کے حصول کے لیے انھیں قربانی کا بکرا بناتے رہے ہیں۔ خود میدان جنگ سے فرار ہوتے ہیں جس طرح آج کل کے لیڈر اپنی جانیں بچانے کے لیے یورپ و امریکہ بھاگ جاتے ہیں اور عوام کو مہنگائی، لوڈ شیڈنگ، لوٹ مار ا ور ڈاکوؤں کی نذر کر کے خود عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی اولادیں آکسفورڈ اور کیمبرج وغیرہ میں پڑھتی ہیں اور ان کے ووٹروں کے بچوں کو پاکستانی اسکولوں اور کالجوں میں بھی داخلہ نہیں ملتا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے کو ووٹروں کا نمائندہ ہونا کے دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ جس شخص کی عوام کے ساتھ معاشرت کی کوئی شے نہیں ملتی وہ بھی اپنے عوام کا لیڈر اور نمائندہ ہونے کا دعویدار ہے۔ یہی کچھ اس وقت کے ان تین مفرور سرداروں نے کیا۔ جب تیس ہزار عوام کو میدان جنگ میں مروا کر خود یہ تینوں بھاگ گئے تو اب اپنے گرد عربی قبائل کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ امیر عبدالرحمٰن کو جب ان کی ان کارروائیوں کا علم ہوا تو وہ سنہ ۱۵۷ھ میں خود ان پر حملہ آور ہوا اور انھیں شکست فاش دے کر نہ صرف انھیں بلکہ ان کے ہوا خواہوں کو بھی قتل کر دیا۔ ان واقعات سے امیر عبدالرحمٰن کو عرب قبائل کی طرف سے بڑی بدظنی، بدگمانی اور بے اعتباری ہو گئی۔ چنانچہ اب اس نے عجمیوں اور غلاموں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا تاکہ عرب قبائل کی آئے روز کی بغاوتوں، شورشوں اور سرکشیوں سے امن و سلامتی مل سکے۔ یہی مجبوریاں ممکن ہے کہ عباسی خلفاء کو بھی پیش آئی ہوں گی لیکن انھوں نے پہلے ہی بنوامیہ اور عربوں کو قتل و غارت کر کے بغاوت کے قابل ہی شاید نہیں چھوڑا تھا۔ ابوالعباس عبداللہ اور ابومسلم خراسانی اور دیگر نقبائے دعوت عباسیہ نے جو جو ظلم کیے ان کو سن کر ہلاکو خان اور چنگیز خان کی روحیں بھی شرما جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے ابوالعباس عبداللہ کو تاریخ میں ''سفاح'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے جس کا مطلب ہے ''خون خوار'' اور ''خون ریز۔'' کیونکہ مؤرخ کا قلم بڑا بدلحاظ اور بے رحم ہوتا ہے۔ وہ کسی کو نہیں بخشتا۔ لال مسجد اسلام آباد میں جن لوگوں نے پرویز مشرف کے ظلم و ستم کے باعث اپنی جانیں جان آفریں کے سپرد کی ہیں، مؤرخ کا قلم جب بھی پرویز مشرف کا ذکر کرے گا تو اسے ''سفاک'' اور ''سفاح'' وغیرہ

کے القابات ہی سے یاد کرے گا کیونکہ اب اس کے قلم پر پرویز مشرف کی اقتدار سے محرومی کے باعث کوئی قدغن نہیں۔ اب اس کا اقتدار رخصت ہو چکا ہے۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ عباسیوں نے بھی شاید اسی وجہ سے عربوں پر دوسری قوتوں کو ترجیح دی اور وہ عربوں کی غداری سے ہمیشہ خوف زدہ ہی رہے۔ کیونکہ ان میں کئی لارنس آف عریبیا اور کئی شریف مکہ جنم لے سکتے ہیں۔ یہ عربوں کی غداری ہی تھی کہ خلافت اسلامیہ ختم ہوگئی اور نتیجتاً مسلم دنیا ٹکڑے ہو کر رہ گئی۔

سنہ ۱۶۰ھ میں امیر عبدالرحمٰن نے ایک لشکر ابن عبدالواحد کی طرف روانہ کیا۔ اس نے جا کر قلعہ شیطران کا محاصرہ کیا اور ایک ماہ محاصرہ رہنے کے بعد بے نیل مرام واپس آیا۔ آخر سنہ ۱۶۲ھ میں ابن عبدالواحد قلعہ شیطران سے نکل کر علاقہ شنت بریہ کے ایک گاؤں میں آیا۔ اس کے ساتھیوں نے اس کی کارروائیوں سے تنگ آ کر اس کو قتل کر ڈالا۔ قتل کرنے والے اس کے دو ساتھی ابو معین اور ابو حریم تھے اور وہ اس کا سر بطور علامت لے کر امیر عبدالرحمٰن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس طرح اس عظیم اور خطرناک فتنے کا عرصہ دراز کے بعد خاتمہ ہو گیا۔

مختلف مؤرخین نے لکھا ہے کہ ابھی تک ابن عبدالواحد اپنے دو ساتھیوں کے ہاتھوں قتل نہیں ہوا تھا کہ سنہ ۱۶۱ھ میں عبدالرحمٰن بن حبیب فہری نے افریقہ میں فوجیں آراستہ کر کے اندلس پر قبضہ کرنے کے ارادہ سے چڑھائی کی اور تدمیر کے میدان میں پہنچ کر قیام کیا۔ یہاں اندلس کے بہت سے بربری آ کر اس کے جھنڈے تلے اکٹھے ہو گئے۔ عبدالرحمٰن بن حبیب نے سلیمان بن یقظان والی برشلونہ کے پاس پیغام بھیجا کہ تم خلافت عباسیہ کی اطاعت قبول کر لو ورنہ مجھے اپنے سر پر پہنچا ہوا سمجھو۔ سلیمان نے عباسیوں کی اطاعت کرنے سے یک قلم انکار کر دیا اور عبدالرحمٰن بن حبیب نے سلیمان پر حملہ کر دیا، باہم سخت مقابلہ ہوا اور سلیمان والی برشلونہ نے عبدالرحمٰن بن حبیب فہری کو عبرت ناک شکست دے کر بھگا دیا۔ عبدالرحمٰن بن حبیب نے میدان تدمیر میں آ کر دم لیا۔ امیر عبدالرحمٰن والی اندلس کو جب یہ حال معلوم ہوا تو وہ قرطبہ سے فوج لے کر میدان تدمیر کی طرف روانہ ہوا۔ امیر عبدالرحمٰن کے آنے کی خبر سن کر عبدالرحمٰن بن حبیب فہری کوہ بلنسیہ میں جا کر پناہ گزین ہو گیا۔ امیر عبدالرحمٰن نے اشتہار دے دیا کہ جو شخص عبدالرحمٰن بن حبیب کو پکڑ کر یا اس کا سر کاٹ کر لائے گا اس کو اس قدر انعام دیا جائے گا۔ اس انعام کے مشتہر ہوتے ہی ایک بربری کی نیت بگڑی جو عبدالرحمٰن بن حبیب کے ساتھیوں میں سے تھا، نیت بگڑی اور انعام کے لالچ میں اس نے موقع پا کر عبدالرحمٰن بن حبیب کا سر کاٹ لیا اور امیر عبدالرحمٰن کی خدمت میں لا کر پیش کر دیا۔ پھر اعلان شدہ انعام وصول کر کے چل دیا۔ یہ سنہ ۱۶۲ھ کا واقعہ ہے۔ عبدالرحمٰن بن حبیب کے مارے جانے پر اس مہم کا خاتمہ ہو گیا لیکن آگے کئی مہمات اس کی منتظر تھیں۔ امیر عبدالرحمٰن اس مہم کا خاتمہ کر کے قرطبہ واپس آ گیا۔

ابھی اس مہم کے اختتام کو چند ماہ ہی گزرے تھے کہ سنہ ۱۶۳ھ میں دحیہ غسانی نے علاقۂ البیرہ کے ایک

قلعے میں جاگزیں ہو کر امیر عبدالرحمٰن کی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ امیر عبدالرحمٰن نے شہید بن عیسیٰ کو اس کی سرکوبی کے لیے مامور کیا۔ شہید بن عیسیٰ نے اس باغی غسانی کو شکست دے کر قتل کر ڈالا۔ اس کے چند روز بعد بربریوں نے سر اٹھایا اور ابراہیم بن سجرہ کی زیر قیادت علم بغاوت بلند کیا۔ امیر عبدالرحمٰن نے ابراہیم بن سجرہ کی سرکوبی پر اپنے غلام بدر کو مامور کیا۔ بدر نے ابراہیم کو قتل کر کے بربریوں کی جمعیت کو منتشر کر دیا۔ انھی دنوں سلمیٰ نامی ایک سپہ سالار نے قرطبہ سے فرار ہو کر طلیطلہ کا رخ کیا اور طلیطلہ پر قبضہ کر کے علم بغاوت بلند کیا۔ امیر عبدالرحمٰن نے اپنے جرنیل حبیب بن عبدالملک کو سلمیٰ کی سرکوبی پر مامور کیا۔ حبیب نے جا کر طلیطلہ کا محاصرہ کر لیا اور عرصۂ دراز تک یہ محاصرہ جاری رہا۔ آخر کار سلمیٰ کا محاصرے کی حالت ہی میں انتقال ہو گیا اور اس کے تمام ساتھی جن کو اس نے بیوقوف بنا کر اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا، منتشر ہو گئے۔

بغاوتوں کے اسباب:

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تھوڑے سے عرصے میں اتنی بغاوتوں کی کیا وجوہات اور اسباب تھے؟ کیا ان کے پیچھے کوئی خفیہ ہاتھ تھا؟ یا وہاں کے لوگوں میں کوئی بغاوت کا مادہ پایا جاتا تھا؟ یا امیر عبدالرحمٰن الداخل کی قیادت اور شخصیت میں کوئی کمی تھی؟ ان مسلسل اور پیہم بغاوتوں کے اسباب اور وجوہات کو ضرور تلاش کرنا چاہیے جنھوں نے ایک خوش اخلاق، اعلیٰ تربیت یافتہ اور شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے شخص کو اطمینان اور چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ اس میں شک نہیں کہ اندلس میں کچھ اس قسم کے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے جن کے ذہنوں میں شرارت اور بغاوت کے جراثیم ہر وقت جنم لیتے رہتے تھے۔ وہ آپس میں بھی ایک دوسرے نہ صرف رقیب تھے بلکہ حاسد تھے اور کسی اجنبی کے زیر فرمان اور زیر حکومت نہیں رہنا چاہتے تھے۔ امیر عبدالرحمٰن الداخل چونکہ ایک غریب الوطن شخص تھا جس کے خاندان کی حکومت وعظمت کا آفتاب مشرق میں غروب ہو چکا تھا، لہٰذا وہ عبدالرحمٰن الداخل کی حکومت کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ تو وہ اسباب ووجوہات ہیں جن کو ہر شخص جانتا ہے لیکن ان کے سوا ایک اور خاص سبب بھی ہے اور دراصل عبدالرحمٰن کی پریشانیوں اور مصیبتوں کا اصلی سبب وہی ہے۔ وہ سبب یہ ہے کہ عباسی خلفاء جنھوں نے بغداد کو اپنا دارالخلافہ بنا لیا تھا، امیر عبدالرحمٰن سے بہت دور تھے۔ ان کی حدود ریاست اور اندلس کے مابین ایک گہرا سمندر حائل تھا۔ وہ عبدالرحمٰن جو ان کے حریف خاندان کا ایک فرد تھا۔ اس خاندان سے انھوں نے مکمل طور پر مشرق میں حکومت چھین لی تھی اور اس خاندان کے ہر فرد کو قتل کرنا اور موت کے گھاٹ اتارنا ان کا مقصد زندگی تھا، وہ کسی صورت بھی اس خاندان کے فرد کی حکومت اور وہ بھی مستقل حکومت، کو کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ عبدالرحمٰن کی حکومت اور طاقت کے حالات کو سنتے تھے، لیکن دور دراز فاصلے پر ہونے کے باعث اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ اور ان دونوں حکومتوں کے درمیان گہرا سمندر بھی عبدالرحمٰن کی حفاظت کرتا۔ عباسیوں نے دو مرتبہ امیر عبدالرحمٰن کی حکومت کو

تباہ و برباد کرنے کے لیے فوج کشی کی اور دونوں مرتبہ اس نے عباسیوں کے سپہ سالاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا بلکہ ایک مرتبہ تو ان کے سروں کو صندوقوں میں بند کر کے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کو بھیجا تا کہ اس کو اپنی ذلت اور ناکامی کا احساس ہو چونکہ عباسی اقتدار کے نشہ میں مخمور تھے اس لیے دو مرتبہ کی فوجی ناکامی کے باعث بالآخر انھیں اپنی ذلت اور ناکامی کا احساس ہو گیا۔ علویوں کی سازشوں اور ممالک مشرقیہ کی پیچیدگیوں نے ان کو فوجی مہم کے ذریعے اور زیادہ تجربہ کرنے کا موقع نہیں دیا اور بالآخر اس معاملے میں ان کی ہمت پست ہو گئی۔ اور انھیں اپنی ذلت ونکبت کا احساس ہو گیا، لیکن انھوں نے امیر عبدالرحمٰن بن معاویہ کی مخالفت میں اسی سازشی طریقے کو استعمال کیا جس کو وہ بنوامیہ کی بربادی اور خلافت دمشق کا تختہ الٹنے میں مشرق میں استعمال کر چکے تھے۔ انھوں نے خفیہ ریشہ دوانیوں کے ذریعے اندلس کے عرب قبائل اور غدارانہ اور باغیانہ خصائل رکھنے والے بربریوں میں عباسیوں کی حمایت اور خلافت عباسیہ کی معاونت پر آمادہ کرنے کا اشاعتی سلسلہ جاری کیا۔ غیر معلوم اور غیر محسوس طریقے پر عباسی مناد اور نقباء اندلس میں آنے جانے لگے اور انواع واقسام کے طریقوں سے اپنا کام کرنے لگے۔ اس طرح اکثر عرب سردار اور بربری نومسلم امیر عبدالرحمٰن کی حکومت کو نیست و نابود کرنے اور عباسی خلیفہ کی نگاہ میں اپنی عزت ومنزلت بڑھانے کے لیے مستعد ہو گئے۔ ان لوگوں نے بار بار بغاوتیں کیں لیکن خود ہی نقصانات اٹھائے کیونکہ عباسی دربار سے کوئی فوجی امداد اندلس کے باغیوں کو نہیں بھیجی جا سکتی تھی۔

اندلس کے ناعاقبت اندیش باغی:

اندلس کے ان ناعاقبت اندیش باغیوں، شورش پسندوں اور سرکش سرداروں نے ایک طرف امیر عبدالرحمٰن کو ملک کی بغاوتیں فرو کرنے کے کام میں الجھائے رکھا جس کی وجہ سے اس کو اپنی حکومت کے استحکام میں دلیری بھی ہوئی اور اسے مختلف قسم کی پریشانیوں سے بھی دوچار ہونا پڑا، اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ایسٹریاس کے عیسائیوں کو جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے اور جو جبل البرتات میں اپنی ایک چھوٹی سی عیسائی ریاست قائم کر چکے تھے اور جس کا مقصد وحید ہی مسلمانوں کی حکومت کو تباہ و برباد کر کے ان سے آزادی حاصل کرنا تھا اور ہر طریقے سے اس اجنبی غیر عیسائی قوت کو ملک سے نکالنا تھا، اس وسیع عرصے میں ان عیسائیوں کو اپنی قوت بڑھانے اور دامن کوہ اور پہاڑی علاقے میں اپنی محدود حکومت کو وسیع کرنے کا موقع مل گیا۔ جس سال امیر عبدالرحمٰن نے اندلس میں قدم رکھا تھا اسی سال عیسائی ریاست کے حاکم الفانسو کا انتقال ہو گیا۔ الفانسو کی جگہ اس کا بیٹا اس عیسائی ریاست کا حاکم بن گیا تھا۔ فردیلہ نے اپنی ریاست کے حدود وثغور بڑھانے، عیسائیوں کو اپنے گرد جمع کرنے اور اپنا ہمدرد بنانے اور آئندہ کے لیے ترقیات کے منصوبے سوچنے کا خوب موقع حاصل کیا۔ ادھر جنوبی فرانس کا صوبہ جو مسلمانوں کے قبضے میں تھا، اس کی طرف متوجہ ہونے اور وہاں کے مسلمانوں کو امداد پہنچانے کا دربار قرطبہ کو موقع ہی نہیں ملا کیونکہ اگر اس طرف فوجیں بھیجی جاتیں اور فرانسیسیوں سے سلسلۂ جنگ شروع کیا

جاتا تو اندلس کا بچانا امیر عبدالرحمٰن کے لیے ناممکن ہو جاتا، لہٰذا وہ صوبہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جب عباسیوں کے ہمدردوں نے آئے روز بغاوتیں اور شورشیں شروع کر دیں تو فرانسیسیوں نے شہر ناربون پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کرلیا۔ چھ سال تک بلا امداد غیرے شہر ناربون کے مسلمانوں نے فرانسیسی فوجوں کا مقابلہ جاری رکھا اور آخر کا نتیجہ یہ نکلا کہ چالیس سال سے زیادہ جنوبی فرانس مسلمانوں کے قبضے میں رہنے کے بعد فرانسیسیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اس میں سب سے زیادہ قصور عباسی حکومت اور اس کے ایجنٹوں کا ہے جنھوں نے امیر عبدالرحمٰن کو اپنی برپا کردہ شورشوں میں مصروف رکھا اور وہ ناربون کے لوگوں کی امداد نہ کر سکا۔

خلیفۂ بغداد کے سپہ سالار عبدالرحمٰن بن حبیب کے مارے جانے کے بعد فرانس میں جو لوگ عباسی سازش کے موید اور ہمدرد تھے ان میں حسین بن عاصی اور سلیمان بن یقظان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں سرقسطہ اور اس کے نواح میں عامل و حکمران تھے۔ شہر سرقسطہ جبل البرتات کے جنوبی دامن میں واقع تھا۔ ان دونوں نے خلیفہ مہدی عباسی سے خط و کتابت کی۔ خلیفہ مہدی بڑا نیک اور بزرگ خلیفہ تھا، لیکن یہ عباسیوں کی سرشت اور فطرت کا تقاضا تھا کہ اس کو بنو امیہ سے نفرت اور امیر عبدالرحمٰن کے اندلس میں برسر اقتدار ہونے پر ملال تھا۔ دربار بغداد سے ان لوگوں کی ہمت افزائی ہوئی اور ان دونوں نے فرانس کے بادشاہ شارلیمین سے خط و کتابت کر کے اس کو ملک اندلس پر حملہ کرنے کی ترغیب دی اور یہ بھی بتایا کہ عباسی خلیفہ مہدی جو تمام عالم اسلام کے دینی اور دنیوی پیشوا ہیں، ان کا بھی یہی منشاء اور عندیہ ہے کہ امیر عبدالرحمٰن کی حکومت کو ختم کر دیا جائے، لہٰذا ہم اور اکثر مسلمانان اندلس آپ کے شریک حال اور ہر طرح معاون و مددگار ہوں۔ شارلیمین کے لیے اس سے بہتر کوئی اور سنہری موقع اندلس کی فتح کا نہ ہوسکتا تھا اور اندلس کی فتح سے بڑھ کر کوئی دوسرا کارنامہ اس کی شہرت و عظمت کے لیے ممکن نہ تھا، مگر وہ صوبہ اربونیہ اور شہر ناربون کے مٹھی بھر بے یار و مددگار مسلمانوں کی ہمت و استقلال اور شجاعت و بہادری سے بخوبی واقف تھا، اس لیے اس نے اندلس پر حملہ کرنے میں عجلت سے کام نہیں لیا بلکہ اچھی طرح اپنی عسکری اور فوجی تیاریاں کیں اور اس کے ساتھ ہی اندلس کے ان باغیوں، شورش پسندوں اور غداروں سے خط و کتابت اور پیغام رسانی جاری رکھ کر ہر قسم کی واقفیت اور جانکاری بہم پہنچائی۔ اس سلسلے میں یہ مناسب سمجھا گیا کہ اندلس کے سابق امیر یوسف فہری کے بیٹے ابوالاسود کو جو قرطبہ کے متصل ایک قلعہ میں نظر بند ہے، آزاد کرایا جائے تا کہ اس کی وجہ سے مسلمانان اندلس کی توجہ امیر عبدالرحمٰن کی مخالفت میں زیادہ کام آسکے۔ ابوالاسود کی رہائی کے بارے میں گذشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو نابینا ظاہر کر کے قید سے فرار حاصل کیا۔ ابوالاسود بھی سنہ ١٦٤ھ میں آزاد اور فرار ہو کر سرقسطہ کے باغیوں میں شامل ہو گیا۔ دوسری طرف شاہ فرانس شارلیمین نے لاکھوں کی تعداد میں فوج اکٹھی کی اور اس وقت کے جدید اسلحہ سے اس کو مسلح کیا، اور اپنی اس فوج کشی کا مقصد اندلس کی سرزمین سے مسلمانوں کا اخراج اور عیسائیوں کی حکومت کا قیام قرار دیا جس سے اس کو عیسائی برادری سے ہر قسم کی امداد حاصل ہو سکی، اسی مہم کے نتیجے میں

عیسائیوں میں امیر عبدالرحمٰن کے خلاف بڑا جوش و ولولہ پیدا ہو گیا۔ شارلیمین نے خود حملہ کرنے سے پہلے باغیان سرقسطہ کو علم بغاوت بلند کرنے کے لیے کہا۔ امیر عبدالرحمٰن کے لیے یہ سب سے زیادہ نازک اور خطرناک موقع تھا کہ اس کی بربادی اور تباہ کاری کے لیے عباسی خلیفہ بغداد کا اخلاقی اثر، مسلمانان اندلس کی عظیم ترین سازش اور بغاوت اور عیسائیوں کی عظیم الشان فوجی اور عسکری تیاریاں سب اس کے خلاف متحد و متفق تھیں، اور امیر عبدالرحمٰن اس خطرے کی پوری پوری کیفیت سے ناآشنا اور ناواقف تھا۔ امیر عبدالرحمٰن نے اپنے ایک سپہ سالار اور بہترین جرنیل ثعلبہ بن عبید کو سرقسطہ کے باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ متعدد لڑائیاں اور جھڑپیں ہونے کے بعد ثعلبہ کو سلیمان بن یقظان نے گرفتار کر لیا، اور اس بات کے ثبوت میں کہ ہم کس قدر طاقتور اور آپ کے ہواخواہ ہیں، ثعلبہ کو شارلیمین کے پاس بھجوا دیا۔ ثعلبہ کی گرفتاری کے بعد اس کی باقی ماندہ فوج بھاگ کر عبدالرحمٰن کے پاس قرطبہ پہنچ گئی اور اس کو باغیوں کی قوت اور طاقت سے باخبر کیا۔

ثعلبہ کی گرفتاری کے بعد ہی شاہ فرانس جو اپنی بے شمار فوج لیے ہوئے جبل البرتات کے اس پار جنوبی فرانس میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھا، روانہ ہوا۔ فوج اس قدر زیادہ تھی کہ جبل البرتات کے ایک درے میں سے نہیں گزر سکتی تھی، لہٰذا فوج کے دو حصے کیے گئے اور پہاڑ کے دو مختلف راستوں سے عبور کر کے سرقسطہ کی فصیل کے نیچے دونوں طرف کی ٹکڑیاں آ کر جمع ہو گئیں۔ اس عیسائی لشکر کی کثرت تعداد اور سرزمین اندلس سے اسلامی اثر و رسوخ کو نیست و نابود کر دینے کی شہرت جب سرقسطہ کے مسلمانوں کے کان میں پڑی تو انھوں نے سلیمان بن یقظان کو لعنت ملامت کی اور اس کو کچھ دینی حمیت و غیرت یاد دلائی اور عیسائیوں کی اپنے دین سے محبت اور ان کی دین اسلام کی دشمنی بیان کر کے اس کے ضمیر کو جھنجوڑا، خصوصاً حسین بن عاصی نے بھی اس انجام کو مسلمانوں کے لیے بہت ہی گراں محسوس کیا اور شہر سرقسطہ کے تمام دروازے بند کر دیے۔ شارلیمین کو جب ان مسلمان قائدین کی غیرت و حمیت میں کچھ بیداری محسوس ہوئی اور اسے یہ احساس ہوا کہ سرقسطہ کے مسلمان میری امداد اور اعانت سے پہلو تہی کر رہے ہیں اور امیر عبدالرحمٰن کے آنے پر ممکن ہے کہ یہ لوگ اس کے ساتھ مل جائیں تو وہ سرقسطہ سے بے نیل و مرام واپس فرانس چلا گیا لیکن واپس جاتے ہوئے اس کا دل بہت بوجھل تھا کہ جس مقصد کے لیے وہ آیا تھا اس میں وہ کامیاب و کامران نہیں ہو سکا۔

چنانچہ شارلیمین واپس ہوا اور جس مقصد کے لیے وہ آیا تھا وہ مقصد عوام کی حمیت و غیرت کے جاگ اٹھنے سے اسے حاصل نہ ہوا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ عوام کی غیرت نے کروٹ لی اور اندلس بچ گیا قائدین اور لیڈروں کی غیرت آج کل کی طرح مردہ اور بے حس رہی۔ جس طرح آج کل کے مسلمان لیڈر اور خصوصی طور پر پاکستان کے قائدین، اسلام دشمن طاقتوں کے چرنوں میں بیٹھنا اور ان کی خوشنودی کی خاطر اپنوں کو مارنا ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں، ایسے ہی اس وقت بھی ہو رہا تھا کہ شارلیمین کی بے حد و شمار فوج سرقسطہ کی فصیل کے نیچے امیر عبدالرحمٰن کے مقابلے میں اہل سرقسطہ کی امداد کے لیے بیٹھی تھی کہ سرقسطہ کے عوام اس

فوج کے بیٹھنے کی غرض و غایت سمجھ گئے لیکن لیڈران کرام جنھوں نے وہ فوج (بلیک واٹر) بنوائی تھی، ان کو اس بات کی سمجھ نہ آئی کہ عبدالرحمٰن کو ختم کرنے کے بعد اس وقت کی یہ بلیک واٹر ہمیں بھی زندہ نہیں چھوڑے گی کیونکہ کفر کبھی بھی اسلام اور مسلمانوں کا بہی خواہ نہیں ہوسکتا۔

شارلیمین کی واپسی کے بعد حسین بن عاصی نے سلیمان بن یقظان کو قتل کر کے سرقسطہ کی حکومت اور باغی افواج کی زمام کار اور قیادت خود اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اسی اثناء میں امیر عبدالرحمٰن الداخل بھی اپنی افواج لے کر سرقسطہ کے سامنے آ پہنچا۔ اور فوری طور پر سرقسطہ کا محاصرہ کر لیا۔ حسین بن عاصی نے اظہار اطاعت اور صلح کی درخواست کی۔ امیر عبدالرحمٰن نے اس کی یہ درخواست منظور کر لی۔ سرقسطہ سے فراغت کے بعد امیر عبدالرحمٰن نے شاہ فرانس کے اندلس پر حملہ کرنے کے ارادہ سے آنے پر اس کے جواب میں فرانس پر حملے کا ارادہ کیا اور پہاڑی دروں کو نہایت آسانی سے عبور کر کے فرانس کے میدان میں پہنچ گیا۔ اس موقع پر ایسٹریاس والے عیسائی اپنے پہاڑوں کے گوشوں اور دروں میں چھپے اور سہمے ہوئے بیٹھے رہے، اور انھوں نے اسی بات کو بہت غنیمت سمجھا کہ امیر عبدالرحمٰن ہماری طرف ملتفت نہیں ہوا کیونکہ انھیں عبدالرحمٰن کے مقابلے میں اپنی طاقت کا وزن معلوم تھا۔ اس مرتبہ ان پہاڑی عیسائیوں نے جن کو پہاڑی قزاق سمجھا جاتا تھا، شارلیمین کا بہت سا سامان اور اسلحہ لوٹ لیا اور اس کی فوج کو بڑا نقصان پہنچایا تھا، اس لیے امیر عبدالرحمٰن نے ان کی طرف متوجہ ہونے یا ان کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کا مطلق خیال نہیں کیا بلکہ ان کے وجود کو جو اندلس کے شاہی لشکر کے لیے اب تک تکلیف کا باعث نہیں ہوا تھا، غنیمت سمجھا اور اس جتھے سے کوئی تعرض نہ کیا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ فرانس کے میدانوں میں پہنچ کر عبدالرحمٰن الداخل نے فرانس کے نصف جنوبی حصے کو خوب تاخت و تاراج کیا۔ بہت سے قلعوں کو مسمار کیا اور بہت سے شہروں کی شہر پناہیں ڈھا کر زمین بوس کر دیں اور نہایت عجلت کے ساتھ بہت بڑے رقبے میں تاخت و تاراج کر کے واپس چلا آیا۔ اس سے مقصود فرانس کے حاکم شارلیمین کو یہ باور کرانا تھا کہ امیر عبدالرحمٰن ابھی بیدار ہے اور یہ تیرے ملک آ کر بھی تجھ پر حملہ آور ہوسکتا ہے۔ یہ اہل کفر کے دلوں پر اسلام کا رعب ڈالنا تھا۔ شارلیمین اس زمانے میں فرانس کی شمالی حدود کی طرف بھاگا ہوا تھا۔ وہ اپنے ملک کے اس جنوبی حصے کو دشمن کی تاخت و تاراج سے مطلق نہ بچا سکا۔ امیر عبدالرحمٰن والی اندلس فرانس میں زیادہ دنوں تک نہیں ٹھہر سکتا تھا کیونکہ اس کو اپنے ملک کے بارے میں پتہ تھا کہ وہاں بھی دشمنان ملک وملت کی بغاوت و سرکشی کا کس قدر سامان موجود ہے۔

ہر شخص اس غریب الدیار اجنبی کو اندلس سے نکالنے کی کوشش میں مصروف ہے، اور بیگانوں سے زیادہ اپنے اس کے لیے کوشش کر رہے ہیں اور بغداد کی مرکزی حکومت ان کی پوری پوری اعانت و امداد کر رہی ہے، لہٰذا امیر عبدالرحمٰن فرانس میں اپنی کارگزاری پوری کر کے فوراً واپس چلا آیا اور قرطبہ پہنچ کر مشکل سے ابھی چند ماہ گزرے ہوں گے کہ سنہ ۱۶۵ھ میں سرقسطہ سے حسین بن عاصی کے باغی ہونے کی خبر آئی۔ امیر عبدالرحمٰن نے

غالب بن تمام بن علقمہ کو اس بغاوت کے فرو کرنے کے لیے روانہ کیا۔ غالب اور حسین میں قریباً ایک سال تک لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا اور یہ ہنگامہ فرو نہ ہوا۔ تب مجبوراً امیر عبدالرحمٰن الداخل نے سنہ ۱۶۶ھ میں خود قرطبہ سے سرقسطہ کی جانب کوچ کیا اور حسین بن عاصی کو گرفتار کر کے قتل کر دیا اور سرقسطہ کے باغیوں میں سے بہت سوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا کیونکہ وہ آئے دن ایک اسلامی حکومت میں فتنہ برپا کرتے رہتے تھے جس سے اسلامی حکومت کمزور اور عیسائیوں کو تقویت ملتی تھی۔ اور ''فتنہ قتل سے زیادہ شدید ہوتا ہے'' اس طرح بظاہر اس بغاوت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ان ہنگاموں، شورشوں اور بغاوتوں میں جو کئی سال سے برپا تھے، ابوالاسود اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے امارت و سرداری کا مرتبہ باغیوں اور شورش پسندوں میں حاصل نہ کر سکا۔ وہ بچ بچا کر کہیں چھپا رہا اور شاہی سزا سے محفوظ رہا۔ اگرچہ باغی سرداروں میں سے بظاہر اب کوئی ایسا باقی نہ رہا تھا جو علم بغاوت بلند کر سکتا۔ چنانچہ اس وجہ سے عباسی سازشوں کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ تاہم وہ لوگ جن کے اعزاء و اقرباء بغاوت کے جرم میں امیر عبدالرحمٰن کی فوج کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے، وہ اپنے سینوں کے اندر اپنے مقتول عزیزوں کی یاد اور عداوت کا جوش اور جذبہ ضرور چھپائے ہوئے تھے۔ بعض شورش پسند لوگوں نے ابوالاسود کو جو مقام قسطلونہ میں روپوش تھا، خروج پر آمادہ کیا اور سنہ ۱۶۸ھ میں اس کے اردگرد اسی قسم کے ہنگامہ پسند، باغی اور شورش پسند لوگوں کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا۔ عبدالرحمٰن نے اس باغی گروہ کو شکست فاش دے کر بھگا دیا اور وہ پہاڑوں میں جا کر چھپ گیا۔ سنہ ۱۶۹ھ میں ابوالاسود پھر میدان میں آ نکلا اور عبدالرحمٰن کے مقابلے میں چار ہزار فوجیوں اور ساتھیوں کو قتل کرا کر بھاگ گیا۔ اگلے سال سنہ ۱۷۰ھ میں ابوالاسود فوت ہو گیا اور اس کے ساتھیوں نے جو لٹیروں اور ڈاکوؤں کی صورت اختیار کر چکے تھے، اس کے بھائی قاسم بن یوسف کو اپنا سردار بنا لیا اور جلد ایک عظیم الشان فوج اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئی۔ امیر عبدالرحمٰن نے اس پر چڑھائی کی اور سخت معرکہ آرائی کے بعد قاسم بن یوسف کو گرفتار کر کے قتل کر دیا، اور اس کے ساتھی کچھ مارے گئے اور کچھ منتشر ہو گئے۔

سنہ ۱۷۰ھ میں خلیفہ ہارون الرشید مسند خلافت پر بیٹھا۔ شارلیمین نے امیر عبدالرحمٰن کے تابڑ توڑ اور تاخت و تاراج کرنے والے حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے اس کی خدمت میں صلح کی درخواست پیش کی اور اپنی حسین و جمیل بیٹی کی شادی اس سے کرنا چاہی۔ امیر عبدالرحمٰن نے صلح کی درخواست تو منظور کر لی لیکن اس کی بیٹی کو اپنے محل سرا میں لانے سے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ شارلیمین کو اس بات کا انتہائی دکھ ہوا کیونکہ اس کی یہ بیٹی حسن و جمال میں بے نظیر اور شہرہ آفاق تھی اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے ذریعے کئی کام نکلوانا چاہتا ہو، لیکن امیر عبدالرحمٰن کو بھی حق تعالیٰ شانہ نے عقل سلیم دی ہوئی تھی۔ اس نے اس کو اپنی بیوی بنانے کے ہو سکتا ہے کہ اس وجہ سے انکار کیا ہو کہ جس طرح شاہ رزریق کی بیوی نے امیر عبدالعزیز کی حرم سرا میں داخل ہو کر حکومت اسلامیہ کو نقصان پہنچایا تھا، کہیں یہ عیسائی شہزادی بھی میری حرم سرا میں داخل ہو کر موجب خطر ثابت نہ ہو۔ امیر عبدالرحمٰن کی عمر بھی اب ستاون (۵۷) سال کے قریب تھی۔ اس عمر میں نئی شادیاں کرنے کا شوق عبدالرحمٰن

الداخل جیسے ملک گیر اور کشور کشا، مصروف الاوقات اور مختلف قسم کی شورشوں اور بغاوتوں کو فرو کرنے والے سلطان کو نہیں ہو سکتا تھا۔ عبدالرحمٰن الداخل نہایت اعلیٰ کیریکٹر کا شہزادہ تھا۔ اس کے دادا نے اس کی نہایت پاکیزہ بنیادوں پر تربیت کی ہوئی تھی۔ وہ ایک بہترین جرنیل اور سپہ سالار تھا۔ اس وجہ سے ایک فرنگی عورت سے اس نے شادی کرنے سے اغماض برتا کیونکہ یہ عورتیں اکثر و بیشتر ''شوخ چشم و خوش نما و خوردہ گیر'' ہوتی ہیں جبکہ ان کے والدین ان کو بادشاہوں اور شہزادوں کے حبالۂ عقد میں دے کر اسلام سلطنت کی بنیادوں کو منہدم کرنے کا کام لیتے ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ شارلیمین خود بدمعاش تھا اور اس کی لڑکیاں علانیہ عصمت فروشی کیا کرتی تھیں۔ (ہسٹری آف سارا سین: ص ۲۷۸ سید امیر علی)

بہر حال عبدالرحمٰن الداخل نے شارلیمین کی ناقابل معافی خطا بھی معاف کر دی اور اس کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھا دیا۔ لیکن شارلیمین کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ خلیفہ بغداد عبدالرحمٰن الداخل کا دشمن ہے، اس لیے باوجود اس کے کہ اس کو خلیفۂ بغداد سے کسی امداد و معاونت کی توقع نہیں ہو سکتی تھی، تاہم وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ خلیفۂ بغداد عبدالرحمٰن الداخل کے سر پر فوجی مہم بھیج سکتا ہے، لہٰذا اس نے خلیفہ ہارون الرشید کی خدمت میں جو اس وقت مسند خلافت پر براجمان تھا، ایک سفارت روانہ کر کے تعلقات پیدا کرنا چاہے۔ ان دوستانہ تعلقات کے پیدا ہو جانے کی اس کو اس لیے بھی توقع تھی کہ وہ اس سے پہلے ہارون الرشید کے باپ مہدی عباسی کی منشاء کے مطابق ایک مرتبہ اندلس میں فوج لے کر جا چکا تھا اور اس بات کو جانتا تھا کہ ہارون الرشید ضرور میری دوستی کے لیے محبت کا ہاتھ دراز کرے گا۔ چنانچہ شارلیمین کا خیال درست ثابت ہوا اور خلیفہ ہارون الرشید نے شارلیمین کے سفیروں کی بڑی آؤ بھگت کی اور ایک گھڑی شارلیمین کے پاس ہدیے اور تحفے کے طور پر بھجوائی۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں بغداد میں وقت دیکھنے کے لیے گھڑی موجود تھی، اس وقت فرانس اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں گھڑیاں نہیں ہوتی تھیں) شارلیمین کے تعلقات اپنے پڑوسی ملکوں یعنی یورپ کے دوسرے عیسائی بادشاہوں سے زیادہ گہرے اور پختہ نہیں تھے۔ اگر وہ ایسا ہی صلح جو اور محبت پرست ہوتا تو سب سے پہلے یورپ کے عیسائی سلاطین سے محبت و دوستی کے تعلقات بڑھاتا لیکن اتنے دور دراز اور طویل مسافت والے علاقے یعنی بغداد میں سفارت بھیجنے سے اس کی غرض صرف یہ تھی کہ اندلس کی اسلامی سلطنت کے خلاف کوئی تدبیر کارگر ہو سکے۔ اسی مقصد کے لیے وہ امیر عبدالرحمٰن الداخل کو اپنی بیٹی اس کے حبالۂ عقد میں دینا چاہتا تھا جس سے عبدالرحمٰن نے انکار کر دیا۔ شاہ فرانس کا دل مسلمانوں اور اسلامی سلطنت کے بارے میں صاف نہیں تھا، اسی وجہ سے اس نے ہارون الرشید کے دربار میں سفارت بھیجی تھی۔ ہارون الرشید نے بھی شارلیمین سے دوستی کے تعلقات پیدا کرنے میں اندلسی سلطنت کی مخالفت مدنظر رکھی تھی، لیکن ان دونوں کے مقاصد پورے نہ ہوئے۔ اور عبدالرحمٰن الداخل یا اس کی اولاد کو نہ تو عباسی خلیفہ ہارون الرشید کوئی نقصان پہنچا سکا اور نہ ہی شاہ فرانس شارلیمین عبدالرحمٰن کا بال بیکا کر سکا۔

اہل خاندان کی بغاوت:

سلطان نے اپنے خاندان اور رشتہ داروں کے افراد کو بنو عباس کے ظلم و ستم سے بچانے کے لیے اپنے پاس بلا لیا تھا، لیکن وہ کچھ ایسے کم ظرف نکلے کہ بنی عباس کے مقابلے میں تو آئے نہیں بلکہ الٹا سلطان کی حکومت کا تختہ الٹنے کے درپے ہو گئے۔ ان باغیوں میں سلطان کا غلام بدر بھی شامل تھا۔ ابھی ان لوگوں نے پوری بغاوت تو نہیں کی تھی بلکہ خفیہ طور پر تخت اندلس پر خود قبضہ کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ ممکن ہے کہ یہ سب اختلاف خلفائے عباسیہ کی کسی خفیہ تحریک کے زیرِ اثر ہو یا پھر اندلس کی روایات قدیمہ نے ان لوگوں کو غداری پر آمادہ کیا ہو۔

ابن باغیوں میں سے عبدالسلام بن یزید بن ہشام اور اس کے بھانجے عبداللہ بن معاویہ بن ہشام کو ٹھکانے لگا دیا گیا۔ ابو عثمان جس کو پہلی خدمت کے صلے میں وزارت کا عہدہ عطا کیا گیا تھا وہ بھی اس سازش میں شریک تھا، لیکن حقوق خدمات کے لحاظ سے اس کی جان بخشی کر دی گئی۔ المغیرہ بن ولید بن معاویہ اور ہزیل بن حاتم بھی اس سازش کے رکن تھے، ان کو کچھ روز بعد قتل کرا دیا گیا۔ ایک عرب نے سفارش کی تو سلطان عبدالرحمٰن نے کہا:

"کس قدر تعجب اور افسوس کا مقام ہے کہ یہ لوگ جن کی جان و مال بچانے میں میں نے اپنی جان و مال کی پروا نہیں کی، ایسے احسان فراموش بلکہ محسن کش نکلے کہ آخر کار میرے ہی مخالف اور دشمن بن گئے جب کہ یہ لوگ دشمنوں کی تلواروں کے خوف سے دربدر اور تباہ حال پھر رہے تھے۔ میں نے ان کی ہر طرح اعانت کی اور ان کے واسطے اس ملک میں آرام و آسائش کے سامان مہیا کیے۔ مقام شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حالات کو ظاہر کر دیا اور ہر ایک نے اپنی بدنیتی اور بداعمالی کی سزا پائی۔" (خلافت اندلس: ص ٦٦)

بعض روایات میں ہے کہ سلطان نے ان لوگوں کو یہی سزا دینی مناسب سمجھی کہ ان کو اندلس سے افریقہ جلاوطن کر دیا۔ امیر عبدالرحمٰن کے لیے اب کوئی کام باقی نہیں رہا تھا کیونکہ بظاہر ملک میں اس کا رعب و اقتدار بخوبی قائم ہو چکا تھا۔ تمام باغیوں اور سرکشوں کو اچھی طرح کچل دیا گیا تھا، لیکن پھر بھی وہ ہر وقت وہاں کے غداروں سے چوکنا اور ہوشیار رہتا تھا۔ دو چار امیر ایسے رہ گئے تھے، لیکن سلطان نے ان کو دبا کر رکھا ہوا تھا۔

شام پر حملے کا ارادہ:

سنہ ۱۶۳ھ میں سلطان عبدالرحمٰن الداخل کا ارادہ ہوا کہ بنو عباس سے بھی اپنے خاندان کی بربادی اور تباہی کا انتقام لے اور اپنے بیٹے شہزادہ سلیمان کو اپنا قائم مقام مقرر کر کے اندلس سے اس مقصد کے لیے روانہ

ہوا کہ دفعتاً سرقسطہ میں حسین الانصاری کی بغاوت کی خبر ملی۔ سلطان نے اپنا شام کا سفر ملتوی کر دیا۔ دیگر امرائے عرب حیات بن صلابس حاکم اشبیلیہ، عبدالغفار بن حامد حاکم نبلیہ اور عمر حاکم نبیرا متحدہ محاذ بنا کر ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ قرطبہ پر حملہ آور ہوئے، لیکن سلطان نے ان سب کو ایسی عبرتناک شکست دی کہ یہ سب لوگ گرفتاری کے بعد قتل کر دیے گئے۔ ان واقعات سے سلطان کا عربوں پر سے بھروسہ جاتا رہا اور اس نے اہل بربر کو اندلس آنے کی ترغیب دی۔ ان بربریوں کی چالیس ہزار فوج بھرتی کی گئی اور انھیں بڑے بڑے عہدے بھی دیے گئے۔

سلطان اندرونی بغاوت کے فرو کرنے میں مصروف تھا کہ قرویلہ بن الفانسو عیسائی نے سرحدی قلعوں اور شہروں پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ عیسائی لوگ تقال اور قسطلہ پر قابض ہو گئے۔

ادھر چند امرائے عرب نے شارلیمین کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اندلس کی اندرونی بغاوت سے فائدہ اٹھائے۔ چنانچہ ان کے کہنے پر شاہ فرانس نے بھی سرحد پر حملہ کر دیا لیکن سلطان نے نہایت جرأت و بہادری سے مقابلہ کیا اور شارلیمین کو ناکام واپس جانا پڑا جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ المقری کا بیان ہے کہ شارلیمین نے اندلس پر حملہ کیا لیکن عربوں نے فرانسیسیوں کو شکست دے کر اندلس سے نکال دیا۔

(خلافت اندلس: ص ۶۸)

سلطان عبدالرحمٰن کی وفات:

سلطان تمام بغاوتوں اور شورشوں سے فارغ ہو چکا تھا اور ان تمام کاموں سے بھی فراغت حاصل کر چکا تھا جو اس کے ہاتھوں انجام ہونے والے تھے۔ چنانچہ ربیع الثانی سنہ ۱۷۲ھ میں تینتیس سال چار ماہ حکومت کرنے کے بعد ۵۸ یا ۵۹ سال کی عمر میں اس عالم فانی سے عالم باقی کی جانب انتقال کر گیا اور بعد والوں کو حکومت کرنے کا طریقہ بتا گیا۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہشام مسند خلافت پر بیٹھا۔ سلطان کی وفات ہارون الرشید کے عہد میں ہوئی اور وہ قرطبہ میں دفن ہوا۔

سلطان عبدالرحمٰن کا حلیہ اور اولاد:

سلطان عبدالرحمٰن الداخل نہایت خوبصورت، کشیدہ قامت اور چھریرے بدن کا آدمی تھا۔ رنگ بہت صاف اور بال بھورے رنگ کے تھے۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کی قوت شامہ کمزور تھی۔ انتقال کے وقت اس نے نو بیٹیاں اور گیارہ بیٹے چھوڑے جن میں سلیمان سب سے بڑا تھا لیکن عبدالرحمٰن نے اپنا ولی عہد دوسرے بیٹے ہشام کو بنایا تھا۔ یہ سلیمان وہی بیٹا تھا جسے وہ فرات کے کنارے سے بغل میں لے کر بھاگا تھا، لیکن بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ وہ اندلس میں پہنچنے سے پہلے ہی انتقال کر گیا تھا۔ بہرحال مرتے

وقت جو بیٹے موجود تھے ان میں سلیمان سب سے بڑا تھا۔ ہشام اپنے بھائی سلیمان سے زیادہ لائق اور سلطنت کے انتظامات سنبھالنے کی زیادہ قابلیت اور اہلیت رکھتا تھا، اسی لیے عبدالرحمٰن نے اس کو اپنا ولی عہد بنایا تھا۔

سیرت:

سلطان عبدالرحمٰن الداخل نہایت نیک سیرت اور منصف مزاج شخص تھا۔ اقرباء تو کجا اگر رعایا سے بھی کوئی شخص مرجاتا اور سلطان کسی مہم پر نہ گیا ہوتا تو بذات خود نماز جنازہ کی امامت کراتا۔ (عرب ان اسپین: ۱/۲۱۳) اگر کوئی شخص بیمار ہوتا تو اس کی عیادت کو وہ خود تشریف لے جاتا غرضیکہ اپنی رعایا کی شادی اور غمی میں برابر کا شریک ہوتا۔ نماز جمعہ خود پڑھاتا اور خطبہ جمعہ بڑی فصیح و بلیغ عربی میں دیا کرتا۔ اس کا خطبہ ایک مجاہد کا خطبہ ہوتا تھا جو بہادرانہ اور شجاعانہ جذبات کو برانگیختہ کر دینے والا ہوتا۔ دنیا کے اس عظیم الشان شخص کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات کا صحیح تصور اخذ کرنے کے لیے یہ حالات کافی نہیں ہیں۔ بیس سال کی عمر تک اس کا اکثر و بیشتر شغل کتب دینی اور علمی مجالس میں شرکت کرنا تھا۔ ان لوگوں کے لیے فنون سپہ گری سے واقف ہونا ضروری اور لازمی سمجھا جاتا تھا۔ بیس برس کی پر راحت اور آرام وسکون کی زندگی کے بعد زندگی کا پھر ایک ایسا دور آیا کہ چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح اپنے آپ کو چھپاتا پھرتا رہا۔ اور روئے زمین کا ہر وہ انسان جو اس کو نظر آتا ہے اسے اپنا قاتل اور خون کا پیاسا جلاد ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے پاس کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا تک نہیں تھا۔ چند سال اس حالت میں گزرے۔ جنگلوں، صحراؤں اور ملکوں میں آوارہ رہنے کے بعد ایک وسیع و عریض ملک کا بادشاہ بن جاتا ہے لیکن یہ بادشاہت کوئی تر لقمہ یا روح افزا شربت کا گھونٹ نہیں تھی بلکہ بھڑوں کا ایک چھتہ تھی اور مصیبتوں اور مشقتوں کی ایک پوٹ تھی جو اس کے سر پر رکھ دی گئی۔ اگر سلطان عبدالرحمٰن کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ شروع ہی میں ناکام ہوکر برباد اور تباہ ہو جاتا، لیکن عبدالرحمٰن نے نہایت مضبوط اور طاقت ور دل، ہمالیہ سے بلند اور پختہ ارادہ اور ایک پست نہ ہونے والی ہمت پائی تھی۔ یہ اندلس میں ایک ہی اجنبی اور غریب الدیار شخص تھا۔ اس کے ساتھ کسی قوم کو کوئی خاص محبت نہیں ہوسکتی تھی لیکن اس نے جس خرد و ہوش مندی، دانائی، مآل اندیشی، دور بینی اور ہوشیاری سے کام لیا، وہ اسی کا حصہ تھا۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے کئی خوبیاں رکھی تھیں کیونکہ اس کی تعلیم و تربیت اس کے دادا ہشام بن عبدالملک نے ایک خاص نہج پر کی تھی جس نے پوری زندگی اسے کام دیا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا سپہ سالار اور شمشیر زن سپاہی ثابت ہوا حالانکہ سرزمین اندلس میں داخل ہونے سے قبل اس کو سپہ سالاری اور شمشیر زنی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس لیے اس سے قبل کسی میدان کارزار یا کسی لڑائی میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا لیکن جب یہاں آ کر حصہ لیا تو پھر کسی میدان جنگ اور کسی لڑائی میں کوئی بھی ایسی غلطی نہیں کی تھی جس پر کوئی تجربہ کار جرنیل یا سپہ سالار انگلی اٹھا سکے۔ جن لڑائیوں

یا مہمات میں اس کے بڑے بڑے تجربہ کار جرنیل اور سپہ سالار ناکام رہ جاتے تھے، ان مہموں کو امیر عبدالرحمٰن خود جا کر سر کر لیتا تھا۔ کسی موقع پر اس کے ہاتھ پاؤں نہیں پھولے حالانکہ بڑے بڑے مصائب نے اس کو آن گھیرا تھا۔ اس پر بارہا ایسی مصیبتیں نازل ہوئیں اور اس کے خلاف مسلسل ایسی بغاوتیں اور شورشیں ہوئیں کہ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو عقل و مذہب کی پابندی میں نہ رہ سکتا، یا تو وہ احمقوں کی طرح اپنے آپ کو ہلاک کر دیتا یا پھر بزدلوں کی طرح ذلیل وخوار ہو کر بھاگ جاتا نہیں تو ہوش وحواس ضرور کھو بیٹھتا، لیکن حقیقت ہے کہ عبدالرحمٰن نے اس بات کا موقع ہی نہیں دیا کہ اس کی ہمت کی انتہا اور اس کے اخلاق کی آخری سرحد کا کسی کو اندازہ ہو سکے، بلکہ اس کے معتدل انداز اور متانت آمیز طرز عمل سے ہمیشہ یہی ظاہر ہوا کہ وہ اس سے بھی بہت بڑھ کر ہمت دکھا سکتا ہے، اس نے کوئی کام ایسا نہیں کیا جس سے اس کی حماقت اور بے وقوفی ثابت ہو سکے۔ اس کے ہر کام میں اس دانائی، دور بینی اور دور اندیشی تھی کہ اس سے بڑھ کر دانائی اور دور اندیشی کی کسی سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

ان کی حکمرانی کی تمام زندگی جنگ و پیکار اور مختلف بغاوتوں اور شورشوں کے دبانے اور ہنگاموں کو مٹانے میں گزرتی نظر آتی ہے اور کسی شخص کا خیال بھی اس طرف نہیں جا سکتا کہ اس ہنگامہ خیز زندگی میں امیر عبدالرحمٰن نے اندلس میں کوئی ایسا کام بھی کیا ہوگا جس کی ایک ایسے سلطان سے توقع ہو سکتی ہے جس نے اپنی زندگی نہایت اور راحت اور امن وامان سے گزاری ہو۔ لیکن عبدالرحمٰن کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نہ صرف جنگوں کے ہنگاموں میں اپنی زندگی گزاری بلکہ اندلس میں علوم وفنون کو بھی رواج دیا، مختلف مدارس قائم کیے، رفاہ عامہ کے بہت بڑے کام کیے، تو یہ سب کچھ دیکھ کر ایک انسان حیران رہ جاتا ہے اور اس مدبر و مآل اندیش شخص کی فہم وفراست پر تحسین وآفریں کے ڈونگرے برسانے کو جی چاہتا کہ اس شخص نے مسلمانوں کی حکومت کو اندلس میں مستحکم کرنے کے لیے علم وفن کو کس طرح رواج دیا۔

علوم وفنون کی ترقی:

امیر عبدالرحمٰن اگرچہ اس ملک میں اجنبی تھا اور جب وہ اس ملک میں داخل ہوا تو وہ اکیلا تھا اور عنفوان شباب کا زمانہ تھا، لیکن اس عمر میں بھی اس نے ڈھیروں مخالفت کے باوجود نہایت مستحکم طریقے سے اس ملک میں اپنے قدم جمائے جب کہ نہ صرف یہ شخص اس خطے میں اجنبی اور غریب الدیار تھا بلکہ یہاں کی آب وہوا، ماحول، وطن، زبان، معاشرت وغیرہ ہر چیز اس کے لیے اجنبی تھی۔ اس نے قرطبہ اور اس کے علاوہ دوسرے کئی ایک شہروں کی شہر پناہیں تعمیر کرائیں۔ اندلس کے بہت سے شہروں اور قصبوں میں، جہاں ضرورت پڑی، مسجدیں بنوائیں، اور شہر قرطبہ میں ایک ایسی مسجد بنوائی جو اپنی مثال آپ ہے۔ اس مسجد کی تکمیل اگرچہ امیر عبدالرحمٰن کی زندگی میں نہیں ہو سکی تھی اور وہ اس کو ناتمام ہی چھوڑ کر اس دنیائے فانی سے کوچ کر گیا تھا، لیکن اس کی بنیاد جس وسیع پیمانے اور خوب صورت طریقے پر اس نے رکھوائی تھی، اپنی تکمیل پر وہ مسجد اپنے بانی ہی کی علو ہمت اور بلند

نظری کی دلیل ثابت ہوتی ہے۔ مسجد قرطبہ کی خوب صورتی اور حسن تعمیر نے بہت سے ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کی نگاہ میں اس مسجد کو خانہ کعبہ کی طرح باعظمت اور مقدس بنا دیا تھا حالانکہ تمام مسجدیں ایک ہی مرتبہ رکھتی ہیں سوائے تین مسجدوں کے۔ عمارات کے شوق میں امیر عبدالرحمٰن الداخل کا مرتبہ ہندوستان کے بادشاہ شاہ جہان سے بڑھ کر ہے، رائے اور تدبیر میں ہمارے خیال میں وہ ارسطو سے بڑھ کر ہے۔ ملک اندلس میں اپنی سلطنت قائم کر لینا تیمور اور نپولین بونا پارٹ سے بڑھ کر مرتبہ رکھتا ہے۔ علوم وفنون کی سرپرستی اور ترقی میں وہ ہارون الرشید اور مامون الرشید سے کم نہیں تھا بلکہ زیادہ ہی تھا۔ ہارون الرشید اور مامون الرشید کے بعد خاندان عباسیہ میں علوم وفنون کے ایسے قدردان پیدا نہ ہو سکے جب کہ عبدالرحمٰن کی اولاد میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جو ہارون و مامون سے بہت بڑھ کر علوم وفنون کے خادم ہوئے۔ اسی وجہ سے قرطبہ نے بغداد سے زیادہ شہرت حاصل کر لی۔

ابن حیان کا بیان ہے کہ ''عبدالرحمٰن الداخل بڑا رحم دل اور نہایت شائستہ مزاج شخص تھا۔ اس کی تقریر نہایت فصیح و بلیغ اور جان دار ہوتی تھی، اس کی قوت مدرکہ نہایت تیز اور نکتہ رس تھی۔ معاملات میں وہ اپنی رائے جلدی قائم نہ کرتا تھا مگر جب وہ کوئی رائے قائم کر لیتا تو پھر پورے عزم واستقلال اور مضبوطی کے ساتھ اس کی تکمیل اور تعمیل کی طرف متوجہ ہوتا تھا۔ جب سلطنت کے اہم معاملات درپیش ہوتے تو اپنے تجربہ کار، جہاں دیدہ اور معاملات کے نشیب وفراز سے آشنا مشیروں سے مشورہ کرتا تھا۔ عبدالرحمٰن میں اللہ تعالیٰ نے بہت خوبیاں رکھی تھیں۔ وہ جانباز، بہادر، اور صف شکن دلاور تھا۔ میدان جنگ میں سب سے پہلے خود حملہ آور ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ دوست اور دشمن دونوں کے لیے یکساں ہیبت اور جلال کا مظہر ہوتا تھا۔ جمعہ کے روز جامع مسجد میں خود خطبہ دیتا، بیماروں کی عیادت کے لیے بھی اکثر جاتا اور عام خوشی کے مواقع جیسے جلسوں اور شادیوں وغیرہ میں شوق سے شریک ہوتا۔''

ہر معاملے میں لوگوں کی دادرسی کرتا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سلطان ایک جنازے میں شرکت کے بعد واپس آ رہا تھا کہ ایک عام آدمی نے گھوڑے کے باگ ہاتھ میں پکڑ کر کہا: ''اے امیر! قاضی نے میرے حق میں ناانصافی کی ہے جس کی داد میں تجھ سے چاہتا ہوں۔ سلطان نے اس کی بات سن کر کہا کہ اگر تو واقعی سچا ہے تو میں تیرے حق میں انصاف کروں گا۔ چنانچہ وہیں کھڑے کھڑے قاضی کو بلا کر سختی سے اس سے کہا: ''قاضی صاحب! اس شخص کا انصاف ہونا چاہیے۔'' سلطان مستقل مزاج ایسا تھا کہ بڑی سے بڑی مصیبت کو بھی ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ افریقہ کے قیام کے دوران پانچ برس گزرنے پر ہمت نہیں ہاری۔ وہ اندلس کو زیر نگین کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ باوجودیکہ گورنر افریقہ حبیب نے ہشام کے دولڑکوں کو قتل کرا دیا اور سلطان کے درپے آزار تھا، مگر عبدالرحمٰن اس سب کچھ کے علی الرغم اپنی کوشش میں لگا رہا اور آخر کار اندلس کو زیر نگین کر ہی لیا۔

دس برس تک خطبے میں سلطان ابوجعفر منصور عباسی کا نام خود لیتا رہا، مگر عبدالملک بن عمر نے کہا کہ سلطان خود آپ کا نام خطبہ میں آنا چاہیے کیونکہ صحیح معنوں میں آپ خود امیر المومنین ہیں۔ چنانچہ اس دن سے تمام اندلس میں عبدالرحمٰن الداخل کا نام خطبے میں لیا جانے لگا۔

سلطان کمال درجہ کا فیاض تھا۔ اس کی سخاوت و فیاضی کی دور دور تک شہرت تھی۔ اس کا حسن اخلاق اور اس کا جود وکرم اندلس میں ضرب المثل بن گئے تھے۔ جس وقت یوسف فہری اور دوسرے مخالفین پر کامیاب ہوا اور اطمینان سے سریر آرائے سلطنت ہوا تو اندلس کے ہر صوبے اور شہر سے حاکم اور رئیس اطاعت قبول کرنے قرطبہ آئے تو ان کی خوب تواضع و مدارات کی اور ہر رئیس اور سردار سے خلوت میں نہایت خوش خلقی سے پیش آیا اور اس قدر مال و دولت سے ان کو نوازا کہ ان میں سے جو بھی واپس ہوا وہ مطیع وفرمان بردار بن کر واپس ہوا۔

ایک روز ایک غریب عرب بھی قناصرین سے دربار میں آیا اور سلطان سے کہا: ''اے سلطان! اللہ تعالیٰ نے تجھ کو بادشاہ اور بے انتہا خزانوں کا اس لیے مالک بنایا ہے کہ تو غریب اور یتیم اور بیواؤں کے حق میں انصاف اور ان کی مدد کر۔

سلطان نے اس کی یہ بات سن کر کہا: ''تمھاری بھی مدد ہوگی اور ہر ایسے شخص سے کہہ دو جو تمھاری طرح ہو، ان سب کے لیے میرا دربار کھلا ہے۔ وہ درخواست میرے سامنے پیش کریں تاکہ میں بذات خود ان کو ہر قسم کی مدد دوں اور ان کو پریشانیوں سے نجات دوں۔ غرض کہ اس غریب اور نادار عرب کو خوش وخرم روانہ کیا اور حکم دیا کہ ضرورت مند خود درخواست لے کر میرے سامنے فوراً پیش ہوا کریں۔ کھانے کے وقت کوئی اہل غرض آ جاتا تو اس کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیتا، پھر اس کی غرض اور حاجت نہایت خوش اسلوبی سے پوری کرتا۔ اپنے اس طریقۂ عمل اور حسن اخلاق سے اس نے ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہوا تھا۔ ایسے ہر دل عزیز بادشاہ کم ہی گزرے ہیں۔

نظم ونسق مملکت:

ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے کہ امیر عبدالرحمٰن الداخل کی طبیعت میں مروت اور فیاضی کا جوہر تھا لیکن غداروں، باغیوں اور شورش پسندوں نے ان کو سزا دہی اور سختی پر مجبور کر دیا۔ اس کا طبعی میلان علم وادب کی طرف تھا لیکن ضرورت نے اس کو نہایت محتاط اور تجربہ کار سپہ سالار بنا دیا تھا۔ عبدالرحمٰن کی ابتدائی عمر دمشق میں انتہائی تکلفات میں گزری تھی کیونکہ وہ ماں کے بطن سے چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوا تھا، لیکن جب مصیبت آئی اور افلاس اور ناداری سے پالا پڑا تو اس نے نہایت خوشی، بلند ہمتی اور صبر و استقلال سے ان تمام مصائب اور تکالیف کو برداشت کیا۔ ابھی اس کی حکومت پوری طرح قائم نہ ہونے پائی تھی کہ اس نے مشرق کے دور دراز علاقوں سے بنوامیہ اور ان کے متوسلین کو اپنے خرچ پر اندلس بلایا اور ان میں سے ہر ایک کو اس کے مرتبے کے مطابق عہدے اور عزتیں اور منصب عطا کیے۔ عبدالرحمٰن کی ذکاوت و مآل اندیشی کے دشمن بھی مدح سرا تھے۔ عبدالرحمٰن تمام مصائب و آلام کو نہایت خاموشی اور صبر سے برداشت کر لیتا تھا۔

عبدالرحمٰن نے اندلس کو چھ صوبوں میں تقسیم کیا تھا۔ ہر ایک صوبے میں ایک فوجی سپہ سالار رہتا تھا۔ اس سپہ سالار کے ماتحت دو عامل اور چھ وزیر ہوتے تھے۔ ان حکام کے مددگار قاضی اور دیگر حکام ہوتے تھے۔ مرکزی دفتر قرطبہ کو یہ لوگ تمام ضروری اطلاعات بھیجتے رہتے تھے۔ عبدالرحمٰن ہمیشہ اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کی تدبیریں سوچتا رہتا تھا۔ اس نے ایسے قوانین جاری کیے تھے کہ رعایا خوش حال ہو اور اپنی املاک پر آزادی کے ساتھ بلا مداخلت غیرے قابض اور متصرف ہو۔

عبدالرحمٰن کو تعلیم اور علم و ادب کی اشاعت کا خاص طور پر شوق تھا۔ تمام اندلس میں عبدالرحمٰن نے سڑکیں بنوائیں، ڈاک کا انتظام کیا، ہر پڑاؤ پر گھوڑے رکھے تاکہ جلد از جلد ملک سے دارالخلافہ قرطبہ میں اطلاعات پہنچ سکیں۔

امیر عبدالرحمٰن نے ڈاکوؤں اور لٹیروں کو طاقت وقوت اور سطوت کے ساتھ بالکل ختم کر دیا تھا۔ بربری لوگ جو اپنی عادت سے کبھی باز نہ آتے تھے، پہلی مرتبہ امیر عبدالرحمٰن ہی کے عہد حکومت میں خاموش ہو کر بیٹھے۔ عبدالرحمٰن اپنے ممالک محروسہ کا ہمیشہ دورہ کیا کرتا تھا تاکہ اپنے حکام کو دیکھے کہ وہ لوگوں پر کس طرح حکومت کرتے ہیں۔ جہاں جہاں امیر کا گزر ہوتا وہاں کے محتاجوں، ناداروں اور عسیر الحال لوگوں کی دست گیری اور اعانت کرتا اور لوگوں کی اصلاح اور رفاہ عامہ کے کاموں کا جائزہ لیتا۔

اس کی فیاضی اور سخاوت سب کے لیے عام تھی۔ اگرچہ عبدالرحمٰن نے ہر جگہ مسجدیں اور رفاہ عام کی عمارتیں بنوائیں لیکن دارالخلافہ قرطبہ کی شان وشوکت یورپی ملکوں کے بادشاہوں کی نظروں میں بڑھانے کے لیے عمارتیں تعمیر کروانے پر خوب توجہ دی۔ شاہی محل کے صحن میں ایک باغ رصافہ کے نام سے لگوایا جو اس کے دادا ہشام بن عبدالملک کے باغ رصافہ کے نام پر تھا۔ قرطبہ میں ایک ٹکسال قائم کی جس میں درہم و دینار اس قسم کے بنوائے جیسے کہ شام اور دمشق میں بنوائے جاتے تھے۔ دنیا کے ہر حصے سے علماء اور فضلاء کو بلایا اور ان کی خوب قدر دانی کی۔ علمی تحقیقات اور فلسفیانہ موشگافیوں کے لیے مجالس مقرر کیں۔ اپنے بیٹوں کو بہترین طریقے پر تعلیم دلوائی اور ان کو حکم دیا کہ وہ دفتر شاہی اور قاضیوں کی عدالتوں میں حاضر ہو کر معاملات کو دیکھا کریں۔ اہم مقدمات اور سرکاری معاملات کے فیصلے بھی ان شہزادوں کے سپرد کیے جاتے تاکہ وہ ان کے بغور ملاحظہ کریں۔ عام لوگوں میں علم کا ذوق وشوق پیدا کرنے کے لیے مشاعرے اور مناظرے کی مجلسیں منعقد ہوتیں۔ اچھی نظموں اور علمی مناظروں کی کامیابی پر انعامات بھی دیے جاتے تھے۔ امیر عبدالرحمٰن ان تمام علمی مجلسوں میں خود بھی شریک ہوتا تھا۔ اندلس کی عیش پسند آب وہوا اور مال و دولت کی فراوانی نے امیر عبدالرحمٰن کے سپاہیانہ اخلاق میں کوئی تغیر پیدا نہیں کیا تھا۔ اس کے اتقاء اور پرہیزگاری میں کسی وقت تغیر اور کمی محسوس نہیں ہوئی۔ قرطبہ کی شہرہ آفاق مسجد کے لیے جو مقام سب سے زیادہ موزوں اور مناسب تھا، وہ عیسائیوں کے قبضے میں تھا۔ امیر عبدالرحمٰن نے اس پر زبردستی قبضہ کرنا مناسب نہیں تھا۔ جب خود ہی عیسائیوں نے اس کو فروخت کرنا چاہا تو امیر عبدالرحمٰن

نے اس کو واجبی قیمت دے کر خریدا اور شہر کے متعدد مقامات پر ان کو گرجا گھر تعمیر کرنے کی اجازت دی۔

میریا کالیکٹ تاریخ اسپین میں لکھتا ہے:

''عبدالرحمٰن اپنے ہمراہ مشرق سے علم معماری اور عالی شان اور خوش نما عمارتوں کا مذاق لایا تھا، اور یہ صرف نقشہ جات ہی کے بنانے میں واقف کار اور ماہر نہیں تھا بلکہ عمدہ معمار بھی تھا، اور یہ مذکور ہے کہ مسجد اعظم کارڈوا (مسجد قرطبہ) کو اس نے اپنے ہاتھ سے بنانا شروع کیا تھا۔ اس مسجد کی تعمیر میں دو لاکھ سکہ طلائی (دینار) سے زیادہ صرف کیا گیا تھا، اور مسجد کا طول چھ سوفٹ اور عرض اڑھائی سوفٹ تھا۔ اور شمال سے جنوب تک انیس محرابیں تھیں، اور ایک سو ترانوے ستون سنگ مرمر کے نہایت خوبصورت تھے، اور انیس بڑے دروازے جنوب کی جانب تھے جو پیتل کے ڈھلے ہوئے تھے۔ مغربی دروازے میں خالص سونے کے پترے جڑے ہوئے تھے، نو دروازے مشرق اور نو دروازے مغرب کی جانب تھے۔ مسجد کا مینار دو سو چالیس فٹ بلند تھا اور تین سنہری گولے مینار پر تھے اور گولوں پر بشکل انار مخروطی طلائی کلس تھا۔ روزانہ روشنی کے لیے چار ہزار چھ سو فتیل سوز روشن کیے جاتے۔ تیل کا خرچہ تین سو من سالانہ تھا۔ عنبر، عود اور لوبان خوشبو کے لیے جلتا رہتا اور امام کی جگہ سونے کا چراغ دان جلتا تھا۔ اس میں نہایت درجہ کارسازی اور عمدہ صناعی تھی۔'' (تاریخ اسپین: ص ۲۶۰)

عبدالرحمٰن الداخل نے اندلس میں عربی صنعت اور دست کاری کی بنیاد ڈالی۔ قرطبہ میں مسجد قرطبہ اور قصر باغ رصافہ کی تعمیر شروع کی لیکن اس کی زندگی میں یہ دونوں چیزیں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکیں البتہ اس کے بیٹے ہشام نے ان کو مکمل کیا۔

سلطان نے اس ملک کی ایک سال کی آمدنی کا پانچواں حصہ (خمس) یعنی اسی ہزار دینار اس عمارت پر صرف کیے تھے۔ قصر کی چھت میں اس قدر سونا چڑھایا گیا تھا کہ اس کی چمک سے دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ عبدالرحمٰن اس قصر میں رہائش پذیر تھا۔ قصر کا باغ بے مثال اور لاجواب تھا۔ میوہ دار درختوں میں اپنے وطن کے یادگار پھل کھجور کا درخت بھی لگایا تھا۔ عبدالرحمٰن نے اپنی اس ہنگامہ خیز زندگی میں بہت سی عمارتیں، مساجد، حمام، پل اور قلعے عوام کے آرام و آسائش کے لیے بنوائے تھے۔

اس نے اپنی حکومت کے دوران سب سے بڑا کام یہ کیا کہ عرب اور بربر عوام کے مابین خوش گوار تعلقات قائم کرا دیے اور وہ ایک دوسرے کے حریف ہونے کے بجائے حلیف اور معاون ہو گئے۔ سلطان کا زمانہ عوام کے لیے نہایت امن و عافیت کا زمانہ تھا۔ تعلیم بھی عام کر دی گئی تھی، ہر مسلم اور غیر مسلم علم حاصل کر سکتا تھا۔ کسی کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ دوسری اقوام کے ساتھ سلطان کے اس قسم کے سلوک سے ان کے خیالات پر اچھا اثر پڑا اور بہت سے عیسائی حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

ایک مرتبہ سلطان نے قاضی کی تقرری کے لیے اپنے ندیموں سے مشورہ کیا۔ دونوں شہزادے سلیمان

اور ہشام بھی موجود تھے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ مصعب کو قاضی مقرر کیا جائے۔ ہر ایک نے ان کا انتخاب پسند کیا۔ مصعب کو بلا لیا۔ وہ تشریف لائے۔ ان سے ان کی اس تقرری کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے کہا: ''میں ایک ضعیف اور کمزور آدمی ہوں۔ اس گراں بار عہدہ کا تحمل نہیں کر سکوں گا۔ بادشاہ کو مصعب کا یہ جواب قدرے گراں گزرا، اور اس سے کہا کہ تشریف لے جایئے، لعنت ہو ان پر جو آپ کو یہاں لائے۔ صرف یہ تھا سلطان کے غصہ کا اظہار۔ دوسری جانب منصور عباسی کا حسن کردار بھی ملاحظہ کر لیجیے جس نے عہدۂ قضا قبول نہ کرنے کے بدلے میں امام اعظم ابوحنیفہ قدس سرہ کے ساتھ وہ کچھ کیا کہ جو نہیں کرنا چاہیے تھا اور جو انصاف پسند مسلمان حکمرانوں کو زیبا نہیں کون نہیں جانتا کہ تاریخ کے اوراق میں امام ابوحنیفہ کے ساتھ روا رکھے جانے والے ناگفتہ بہ رویے کا حال پوری طرح محفوظ ہے۔

سلطان غیور طبیعت کا انسان تھا۔ بغاوت کے سلسلے میں اپنے بھائی ولید کے لڑکے کو سلطان نے قتل کرا دیا تھا۔ اس کا اس کو بڑا افسوس تھا۔ چنانچہ اپنے ایک ملازم سے کہا: ''تم اسی وقت ولید کے پاس جاؤ اور میری طرف سے اس سے عذر خواہی کرو۔ پانچ ہزار دینار دے کر ان سے کہا: آپ کسی دوسری جگہ تشریف لے جائیں کیونکہ میرا اس واقعہ سے صلۂ رحم ختم ہو گیا ہے۔ بھائی اگر سامنے ہو گا تو میں آنکھ نہیں ملا سکوں گا۔ چنانچہ ولید افریقہ چلا گیا۔ (عبرت نامۂ اندلس: ص ۳۲۳)

مختصر یہ کہ امیر عبدالرحمٰن میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو ایک عقل مند، باشعور، سیاست دان اور روشن دماغ اور زندہ ضمیر بادشاہ میں ہونی چاہئیں۔ جس تاریخ سے امیر عبدالرحمٰن نے تخت اندلس پر قدم رکھا اسی تاریخ سے اندلس خلافت مشرقیہ اسلامیہ کی ماتحتی سے آزاد ہو گیا، لیکن امیر عبدالرحمٰن نے پھر بھی نہایت دانائی اور ہوشیاری سے کام لے کر اپنے آپ کو امیر ہی کہلایا اور خلافت کا دعویٰ نہیں کیا۔ دس برس کے بعد خطبے میں اپنا نام داخل کیا، کیونکہ عبدالرحمٰن اس بات کو بخوبی جانتا تھا کہ اندلس میں بہت سے ایسے مسلمان موجود ہیں جو بنوامیہ کو نفرت کی نگاہ دیکھتے ہیں (کیونکہ ان کے خلاف بہت پراپیگنڈہ کیا گیا تھا) اور عباسیوں سے محبت رکھتے ہیں کیونکہ یہ اہل بیت کا نام لے کر برسر اقتدار آئے ہیں، اور عام طور پر لوگ اسلامی سلطنت کا ایک ہی مرکز سمجھتے ہیں جو مشرق میں موجود ہے۔

اگر امیر عبدالرحمٰن اپنے آپ کو خلیفہ کہلاتا تو یقیناً اس کے خلاف تمام مسلمانان اندلس شمشیر بدست ہو جاتے اور عبدالرحمٰن کو خلافت اسلامیہ کا باغی، بے ادب اور گستاخ قرار دیتے۔ اندلسی مسلمانوں کی اس حالت کو بتدریج اصلاح پذیر کیا گیا اور عبدالرحمٰن ثالث نے مناسب وقت پر اپنے آپ کو امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کہلایا۔ ایک مؤرخ نے لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن کی تقریر نہایت شائستہ اور دل آویز ہوتی تھی۔ نہایت سنجیدہ، معاملہ فہم اور منتظم شخص تھا۔ کسی کام کے کرنے میں جلدی نہیں کرتا تھا لیکن جس کام کا ارادہ کر لیتا پھر اس کو بغیر ختم کیے نہیں چھوڑتا تھا۔ لہو ولعب اور ضرورت سے زیادہ آرام کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔ اکثر سفید لباس پہنتا۔

حاجت مندوں کی اپنے تک آسان رسائی کی غرض سے دربانوں کو موقوف کر دیا تھا۔کوئی حاجت مند اگر کھانے کے وقت اپنی درخواست لے کر آ جاتا تو اسے اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھا کر کھانا کھلاتا۔

عبدالرحمٰن دنیا کے ان عظیم الشان انسانوں میں سے ہے جنھوں نے قوموں کے زندہ کرنے، سلطنتوں کے بنانے اور روئے زمین کے حالات میں تغیر عظیم پیدا کرنے میں ایسی محیر العقول طاقتوں کا اظہار کیا ہے کہ آسمان شہرت پر اس کا نام روشن ستارہ بن کر چمک رہا ہے اور اس کے کارنامے زندۂ جاوید بن گئے ہیں۔ ذرا غور فرمائیں عبدالرحمٰن کی عظمت کے بارے میں کہ اس نے کیسا غیر معمولی دل و دماغ پایا تھا۔سب سے بڑھ کر قابل تعریف چیز امیر عبدالرحمٰن کی سپاہیانہ زندگی تھی کہ مسجد قرطبہ کی تعمیر کے وقت وہ امیر اندلس ہونے کے باوجود بھی وہ معمولی مزدوروں کی طرح ان کے ساتھ کام کرنے اور پتھر ڈھونے کو عیب نہیں سمجھتا تھا۔

ہشام بن عبدالرحمٰن الداخل

امیر عبدالرحمٰن اپنی اس حیات مستعار کے دن گزار کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ عبدالرحمٰن الداخل ساری زندگی امیر ہی کہلاتا رہا لیکن دراصل وہ اندلس کا پہلا خود مختار خلیفہ تھا۔ اس سے پہلے جو وہاں کے گورنر ہوتے تھے، وہ امیر کہلاتے تھے۔ اگر چہ معنوی طور پر اس میں وہ تمام صفات اور خوبیاں بدرجۂ اتم موجود تھیں جو خلیفہ کی ذات میں ہونی چاہئیں۔ اس کی اولاد میں عبدالرحمٰن الثالث نے خلیفہ کا لقب اختیار کیا تھا اور بالکل صحیح وقت پر کیا تھا۔ امیر عبدالرحمٰن کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہشام منصب امارت پر متمکن ہوا اس کی زندگی کے واقعات اور حکمرانی کے کارناموں پر سطور ذیل میں روشنی ڈالی جاتی ہے۔

ولادت:

ہشام بن عبدالرحمٰن اپنے باپ کے اندلس میں داخل ہونے بعد سنہ ۱۳۹ھ شوال کے مہینے میں پیدا ہوا تھا۔ ہشام کی ماں حلل نامی ام ولد کو اندلس کے سابق امیر یوسف فہری نے عارضی صلح کے وقت امیر عبدالرحمٰن کی خدمت میں ہدیے کے طور پر پیش کیا تھا۔ عبدالرحمٰن نے اس کو آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا۔ وہ اس سے بہت ہی محبت کرتا تھا۔ یہ محبت اس عورت کی خوبیوں کے باعث تھی، اسی کے بطن سے ہشام جیسے مدبر اور منتظم خلیفہ نے جنم لیا۔

تخت نشینی:

عبدالرحمٰن کے اس صاحب زادے میں بہت سی خوبیاں تھیں جو دوسروں میں نہیں تھیں۔ اس وجہ سے عبدالرحمٰن نے اس کو اپنا جانشین بنایا۔ سنہ ۱۷۲ھ میں عبدالرحمٰن کا انتقال ہوا اور اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ۳۲ یا ۳۳ سال کی عمر میں ہشام مسند خلافت پر بیٹھا۔ جس وقت عبدالرحمٰن کا انتقال ہوا اس وقت ہشام شہر مریدہ میں بطور گورنر کام کر رہا تھا۔ وہیں باپ کی وفات کا حال سن کر مسند خلافت پر بیٹھا۔ اور عام طور پر اندلس میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ قرطبہ میں اس کا ایک بھائی عبداللہ موجود تھا۔ اس نے باپ کے انتقال کے بعد شاہی

محل سرائے اور دار السلطنت قرطبہ میں ہشام کے خلاف قبضہ کر لیا۔ دوسری طرف صوبہ طلیطلہ کا گورنر اس کا بھائی سلیمان تھا جو عمر میں ہشام سے بڑا تھا۔ ہشام مریدہ سے قرطبہ کی جانب روانہ ہوا اور معمولی سے مقابلے کے بعد عبداللہ کو گرفتار کر کے قرطبہ پر مکمل قبضہ کر لیا اور دوبارہ تخت نشینی کی رسم یہاں قرطبہ میں ادا کی گئی کیونکہ ملک کا دار الخلافہ تو یہی تھا۔ اس موقع پر اس نے اپنے بھائی عبداللہ کی بغاوت کی یہ غلطی معاف کر کے اس کو اپنے مشیروں اور وزیروں میں داخل کر لیا اور اس کو ایک جاگیر بھی عطا کر دی۔

اندلس میں مختلف قومیں آباد ہو گئیں تھیں اور ان میں بھی اکثر متضاد طبائع وعناصر کے لوگ آباد تھے۔ اس نازک موقع پر جب کہ امیر عبدالرحمٰن انتقال کر گیا تھا اس وقت ملک کی حالت کے پیش نظر خطرہ تھا کہ ملک میں بغاوتیں اور شورشیں پیدا نہ ہو جائیں، لیکن امیر عبدالرحمٰن نے اپنے حینِ حیات میں سرکشوں کو کچھ اس طرح مسل دیا تھا کہ وہ اب سر اٹھانے کے قابل نہ رہے تھے، لیکن اس کے بعد اب معاملہ کچھ عجیب ہو گیا بجائے اس کے کہ باغی اور سرکش لوگ حکومت کے خلاف سر اٹھائیں، خود ہشام کے بھائیوں نے ہی اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے شروع ہی میں اس کے راستے میں مشکلات اور مصائب کے پہاڑ پیدا کر دیے اور لوگوں کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ امیر عبدالرحمٰن نے اپنے ولی عہد کے انتخاب میں کوئی غلطی نہیں کی بلکہ بالکل درست انتخاب کیا۔ سلیمان نے جو طلیطلہ کا گورنر تھا، اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ دوسری جانب عبداللہ قرطبہ سے فرار ہو کر اپنے بھائی سلیمان کے پاس طلیطلہ پہنچ گیا۔ ہشام نے دونوں بھائیوں کی سرکشی اور بغاوت کا حال سن کر درگزر سے کام لیا اور سمجھا کہ چند روز کے بعد یہ خود ہی راہ راست پر آ جائیں گے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ حالانکہ ہشام نے باپ کے عہد کے افسروں کو ان کے عہدوں پر قائم رکھا، اہل خاندان کی توقیر ومنزلت میں کمی نہ کی لیکن شہزادوں نے اس کی ان تمام باتوں کو در خور اعتنا نہ سمجھا۔

طلیطلہ میں سلیمان کا وزیر غالب ثقفی تھا۔ وہ امیر عبدالرحمٰن کا نہایت وفادار سردار تھا۔ اس نے ان دونوں بھائیوں کو بہت سمجھایا اور بغاوت سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اقتدار کی خواہش انسان کو پاگل کر دیتی ہے اور وہ نصیحت کرنے والے کو بھی برا سمجھنے لگتا ہے۔ چنانچہ سلیمان اور عبداللہ دونوں بھائیوں نے غالب ثقفی کی اس نصیحت سے ناراض ہو کر اسے وزارت کے عہدے سے معزول کر کے قید کر دیا۔ غالب ثقفی کے قید ہونے کی خبر سن کر ہشام نے قرطبہ سے ایک خط اپنے سفیر کی معرفت طلیطلہ میں ان دونوں بھائیوں کو بھیجا جس میں لکھا تھا کہ ایسے قدیمی وفادار اور نمک حلال شخص کو قید کرنا نہایت نامناسب ہے۔ سلیمان اور عبداللہ نے اس خط کا غلط اثر لیا اور اس سفیر کے سامنے غالب ثقفی کو قید خانے سے بلوا کر قتل کروا دیا اور سفیر سے کہا کہ جاؤ اس خط کا یہی جواب ہے۔ سلطان ہشام اس خونی جواب کا سن کر قرطبہ سے بیس ہزار فوج لے کر طلیطلہ کی جانب روانہ ہوا۔ ادھر سے سلیمان اور عبداللہ دونوں ایک زبردست فوج لے کر طلیطلہ سے قرطبہ کی جانب روانہ ہوئے۔ طلیطلہ سے تھوڑے فاصلہ پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ سلیمان اور عبداللہ شکست کھا کر طلیطلہ واپس ہو کر قلعہ بند

ہو گئے۔ قلعہ طلیطلہ اپنی مضبوطی اور استحکام کے باعث مشہور تھا۔ اس کا فتح کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ہشام نے طلیطلہ کا محاصرہ کر لیا۔ سلیمان نے اپنے بیٹے اور بھائی عبداللہ دونوں کو طلیطلہ میں چھوڑ کر اور ایک حصۂ فوج ساتھ لے کر قرطبہ کا رخ کیا۔ قرطبہ میں عبدالملک بطور گورنر مقیم تھا۔ عبدالملک نے سلیمان کے اس طرح آنے کی خبر سن کر قرطبہ سے کچھ فاصلے پر سلیمان کا استقبال تیر و شمشیر سے کیا۔ سلیمان شکست کھا کر مرسیہ کی طرف بھاگ گیا اور ملک میں جابجا لوٹ مار کرنے لگا۔ یہ حالت دیکھ کر ہشام نے طلیطلہ کے محاصرہ پر ایک سردار کو چھوڑ کر دارالسلطنت قرطبہ کا عزم کیا تاکہ قرطبہ میں بیٹھ کر سلیمان کی نقل و حرکت کی نگرانی اور اس کا بندوبست آسانی سے کیا جا سکے۔

دوسری طرف عبداللہ بھی محاصرہ کی طوالت سے تنگ آ گیا تو اس نے بلا شرط اور بلا جان کی امان طلب کیے ہوئے اپنے آپ کو ہشام کے حوالے کر دینا گوارا کر لیا۔ چنانچہ وہ محاصرین کے ایک معتمد شخص کی نگرانی میں قرطبہ آ کر ہشام کے پاس حاضر ہوا۔ ہشام نے پھر اس کی خطا معاف کر دی اور بڑی عزت و محبت کا برتاؤ کیا اور اس بات کے ثبوت کے لیے کہ عبداللہ کی طرف سے سلطان کا دل صاف ہے اس کو طلیطلہ ہی میں ایک جاگیر دے کر رخصت کر دیا۔

عبداللہ کی طرف سے تو معاملہ درست ہو گیا۔ دوسری طرف سلیمان نے مرسیہ میں بہت سے آدمیوں کو اکٹھا کیا۔ ہشام نے اپنے نوعمر بیٹے حکم کو فوج کا جنرل بنا کر مقابلے کے لیے بھیجا۔ دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلیمان حکم سے شکست کھا کر بھاگا۔ اس کی تمام جمعیت مقتول اور منتشر ہو گئی۔ آخر دو برس آوارہ اور سرگرداں رہنے کے بعد مجبوراً سنہ ۱۷۴ھ میں سلیمان نے ہشام سے معافی کی درخواست کی۔ ہشام نے فوراً اس کی درخواست منظور کر لی اور بھائی کو اپنے دربار میں نہایت عزت و احترام کے ساتھ جگہ دی۔ سلیمان نے کہا کہ میں اندلس اب رہنا پسند نہیں کرتا۔ مجھ کو افریقہ جانے کی اجازت دی جائے۔ ہشام نے بخوشی اسے اجازت دے دی اور اس کی جاگیر جو اندلس میں تھی، ستر ہزار مثقال سونے کے عوض خرید لی۔ سلیمان افریقہ پہنچ کر مقیم ہو گیا اور وہاں عباسیوں کا ایجنٹ بن کر خط و کتابت کے ذریعے اندلس کے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرتا رہا۔

فرانس پر حملہ:

بھائیوں کے فتنے سے فراغت حاصل کر کے ہشام نے چالیس ہزار نفوس پر مشتمل فوج منظّم کی اور فرانس پر حملہ کر دیا اور تمام جنوبی فرانس اور شہر ناربون کو جو ایک عرصے تک صوبہ بونیہ کے مسلمان گورنر کا دارالحکومت رہ چکا تھا اور مسلمانوں کی خانہ جنگی کی وجہ سے امیر عبدالرحمٰن کے زمانے میں فرانسیسیوں کے قبضے میں تھا، پھر سے فتح کر لیا۔ یہاں سے بے شمار مال و دولت ہاتھ آیا۔ واپسی پر جبل البرتات کے عیسائیوں سے کچھ گستاخانہ حرکات سرزد ہوئیں۔ یہ چھوٹی سی عیسائی ریاست مسلمانوں کی بے التفاتی اور عیسائیوں کی چالاکی

کے باعث پہاڑ کی وادی میں قائم ہوگئی تھی۔ آج تک اس عیسائی ریاست نے کبھی اسلامی لشکر کا مقابلہ نہیں کیا تھا اس لیے مسلمانوں نے بھی اس کے وجود کو اپنے لیے مضر اور قابل نقصان نہیں سمجھا تھا، لیکن یہ لوگ اندر ہی اندر اپنے کو مضبوط اور مستحکم کر رہے تھے۔ اب جب کہ اسلامی لشکر فرانس کے ایک اچھے خاصے حصہ کو فتح کر کے اور فرانس کے بادشاہ شارلیمین کو مقابلے سے بھگا کر بہت سے مال غنیمت کے ساتھ واپس آ رہا تھا تو ایسٹریاس کے عیسائیوں نے مسلمانوں کی فوج کے عقبی حصہ کو اسی طرح چھیڑنا اور لوٹنا چاہا جس طرح انھوں نے شارلیمین کی فوج کو جبل البرتات میں لوٹ کر اس کے ایک بہت بڑے حصہ کو تباہ و برباد کر دیا تھا، لیکن شارلیمین اور ہشام کی فوجوں میں بڑا فرق تھا جس کا انھیں احساس نہیں تھا۔

ہشام نے قرطبہ پہنچ کر سنہ ۱۷۵ھ میں اپنے وزیر یوسف بن بخت کو ان پہاڑی عیسائیوں کی سرکوبی پر مامور کیا۔ یوسف بن بخت نے ریاست ایسٹریاس پر حملہ کر کے تمام ریاست کو پامال اور تہہ و بالا کر ڈالا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایسٹریاس کے عیسائیوں کو مسلمانوں کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑا لیکن وہ بری طرح ہلاک اور برباد کیے گئے، اور ان کا حاکم برمیوڈر گرفتار کر لیا گیا۔ فتح کے بعد اس پہاڑی علاقے کو مسلمانوں نے اپنی سکونت کے قابل نہ پا کر اسی حاکم کو دے دیا اور اس سے اطاعت اور فرمانبرداری اور ادائے خراج کا قول و قرار لے لیا۔

مسجد قرطبہ کی تکمیل:

جنوبی فرانس اور عیسائی صوبوں سے جو مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا اس کا خمس جو ہشام کی خدمت پیش کیا گیا وہ ۴۵ ہزار اشرفیوں پر مشتمل تھا۔ سلطان ہشام نے یہ تمام روپیہ مسجد قرطبہ کی تعمیر و تکمیل پر صرف کر دیا۔ اس مسجد کی مثال پورے کرۂ ارض میں نہیں ملتی۔ فن تعمیر کا یہ وہ شاہکار ہے جس پر خود انسان حیران و پریشان نظر آتا ہے۔ اسی مسجد کے بارے میں علامہ اقبال نے بال جبریل میں ایک معرکۃ الآراء نظم لکھی ہے جس کو انھوں نے قرطبہ میں ہی لکھا تھا۔ افسوس کہ مسلمان اس مسجد کی حفاظت نہ کر سکے اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کی دیواروں پر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کی تصاویر آویزاں ہیں اور وہ مسجد ایک گرجا میں تبدیل ہو چکی ہے۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں حضرت علامہ اقبال کو قرطبہ جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال نے اس مسجد میں اذان دی تھی اور نماز بھی پڑھی تھی۔ وہ مسجد جو اتنی محنت سے دو بادشاہوں کے عہد خلافت میں مکمل ہوئی وہ پھر کئی سو سال تک اذان اور نماز سے محروم رہی۔ علامہ اقبال جب اس مسجد کو دیکھنے کے لیے گئے تو علامہ نے بے اختیار چاہا کہ مسجد قرطبہ میں تحیۃ المسجد کے دو نفل ادا کروں۔ اس عمارت کے نگران سے اس بارے میں پوچھا گیا۔ اس نے کہا کہ میں بڑے پادری سے پوچھ کر اجازت لے آؤں۔ ادھر وہ پوچھنے گیا ادھر علامہ نے نیت باندھ لی اور اس کے واپس آنے سے پہلے ہی نماز کی ادائیگی سے فارغ ہو گئے۔ (عبدالمجید سالک، ذکر اقبال: ص ۱۸۲)

ہسپانیہ میں جب سے غیر مسلموں کی حکومت قائم ہوئی تو یہ قانون بنایا گیا کہ مسجد قرطبہ میں نہ تو اذان دی جائے گی اور نہ ہی نماز ادا کی جائے گی اور اسی قانون کے نفاذ کے ساتھ ساتھ اس عظیم الشان مسجد کو گرجا میں تبدیل کر دیا گیا۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ علامہ اقبال نے باقاعدہ حکومت ہند کے ہوم سیکرٹری کی معرفت ہسپانیہ کے ہوم سیکرٹری سے اذان اور نماز کی اجازت لی تھی۔ علامہ فرماتے ہیں کہ میں نے مسجد کے اندر پہنچ کر اپنی آواز کی پوری شدت کے ساتھ اذان دی۔ میں اس جذبے، اس سرور اور اس کیف کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ کئی صدیوں کے بعد اس مسجد کے اندر پہلی مرتبہ اللہ اکبر کی آواز محراب و منبر سے ٹکرا ٹکرا کر گونج رہی تھی۔ اذان سے فارغ ہونے کے بعد میں نے مصلی بچھایا اور نماز ادا کرنے لگا۔ دوران نماز مجھ پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ میں گریہ وزاری برداشت نہ کر سکا اور جب سجدے میں گرا تو بے ہوش ہو گیا۔ اسی دوران میں نے عالم رؤیا میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے ہیں اور مجھے مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں:

”اقبال! تم نے میری مثنوی کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ اسے مسلسل پڑھتے رہو اور میرا پیغام دوسروں تک پہنچاؤ۔“

اور جب میں ہوش میں آیا تو دل کو سکون و اطمینان حاصل ہو چکا تھا۔

صوبہ اربونیہ کی بغاوت:

عبدالملک نے اس مہم میں ایک عجیب فیصلہ کیا کہ جلیقیہ، الیسٹریاس، اربونیہ اور جنوبی فرانس کے سرکش عیسائیوں کو جو میدان جنگ میں مسلمانوں نے گرفتار کیے تھے، شہر ناربون میں یہ حکم سنایا کہ تمھاری رہائی اس طرح ہو سکتی ہے کہ شہر ناربون کی شہر پناہ کو گرا کر اس کے پتھر شہر قرطبہ میں پہنچاؤ۔ چنانچہ ان عیسائیوں نے ناربون کی فصیل کے پتھروں کو قرطبہ پہنچایا۔ قرطبہ اور ناربون کے درمیان کئی سو میل کا فاصلہ تھا۔ راستے میں بہت سے دریاؤں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں کو عبور کرنا پڑتا تھا۔ ایک ایک قیدی نے ایک ایک چھوٹا پتھر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ جو بڑے پتھر تھے ان کو گاڑیوں میں لادا اور ان گاڑیوں کو قیدی کھینچ کر لائے۔ بعض متوسط پتھروں کو دو آدمیوں نے ڈولی کی طرح باندھ کر ایک بانس یا لکڑی میں لٹکا کر اٹھایا۔ اس طرح ناربون کی فصیل کے جس قدر پتھر یہ قیدی اٹھا سکتے تھے، اٹھا کر شاہی دستہ کی نگرانی میں قرطبہ تک لائے۔ ان پتھروں سے کہتے ہیں کہ مسجد قرطبہ کی مشرقی دیوار کا ایک حصہ تعمیر ہوا۔ عبدالملک نے ان قیدیوں سے یہ مشقت لے کر ان کو حسب وعدہ رہا کر دیا، اور عیسائی ریاستیں سزا دہی کے بعد اطاعت کا اقرار لے کر پھر عیسائیوں کے سپرد کر دی گئیں کیونکہ ان شمالی اور پہاڑی علاقوں کو عرب سردار آب و ہوا کے باعث پسند نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اندلس کے ان شمالی صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم تھی جب کہ جنوبی اندلس میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی اور یہیں عیسائی باشندے بھی زیادہ اسلام میں داخل ہوئے۔

وادئ الکبیر کے پل کی تعمیر:

ہشام نے اپنے باپ عبدالرحمٰن الداخل کی بنا کردہ مسجد قرطبہ کی تکمیل پر خصوصی توجہ صرف کی سنہ ۱۷۵ھ میں سلطان ہشام نے اپنے بیٹے حکم کو صوبہ طلیطلہ کا گورنر مقرر کیا۔ سنہ ۱۷۶ھ میں قرطبہ میں دریائے وادئ الکبیر کا پل از سر نو تعمیر کرایا۔ یہ امیر سمح نے سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں تعمیر کرایا تھا۔ ہشام نے اس کو پہلے سے زیادہ وسیع، خوبصورت اور مضبوط بنوایا۔ جب یہ پل بن کر تیار ہوا تو کسی نے ہشام کے کان میں یہ آواز پہنچائی کہ سلطان نے یہ پل اس لیے بنوایا تھا کہ اس کو شطہ میں آنے جانے کی آسانی ہو۔ ہشام کے کان میں جب یہ بات پہنچی تو مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس نے مرتے دم تک اس پل پر قدم نہیں رکھا۔ (آج بھی اس دریا کا نام الوادئ الکبیر ہے اور مسجد قرطبہ کی محراب کے عقب میں یہ بہت بڑا دریا اسی نام سے بہہ رہا ہے اور مسجد قرطبہ میں غسل اور وضو کے لیے پانی اسی دریا سے جاتا تھا) چونکہ عباسی ایجنٹ خفیہ طور پر اندلس میں اپنا کام کرتے ہی رہتے تھے۔ ادھر ہشام کا بھائی سلیمان افریقہ (مراکش) میں بیٹھا ہوا عباسیوں کے لیے جاسوسی کا کام کر رہا تھا اور وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کو گمراہ کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ شمال کی جانب شارلیمین جو عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھا چکا تھا، اس قسم کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ جلیقیہ کی نوزائیدہ عیسائی ریاست نے فرانسیسیوں اور اندلسی واقعہ پسندوں کی پشت پناہی پر سرکشی کے برگ و بار نکالنا شروع کر دیے۔ سلطان ہشام نے بلا توقف عبدالکریم بن عبدالواحد بن مغیث کو بلا کر جلیقیہ کی جانب روانہ کیا۔ لشکر اسلام نے جلیقیہ میں پہنچ کر سرکشوں کی گوش مالی کی اور ان سے اطاعت کا قول و قرار لے کر واپس آیا۔ ابھی یہ بغاوت فرو نہ ہوئی تھی کہ بربریوں نے متحد ہو کر علم بغاوت بلند کر دیا۔ ہشام نے ان کی سرکوبی پر عبدالقادر بن ابان بن عبداللہ خادم امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ عبدالقادر نے ایک نہایت سخت معرکے کے بعد بربری جمعیت کو منتشر اور ہزارہا کو خاک و خون میں ملا دیا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۷۸ھ کا ہے۔ سنہ ۱۷۹ھ میں اہل جلیقیہ نے فرانسیسیوں کے مشتعل کرنے اور ابھارنے سے پھر سرکشی کا اظہار کیا۔ سلطان نے عبدالملک بن عبدالواحد بن مغیث کو فوج دے کر اس طرف روانہ کیا اور یہ حکم دیا کہ علاقہ جلیقیہ میں ہوتے ہوئے ملک فرانس کے اندر داخل ہو کر اس اسلامی لشکر سے جا کر ملو جو دوسری طرف سے فرانس میں داخل ہو گا۔ چنانچہ ایک لشکر دوسرے راستہ سے فرانس بھیجا گیا۔ جلیقیہ کے عیسائی رئیس اور فونش نے اسلامی لشکر کی آمد کا حال سن کر تمام راستے اور شہر خالی کر دیے اور خود اسلامی لشکر کے آگے آگے پہاڑوں میں بھاگتا اور پھرتا رہا۔ چونکہ عبدالملک جلیقیہ میں زیادہ روز نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا، لہٰذا وہ باغی سردار کو مفرور دیکھ کر فرانس کی حدود میں داخل ہوا اور دوسرے اسلامی لشکر سے مل کر ملک فرانس کے اکثر شہروں اور قلعوں کو فتح کر کے مسمار کیا اور فتح اور فیروزمندی کے ساتھ قرطبہ کی جانب واپس آیا۔ ہشام اس کی کارکردگی سے بہت خوش ہوا۔

وفات:

ماہ صفر سنہ ۱۸۰ھ میں سلطان ہشام بن عبدالرحمٰن نے سات سال اور چند ماہ حکومت کر کے چالیس سال چار ماہ کی عمر میں داعئ اجل کو لبیک کہا۔ یہ بھی اپنے باپ عبدالرحمٰن کی طرح شورش پسندوں ہی سے لڑتا رہا۔ البتہ فرانس کا کافی حصہ اس کی خلافت میں فتح ہوا اور مسجد قرطبہ کی تکمیل ہوئی۔ یہ دونوں بہت بڑے کارنامے ہیں۔

ہشام بن عبدالرحمٰن کی زندگی پر تبصرہ:

امیر عبدالرحمٰن کی طرح ہشام بھی ایک فیاض اور عدل گستر خلیفہ تھا۔ تاریخ میں اس کی معدلت گستری اور فیاضی کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ اس نے اپنی بیدار مغزی اور دانش وری سے حکومت کو ایسے مستحکم اور مضبوط اصولوں پر قائم کیا کہ اگر اس کے جانشین اس کی پابندی کرتے تو اس وقت یورپ کا مغربی گوشہ مسلمانوں کے قبضے میں ہوتا۔ (خلافت اندلس: ص ۸۰)

اس نے اپنے عہد خلافت میں مسجد قرطبہ کی تعمیر کی تکمیل کی۔ مسجد قرطبہ کی تعمیر میں اسی ہزار دینار تو امیر عبدالرحمٰن نے اپنی زندگی میں صرف کیے اور اس سے دگنی رقم یعنی ایک لاکھ ساٹھ ہزار ہشام نے اس مسجد کی تعمیر اور تکمیل میں صرف کیے۔ طبیعت میں نہایت سادگی تھی، اس وجہ سے ہشام بھی اپنے باپ کی طرح سفید مگر نہایت سادہ اور کم قیمت لباس زیب تن کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ آدمی کی قیمت اس کے لباس سے نہیں بلکہ اس کے اوصاف سے ہے۔ اسے اگرچہ شکار کا شوق تھا لیکن وہ شوق ایسا نہ تھا کہ وہ امور مملکت اور امور دین وملت میں حارج ہو، زندگی کے آخری ایام میں اس شوق کو بھی اس نے یک قلم ترک کر دیا تا کہ امور مملکت صحیح طریقے سے ادا کر سکے، اور ان کی ادائیگی میں کوئی چیز مانع نہ ہو۔ حاجت مندوں کے لیے اس کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ مظلوموں کو دادرسی میں کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہیں آتی تھی۔ محتاجوں کی خبر گیری میں وہ خود راتوں کو اپنا آرام ترک کر دیتا تھا۔ مسافروں کو خود لے کر کھانا کھلاتا اور اندھیری راتوں میں شہر کے گلی کوچوں میں گشت کرتا، اور محتاجوں، بیواؤں مسکینوں کی دست گیری میں وہ لطف پاتا، چوروں، ڈاکوؤں اور مجرموں سے جو زر جرمانہ وہ وصول کرتا وہ سرکاری خزانے میں داخل نہ ہوتا بلکہ رعایا ہی کی بہبود کے کاموں میں صرف کیا جاتا۔ لڑائیوں میں جو لوگ اتفاقاً عیسائیوں کی قید میں چلے جاتے، ان کو سرکاری خزانے سے فدیہ دے کر آزاد کرایا جاتا۔

یہ ایک بادشاہ کا حال ہے جس کی حکومت کو آج کل کی اصطلاح میں ''آمریت'' کہا جاتا۔ آمروں کو عصرِ حاضر میں نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، لیکن وہ آمر یا بادشاہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر مسافروں، غریبوں اور محتاجوں کی خبر گیری کرتا ہے، ان کی حاجتیں پوری کرتا ہے، ان کو ہر قسم کا آرام پہنچاتا ہے۔ پورے

شہر کی پولیس اس کی حفاظت پر نہیں لگی ہوتی۔ آج کل جمہوریت کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے اور لوگوں کے لیے اس کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھا جاتا ہے، لیکن ان عوامی نمائندوں کی حفاظت کے لیے پولیس کی ڈیوٹی لگی ہوتی ہے۔ اور ان عوامی نمائندوں میں سے اگر کوئی وزیر یا وزیر اعظم یا صدر مملکت ہو جائے تو پھر کروڑوں روپے سالانہ اس کی حفاظت کے لیے صرف ہوتے ہیں۔ اگر وہ کسی شہر میں چلا جائے تو دس دس میل کے حدود اربعہ میں سڑکوں کو بند کر دیا جاتا ہے۔ غریب تو کیا بعض خواص بھی اس سے نہیں مل سکتے۔ یہ ہے آج کل کی جمہوریت جس میں غریبوں کو روز بروز غریب سے غریب تر کر کے ختم کیا جا رہا ہے اور امیروں کو امیر تر کر کے آسمان رفعت پر لے جایا جا رہا ہے۔ جس مملکت کا صدر ہی ٹھگ اور رسہ گیر ہو وہاں کے وزیر اور اس کی پارٹی کے نمائندے تو کرپشن اور بدعنوانی کے ذریعے تباہی مچا دیتے ہیں۔ شیخ سعدی نے سچ کہا تھا کہ اگر کسی ملک کا بادشاہ ظلم سے رعایا کا ایک انڈا کھا لیتا ہے تو اس کے امیر وزیر مرغیوں ہی کو سیخوں پر چڑھا کر اور کباب بنا کر کھا لیتے ہیں۔

ہشام کے دل میں اپنی رعایا کا اس قدر درد تھا کہ اس نے اپنے عہد خلافت میں قسم کھانے کو ایک بھی مسلمان عیسائیوں کی قید میں باقی نہیں چھوڑا تھا۔ وہاں کوئی عافیہ صدیقی کسی حریف یا حلیف کی قید میں نہیں تھی۔ ہشام نے ہر ایک کو عیسائیوں کی قید سے رہا کرا لیا تھا۔ اندلس میں ایک مسلمان نے مرتے وقت ایک وصیت کی تھی کہ اس کے ترکہ سے ایک مسلمان قیدی عیسائیوں کی قید سے آزاد کرایا جائے۔ اس کی اس وصیت کو پورا کرنے کے لیے تمام عیسائی ممالک کو چھان مارا مگر کوئی مسلمان عیسائیوں کی قید میں نہ ملا کیونکہ سلطان ہشام نے تمام مسلمانوں کو پہلے ہی آزاد کروا لیا ہوا تھا۔

ہشام ایک مکان خریدنا چاہتا تھا اور اس مکان کے مالک سے گفتگو چل رہی تھی۔ اسی اثناء میں ہشام کو پتہ چلا کہ اس مکان کے قریب رہنے والا ایک شخص اس مکان کو خریدنا چاہتا ہے، لیکن وہ سلطان کی وجہ سے اس مکان کی خریداری کا ارادہ ترک کر چکا ہے۔ یہ سن کر ہشام نے اس مکان کو خریدنے کا ارادہ ترک کر دیا اور پڑوسی کو کہلوا بھیجا کہ وہ اس مکان کو خرید لے۔ اس بات کے پیش نظر سلطان نے ایسے تجربہ کار اور دین دار لوگ مقرر کیے تھے جو صوبوں کے عاملوں کے طرز حکومت، عدل و انصاف اور دفاتر کی جانچ پڑتال کرتے اور ہر ایک صوبے میں جا کر وہاں کی رعایا سے وہاں کے حاکموں کے بارے میں شکایات سنتے تھے۔ آج کے اس جمہوری دور میں تو ضلع کا ڈپٹی کمشنر بھی کسی کی شکایت نہیں سنتا۔

اہل اندلس پر مسلمانوں کا تمدنی اثر:

سلطان عبدالرحمن اور ہشام کے عہد حکومت میں اندلس کے اصلی باشندوں پر بھی مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا بہت اثر پڑا۔ میریا کالیکٹ نے لکھا ہے:

”جب خلفائے امیہ کی حکومت اسپین میں قائم ہوئی تو اسپین کے باشندوں کی اوضاع میں ابتری آئی اور

اخلاق درست ہوئے۔ خاندان بنو امیہ اس ملک میں اپنے ہمراہ علوم وفنون کا مذاق لائے اور زیب وزینت صرف مساجد اور عمارات کے واسطے مخصوص نہیں تھی بلکہ عام آدمیوں کے مکانات میں بھی مثل محل کے آرام کی تمام اشیاء ہوتی تھیں، اور لوگ اپنے مکانات میں حوض اور فوارے، باغات اور کتب خانے بہت کچھ صرف کر کے بناتے تھے، اور جو بزم ضیافت عالی شان اور پر رونق ہوتی تھیں اس کا اصل مقصد اور منشاء صرف تفریح ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ شاعری اور علم موسیقی کا مشغلہ بھی ہوتا تھا، اور علماء اور فضلاء میں باہمی گفتگو بھی ہوتی تھی، اور نوعمر بچے مختلف شہروں سے اندلس کے مدارس میں علوم شرقیہ میں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے، اور جب تعلیم حاصل کر کے واپس جاتے تو اپنے ملک میں مدرسے جاری کرتے تھے اور مدارس مشرقیہ اسلامیہ میں عربی میں علم فقہ، فن شاعری، علم شاعری، ہیئت اور علم طب سکھایا جاتا تھا۔
ہشام نے تعلیم کا افسر اعلیٰ سقاتوین سلیمیا کو بنایا تھا جو اندلوشیا (اندلس) کا باشندہ تھا اور جس نے قرطبہ کی یونیورسٹیوں میں علم حاصل کر کے یہ فضل وکمال اور مرتبہ حاصل کیا تھا۔ اس عالم نے مشہور عالم وفاضل ایاز دمشقی کی رائے کے مطابق آیات احکام کی تفسیر لکھی۔ یہ عالم ان ائمہ اربعہ سے پہلے گزرا ہے جن سے چار فقہی مذاہب پیدا ہوئے۔'' (تاریخ اسپین: ص ۲۵۸)

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ جو مغربی قومیں یورپ کے شمال مغرب میں آباد تھیں، جہالت وناخواندگی کا شکار اور خونی جنگوں میں زار ونزار تھیں۔ وہ جنگ اور جہالت کی پیدا کی ہوئی تاریکی میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ ان ممالک میں اب تک علم وتمدن کی صبح نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اسلامی اور عربی اندلس اس وقت تک منصۂ شہود پر نہیں آیا تھا۔ ان کو علم وتمدن سے روشناس کرانے کا سہرا مسلمان خلفاء کے سر ہے علاوہ ازیں مصائب وحوادث نے بھی ان کی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ بہت حد تک یہ ریاستیں دنیا سے بے خبر تھیں اور دنیا ان سے قریباً ناآشنا تھی۔ مشرق ومغرب کے ممالک میں جو انقلاب انگیز واقعات اور تغیرات رونما ہو رہے تھے، ان سے ان قوموں کو دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ عقائد کے لحاظ سے یہ قومیں نوخیز مسیحیت اور فرسودہ بت پرستی کے درمیان میں تھیں۔ نہ دین کے بارے میں ان کے پاس کوئی پیغام تھا اور نہ سیاست کے میدان میں ان کا کوئی مقام تھا۔ ایچ۔ جی ویلز (H.G. Wells) کا بیان ہے کہ ''اس زمانے میں مغربی یورپ کے اندر یک جہتی اور نظم وانصرام کے کوئی آثار نہ تھے۔'' (A Short History of the World)

اس سلسلے میں ایک اور مغربی دانشور رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) نے لکھا ہے:
''پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی جا رہی تھی۔ اس دور کی وحشت وبربریت زمانہ قدیم کی وحشت وبربریت سے کئی درجے زیادہ تھی کیونکہ اس کی مثال کسی ایسے بڑے تمدن کی لاش کی سی تھی جو سڑ گئی ہو۔ اس تمدن کے نشانات مٹ رہے تھے اور اس پر زوال کی مہر لگ چکی تھی۔ وہ ممالک جہاں یہ تمدن

برگ و بار لایا اور گذشتہ زمانے میں اپنی انتہائی ترقی کو پہنچ گیا تھا جیسے اٹلی، فرانس وہاں تباہی، طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا۔'' (The Making of Humanity, P.164)

ان غیر مہذب عادات اور جاہلانہ تمدن کے باعث چھٹی صدی کے اواخر میں یہودیوں اور عیسائیوں میں باہمی رقابت اور منافرت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ان میں سے کوئی فریق دوسرے فریق کو ذلیل کرنے اور اس سے اپنی قوم کا انتقام لینے اور مفتوح کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا تھا۔ سنہ ۶۱۰ء میں یہودیوں نے انطاکیہ میں عیسائیوں کے خلاف بلوہ کیا۔ شہنشاہ روم فوکاس (Phocas) نے ان کی سرکوبی کے لیے مشہور فوجی جرنیل بنوسوس (Bonosus) کو بھیجا۔ اس نے پوری یہودی آبادی کا اس طرح خاتمہ کیا کہ ہزاروں کو تلوار سے، سیکڑوں کو دریا میں غرق کر کے، آگ میں جلا کر اور درندوں کے سامنے ڈال کر ہلاک کر دیا۔ سنہ ۶۱۵ء میں جب ایرانیوں نے شام کو فتح کیا تو یہودیوں ہی کے مشورے اور ترغیب سے خسرو نے عیسائیوں پر وحشیانہ مظالم کیے اور اکثر و بیشتر عیسائیوں کو تہ تیغ کیا۔ ایرانیوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد ہرقل نے زخم خوردہ عیسائیوں کے مشورے سے سنہ ۶۳۰ھ میں یہودیوں سے سخت انتقام لیا اور ان کا اس طرح قتل عام کیا کہ رومی سلطنت میں صرف وہ یہودی بچ سکے جو ملک چھوڑ کر چلے گئے یا کہیں چھپ رہے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الخطط المقریزی: ۳۹۲/۴)

پھر یورپ پر وہ وقت بھی آیا کہ رہبانیت کی بدعت نکالی گئی جو شاید انسانیت اور تمدن کے حق میں بت پرست روما کی حیوانیت سے زیادہ وبال جان تھی۔ یورپ کی مادہ پرستی اور لادینیت میں اس مردم آزار اور آدم بیزار دشمن فطرت رہبانیت کو بہت کچھ دخل ہے۔ رہبانیت میں اس قدر غلو اور افراط پیدا ہو گیا تھا کہ اس زمانہ میں اس کا تصور کرنا بھی مشکل اور تکلیف دہ ہے۔ ڈریپر نے اپنی کتاب تاریخ اخلاق یورپ میں اس کے نمونے پیش کیے ہیں۔

راہبوں کی مجموعی تعداد کا بتانا تو مشکل ہے لیکن ان کی کثرت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ سینٹ جروم کے زمانے میں ایسٹر کی تقریب پر قریباً پچاس ہزار راہبوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ چوتھی صدی عیسوی میں صرف ایک راہب کی ماتحتی میں پانچ ہزار راہب تھے۔ ایک اور راہب سینٹ سیرامین کی ماتحتی میں دس ہزار راہب تھے۔ چوتھی صدی کے خاتمے پر تو یہ حالت تھی کہ جتنی خود مصر کے شہریوں کی آبادی تھی قریباً اسی قدر ان راہبوں کی تعداد تھی۔ پورے دو سو سال تک جسم کشی منتہائے اخلاق سمجھی جاتی رہی۔ مؤرخین نے اس کی بڑی لرزہ خیز مثالیں پیش کی ہیں۔ سینٹ میکیریس کی بابت مشہور ہے کہ وہ چھ ماہ تک برابر ایک دلدل میں سویا کیے تاکہ اس کے برہنہ جسم کو زہریلی مکھیاں ڈسیں۔ نیز یہ کہ وہ ہمیشہ ایک من لوہے کا وزن اپنے اوپر لادے رہتے تھے، اور تین سال تک ایک خشک اور اندھے کنویں میں مقیم رہا۔ ایک مشہور راہب یوحنا کے متعلق منقول ہے کہ وہ مسلسل تین سال تک کھڑے ہوئے عبادت کرتا رہا۔ اس مدت میں ایک لمحے کے لیے بھی نہ بیٹھا اور نہ لیٹا۔ جب بہت تھک جاتا تو ایک چٹان پر اپنے جسم کو سہارا دے لیتا۔ بعض راہب کسی قسم کا لباس استعمال نہیں کرتے

تھے۔ ستر پوشی کا کام اپنے جسم کے بڑے بالوں سے لیتے تھے اور چوپایوں کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں کے بل چلتے تھے۔ راہبوں کے مسکن اس زمانے میں مکانات نہیں ہوتے تھے بلکہ وحشی درندوں کے غار، خشک کنویں یا قبرستان ہوتے تھے۔ راہبوں کا ایک خاص طبقہ صرف گھاس کھاتا تھا۔ جو زاہد مرتبۂ زہد میں جتنی زیادہ ترقی کرتے جاتے تھے اسی قدر وہ مجسمۂ عفونت اور غلاظت ہوتے جاتے تھے۔ سینٹ انھونی نے بوڑھا ہونے کے باوجود کبھی ہاتھ منہ دھونے کے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ سینٹ ابراہام نے پچاس سالہ مسیحی زندگی میں اپنے چہرے یا پاؤں پر پانی کی چھینٹ نہ پڑنے دی۔

اس رہبانی طرز معاشرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ خانگی زندگی کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں اور دلوں سے اعزاء و اقرباء کا احترام و ادب جاتا رہا۔ اس زمانہ میں ماں باپ کے ساتھ احسان فراموشی اور اعزاء کے ساتھ قساوت قلبی کی جس کثرت سے نظیریں ملتی ہیں، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ یہ زاہدان صحرا اور عابدان مرتاض اپنی ماؤں کی دل شکنی کرتے تھے۔ بیویوں کے حقوق پامال کرتے تھے اور اپنی اولاد کو دغا دیتے تھے۔ ان کا مقصود زندگی صرف اور صرف یہ ہوتا تھا کہ خود انھیں نجات اخروی حاصل ہو۔ لیکی نے اس سلسلے میں جو واقعات لکھے ہیں ان کو پڑھ کر شدت الم سے آج بھی آنسو نکل آتے ہیں۔ عورتوں کا سایہ اپنے اوپر نہیں پڑنے دیتے تھے اور اگر اتفاقاً گلی راستے میں عورت سے آمنا سامنا ہو جاتا تو یہ سمجھتے تھے کہ ساری عمر کی ریاضت اور زہد کی کمائی خاک میں مل گئی۔ اپنی ماؤں، بیویوں اور بہنوں سے بات کرنا بھی وہ گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔

جب مسلمان اندلس میں داخل ہوئے اور اپنی حکومت قائم کی تو اس کے اثرات عیسائی مذہب اور اس وقت کے عیسائی تمدن پر بھی پڑے۔ چنانچہ آٹھویں صدی عیسوی سے نویں صدی تک یورپ میں اس تحریک کا بڑا زور رہا کہ تصاویر اور بت ایک خلاف مذہب فعل ہے اور اس میں کوئی تقدیس کا پہلو نہیں۔ اس تحریک نے اتنا زور پکڑا کہ لیوسوم، قسطنطین پنجم اور لیو چہارم جیسے عظیم الشان شاہان روما نے اس کی حمایت کی اور سنہ ۷۲۶ء میں ایک فرمان جاری کیا گیا جس میں سرکاری طور پر تصویروں اور بتوں کی تقدیس کی ممانعت کر دی گئی۔ پھر سنہ ۷۳۰ء میں ایک اور فرمان کے ذریعے اس کو بت پرستی قرار دیا گیا۔ تصاویر کے خلاف یہ احکام یقیناً اسلام کی بت شکنی اور اعلان توحید کی صدائے بازگشت تھی جو مغربی ممالک اور اندلس میں اسلامی تبلیغ و اثرات کے تحت پہنچی۔ اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ کلوڈلیس (Cladius) جو تورین کا لاٹ پادری اور اس تحریک و دعوت کا بڑا پرجوش علم بردار تھا یہاں تک کہ وہ اپنے حلقۂ اثر میں تصویروں اور صلیبوں کو جلا دیا کرتا تھا، اس کے بارے تاریخی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ولادت اور نشو و نما اندلس میں ہوئی تھی۔ اور یہ دوسری صدی ہجری کا زمانہ تھا جب وہاں اندلس میں عبدالرحمٰن الداخل اور ہشام کی حکومت تھی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ضحیٰ الاسلام: ۱/۱۶۴)

مشہور مغربی دانشور اور نوبل انعام یافتہ مستشرق رابرٹ بریفالٹ نے اپنی مشہور کتاب تشکیل انسانیت میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ''صرف مذہب ہی نہیں بلکہ یورپ کی پوری زندگی اور اس کا تمدن اسلام

سے متاثر ہوا ہے۔" چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"یورپ کی ترقی کا کوئی شعبہ اور کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں اسلامی تمدن کا دخل نہ ہو، اور اس کی ایسی نمایاں یادگاریں نہ ہوں جنھوں نے زندگی پر بڑا اثر ڈالا ہے۔"

(The Making of Hamanity, P.190)

یہی مصنف دوسری جگہ لکھتا ہے:

"صرف طبعی علوم ہی نہیں، جن میں عربوں کا احسان مسلم ہے، یورپ میں زندگی کی بوقلمونی اور رنگا رنگی پیدا کرنے کے ذمہ دار یورپی نہیں ہیں بلکہ اسلامی تمدن نے یورپ کی زندگی پر بہت عظیم الشان اور مختلف النوع اثرات ڈالے ہیں اور اس کی ابتداء اسی وقت سے ہو جاتی ہے جب اسلامی تہذیب و تمدن کی پہلی کرنیں یورپ پر پڑنی شروع ہوتی ہیں۔" (ص ۲۰۲)

یہی مصنف اسی کتاب کے اسی صفحہ پر لکھتا ہے:

It is highly probable that but for the Arabs, modern industrial civilization would never have arisen at all.

(The making of humanity, P.202)

انتہائی اغلب ہے کہ عربوں کے بغیر جدید صنعتی تہذیب سرے سے وجود ہی میں نہ آتی۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اندلس کے باشندوں اور یورپ کے رہنے والے لوگوں پر مسلمانوں کے تمدنی اثرات پڑے اور ان کو دنیا میں رہنے کا سلیقہ آ گیا۔

تعمیرات:

ہشام کے عہد خلافت میں قرطبہ کے اندر وہاں کے امیروں اور مال دار لوگوں نے بڑی خوبصورت اور عظیم الشان عمارتیں بنوائیں جن سے شہر کی رونق اور خوب صورتی میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ خود ہشام کو بھی اپنے باپ کی طرح عمارتیں تعمیر کرنے میں بہت دل چسپی تھی۔ مسجد قرطبہ کی تکمیل بھی اس نے کرائی۔ قرطبہ میں ایک جدید محل تعمیر کروایا۔ فارقد بن عین میر عمارات نے خلیفہ کے حکم سے شاندار حوض تعمیر کیا تھا۔ یہ حوض عین الفارقد کے نام سے مشہور تھا۔

علمی مجالس:

علمی مجالس کا سلسلہ تو امیر عبدالرحمٰن الداخل ہی کے زمانے سے خوب زور و شور کے ساتھ اندلس میں جاری تھا لیکن ہشام نے ان علمی ترقیات کے سلسلے کو ترقی دینے کے علاوہ سب سے بڑا کام یہ کیا کہ مدارس میں

عربی زبان کو لازمی قرار دے دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز میں اندلس کے عیسائی عربی زبان سے واقف ہو کر قرآن حکیم اور دین اسلام سے واقفیت حاصل کرنے کے قابل ہوئے اور بڑی کثرت سے بہ طیب خاطر اسلام میں داخل ہونے لگے اور عیسائیوں کی وہ وحشت ونفرت جو مسلمانوں اور اسلام سے تھی وہ یکسر ختم ہو کر اس کی جگہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں محبت ومودت کے جذبات ابھرنے لگے۔ عربی زبان کے لازمی قرار دینے کا اثر اشاعت اسلام کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔ عیسائیوں کے اندر مسلمانوں کا احترام پیدا ہوا اور وہ اپنے عقائد وخیالات کی نادرستی اور غلطی سے واقف وآشنا ہونے لگے۔ دونوں قومیں ایک دوسرے کی رعایت کرنے لگیں اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسلمان عام طور پر عیسائی عورتوں سے شادیاں کرنے لگے۔ عیسائیوں نے خود ہی اسلامی لباس پہننا شروع کر دیا۔ چنانچہ رابرٹ بریفالٹ رقم طراز ہیں:

''ایک پادری گرجے میں اتوار کے دن خطبہ دے رہا ہوتا اور اس کی عبا پر قرآنی آیات کاڑھی ہوئی ہوتیں۔'' (تشکیل انسانیت: ص ۲۶۹)

دل ڈیوران نے لکھا ہے:

''اندلس پر عربوں کی حکومت اس قدر عادلانہ، عاقلانہ اور مشفقانہ تھی کہ اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان کے جج نہایت قابل تھے۔ عیسائیوں کے فیصلے عیسائی جج کیا کرتے۔ پولیس کا انتظام بہت اعلیٰ تھا۔ بازار میں ناپ تول کی کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔ عوام کے لیے عربوں کی حکومت روما کی حکومت کے مقابلے میں ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ انھوں نے بڑے بڑے زمین داروں کی زمینیں مزارعین میں تقسیم کر دہ تھیں۔'' (Age of Faith, P.279)

اندلس میں مسلمانوں کے علمی مراکز چار تھے۔ قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ اور طلیطلہ۔ ہر مرکز میں بڑے بڑے کتب خانے تھے۔ ڈاکٹر ڈریپر اپنی شہرہ آفاق کتاب ''معرکہ مذہب وسائنس'' میں لکھتے ہیں:

''اندلس کے صرف ایک شہر قرطبہ میں ستر لائبریریاں تھیں جنھیں مسلمانوں کے زوال کے بعد متعصب عیسائیوں نے جلا دیا۔ صرف طلیطلہ میں وہاں کے بشپ زینز نے اسی ہزار کتابیں سپرد آتش کی تھیں۔'' (معرکہ مذہب وسائنس: ص ۲۴۵)

سلطان ہشام کی عادات وخصائل اور طرز زندگی میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے ساتھ بہت مشابہت تھی۔ اندلس کی تمام رعایا نے ہشام کو ''سلطان عادل'' کا خطاب دیا تھا اور اسی نام سے اس کا ہر جگہ ذکر کیا جاتا تھا۔

سلطان ہشام کو باغات سے بھی بڑی دل چسپی تھی۔ اس نے قرطبہ میں بڑے بڑے باغات لگوائے۔ خود بھی پودے لگاتا، چنانچہ اس نے پھلوں اور میوہ جات کے درخت عرب سے منگوا کر اپنے باغات میں لگوائے۔ (تاریخ اسپین: ص ۲۴۳)

ہشام علم وفضل کے ساتھ ساتھ شعروشاعری کا عمدہ ذوق بھی رکھتا تھا۔شعراء کا قدردان تھا۔خود نہایت اعلیٰ درجے کے شعر کہتا تھا اوران کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ مطربہ عورتیں انھیں بڑے شوق سے گاتیں۔
(تاریخ اسپین:ص ۲۴۴)

ہشام اوقات نماز کا بہت پابند تھا۔لوگوں کو بھی نماز پڑھنے کی ہدایت کرتا اور جب اندھیری راتوں میں بارش کا طوفان ہوتا اور دیکھتا کہ نمازی باوجود موسم کی خرابی کے نماز کے لیے مسجد میں آگئے ہیں تو انھیں انعام دیتا۔(عبرت نامۂ اندلس:۱/۳۶۸)

مؤرخین نے لکھا ہے کہ ہشام میں دین داری بہت تھی۔وہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے طورطریقوں کا بہت لحاظ رکھتا تھا۔نیک کاموں میں بہت زیادہ مصروف رہتا۔نہایت سادہ اورسیدھا سادا لباس پہن کر قرطبہ کے گلی کوچوں میں پھرا کرتا۔غریبوں سے ملتا،بیماروں کی عیادت کو جاتا،مفلسوں اور ناداروں کے گھروں میں پہنچتا اورنہایت دردمندی سے ان کی تکلیفوں اور ضرورتوں کو معلوم کرکے ان کو رفع کرنے کی کوشش کرتا۔اکثر ایسا ہوتا کہ بارش ہورہی ہے۔زیادہ رات گئے ہشام قصر امارت سے خاموشی سے نکل گیا اور کسی غریب بیمار کے لیے کھانا ساتھ لیتا گیا۔اس کے گھر جاکر بیمار کے پاس تنہا بیٹھا اوراس کی ساری رات تیمارداری کی اور صبح چلا آیا۔

ہشام اپنے باپ عبدالرحمٰن سے بھی زیادہ عابد،زاہد اور مذہبی شخص تھا۔امیر عبدالرحمٰن کی عظمت و سطوت اور بانی سلطنت ہونے کی حیثیت نے دین داروں اور دینی مزاج لوگوں کو دربارشاہی میں ایک حد تک اقتدار حاصل کرنے کا موقع دیا تھا لیکن ہشام کے عہدحکومت میں فقہاء کا اقتدار سب پر فائق تھا۔اسی زمانے میں فقہاء کے الگ الگ مذاہب کی بنیاد رکھی جارہی تھی۔حضرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ کی مدینہ طیبہ میں بڑی شہرت تھی اورحجاز میں عام طور پرلوگ فقہ مالکی کی پیروی کرنے لگے تھے۔حضرت امام مالک رحمہ اللہ کی خدمت میں اندلس کے بعض لوگ حاضر ہوئے اور کچھ عرصہ رہ کر اندلس واپس آئے۔ان سے امام مالک رحمہ اللہ نے سلطان ہشام کے حالات اوراس کی معدلت گستری کا سن کر بڑی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا۔چنانچہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں کوئی شخص اگر خلیفۃ المسلمین ہونے کا مستحق ہے تو وہ صرف ہشام بن عبدالرحمٰن ہے۔امام مالک رحمہ اللہ کا یہ تبصرہ درست اور حقیقت پر مبنی تھا کیونکہ ہشام زاہد و عابد ہونے کے علاوہ عقل مند،مدبر اور بہادر بھی تھا۔وہ بہادری، قابلیت،اہلیت اورسپہ سالاری میں اپنے باپ کا ہم سر اور زہد وعبادت میں باپ سے بھی بڑھ کر تھا۔

امام مالک رحمہ اللہ کے یہ کلمات عباسیوں کو سخت ناگوار گزرتے۔اس لیے عباسیوں کے ہاتھوں انھوں نے سخت اذیتیں اٹھائیں۔اور امام مالک رحمہ اللہ کیا؟ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سبھی نے عباسیوں کے ہاتھوں کوڑے کھائے اور پس دیوار زنداں رہے۔ہشام کے ابتدائی عہد حکومت میں ابن عباس،عیسیٰ بن دینار اورسعید بن ابی ہند جو ملک اندلس کے مشہور فقہاء اور علماء میں سے تھے،حج کے ارادہ سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ان کے ساتھ اور بھی کئی علماء اور اکابر تھے۔ان سب لوگوں کی جب

حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے ملاقات ہوئی تو وہ سب ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے۔ چند روز ان کی صحبت سے مستفید ہو کر اندلس واپس گئے اور امام مالک رحمہ اللہ کے خیالات اور عقائد کی اشاعت کرنے لگے۔ ان کی تبلیغ کا یہ اثر ہوا کہ اندلس کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ابوعبداللہ زید نے بھی مالکی مسلک کو پسند کیا۔ سلطان ہشام ان لوگوں کی سب سے زیادہ قدر و منزلت کرتا اور انھی لوگوں کو ہی زیادہ اپنی صحبت میں رکھتا، لہٰذا سلطان نے بھی امام مالک رحمہ اللہ کے مسلک کو قبول کر کے حکم دیا کہ ہر سال سرکاری خزانے سے ان لوگوں کے مصارف برداشت کیے جائیں جو امام مالک رحمہ اللہ کی خدمت میں فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے جائیں۔ چنانچہ نومسلم عیسائیوں اور نومسلموں کی اولاد نے اس طرف زیادہ توجہ کی، اور حقیقت یہ ہے کہ ان نو مسلموں میں دینی احکام کی پابندی اور عبادت کا شوق زیادہ تھا۔ سلطان ہشام اور شیخ الاسلام ابوعبداللہ کے مالکی مسلک اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کا مسلک مالکی ہو گیا اور تمام ملک میں مالکی فقہ کے مطابق قاضیوں کے فیصلے صادر ہونے لگے۔ ہشام کے عہد حکومت میں صدقات و زکوٰۃ کتاب و سنت کے بالکل موافق وصول کیے جاتے تھے۔

ولی عہدی:

سلطان ہشام جب بیمار ہوا اور بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو اس نے تمام ارکان سلطنت کو جمع کیا اور ان سے الحکم کے لیے حلف لیا کہ اس کے ساتھ وفادار رہیں گے۔ پھر خلیفہ نے حالت نزع میں اپنے بیٹے الحکم کو بلایا۔ اس وقت اس کی عمر بائیس سال تھی۔ نہایت حسین اور طباع تھا۔ خلیفہ ہشام نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے خطاب فرمایا اور کہا:

''اے میرے بیٹے! میری نصیحتیں اپنے کوزۂ ذہن میں محفوظ رکھنا۔ محبت کے تقاضے سے میں تم کو یہ باتیں بتا رہا ہوں ان کو گرہ میں باندھ لینا۔ بیٹا! یہ خیال رکھنا کہ سلطنت اور حکومت کا اصل والی اور مالک اللہ تعالیٰ ہے، اور جب وہ چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ اپنے عطایائے ربانی سے اختیار اور دبدبۂ شاہی عطا فرمائے تو ہم کو اس کی اس نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اس کی رضا اور خوشنودی کو پورا کرنا واجب سمجھنا چاہیے۔ بطور مسلمان حکمران ہمارے فرائض و ذمہ داریوں کی اصلی غرض یہ ہے کہ ہم تمام مخلوقات کے ساتھ نیکی سے پیش آئیں اور خصوصاً ان کے ساتھ جن کو ہماری حفاظت میں تفویض کیا گیا ہے۔ امیر اور غریب کے ساتھ برابر عدل کرنا، ظلم کو قریب بھی نہ پھٹکنے دینا اس لیے کہ یہ ظلم تباہی کا دروازہ کھولتا ہے۔ اپنی رعایا، ملازمین اور نوکروں پر مہربان رہنا وہ اس لیے کہ ہم سب ایک خالق کی مخلوق ہیں، اور حکومت کے عہدے اور مناصب انھی کے سپرد کرنا جو عمدہ صفات کے حامل ہوں اور ایسے وزراء کو بے رحمی سے سزا دینا چاہیے جو بے فائدہ اور بے قاعدہ

محصولات سے رعایا کو تنگ کریں اور نرمی اور مستقل مزاجی سے فوج پر حکومت کرنا، اور جب لشکر کشی پر مجبور ہو تو ہمارا لشکر ملک کا محافظ ہو نہ کہ غارت گر ملک، کیوں کہ فوج کا کام ملک کی حفاظت کرنا ہے ملک کو تباہ کرنا نہیں۔ فوج کی تنخواہ ہمیشہ وقت پر دینا اور پوری دینا۔ ان سے جو وعدہ کرنا وہ ضرور پورا کرنا۔ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرنا کہ رعایا تم کو محبت کی نگاہ سے دیکھے نہ کہ نفرت و ناپسندیدگی کی نگاہ سے۔ رعایا کو زیادہ ڈرانا اور خوف زدہ رکھنا استحکام سلطنت کے لیے نہایت مضر ہے۔ اسی طرح رعایا کا بادشاہ سے تنفر نقصان رساں اور باعث زوال سلطنت ہے۔ کاشت کاروں کے حال سے کبھی بھی بے خبر نہ رہنا۔ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا کہ فصلیں تباہ اور برباد نہ ہونے پائیں کیونکہ یہ لوگ ہماری روزی کے واسطے زمین سے فصلیں اگاتے ہیں۔ چراگاہیں برباد نہ ہونے دینا۔ باغات کو پامال نہ ہونے دینا۔ تمہارا مجموعی طرز عمل ایسا ہو کہ تمھاری رعایا تم کو دعائیں دے اور تمھارے زیر سایہ خوشی سے اپنی زندگی گزارے اور ہم بھی حلاوت زندگی کا مزہ آسودگی میں پائیں۔ اگر تم نے ان باتوں کو ملحوظ رکھا تو تم خوش حال رہو گے اور روئے زمین کے نامور بادشاہوں میں تمہارا شمار ہوگا اور ان کی مانند تم کو دبدبہ اور سطوت حاصل ہوگی۔"

وفات:

ہشام نے سات سال آٹھ ماہ حکومت کی اور سنہ ۱۸۰ھ مطابق ۷۹۶ عیسوی میں انتقال کیا اور قرطبہ میں دفن ہوا۔ ہشام نے صرف چالیس سال عمر پائی، گویا جوانی ہی میں راہی ملک عدم ہو گیا۔ خلیفہ کے جنازے کے ساتھ لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم تھا جن میں سے اکثر گریاں تھے۔ ولی عہد الحکم نے خود اپنے باپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اس کے بعد لوگوں کو الحکم کے خلیفہ نامزد ہونے کا بتایا گیا اور اس کے نام کا خطبہ تمام مساجد میں پڑھا جانے لگا۔ (خلافت اندلس: ص ۲۵۶)

خلاصہ یہ کہ سلطان ہشام کا قریباً تمام عہد لڑائیوں میں گزرا، لیکن جب اس کے مذہبی، علمی، اخلاقی اور معاشرتی کارناموں پر غور و فکر کیا جائے تو اس بات کا تصور دشوار اور مشکل ہو جاتا ہے کہ ہشام نے جنگی کارنامے بھی کیے ہوں گے اور بغاوتوں کو بھی فرو کیا ہوگا اور بڑے بڑے بادشاہوں کو نیچا دکھایا ہوگا اور ہر ایک میدان میں فتح یابی کا جھنڈا بلند کیا ہوگا۔ بہر حال اندلس میں خاندان بنو امیہ کی خلافت کے قائم ہونے اور قائم ہو کر تین سو برس باقی رہنے کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ امیر عبدالرحمن بانی حکومت اندلس کے بعد ہشام جیسا ہمہ صفت موصوف سلطان تخت اندلس پر بیٹھا۔ اگر ہشام کی جگہ کوئی دوسرا کم قابلیت والا سلطان ہوتا تو بنو امیہ میں سلسلۂ خلافت قائم رہنا بے حد دشوار تھا۔ افسوس یہ ہے کہ اس کو حکومت کرنے کے لیے بہت کم وقت ملا یعنی صرف سات سال اور آٹھ ماہ۔ تاہم اس کی تلافی اس طرح ہوگئی کہ ہشام کے بعد اس کا بیٹا حکم بھی ایک نہایت موزوں شخص تھا جو مسند حکومت پر جلوہ افروز ہوا۔

خلیفہ حکم بن ہشام

ہشام بن عبدالرحمٰن الداخل کے انتقال کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کا بیٹا حکم مسند خلافت پر بیٹھا۔ یہ نہایت ذی علم تھا، لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں تلون مزاجی بہت زیادہ تھی۔ اس نے تمام عہدوں پر انھی لوگوں کو برقرار رکھا جو اس کے باپ ہشام کے عہد میں تھے۔ وزارت کے عہدے پر اس نے اپنے استاذ اور حاجب امیر عبدالکریم بن مغیث کو سرفراز کیا۔ حکم سنہ ۱۸۰ھ میں مسند نشین ہوا لیکن مسند خلافت پر بیٹھتے ہی اس کے خلاف بہت بڑی بغاوت نے سر اٹھایا۔

سلیمان اور عبداللہ کی بغاوت:

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ حکم کے چچا سلیمان کو ان کے بھائی ہشام نے ان کی بغاوت پر قابو پانے کے باوجود معاف کر دیا تھا اور وہ سرزمین اندلس کو چھوڑ کر افریقہ (مراکش) آ گیا تھا لیکن پھر بھی بغاوت کے جراثیم اس میں امنڈتے رہے اور وہ عیسائیوں کا ایجنٹ بن کر خط و کتابت کے ذریعے اندلس میں بغاوت اور شورش پیدا کرنا چاہتا تھا۔ جب انسان کی آنکھوں پر خود غرضی اور حسد کے دبیز پردے چھا جاتے ہیں تو پھر اس کو دوست دشمن میں تمیز نہیں رہتی۔ سلیمان اور عبداللہ بخوبی جانتے تھے کہ عباسیوں نے ان کے خاندان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور وہ خود بھی عبدالرحمٰن الداخل ہی کی وجہ سے عباسیوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے سے بچے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سرشت میں بغاوت بھری ہوئی تھی۔ جتنی دفعہ انھوں نے بغاوت کی اتنی دفعہ ہی انھیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مراکش میں رہنے کے باوجود سلیمان خط و کتابت کے ذریعے اندلس کے اندر بغاوت پھیلانے میں مصروف تھا۔ ہشام کا دوسرا بھائی عبداللہ طلیطلہ کے متصل اپنی جاگیر میں مقیم تھا جو ہشام ہی نے اسے مرحمت کی تھی۔ ہشام کی وفات کا سن کر عبداللہ فوری طور پر طلیطلہ سے بھاگ کر اپنے بھائی سلیمان کے پاس گیا جو اس وقت مراکش (افریقہ) کے شہر تنجیر میں مقیم تھا اور اس کے پاس بربریوں اور ڈاکہ زنوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ اپنی غلط کاریوں کے باعث ان لوگوں نے وہاں کے علاقے کو لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کی جولان گاہ بنا رکھا تھا۔ تنجیر میں دونوں بھائیوں نے اندلس کی سلطنت پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔

یہ دونوں چچا اپنے بھتیجے سے زمام اقتدار چھیننے کی ساز باز کر رہے تھے جس کے باپ نے دو تین مرتبہ ان کی جان بخشی کی تھی۔ کسی عربی شاعر نے سچ کہا ہے:

الاقارب كالعقارب فى الايذاء فـلا تـفـرح بـعـم أو بـخـال

فكـم عـم يـكـون الـغـم فيه وكـم خـال عن الاحسان خال

''عزیز و اقارب ایذا دینے میں بچھوؤں کی مانند ہوتے ہیں پس تو کسی چچا اور ماموں کو دیکھ کر خوش نہ ہو کہ یہ تیرے کام آئیں گے۔ بہت سے چچا غم کا باعث بنتے ہیں اور بہت سے ماموں احسان سے خالی ہوتے ہیں۔''

یہی کچھ حکم بن ہشام کے ساتھ ہو رہا تھا۔ شارلیمین شاہ فرانس سے اور دوسرے سرحدی رئیسوں سے پہلے ہی سلیمان نے خط و کتابت کے ذریعے ساز باز کر رکھی تھی۔ اب تجویز یہ قرار پائی کہ عبداللہ خود شارلیمین کی خدمت میں فرانس جائے اور اس کو اندلس پر حملہ کرنے کی ترغیب دے یعنی فرانس کے بادشاہ کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اندلس پر فوج کشی کر کے اس بغاوت کو جو ہم اندرون ملک برپا کریں گے، کامیاب بنا دے۔ حسب تجویز عبداللہ شاہ فرانس کے پاس گیا۔ شارلیمین نے اس کے ساتھ وعدہ کیا اور ایک لشکر جرار ترتیب دے کر اپنے بیٹے کی سپہ سالاری میں سرحد اندلس پر روانہ کر دیا۔ عبداللہ نے واپس آ کر طلیطلہ کے گورنر کو اپنے حسب منشاء بغاوت پر آمادہ کر کے طلیطلہ پر خود قبضہ کر لیا۔ طلیطلہ اندلس کا قدیمی دارالحکومت تھا۔ یہاں عیسائیوں کی آبادی بہت زیادہ تھی اور جو مسلمان تھے وہ نومسلم تھے جو اپنے عیسائی بزرگوں اور قدیمی عیسائی بادشاہوں کی حکمرانی کے افسانوں کو فخریہ بیان کرنے اور یاد رکھنے کے عادی تھے۔ اس لیے طلیطلہ کے عیسائیوں اور عیسائیوں کے ہم قوم نومسلموں کو بڑی آسانی سے بغاوت پر آمادہ کیا جا سکتا تھا۔ یہاں امیر عبدالرحمٰن الداخل کو بھی بہت عزت و محبت کے ساتھ یاد کیا جاتا تھا اور عبدالرحمٰن کے بیٹے عبداللہ کو عبدالرحمٰن کے پوتے حکم کے مقابلے میں زیادہ عزت و تکریم کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ غرض ایسے کئی اور اسباب موجود تھے کہ عبداللہ کو طلیطلہ پر قبضہ کرنے میں بڑی آسانی ہوئی۔ دوسری جانب سلیمان بن عبدالرحمٰن نے مراکش سے اندلس کے صوبہ بلنسیہ میں پہنچ کر اپنے آپ کو خاندان سلطنت میں سب سے زیادہ مستحق اور بڑی عمر کا شخص ہونے کی وجہ سے سلطنت اندلس کا مستحق بتا کر اپنی امارت کا اعلان کر دیا اور اس صوبے میں اپنا عمل دخل قائم کر لیا۔

سلیمان اور عبداللہ کے اعلان بغاوت کے ساتھ ہی حسب قرار داد شارلیمین کے بیٹے نے جبل البرتات سے گزر کر اندلس کے میدان میں قدم رکھا اور کئی شہروں کو فتح کرنے کے بعد برشلونہ کا محاصرہ کر لیا۔ برشلونہ کے گورنر زید نے شارلیمین کی اطاعت قبول کر لی مگر قلعہ کے اندر فرانسیسی فوج کو داخل نہیں ہونے دیا۔ دوسری طرف ایکیوٹین کی ریاست کے فرمانروا لوئی نے جبل البرتات کے مغربی حصے کو عبور کر کے اندلس کے شمالی اور مغربی علاقے کو تاخت و تاراج کر ڈالا اور لاردہ و وشقہ پر قابض ہو گیا۔ اندرون ملک سلیمان اور عبداللہ

نے ملک کے نہایت اہم اور مرکزی شہروں اور صوبوں پر قبضہ کر لیا اور شمال کی جانب سے عیسائیوں نے زبروست حملہ کر کے شمالی اندلس کو تہ و بالا کر دیا۔ یہ خطرات معمولی نہ تھے اور اندلس کے ہاتھ سے نکل جانے میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی۔

جب حکم بن ہشام نے سب سے پہلے طلیطلہ کی بغاوت کا حال سنا تو فوراً فوج لے کر اس نے طلیطلہ کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں عبداللہ نے مدافعت میں مستعدی دکھائی۔ ابھی اس محاصرے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا کہ شمالی اندلس کے قبضے سے نکل جانے اور عیسائیوں کے حملہ آور ہونے کی اطلاع ملی۔ حکم نے عیسائی حملے کو اپنے چچاؤں کی بغاوت سے زیادہ اہم اور خطرناک سمجھ کر طلیطلہ سے محاصرہ اٹھا کر فوراً شمال کی جانب کوچ کر دیا۔ حکم کے پہنچنے کی خبر سن کر شارلیمین کی افواج برشلونہ اور نواح برشلونہ سے نہایت عجلت کے ساتھ فرار ہو گئیں۔ اور اس طرح فرار ہوئیں کہ راستے میں کسی جگہ انھوں نے ٹھہرنا اور دم لینا مناسب نہ سمجھا بلکہ فرانس ہی میں جا کر دم لیا۔ اس کے بعد حکم بن ہشام وشقہ اور لاردہ کی جانب متوجہ ہوا۔ وہاں کی عیسائی افواج بھی قتل و غارت کے ہنگامے برپا کرنے کے بعد حکم بن ہشام کے قریب پہنچنے کی خبر سن کر بھاگ گئیں اور ایکیوٹین میں جا کر دم لیا۔ سلطان حکم نے اندلس کا علاقہ عیسائیوں سے خالی کروا کر کوہ پیری نیز جبل البرتات کے شمال میں پہنچ کر فرانس کے جنوبی حصے کو تاخت و تاراج کیا اور شہر ناربون کو عیسائیوں سے چھین لیا۔ ادھر حکم عیسائیوں کے تعاقب میں فرانس تک پہنچ گیا، ادھر عبداللہ اور سلیمان نے موقع پا کر اندلس کے شہروں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا اور سلطان حکم کے عاملوں اور حکام کو بے دخل کرنا شروع کیا۔ یہ دونوں بھائی فتوحات کرتے ہوئے دریائے ٹیگس پر ایک دوسرے سے آ ملے، لیکن اس کے بعد انھوں نے اپنی فتوحات کو جاری نہیں رکھا بلکہ دونوں اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ فرانس میں حکم کے ساتھ کیا معاملہ پیش آتا ہے۔ یہ دونوں بھائی اس بات کے خواہش مند تھے کہ فرانسیسی حکم پر غالب آ جائیں اور حکم کا وہیں خاتمہ ہو جائے تو ہم تمام اندلس پر قابض ہو کر اپنی حکومت شروع کر دیں۔ اسی طرح حکم کے عامل بھی اسی انتظار میں اپنی جگہ خاموش اور متامل تھے کہ دیکھیے حکم کے اس عاجلانہ حملے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اللہ نہ کرے اگر حکم فرانس میں مارا جاتا تو تمام عامل اور گورنر بخوشی سلیمان اور عبداللہ کی اطاعت قبول کر لیتے کیونکہ یہ دونوں امیر عبدالرحمٰن الداخل کے بیٹے تھے، مگر فرانس میں جب حکم داخل ہوا تو نصرت ایزدی اس کے شامل حال ہوئی اور وہاں کی افواج پر اس کا اس قدر رعب و جلال طاری ہوا کہ وہ اس کے آگے ہر مقام پر بھاگتی ہوئی نظر آئیں۔ ممکن تھا کہ حکم اس ملک کو فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کرنے اور اپنے عامل مقرر کرنے کی کوشش کرتا اور کچھ روز فرانس میں گزارتا لیکن اس کو بخوبی معلوم تھا کہ اندلس کے اندر اس کے کیسے طاقتور دشمن موجود ہیں اور وہاں اس کی غیر موجودگی کس قدر مضر اور نقصان دہ ثابت ہوگی، چنانچہ وہ عیسائیوں کو خوف زدہ کر کے فوری طور پر اندلس کی جانب لوٹا۔

حکم کی واپسی کی خبر سن کر سلیمان اور عبداللہ نے اپنی طرف سے عبیدہ بن عمیرہ کو طلیطلہ کا گورنر مقرر کر

کے خود فوجیں لے کر حکم کو آگے بڑھ کر روکا۔ حکم کے فتح مند آنے کی وجہ سے ان دونوں بھائیوں کی ہمتیں پست ہو چکی تھیں۔ مقابلہ ہونے پر ان دونوں نے بری طرح شکست کھائی اور فرار ہو کر اندلس کے مشرقی کوہستان میں جا کر پناہ لی۔ سلطان حکم نے عمرو بن یوسف اپنے ایک سردار کو تو طلیطلہ کے محاصرے پر مامور کیا اور خود سلیمان اور عبداللہ کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ کئی مہینے تک سلیمان اور عبداللہ پہاڑوں میں حکم کو پریشان کرتے پھرے اور کہیں مقابلہ نہ ہوا۔ آخر کار وہ مرسیہ کے اسی میدان میں نکلے جہاں چند روز قبل بحالت شہزادگی حکم نے سلیمان کو شکست دی تھی۔ ادھر سلیمان بھی مقابلے میں پہنچ گیا۔ دونوں فوجوں نے خوب جم کر اور جی توڑ کر ایک دوسرے کے مقابلہ کیا۔ آخر ایک تیر سلیمان کو آ کر لگا اور اس کا کام تمام ہو گیا۔ سلیمان کے مارے جاتے ہی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ عبداللہ نے فرار ہو کر بلنسیہ میں جا کر قیام کیا اور سلطان حکم کے پاس عفو تقصیرات اور اپنی غلطیوں اور بغاوتوں کی معافی کی درخواست کی۔ حکم نے اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیتے اور عبداللہ کو اپنے باپ کا بھائی سمجھتے ہوئے معافی کی درخواست کو فوراً منظور کر کے یہ شرط عائد کر دی کہ عبداللہ اپنے دونوں بیٹے اصبغ اور قاسم کو میرے پاس بطور یرغمال چھوڑ دیں اور اندلس سے مراکش کے مقام تنجیر واپس چلے جائیں اور وہاں مستقل قیام کریں۔ دوبارہ اندلس آنے کی تکلیف گوارا نہ کریں۔

عبداللہ نے فوری طور پر یہ شرط مان لی کیونکہ اب اس کی اپنی جان خطرے میں تھی اور تنجیر میں سکونت اختیار کر لی۔ حکم اپنے ان چچا زاد بھائیوں کے ساتھ نہایت محبت وشفقت کا برتاؤ کرتا رہا اور چھوٹے بھائی کو شہر مریدہ کا گورنر مقرر کر کے بڑے کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کر دی۔ جب حکم سلیمان اور عبداللہ کے تعاقب میں مصروف تھا تو عمرو بن یوسف نے شہر طلیطلہ کو فتح کر کے عبیدہ بن عمیر کو گرفتار کر کے قتل کر دیا اور اپنے بیٹے یوسف کو طلیطلہ کا حاکم مقرر کر کے خود عبیدہ کا سر لے کر سلطان حکم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے بعد سرقسطہ میں بغاوت نمودار ہوئی۔ عمر بن یوسف اس طرف گیا اور وہاں کے باغیوں کو قرار واقعی سزا دے کر اس بغاوت کو فرو کیا۔ ان تمام خطرناک بغاوتوں کا سلسلہ سنہ ۱۸۱ھ میں شروع ہوا تھا اور تین برس یعنی سنہ ۱۸۴ھ میں ختم ہوا اور تمام اندلس میں امن وسکون اور اطمینان نظر آنے لگا۔

عیسائیوں کی ایک اور سازش:

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ ان سازشوں اور بغاوتوں کے شروع میں حکم بن ہشام عیسائیوں کو سزا دینے اور انہیں چھٹی کا دودھ یاد کرانے کے لیے فرانس میں داخل ہو گیا اور عیسائی فوج اس کے مقابلے پر نہیں ٹھہر سکی بلکہ ایسے بھاگی تھی جیسے باز کے آگے چڑیاں۔ اس تین سال کے عرصے میں کلیساؤں نے اپنی اس زبوں حالت کو محسوس کیا اور مسلمانوں کے خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے نہایت موزوں اور صحیح تدابیر سوچیں۔ وہ یہ کہ سلسلۂ جبل البرتات کے مغربی حصے میں جہاں خلیج بسکی، صوبہ جلیقیہ اور فرانس کی حدود ملتی ہیں ایک عیسائی

ریاست ایسٹریاس کے نام سے وہاں قائم ہو چکی تھی۔ ایک زبردست ریاست جبل البرتات کے مشرقی حصے کے شمال اور فرانس کے جنوب میں گاتھ قوم کے سرداروں نے اندلس سے باہر نکل کر قائم کر لی تھی۔ یہ ریاست بڑی طاقتور تھی اور ریاست ایکیوئین کے نام سے مشہور تھی۔ دوسری طرف فرانس میں سب سے زیادہ وسیع ملک پر ایک قدیمی سلطنت قائم تھی جس کا بادشاہ شارلیمین تھا۔ اس کے علاوہ صوبہ برشلونہ، اراگون، اربونہ اور خلیج بسکی کے جنوبی ساحل یعنی جلیقیہ وغیرہ میں سرکش عیسائیوں کی غالب آبادی تھی۔ مسلمان برائے نام اس طرف کہیں نظر آتے تھے۔ ان شمالی علاقوں کی حکومت ہمیشہ معرض خطر میں رہتی تھی۔ عیسائی قبائل جب کبھی اپنے مسلمان حاکموں کو کمزور دیکھتے تھے تو بغاوت پر آمادہ ہو جاتے یا آمادہ کیے جا سکتے تھے۔

سلطان حکم بن ہشام کو اندرونی بغاوتوں میں مصروف دیکھ کر عیسائیوں نے ایک زبردست کونسل یا مجلس مشاورت شہر نولوا میں منعقد کی۔ اس کونسل میں مذکورہ بالا تمام عیسائی ریاستوں اور حکومتوں کے سربراہ اور سردار، اندلس کے شمالی حصوں کے عیسائی امراء سب اکٹھے ہوئے اور ایک زبردست عیسائی اتحاد مسلمانوں کے خلاف قائم کیا گیا۔ ایکیوئین اور فرانس کے بادشاہوں میں صلح کرائی گئی۔ اسی طرح ایسٹریاس کی ریاست جو اب تک سب سے الگ اور بے تعلق تھی، نے بھی اس متحدہ محاذ میں شرکت کی اور جبل البرتات کے جنوب اور اندلس کے شمال میں جہاں سرکش اور جنگ جو عیسائیوں کی غالب آبادی تھی، عیسائی ریاستیں قائم کرنے کی تجاویز پاس ہوئیں۔ مسلمانوں نے بارہا جبل البرتات کو طے کیا اور فرانس کے میدانوں میں اپنے گھوڑے دوڑائے لیکن فرانسیسیوں کے لیے جبل البرتات کو عبور کرنا ہمیشہ دشوار اور نقصان رساں ثابت ہوا۔

مسلمانوں کے مقابلے کے لیے ایک جدید ریاست کا قیام فرانسیسی حکمران شارلیمین کا منصوبہ تھا۔ اس نے جنوبی فرانس کا ایک ٹکڑا جو جبل البرتات کے دامن میں تھا، الگ کر کے ایک چھوٹی سی جدید ریاست قائم کی اور وہاں کا حاکم فرانس کا ایک رئیس بوریل نامی مقرر کیا گیا۔ اس ریاست کا نام ''گاتھک مارچ'' رکھا گیا اور اس کے رئیس کو خود مختار حاکم قرار دے کر اس امر کی ہدایت کی گئی کہ وہ مسلمانوں کے لیے جبل البرتات کو ناقابل گزر بنائے اور ان کو وہاں سے گزرنے سے روکنے کے لیے ہمیشہ تیار رہے۔ اس ریاست کو بادشاہ ایکیوئین کی سرپرستی میں دے دیا گیا۔ جبل البرتات کے دامن میں جابجا مناسب موقعوں پر زبردست قلعے تعمیر کیے گئے اور اندلس کے شمالی عاملوں کے ساتھ تعلقات اور دوستی پیدا کرنے کے ذرائع اس امید پر سوچے گئے کہ ان کو بغاوت پر آسانی کے ساتھ آمادہ کیا جا سکے۔ ان تمام عزائم اور تیاریوں کی اطلاع خلیفۂ بغداد کو بھی دی گئی اور ہارون الرشید کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے اور تحف و ہدایا بھیجنے کے ذریعے عیسائیوں کی قدرے ہمت افزائی ہوئی۔ اس نئی ریاست گاتھک مارچ نے جبل البرتات کے مشرقی اور جنوبی حصے پر بھی قبضہ جما لیا اور شمالی اندلس کے عیسائیوں نے اس کے لیے ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی۔ غرض یہ نئی ریاست ایسٹریاس کی ریاست کے نمونے پر ایک پہاڑی ریاست بن گئی اور جس طرح ایسٹریاس کی ترقی و طاقت میں پادریوں نے خاص طور پر اضافے

کی کوشش کی تھی اسی طرح اس ریاست کو طاقتور اور مضبوط بنانے کے عمل کو بھی مذہبی کام قرار دیا گیا۔ وہ عیسائی جو ایکیوٹین، ایسٹریاس یا فرانس کی حکومتوں اور حاکموں سے کسی وجہ سے ناراض اور ناخوش تھے، وہ بجائے اس کے کہ مسلمانوں کی حکومت میں آ کر آباد ہوتے، اس نئی ریاست میں آ آ کر آباد ہونے لگے اور کوہی علاقہ (Mountain Aria) جو بالکل ویران اور غیر آباد ہوا تھا آباد اور پر رونق ہونے کے علاوہ ایک طاقتور عسکری چھاؤنی کی شکل اختیار کر گیا۔

غدار مسلمان حکام:

سنہ ۱۸۴ھ کے اواخر میں حکم بن ہشام کو مشکل سے اطمینان حاصل ہوا تھا کہ سنہ ۱۸۵ھ میں عیسائیوں نے شمالی اندلس میں پھر شورش پیدا کر دی اور بعض شمالی شہروں کے عاملوں میں شارلیمین کو خلیفۂ بغداد ہارون الرشید کا دوست اور ایجنٹ سمجھ کر اور اس کی حمایت واعانت کو جائز جان کر حکم کے خلاف آمادہ ہو جانا ہی کار ثواب سمجھا۔ اس موقع پر ان جاسوسوں نے بھی جو خلیفہ بغداد کی طرف سے اندلس میں مامور تھے، کام کرنے کا خوب موقع پایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ وشقہ، گیرون، مون، لریدہ اور ترکونہ وغیرہ شمالی شہروں کے عاملوں نے شاہ فرانس کو اپنا بادشاہ تسلیم کر کے سلطان حکم کی فرمان برداری سے انکار اور شارلیمین کے احکام کی اطاعت کا اقرار کیا۔ اس طرح یکا یک ریاست ''گاتھ مارچ'' اندلس کے شمالی میدانوں میں وسیع ہو کر اور ان مسلمانوں کو اپنا مطیع پا کر خوب طاقتور اور مضبوط ہو گئی۔

اسی طرح جلیقیہ اور ساحل بسکی کے عاملوں نے جن میں حاکم سرقسطہ بھی شامل تھا عیسائی بادشاہوں کی اطاعت کا اعلان اور سلطان حکم سے بغاوت کا اظہار کیا۔ اس نئی مصیبت کے مقابلے کو سلطان حکم تیار تھا اور وہ اس مہم میں کامیاب بھی ضرور ہوتا لیکن وہ خود اس وجہ سے قرطبہ سے حرکت نہ کر سکا کہ یہاں دارالحکومت کی فضا بھی خراب ہو رہی تھی اور اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ سلطان دارالحکومت میں مقیم رہ کر بغاوت و سرکشی کے ان جرثوموں کا علاج کرے جو ملک کے گوشے گوشے میں سرایت کر گئے تھے اور روز بروز بڑھ رہے تھے اور جن کو خود سلطان کے رشتے داروں اور مسلمانوں نے تقویت پہنچائی تھی۔ شمالی حصۂ ملک کے بچانے اور عیسائیوں کے قبضے سے نکالنے کے لیے اس نے اپنے سپہ سالار ابراہیم کو روانہ کیا۔ ابراہیم نے پہلے جلیقیہ اور سرقسطہ کی جانب فوج کشی کی اور اس علاقے کو بہت سی لڑائیوں اور خون ریزیوں کے بعد عیسائیوں سے واپس چھینا۔ باغی عامل عیسائی فوج اور عیسائی باشندوں کے ساتھ بھاگ بھاگ کر شارلیمین کے پاس فرانس پہنچے اور اس کو اندلس پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ ابراہیم بھی جلیقیہ اور سرقسطہ وغیرہ کی طرف اس طرح مصروف ہوا کہ اندلس کے شمال مغربی حصے کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ ان مسلمان عاملین نے جو شارلیمین کے پاس پہنچ گئے تھے، اس کو مشورہ دیا کہ اندلس کی قدیمی گاتھک دارالسلطنت کو آپ نہایت آسانی سے قبضے میں لا سکتے ہیں اور ہم

اس کام میں آپ کی راہ نمائی اور امداد کرنے کو موجود ہیں۔ مسلمان عاملوں کی اس ہمت افزائی نے عیسائیوں کے حوصلوں کو بہت بلند کر دیا۔ چنانچہ ایک مجلس مشاورت فرانس میں منعقد ہوئی اور اس میں یہ قرار پایا کہ ریاست گاتھک مارچ کی حدود میں برشلونہ کی بندرگاہ کو بھی شامل کر لیا جائے۔ برشلونہ کا عامل زید بھی شارلیمین اور کاؤنٹ لوئی سے خط و کتابت رکھتا تھا اور اس کی حمایت اور طرف داری کا اقرار کر چکا تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۸ھ کے آخری ایام میں عیسائی فوجیں گاتھک مارچ کی فوجوں کے ساتھ مل کر اندلس کے شمالی اور مشرقی صوبہ کو پامال کرتی ہوئی برشلونہ تک پہنچیں۔ یہاں کے عامل زید نے ان فوجوں کے آنے پر برشلونہ کے دروازوں کو بند کر لیا اور یہ شہر عیسائیوں کے قبضے میں دینے سے انکار کر دیا۔ عیسائی افواج نے برشلونہ کا محاصرہ کر لیا۔ عیسائیوں نے برشلونہ کے مضافات کو تباہ و برباد کر کے محاصرے میں سختی سے کام لیا۔ زید کو کسی طرف سے کوئی امداد نہ پہنچی۔ آخر برشلونہ پر عیسائیوں نے اس شرط کے ساتھ قبضہ کر لیا کہ وہ مسلمانوں کو وہاں سے اپنے اسباب منقولہ کے ساتھ نکل جانے دیں گے۔ مسلمانوں نے برشلونہ کو خوب مضبوط کر کے ایک گورنر مقرر کر دیا۔ یہ نو مفتوحہ تمام علاقہ گاتھک مارچ کی ریاست میں شامل ہو گیا۔ اسلامی فوجوں کے لیے شمالی اندلس میں اب دو محاذ جنگ ہو گئے۔ ایک ریاست ایسٹریاس اور صوبہ جلیقیہ کی سرکش عیسائی آبادی کا، جن کو فرانس کی جانب سے برابر امداد پہنچتی رہتی تھی۔ دوسرا گاتھ مارچ اور برشلونہ کے علاقے کی باغی عیسائی رعایا کا جن کو بھی فرانس سے امداد پہنچتی رہتی تھی۔ ادھر جنوب میں سازشوں کا جال پھیلا ہوا تھا اور مسلمان علماء نے نہایت سخت مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ فوجیں جو عیسائیوں کی مدافعت کے لیے روانہ کی گئی تھیں وہ کسی ایک ہی محاذ پر عیسائیوں کے مقابلہ میں مصروف رہ سکتی تھیں۔ چنانچہ صوبہ جلیقیہ کی طرف جا کر انھوں نے عیسائیوں کو شکست فاش دی تو دوسرا محاذ خالی رہا اور برشلونہ قبضے سے نکل گیا۔ اسی طرح اگر وہ برشلونہ کی طرف متوجہ ہوتیں تو سرقسطہ اور جلیقیہ وغیرہ پر عیسائیوں کا قبضہ قائم رہتا اور وہ مزید پیش قدمی کرتے۔

سنہ ۱۸۹ھ میں اندلس کے مسلمان باغی عاملوں نے عیسائیوں کو ترغیب دے کر طلیطلہ پر حملہ کرایا۔ عیسائیوں نے برشلونہ اور شمالی شہروں سے طلیطلہ کی طرف حرکت کی۔ ادھر یوسف بن عمر نے مدافعت پر مستعدی ظاہر کی۔ عیسائیوں نے طلیطلہ کا محاصرہ کر لیا اور شہر طلیطلہ اور اس کے نواح کی عیسائی آبادی نے حملہ آوروں کے لیے ہر قسم کی سہولت بہم پہنچا کر یوسف بن عمر کو طلیطلہ کے عیسائیوں کے ہاتھوں گرفتار کرا کے عیسائیوں کا طلیطلہ پر قبضہ کرا دیا۔ عیسائیوں نے یوسف بن عمر کو صخرۂ قیس میں قید کر دیا اور اندلس کے قدیمی دارالسلطنت پر قابض ہو گئے۔ اس قبضے سے وہ بہت خوش تھے اور خوش ہونا بھی چاہیے تھا کہ مسلمان عاملوں کی غداری کے باعث انھیں یہ فتح نصیب ہوئی ورنہ قبل ازیں ان کو ہر جگہ شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ طلیطلہ کی اس صورتحال کی خبر یوسف بن عمر کے باپ عمر بن یوسف کو پہنچی تو وہ سرقسطہ کی جانب سے ایک لشکر جرار لے کر طلیطلہ کی جانب روانہ ہوا۔ یہاں آ کر ایک عظیم معرکے کے بعد اس نے طلیطلہ کو فتح کر لیا اور یوسف بن عمر کو آزاد کرایا اور عیسائیوں کو وہاں

سے مار بھگایا۔ طلیطلہ پر عیسائیوں کا قبضہ کرانے میں باشندگان طلیطلہ نے جن میں زیادہ تر عیسائی تھے، زیادہ موثر کوشش کی تھی، لہٰذا سب سے زیادہ عتاب و عذاب کے مستحق بھی وہی تھے جنھوں نے طلیطلہ کی حکومت کو بے حد مخدوش بنا رکھا تھا، مگر عمر بن یوسف نے دور اندیشی اور ہوشیاری سے کام لے کر ان غداروں کو کچھ نہیں کہا اور جو جو عذرات باردہ (لنگڑے لُولے بہانے) انھوں نے پیش کیے، ان سب کو منظور کر کے انھیں مطمئن کر دیا۔

حکم کی مخالفت کی وجوہات:

سلطان حکم اپنے باپ ہشام کی طرح ایک بہادر، جفاکش اور نیک دل انسان تھا، اس کی نیکی کا یہ ایک ثبوت ہی کافی ہے کہ اس نے اپنے چچاؤں کو معاف کر دیا جنھوں نے اس کی مخالفت میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے تھے، بلکہ ایک چچا عبداللہ کے بیٹوں کو عنایات خسروانہ سے یہاں تک نوازا کہ ایک کو گورنر اور دوسرے کو اپنا داماد بنا لیا، لیکن جب اس نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو لڑائیوں کا تسلسل برابر جاری تھا اور اندلس کی سلطنت کے بعض حصے کٹ کر عیسائیوں کے قبضے میں جا رہے تھے۔ عیسائی روز بروز طاقتور اور مسلمان آئے دن کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ خود مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی اور ناعاقبت اندیشی تھی۔ حکم کے اعزاء و اقرباء اور رشتہ داروں نے اس کی مخالفت اور خود حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش میں تیغ و تیر سے کام لینے میں جس طرح تامل نہیں کیا تھا اسی طرح انھوں نے سازشوں، شورشوں اور بغاوتوں کے برپا کرانے کی کوشش میں بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ اسی پر بس نہیں ہوا بلکہ انھوں نے عیسائیوں کو ہر قسم کی امداد فراہم کی۔ دوسرے دشمن عیسائی تھے جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور اندلس کی اسلامی سلطنت کو کمزور کرنے کے لیے آپس میں متفق و متحد ہو چکے تھے۔ تیسرے دشمن عباسی تھے جن کی طرف سے حکم کے رشتہ داروں اور عیسائیوں دونوں کی ہمت افزائی ہوتی رہتی تھی۔ خود اندلس کے اندر ان کے حامی موجود تھے جو حکم کو نقصان پہنچانے اور اس کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے ہر وقت تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔ ان تینوں دشمنوں کے علاوہ ایک چوتھا زبردست دشمن اور پیدا ہو گیا تھا۔ یہ مالکی فقہاء تھے جن کا ہشام کے زمانے میں حکومت میں بڑا اثر و اقتدار تھا۔ وہی سلطان ہشام کے مشیر و وزیر اور وہی تمام محکموں کے مالک اور منتظم تھے۔ مذہبی پیشوا ہونے کے باعث عوام اور بھی زیادہ ان کے زیر اثر تھے۔ سلطان حکم نے مسند خلافت پر بیٹھ کر ان فقہاء کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو کم کرنے کی کوشش کی اور ان کی صحبت کو اپنے لیے ضروری نہ سمجھا۔ سلطان کی یہ خود رائی یا خود آرائی ان کو سخت ناگوار گزری۔ وہ حکم کے خلاف نکتہ چینی اور عیب شماری میں مصروف ہو گئے۔ قرطبہ کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) یحییٰ بن یحییٰ جو اندلس کے شیخ الاسلام بنا دیے گئے تھے، وہ اپنے اثر و اقتدار اور احترام و اختیار کو کم دیکھ کر اور بھی زیادہ سلطان کے اعمال و افعال پر رائے زنی اور نکتہ چینی کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس قسم کے تمام مشہور علماء جو مالکی مذہب میں داخل اور سلطان ہشام بن عبدالرحمٰن کے عہد خلافت میں دخیل تھے، فتویٰ بازی پر

اتر آئے۔ اندلس میں یہ فقہی مذہب ابھی نیا نیا جاری ہوا تھا۔ اس سے قبل کوئی مسلمان ان فقہی مذاہب کی تخصیص وتفریق سے واقف نہیں تھا، لہٰذا تمام وہ لوگ جو مالکی مذہب میں داخل تھے، وہ خاص طور پر سلطان حکم کے دشمن اور مخالف ہو گئے۔ اس چوتھے دشمن کی مخالفت کے نتائج سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوئے اور اسی کی وجہ سے سلطان حکم باقی تینوں دشمنوں کا قرار واقعی انسداد نہ کر سکا اور عیسائیوں کو طاقتور بننے اور اسلامی حکومت کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا موقع ملتا رہا۔ بہر حال سلطان حکم کے زمانے میں مذکورہ بالا چاروں مخالف طاقتوں نے مل کر عیسائیوں کو طاقتور ہونے کا خوب موقع دیا۔ اس بارے حکم کی بد احتیاطی اور آزاد مزاجی کو بھی معمولی سا ملزم قرار دیا جا سکتا ہے مگر نہ اتنا کہ جس قدر عام طور پر ہمارے مؤرخین سلطان کو مجرم قرار دیتے ہیں۔ سنہ ۱۹۰ھ میں ان فقہاء اور علماء نے اپنی سازشوں اور کوششوں کو عملی جامہ پہنانے کا تہیہ کیا۔ قاضی القضاۃ یحییٰ بن یحییٰ اور فقیہ طالوت وغیرہ علمائے قرطبہ نے اپنے ہم خیال علماء اور امراء کو اکٹھا کر کے حکم کی معزولی کا مشورہ کیا اور یحییٰ کی سرکردگی میں ایک وفد قاسم بن عبداللہ حکم کے چچیرے بھائی اور داماد کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سے کہا کہ آپ کو ہم تخت اندلس پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ قاسم نے جواب میں کہا کہ پہلے مجھ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کون کون لوگ اس کام پر آمادہ ہیں؟ اگر ان کی جمعیت اور طاقت وقوت اس قابل ہے کہ سلطان کو معزول کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو میں بخوشی آپ کے مشورے میں شریک ہو سکتا ہوں، لہٰذا کل آپ ان لوگوں کے ناموں کی فہرست میرے سامنے لائیں۔ قاضی یحییٰ اس فہرست کا وعدہ کر کے واپس آئے۔ اگلے روز جب فہرست لے کر پہنچے تو قاسم بن عبداللہ نے پہلے ہی سلطان حکم کو اپنے مکان میں بلا کر پس پردہ چھپا کر بٹھالیا تھا۔ قاضی یحییٰ نے ان لوگوں کے نام قاسم کے منشی کو لکھوانے شروع کیے۔ ادھر پس پردہ سلطان حکم کا منشی بھی بیٹھا ہوا ان لوگوں کے نام لکھ رہا تھا۔ حکم کے منشی کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں میرا نام بھی نہ لکھوا دیا جائے لہٰذا اس نے قلم کو کاغذ پر اس طرح چلانا شروع کر دیا جس سے قلم کی آواز (صریر خامہ) نکلنے لگی۔ پس پردہ لکھنے کی آواز کو سن کر قاضی صاحب اور ان کے ساتھیوں کو یہ شبہ ہوا کہ کوئی پس پردہ چھپا ہوا بیٹھا ہے اور ان ناموں کو لکھ رہا ہے۔ اس شبہ کے پیدا ہوتے ہی یہ لوگ وہاں سے اٹھ کر بھاگے۔ کچھ تو نکل گئے، باقی اسی مکان میں گرفتار کر کے قتل کر دیے گئے۔ ان کی تعداد ۷۲ بتائی جاتی ہے۔ اس کے بعد علم بغاوت علانیہ بلند کر دیا گیا۔ قرطبہ کے جنوب کی جانب دریائے وادی الکبیر کے پار ایک محلّہ آباد تھا۔ اس محلے میں عام طور پر یہی لوگ رہتے تھے جو ان علماء کے زیر اثر اور زیادہ عیسائی قوم کے نومسلم تھے۔ ان لوگوں نے ہجوم کر کے سلطان حکم کے محل پر حملہ کر کے محاصرہ کر لیا مگر حکم نے ان سب کو منتشر کر دیا اور معمولی کشت وخون کے بعد یہ ہنگامہ فرو ہو گیا۔

اسی سال سنہ ۱۹۰ء میں سلطان حکم نے مراکش کی نئی خود مختار حکومت ادریسیہ سے مصالحت اور دوستانہ تعلقات پیدا کیے۔ مراکش میں سلطنت ادریسیہ کا خلافت بغداد سے جدا ہو جانا حکومت اندلس کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا اور اندلس عباسیوں کی ریشہ دوانیوں اور خفیہ سازشوں کے اثرات سے بہت حد تک محفوظ ہو گیا۔

حکومت اندلس کے لیے مراکش کی خودمختاری ایک تائید غیبی تھی اور حکم نے مراکش کی حکومت کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ حکم نے سنہ ۱۹۱ھ تک علمائے قرطبہ کا زور کم کرنے اور حکومت مراکش کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے سے فارغ ہو کر کسی قدر اطمینان حاصل کیا اور شمالی صوبوں کی جانب متوجہ ہو کر ان کی خرابیوں کے تدارک میں مصروف ہو گیا۔

طلیطلہ میں باغیوں کا استیصال:

سنہ ۱۹۱ھ میں حکم نے حالات و واقعات جو وقوع پذیر ہوئے تھے ان کا بغور جائزہ لینے کے بعد یہ رائے قائم کی کہ عیسائی سازشوں کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا سب سے زیادہ سامان طلیطلہ میں موجود ہے اور وہاں کے عیسائی زیادہ ہنگامہ پسند اور عسکری لحاظ سے طاقتور ہونے کی وجہ سے مسلمان اور عیسائی دونوں قسم کے سازش کنندوں کا ملجاء و ماویٰ بنے رہتے ہیں۔ اگر طلیطلہ کو اس کثافت اور گندگی سے پاک وصاف کر دیا جائے اور بغاوت و سرکشی کے اس مرکز کو توڑ دیا جائے تو پھر شمالی صوبوں کے انتظام میں آسانی پیدا ہو سکے گی۔ اس سازشی مرکز کو نیست و نابود کرنے اور اس کی قوت کو توڑنے کے لیے ایک سازش کی گئی کہ ''آہن بہ آہن تواں کوفتن۔'' حکم نے عمر بن یوسف کو بلا کر مشورہ کیا اور اس کے مشورے کے مطابق اس کے بیٹے یوسف بن عمر کی جگہ اس کو طلیطلہ کی مسند حکومت عطا کی گئی۔ عمر بن یوسف نے طلیطلہ پہنچ کر اہل طلیطلہ سے رعایت و مروت کا برتاؤ شروع کیا اور وہاں کے بعض امراء سے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ موجودہ حکامِ سلطنت یعنی بنو امیہ کو تخت حکومت سے معزول کر دینا چاہیے۔ یہ سنتے ہی طلیطلہ کے لوگ بہت خوش ہوئے اور بہت جلد تمام باشندگان طلیطلہ نے عمر بن یوسف کو اپنی جان نثاری اور حمایت کا یقین دلایا۔ اس طرح اہل طلیطلہ کے اصلی خیالات سے واقف ہونے کے بعد عمر بن یوسف نے ان سے کہا کہ موجودہ سلطنت کے ختم کرنے اور اس کو درہم برہم کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم طلیطلہ کے سامنے ایک اور قلعہ تعمیر کریں تاکہ طلیطلہ کا محاصرہ کرنا آسان کام نہ رہے۔ اہل طلیطلہ نے کہا کہ اس قلعہ کی تعمیر کے تمام مصارف ہم خود ادا کریں گے۔ چنانچہ طلیطلہ کے رہنے والوں نے خود ہی چندہ جمع کر کے کافی رقم عمر بن یوسف کی خدمت میں پیش کی اور بہت جلد اور مختصر وقت میں مضبوط قلعہ بن کر تیار ہو گیا۔ اس کے بعد سرحدی عامل نے قرارداد کے مطابق حکم سے فوجی امداد طلب کی کہ اس طرف سے عیسائی حملے کا خطرہ ہے۔ سلطان حکم نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کی قیادت میں ایک زبردست اور عظیم فوج اس طرف روانہ کی۔ یہ فوج راستے میں طلیطلہ ہو کر گزری۔ جب طلیطلہ کے قریب پہنچی تو عمر بن یوسف عامل طلیطلہ نے استقبال کیا اور مراسم میزبانی بجا لایا اور اس جدید قلعہ میں ٹھہرایا اور اہل طلیطلہ سے کہا کہ شہزادہ عبدالرحمٰن ولی عہد سلطنت چونکہ تمہارے شہر میں آیا ہے، لہٰذا تم اس کی مہمان داری اور مدارات میں خوب شوق اور جوش کا اظہار کرو تاکہ اس کے دل میں تمہاری وفاداری اور محبت کا نقش بیٹھ جائے اور تمہاری طرف سے وہ

غافل اور مطمئن رہے۔ اہل طلیطلہ نے اس کے اس مشورے کو پسند کیا اور وہ تمام لوگوں جو فساد و بغاوت اور شورش اور سرکشی کے علمبردار تھے اور حکومت میں انقلاب کے خواہاں تھے، شہزادہ عبدالرحمٰن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کرنے کی اجازت چاہی۔ شہزادے نے بخوشی ان کو اجازت دے دی اور وقت مقررہ پر سب کو طلب کیا۔ اس طرح طلیطلہ کا تمام فاسد مواد جب قلعے کے اندر پہنچ گیا تو سب کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا اور ایک خندق میں جو قلعے کے اندر پہلے ہی سے کھودی گئی تھی، اس میں سب کی لاشوں کو مٹی ڈال کر برابر کر دیا گیا۔ اس کے بعد طلیطلہ سے ہر قسم کے شر و فساد کا استیصال ہو گیا۔ باقی لوگ ان انقلابی لوگوں کے انجام کو دیکھ کر سہم گئے، اور پھر کسی کو بغاوت اور سرکشی کی جرأت اور ہمت نہ ہوئی۔

عیسائیوں سے جھڑپیں:

باغیان طلیطلہ کی بغاوت کی سرکوبی اور سزا دہی سے فراغت کے بعد سلطان حکم بن ہشام نے اب عیسائیوں کے خلاف جو شمالی اندلس اور جبل البرتات سے برشلونہ تک قابض اور متصرف ہو چکے تھے، معمولی قسم کے فوجی دستے بھیجے لیکن پوری طاقت سے اس طرف متوجہ ہونا مناسب نہ سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شمال میں لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کبھی مسلمان عیسائیوں کو شکست دیتے اور کبھی خود ان سے شکست کھا جاتے۔ سات آٹھ برس تک یہی سلسلہ جاری رہا چونکہ مسلمانوں کی پوری اور بڑی طاقت عیسائیوں کے مقابلے میں نہیں بھیجی گئی تھی بلکہ صرف عیسائیوں کی پیش قدمی اور یلغار کو روکنا مقصود تھا۔ لہٰذا ان معرکہ آرائیوں کا نتیجہ عیسائیوں کے حق میں بہت ہی مفید ثابت ہوا۔ ان کے دلوں سے مسلمانوں کا رعب جاتا رہا، ان کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ مسلسل مصروف جنگ رہ کر لڑائیوں میں خوب مشاق اور چابک دست ہو گئے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حکم کے فوجی دستوں نے عیسائیوں کی ریاست گاتھک مارچ، ایسٹریاس اور سرکشان جلیقیہ کو نہایت شوق اور تن دہی کے ساتھ فوجی مشق کرائی اور ان کو میدان جنگ میں لڑنے کی ٹریننگ اور تعلیم دے کر زبردست سپاہی بنا دیا لیکن سلطان کے پاس اس کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا کیونکہ اس کے دل میں اندلس کے باشندوں کی نسبت بدظنی پیدا ہو گئی تھی۔

اس عرصے میں حکم نے دارالخلافہ قرطبہ میں رہ کر ایک جدید فوج مرتب کرنے کی کوشش کی۔ اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ ان سپاہیوں کو فوج میں بھرتی کیا جو اندلس کے جنوبی علاقے میں سکونت پذیر تھے اور شمالی علاقے کے سرکش عیسائیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ نیز جو اسلامی حکومت سے بہت خوش تھے اور بافراغت زندگی بسر کرتے تھے۔ گویا ان عیسائیوں کو مشتبہ مسلمانوں کے مقابلے میں حکومت کا زیادہ وفادار اور معتمد سمجھا گیا۔ عیسائیوں کی فوج تمام اندلس کو قبضے میں رکھنے اور ہر قسم کے باغیوں کا سر کچلنے اور ان کی سرکوبی کے لیے کافی نہ تھی، لہٰذا سلطان حکم نے ملک جیش، وسط افریقہ، ایشیائے کوچک اور ایشیاء کے دوسرے ممالک

کے غلاموں اور حربی قیدیوں کی خریداری شروع کی اور اپنے اہل کاروں کے ذریعے دور دور سے غلاموں کو خرید کر منگوایا۔ ان غلاموں کی ایک زبردست فوج تیار ہوگئی۔ یہ لوگ چونکہ عربی زبان سے ناواقف تھے لہٰذا عجمی کہلاتے تھے اور اپنے آقا یعنی حکم کی حفاظت کرنے اور میدان جنگ میں لڑنے کے سوا اور کچھ نہ جانتے تھے۔ نہ وہ کسی سازش میں شریک ہو سکتے تھے، نہ کسی سے تعلقات محبت استوار کر سکتے تھے۔ ان غلاموں کو اعلیٰ درجے کی فوجی تربیت دی گئی اور حکم نے بذات خود ان کی تعلیم و تربیت کی جانب اپنی توجہ مبذول رکھی۔ حکم درحقیقت غلاموں کی ایسی فوج مرتب کرنے اور اس کے ذریعے سلطنت کو قائم رکھنے کی تدبیر کا موجد ہے۔ بعد میں اسی کی تقلید مصر کے ایوبی خاندان نے کی تھی اور مملوکوں کی فوج مصر میں قائم ہو کر آخر کار سلطنت کی مالک بنی تھی۔
جب سلطان حکم کو اس عیسائی اور عجمی فوج کی ترتیب و تکمیل سے اطمینان حاصل ہوا تو اب وقت آ گیا تھا کہ وہ شمال کی طرف عیسائی سرکشوں کی سرکوبی اور فرانسیسیوں پر فوج کشی کے لیے روانہ ہو، مگر قضا و قدر نے ابھی اس کے لیے اندرونی بغاوتوں کے سلسلے کو ختم نہیں کیا تھا۔ اصبغ بن عبداللہ حاکم مریدہ نے ایک غلط فہمی کی وجہ سے علم بغاوت بلند کیا۔ سلطان کو اس کی طرف خود متوجہ ہونا پڑا کیونکہ اصبغ بن عبداللہ سلطان کا چچا زاد بھائی بھی تھا اور بہنوئی بھی۔ آخر اصبغ محصور ہو کر گرفتار ہوا لیکن سلطان کی بہن نے درمیان میں پڑ کر غلط فہمی کو رفع کرا دیا اور سلطان نے اصبغ کو آزاد کر کے اس کی غلطی کو معاف کر دیا اور دارالخلافت قرطبہ میں رہنے کا حکم دیا۔ اس بغاوت سے سلطان ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ ایک اور عظیم الشان خطرہ نمودار ہوا جس سے یکا یک قصر حکومت منہدم ہی ہوا چاہتا تھا۔

مالکی علما و فقہاء مخالفت:

سنہ ۱۹۸ھ میں مالکی گروہ نے پھر سر اٹھایا۔ ایک مرتبہ پہلے ان لوگوں کی کوششوں اور سازشوں کا قلع قمع کر دیا گیا تھا، مگر اب جب کہ عیسائی اور عجمی لوگوں کی فوج تیار ہونے لگی تو ان علماء نے سلطان کے خلاف فتویٰ بازی شروع کر دی اور عجمیوں کے وجود کو شہر قرطبہ کے لیے ایک لعنت قرار دیا۔ گذشتہ سازشؒ میں قاضی یحییٰ بن یحییٰ پیش پیش تھے اور ان کی نسبت اہل اندلس بہت عقیدت و احترام رکھتے تھے، اور ان کو ولی کامل بھی جانتے تھے۔ اسی لیے سلطان حکم نے قاضی یحییٰ کو ماخوذ نہیں کیا تھا اور اس کی ہر ایک مخالفت سے جو اس نے اسٹیٹ کے خلاف کرنے کی کوشش کی تھی، چشم پوشی اور درگزر کیا تھا۔ اس مرتبہ بھی انھیں کے ذریعے طبقۂ علماء اور ان کے معتقدین میں نفرت کے جذبات نے ترقی کی اور قرطبہ والوں نے یہاں تک مبارزت کی کہ جہاں کہیں کوئی اکیلا عجمی مل جاتا اس کو قتل کر دیتے، اس لیے عجمی لوگ شہر میں یا شہر کے گلی کوچوں میں جب کبھی نکلتے تو کئی کئی مل کر اکٹھے نکلتے ورنہ اپنی چھاؤنی ہی میں رہتے، اکیلا کوئی شہر میں نہیں آتا تھا۔
ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ ایک عجمی اور ایک مالکی کے درمیان کسی بات پر ہاتھا پائی کی نوبت پہنچ گئی۔

شہر والے بالخصوص شہر کے جنوبی محلے والے جو وادئ الکبیر کے دوسری جانب آباد تھے اور سب کے سب مالکی مسلک سے تعلق رکھتے تھے، اٹھ کھڑے ہوئے سب نے مل کر قصر سلطانی پر حملہ کر دیا اور خلیفہ حکم کی معزولی کا اعلان کر دیا، ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی جو ان کے ہم خیال تھے، مل گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ یہ لوگ سرائے سلطانی کے دروازے کو توڑ کر اندر گھس گئے اور قصر سلطانی کے محافظ دستے کو قتل کرتے اور پیچھے ہٹاتے ہوئے دوسری ڈیوڑھی پر پہنچ گئے۔ تمام قصر سلطانی میں ایک تلاطم اور گھبراہٹ پیدا ہوگئی۔ سلطان حکم نے اپنے خدمت گار حسن نامی کو آواز دی اور کہا کہ سر میں لگانے کا خوشبودار تیل لاؤ۔ خدمت گار نے تیل حاضر کیا۔ سلطان نے سر میں تیل لگایا۔ حسن نے جرأت کر کے پوچھا کہ اس وقت سخت خطرے کا مقام ہے اور باغیوں نے سرائے سلطانی کے کواڑوں کو آگ لگا دی ہے اور لوگوں کو قتل کرتے اور مارتے ہوئے بڑھے چلے آ رہے ہیں اور آپ کو تیل لگانے اور اپنی زیب و زینت کرنے کی سوجھی ہے۔ سلطان نے جواب دیا: ''احمق! اگر میں اپنے بالوں میں خوشبودار تیل نہ لگاؤں تو باغیوں کو میرا سر کاٹتے وقت یہ کیسے معلوم ہو سکے گا کہ یہ بادشاہ کا سر ہے۔ مؤرخین نے اس بات کو اس ثبوت میں نقل کیا ہے کہ سلطان حکم سخت سے سخت پریشانی اور گھبراہٹ کے موقع پر بھی مستقل مزاج رہتا اور حواس باختہ نہیں ہوتا تھا۔ اور بادشاہوں کا مزاج ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس کے بعد سلطان نے اپنے چچا زاد بھائی اصبغ کو بلا کر حکم دیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو تم اپنے آپ کو باغیوں کے اس محاصرہ سے باہر نکالو اور فوری طور پر وادئ الکبیر کے اس طرف جا کر جنوبی محلے میں آگ لگا دو۔ اصبغ نے اس حکم کی تعمیل کی اور ایک چور دروازہ کے ذریعے اپنے آپ کو باغیوں کے محاصرے سے باہر نکال لینے میں کامیاب ہو کر اور چند ساتھیوں کو اپنے ہمراہ لے کر قرطبہ کی ایک نواحی چھاؤنی میں خبر بھیجی کہ فوراً ہتھیاروں سے لیس ہو کر جنوبی محلے میں پہنچو اور خود وہاں پہنچ کر متعدد مکانوں کو آگ لگا دی۔ اتنے میں چھاؤنی سے فوج بھی پہنچ گئی۔ قصر سلطانی کا محاصرہ کرنے والے باغیوں نے جب جنوبی محلے سے آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بادل اٹھتے ہوئے دیکھے تو وہ لوگ جو اس محلے میں رہتے تھے اور وہی زیادہ تعداد میں اور اس بغاوت کے سرغنے بھی تھے، اپنے مکانوں کو بچانے کے لیے اس طرف دوڑے اور قصر سلطانی فوراً باغیوں سے خالی ہو گیا۔ سلطان نے اس مناسب موقع سے فائدہ اٹھانے میں مطلق کوتاہی نہ کی۔ فوراً اپنے محافظ دستے کو لے کر ان باغیوں کے پیچھے قصر سے روانہ ہوا۔ ادھر سے اصبغ بن عبداللہ نے اور ادھر سے خلیفہ حکم نے حملہ کر کے ان باغیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کو قتل کر دیا۔ پھر قتل کی ممانعت کا حکم دے کر باغیوں کی گرفتاری کا حکم دیا۔ بہت جلد مختلف چھاؤنیوں سے فوجیں آ گئیں اور ایک بڑی تعداد میں باغی گرفتار کر لیے گئے۔

اب مجبور ہو کر حکم نے حکم دیا کہ مالکی مذہب کے جس قدر پیروکار قرطبہ اور اس کے نواح میں موجود ہیں، ان سب کو جلا وطن کر دیا جائے۔ جلا وطنی کا یہ حکم ان لوگوں کے لیے تھا جو علم و فضل سے بہرہ نہیں رکھتے تھے۔ ان میں اکثر نو مسلم عیسائی شامل تھے۔ قاضی یحییٰ اور دوسرے علماء کو بوجہ ان کے علم و فضل کے معاف کر دیا

گیا اور باوجود اس کے کہ اصل موجب فساد انھیں لوگوں کا وجود ہوا تھا، خلیفہ حکم نے یہی کافی سمجھا کہ ان کے معتقدین کو جلاوطن کر کے ان کی طاقت کو توڑا جائے اور ان کے علم و فضل سے خود فائدہ اٹھایا جائے۔ یہ معلوم کر کے نہایت تعجب ہوتا ہے کہ یہی قاضی یحییٰ چند سال کے بعد سلطان کے مصاحب اور بے تکلف مشیر خاص تھے۔ان مالکی لوگوں کی جلاوطنی کے حکم کی تعمیل بڑی سرگرمی سے عمل میں لائی گئی۔ یہ لوگ جب ساحل اندلس پر پہنچے تو ان میں سے آٹھ ہزار آدمی جو اپنے ساتھ اپنے اہل وعیال بھی رکھتے تھے، مراکش جانے پر آمادہ ہوئے اور وہاں کے حاکم ادریس نے ان کے آنے کو غنیمت سمجھا کہ اس کے دارالسلطنت شہر فیض یا تنجیر کی آبادی اور رونق میں اضافہ ہو گیا۔ جہاں یہ بڑے شوق سے آباد ہو گئے اور پندرہ ہزار مالکی جہازوں میں سوار ہو کر اسکندریہ (مصر) پہنچے اور اسکندریہ پر قابض ہو گئے۔ آخر وہاں سے بھی نکالے گئے اور جزیرہ اقریطش (کریٹ) پر قابض ہو گئے۔ وہاں انھوں نے اپنی حکومت قائم کی جو سو برس تک ان کی اولاد کے قبضے میں رہی۔

مالکیوں کی اس بغاوت کے فرو ہونے کے بعد حزم بن وہب نے مقام باجہ میں علم بغاوت بلند کیا اور اس بغاوت کا انجام یہ ہوا کہ حزم نے سلطانی فوج کے مقابلے میں شکست کھائی اور عفو تقصیرات کا خواہاں ہوا۔ سلطان نے اس کی خطا معاف کر دی۔ اب اور بھی اس بات کا یقین ہو گیا کہ ملک کی حالت ابھی تک قابل اطمینان نہیں اور بغاوت کے جراثیم جابجا موجود ہیں۔

فرانس پر حملہ:

خلیفہ حکم بن ہشام کو اندلس پر حکومت کرتے بیس سال ہو گئے تھے۔ اس بیس سال کے عرصے میں اس کو مسلسل ملک کی اندرونی بغاوتوں، شورشوں اور عیسائیوں کے بیرونی حملوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ زیادہ وقت اس کا بغاوتوں ہی کے فرو کرنے میں صرف ہوا۔ عیسائیوں پر حملہ آور ہونے کی فرصت اور مہلت اسے نہ مل سکی۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ اندرون ملک بغاوتوں اور شورشوں میں حصہ اکثر و بیشتر مسلمانوں ہی کا تھا اور عیسائیوں کو مسلمان ہی بغاوت پر اکساتے تھے ورنہ ان میں بغاوت کرنے کی اتنی طاقت نہ تھی۔ ان تمام بغاوتوں میں سلطان کے رشتے داروں اور بغداد کے عیسائیوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ سلطان نے دیکھا کہ اب بظاہر ملک میں خاموشی ہے، اس لیے اس نے ایک لشکر جرار تیار کیا اور اپنے حاجب عبدالکریم کی سرداری میں شمالی سمت کو عیسائیوں کے مقابلے میں روانہ کیا۔ حاجب عبدالکریم نے ریاست ایسٹریاس سے صرف اظہار فرمان برداری ہی کو غنیمت سمجھا اور سیدھا ملک فرانس میں جبل البرتات کے اس طرف پہنچ کر فتوحات میں مصروف ہوا۔ یہ مہم سنہ ۲۰۰ھ میں فرانس کی طرف روانہ ہوئی تھی اور سنہ ۲۰۳ھ تک عبدالکریم نے فرانس میں جنگ و پیکار اور معرکہ کارزار جاری رکھا۔ سلطان حکم اور اس کے سپہ سالاروں کی یہ غلطی تھی کہ وہ صرف شارلیمین کی حکومت کو اپنا حریف سمجھتے تھے اور اسی کی حکومت کی حدود میں جا کر اس کے شہروں کو فتح کرتے تھے۔ گاتھک مارچ کی ریاست

جوجبل البرتات سے اس کے جنوبی اور مغربی میدانوں تک وسیع ہو چکی تھی، ان کے لیے ناقابل التفات تھی۔ ان ریاستوں کو نہ انھوں نے مٹانا چاہا اور نہ ان کے رقبے کو کم کرنا ہی ضروری سمجھا۔ وہ صرف اس بات کو کافی سمجھتے تھے کہ یہ عیسائی ریاستیں ہماری فرماں برداری کا اقرار کرتی رہیں اور وہاں کی عیسائی آبادی پر خود ہی حکومت کریں، لیکن ان کو یہ علم نہیں تھا کہ یہ ریاستیں کسی روز ان کے لیے وبال جان ہو جائیں گی۔ فرانس پر وہ اس لیے حملہ آور ہوتے تھے کہ اگر فرانس کی حکومت کو ختم کر دیا گیا تو خطرے کا وجود ہی باقی نہ رہے گا اور یہ پہاڑی عیسائی ریاستیں شاہ فرانس سے مل کر اور اس کی سازش میں شریک ہو کر ہمارے لیے مشکلات پیدا کرنے کا موقع نہ پا سکیں گی۔ لیکن سلطان حکم اگر ان دونوں سرحدی ریاستوں کو بالکل مٹا کر جبل البرتات پر اپنی زبردست فوجی چوکیاں قائم کر دیتا تو آئندہ کے لیے ملک اندلس خطرات سے محفوظ رہ سکتا تھا، اور ممکن تھا کہ کسی وقت فرانس اور یورپ کے دوسرے ممالک بھی مستقل طور پر مسلمان فتح کر لیتے۔ ان پہاڑی سرحدی ریاستوں نے اندلس کی اسلامی سلطنت کو جو نقصانات پہنچائے ان کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

سلطان حکم کے عہد خلافت ہی میں ایسٹریاس کے ایک پادری نے ریاست ایسٹریاس اور صوبہ جلیقیہ کی سرحد کے ایک جنگل میں بتایا کہ سینٹ جیمس رسول کی قبر ہے اور مجھ کو خواب میں فرشتے نے اس قبر کا پتہ بتایا ہے۔ چنانچہ وہاں ایسٹریاس کے حاکم نے ایک گرجا تعمیر کرا دیا۔ یہ گرجا نہ صرف ایسٹریاس اور صوبہ جلیقیہ کے عیسائیوں کی زیارت گاہ بن گیا بلکہ یورپ کے دور دراز مقامات تک اس کی شہرت ہوگئی اور عیسائی جوق در جوق اس کی زیارت کے لیے آنے لگے۔ رفتہ رفتہ یہاں ایک آبادی قائم ہوگئی اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ مقام ریاست ایسٹریاس کے حاکم کا مقام رہائش اور دارالحکومت بن گیا، اس نے اپنے محل وقوع کے اعتبار سے تمام صوبہ جلیقیہ کو بھی قدرتی طور پر اپنے زیر اثر لے آیا۔

سپہ سالار عبدالکریم کئی سال کے بعد یعنی سنہ ۲۰۳ھ میں صحیح سلامت اور بہت سا مال غنیمت لے کر فرانس سے واپس ہوا اور اس کی یہ مہم بڑی کامیاب سمجھی گئی کہ فرانسیسیوں کو ان کی گستاخی کی اچھی طرح سزا دی گئی، مگر افسوس کہ اس طرف کوئی توجہ نہ دی گئی کہ ریاست گاتھک مارچ اور ایسٹریاس کا نام ونشان مٹایا جاتا کہ مستقبل میں یہ ان کے لیے باعث مصیبت نہ ہوتے لیکن یہاں سوچ ہی دوسری تھی وہ یہ کہ ان دونوں عیسائیوں ریاستوں کے وجود کو بہت ہی غنیمت سمجھا گیا کہ ان کے ذریعے باقاعدہ حکومت اس علاقے میں قائم ہے جہاں مسلمان جانا اور رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ فرانس میں رہنے کے لیے بھی کوئی عرب سردار رضا مند نہ تھا، مسلمانوں نے اگرچہ بار بار فرانس کو فتح کیا لیکن اس کی قدر و قیمت اس کی سرد آب و ہوا کے باعث کچھ نہ سمجھی۔ وہاں سے مال غنیمت حاصل ہونے اور وہاں کے رئیسوں سے خراج وصول کر لینے ہی کو کافی سمجھتے رہے۔ ہر ایک عربی نژاد سردار جب ناربون، جلیقیہ اور جبل البرتات کے متصلہ سرحدی علاقے میں عامل مقرر کر کے بھیجا جاتا تو

وہ نہایت کبیدہ خاطر ہوتا اور جنوبی معتدل وگرم میدانی علاقوں میں رہنے اور جنوبی شہروں کا عامل مقرر ہونے کو اپنی خوش نصیبی سمجھتا۔

اندلس میں قحط اور خشک سالی:

مصیبتیں جب آتی ہیں تو ایک ساتھ اکٹھی آتی ہیں۔ سنہ ۲۰۳ھ کے بعد اندلس میں حکم کے لیے قدرے سکون و اطمینان کا زمانہ شروع ہوا تھا کیونکہ اب ملک میں کوئی بغاوت اور شورش نہ تھی اور نہ کسی عیسائی حملہ آور ہی کا کوئی خطرہ تھا اور نہ کسی اور طرف سے کسی قسم کے حملے کا کوئی خطرہ تھا، لیکن حق تعالیٰ شانہ کو یہی منظور تھا کہ حکم کا تمام عہد حکومت مصروفیت اور ہنگامہ آرائی میں بسر ہو۔ چنانچہ اب جب کہ ہر جانب سے ہر قسم کے حملے قریباً ختم ہو چکے تو یکایک اندلس پر قحط سالی کا حملہ ہو گیا۔ یہ قحط بہت بڑا تھا اور قحط کی وجہ سے ملک میں چوری اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں بھی کثرت سے ہونے لگیں۔ حکم نے جس طرح اب تک اپنے آپ کو ہر ایک موقع پر مستقل مزاج اور باحوصلہ ظاہر کیا تھا، اسی طرح اس نے اس مصیبت میں بھی اپنی شاہانہ ہمت و جرأت کا اظہار کیا۔ قحط زدہ لوگوں کی پرورش کے لیے اس نے ہر شہر، قصبے اور گاؤں میں محتاج خانے کھلوا دیے۔ غلے کے باہر سے منگوانے کا اہتمام کیا۔ جا بجا راستوں اور آبادی کی حفاظت کے لیے زائد پولیس اور فوجی دستے مقرر کیے۔ اس حالت میں جہاں کہیں کسی بدامنی کی خبر پہنچتی، حکم فوج کے ساتھ وہاں خود پہنچتا اور امن وامان کو قائم رکھتا۔ غرض کہ اس قحط کے زمانے میں اس نے اپنی رعایا کی ایسی امداد اور دستگیری کی کہ رعیت کا ہر ایک طبقہ اس سے محبت کرنے لگا اور وہ نفرت جو علماء اور بعض دین دار لوگوں نے اس کے بارے میں پھیلا دی تھی اور جو لوگ اس پر اس کی آزاد مزاجی اور آزاد روی کی وجہ سے زبان طعن دراز کرتے تھے، اس کے مداح نظر آنے لگے۔

وفات اور اولاد:

سلطان حکم کی نسبت اکثر مؤرخین یہ کہتے ہیں کہ وہ خون خوار اور قاتل تھا حالانکہ یہ الزام اس پر نہایت غلط ہے۔ اندلس میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے، اگر حکم کی جگہ ان الزام لگانے والے مؤرخین میں سے کوئی ہوتا تو وہ بھی یہی کچھ کرتا جو حکم نے کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ حکم نے بہت سے لوگوں کو قتل کرایا لیکن جن لوگوں کو قتل کرایا گیا کیا وہ حقیقتاً مستحق قتل تھے یا نہیں؟ سلطان نے مجبوراً ان کو قتل کرایا نہ کہ تفریح طبع کے طور پر۔ قرآنی حکم ہے ﴿الفتنة اشد من القتل﴾ یعنی قتل سے زیادہ شدید بات تو فتنہ برپا کرنا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سلطان نے زندگی کے جتنے دن گزارے باغیوں نے اسے آرام سے نہیں بیٹھنے دیا۔ بالآخر سلطان حکم ۲۵/ ذی قعدہ سنہ ۲۰۶ھ جمعرات کے روز ۵۳ سال چند ماہ کی عمر میں اپنے خالق

حقیقی سے جا ملا اور وارثان میں اپنے بیس لڑکے اور بیس لڑکیاں چھوڑیں۔ حکم کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عبدالرحمٰن ثانی مسند خلافت پر بیٹھا۔

حکم بن ہشام کی سیرت و کردار:

حکم بن ہشام دلیر، بہادر، فیاض، عاقبت اندیش اور نڈر شخص تھا۔ یہ مکاروں اور خفیہ سازشیں کرنے والوں کا سخت دشمن اور اپنے دوستوں کے لیے بہت با مروت اور ہمدرد تھا۔ علماء اور فضلاء کا قدردان اور شعراء کا مربی تھا۔ میدان جنگ میں مستقل مزاج اور جہاں کہیں معاف کرنے سے اصلاح کی توقع ہوتی وہاں فوراً خطا کو معاف کر دیتا تھا۔ وہ اندلس کا ایک جلیل القدر اور عظیم الشان بادشاہ تھا۔ جن حالات میں اس نے اپنی بادشاہت کو قائم رکھا یہ اسی کا حوصلہ اور کام تھا۔ ہر طرف بغاوتوں اور شورشوں کی بھرمار تھی۔ اپنے بھی خفا اور بیگانے میں ناخوش تھے۔ کسی طرف سے عیسائی یلغار تھی تو کسی طرف سے غدار مسلمانوں اور علماء نے شورش برپا کر رکھی تھی، لیکن حکم نے نہایت مستقل مزاجی سے ان سب کا مقابلہ کر کے فتح اور کامیابی حاصل کی۔ وہ نہایت دین دار اور اللہ والا شخص تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ ایک روز اس نے کسی وجہ سے اپنے کسی خادم سے ناراض ہو کر اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ اتفاقاً اس وقت ایک عالم زیاد بن عبدالرحمٰن آ گئے۔ انھوں نے سلطان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ”سیدنا مالک بن انس رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً روایت کی ہے کہ جو شخص اپنے غیظ و غضب کے باوجود ضبط کی قدرت رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے قلب کو امن و اطمینان سے پر کر دے گا۔ اس بات کے ختم ہوتے ہی سلطان کا غصہ کافور ہو گیا اور خادم کی خطا معاف کر دی گئی۔

سلطان حکم کا ٢٧ سالہ عہد حکومت ہنگامہ آرائی اور بے اطمینانی کے عالم میں گزرا۔ اس بے اطمینانی، بے سکونی اور بدامنی کی وجوہات و اسباب حکم کے پیدا کردہ نہ تھے بلکہ یہ سب قدرتی وارد ہونے والی افتادیں تھیں۔ اس زمانے میں اگر حکم سے کسی قدر کم مستقل مزاج شخص تخت اندلس پر متمکن ہوتا تو وہ بازی ہار گیا ہوتا جس کے نتیجے میں بنو امیہ کی حکومت اندلس سے مٹ چکی ہوتی اور وہاں کے مسلمانوں کا انجام خطرناک ہوتا۔ قدرت نے سلطان حکم کا امتحان لیا اور وہ اس امتحان میں کامیاب ہوا۔
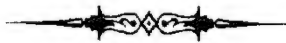
سلطان عبدالرحمٰن ثانی

سلطان حکم کی وصیت کے مطابق اس کی وفات کے بعد سلطان عبدالرحمٰن ثانی مسند خلافت پر بیٹھا۔ سلطان عبدالرحمٰن ثانی شعبان سنہ ۱۷۶ھ میں طلیطلہ کے مقام پر پیدا ہوا اور سنہ ۲۰۶ھ میں اپنے باپ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا۔ سلطان عبدالرحمٰن کی تخت نشینی کے وقت ملک میں بظاہر امن و امان قائم تھا اور اندرونی اور بیرونی فتنوں کو فرو کیا جا چکا تھا، مگر اس سلطان کو تخت نشین ہوتے ہی اپنے خاندان والوں کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ سلطان حکم کا چچا عبداللہ جس کی فطرت میں شاید بغاوت کے جراثیم مضمر تھے، سلطان حکم کے زمانے معافی حاصل کر کے اندلس سے مراکش کے شہر تنجیر میں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔ عبداللہ اس وقت بہت بوڑھا ہو گیا تھا، لیکن اس کی سرشت میں بغاوت کا مادہ اب بھی موجود تھا۔ اپنے بھتیجے حکم کی وفات کا سن کر بغاوت کے جراثیم اس کے ذہن میں رینگنے لگے۔ چنانچہ تنجیر سے چلا اور اندلس میں وارد ہو کر اپنی حکومت کا اعلان کیا۔ عبداللہ کے تین بیٹے اس وقت اندلس میں موجود اور مختلف صوبوں کی گورنری پر مامور تھے۔ عبداللہ کو توقع تھی کہ میرے بیٹے ضرور میری بادشاہت قائم کرانے میں مدد و معاون ہوں گے۔ مگر یہ عبداللہ کی حماقت تھی اور کہا جا سکتا ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے اس کی عقل کمزور ہو گئی تھی۔ شاہی فوجوں نے فوراً عبداللہ کا مقابلہ کیا اور وہ شکست کھا کر بلنسیہ میں پناہ گزین ہوا۔ اس کے بیٹے بجائے اس کے کہ باپ کی مدد کرتے اور اس بغاوت میں اس کے شریک ہوتے، انھوں نے عقل و دانائی اور مآل اندیشی سے کام لے کر عبدالرحمٰن ثانی کی حمایت کی اور باپ کو سمجھایا کہ اس خیال خام سے باز رہو اور آتش فساد کو مشتعل نہ کرو۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ عبداللہ نے اپنے پوتے عبدالرحمٰن ثانی سے عفو تقصیرات کی درخواست کی اور عبدالرحمٰن نے نہ صرف اس درخواست کو منظور کیا بلکہ عبداللہ کو صوبہ مرسیہ کا والی بنا دیا، جہاں وہ دو تین سال یعنی اپنے انتقال تک برسر اقتدار رہا۔

ایک ماہر موسیقی کی قدر افزائی:

سنہ ۲۰۶ھ یعنی تخت نشینی کے پہلے ہی سال میں ابراہیم موصلی کا شاگرد علی بن نافع معروف بہ فاریاب اندلس میں آیا۔ علی بن نافع فن موسیقی میں استاد کامل تھا۔ علاوہ ازیں علوم مروجہ اور بعض دوسرے علوم غربیہ میں

ماہر و یکتا تھا۔ حکم نے یہ سن کر کہ عراق اور شام میں اس کی اس کے مرتبہ اور مقام کے مطابق قدر دانی نہیں ہوئی، اس کو اندلس میں اپنے پاس طلب کیا تھا، لیکن اس کے اندلس پہنچنے سے پہلے ہی سلطان حکم فوت ہو گیا تھا۔ جب سلطان عبدالرحمٰن کو اس حکیم و فلسفی کے اندلس میں آنے کا حال معلوم ہوا تو اس نے شہروں کے عاملوں کے نام احکام جاری کر دیے کہ قرطبہ تک پہنچنے میں علی بن نافع کو جس جس شہر سے ہو کر گزرنا پڑے، اس شہر کا حاکم اس کا شاہانہ استقبال کرے اور متعدد غلام، گھوڑے اور ہدیے پیش کرے۔ غرض بڑی عزت و احترام سے یہ شخص قرطبہ تک پہنچا اور بادشاہ کا مقرب خاص اور ندیم با اختصاص بن گیا۔

علی بن نافع نے اندلس میں بڑی اہم معاشرتی اصلاحات کیں، تکلفات اور زیب و زینت کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کیے جو بہت جلد مقبول ہوئے۔ اس کی کوششوں سے قرطبہ کے اندر آب رسانی کے نل لگائے گئے اور بہت جلد اندلس کے دوسرے شہروں میں بھی نلوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ نئے نئے اور پر تکلف لذیذ و مقوی کھانے اور خوب صورت لباس بھی اسی کی ایجاد ہیں۔ غرض اس ایک شخص کی کوششوں اور ایجادوں نے نہ صرف تمام اندلس بلکہ تمام یورپ پر اپنا اثر ڈالا۔ چھری کانٹے کے ساتھ کھانا کھانا بھی اسی کی ایجاد ہے، اور یورپ والوں نے اندلس کے مسلمانوں ہی سے چھری کانٹے کا استعمال سیکھا تھا۔ علی بن نافع کو سلطان عبدالرحمٰن ثانی کے مزاج میں بخوبی رسوخ حاصل تھا اور سلطان اس کی بڑی عزت و توقیر کرتا تھا، لیکن اس نے کبھی کسی سیاسی معاملے میں دخل نہیں دیا تھا بلکہ اپنی تمام تر توجہ کو اصطلاح معاشرت ہی کی جانب مبذول کر رکھا تھا، اس لیے وہ تمام ملک میں ہر دل عزیز و محبوب تھا اور کوئی اس کا دشمن اور مخالف کبھی پیدا نہیں ہوا۔ اندلس والوں نے جہاں اس شخص کی وجہ سے لباس، غذا اور مکان کے تکلفات دیکھے وہاں انھوں نے موسیقی کا شوق بھی اس سے حاصل کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ علی بن نافع نے اندلس پہنچ کر وہاں کے سپاہی پیشہ مسلمانوں کو عیش پسند اور نازک مزاج بنانے کی موثر کوشش کی۔

مالکی مسلک کو فروغ:

قاضی یحییٰ بن یحییٰ اندلس کا قاضی القضاۃ تھا اور اس کا تعلق مالکی مسلک سے تھا۔ انھی قاضی صاحب کی کوششوں سے سلطان حکم کے زمانے میں قرطبہ میں ایک خطرناک بغاوت ہوئی جس کے نتیجے میں قرطبہ کی آبادی کا پانچواں حصہ یعنی دریائے وادئ الکبیر کے پار کا جنوبی محلّہ بالکل ویران اور تاخت و تاراج ہو گیا اور بیس پچیس ہزار آدمیوں کو اندلس سے جلا وطن ہونا پڑا تھا مگر قاضی یحییٰ آخر میں سلطان حکم کے مصاحبوں اور مشیروں میں داخل ہو گئے تھے۔ اب سلطان عبدالرحمٰن ثانی کی تخت نشینی کے بعد وہ سلطان عبدالرحمٰن کے مزاج میں بہت کچھ دخیل تھے۔ ان کو قاضی القضاۃ اور شیخ الاسلام کا عہدہ سلطان عبدالرحمٰن نے دینا چاہا لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور اس انکار کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قاضی القضاۃ کے بھی افسر اعلیٰ سمجھے جانے لگے۔ عوام ان کے بہت زیادہ معتقد

تھے اور مذہبی معاملات میں ان کا فیصلہ سب سے آخری وحتمی سمجھا جاتا تھا۔ قاضی صاحب بڑے کثیر التصانیف شخص تھے۔ وہ امام مالک رحمہ اللہ کے شاگرد رشید تھے۔ انھوں نے کئی سال تک امام مالک رحمہ اللہ کی خدمت میں رہ کر علم دین حاصل کیا تھا۔ اب سلطان عبدالرحمٰن کے عہد میں انھوں نے اپنے طرز عمل کے اندر بہت بڑی تبدیلی پیدا کر لی تھی۔ اب وہ اپنے اثر ورسوخ سے نہایت قابلیت کے ساتھ کام لے رہے تھے۔ وہ جس شخص کی سفارش محکمہ قضا میں کر دیتے تھے وہ کبھی رد نہ ہوتی تھی، لہٰذا ان تمام علماء نے جو کسی شہر یا قصبے کے قاضی بننا چاہتے تھے، مالکی مذہب اختیار کرتے اور اس طرح قاضی یحییٰ کی نگاہوں میں عزت ومحبت کا مقام پیدا کر کے کہیں نہ کہیں قاضی بن جاتے۔ اس غیر محسوس طرز عمل نے چند روز میں تمام اندلس کو مالکی مسلک کا پیروکار بنا دیا۔ سلطان عبدالرحمٰن ثانی اپنے باپ کے زمانے سے امور سلطنت میں دخیل اور تمام حالات سے خوب واقف اور تجربہ کار تھا، لہٰذا اس نے احتیاط سے کام لیا اور اس بات کی کوشش کی کہ علماء اور علماء مزاج لوگوں کو اس کے خلاف لوگوں کو برانگیختہ کرنے کا موقع نہ ملے۔

بغاوتوں کا استیصال:

عبدالرحمٰن ثانی کی تخت نشینی کے وقت اندلس کا تمام شمالی حصہ جس میں خلیج بسکی کا جنوبی ساحل اور جبل البرتات کا جنوبی دامن شامل تھا، عیسائیوں کے قبضے میں تھا مگر یہ تمام عیسائی رؤسا سلطنت اسلامیہ کے باج گزار تھے اور دربار قرطبہ کی سیادت کو تسلیم کرتے تھے۔ دربار قرطبہ بھی اندلس کے اس شمالی حصے سے اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا تھا۔ برشلونہ کا علاقہ بھی عرصہ سے عیسائیوں کے قبضے میں آ چکا تھا اور وہاں ریاست ''گاتھک مارچ'' کے فرماں روا کی طرف سے ایک نائب الریاست مامور تھا۔ اس طرح اندلس کے مشرقی اور شمالی ساحل کا بھی ایک حصہ عیسائیوں کے تصرف میں تھا۔ ریاست ایسٹریاس، لیون اور جلیقیہ تک وسیع ہوگئی تھی اور اس کا جدید شہر کیسٹل یا قسطلہ دارالسلطنت بن چکا تھا۔ مسلمان ان شمالی عیسائی ریاستوں کو ہرگز مٹانا تو نہیں چاہتے تھے مگر ان کو اپنی طاقت سے محض اس لیے مرعوب رکھنا چاہتے تھے کہ وہ فرانس کے عیسائیوں یعنی حکومت فرانس وغیرہ سے ساز باز کر کے اندلس کے ملک پر چڑھائی نہ ہونے دیں۔ اسی مقصد کے لیے وہ خلیج بسکی کو عبور کر کے اور کبھی جبل البرتات کو طے کر کے فرانس پر حملہ آور ہوتے تھے کہ شمالی ملکوں کے عیسائی اندلس کی جانب اقدام نہ کر سکیں۔ اندلس کی شمالی سرحد پر شہر البیرہ تھا جہاں دربار قرطبہ سے سرحدی عامل مقرر کیا جاتا تھا۔ البیرہ کے اس سرحدی عامل نے وہاں کی رعایا پر ظلم وستم کیا اور عیسائیوں سے ساز باز رکھی۔ اس کی پاداش میں سلطان حکم نے اس کو قتل کرا کر اس کا تمام مال واسباب ضبط کرا لیا تھا۔ اس کے چند ہی روز بعد حکم کا انتقال ہوگیا تھا۔ جدید سلطان کی تخت نشینی پر سرحدی عیسائیوں نے موقع پایا اور البیرہ کی فوج اور رعایا کو بہکا کر قرطبہ میں بھیجا کہ وہ اس مال کا مطالبہ کریں جو مقتول عامل کا سرکاری خزانے کے حق میں ضبط ہوا ہے کیونکہ وہ مال دراصل رعایا کا مال

ہے جو عامل نے زبردستی چھین لیا تھا۔ یہ احتجاجی لوگ قرطبہ میں سنہ ۲۰۷ھ میں پہنچ کر قصر سلطانی کے دروازے پر گستاخانہ حرکات کرنے لگے۔ ان کی تادیب کے لیے شاہی محافظ دستے کو حکم ہوا۔ ان لوگوں نے شاہی دستے کا مقابلہ کیا۔ چنانچہ ان میں سے بہت سے مارے گئے اور بہت سے بھاگ گئے۔

اسی سال یعنی سنہ ۲۰۷ھ میں تدمیر کے علاقے میں عربوں کے قبائل مضریہ اور قبائل یمانیہ میں جنگ چھڑ گئی۔ اس خانہ جنگی کو فرو کرنے کے لیے شاہی فوج بھیجی گئی جس نے آتش فساد کو فرو کیا مگر جب شاہی فوج واپس ہوئی تو یہ قبائل پھر آپس میں لڑنے لگے۔ پھر شاہی فوج گئی۔ غرض کہ قبائل کی اس خون ریزی کا سلسلہ قریباً سات سال تک جاری رہا اور اندلس کے اندر قبائل عرب نے عرب جاہلیت کی خون خواری کی خوب نمائش کی۔

سنہ ۲۰۸ھ میں عیسائی ریاست ایسٹریاس نے باج وخراج کی ادائیگی سے انکار کر کے علم بغاوت بلند کر دیا۔ سلطنت اسلامیہ کی حدود میں داخل ہو کر شہروں اور شہریوں کو لوٹا۔ اس خطرناک خبر کو سن کر عبدالرحمٰن ثانی نے اپنے مشہور سپہ سالار عبدالکریم کو فوج دے کر اس طرف روانہ کیا۔ اس بہادر سپہ سالار نے وہاں پہنچ کر ماہ جمادی الآخر سنہ ۲۰۸ھ میں عیسائیوں کو شکست پر شکست دے کر بھگا دیا اور ان کی فوجیں بھاگ کر پہاڑوں میں جا چھپیں۔ عبدالکریم نے عیسائیوں کے سرحدی قلعوں کو مسمار کر کے عیسائی فرمان روا کو مجبور کر دیا کہ وہ خراج ادا کرے اور آئندہ مطیع وفرمان بردار رہنے کا اِقرار کر کے معافی چاہے۔ اس کامیابی کے بعد عبدالکریم واپس آیا اور فوراً یہ فوج اسی سپہ سالار کی سرکردگی میں برشلونہ کی طرف روانہ کی گئی جہاں سے بغاوت، شورش اور جنگی تیاریوں کی خبر پہنچی تھی۔ شاہی فوج نے جاتے ہی برشلونہ کا تمام علاقہ فتح کر کے عیسائیوں کو بھگا کر پہاڑوں کے اندر چھپنے اور پناہ لینے پر مجبور کر دیا اور ایسٹریاس والوں سے بھی اِقرار اطاعت لے کر تمام مفتوحہ ملک پھر انھی کے قبضے میں دے دیا گیا۔

قیصر کی سفارت:

سنہ ۲۰۹ھ میں قیصر قسطنطنیہ کی طرف سے عبدالرحمٰن ثانی کی خدمت میں ایک سفارت حاضر ہوئی۔ اس سفارت کے ذریعے قیصر نے اندلس سے محبت و دوستی کے تعلقات پیدا کرنے چاہے۔ دربار بغداد نے فرانس کے بادشاہ سے تعلقات محبت قائم کر لیے تھے۔ قیمتی تحائف اور نذرانے فرانسیسیوں کے لیے پہنچتے رہتے تھے اور دربار بغداد سے ہمیشہ اس بات کی کوشش ہوتی رہتی تھی کہ فرانسیسی ملک اندلس پر حملہ آور ہوں۔ ان باتوں سے قرطبہ کی انتظامیہ واقف و آشنا تھی۔ ادھر قیصر قسطنطنیہ پر ہمیشہ حملہ آور ہوتے رہتے تھے اور قسطنطنیہ کی حکومت ہر وقت اپنے آپ کو معرض خطر میں پاتی تھی۔ اب قیصر قسطنطنیہ نے جانثارانِ اندلس کی بہادری اور مسلمانان اندلس کی شہرت سن کر قرطبہ کو اپنا ہمدرد اور ساتھی بنانا چاہا۔ اندلس کے سلطان کو قدرتی طور پر قیصر سے ہمدردی ہونی چاہیے تھی کیونکہ وہ دربار بغداد کا دشمن تھا۔ سلطان اندلس اگر قیصر کی عظیم الشان طاقت اور

زبردست افواج سے تعلقات پیدا کرلیں تو بڑی آسانی سے وہ اپنی آبائی خلافت اور شام، عراق اور عرب وغیرہ کی حکومت عباسیوں سے واپس لے سکتا تھا۔ عبدالرحمٰن نے اس موقع پر بڑی دانائی، ہوش مندی اور مآل اندیشی سے کام لے کر صرف اس قدر وعدہ کیا کہ ادھر مجھ کو اپنے ہی ملک میں بہت سے ضروری اور اہم کام درپیش ہیں۔ تاہم اس نے بہت سے قیمتی تحفے اس سفیر کے ہمراہ اپنے ایلچی غزال کے ہاتھ قیصر روم کے لیے روانہ کیے۔

عبدالرحمٰن کے ایلچی یحییٰ الغزال نے قسطنطنیہ میں داخل ہوکر نہایت غور وتعمق کی نگاہ سے وہاں کے حالات کا جائزہ لیا اور قیصر کو اپنے سلطان کی دوستی کا یقین دلا کر واپس آیا۔ عبدالرحمٰن ثانی نے حمیت اسلامی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک مسلمان فرمان روا کے خلاف گو وہ عبدالرحمٰن کا دشمن عباسی خلیفہ ہی کیوں نہ ہو ایک عیسائی بادشاہ کی مال و دولت یا فوج سے مدد کرنی کسی طرح مناسب نہ سمجھی اور زبانی وعدہ وعید پر ہی ٹال دیا، ورنہ سلطان عبدالرحمٰن قیصر کی درخواست کو پورا کرنے کی طاقت ضرور رکھتا تھا کیونکہ قیصر نے سلطان اندلس سے فوج اور روپیہ مانگا تھا۔ ایک یا چند ہزار فوج اور ایک یا چند لاکھ دینار کا بھیج دینا عبدالرحمٰن کے لیے بالکل معمولی بات تھی اور اندلس کی فوج یا خزانے پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا، لیکن عبدالرحمٰن نے اپنی حمیت اسلامی کا ثبوت دیتے ہوئے قیصر کو ٹال دیا۔

پرتگالیوں کی بغاوت:

پرتگال اس زمانے میں اندلس ہی ایک حصہ تھا۔ اب یہ دونوں الگ الگ ملک ہیں۔ چنانچہ اسی سال اندلس کے جنوب مغرب میں اس علاقے کے اندر جس کو آج پرتگال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جہاں عیسائیوں کی آبادی زیادہ تھی، شہر مریدہ والوں کی سربراہی میں بغاوت کا فتنہ نمودار ہوا۔ اس فتنے کو فرو کرنے کے لیے عبیداللہ بن عبداللہ کو بھیجا گیا۔ سخت معرکوں کے بعد باغیوں کو ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا اور شہر پناہ کو منہدم کر کے عبیداللہ سنہ ۲۱۰ھ میں واپس آ گیا۔ چند روز کے بعد باغیوں نے پھر سر اٹھایا اور عبیداللہ کو پھر اس طرف جانا پڑا۔ اس مرتبہ بھی بغاوت فرو ہوگئی۔ یہ بغاوت کیوں ہوئی؟ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کا سبب وہ پادری تھے جو جلیقیہ اور قسطیلہ سے یہاں آکر بغاوت کی ترغیب دینے میں مصروف تھے کیونکہ عیسائیوں اور خصوصی طور پر جلیقیہ والوں کو یہ محسوس ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کا اندرونی بغاوتوں اور آپس کی لڑائیوں میں مصروف رہنا ہی ہماری ترقی اور کامیابی کا باعث ہے۔ ہم جب تک جنوبی علاقوں میں ہنگامے برپا نہ کرادیں، اس وقت تک ہم کو مسلمانوں کے خلاف کوئی کوشش اور بغاوت نہیں کرنی چاہیے۔ اہل مریدہ کی سرکشیوں، شورشوں اور گستاخیوں کی اب کوئی انتہا نہیں رہی تھی کیونکہ انھوں نے اپنے عامل کو بغاوت کر کے اپنے شہر سے نکال دیا تھا اور شاہی فوجوں کا دو مرتبہ مقابلہ کر چکے تھے۔ لہٰذا سنہ ۲۱۳ھ میں عبدالرحمٰن ثانی نے حکم دیا کہ شہر مریدہ کی منہدم شدہ فصیل کے

پتھروں کو دربار میں لاکر ڈال دو۔ جب اس حکم کی تعمیل عامل مریدہ نے کرنا چاہی تو وہاں کے لوگ پھر باغی ہو گئے۔ انھوں نے اس مرتبہ پھر شہر پر قبضہ کرلیا اور عامل کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ اہل شہر نے شہر کی منہدم شدہ فصیل کو پھر تعمیر کرلیا اور مقابلے کے لیے مضبوط ہو کر بیٹھ گئے۔ تعجب ہوتا ہے کہ یہ بغاوت صرف عیسائیوں تک محدود نہ تھی بلکہ مسلمانوں کا بھی ایک بہت بڑا حصہ اس میں شریک تھا اور باغیوں کی قیادت ایک مسلمان محمود بن عبدالجبار کررہا تھا۔ یہ مسلمان عیسائیوں کے ترغیب دینے سے کیوں بغاوت پر آمادہ ہو جاتے تھے؟ اس کا سبب آئندہ سطور میں بیان ہوگا۔ مختصر یہ کہ سنہ ۲۱۷ھ تک مریدہ کے مقابل شاہی فوجیں مصروف جنگ رہیں اور انھیں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ آخر سنہ ۲۱۸ھ میں سلطان عبدالرحمٰن نے خود مریدہ پر فوج کشی کی مگر اس مرتبہ ابھی شہر فتح نہ ہونے پایا تھا کہ سلطان کو محاصرہ اٹھا کر فوراً کسی ضرورت سے قرطبہ کی جانب واپس آنا پڑا۔ سنہ ۲۲۱ھ میں پھر خاص اہتمام سے حملہ کیا گیا اور یہ شہر سات سال تک اندلس کے درمیانی علاقے میں خود مختار رہنے کے بعد فتح ہوا اور اس بغاوت کا خاتمہ ہوگیا تو محمود بن عبدالجبار مریدہ سے فرار ہوکر سیدھا ریاست ایسٹریاس میں پہنچا اور وہاں ایک قلعہ دار بنا دیا گیا جہاں وہ پانچ سال تک زندہ رہنے کے بعد ایک غدار قوم و وطن کی موت مرا۔

عیسائیوں کو مسلمانوں کے باغی بنانے میں دو وجوہ سے آسانی ہوئی۔ اول یہ کہ اندلس میں عیسائی عورتیں عام طور پر مسلمانوں کے گھروں میں تھیں اور یہ ایک بہت بڑے فتنے کا باعث تھیں۔ مسلمان مذہبی رواداری اور عقیدہ وفکر کی آزادی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی ان عیسائی بیویوں کو تبدیل مذہب پر مجبور نہ کرتے تھے۔ شمالی عیسائی ریاستوں کو چھوڑ کر ان عیسائیوں کو مسلمانوں سے عداوت ونفرت تھی۔ اندلس کے باقی تمام عیسائی مسلمانوں کے ساتھ نہایت گہرے اور ہمدردانہ تعلقات رکھتے تھے۔ ان عیسائیوں کے ذریعے شمالی ریاستوں کے عیسائی مسلمانوں میں ہر ایک خیال کی بہ آسانی اشاعت کرسکتے تھے۔ اس مرتبہ یہ مشہور کیا گیا تھا کہ سلطان عبدالرحمٰن نے زکوٰۃ کے علاوہ جو اور کوئی ٹیکس لگایا ہے، یہ ابتدا ہے اس ظلم وستم کی جو سلطان کے پیش نظر ہے اور آثار سے پتہ چل رہا ہے کہ سلطان اپنی رعایا کے تمام اموال پر قبضہ کرنے والا ہے۔ یہ ایک ایسی بات تھی کہ سب سے پہلے اس پر مسلمانوں ہی کو غصہ آتا تھا۔ بڑھتے بڑھتے اس معمولی سی بات نے وہ صورت اختیار کرلی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

طلیطلہ کی بغاوت:

مریدہ کی بغاوت چونکہ جلدی فرو نہ ہوسکی تھی اور مسلمان باغیوں کی پامردی نے شاہی فوج کے لیے مشکلات پیدا کردی تھیں، اس لیے ملک کے اندر سرکش لوگوں کی ہمتیں پھر جوان اور بلند ہونے لگیں، اور طلیطلہ میں جہاں عیسائی آبادی زیادہ تھی، عیسائیوں اور مسلمانوں نے مل کر ہاشم ضراب نامی ایک شخص کی قیادت میں علم بغاوت بلند کرکے وہاں کے گورنر کو شہر سے نکال دیا اور خود طلیطلہ میں ہر قسم کی مضبوطی کرلی۔

عیسائی ریاست گاتھک مارچ اور اردگرد کے لوگوں نے ہر قسم کی امداد ہاشم ضراب کو پہنچانی شروع کر دی۔ واقعہ پسند اور بد چلن لوگ جوق در جوق آ کر طلیطلہ میں داخل اور باغی فوج میں شامل ہونے لگے۔ طلیطلہ پہلے ہی نہایت مضبوط اور نا قابل تسخیر شہر تھا۔ اب ہاشم ضراب نے سامان مدافعت اور افواج کی فراہمی سے اس کو خوب مضبوط کر لیا۔ یہ دیکھ کر سرحدی عامل محمد بن وسیم بھی ہاشم کا شریک اور ساتھی ہو گیا۔ ادھر سلطان عبدالرحمٰن ثانی نے اپنے بیٹے امیہ کو ایک زبردست فوج دے کر طلیطلہ کی جانب روانہ کیا۔ امیہ نے ہر چند کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر امیہ اپنی فوج لے کر واپس ہوا اور ہاشم نے طلیطلہ سے باہر نکل کر شاہی فوج کا تعاقب کیا۔ شاہی فوج ایک جگہ کمین گاہ میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ جب طلیطلہ کے باغی زد پر پہنچ گئے تو ان پر زور دار حملہ کیا گیا۔ اہل طلیطلہ کا نقصان تو بہت زیادہ ہوا لیکن وہ بھاگ کر طلیطلہ میں واپس داخل ہو کر قلعہ بند ہو گئے۔ بار بار اس شہر کے محاصرے کو فوجیں بھیجی گئیں لیکن یہ شہر فتح نہ ہوا۔ ایک مرتبہ ہاشم نے طلیطلہ سے نکل کر شنت بریہ کو خوب لوٹا اور اس پر قبضہ کر لیا۔

آخر کار سلطان عبدالرحمٰن نے اپنے بھائی ولید کو سنہ ۲۲۲ھ میں ایک زبردست فوج دے کر طلیطلہ کی مہم پر روانہ کیا۔ ولید نے طلیطلہ کے چاروں طرف فوجیں متعین کر کے ہر طرف سامان رسد کی آمد کو بند کرنے میں نہایت مبالغے سے کام لیا اور اپنی اس کوشش کو نہایت مستقل مزاجی سے قائم رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل طلیطلہ سخت مجبور ہو گئے اور ولید نے سنہ ۲۲۳ھ میں طلیطلہ کو فتح کیا۔ ہاشم ضراب نے لڑائی میں غداری کی اور باغی کی موت مارا گیا اور محمد بن وسیم وہاں سے فرار ہو کر سبن شہر چلا گیا۔ وہاں اس نے اپنے گرد باغیوں کی ایک جمعیت اکٹھی کی اور چند روز کے بعد طلیطلہ میں اچانک پہنچ کر پھر قابض ہو گیا۔ سنہ ۲۲۴ھ میں سلطان عبدالرحمٰن نے خود چالیس ہزار فوج لے کر طلیطلہ پر چڑھائی کی اور اس کو فتح کیا اور باغیوں کو قرار واقعی سزا دے کر امن و امان قائم کیا اور یہیں سے ایک فوج عبیداللہ بن عبداللہ کو دے کر مقام البہ اور قلاع کی جانب روانہ کیا۔ عبیداللہ نے اس کے نواح میں پہنچ کر ان عیسائیوں کو جنھوں نے بغاوت اور سرکشی شروع کر دی تھی، متعدد شکستیں دے کر مطیع و منقاد بنا دیا۔ ابھی یہ لشکر شمالی حدود میں اپنا کام پورے طور پر ختم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ فرانسیسیوں کی فوج نے جو سرحد پر ایک عرصے سے جمع ہو رہی تھی اور اندلس کی اندرونی بغاوتوں سے فائدہ اٹھانے کی خواہاں تھی، سرحد پر حملہ کر دیا اور اندلس کی حدود میں داخل ہو کر سالم شہر کو تاخت و تاراج کر دیا۔ عبیداللہ نے اس طرف کے عامل ابن موسیٰ کو ساتھ لے کر عیسائی فوجوں پر حملہ کیا اور ان کے سپہ سالار لرزیق نامی شاہ فرانس کو شکست دے کر بھگا دیا۔

سنہ ۲۲۵ھ میں سلطان عبدالرحمٰن ثانی نے خود جلیقیہ پر حملہ کر کے وہاں کے عیسائیوں کو سزائیں دے کر مطیع و منقاد بنایا۔ ریاست ایسٹریاس کے حاکم سے باج و خراج وصول کر کے اس سے اطاعت و فرمان برداری کا اقرار لیا اور اسی کی ریاست میں اپنا فوجی کیمپ قائم کر کے ملک فرانس پر خشکی کے راستے کے ذریعے بھی اور

بحری راستے سے بھی فوجیں روانہ کیں۔ ان فوجی مہموں کا نتیجہ مال غنیمت اور کثیر التعداد قیدیوں کی شکل میں ظاہر ہوا، اور سلطان صحیح وسالم بہت سا مال غنیمت حاصل کر کے قرطبہ واپس آیا۔

قیصر کی اندلس میں دوسری سفارت:

اسی سال طوفیلس قیصر روم جس کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا، کی جانب سے قرطبہ میں ایک سفارت اسی طرح آئی جس طرح اس سے قبل قیصر میکائیل کی طرف سے آئی تھی۔ عبدالرحمٰن نے اس سفیر کے ساتھ بھی وہی برتاؤ اور سلوک کیا جو پہلے سفیر سے کیا تھا۔ اس مرتبہ قیصر حکومت بغداد سے بہت مجبور ہو گیا تھا اور اس نے پہلے والے قیصر سے بھی زیادہ الحاح وزاری اور اصرار کے ساتھ عبدالرحمٰن ثانی سے مدد طلب کی تھی اور پہلے سے زیادہ توقعات دلائی تھیں۔ ممکن تھا کہ خلیفہ بغداد کی سخت مخالفت کو مدنظر رکھ کر اس نے فرانسیسیوں کے پاس بڑے بڑے قیمتی تحفے اور ہدیے بھیجنے کا سلسلہ جاری کر رکھا ہو اور فرانسیسیوں کو اپنی ہر ایک حملہ آوری پر جو وہ اندلس پر کرتے تھے، دربار بغداد سے شہ ملتی ہو، اس مرتبہ عبدالرحمٰن قیصر کی مدد کو فوج روانہ کر دیتا لیکن اتفاق کی بات ہے کہ انھی دنوں یورپ کے شمالی علاقے کی نارمن قوم نے جو ابھی تک عیسائیت سے متنفر اور آتش پرستی میں مبتلا تھی، جرمنی اور اسکینڈی نیویا سے اپنی کشتیوں میں سوار ہو کر اور انگلش چینل میں سے گزر کر اندلس کے جنوبی اور مغربی ساحل پر اتر کر یکا یک قصبوں اور شہروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ شہر وادیس کو خوب لوٹا اور پھر مضافات اشبیلیہ تک پہنچ گئے۔ یہ حملہ ایک غیر معروف اور اجنبی قوم نے اندلس پر اسی طرح کیا تھا جس طرح مسلمانوں کا ابتدائی حملہ طارق بن زیاد کی قیادت میں ہوا تھا۔ اس وحشت انگیز خبر کو سن کر امیر عبدالرحمٰن نے خشکی کے راستے ان کے مقابلے کے لیے فوجیں روانہ کیں اور دوسری طرف اندلس کے مشرقی ساحل کی بندرگاہوں میں یہ حکم بھیجا کہ جہازوں کو آبنائے جبل الطارق کی طرف بھیج دو تا کہ ان حملہ آوروں کے جہازوں پر قبضہ کر کے ان کے لیے فرار کی راہ کو مسدود کر دیں۔ نارمنوں کو جب یہ پتہ چلا کہ پندرہ جہاز مسلح سپاہیوں سے بھرے ہوئے ہمارا راستہ روکنے کے لیے آ رہے ہیں تو وہ اندرون ملک سے فوری طور پر بے تحاشا ساحل کی جانب بھاگے اور اپنی کشتیوں پر سوار ہو کر غائب ہو گئے۔ اس کے بعد عرصہ دراز تک ان کو اندلس پر چھاپہ مارنے کی جرأت نہ ہوئی۔

سپہ سالار موسیٰ کی بغاوت:

ابھی نارمنوں کا یہ فتنہ فرو ہوا ہی تھا کہ شمال کی جانب سے خبر آئی کہ موسیٰ بن موسیٰ جو عبدالرحمٰن ثانی کا مشہور سپہ سالار اور شمالی سرحد کا محافظ اور نگران مقرر کیا گیا تھا، باغی ہو کر عیسائیوں سے مل گیا ہے۔ سلطان نے اس کی سرکوبی کے لیے حرث بن بدیع کو بھیجا۔ موسیٰ عیسائی لشکر کے ساتھ مقابلے پر آیا لیکن حرث نے شکست دے کر اسے بھگا دیا۔ موسیٰ نے طلیطلہ میں قیام کیا اور حرث سرقسطہ میں واپس ہو کر مقیم ہوا۔ عرصے تک دونوں

میں لڑائیاں ہوتی رہیں۔ آخر موسیٰ طلیطلہ چھوڑ کر رابطہ کے مقام پر چلا گیا اور حرث نے طلیطلہ پر قبضہ کر لیا۔ ازاں بعد عیسائی بادشاہ غرسیہ فوج لے کر موسیٰ کی مدد کو پہنچا اور جنگ و جدل کا ہنگامہ خوب زور شور سے جاری ہوا۔ ان ہنگامہ آرائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقام البہ میں ایک لڑائی میں موسیٰ نے حرث کو گرفتار کرا دیا اور شاہ فرانس کے پاس بھیج دیا۔ عبدالرحمٰن کو یہ خبر سن کر سخت صدمہ ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے منذر کو ایک زبردست فوج دے کر موسیٰ کی طرف روانہ کیا۔ اس عرصے میں موسیٰ نے طلیطلہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ منذر نے سنہ ۲۲۹ھ غرسیہ نامی سردار والی نبلونہ کو جو موسیٰ کی حمایت اور امداد کے لیے آیا تھا، ایک لڑائی میں قتل کر دیا۔ موسیٰ نے اپنے بیٹے کو بطور یرغمال منذر کے پاس بھیج کر صلح کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی اور موسیٰ کو طلیطلہ کی حکومت پر سرفراز کر دیا۔

شمالی اندلس کے عیسائیوں کی بغاوت:

ادھر اندلس کی شمالی سرحد پر ہنگامہ برپا تھا ادھر شمال اور مشرق کی جانب عیسائیوں نے بغاوت و سرکشی کی تیاریاں بڑے زور وشور سے شروع کر دیں۔ چنانچہ سنہ ۲۳۰ھ میں اہل برشلونہ نے اسلامی حدود میں لوٹ مار شروع کر دی اور وہاں کی اسلامی فوج کو قتل کر کے جنوب مغرب کی جانب پیش قدمی کی۔ سلطان عبدالرحمٰن نے اپنے مشہور سپہ سالار عبدالکریم بن عبدالواحد کو سنہ ۲۳۱ھ میں برشلونہ کی جانب روانہ کیا۔ عبدالکریم نے برشلونہ اور اس کے نواح کے باغیوں کو قرار واقعی سزا دے کر ریاست گاتھک مارچ کو تہ و بالا کر ڈالا، مگر پھر اقرار اطاعت لے کر یہ ریاست اس کے والی کے سپرد کر دی اور فرانس کی حدود میں داخل ہو کر فرانس کے شہر جرندہ تک برابر تاخت و تاراج کرتا ہوا چلا گیا۔ اسلامی فوج فرانس میں زیادہ دیر تک نہیں رہی بلکہ فرانسیسیوں کو اپنی طاقت و صولت دکھا کر جلد واپس چلی گئی۔

عیسائیوں اور بنو امیہ کے دشمنوں کو اب تک اپنی ہر ایک تدبیر اور ہر ایک سازش میں بظاہر ناکامی ہی حاصل ہوتی رہی تھی۔ اب جب کہ تمام ہنگامے فرو ہو گئے اور تمام باغی تھک کر بیٹھ رہے تو فرانس اور اندلس کی شمالی سرحدی ریاستوں کے عیسائیوں نے مل کر ایک مجلس مشاورت منعقد کی اور ایک عرصۂ دراز تک قرطبہ کی سرحدات کی طرف توجہ کرنے سے باز رکھنے کا ذمہ جلیقیہ کے پادریوں نے لیا کہ اس عرصے میں عیسائی طاقتیں متحد ہو کر فوجی تیاریاں کر سکیں، نئے قلعے بنا سکیں، شمالی عاملوں کو اپنے ساتھ ملا سکیں اور حکومت اسلامیہ پر ایک ایسی ضرب کاری لگانے کے لیے تیار ہو جائیں کہ اس کا نام ونشان باقی نہ رہے اور نتیجتاً پھر سے وہی گاتھک سلطنت کا زمانہ لوٹ آئے۔ اس کوشش کو خالص مذہبی عبادت قرار دیا گیا۔ جلیقیہ کے پادریوں نے ایک نہایت پرجوش پادری کو قرطبہ میں اس لیے مامور کیا کہ وہ خاص دارالحکومت قرطبہ اور دوسرے شہروں میں پادریوں اور عیسائیوں کو دین عیسوی کی خدمت کے لیے قربان ہونے اور جان دینے پر آمادہ کرے۔ اندلس میں عیسائیوں کو مسلمانوں کی طرف سے ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل تھی۔ وہ اپنے گرجوں میں گھنٹے بجاتے اور نہایت اطمینان

سے مراسم عبادت ادا کرتے تھے۔ مذہبی معاملات اور مقدمات کا فیصلہ عام طور پر عیسائی جج کرتے اور گرجوں کے مصارف انھیں شاہی خزانے سے عطا ہوتے تھے۔ مسلمان عیسائیوں کے تہواروں میں اور عیسائی مسلمانوں کے تہواروں میں شریک ہوتے اور تجارت و زراعت وغیرہ میں دونوں قومیں بلا امتیاز یکساں حقوق رکھتی تھیں۔ کوئی ایسی وجہ پیدا ہی نہیں ہوسکتی تھی کہ عیسائیوں میں مسلمانوں کے خلاف مذہبی جوش پیدا کیا جاسکے۔ ان لوگوں کو مسلمانوں کے اصلی اخلاق کا مطالعہ اور معائنہ کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا کیونکہ ان اطراف میں زیادہ تر وہی لوگ سمٹ کر جمع ہو گئے تھے جو گاتھک سلطنت کے ارکان اور مسلمانوں کی آمد کو اپنی ذلت کا موجب جانتے تھے۔ یہیں پادریوں کے وعظ و تقریر کے ذریعے مخالفت کے شعلے بلند ہوتے رہتے تھے، اور مسلمان بھی اسی نواح میں بار بار حملہ آور ہوتے اور قتل و غارت کے ہنگامے برپا کرنے کا موقع پاتے رہتے۔

جنوبی وشمالی اندلس میں عیسائی فتنہ:

تاہم جنوبی اندلس میں شمالی اندلس کے فدائی عیسائی آ کر پھیل گئے۔ انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ علانیہ بازاروں اور مجمعوں میں سرکار دو عالم ﷺ پر (معاذ اللہ) سب و شتم کرتے، قرآن حکیم کی بے حرمتی کرتے اور یوں مسلمانوں کو جوش دلاتے تھے۔ ان عیسائی بدزبانوں کو گرفتار کر کے قاضی کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ وہاں بھی انھوں نے حسب سابق بدزبانی کا اعادہ کیا۔ قاضی صاحب نے ان کے قتل کا حکم دیا۔ جب اس طرح ایک شخص کا قتل ہوا تو دوسرے نے خود قاضی کے دربار میں پہنچ کر علانیہ سرکار دو عالم ﷺ کو سب و شتم کیا۔ قاضی صاحب نے اس کو بھی قتل کرادیا۔ ان عیسائیوں نے جو اپنے آپ کو قتل ہی کرانے کے لیے مستعد ہو کر آئے تھے، یکے بعد دیگرے اپنے آپ کو مستحق قتل قرار دینا اور قتل ہونا شروع کیا تو قاضی اور سلطان کی طرف سے درگزر اور چشم پوشی کا برتاؤ شروع ہوا۔ عام عیسائیوں میں یہ خیال بڑی آسانی سے یہ لوگ پھیلا سکے کہ جو لوگ اس طرح مقتول ہوتے ہیں وہ ولی کامل بن جاتے ہیں۔ چنانچہ ان مقتولوں کی قبروں کو زیارت گاہ بنایا گیا اور قرطبہ اور دوسرے مقامات کے جاہل عیسائیوں کی ایک تعداد ان قتل ہونے والے عیسائیوں کی قبروں کو عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھنے اور ان کی قبروں کی زیارت کرنے کو باعث ثواب سمجھنے لگی۔ شمالی ریاستوں کے عیسائی ان شہیدوں کے مزاروں کی زیارت کو آتے اور خود بھی اسی نامعقول حرکت کا ارتکاب کر کے گرفتار ہو جاتے۔ جب ان شریروں کو مقتل میں لے جایا جاتا تو کئی ہزار آدمی ان کو ولی کامل سمجھ کر ان کا آخری دیدار کرنے کو جمع ہو جاتے۔ اس طرح یہ سلسلہ کئی برس تک جاری رہا اور سلطان سخت شش و پنج میں مبتلا رہا کہ عیسائیوں کے اس طوفان بدتمیزی کو کس طرح فرو کیا جائے۔ آخر قرطبہ اور اشبیلیہ کے بڑے سنجیدہ مزاج پادریوں اور اسقفوں نے ایک عظیم الشان مذہبی مجلس منعقد کی اور تمام اندلس کے بڑے پادریوں کو اس مجلس میں بلا کر یہ مسئلہ پیش کیا کہ آیا مذہب عیسوی کی رو سے مسلمانوں کے پیغمبر (ﷺ) اور ان کی مذہبی کتاب قرآن حکیم کو سب و شتم کرنا کار

ثواب ہے یا نہیں؟ اور جو لوگ اس طرح مقتول ہو رہے ہیں وہ شہید یا ولی کامل کہلانے کے مستحق ہیں یا نہیں؟ اس پر مختلف پادریوں نے خوب تقریریں کیں اور اس حرکت کو عیسائی مذہب کے بالکل خلاف قرار دے کر ان لوگوں کو جو اس طرح اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالتے اور مقتول ہوتے تھے، گناہ عظیم کا مرتکب قرار دے دیا اور یہ عجیب فیصلہ کیا کہ جو لوگ اب تک مقتول ہو چکے ہیں وہ تو شہید اور شاہ ولایت سمجھے جائیں گے، لیکن جو عیسائی اس کے بعد اس ناشائستہ اور قبیح حرکت کا مرتکب ہو گا، وہ بدمعاش سمجھا جائے گا اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو گا۔ پادریوں کی کونسل کے اس فیصلے نے اندلس کے عیسائیوں کو متاثر کیا لیکن شمالی ریاستوں کے پادری جو اسی غرض کے لیے اپنے آپ کو ایک ولی کامل کی حیثیت سے پیش کرتے تھے، اپنی ان حرکات سے باز نہ آئے۔ ایک طرف مسلمانوں کی شکایت تھی کہ سلطان ان عیسائی بدزبانوں کو سزا دینے میں لیت و لعل سے کام لیتا ہے اور غفلت کوشی کا ارتکاب کرتا ہے، اسی لیے ان کے حوصلے بڑھتے جاتے ہیں۔ دوسری طرف عیسائیوں کا جاہل طبقہ اپنے ان پادریوں کو برا کہنے لگا جنھوں نے ان مذہبی شہیدوں کو بدمعاش قرار دیا تھا، اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے جو خوش گوار تعلقات ملک میں قائم تھے اور ان میں کوئی مذہبی منافرت نہیں پائی جاتی تھی، وہ کمزور ہونے لگے اور عیسائی مسلم نا اتفاقی پیدا ہونے لگی۔ عیسائیوں کے اس فتنے نے سلطان عبدالرحمٰن ثانی کو اس کی عمر کے آخری پانچ چھ سالوں میں بہت پریشان اور غمگین رکھا اور اس کی زندگی میں اس عجیب و غریب قسم کے فتنے کا کلیتاً استیصال و سد باب نہ ہو سکا بلکہ کم و بیش یہ سلسلہ جاری رہا۔

وفات:

سلطان عبدالرحمٰن ثانی نے اکتیس (۳۱) سال چند ماہ حکومت کی اور سنہ ۲۳۸ھ مطابق سنہ ۸۵۲ء میں وفات پائی۔ وفات کے وقت اس کی عمر ۶۲ سال تھی۔ وفات کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ یہ نہایت نیک نیت، ہر دل عزیز اور بیدار مغز خلیفہ تھا۔ اس کی عظیم الشان فتوحات سے رعایا اس کو ''المظفر'' کے لقب سے یاد کرتی تھی۔ وہ بے مثل قیافہ شناس تھا اور کہا کرتا تھا:

''حکومت اور اعزاز کی خواہش ایسے لوگوں کو رہتی ہے جن کو ان کی قدر نہیں۔ پس بادشاہ کو چاہیے کہ اجزائے حکومت کے انتخاب میں از حد احتیاط اور دور اندیشی سے کام لے اور کم ظرف سے اجتناب کرے۔''

عبدالرحمٰن ثانی کے عہد حکومت پر تبصرہ:

عبدالرحمٰن ثانی کا عہد حکومت اگرچہ لڑائی جھگڑوں سے خالی نہیں رہا لیکن پھر بھی اس نے اپنے عہد حکومت میں رفاہ عامہ کے بہت سے کام کیے اور ملک کی اصلاح کی طرف قدم اٹھایا جس کی وجہ سے تھوڑے ہی

عرصے میں ملک امن و امان اور خوشحالی و فارغ البالی سے آراستہ ہو گیا اور بہ نسبت پہلے بادشاہوں کے اس کی مالی اور اقتصادی حالت درست ہو گئی۔ اس کے عہد حکومت میں اب ملک کے بیرونی حملوں اور خانہ جنگی کا امکان نہ رہا۔ ملک میں رہنے والا ہر فرد امن و امان کی زندگی گزار رہا تھا جس سے ملک کی آمدنی پہلے سے دگنی ہو گئی۔ جس وقت سلطان عبدالرحمٰن تخت نشین ہوا تھا تو چھ لاکھ دینار کی آمدنی تھی۔ اس کے حسن انتظام سے یہ آمدنی دس لاکھ دینار ہو گئی۔ اور یہود و نصاریٰ سے ان کی حیثیت کے مطابق جزیہ وصول ہوتا تھا۔ مسلمانوں پر البتہ نئے ٹیکس لگائے گئے۔ یہ رقم جبایہ کہلاتی تھی۔ یہ محاصل سات لاکھ ۶۵ ہزار دینار سالانہ ہوتے تھے۔ بقیہ رقم جزیہ وغیرہ ملا کر دس لاکھ دینار ہوتی تھی۔ چنانچہ مؤرخین نے اعتراف کیا ہے کہ عبدالرحمٰن کے زمانے میں سلطنت کا خزانہ بہت ترقی کر گیا تھا۔ اس نے اپنے زمانے میں پہلے سے زیادہ اچھی کرنسی بنائی۔ عبدالرحمٰن ثانی نہایت اعلیٰ درجے کا عالم اور فلسفہ شریعت کا خوب ماہر تھا۔ جامع مسجد قرطبہ میں متعدد کمرے تعمیر کرا کر اس میں اضافہ کیا۔ محلات اور باغات پر کافی روپیہ صرف کیا۔ بہت سی مسجدیں اور قلعے تعمیر کرائے۔ نئی سڑکیں نکالیں۔ مسافروں اور تاجروں کی سہولت کے لیے سامان بہم پہنچائے۔ سررشتۂ تعلیم کی طرف اس کی توجہ ہمیشہ مبذول رہی۔ کسی قصبے اور گاؤں کو بلا مدرسہ نہیں چھوڑا۔ ہر ایک شہر اور قصبے میں اپنے عاملوں اور قاضیوں کے لیے دفتروں اور عدالتوں کی شاندار بلڈنگیں تعمیر کرائیں اور ہر ایک شہر اور قصبے میں حمام بھی بنوائے۔

عبدالرحمٰن ثانی کو زیب و زینت، آرائش و تزئین اور شان و شکوہ کا بڑا شوق تھا۔ رعایا کی نگاہوں سے اکثر پوشیدہ اور غائب رہتا۔ اس کی طبیعت میں رحم و کرم کا مادہ دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہی تھا۔ سخت سزائیں دینے اور قتل کرانے میں ہمیشہ تامل کرتا۔ اس نے دریائے وادی الکبیر کے دونوں کناروں پر قرطبہ کے متصل میووں اور پھلوں کے متعدد باغات لگوائے اور ان کو عوام کے لیے وقف کر دیا۔ یونانی فلسفیوں کی کتابوں کے ترجمے کروائے اور مختلف علمی مجالس مقرر کیں۔ ایک مرتبہ ٹڈی دل کے لشکر نے کھیتوں کو کھا کر صفایا کر دیا اور بارش نہ ہونے کے باعث ملک میں عام طور پر قحط پڑ گیا۔ سلطان نے اس موقع پر لوگوں کے مصائب اور ان کی تکالیف کے ازالے کے لیے ان کی بڑی مدد کی اور پھر یہ اصول مقرر کر دیا کہ غلے کا ایک بہت بڑا ذخیرہ شاہی خزانے سے خرید کر جمع رکھا جائے تاکہ کسی ایسے ہی قحط کے موقع پر لوگوں کے کام آ سکے۔

ملک کی کل آمدنی جو دس لاکھ دینار تھی، اس کے تین حصے کیے جاتے تھے۔ ایک حصہ فوج کی تنخواہوں میں، ایک حصہ حکام اور عہدہ داران حکومت کی تنخواہوں میں اور ایک حصہ خزانۂ عامرہ میں غیر مترقبہ ضرورتوں کے لیے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ اسی سے رفاہ عام کے کام، تعمیرات اور جہازوں وغیرہ کے مصارف کے کام لیے جاتے تھے۔ اس نے ایک جنگی جہاز کا بیڑا تیار کرایا جو ساحلی علاقے پر گشت کرتا رہتا تھا۔ اس نے اپنی رعایا سے رواداری کا برتاؤ کیا۔ یہود و نصاریٰ کے محصولات کو معاف کر دیا اور خراج بھی کم کر دیا۔ ہر قوم و مذہب کے محتاجوں کو شاہی عمارت کے کام میں لگایا۔ نہر، حوض اور تالاب بنوائے تاکہ خشک سالی کا اندیشہ نہ رہے، سلطان

عبدالرحمٰن ثانی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ نہایت حلیم اور بردبار تھا۔ عبدالرحمٰن ثانی کے عہد حکومت میں عیسائیوں کو سلطنت کے ذمہ داری کے بڑے بڑے عہدے دیے جاتے تھے اور جو عیسائی عربی زبان بولتے اور لکھتے تھے وہ دفتروں پر قابض اور متصرف ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کی توجہ زیادہ تر فوجی خدمات کی طرف تھی۔ دفتری امور کو انھوں نے عیسائیوں کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

سلطان عبدالرحمٰن ثانی خود صاحب علم تھا اس وجہ سے علماء کی بڑی قدر کرتا تھا۔ قاضی یحییٰ بن یحییٰ اللیثی کو اپنا مشیر کار بنایا اور ان کے صاحب زادے عیسیٰ بن یحییٰ کو قرطبہ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ اس کے عہد میں ابومروان عبدالملک بن حبیب تھا جو سلطان کے مشورے میں شریک رہتا تھا۔ یہ بہت عقل مند اور علم و دانش کا حامل انسان تھا۔

لکھا ہے کہ ایک روز سلطان عبدالرحمٰن ثانی نے علماء کے سامنے کہا کہ مجھ سے یہ سخت غلطی سرزد ہو گئی ہے کہ میں رمضان المبارک میں دن کے وقت محل سرا میں چلا گیا۔ اس کا کیا کفارہ ہے؟ یحییٰ بن یحییٰ نے تمام علماء کے سامنے کہا کہ مسلسل دو ماہ تک روزے رکھو تو البتہ اس گناہ کا کفارہ ہو سکتا ہے۔ حاضرین قاضی صاحب کے منہ سے یہ الفاظ سن کر خاموش ہو گئے۔ جب علماء دربار سے اٹھ کر چلے گئے تو سلطان نے یحییٰ سے پوچھا کہ امام مالک رحمہ اللہ نے اس کفارے کا کوئی بدل بھی بتایا ہے یا نہیں؟ قاضی یحییٰ نے جواب دیا کہ بدل ضرور ہے لیکن اگر میں آپ کو اس سخت سزا کا بدل بتا دیتا تو آپ کو مکرر اس گناہ کے کرنے کی جرأت ہو جاتی۔ اس پابند شرع سلطان کی ہمت ملاحظہ فرمائیں کہ اس نے قاضی یحییٰ کے حکم کی پوری تعمیل کی۔ سلطان کی علماء اور اہل علم و فن کی قدر دانی کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا تھا۔ اصحاب ہنر و فن، اہل سیف اور اہل قلم سلطنت عباسیہ کو خیر باد کہہ کر اندلس چلے آئے تھے۔ ان میں ایک علی بن نافع بھی تھا جس کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں آ چکا ہے۔ یہ شخص فن موسیقی میں دور دور تک مشہور تھا۔ علاوہ ازیں علم نجوم اور ہیئت، جغرافیہ اور انشاء پردازی میں کامل دست گاہ رکھتا تھا۔ ایک ہزار غزلیں حفظ تھیں۔ نہایت مہذب اور با اخلاق تھا، خلیفہ ہارون الرشید کی صحبت میں رہ چکا تھا۔ سلطان نے اس کو اپنا ندیم بنایا اور بڑی قدر دانی کی۔ غرض کہ عبدالرحمٰن ثانی کے تاج میں علم و فضل اور عظمت و کمال کے ایسے بے بہا جواہر جڑے ہوئے تھے جن کی آب و تاب پر شرق و غرب اش اش کرتا تھا۔ ان ہی علماء کے فیضان صحبت کی بدولت اس کی شوکت اور دبدبے نے دنیا کو ایسا مرعوب کر لیا تھا کہ ہر بادشاہ اس سلطنت سے اتحاد اور دوستی بڑھانا باعث عزت و افتخار تصور کرتا تھا۔ تاریخ ہسپانیہ میں میریا کالیکٹ لکھتا ہے:

"عبدالرحمٰن ثانی دانا، مدبر اور نامی سپہ سالار تھا۔ اگرچہ شروع سلطنت میں ہنگامے اور فتور و فساد برپا رہے لیکن اس کی رعایا دولت مند اور خوش حال تھی۔ وہ علوم کا بہت شائق تھا اور فلسفہ اور فن شاعری کا زیادہ شوق رکھتا تھا، اور جس وقت اس کو مملکت کے معاملات سے فرصت ہوتی تھی تو علماء، فضلاء اور شعراء کی صحبت میں اپنا وقت صرف کرتا تھا۔ فن موسیقی کا بھی شوق رکھتا تھا۔" (تاریخ ہسپانیہ: ص ۲۸)

ولی عہدی:

سلطان عبدالرحمٰن ثانی کی ایک بیوی طروب نامی تھی جس کے ساتھ اس کو بہت محبت تھی۔ اس کے بطن سے عبدالرحمٰن کا بیٹا عبداللہ پیدا ہوا تھا۔ طروب کی یہ خواہش تھی کہ سلطان اپنے بعد عبداللہ کو اپنا ولی عہد بنائے اور اسے تاج وتخت کا مالک قرار دے لیکن سلطان کا بیٹا محمد اپنے بھائی عبداللہ سے زیادہ قابل اور سلطنت کے تاج وتخت کا مستحق تھا۔ طروب نے ایک مرتبہ اس بات کی کوشش کی کہ محمد کو زہر دے کر قتل کرا دیا جائے۔ اس کام کے لیے نصر نامی خواجہ سرا کو راز دار بنایا گیا۔ نصر نے ایک شاہی طبیب کو بڑا بھاری لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ دوا میں زہر ہلاہل ملا کر محمد کو پلا دے جوان دنوں اس طبیب کے زیر علاج اور کسی معمولی مرض میں مبتلا تھا۔ شاہی طبیب نے نصر کی اس فرمائش کو منظور کر لیا لیکن پوشیدہ طور پر سلطان کو بھی اس کی اطلاع دے دی کہ آج دوا کا پیالہ شہزادے کے لیے آئے گا اور اس میں زہر ہلاہل شامل ہوگا۔ چنانچہ زہر آلود پیالہ آیا۔ بادشاہ نے نصر سے مخاطب ہو کر کہا کہ اس دوا کو آج تم ہی پی جاؤ۔ نصر کو بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں دوا پینی پڑی اور وہ پیتے ہی فوراً مر گیا۔ جو گڑھا اس نے شہزادہ محمد کے لیے کھودا تھا، خود ہی اس میں گرا۔ اس کے چند روز کے بعد سلطان عبدالرحمٰن کا انتقال ہو گیا۔ مؤرخین کے مطابق سنہ ۲۲۶ھ مطابق سنہ ۸۵۰ کے موسم بہار میں سلطان عبدالرحمٰن ثانی نے تمام حکام سلطنت کو جمع کیا اور اپنے بیٹے محمد اور سلطنت کے صحیح وارث کے ساتھ وفادار اور خیر خواہ رہنے کی قسم لی اور اس موقع پر خلیفہ نے تمام حکام کی نہایت تزک واحتشام سے دعوتیں کی تھیں، اور زرہ اور جوشن اور قیمتی گھوڑے سرداروں کو بطور تحفہ دیے تھے، اور تمام دستۂ محافظان کو نہایت قیمتی اور زرق برق لباس پہنائے تھے محتاجوں اور غریبوں کو بہت خیرات دی تھی نہ صرف شہروں میں بلکہ دور دراز دیہاتوں میں بھی خیرات تقسیم کی گئی اور کوئی آدمی ایسا نہ ہوگا جس نے انعام واکرام اور خیرات نہ پائی ہو اور خلیفہ کے ساتھ خوشی میں شریک نہ ہوا ہو۔ (تاریخ ہسپانیہ: ۲۸۷)

ڈوزی لکھتا ہے کہ ''سلاطین اسپین کے دربار کو جیسی رونق عبدالرحمٰن ثانی بن حکم کے زمانے میں ہوئی ایسی کبھی پہلے نہ ہوئی تھی۔ شان وشوکت میں خلفائے بغداد کی ہم سری کے خیال سے اس نے بڑے خدم وحشم اپنے گرد اکٹھے کر لیے تھے، اور قرطبہ کو بڑی زیب وزینت بخشی تھی۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن ثانی کی اولاد سینکڑوں تک پہنچ گئی تھی یعنی سو سے زیادہ بیٹے اور پچاس کے قریب بیٹیاں تھیں۔ اس کا لقب ''المظفر'' اور اس کا سجع اور نقش ''راضی برضا'' تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا، آنکھیں گہری، دراز ریش اور لحیم وشحیم آدمی تھا۔ داڑھی میں حنا کا خضاب لگاتا تھا۔ وفات کے وقت اس کے ۴۵ لڑکے زندہ تھے۔

محمد بن عبدالرحمٰن الثانی

سلطان عبدالرحمٰن الثانی تو اپنے زندگی کے ایام مستعار پورے کر کے عالم باقی کو انتقال کر گیا۔ اس کی وفات کے بعد سنہ ۲۳۸ھ میں اس کا ولی عہد بیٹا محمد مسند نشین خلافت ہوا۔ لین پول کے مطابق ''یہ سخت مزاج، سنگ دل اور خود بین تھا۔'' یہ فقرہ لین پول نے محمد کے بارے میں اس لیے لکھا کہ سلطان محمد نے پادریوں کی مجنونانہ حرکات اسلام اور داعیٔ اسلام ﷺ پر ان کے رکیک اور غلیظ حملوں کے بارے میں باپ کی طرح چشم پوشی نہیں کی تھی بلکہ اس نے اس فتنے کو نہایت قوت کے ساتھ دبایا چنانچہ پر جوش عیسائیوں نے اسلام، داعیٔ اسلام اور قرآن حکیم پر جو توہین آمیز حملے کیے تھے ان کا محمد بن عبدالرحمٰن ثانی نے پورا پورا انتقام لیا۔ اس نے وہ گرجے جو فتنوں اور راہبوں کی خوش فعلیوں کا مرکز بن گئے تھے، گرا دیے۔ عیسائیوں کو اچھی طرح سے کچلا اور پامال کیا۔ جنہوں نے سرکشی کی ان کی سرکوبی کی۔ وہ یوپی جیس جس نے ایک مسلمان لڑکی فلورا کو اغوا کیا تھا اسے ۱۱/ مارچ سنہ ۸۵۹ء میں قتل کرا دیا گیا۔ اس واقعے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی اپنی حماقت پر شرمندہ ہوئے۔ شہادت کے ڈھونگ سے ان کو ایسی نفرت ہوئی کہ وہ عیسائی مذہب کو چھوڑ بیٹھے، لیکن اندلس میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ ملک کا انتظام نہ سنبھل سکا۔

سلطان عبدالرحمٰن الثانی کے زمانے میں عیسائیوں کا اثر و اقتدار سلطنت کے دفاتر میں بہت بڑھ گیا تھا۔ مسلمان فقہاء اس حالت کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے اور سلطان حکم کا تجربہ کرنے کے بعد اب خاموش تھے، مگر عیسائیوں کے اس اثر و رسوخ، اقتدار نیز ان کی شرارتوں اور گستاخیوں کو دیکھ دیکھ کر کبیدہ خاطر ضرور تھے۔

پہلا کلام:

سلطان محمد (جو ربیع الاول سنہ ۲۳۸ھ کو اپنے باپ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا تھا، اس) نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ تمام ذمہ دار اور کلیدی عہدوں پر مسلمانوں کو مامور کیا اور ان عمال اور حکام کو جو اسلامی احکام و اعمال کی پابندی میں کوتاہی کے مرتکب ہوتے تھے، معزول کر دیا۔ سلطان محمد کی یہ پہلی کارروائی علمائے اسلام کو بہت پسند آئی۔ اسی عرصے میں اندلس میں بعض علماء کے ذریعے بحث و مباحثے اور مناظرے شروع ہو

گئے۔ یہ علماج کی غرض سے عرب و شام کے ملکوں میں آئے تھے اور حنبلی مسلک کے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی آمد پر قرطبہ میں اب حنبلی اور مالکی علماء کے مباحثے اور مناظرے شروع ہو گئے اور مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو کر آپس میں جنگ وجدل کرنے پر مستعد ہو گئے۔ سلطان محمد نے خود اس بحث مباحثے میں شامل ہو کر فیصلہ کیا اور اس برپا ہونے والے فتنہ کو فرو کیا، اس خیال سے کہ مسلمانوں کی توجہ دوسری طرف منعطف کر دینے سے آپس کی مخالفتوں اور خانہ جنگیوں کا خطرہ دور ہو جائے گا، جہاد کے لیے فوجی بھرتی شروع کی گئی اور ایک زبردست فوج تیار کر کے شمالی عیسائی ریاستوں کے خلاف مہم روانہ کی گئی۔

اس زمانے میں ریاست ایسٹریاس یعنی سلطنت قسطلہ کے حاکم نے مسلم علاقے کے متعدد شہروں پر قبضہ کر لیا تھا اور ہر طرف سے ایک عیسائی رئیس اسلامی خطے کو دباتا چلا جاتا تھا۔ اس فوج نے اول شاہ اردونی والیٔ قسطلہ کے خلاف پیش قدمی کی۔ اس فوج کی سرداری سلطان محمد نے موسیٰ بن موسیٰ کو سپرد فرمائی۔ یہ موسیٰ بن موسیٰ گاتھ قوم سے تعلق رکھتا تھا اور نو مسلم تھا، مثل اس کے اور بھی کئی نو مسلم شاہی فوج کی سرداریوں اور صوبوں کی گورنریوں پر مامور تھے۔ یہ مہم آخر کار کچھ زیادہ نتیجہ خیز اور ثمر آور ثابت نہ ہوئی اور معمولی معرکہ آرائیوں کے بعد اس طرف سے فوج واپس آ گئی۔ اب اس فوج کو برشلونہ کی جانب بھیجا گیا کیونکہ وہاں بھی عیسائیوں نے جادۂ اطاعت سے قدم باہر رکھا تھا، وہاں سے بھی معمولی مال غنیمت لے کر یہ فوج واپس آ گئی۔

بغاوتیں اور ان کا استیصال:

سنہ ۲۳۹ھ میں طلیطلہ کے باشندوں نے جب دیکھا کہ قرطبہ پر فقہاء اور علماء کا قبضہ اور اثر زیادہ ہو گیا ہے اور عیسائی فدائیوں کو بلا تامل قتل کیا جانے لگا ہے، اپنے آپ کو خطرے میں محسوس کر کے یا شمالی عیسائیوں کی قرارداد کے مطابق سلطنت اسلامیہ کے لیے مشکلات پیدا کرنے کی غرض سے بغاوت کی تیاری کی۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ سلطان محمد نے تخت نشین ہو کر جب عیسائی شہداء کی تعداد میں بے دریغ اضافہ کرنا شروع کر دیا تو عیسائیوں نے اپنی اس ناشائستہ اور قبیح حرکت کو یک قلم ترک کر دیا تھا۔ اس کے عوض اب طلیطلہ کی بغاوت کا اہتمام ہونے لگا۔ اہل طلیطلہ نے اپنے عربی النسل گورنر کو گرفتار کر کے دربار قرطبہ میں پیغام بھیجا کہ سلطان عبدالرحمٰن الثانی نے ہمارے جن لوگوں کو بطور یرغمال قرطبہ میں لے جا کر زیر نگرانی رکھا ہے، ان کو واپس کر دیا جائے ورنہ ہم تمھارے گورنر کو قتل کر کے خود مختاری کا اعلان کر دیں گے۔

سلطان محمد نے اہل طلیطلہ کی اس درخواست کو منظور کر کے ان لوگوں کو جو بطور یرغمال قرطبہ میں موجود تھے، طلیطلہ بھیج دیا۔ اہل طلیطلہ نے بجائے اس کے کہ وہ اب راہ راست پر آ جاتے اور مطیع و منقاد رہتے، اس عمل کو سلطان کی کمزوری پر محمول کر کے علانیہ علم بغاوت بلند کر دیا اور طلیطلہ کو ہر طرح مضبوط اور مستحکم کر کے شمالی عیسائی بادشاہوں سے امداد طلب کی۔ اہل طلیطلہ بار بار بغاوت کر چکے تھے لیکن تعجب ہے کہ اب تک کسی بادشاہ

نے بھی طلیطلہ کے قلعے اور شہر پناہ کو منہدم کرنا ضروری نہیں سمجھا اور یہی دونوں چیزیں عیسائیوں کو بار بار بغاوت پر ابھارتی تھیں کیونکہ یہی دونوں چیزیں (قلعہ اور شہر پناہ) ان کی حفاظت کرتی تھیں۔ اس دونوں چیزوں کو منہدم نہ کرنا بھی مسلمانوں کی بلند نظری ہے جس نے ان کو شمالی سرحدی ریاستوں کے استیصال سے باز رکھا، ورنہ یہ کام اس سے پہلے ان کے لیے نہایت ہی آسان اور معمولی تھا۔

سلطان محمد خود فوج لے کر سنہ ۲۴۰ھ میں قرطبہ سے طلیطلہ کی جانب روانہ ہوا۔ ابھی سلطان محمد طلیطلہ تک نہیں پہنچنے پایا تھا کہ ریاست ایسٹریاس کی فوج اور پہاڑی جنگجو اہل طلیطلہ کی امداد کے لیے طلیطلہ میں داخل ہو گئے۔ سلطان نے طلیطلہ کی فتح کو ایک مشکل معاملہ خیال کر کے یہ ترکیب کی کہ اپنی فوج کے بڑے حصے کو پہاڑوں، ٹیلوں اور جھاڑیوں میں چھپا کر ایک چھوٹے سے حصے کو میدان سلیط میں جو ان ٹیلوں اور جھاڑیوں کے درمیان تھا، خیمہ زن کیا۔ اہل طلیطلہ نے جب یہ دیکھا کہ سلطان کے ساتھ بہت ہی تھوڑی سی فوج ہے اور اسی لیے وہ طلیطلہ کے محاصرے کی جرأت نہیں کر سکا، تو وہ خود طلیطلہ سے نکل کر شاہی لشکر پر حملہ آور ہوئے۔ جب لڑائی شروع ہوگئی تو سلطانی لشکر چاروں طرف سے نکل کر حملہ آور ہوا۔ اس غیر متوقع آفت سے پہاڑی عیسائی اور اہل طلیطلہ حواس باختہ ہو کر بھاگنے لگے مگر سلطانی فوج نے اس دوران میدان سلیط میں بیس ہزار آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ اس شکست سے اہل طلیطلہ کی ہمت پست ہوگئی اور سلطان محمد نے آسانی کے ساتھ طلیطلہ پر قبضہ کر کے وہاں ایک معمولی فوجی دستہ متعین کر دیا۔

اس جنگ میں اس قدر کشت وخون ہوا تھا کہ اب اہل طلیطلہ کے باغی ہونے اور سرکشی کرنے کی امید نہ رہی تھی، لیکن اہل طلیطلہ کے تعلقات اب شمالی عیسائی بادشاہوں سے قائم ہو چکے تھے۔ ادھر شاہی لشکر میں بہت سے سردار اور صوبوں کے گورنر ایسے تھے جو شاہ ایسٹریاس، شاہ گاتھک مارچ، شاہ جلیقیہ، شاہ نوار، شاہ ایکویٹین اور شاہ فرانس سے در پردہ خط وکتابت رکھتے اور سازش کر چکے تھے۔ جس طرح ہر ملک میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال کا باعث آپس کی نا اتفاقی اور باہمی انتشار ہوا ہے اسی طرح اندلس میں بھی آپس کی نا اتفاقی اور خانہ جنگی نے روز بد دکھایا۔ اندلس میں اس نا اتفاقی اور خانہ جنگی کی مثالیں دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ اور غیر معمولی نظر آتی ہیں۔ اندلس کی اسلامی تاریخ میں کوئی زمانہ ایسا نہیں ملتا جس میں مسلمان اس مہلک مرض سے محفوظ نظر آتے ہوں۔ بہر حال عیسائیوں کے اتحاد اور مسلمانوں کی غداری نے اہل طلیطلہ کو سنہ ۲۴۲ھ کے آخر میں پھر بغاوت وسرکشی پر آمادہ کر دیا۔ اس مرتبہ سلطان محمد نے پھر طلیطلہ پر چڑھائی کی اور دوبارہ ان کو مطیع ومنقاد بنا کر اور باغیوں کو سزائیں دے کر واپس آیا لیکن سلطان محمد کے واپس لوٹتے ہی اہل طلیطلہ نے ایک عیسائی سردار کی زیر قیادت پھر علم بغاوت بلند کر دیا۔ غرض اہل طلیطلہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے اور سلطان محمد کو بارہا ان پر چڑھائی کرنے میں مصروف رہنا پڑا۔ آخر سنہ ۲۴۸ھ میں سلطان محمد اس بات پر رضا مند ہو گیا کہ اہل طلیطلہ سے اقرار اطاعت لے کر حکومت خود مختاری عطا کر دے یعنی اہل طلیطلہ کو اپنا گورنر

خود منتخب کرنے کا اختیار دے دیا گیا، اور یہ قرار پایا کہ وہ گورنر ایک مقررہ سالانہ رقم دارالخلافہ قرطبہ میں بھیجا کرے۔ باقی طلیطلہ کے اندرونی انتظام میں وہ خود مختار ہوگا۔ سلطان محمد نے اہل طلیطلہ کی اس شرط کو منظور کر کے نہ صرف اپنی کمزوری کا اظہار کیا بلکہ عیسائیوں کے اس قدیمی دارالحکومت کو خود مختار حکومت عطا کر کے اندلس میں دوبارہ عیسائی سلطنت کا سنگ بنیاد رکھ دیا اور اندلس کی اسلامی سلطنت کے ایوان کی بنیاد میں ایک سرنگ لگا دی جس سے ایک عرصے کے بعد مسلمانوں کا نام ونشان اندلس سے گم ہوگیا۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں سلطان محمد کا اتنا قصور نہیں ہے جتنا ان غدار مسلمانوں کا ہے جو اندرون خانہ عیسائیوں سے ملے ہوئے تھے اور اسلامی حکومت کے خلاف آئے روز ساز باز کرتے رہتے تھے۔ اندلس میں جتنی بھی بغاوتیں ہوئیں وہ عیسائیوں نے خود نہیں کیں بلکہ اندرون خانہ اس میں مسلمانوں کا بھی ہاتھ تھا۔ حالانکہ سلطان محمد اور اس کے آباء واجداد نے مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں سے اتنا اچھا سلوک کیا کہ عیسائی بادشاہ ان کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتے تھے۔ پھر مسلمانوں کی آپس کی نااتفاقی اور اندرون خانہ سازشوں اور سلطان کے رشتہ داروں کی سرکشیوں نے پوری امت مسلمہ کو یہ روز بد دیکھنے پر مجبور کیا کہ مسلمانوں کی سلطنت جو طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر اور عبدالرحمٰن الداخل کی کوششوں کے باعث قائم ہوئی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی اور آج بھی مسجد قرطبہ ان مسلمانوں پر نوحہ خواں ہے جو اس کو عیسائیوں کے حوالے کر کے چھوڑ آئے۔ غرناطہ کا الحمراء دیدۂ خونبار ہے کہ مسلمانوں نے مجھے تہذیب حجازی سے نکال کر یورپی تہذیب میں ڈال دیا اور خود یہاں سے فرار ہوگئے۔ بہرحال یہ امت مسلمہ کی بدقسمتی تھی کہ کئی سو سال اندلس پر حکومت کرنے کے باوجود اپنوں کی غداری اور بیگانوں کی عیاری سے وہاں سے ایسے نکالے گئے کہ ابھی تک کو واپس جانے کا موقع نہیں مل رہا۔ طلیطلہ والوں کو جب سلطان محمد کی طرف سے خود مختاری کا پروانہ مل گیا تو اہل طلیطلہ نے موسیٰ بن موسیٰ نومسلم کے بیٹے لوپ کو یہاں کا گورنر بنانا چاہا۔ سلطان محمد نے اس کو بخوشی منظور کر لیا۔ اس کے بعد طلیطلہ میں شمالی علاقہ کی عیسائی حکومتوں سے پہاڑی اور جنگ جو عیسائی آ آ کر بکثرت آباد ہونے شروع ہو گئے اور مسلمانوں کو جو طلیطلہ میں آباد تھے، بتدریج وہاں سے بے دخل کرنا شروع کر دیا۔ نہ صرف شہر طلیطلہ بلکہ اس کے اردگرد کا تمام علاقہ ریاست ایسٹریاس کا نمونہ بن گیا۔ ادھر موسیٰ بن موسیٰ نے مسلمان ہونے کے باوجود عیسائی بادشاہوں سے خفیہ معاہدے کر لیے تھے۔ غرض اس غدار خاندان نے سلطنت اسلامیہ کو کمزور کرنے میں خوب حصہ لیا جو بظاہر مسلمان کہلاتا تھا۔ اسی سال نارمن قوم نے اندلس کے مغربی ساحل پر اپنی کشتیاں لا کر اس طرف کے ساحلی علاقے پر چھاپہ مارا لیکن سلطان محمد کے جہازوں نے جو اس ساحل پر موجود تھے، نارمنوں کی پچاس کشتیاں پکڑ لیں اور وہ کوئی سخت نقصان پہنچائے اندلس سے بھاگ گئے۔

رجب سنہ ۲۵۱ھ میں سلطان محمد نے اپنے بیٹے منذر کو سرحد شمال کی جانب البہ اور قلاع کے عیسائی سرکشوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا اور اس کے پیچھے خود فوج لے کر جلیقیہ کے ارادہ سے روانہ ہوا۔ یہاں باپ

بیٹے دونوں کو فتوحات حاصل ہوئیں لیکن عیسائی لوگ اب مسلمانوں کے ان حملوں اور شمالی علاقے پر چڑھائیوں کو خوب پہچان گئے تھے۔ جب کوئی زبردست فوج حملہ آور ہوتی تو وہ معمولی مقابلہ کر کے پہاڑوں میں جا چھپتے اور معافی کی درخواستیں بھیجتے، اطاعت کا اقرار کرتے اور اس طرح ان حملہ آوروں کو واپس کر کے پھر اپنے مقبوضہ ملک پر قابض و متصرف ہو کر حکومت کرنے لگتے۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ شاہی فوجیں قرطبہ کی جانب واپس آئیں اور عیسائیوں نے اپنی پیش قدمی شروع کی۔ اس سے قبل عیسائیوں کے حملے اسلامی شہروں پر لوٹ مار کی غرض سے ہوتے تھے، لیکن اب وہ مسلمانوں کی کمزوری کو بخوبی محسوس کر چکے تھے۔ اب انھوں نے جس شہر پر قبضہ کیا وہاں اپنا عامل مقرر کیا اور وہاں باقاعدہ حکومت قائم کر کے جلد جلد اپنی حکومت کی حدود کو وسیع کرنے لگے۔ چنانچہ جس طرح مشرقی ساحل پر برشلونہ لے لینے کے بعد عیسائی مشرقی ساحل پر نیچے اترنے کی فکر میں تھے اسی طرح انھوں نے مغربی ساحل پر قبضہ کرنا شروع کیا اور پرتگال کے علاقے کو زیر تصرف لے آئے۔ سلطان محمد نے ایک جنگی بیڑا ترتیب دے کر بحری راستے سے فوج بھیجی کہ وہ خلیج بسکی میں پہنچ کر جلیقیہ کے شمالی جانب سے حملہ آور ہو، لیکن اتفاق سے سمندر میں طوفان آ گیا اور یہ بیڑا طوفان میں سخت نقصان اٹھا کر بے نیل و مرام واپس آیا۔ اس کے بعد بحری مہم کا خیال ترک کر دیا گیا۔ اہل طلیطلہ کی مثال دیکھ کر جا بجا شہروں میں بغاوتیں شروع ہوئیں اور ہر ایک اس شہر نے جہاں عیسائیوں کی آبادی زیادہ تھی، خود مختار حکومت کا مطالبہ کر دیا۔ ان بغاوتوں کے فرو کرنے میں سلطان محمد کو پورے دور حکومت میں بالکل اطمینان میسر نہ ہوا۔

ایک نئے مذہب کی ایجاد:

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ سنہ ۲۶۳ھ میں عبدالرحمٰن بن مروان نے جو اس سے پہلے بھی کئی بغاوتوں میں حصہ لے چکا تھا اور سلطان محمد کی بے جا رعایت کے سبب نواح مریدہ میں ایک ذمہ داری کے عہدے پر مامور تھا، اعلان بغاوت کر دیا۔ سلطان محمد نے اس کی طرف فوج کشی کی۔ تین ماہ کی جنگ و پیکار کے بعد عبدالرحمٰن بن مروان نے بجائے اس کے کہ اپنے وعدے اور ارادے کے موافق بغداد کی جانب روانہ ہوتا، اندلس ہی میں رہ کر ایک نئے مذہب کی ایجاد کی۔ اس مذہب میں اسلام اور عیسائیت کے اصولوں کو جمع کر کے ترتیب دیا گیا تھا۔ اس جدید مذہب میں بہت سے آوارہ مزاج مسلمان اور عیسائی شامل ہونا شروع ہو گئے۔ چونکہ تمام ملک میں خودسری کی ہوا چل رہی تھی، لہٰذا بہت سے واقع پسند اور فتنہ جُو لوگ بلحاظ مذہب بھی اس کے گرد آ کر جمع ہو گئے اس طرح صوبہ جلیقیہ اور صوبہ پرتگال کی حدود میں ایک خطرناک لشکر حکومت وقت کے خلاف عبدالرحمٰن بن مروان کی سرداری میں اکٹھا ہو گیا۔ سلطان محمد نے اس خطرے سے آگاہ ہو کر اپنے وزیر ہاشم بن عبدالعزیز کو ایک فوج دے کر اس طرف روانہ کیا۔ عبدالرحمٰن نے ہاشم کو دھوکا دیا اور اس کے سامنے سے فرار ہوتا ہوا اپنے تعاقب میں ایک جگہ ہاشم کو لے گیا جہاں کمین گاہ میں فوج چھپی ہوئی تھی۔ اس فوج نے

یکا یک چاروں طرف سے حملہ آور ہو کر ہاشم کی تمام فوج کو کاٹ ڈالا اور ہاشم کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس سے قبل عبدالرحمٰن بن مروان نے الفانسو حاکم ایسٹریاس سے خط و کتابت کر کے دوستی اور محبت کا عہد نامہ لکھ دیا تھا۔ اب اندلس کے وزیر اعظم کو گرفتار کر کے اس نے اپنے دوست الفانسو کے پاس بھیج دیا تھا تاکہ اس کو عبدالرحمٰن کی طاقت اور قوت کا اندازہ ہو سکے اور محبت و دوستی کے تعلقات استوار ہو جائیں۔ سلطان محمد کو جب اپنے وزیر کے گرفتار ہونے کا حال معلوم ہوا تو اس نے عبدالرحمٰن بن مروان کو ہاشم کی رہائی کی بابت لکھا۔ عبدالرحمٰن بن مروان نے ایک لاکھ دینار زر فدیہ طلب کیا۔ ہاشم چند ماہ تک قید میں رہا اور عبدالرحمٰن بن مروان اور سلطان محمد کے درمیان خط و کتابت جاری رہی۔ آخر سلطان محمد نے اس بات کو منظور کر لیا کہ عبدالرحمٰن شہر بطلیوس اور اس کے نواحی علاقے پر قابض اور متصرف رہے اور اس پر کوئی خراج بھی عائد نہ کیا جائے۔ ساتھ ہی زر فدیہ ادا کر کے ہاشم کو چھڑایا جائے۔ چنانچہ ہاشم جب چھوٹ کر آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کا حریف جس نے اس کو قید کر لیا تھا، ایک نہایت مضبوط مقام پر خود مختار حاکم ہو گیا ہے اور باج و خراج سے بھی بالکل آزاد ہے، ابن خلدون کا بیان ہے کہ وزیر ہاشم کی رہائی اڑھائی برس کے بعد سنہ ۲۶۵ھ میں ہوئی تھی۔ غرض عبدالرحمٰن بن مروان جو ایک معمولی باغی سردار تھا، اب اپنے آپ کو سلطان محمد کا ہم سر سمجھنے لگا۔ اس نے سلطنت ایسٹریاس سے اپنی دوستی اور تعلقات کو خوب بڑھایا۔ یہ رنگ دیکھ کر ملک کے ہر حصے میں سرداروں نے بغاوت اور سرکشی پر کمر ہمت چست کی اور سلطنت کا رعب خاک میں مل گیا۔

موسیٰ بن ذی النون گورنر شنت بریہ نے بغاوت اختیار کر کے طلیطلہ پر حملہ کیا کہ اس کو اپنے قبضے میں لائے۔ اہل طلیطلہ نے مقابلہ کر کے اس کو شکست دی۔ اس نے پھر حملہ کیا اور اس طرح ان کی زور آزمائی کا سلسلہ جاری ہوا۔ ادھر اسد بن حرث بن بدیع نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ سلطان محمد نے شہزادہ منذر کو فوج دے کر موسیٰ بن ذی النون کی طرف بھیج دیا۔ منذر کئی شہروں اور قلعوں کو فتح کر کے قرطبہ میں واپس آ گیا۔ غرض سلطان محمد کو بغاوتوں کے فرو کرنے اور فوجیں بھیجنے سے ایک روز بھی فرصت نہیں ملی۔

اسی نازک زمانے میں عمر بن حفصون نامی ایک عیسائی نے خاص صوبہ اندلیسیہ یعنی جزیرہ نمائے اندلس کے جنوبی و مشرقی علاقے کے پہاڑوں میں ڈاکوؤں کی ایک جمعیت اپنے گرد فراہم کی۔ عمر بن حفصون گاتھک خاندان کے سر برآوردہ اشخاص میں سے تھا۔ اس لیے بڑی آسانی سے وہ عیسائیوں اور جرائم پیشہ لوگوں کو جمع کر سکا۔ نواح مالقہ میں پہاڑ کے ایک دشوار گزار مقام پر قلعہ بنا ہوا تھا۔ اس قلعے کو عمر بن حفصون نے اپنا قرار گاہ بنایا اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری کر دیا۔ اردگرد کے شہروں اور قصبوں کے عاملوں نے بار بار اس پر چڑھائیاں کیں مگر ہر مرتبہ شکست یاب ہوئے۔ آخر سنہ ۲۶۷ھ میں دار السلطنت قرطبہ سے ایک زبردست فوج اس کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئی۔ عمر بن حفصون نے براہ چالا کی اس فوج کی آمد پر درخواست صلح بھیجی اور اس بات کا وعدہ کیا کہ آئندہ لوٹ مار کرنے سے باز رہ کر علاقے میں امن و امان قائم رکھے گا۔ چنانچہ اسی شرط پر وہ

پہاڑی قلعہ اس کے قبضے میں چھوڑ دیا گیا اور اس کے نتیجے میں اس خطے میں پھر سے امن وامان قائم ہو گیا۔

سنہ ۲۶۸ھ میں سلطان محمد نے شہزادہ منذر کو ایک زبردست فوج دے کر شمال کی جانب بھیجا کہ اس طرف کے عیسائی سرکشوں کو سزا دے دی جائے۔ شمالی ریاستوں اور باغیوں کی حالت، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، یہ تھی کہ جب کوئی زبردست فوج اس طرف جاتی تھی تو اظہار اطاعت کرنے لگتے تھے۔ لیکن جونہی یہ فوج واپس ہوئی پھر تمرد و سرکشی پر قائم ہو گئے۔ چنانچہ شہزادہ منذر نے اول سرقسطہ پہنچ کر وہاں کے باغیوں کو درست کیا پھر البہ وقلاع وغیرہ کا رخ کیا۔ اس کے بعد لریدہ کی بدنظمی کو دور کر کے وہاں اسماعیل بن موسیٰ کو ناظم مقرر کیا اور واپس چلا آیا۔ منذر کے واپس ہوتے ہی حاکم برشلونہ نے اسماعیل پر حملہ کیا۔ اسماعیل نے کمال مردانگی سے مقابلہ کر کے اہل برشلونہ کو شکست دے کر بھگا دیا۔

سنہ ۲۷۰ھ میں عمر بن حفصون نے پھر بغاوت اختیار کی اور پہلے سے زیادہ طاقت بہم پہنچا کر علاقہ مالقہ کے امن وامان کو برباد کر دیا۔ قرطبہ سے ہاشم بن عبدالعزیز وزیر اعظم ایک فوج لے کر عمر بن حفصون کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ معرکے ہوئے، آخر ہاشم نے سلام و پیام کے ذریعے عمر بن حفصون کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی اور اس کو معافی کا وعدہ دے کر اپنے ساتھ قرطبہ چلنے پر رضامند کر لیا۔ عمر بن حفصون وزیر ہاشم کے ساتھ قرطبہ چلا آیا۔ وزیر ہاشم اس کی بہادری دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے سلطان محمد سے کہہ کر عمر بن حفصون کو افواج سلطانی کا سپہ سالار اعظم مقرر کرا دیا۔

اس کے بعد سنہ ۲۷۱ھ میں وزیر ہاشم عمر بن حفصون کو ایک زبردست فوج کے ساتھ اپنے ہمراہ لے کر شمال کی جانب متوجہ ہوا۔ وہاں اہل سرقسطہ پھر باغی ہو گئے تھے اور ریاست ایسٹریاس کی جانب سے خطرات پیدا ہو رہے تھے۔ عمر بن حفصون نے ان لڑائیوں میں بڑی شہرت و ناموری حاصل کی۔ اہل سرقسطہ اور عیسائیان ایسٹریاس کو پیہم شکستیں دے کر اور خراج وصول کر کے یہ دونوں واپس ہوئے۔ عمر بن حفصون کو حکومت اسلامیہ کی سپہ سالاری کچھ پسند نہ آئی کیونکہ اس طرح وہ اپنی امیدوں کو کہ دوبارہ گاتھک حکومت قائم ہو جائے، پورا نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ راستے ہی سے وہ وزیر ہاشم سے جدا ہو کر بھاگا اور سیدھا اپنے اسی پرانے قلعے میں پہنچ کر مضبوط ہو بیٹھا۔ اس کے قدیمی دوست اور پرانے رفیق پھر آ آ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ادھر عمر بن حفصون نے پہلے سے زیادہ مضبوط ہو کر نواح مالقہ میں خود مختار حکومت شروع کی، ادھر عبدالرحمٰن بن مروان نے جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، اشبیلیہ اور اس کے نواحی علاقے میں لوٹ مار شروع کر دی۔ سلطان محمد نے اشبیلیہ کی طرف اپنے بیٹے منذر اور وزیر ہاشم کو فوج دے کر بھیجا اور عمر بن حفصون کو اپنی حکومت و ریاست قائم کرنے کے لیے نہایت قیمتی موقع مل گیا۔ وہاں اشبیلیہ کے نواح میں دو سال تک جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر سنہ ۲۷۲ھ میں عبدالرحمٰن بن مروان کو تھوڑا سا علاقہ اور دے کر صلح کر لی گئی اور اس طرف کی ہنگامہ آرائی ختم ہوئی۔

اس کے بعد شہزادہ منذر کو عمر بن حفصون کی طرف بھیجا گیا۔ عمر بن حفصون جب سے سپہ سالاری

چھوڑ کر آیا تھا، پہلے کی نسبت زیادہ شائستہ اور مآل اندیش بن گیا تھا۔ اس نے دربار قرطبہ اور وزیر ہاشم کی صحبت سے بہت فائدہ اٹھایا اور اس مرتبہ آ کر بجائے ایک ڈاکو اور رہزن کے وہ ایک فرماں روا اور والی ملک کی حیثیت میں نمودار ہوا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جس قدر حصۂ ملک پر اس کا قبضہ تھا، اس میں چوری اور ڈاکہ زنی کا بالکل انسداد کر دیا اور رہزنوں، چوروں اور ظالموں کو نہایت عبرتناک سزائیں دیں اور بالخصوص وہ اپنے سپاہیوں اور فوجی سرداروں کو تو قطعاً رعایا پر ظلم نہ کرنے دیتا۔ اس کا اثر اس کی حکومت و طاقت کے بڑھانے کا موجب ہوا اور یہی وہ اصول تھا جو عمر بن حفصون دربار قرطبہ سے یاد کر کے آیا تھا۔ رعب سلطنت کے باقی نہ رہنے سے ملک میں ہر طرف بدامنی کا دور دورہ تھا اور ایسی حالت میں رعایا کے جان و مال کا محفوظ نہ ہونا یقینی بات تھی لیکن بخلاف اس کے عمر بن حفصون نے اپنے چھوٹے سے مقبوضہ علاقے میں جس پر وہ غاصبانہ اور باغیانہ طور پر قابض و متصرف تھا، قابل رشک امن و امان قائم کر رکھا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کی آبادی کو اس کے ساتھ محبت ہو گئی اور ارد گرد کے علاقوں کے لوگ بھی اس سے ہمدردی کرنے لگ گئے۔

سلطان محمد کی وفات:

سنہ ۲۷۲ھ کے آخر اور سنہ ۲۷۳ھ کے شروع میں منذر بن محمد ولی عہد سلطنت فوج لے کر عمر بن حفصون کے مقابلے کو آیا۔ ابتداً چند چھوٹی چھوٹی معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ اس کے بعد بہت زیادہ ممکن تھا کہ عمر بن حفصون کو مغلوب یا مقتول یا گرفتار کر لیا جائے۔ عمر بن حفصون زخمی ہو چکا تھا۔ اس کو اور اس کی فوج کو منذر بن محمد نے محصور کر کے اس قدر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو منذر کے سپرد کر دینے والا تھا کہ اسی اثناء میں منذر کے پاس سلطان محمد کے فوت ہونے کی خبر پہنچی۔ منذر اس خبر کو سنتے ہی بلا توقف قرطبہ کی جانب روانہ ہو گیا اور عمر بن حفصون اس طرح مع اپنی جماعت کے برباد ہونے سے بچ گیا۔

سلطان محمد سنہ ۲۰۷ھ میں پیدا ہوا تھا۔ قریباً ۶۶ سال کی عمر پا کر ماہ صفر سنہ ۲۷۳ھ میں ۳۴ سال چند ماہ حکومت کرنے کے بعد فوت ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا منذر تخت نشین ہوا۔

سلطان محمد کے عہد حکومت پر تبصرہ:

سلطان محمد کے عہد حکومت میں اندلس میں بدامنی جاری و ساری رہی۔ اس کو ایک روز بھی مطمئن ہو کر بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ اندرونی بغاوتوں اور بیرونی سازشوں کے ختم نہ ہونے والے سلسلے نے سلطان محمد کو ہمیشہ مصروف و پریشان رکھا۔ سلطان محمد کے زمانے میں خاندان بنو امیہ کی حکومت بہت ہی کمزور اور بے وقار ہو گئی تھی کہ معمولی اور ادنیٰ درجے کے لوگوں کو بھی بغاوت و سرکشی کی جرأت ہو گئی تھی۔ سلطنت اموی کے اس ضعف و اختلال نے عیسائیوں کو بہت فائدہ پہنچایا۔ انھوں نے اپنے آپ کو خوب طاقتور بنا کر اس بات کو ممکن سمجھا کہ ہم

اندلس میں پھر عیسائی حکومت قائم کر سکیں گے۔

سلطان محمد ذاتی طور پر بہادر اور مستعد بادشاہ تھا مگر اندرونی شورشوں اور خود مسلمان سرداروں کی غداریوں اور بغاوتوں نے ملک کی حالت کو اس قدر نازک بنا دیا تھا کہ ان کی مخالفتوں اور سازشوں کا یہ طوفان سلطان محمد کے زمانے میں سلطنت اسلامیہ کی خرابی و بے عزتی کا باعث ہوا۔ اس کے علاوہ عیسائی سلاطین اور عباسی خلفاء اندلسی مسلمانوں میں نا اتفاقی پیدا کرانے میں کوشاں رہتے تھے لیکن اب عباسیوں کا جوش مخالفت تو سرد ہو چکا تھا اور ان کو اس قدر ہوش ہی نہ رہا کہ وہ سلطنت اندلس کی طرف توجہ کرتے۔ عیسائیوں کی مخالفت کوئی پوشیدہ چیز نہ تھی۔ اب جو مسلمانوں میں نا اتفاقی اور عداوتیں پیدا ہوئیں۔ یہ فقہاء کی کوتاہ اندیشیوں کا نتیجہ تھا۔ اندلس کے قاضیوں اور عالموں کو عام طور پر بمقابلہ دیگر ممالک اسلامیہ کے ہمیشہ زیادہ اقتدار حاصل رہا ہے اور اسی مناسبت سے اندلس کے مسلمانوں میں ہمیشہ زیادہ نا اتفاقی پائی گئی ہے، جس کا پہلا قابل تذکرہ اور اہم مظہر سلطان محمد کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں جو سب سے زیادہ نقصان اسلام کو اندلس میں پہنچا وہ یہ تھا کہ اس سے پہلے تک عیسائی برابر اسلام میں داخل ہوتے رہتے تھے اور باوجودیکہ شمالی پہاڑی علاقے کے عیسائیوں کی طرف سے طرح طرح کی کوششیں مسلمانوں کو بدنام کرنے اور اسلام سے عیسائیوں کو متنفر بنانے کے لیے ہوتی رہتی تھیں۔ تاہم سمجھدار شخص عیسائیت کو ترک کر کے اسلام قبول کرتے جاتے تھے اور اس طرح نومسلموں کی ایک بڑی تعداد ہر زمانے میں موجود ہوتی تھی۔

سلطان محمد کے زمانے میں علماء وفقہاء نے ایسے فتاویٰ اور ایسے قوانین جاری کیے جس سے نہ صرف عیسائیوں کے قدیمی حاصل شدہ حقوق کو صدمہ پہنچا بلکہ نومسلموں کے متعلق بھی بے اعتمادی اور بے اعتباری پیدا ہوئی اور اس کے نتیجے میں ارتداد کا سلسلہ جاری ہوا۔ نومسلم لوگ اسلام کو چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرنے لگے۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی عبرت کا مقام نہیں ہوسکتا کہ مولویوں کی تنگ نظری وسخت گیری نے سلطان محمد کے آخری عہد حکومت میں مرتدین کا ایک بہت بڑا گروہ پیدا کر دیا جو شمالی اندلس میں نہیں بلکہ دارالسلطنت قرطبہ کے نواح میں پیدا ہو کر شمالی عیسائیوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم   کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد

سلطان محمد کے آخر عہد حکومت میں اندلس کے اندر مختلف جماعتیں اور مختلف گروہ پیدا ہوئے جن میں سے ہر ایک کے مقاصد الگ الگ تھے، اور یہ مقاصد حسب ذیل تھے:

① خالص عربی النسل لوگ۔ ان کے اندر بھی آپس میں اتفاق نہ تھا اور کئی گروہ تھے۔ مثلاً شامی، یمنی، حجازی اور حضرمی وغیرہ۔

② مولدین یعنی وہ لوگ جن کے باپ عرب اور مائیں عیسائیان اندلس سے تھیں۔ ان کو دوغلے عرب کہنا چاہیے۔ مگر یہ سب کے سب اپنے اندر عربی خون نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا زیادہ حصہ بربری باپ اور

اندلسی ماؤں کی اولاد پر مشتمل تھا۔

(۳) نومسلم یعنی وہ لوگ جو پہلے عیسائی تھے اور اب مسلمان ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کی اولاد بھی نومسلم ہی کہلاتی تھی اور یہ مذہب اسلام کے زیادہ پابند نظر آتے تھے۔

(۴) خالص بربری لوگ، ان کی تعداد بھی کافی تھی۔

(۵) مجوسی یہ ان لوگوں کی اولاد تھی جن کو بطور غلام مختلف ملکوں سے خرید کر منگوایا گیا تھا، ان کی تعداد زیادہ نہ تھی۔

(۶) یہودی، یہ بھی اندلس کے قدیم باشندے تھے۔ ان کا پیشہ زیادہ تر تجارت تھا اور فساد و بغاوت سے الگ رہنا چاہتے تھے۔

(۷) عیسائی، یہ اپنے مذہب پر آزادی کے ساتھ عامل تھے۔ ان کی تعداد بھی ملک میں زیادہ تھی۔

(۸) مرتدین، یہ وہ لوگ تھے جو سلطان محمد کے زمانے میں اسلام سے روگرداں ہو کر پھر حالت کفر میں واپس چلے گئے تھے۔ ان مرتدین کے ساتھ ہی ایک ایسا فرقہ بھی شامل تھا جو کسی مذہب کی قید میں نہ تھا اور اس کا پیشہ لوٹ مار اور غارت گری ہی تھا۔

اول الذکر چاروں گروہ مسلمان اور اصل اسلامی طاقت سمجھے جاتے تھے۔ بادشاہ اور علماء کا اولین فرض یہ تھا کہ ان کی نگاہ میں ان چاروں کا مرتبہ مساوی ہوتا مگر سلطان محمد سے اس معاملے میں سخت غلطی اور کمزوری کا اظہار ہوا اور مولدین کو جن کی تعداد اور طاقت بڑھی ہوئی تھی، شکایتیں پیدا ہوئیں۔ علماء کی گروہ بندی اور مالکی، حنبلی تفریق نے نومسلموں کے جوش کو سرد کر دیا۔ بربری لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے اندر سے بحیثیت مجموعی روحانیت جاتی رہی۔ اخلاق فاضلہ ضعیف ہو گئے۔ دینی جہاد کا شوق سرد پڑ گیا۔ وہ تلواریں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں بے نیام ہوتی تھیں، اب نفسانی اغراض و خواہشات کے پورا ہونے میں چمکنے لگیں۔ ہر ایک گروہ کی تفریق نمایاں سے نمایاں تر ہوتی گئی۔ سلطان نے جس قدر فقہاء کے اقتدار کو بڑھایا، اسی قدر عوام کا اعتماد فقہا کی نسبت کمزور ہوتا گیا۔ اس بے اعتمادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی محبت دلوں سے جاتی رہی اور دنیا دین پر مقدم ہو گئی۔

مسلمانوں اور ان کی سلطنت کا حال یہ ہو گیا تھا۔ ادھر عیسائیوں کی ریاستیں جو وسیع ہوتے ہوتے اسلامی سلطنت کی ہمسر بن گئی تھیں، روز افزوں ترقی پر تھیں۔ الفانسو سوم شاہ ایسٹریاس مسلمانوں سے اندلس کے خالی کرانے کا پروگرام تیار کر رہا تھا۔ پرتگال کے عیسائی اپنی الگ ریاست قائم کرنے کی تیاری کر چکے تھے۔ اشبیلیہ پر ابن مروان اور مالقہ وغیرہ پر ابن حفصون خود مختار حکمران تھے۔ طلیطلہ نے خود مختار ہو کر عیسائی مقبوضہ کو قرطبہ کے قریب تک وسیع کر دیا تھا۔ جلیقیہ واراگون وغیرہ کے عیسائی حاکموں نے جبل البرتات سے اندلس کے مغربی ساحل یعنی پرتگال و اشبیلیہ تک عیسائیوں کا ڈنکا بجوا دیا تھا۔ اس سلسلے میں کہیں کہیں کسی شہر کا کوئی

مسلمان عامل موجود تھا تو وہ عیسائیوں کی ہمدردی کا دم بھر رہا تھا۔ غرض سلطان منذر نے نہایت خطرناک حالات میں تخت سلطنت پر قدم رکھا۔

سلطان منذر بن محمد سنہ ۲۲۹ھ میں پیدا ہوا تھا۔ ۴۴ سال کی عمر میں اپنے باپ کی وفات کے بعد ماہ صفر سنہ ۲۷۳ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کی تمام عمر لڑائیوں اور زور آزمائیوں میں گزری تھی۔ اپنے باپ کے عہد حکومت میں وہ بار بار سپہ سالاری کی خدمت انجام دے چکا تھا۔

سلطان منذر کے کارنامے:

اس نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے باپ کے وزیر اعظم ہاشم بن عبدالعزیز کے قتل کا فتویٰ جو علماء نے جاری کیا تھا، نافذ کیا اور اس کو دوسرے جہان میں پہنچایا۔ عمر بن حفصون نہ صرف مالقہ بلکہ اور بھی متعدد شہروں پر قابض و متصرف ہو چکا تھا۔ سلطان منذر نے ہاشم بن عبدالعزیز کے قتل سے فارغ ہو کر عمر بن حفصون پر چڑھائی کی۔ ابن حفصون اگرچہ نہایت تجربہ کار اور بہادر سپہ سالار تھا مگر سلطان منذر بھی اس سے کچھ کم نہ تھا۔ یکے بعد دیگرے قلعوں کو فتح کرتا، ابن حفصون کی فوجوں کو پیچھے ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔ ابن حفصون نے مصلحت وقت دیکھ کر سلطان کی خدمت میں صلح کی درخواست بھیج کر اطاعت کا اقرار کیا۔ سلطان نے اس درخواست کو غنیمت سمجھا۔ اس لیے کہ وہ اس خطرناک دشمن کے ساتھ دیر تک الجھے رہنے کی نسبت دوسرے باغیوں کی سرکوبی ضروری جانتا تھا۔ سلطان ابھی واپس ہو کر قرطبہ تک پہنچنے نہیں پایا تھا کہ اس کے باغی ہونے کی خبر پہنچی۔ سلطان نے پھر واپس ہو کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ اب کی مرتبہ ابن حفصون نے پھر نہایت ندامت و شرمندگی اور عجز و الحاح کے ساتھ اپنی خطا کی معافی چاہی اور خود سلطان کے ساتھ قرطبہ جانے پر رضامند ہو گیا۔ سلطان نے اس بات کو بہت غنیمت سمجھا۔ نہایت عزت و تکریم کے ساتھ اس باغی سردار کو اپنے ہمراہ لے کر قرطبہ کی طرف چلا۔

سلطان کا ارادہ تھا کہ قرطبہ پہنچ کر فوراً طلیطلہ پر چڑھائی کرے اور مرکزی شہر کو اول قبضے میں لا کر پھر کسی دوسری طرف متوجہ ہو۔ یہ سلطان منذر کی کمال بیدار مغزی اور ہوشیاری کی دلیل تھی بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ شروع میں مسلمانوں سے غلطی ہوئی کہ انھوں نے طلیطلہ کی اہمیت اور اس کے محل وقوع کے اعتبار سے اس کے دارالسلطنت ہونے کی موزونیت کو محسوس نہیں کیا۔ اگر مسلمان طلیطلہ کو دارالسلطنت بنا لیتے تو یقیناً مسلمانوں کو اس قدر مشکلات ملک اندلس میں پیش نہ آتے جو قرطبہ کے دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے پیش آئے۔ طلیطلہ ملک اندلس کے وسط میں واقع تھا اور بہت مضبوط مقام تھا۔ شمالی عیسائی ریاستوں کو طاقتور ہونے اور پھیلنے کا موقع ہی نہیں مل سکتا تھا۔ بہر حال منذر طلیطلہ پر قبضہ کرنے کے لیے بیتاب تھا اور بظاہر عمر بن حفصون کی طرف سے اس کو کامل اطمینان ہو چکا تھا۔ راستے میں عمر بن حفصون کو کسی نے اس کا وہ انجام یاد دلایا جو فقہاء کے فتوے کی تعمیل میں ہونے والا ہے۔ حالانکہ سلطان اس کی دل دہی پر آمادہ اور اس سے اہم خدمات سلطنت لینے کا

ارادہ رکھتا تھا مگر جب عمر بن حفصون کو اپنا وہ واقعہ یاد آیا کہ محض فقہاء کی مخالفت نے اس کو ہشام بن عبدالعزیز کے لشکر سے جدا ہو کر بھاگنے اور اپنے ارتداد کے اعلان پر مجبور کیا تھا، نیز جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ ہشام بن عبدالعزیز بھی انھیں حضرات کے فتوؤں کی بنا پر قتل ہو چکا ہے تو وہ اپنے قتل ہونے کو یقینی سمجھنے لگا اور قرطبہ تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ لوگوں کی آنکھ بچا کر بھاگ نکلا۔ سیدھا اپنے قلعے میں پہنچ کر قلعہ بند ہو بیٹھا اور اپنے اردگرد علاقے سے اپنے تمام آدمیوں کو جمع کر لیا۔

سلطان منذر کی وفات:

سلطان منذر پھر اس کی طرف لوٹا۔ اب کی مرتبہ بڑی سختی سے قلعے کا محاصرہ شروع کیا۔ عمر بن حفصون نے بھی بڑی ہمت کے ساتھ مدافعت جاری رکھی۔ اس محاصرے نے طول کھینچا اور قلعہ ابھی فتح ہونے نہیں پایا تھا کہ سلطان منذر نے سنہ ۲۷۵ھ میں بہ حالت محاصرہ دو برس سے بھی کم حکومت کر کے قریباً ۴۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔ سلطان کے کوئی بیٹا نہ تھا۔ اس لیے امراء لشکر نے منذر کے بھائی عبداللہ کے ہاتھ پر قلعہ کی دیوار کے نیچے بیعت کی۔ عبداللہ نے عمر بن حفصون کی ریاست وحکومت کو بھی باقاعدہ طور پر تسلیم کر لیا۔ عمر بن حفصون نے اس کو بہت غنیمت سمجھا اور سلطان عبداللہ اپنے بھائی منذر کے جنازے کو لے کر قرطبہ پہنچا۔ راستے میں عرب سرداروں کی چہ میگوئیاں حد سے بڑھ گئیں اور سلطان عبداللہ کو متہم کرنے میں یہاں تک مبالغے سے کام لیا گیا کہ قرطبہ تک پہنچتے پہنچتے تمام فوج ادھر ادھر منتشر ہوگئی اور سو آدمیوں سے بھی کم آدمی سلطان عبداللہ کے ساتھ سلطان منذر کا جنازہ لیے ہوئے قرطبہ میں داخل ہوئے۔

عبداللہ بن محمد کی پہلی کمزوری:

سلطان عبداللہ بن محمد نے تخت نشین ہوتے ہی یہ کمزوری دکھائی کہ عمر بن حفصون کی حکومت تسلیم کر کے محاصرہ اٹھا لیا۔ حالانکہ اس کے لیے قدرتی طور پر اپنے عنوان سلطنت کو شاندار بنانے کا موقع تھا کہ وہ قلعہ کو فتح کر کے واپس ہوتا اور عمر بن حفصون کو جو طول اور شدت محاصرہ سے تنگ آ چکا تھا، گرفتار یا قتل کر کے قرطبہ کی جانب لوٹتا۔

عبداللہ کے عہد میں سلطنت بنو امیہ کی حالت:

سلطنت عبداللہ کی تخت نشینی کے وقت یعنی سنہ ۲۷۵ھ میں حکومت اندلس یعنی سلطنت بنو امیہ کی حالت اس قدر سقیم ہو چکی تھی کہ خزانہ تمام خالی ہو گیا تھا۔ آمدنی جو کسی زمانے میں دس لاکھ دینار سالانہ تک پہنچ گئی تھی۔ اب ایک لاکھ دینار سالانہ تک پہنچ گئی تھی۔ عیسائی ریاستوں سے قطع نظر کی جائے تو دارالسلطنت قرطبہ

کے دونوں پہلوؤں پر دو ایسے زبردست رقیب پیدا ہو چکے تھے جن کی طاقت سلطنت قرطبہ سے کم نہ تھی۔ ایک طرف ابن حفصون تھا اور دوسری طرف ابن مروان۔ ابن حفصون زیادہ عقلمند اور مدبر شخص تھا۔ اس کا طرز حکومت ایسا تھا کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہونے اور اس کے زیر حکومت رہنے کو پسند کرتے تھے مگر چونکہ اس کے ارتداد کا اعلان ہو چکا تھا۔ اس لیے بہت سے مسلمان اس کی مدد کرنے کو گناہ سمجھ کر بجائے اس کے سلطنت کے دوسرے رقیب ابن مروان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ابن حفصون باوجود اعلان ارتداد عیسائی ریاستوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا مگر ابن مروان باوجود مسلمان ہونے کے الفانسو سوم بادشاہ ایسٹریاس اور دوسرے عیسائیوں کا ہم عہد اور رفیق تھا۔ نواح اشبیلیہ میں بعض عرب سرداروں کی جاگیریں تھیں اور وہ وہیں اقامت گزیں تھے۔ ان لوگوں میں سے بعض نے یہ رنگ دیکھ کر علم بغاوت بلند کیا اور اشبیلیہ پر قابض و متصرف ہو گئے۔ ادھر اسی قسم کے جاگیردار عربوں نے غرناطہ کے نواح میں علم بغاوت بلند کر کے غرناطہ پر قبضہ کر لیا۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ ابن حفصون اور ابن مروان کے مدمقابل دو اور طاقتیں پیدا ہو گئیں اور ان چاروں طاقتوں میں جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری ہوا۔ دربار قرطبہ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ ان سب کو زیر کرتا بلکہ اب سلطان عبداللہ کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ وہ نواح قرطبہ پر حکومت رکھتا اور ان لڑنے والی چاروں طاقتوں کے درمیان کبھی کبھی دخل دے کر ان کی لڑائی کو صلح سے تبدیل کرا دیتا تھا۔ چونکہ چاروں رقیب ایک دوسرے کے مدمقابل تھے، اس لیے ان میں سے ہر ایک دربار قرطبہ کی سیادت کو تسلیم کرتا اور سلطان کو اپنا بادشاہ کہتا لیکن عملی طور پر وہ بالکل خودمختار تھے اور کسی قسم کا باج وخراج سلطان عبداللہ کے پاس نہیں بھیجتے تھے۔ مذکورہ عرب سرداروں کا طرز عمل مولدین اور نومسلموں کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ اس لیے مولدین اور نومسلموں کا ایک بڑا گروہ ابن مروان کے پاس چلا گیا تھا۔

انھی ایام میں شمالی شہروں کے دو مسلمان عاملوں نے سرقسطہ و شقت بریہ کے نواح میں عیسائیوں کے اس منصوبے کو کہ اندلس کو مسلمانوں خالی کرا لیا جائے سخت صدمہ پہنچایا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب بادشاہ ایسٹریاس اپنی فوجیں لے کر جنوب کی طرف بڑھا تو مقام طرسونہ کے عامل لب بن محمد نے اپنی نہایت قلیل جمعیت سے عیسائی فوجوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ ادھر عبدالرحمٰن بن مروان نے اپنے دوست شاہ ایسٹریاس کو اطلاع دی کہ اگر اپنی حدود سلطنت سے آگے قدم بڑھایا تو میں سب سے پہلے مقابلے کے لیے تیار ہوں۔ اس تنبیہ وتہدید کا یہ اثر ہوا کہ عیسائیوں نے مزید چند روز کے لیے خاموش رہنا مناسب سمجھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حملہ آوری سے مسلمانوں کی خانہ جنگی موقوف ہو کر ان میں اتفاق پیدا ہو جائے گا اور ان کے کمزور ہونے کا سلسلہ رک جائے گا۔

ادھر ابن حفصون نے ہوشیاری سے افریقہ کے خاندان اغالبہ سے اندلس میں فوج منگوانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اگرچہ عمر بن حفصون کو کامیابی نہ ہوئی مگر اس خبر کے سننے سے دربار قرطبہ میں ہلچل پیدا ہو گئی اور سلطان عبداللہ نے جس قدر فوج وہ فراہم کر سکتا تھا، فراہم کر کے ابن حفصون پر فوراً چڑھائی کر دی۔ سلطان

عبداللہ اس بات سے واقف تھا کہ اگر عمر بن حفصون کے پاس عباسی خلیفہ کی سند آ گئی تو عام طور پر لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور پھر اندلس میں بنو امیہ کا وجود باقی نہیں رہ جائے گا۔ سلطان عبداللہ چودہ ہزار سے زیادہ فوج جمع نہ کر سکا۔ ابن حفصون کے پاس تیس ہزار فوج تھی۔ آخر کار دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ اس معرکے میں سلطان عبداللہ اور اس کے ہمراہیوں نے غیر معمولی بہادری کا اظہار کیا اور ابن حفصون کو شکست فاش دے کر پہاڑوں میں بھگا دیا۔ باغی فوج کے بہت سے آدمی مارے گئے اور سلطان عبداللہ کی حدود ملکیت کسی قدر وسیع ہو گئیں۔ اس فتح کا اثر حکومت قرطبہ کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ سلطنت کا اعتبار و اعتماد جو بالکل ضائع ہو چکا تھا، اب کسی قدر پھر سے قائم ہونے لگا۔

عبداللہ کی عملی جدو جہد:

ادھر عبداللہ بن مروان نے انھی ایام میں اشبیلیہ کے خود مختار رئیس ابراہیم بن حجاج سے صلح کر کے اپنی طاقت وقوت بڑھانے کی کوشش کی۔ سلطان عبداللہ نے اس فتح کے نتائج دیکھ کر ابن مروان کا زور توڑنا اور اس پر حملہ کرنا ضروری سمجھا۔ وزیر السلطنت احمد بن ابی عبیدہ کو فوج دے کر ابن مروان کی طرف بھیجا گیا۔ ابن مروان نے ابراہیم بن حجاج والی اشبیلیہ سے امداد طلب کی۔ چنانچہ ابراہیم بن حجاج بھی ابن مروان کی کمک پر تیار ہو گیا۔ دونوں نے مل کر احمد بن ابی عبیدہ کا مقابلہ کیا۔ اس معرکے میں بھی رعب سلطنت نے اپنا کام کیا اور باغیوں کو شکست ہوئی۔ اس شکست کے بعد ابراہیم بن حجاج نے اطاعت وفرمانبرداری کا اظہار کیا اور سلطان عبداللہ نے اس کو اشبیلیہ کا عامل مقرر کر دیا۔ اس لڑائی کا نتیجہ پہلی لڑائی سے بھی زیادہ مفید برآمد ہوا اور حدود سلطنت کے ساتھ ہی وقار سلطنت نے بھی پہلے سے زیادہ ترقی کی۔ اس واقعہ کے چند ہی روز بعد عبدالرحمٰن بن مروان کا انتقال ہو گیا اور اس کے بیٹوں نے طلیطلہ وغیرہ میں حکومت شروع کی۔ ادھر ابراہیم بن حجاج حاکم اشبیلیہ نے اس کے ملک کا اکثر حصہ اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ عمر بن حفصون نے سلطان عبداللہ سے شکست کھا کر پہاڑوں میں پناہ لی تھی۔ جب سلطان دار السلطنت کی طرف واپس ہوا تو عمر بن حفصون نے بتدریج اپنی طاقت کو بڑھانا اور اپنی حالت کو سدھارنا شروع کیا۔

بادشاہ ایسٹریاس مسمی الفانسو اور اس کے بھائی میں لڑائی شروع ہوئی۔ الفانسو نے اپنی تسکین خاطر کے لیے سلطان عبداللہ سے خط وکتابت کر کے تجدید صلح کی خواہش ظاہر کی۔ سلطان نے فوراً رضا مندی ظاہر کر کے ان شرائط پر صلح کر لی کہ نہ بادشاہ ایسٹریاس اپنی موجودہ حدود سلطنت سے باہر قدم رکھے، نہ اسلامی فوجیں اس کی حدود میں داخل ہوں۔ یہ صلح الفانسو کے لیے بہر طور مفید اور نفع رساں تھی کیونکہ مسلمان اس تمام ملک کو جو اس کے قبضے میں تھا، اپنا ملک سمجھتے اور اس پر قبضہ کرنے کا دعویٰ رکھتے تھے لیکن اب سلطان عبداللہ نے اس کی حکومت کو تسلیم کر کے اس کی اولوالعزمی کو تقویت پہنچا دی۔

ادھر آئے دن کی لڑائیوں اور بغاوتوں سے رعایا تنگ آ چکی تھی اور بدامنی کا یہ سلسلہ بہت ہی طویل ہو گیا تھا۔ لہٰذا خود بخود لوگوں کی توجہ اس طرف مائل ہوئی کہ دربار قرطبہ کے خلاف بغاوت کرنا کسی طرح مفید نہیں ہے اور ایسے باغیوں کا ساتھ دینا اور ان کی مدد کرنا گناہ عظیم ہے۔ لہٰذا یہ صورت جو پیدا ہو چکی تھی، دیر تک قائم رہی۔ اشبیلیہ کے نام سے ایک خود مختار اور طاقتور ریاست مشرق میں قائم تھی۔ ان کے علاوہ باقی اکثر حصہ ملک اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا اور سب اپنی اپنی جگہ حکومت کرتے اور دربار قرطبہ کی ظاہری تکریم بجا لاتے تھے۔ عیسائی ریاستوں میں جانشینوں کے متعلق اتفاقاً سخت پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں اور ان کو اپنے اندرونی جھگڑوں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ حکومت اسلامیہ پر حملہ آور ہوتے:

خدا شرے برانگیزد کہ خیر مادراں باشد

اولاد:

سلطان عبداللہ کے گیارہ بیٹے تھے۔ جن میں دو بڑے بیٹے مطرف اور محمد زیادہ لائق اور امور سلطنت میں دخیل تھے۔ ان دونوں کے درمیان رقابت و عداوت پیدا ہو گئی تھی۔ زیادہ لائق اور قابل آدمی ریاست اشبیلیہ میں چلے گئے تھے کیونکہ وہاں علماء اور باکمال لوگوں کی خوب قدردانی ہوتی تھی۔ قرطبہ کا خزانہ خالی تھا۔ اشبیلیہ کی نوخیز اور جدید ریاست کا دربار ابراہیم بن حجاج کی قدردانیوں کے سبب قرطبہ کے لیے موجب رشک بن گیا تھا۔ یہاں کے موجودہ پست ہمت اراکین دربار نے دونوں بھائیوں کی رقابتوں کو ترقی دینے میں خوب کوشش کی۔ مطرف کو اپنے بھائی محمد کی شکایت کا موقع مل گیا اور اس نے باپ کے کان اچھی طرح بھرنے شروع کیے، اس کے ہمساز امرا نے تائید کی۔ سلطان عبداللہ اپنے بیٹے محمد کو غضب آلود نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ محمد نے مجبور ہو کر راہ فرار اختیار کی اور قرطبہ سے بھاگ کر عمر بن حفصون کے پاس چلا گیا۔ چند روز وہاں رہ کر اپنی حرکت پر پشیمان ہو کر باپ کے پاس پیغام بھیجا کہ مجھ کو جان کی امان دی جائے تو میں حاضر خدمت ہو جاؤں؟ عبداللہ نے اس کو جان کی امان دے کر بلوا لیا۔ اب مطرف کو شکایت کرنے کا اور بھی زیادہ موقع مل گیا تھا۔ چند روز کے بعد عبداللہ نے اپنے بیٹے محمد کو محل سرائے کے ایک حصے میں قید کر دیا۔ سلطان عبداللہ کو کسی مہم کی وجہ سے چند روز کے لیے قرطبہ سے باہر جانا پڑا۔ اپنی غیر موجودگی میں وہ مطرف کو قرطبہ کا حاکم مقرر کر گیا تھا۔ مطرف نے اس موقع پر بھائی کو جو محل سرائے میں قید تھا، قتل کرا دیا۔ عبداللہ کو محمد کے قتل ہونے کا سخت صدمہ ہوا، محمد کے بیٹے عبدالرحمٰن کی بڑی محبت کے ساتھ پرورش کرنے لگا۔ اس کے بعد سنہ ۲۸۳ھ میں مطرف نے کسی کاوش کی بنا پر وزیر السلطنت عبدالملک بن امیہ کو بھی قتل کر دیا۔ سلطان عبداللہ نے محمد اور عبدالملک کے قصاص میں مطرف کو قتل کرا دیا۔

وفات:

سلطان عبداللہ یکم ماہ ربیع الاول سنہ ۳۰۰ھ میں پچیس سال سے کچھ زیادہ دنوں سلطنت کرنے کے بعد بیالیس سال کی عمر میں فوت ہوا۔ سلطان عبداللہ کا تمام زمانہ فتنہ وفساد یا سلطنت کے ضعف و ناتوانی کے عالم میں بسر ہوا۔ اس کے زمانے میں بھی فقہاء اکثر ایک دوسرے سے دست بہ گریباں رہتے۔ مباحثوں، مناظروں اور دوراز کار مسائل کی تحقیق میں مشغول نظر آتے تھے۔ بظاہر کوئی صورت ایسی نظر نہ آتی تھی کہ مسلمانوں کا ابتدائی رعب و جلال اور حکومت اسلامیہ کا اثر واقتدار پھر واپس آ سکے گا۔ ان حالات میں سلطان عبداللہ کے بعد اس کا نوجوان پوتا عبدالرحمٰن بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمٰن ثانی تخت نشین ہوا۔

سلطان عبدالرحمٰن ثالث

عبدالرحمٰن ثالث بن محمد اموی:

جس روز سلطان عبداللہ کو دفن کیا گیا اسی روز عبدالرحمٰن الثالث تخت نشین ہوا۔ اس کی والدہ مریم نامی ایک امیر نصرانی خاندان کی صاحب زادی تھیں۔ (تاریخ اسپین: ص ۳۴۹) جب سلطان نے حکمرانی شروع کی اس وقت اس کی عمر بائیس سال تھی۔ سلطان عبدالرحمٰن نہایت نیک خصلت اور سعید فطرت انسان تھا، اس کے ساتھ بہت بڑا عالم اور فاضل تھا۔ اس کا علم و فضل اس کی عمر کے لحاظ سے بہت زیادہ تھا۔ اس کا چہرہ نہایت باتمکنت اور حسین و جمیل تھا۔ موزوں قد، گورا رنگ، خوب صورت نیلگوں آنکھیں، شیریں گفتار اور رفتار نرم تھی۔ نہایت سلیم الطبع اور رحم دل تھا۔ ان صفات حمیدہ کے باعث وہ اپنی رعایا کو اس قدر عزیز تھا کہ جس روز وہ تخت نشین ہوا تمام سلطنت میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی اور ہر ایک نے خوشی منائی۔

تخت نشینی:

عبدالرحمٰن بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمٰن ثانی اپنے دادا عبداللہ کے بعد اکتیس سال کی عمر میں بتاریخ یکم ربیع الاول سنہ ۳۰۰ھ میں تخت نشین ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ طارق و موسیٰ کا فتح کیا ہوا ملک اور عبدالرحمٰن الداخل کی قائم کی ہوئی سلطنت پاش پاش اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بظاہر عیسائیوں کے قبضے میں جانے کے لیے ہر قسم کی استعداد پیدا کر چکی تھی لیکن قضا و قدر کو یہ صورت ابھی پیدا کرنی منظور نہ تھی۔ اس نوجوان سلطان کی تخت نشینی کے وقت بہت سے چچا موجود تھے جو اس سے عمر و استحقاق میں بڑھے ہوئے تھے، لیکن یا تو ان کی پاک باطنی اور نیک نفسی تھی یا انھوں نے ایسی قریب المرگ سلطنت کا بادشاہ بن کر اپنے آپ کو خطرات میں مبتلا کرنا مناسب نہ سمجھا کہ سب نے بخوشی اس نوجوان کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا اور تخت نشینی کے وقت کسی قسم کا فتنہ و فساد برپا نہ ہوا۔

سلطان عبدالرحمٰن ثالث کی تخت نشینی کے وقت اس لیے بھی امن و سکون رہا کہ یہ نوجوان سلطان

تھوڑی سی عمر میں اپنے دادا کی زیرنگرانی ایسی اچھی اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کر چکا تھا اور ایسی عقل و ذہانت رکھتا تھا کہ بڑے بڑے علماء وفقہاء اس پر رشک کرتے تھے۔ اس کے اخلاق فاضلہ اور حسن خصائل نے اعیان و ارکان قرطبہ کو اپنا گرویدہ اور رشتہ داروں کو اپنا ہمدرد و بہی خواہ بنالیا تھا۔ وہ نہ صرف مجالس علمیہ میں عزت کا مقام رکھتا بلکہ اس زمانے کی رسم کے موافق فنون سپہ گری سے بھی خوب واقف و ماہر تھا۔

پہلا حکم:

تخت سلطنت پر جلوس فرماتے ہی اس نوجوان سلطان نے حکم جاری کیا کہ وہ تمام محصولات جو اس کے پیش روسلاطین بالخصوص سلطان عبداللہ نے خزانہ سلطانی کو پر کرنے کے لیے رعایا پر لگائے تھے اور جو احکام شرع کے خلاف تھے، معاف وموقوف کر دیے۔ اس اعلان کا اثر نہایت ہی مفید ثابت ہوا۔ رعایا میں اس کی مدح وثنا ہونے لگی اور دلوں میں اس کی نسبت بہترین توقعات پیدا ہو گئیں۔

اس کے بعد سلطان ثالث نے اعلان کیا کہ جو شخص حکومت کا فرماں بردار بن کر آئے گا اور آئندہ اطاعت پر قائم رہنے کا وعدہ کرے گا اس کی تمام سابقہ خطائیں معاف کر دی جائیں گی اور گزشتہ بدعنوانیوں پر مطلق توجہ نہ کی جائے گی اور اس معاملے میں مذہب وعقائد کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے گا یعنی دربار سلطان سے عیسائی، یہودی، مسلمان سب کے ساتھ یکساں عدل و انصاف کا برتاؤ ہوگا۔ چونکہ لوگ طوائف الملوکی اور خانہ جنگی سے تنگ آچکے تھے لہٰذا وہ تمام چھوٹے چھوٹے سردار جو قرطبہ سے قریب تھے اور اپنے آپ کو سلطان قرطبہ کی فرماں برداری و اطاعت سے آزاد کر چکے تھے۔ اس اعلان کو سن کر بلا تامل سلطان عبدالرحمٰن ثالث کی خدمت میں فرماں برداری کا اقرار کرنے لگے۔ اس طرح لگان سرکاری شاہی خزانہ میں داخل ہونا شروع ہوا اور اس کی کمی جو ناواجب محصولات کے معاف کرنے سے خزانہ میں ہوئی تھی، بخوبی تلافی ہو گئی۔

دو حریف طاقتیں:

اب صرف دو زبردست اور رقیب طاقتیں باقی رہ گئیں جو نسبتاً قرطبہ سے قریب اور موجب خطر تھیں۔ ایک عمر بن حفصون جو مالقہ، ریہ، بشتر وغیرہ پر قابض ومتصرف تھا اور عبیدیین سے ساز باز کر کے قرطبہ کی سلطنت کو درہم برہم کرنا چاہتا تھا۔ عمر بن حفصون اس لیے بھی زیادہ خطرناک تھا کہ اس کو ایک طرف عبیدیین اور دوسری طرف شمالی عیسائی بادشاہوں سے مدد پہنچ سکتی تھی۔ عبیدیین قدرتی طور پر بنوامیہ کے دشمن تھے جس طرح کہ وہ بنوعباس کے بھی دشمن تھے اور عیسائی اس لیے اس کو محبوب سمجھتے تھے کہ وہ مرتد ہو کر پھر عیسائی بن گیا۔ دوسری طاقت ریاست اشبیلیہ کی تھی، جہاں عربوں کی حکومت تھی اور شان وشکوہ میں اشبیلیہ کا دربار قرطبہ کے دربار سے فائق نظر آتا تھا۔ عبدالرحمٰن نے سب سے پہلے اشبیلیہ کے دربار سے فرماں برداری و اطاعت کا اقرار

لینا اور شرائط اطاعت کا ادا کرانا چاہا۔ اشبیلیہ کا حاکم ابراہیم بن حجاج فوت ہو گیا تھا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا تخت نشین ہو چکا تھا۔ اشبیلیہ کے بہت سے سرداروں نے سلطان عبدالرحمٰن ثالث کے ساتھ اظہار عقیدت کیا اور دربار اشبیلیہ نے بھی اس موقع پر مصلحت سے کام لینا مناسب سمجھا۔

پہلی مہم:

اشبیلیہ کی جانب سے جب سلطان عبدالرحمٰن ثالث کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ ادھر سے کوئی مخالفانہ فوجی کارروائی نہیں ہو گی تو اس نے ایک فوج مرتب کر کے اپنے آزاد کردہ غلام بدر نامی کو دے کر عمر بن حفصون کی جانب روانہ کیا۔ یہ مہم عبدالرحمٰن ثالث نے اپنے جلوس کے پہلے ہی سال یعنی سنہ ۳۰۰ھ میں روانہ کی۔ بدر نے عمر بن حفصون کے قلعوں کو یکے بعد دیگرے فتح کرنا شروع کیا۔ عمر بن حفصون اپنا بہت سا میدانی علاقہ فتح کرا کر پہاڑی قلعوں میں جا چھپا۔ بدر اس طرف سے صحیح سلامت اور مال غنیمت سے مالا مال واپس آیا اور لوگ بخوشی آ آ کر سلطانی فوج میں داخل ہونے لگے۔

بغاوتوں کا استیصال:

سنہ ۳۰۱ھ میں سلطان عبدالرحمٰن ثالث نے ابن مسلمہ کی طرف سے ناشدنی حرکات دیکھ کر اور بعض امیران اشبیلیہ کی شکایات سن کر اشبیلیہ پر فوج کشی کی۔ ابن مسلمہ نے عمر بن حفصون سے مدد طلب کی۔ عمر بن حفصون نے اس موقع کو مناسب سمجھ کر ابن مسلمہ کی مدد اس طرح کی کہ جب سلطانی فوج اشبیلیہ کی طرف گئی تو ابن حفصون کی فوج پیچھے سے سلطانی فوج کی طرف بڑھی۔ سلطان عبدالرحمٰن نے عمر بن حفصون کی فوج کو شکست دے کر بھگایا اور ابن مسلمہ کو بھی شکست فاش ہوئی۔ ابن مسلمہ گرفتار ہوا اور سلطان نے اپنا ایک گورنر اشبیلیہ میں مقرر کر دیا۔ اس کام میں سلطان کو زیادہ دقت نہیں اٹھانی پڑی کیونکہ ابن مسلمہ کے رشتے دار اور اراکین دربار اشبیلیہ خود اس بات کے خواہاں تھے کہ اشبیلیہ عبدالرحمٰن ثالث کے حدود سلطنت میں براہ راست شامل ہو جائے۔ دربار اشبیلیہ کے مشہور سرداروں میں ایک شخص اسحاق بن محمد تھا جو اشبیلیہ کے فتح ہونے کے بعد قرطبہ میں چلا آیا۔ اس کو سلطان عبدالرحمٰن ثالث نے جوہر قابل پا کر اپنا وزیر بنا لیا۔ جب وہ فوت ہوا تو اس کے بیٹے احمد بن اسحاق کو وزارت کا عہدہ عطا کیا۔

اس طرح جب سلطنت کے وقار و عظمت میں ترقی ہو گئی تو سلطان عبدالرحمٰن نے فوجیں آراستہ کر کے عمر بن حفصون کے استیصال کو ضروری سمجھا اور سنہ ۳۰۴ھ میں اس طرف فوج کشی کی۔ عمر بن حفصون نے اس موقع پر عبیدین کی سلطنت سے امداد طلب کی۔ وہاں سے جو جہاز آئے ان کو سلطان عبدالرحمٰن نے اپنے جہازوں کے ذریعے ابن حفصون تک نہ پہنچنے دیا اور سمندر ہی میں سب کو گرفتار کر لیا۔ ابن حفصون پر مایوسی چھا

گئی اور پہاڑوں میں محصور ہو کر وہ جب سخت مجبور ہو گیا تو اس نے یحیٰی بن اسحاق کے ذریعے اپنی درخواست سلطان کی خدمت میں پہنچوائی اور آئندہ مطیع و فرماں بردار رہنے کا اقرار کر کے صلح چاہی۔ سلطان نے اس کے تمام سیر حاصل اور زرخیز علاقے پر قبضہ کر کے بہت تھوڑا سا پہاڑی علاقہ اس کے پاس چھوڑ دیا اور اس طرف سے مطمئن ہو کر قرطبہ کو واپس آیا۔

اس کے بعد ایک فوج اپنے وزیر اسحاق بن محمد کو دے کر مرسیہ و بلنسیہ کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ اسحاق بن محمد نے اس طرف کے باغیوں کو مطیع کر کے قرمونہ پر چڑھائی کی اور اس کو حبیب بن سوارہ کے قبضے سے نکال کر سلطانی مملکت میں شامل کیا۔ اسی سال سلطان کے آزاد کردہ غلام بدر نے لبلہ پر چڑھائی کر کے وہاں کے باغی سردار عثمان بن نصر کو گرفتار کر کے قرطبہ کی جانب بھیج دیا۔ سنہ ۳۰۶ھ میں اسحاق بن محمد نے قلعہ سمرنا کو فتح کر کے وہاں کے باغیوں کو مطیع و فرماں بردار بنایا۔

سلطان کے خلاف ایک سازش:

سنہ ۳۰۸ھ میں محمد بن عبدالجبار بن سلطان محمد اور قاضی بن سلطان محمد نے سلطان عبدالرحمٰن ثالث کے خلاف ایک سازش کی اور تخت سلطنت حاصل کرنے کے لیے سلطان کے قتل کی تدبیروں میں مصروف ہوئے۔ اتفاقاً اس سازش کے شرکاء میں سے ایک شخص نے سلطان کو تمام حالات کی خبر کر دی۔ سلطان نے عجلت اور شتاب زدگی سے کام نہیں لیا بلکہ اول خوب اچھی طرح سے تحقیق و تفتیش کے سلسلے کو جاری رکھا اور جب ان دونوں پر جرم ثابت ہو گیا تو دونوں کو قتل کرا دیا۔ چونکہ یہ دونوں مجرم ثابت ہو چکے تھے لہٰذا لوگوں نے اس سزا پر کسی بے چینی یا ناراضگی کا مطلق اظہار نہیں کیا۔

۳۰۹ھ میں قلعہ طرسوس فتح ہوا۔ اسی سال احمد بن اضحیٰ ہمدانی نے جو قلعہ جامہ پر قابض اور اطاعت سے منحرف تھا، خود ہی اطاعت قبول کر کے اپنے بیٹے کو بطور یرغمال قرطبہ میں بھیج دیا۔ غرض چھوٹے چھوٹے سردار جو جابجا خود مختار ہو گئے تھے، یکے بعد دیگرے ایک ایک کر کے سب مطیع و فرماں بردار بنائے گئے یا مقتول ہوئے اور سلطنت قرطبہ کا رقبہ وسیع ہو گیا اور نتیجتاً وہ حالت جو سلطان عبداللہ کے زمانے میں پیدا ہو گئی تھی، دور ہو گئی یا یوں سمجھنا چاہیے کہ جو ملک بیسیوں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا، وہ سب ایک اسلامی سلطنت کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔

عیسائی مقبوضات کی تفصیل:

اب عیسائی مقبوضات کا حال سنو۔ سب سے قریب مشرقی ساحل کے متصل ایک پہاڑی علاقہ ابن حفصون کے قبضے میں تھا جو عیسائی ہو گیا تھا اور اس کے رفیق سب عیسائی لوگ ہی باقی رہ گئے تھے۔ لہٰذا ایک

عیسائی ریاست تھی جو ابن حفصون کی تجربہ کاری کے سبب ایک زبردست عیسائی طاقت سمجھی جاتی تھی مگر اس سے صلح ہو گئی تھی۔ طلیطلہ ایک نہایت مضبوط مقام تھا جس کا فتح کرنا آسان کام نہ تھا۔ یہاں سلطان عبداللہ کے زمانے میں خود مختار ریاست قائم ہو گئی تھی اور اب اس کا دربار قرطبہ سے کوئی رسمی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ یہ ریاست ملک اندلس کے وسط میں واقع تھی اور ایک زبردست عیسائی طاقت تھی۔ برشلونہ، میں عرصہ دراز سے عیسائی حکومت قائم تھی۔ اربونیہ میں بھی ایک مستقل عیسائی سلطنت قائم ہو چکی تھی۔ نوار، اربونیہ کے متصل ہی ایک زبردست ریاست فرانسیسیوں نے قائم کر لی تھی۔ ایسٹریاس کی ریاست اب تک زبردست سلطنت کی شکل میں تبدیل ہو کر اندلس کے میدانوں میں دور دور تک پھیل گئی تھی، جس کے ماتحت جلیقیہ، لیون اور قسطلہ کی تین زبردست عیسائی ریاستیں تھیں۔

ان کے علاوہ ساحل بحر ظلمات پر پرتگال کے علاقے میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں عیسائیوں نے قائم کر لی تھیں جو ریاست جلیقیہ کے ماتحت سمجھی جاتی تھیں۔ یہ وہ عیسائی مقبوضات تھے جو جزیرہ نمائے اندلس کی حدود میں تھے۔ باقی جنوبی و مشرقی فرانس اور مغربی فرانس اور شمالی فرانس کی عیسائی سلطنتیں ان کے علاوہ تھیں جو سلطنت اسلامیہ اندلس کی مخالفت پر کمر بستہ تھیں۔ سلطنت اسلامیہ کی حدود کا ایک کونہ جو شمال کی جانب نکلا ہوا تھا وہ صرف سرقسطہ کا ضلع تھا جہاں مسلمان عامل حکمران تھا مگر اس کے تعلقات عیسائیوں سے دوستانہ تھے اور اس لیے قابل اعتراض نہ تھے کہ سلطان عبداللہ اور الفانسو سوم بادشاہ ایسٹریاس سے دوستانہ صلح نامہ ہو گیا تھا۔ جو اب تک قائم تھا اور فی الحال کسی فریق نے اس کی خلاف ورزی میں اقدام نہیں کیا تھا۔

اسٹینلے لین پول نے لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن نے باغی علاقوں پر فوج کشیاں شروع کیں تو باغیوں کو اطاعت قبول کرنے پر آدھے سے زیادہ رضامند پایا۔ اس کے سپاہی اپنے بہادر نوجوان بادشاہ کو اپنے سروں پر دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے۔ غرض کہ دکھلاوے کی مزاحمت کے بعد عبدالرحمٰن ثالث کے لیے لوگوں نے اپنے شہروں کے دروازے کھول دیے اور یکے بعد دیگرے اندلس کے بڑے بڑے شہروں نے سلطان کو اپنی دیواروں کے اندر بلا لیا۔ اشبیلیہ کی طرف عبدالرحمٰن متوجہ ہوا تو وہاں کے لوگ خود ہی قدموں میں آ گرے۔ پچھّم کے بربری سردار بھی سرنگوں ہو گئے۔ الغرب کا رئیس خود خراج دینے کو دوڑا آیا۔ اس کے بعد ضلع ریکیور کے عیسائیوں کے مقابلے کے لیے آگے بڑھا اور حسن تدبیر سے ان کو رام کر لیا۔ اسی طرح مسلسل اس کے قدم آگے بڑھتے رہے۔ بوباسترو تک اسلامی فوج پہنچ گئی۔ سلطان نے قلعے کی دیوار پر چڑھ کر اپنی فتوحات کا جائزہ لیا اور عظیم الشان فتح پر اللہ تعالیٰ کے حضور میں دو رکعت نماز شکر ادا کی۔ جب تک سلطان اس قلعے میں رہا خلوص سے اللہ تعالیٰ کے لیے روزے رکھتا رہا۔ حاکم شبہ نے بھی اس وقت آ کر سلطان کی اطاعت کی۔ پھر طلیطلہ پر قبضہ جمایا۔ غرض کہ سنہ ۹۲۰ء مطابق ۳۱۸ھ اپنی پوری سلطنت کو سلطان عبدالرحمٰن کی حکومت پہنچ گئی۔ سلطنت کے جتنے حصے باپ دادا نے کھوئے تھے سلطان نے ان کو پھر سے حاصل کرنے میں اٹھارہ سال صرف کیے، لیکن یہ کام پورا ہو

گیا اور شاہی اقتدار نہایت مضبوطی کے ساتھ عربوں، بربریوں، اندلسیوں اور عیسائیوں پر یکساں قائم ہو گیا۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن نے کسی بھی فریق کو خاص فوقیت حاصل نہ کرنے دی۔ (مورزان اسپین: ص ۸۵)

سلطان عبدالرحمٰن ثالث نے چند ہی سال میں تمام باغیوں سے فراغت حاصل کر کے طلیطلہ پر فوج کشی کی۔ فوج کشی سے پہلے سلطان نے اہل طلیطلہ کے پاس پیغام بھیجا کہ تمھارے لیے اب مناسب یہی ہے کہ اطاعت و فرماں برداری سے انحراف نہ کرو اور ہوا خواہانِ سلطنت کے زمرہ میں شامل ہو جاؤ۔ اہل طلیطلہ نے سلطان کے اس پیغام کا سختی کے ساتھ انکار میں جواب دیا اور جس قدر وہ مقابلے کے لیے تیاری کر سکتے تھے، کی اور اردگرد سے عیسائی فوجوں کو بلایا۔ برشلونہ، نوار اور ایسٹریاس سے امداد طلب کی۔ پادری لوگوں نے ہر جگہ عیسائیوں کو طلیطلہ کے بچانے کے لیے جوش دلایا۔ آخر سلطان عبدالرحمٰن ثالث بڑی احتیاط اور مآل اندیشی کے ساتھ طلیطلہ کی جانب بڑھا۔ جنگ و پیکار اور معرکہ آرئیوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ قریباً سال بھر کی کوشش و کشمکش کے بعد سلطان نے طلیطلہ کو فتح کر لیا۔ مفتوحین کے ساتھ نرمی و ملاطفت اور عفوو درگزر کا برتاؤ کیا اور چند مہینے طلیطلہ اور نواح طلیطلہ میں رہ کر اور وہاں کے تمام ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر قرطبہ کی جانب واپس آیا۔

فتح طلیطلہ کا اثر عیسائی سلاطین پر یہ ہوا کہ انھوں نے اسلامی مقبوضات پر حملہ کر کے کئی شہروں کو تباہ و برباد کر دیا۔ سلطان نے احمد بن اسحاق وزیر السلطنت کو فوج دے کر اس طرف روانہ کیا۔ اس نے ریاست لیون پر حملہ کیا اور عیسائیوں کو متعدد شکستیں دے کر پیچھے ہٹایا۔ آخر ایک لڑائی میں وزیر السلطنت احمد بن اسحاق شہید ہوا۔ سلطان نے اپنے خادم بدر کو بھیجا۔ بدر کے مقابلے پر ریاست نوار اور ریاست لیون وغیرہ کی متفقہ فوجیں آئیں اور معرکۂ کارزار گرم ہوا۔ بدر نے شکست دے کر سب کو بھگا دیا۔ اس کے بعد ہی سلطان عبدالرحمٰن ثالث خود فوج لے کر عیسائیوں کی بدعہدی اور سرکشی کی سزا دینے پہنچا اور فتح کرتا ہوا حدود فرانس میں داخل ہوا۔ نوار اور اربونیہ کی ریاستوں نے اظہار اطاعت کر کے سلطان کو واپس کیا اور سلطان کے واپس ہوتے ہی تمام شمالی عیسائیوں نے آپس میں مسلم کشی کے لیے اتحاد و اتفاق کے معاہدوں کی تجدید کی۔ یہ سنہ ۳۱۳ھ کے واقعات ہیں۔ ابھی سلطان عبدالرحمٰن بلاد شمالی ہی میں مصروف قتال تھا کہ اس کے پاس عمر بن حفصون کے مرنے کی خبر پہنچی۔ عمر بن حفصون اپنی تجربہ کاری و ہوشیاری کے اعتبار سے بہت بڑا آدمی بن گیا تھا۔ اس کی طرف سے ہمیشہ خطرہ رہتا تھا۔ سلطان نے واپس قرطبہ میں پہنچ کر اس کی ریاست کو ضبط کرنا اور براہ راست مقبوضات سلطانی میں شامل کرنا مناسب نہ سمجھ کر عمر بن حفصون کے بیٹے جعفر کو والی ریاست بنا دیا۔ آخر سنہ ۳۱۵ھ میں یہ ریاست معدوم ہو گئی اور نتیجتاً یہ تمام علاقہ مقبوضات سلطانی میں شامل ہوا۔

اِدھر سلطان عبدالرحمٰن ثالث اپنے آبائی ملک کو باغیوں کے قبضے سے واپس لینے میں کامیاب ہوا۔ اُدھر شمال اور جنوب دونوں جانب اس کے لیے قدرتی طور پر بہتری کے سامان پیدا ہوئے۔ عبدالرحمٰن ثالث کو شمال کی جانب کے عیسائیوں کے حملے کا اندیشہ تھا کیونکہ وہ بحر روم سے بحر ظلمات تک جزیرہ نما کے تمام شمالی حصے

پر قابض و متصرف تھے اور اب بجائے عباسیوں کے عبیدیین کی طرف سے ان کی ہمت افزائی ہو رہی تھی۔ ان کے دلوں پر مسلمانوں کی وہ ہیبت اب طاری نہ رہی تھی، جو طارق و موسیٰ کی آمد کے وقت طاری ہوئی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اب پہلے کی طرح بہادر و باہمت نہ رہے تھے اور عیسائیوں نے بہت کچھ بہادری و جفاکشی میں ترقی کر لی تھی۔ لہٰذا شمالی خطرہ موجود نہیں رہا تھا۔ جنوب کی جانب عبیدیین کی طاقت بہت زبردست ہوگئی تھی اور وہ براعظم افریقہ کے تمام شمالی حصے پر مستولی ہو کر مراکش کی حکومت ادریسیہ کا نام و نشان گم کرنے اور اندلس کی فتح کا عزم رکھتے تھے۔ سلطان عبدالرحمٰن ثالث کو بیک وقت دونوں جانب سے اطمینان حاصل ہو گیا۔ تفصیل اس اجمال کی حسب ذیل سطور میں ملاحظہ فرمائیں:

الفانسو سوم کی سلطنت کی تقسیم:

الفانسو سوم بادشاہ ایسٹریاس نے اپنی سلطنت کو اپنی اولاد میں اس طرح تقسیم کیا تھا کہ لیون کا علاقہ غرسیہ کو دیا۔ جلیقیہ کی حکومت اردونی کے حصے میں آئی اور اویڈو کا علاقہ فردیلہ کو ملا۔ غرسیہ کی شادی شاہ نوار کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ اس لیے ریاست نوار کو لیون کی ریاست سے خصوصی تعلق تھا۔ چنانچہ لیون اور نوار کی ریاستوں نے مل کر کئی مرتبہ مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ تین سال حکومت کرنے کے بعد غرسیہ سنہ ۳۱۶ھ میں فوت ہوا۔ اس کے بعد شانجہ ریاست لیون کا فرماں روا ہوا۔ مگر اردونی حاکم جلیقیہ نے اپنے بھتیجے شانجہ کو بے دخل کر کے خود ریاست لیون کو بھی اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ ادھر بادشاہ نوار کا بھی انتقال ہوا تو شانجہ بھاگ کر اپنے ننھیال میں چلا گیا۔ وہاں اس کی نانی طوطہ نامی حکمران نوار تھی۔ ادھر قسطلہ کی ریاست نے بادشاہ جلیقیہ و لیون کی فرماں برداری سے آزاد و خود مختار ہونے کی کوشش شروع کی اور فردی نند حاکم قسطلہ اپنی خود مختاری کی تدابیر میں مصروف ہوا۔ غرض ان عیسائی فرمانرواؤں کے اندر کچھ ایسے خرخشے اور اندرونی جھگڑے پیدا ہوئے کہ وہ کئی سال تک اسلامی علاقے کی طرف متوجہ نہیں ہو سکے۔ سلطان عبدالرحمٰن ثالث نے عیسائیوں کے ان خانگی نزاعات کی خبریں سن کر عقلمندی اور ہوشیاری کی راہ سے اس طرف مطلق کوئی فوج نہیں بھیجی اور موقع دیا کہ وہ آپس ہی میں لڑ بھڑ کر اپنے معاملات کو طے کریں۔ اگر ان ایام میں سلطان عبدالرحمٰن شمال کی جانب فوج کشی کرتا تو یقیناً عیسائیوں کے اندر فوراً اتفاق و اتحاد ہو جاتا اور ان کی آپس کی لڑائیاں یک لخت بند ہو جاتیں۔

مراکش پر قبضہ:

اسی فرصت میں جنوب کی جانب سے یہ خوشخبری پہنچی کہ عبیدیین جو مراکش کے خاندان ادریسیہ کو مٹا کر تمام ملک مراکش پر قابض و متصرف ہونا چاہتے ہیں، ان کے مقابلے سے تنگ آ کر ابراہیم بن محمد ادریسی بجائے اس کے کہ عبیدیین کی فرماں برداری و اطاعت قبول کرے، سلطان عبدالرحمٰن ثالث کی اطاعت اختیار

کرنا چاہتا ہے۔ اب تک دربار قرطبہ اور حکومت مراکش کے تعلقات دوستانہ و ہمسرانہ تھے۔ سلطان عبدالرحمٰن نے اس کو ایک تائید غیبی سمجھ کر فوراً اپنی فوج جہازوں میں سوار کرا کر ساحل مراکش میں اتار دی۔ مراکش ان دنوں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ مراکش کے ہر ایک رئیس نے سلطان عبدالرحمٰن کی سیادت کو قبول و تسلیم کر کے اپنے ایلچی مع تحف و ہدایا قرطبہ میں بھیجے اور بعض رؤساء خود ہی حاضر قرطبہ ہو گئے۔ سلطان عبدالرحمٰن کی فوجوں نے عبیدیین کی فوجوں کو مار بھگایا اور اپنی طرف سے سند امارت دے کر وہاں کے رئیسوں کو مامور کیا۔ اس طرح ملک مراکش بھی دربار قرطبہ کا ایک صوبہ بن گیا۔ جس زمانے میں سلطان عبدالرحمٰن مراکش کی جانب متوجہ تھا، اس زمانے میں شمالی عیسائیوں کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے خانگی جھگڑوں میں مبتلا تھے۔ عبیدیین کا خطرہ بالکل جاتا رہا کیونکہ ملک مراکش اب سلطان عبدالرحمٰن کے قبضے میں آ گیا اور اندلس کا ملک بہت محفوظ ہو گیا۔

گورنر سرقسطہ کی بغاوت:

سنہ ۳۲۲ھ عیسائی سلاطین کے اندرونی جھگڑے ختم ہوئے اور اسی زمانے میں سلطان عبدالرحمٰن مراکش کو اپنی حدود سلطنت میں شامل کرنے سے فارغ ہو چکا تھا۔ اب عیسائیوں نے محمد بن ہشام، گورنر سرقسطہ کو بغاوت پر آمادہ کر کے اس کی حمایت کا پختہ وعدہ کیا اور برشلونہ سے لے کر جلیقیہ تک کا تمام علاقہ سلطان عبدالرحمٰن کے مقابلے پر آمادہ و مستعد ہو گیا۔ سرقسطہ کے مسلمان عامل کی بغاوت کو کامیاب بنانے اور اس کی حمایت پر سب کے آمادہ ہو جانے کا سبب یہ تھا کہ مراکش کے شامل اندلس ہو جانے کی خبر نے عیسائیوں کو یکا یک بیدار کر دیا اور انھوں نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے عبدالرحمٰن کی طاقت کو توڑ دینا چاہیے اور اب تامل کرنا اپنے لیے خطرات کو بڑھانا ہے۔ اسی لیے صوبہ سرقسطہ کے عامل کو جو نسبتاً قرطبہ سے دور اور عیسائی مقبوضات کے جوار میں تھا، باغی بنانے اور بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تاکہ عبدالرحمٰن کی طاقت مقابلے میں کمزور ثابت ہو۔

عبدالرحمٰن عامل سرقسطہ کی بغاوت کا حال سن کر اس کی سزا دہی کے لیے شمال کی جانب متوجہ ہوا تو عیسائی افواج کو مستعد پیکار پایا۔ مقام وشمہ پر سخت خون ریز و فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ محمد بن ہشام گرفتار ہوا اور عیسائی افواج اپنے اپنے علاقوں کی جانب فرار ہوئیں۔ اس کے بعد سلطان عبدالرحمٰن نے ہر ایک عیسائی ریاست پر الگ الگ حملہ کر کے ہر ایک کو شکست دے کر مغلوب و مجبور کیا۔ سب نے اطاعت و فرماں برداری کا اقرار کیا۔ ملکہ طوطہ فرماں روائے نوار نے سخت مقابلہ کے بعد شکست یاب ہو کر اظہار اطاعت کیا اور اپنے نواسے مانچہ کو تخت نوار پر بٹھا کر خود اس کی سرپرستی و نگرانی اپنے ہاتھ میں رکھی۔ عیسائیوں کی تنبیہ اور محمد بن ہاشم کی سرکوبی سے فارغ ہو کر اور سرقسطہ میں امیہ بن اسحاق کو گورنر مقرر کر کے سلطان قرطبہ میں واپس آیا۔

جنگ خندق:

سنہ ۳۲۷ھ کے ابتدائی مہینوں میں امیہ بن اسحاق کے کسی بھائی سے غداری و سازش کا جرم سرزد ہوا، جس کی سزا میں اس کو سلطان نے قتل کرا دیا۔ امیہ بن اسحاق گورنر سرقسطہ نے جب اپنے بھائی کے قتل کیے جانے کا حال سنا تو اسے سخت صدمہ ہوا۔ عیسائی سلاطین نے اس موقع کو غنیمت جان کر امیہ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور اس کو بڑی آسانی سے بغاوت پر آمادہ کر لیا۔ جلیقیہ کا عیسائی بادشاہ ان دنوں رذمیر نامی بڑا ہوشیار اور تجربہ کار شخص تھا۔ امیہ باغی ہو کر اور سرقسطہ کی فوج اور خزانہ جس قدر ہمراہ لے جا سکتا تھا، ہمراہ لے کر رذمیر کے پاس مقام سمورہ دارالسلطنت جلیقیہ میں چلا گیا اور اسی جگہ نوار و لیون اور قسطلہ وغیرہ کی فوجیں بھی آ کر فراہم ہونے لگیں۔ برشلونہ و طرکونہ تک کی فوجیں بھی یہاں پہنچ گئیں۔ فرانس سے بھی عیسائی مجاہدین اس طرف آ آ کر فراہم ہونے لگے۔ اندلس میں عیسائی طاقت کا یہ سب سے بڑا مظاہرہ تھا جس میں ایک مسلمان گورنر بھی مع اپنی زبردست طاقت کے شامل اور انتہائی جوش کے ساتھ سلطان عبدالرحمٰن کو شکست دینے اور نقصان پہنچانے پر آمادہ تھا۔ اس مسلمان گورنر نے عیسائیوں کو بڑی بڑی قیمتی معلومات بہم پہنچائیں اور نہایت مفید و معقول مشورے دیے۔ امیہ بن اسحاق کی موجودگی عیسائیوں کے لیے بے حد ہمت افزائی اور جرأت کا موجب تھی۔ ادھر سلطان عبدالرحمٰن نے جب اس فساد عظیم کا حال سنا تو اس نے فوراً اعلان جہاد کیا۔ باقاعدہ فوج کے علاوہ بہت سے رضا کار اور لوگ بھی شوق شہادت میں آ آ کر شریک لشکر ہو گئے۔

اس لشکر کی تعداد پچاس ہزار سے زیادہ تھی جس کو ہمراہ لے کر سلطان عبدالرحمٰن نے قرطبہ سے شمال کی جانب کوچ کیا مگر ان پچاس ہزار میں زیادہ آدمیوں میں بڑا حصہ ان لوگوں کا تھا جو تجربہ کار و تیغ آزمودہ نہ تھے۔ جوں جوں سلطان کی فوج شمال کی جانب بڑھتی گئی، عیسائی فوجیں سمٹ سمٹ کر سمورہ میں جمع ہوتی گئیں۔ عیسائیوں کو اپنی تعداد اور قوت کی زیادتی کے علاوہ ایک مضبوطی یہ حاصل تھی کہ سمورہ کے گرد سات مضبوط دیواریں شہر پناہ کی تھیں اور ہر دیوار کے بعد ایک نہایت عمیق، خندق کھدی ہوئی تھی۔ ان کا سپہ سالار رذمیر تھا اور امیہ بن اسحاق اس کا مشیر و معاون تھا۔ اسلامی فوج نے جا کر معرکۂ کارزار گرم کیا۔ عیسائی لشکر نے میدان میں نکل کر مقابلہ کیا۔ ہر ایک میدانی جنگ میں مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوئی اور عیسائیوں کو پسپا ہونا پڑا۔ کئی روز کی معرکہ آرائی کے بعد عیسائی لشکر سمورہ کی شہر پناہ میں محصور ہو گیا۔ ۳۰ رشوال سنہ ۳۲۷ھ کو مسلمان سخت حملہ کر کے دو دیواروں کے اندر گھس گئے۔ تیسری دیوار کو بھی انھوں نے فتح کر لیا لیکن اس دیوار کے اندر پہنچتے ہی عیسائیوں کے لشکر نے جو کمین گاہوں میں پوشیدہ تھا، نکل کر ہر طرف سے حملہ شروع کر دیا اور مسلمانوں کی بڑی تعداد بوجہ اس کے کہ نہ آگے بڑھ سکتی تھی، نہ پیچھے ہٹ سکتی تھی، خندق میں گر گر کر ڈوب گئی۔ غرض مسلمان ایسے تنگ مقام میں اور ایسی بری طرح پھنسے کی صرف ۴۸ آدمی زندہ بچ کر باہر نکل سکے اور اپنے بادشاہ عبدالرحمٰن

ثالث کو جو پچاسواں شخص تھا، بمشکل اس مقام سے بچا کر نکال لائے۔ باقی سب کے سب سمورہ کی خندق میں شہید ہو گئے۔ ان پچاس آدمیوں کے تعاقب میں رذمیر نے ایک رسالہ بھیجنا چاہا تو امیہ بن اسحاق نے اس کو یہ کہہ کر روک دیا کہ بہت زیادہ ممکن ہے کہ اسلامی لشکر کی کوئی بڑی تعداد باہر جھاڑیوں میں چھپی ہوئی موجود ہو اور وہ ہر طرف سے گھیر کر آپ کے لشکر کو تباہ کر دے۔ غرض عبدالرحمٰن ثالث کو بڑی ناکامی ہوئی اور جب سے مسلمانوں نے اندلس کی سرزمین پر قدم رکھا تھا، آج تک کسی معرکے میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد شہید نہیں ہوئی تھی۔ یہ لڑائی یوم الخندق یا جنگ خندق کے نام سے مشہور ہوئی۔

اس لڑائی کے بعد امیہ بن اسحاق کو پچاس ہزار مسلمانوں کی لاشیں دیکھ کر اپنی بداعمالی پر غور کرنے کا موقع ملا اور اس کے ضمیر نے اس کو ملامت کی کہ تو نے مسلمانوں کا اس قدر کشت و خون کرا کر بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ چنانچہ اس نے سلطان کے پاس ایک درخواست بھیج کر اپنی خطا کی معافی چاہی اور عیسائیوں کا ساتھ چھوڑ کر چلا آیا۔ سلطان عبدالرحمٰن نے قرطبہ میں واپس آ کر زبردست فوجیں عیسائی ممالک کی طرف بھیجیں۔ ان اسلامی فوجوں نے مختلف علاقوں میں پہنچ کر ہر جگہ عیسائیوں کو شکست فاش دی اور ان کو جنگ خندق کی فتح عظیم سے فائدہ اٹھانے کا مطلق موقع نہ دیا یہاں تک کہ حدود فرانس تک فاتحانہ پہنچ کر اور بہت کچھ مال غنیمت لے کر واپس آئیں۔

بحری و بری قوت میں اضافہ:

سنہ ۳۲۸ھ سے بحیثیت مجموعی خلیفہ ناصرلدین اللہ یعنی عبدالرحمٰن ثالث کے لیے اطمینان و فراغت کا زمانہ شروع ہوا۔ کوئی پریشان کرنے والی بات بظاہر باقی نہ تھی۔ اس فرصت میں خلیفہ ناصر نے بحری قوت کے بڑھانے اور ساتھ ہی بری فوجوں کے باترتیب بنانے کی طرف توجہ کی۔ بہت سے جنگی جہاز بنوائے گئے اور اندلس کا بیڑا اس زمانے کے تمام جنگی بیڑوں سے طاقتور ہو گیا۔ بحر روم پر خلیفہ ناصر کی سیادت مسلم ہو گئی۔ خلیفہ نے قدیمی شاہی محل کے متصل ایک عظیم الشان قصر دارالروضہ کے نام سے تعمیر کرایا۔ مسجد قرطبہ کی زیب و زینت اور وسعت میں اضافہ کیا گیا۔ علمی مجالس اور مذاکرات علمیہ کا سلسلہ جاری ہوا۔ تجارتوں میں سہولتیں پیدا ہوئیں اور اندلس کے تاجر دور دراز مقامات تک سامان تجارت لے کر پہنچنے لگے۔

خلیفہ عبدالرحمٰن کی عالمگیر عظمت:

خلیفہ عبدالرحمٰن ناصر کی خدمت و شہرت نے بہت جلد دنیا کا محاصرہ کر لیا۔ سنہ ۳۳۶ھ میں قسطنطین بن لیون شہنشاہ قسطنطنیہ نے اپنے سفیر نہایت شاندار اور قیمتی تحائف کے ساتھ خلیفہ ناصر کی خدمت میں قرطبہ کی طرف روانہ کیے۔ قسطنطین نے یہ شاندار تحائف بھیج کر ایک طرف اپنی شان و عظمت اور مال و دولت کی نمائش

کرنی چاہی تھی جبکہ دوسری طرف وہ خلیفہ ناصر کی دوستی سے فائدہ اٹھانے کا خواہاں تھا۔ خلیفہ ناصر نے اس سفارت کے قریب پہنچنے کا حال سن کر شہر قرطبہ کی آراستگی کا حکم دیا۔ فوجیں زرق برق وردیوں میں دورویہ ایستادہ ہوئیں۔ دروازوں اور دیواروں پر زردوزی کے پردے، ریشمیں نمگیرے، خوبصورت قناتیں اور انواع واقسام کی زینت اور صنعت کاری دیکھ کر قسطنطنیہ کے ایلچی حیران وششدرر رہ گئے اور اپنے لائے ہوئے ہدیوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ سنگ مرمر کے خوبصورت ستونوں اور پچی کاری کے سنگین ورنگین فرشوں پر سے گزرتے ہوئے یہ ایلچی دربار کے ایوان عالی شان میں پہنچے، جہاں خلیفہ ناصر تخت خلافت پر جلوہ افگن اور امراء، وزراء، علماء، شعرا اور سرداران فوج اپنے اپنے منصب اور مرتبے پر ایستادہ تھے۔ ان سفیروں پر یہ پُر ہیبت وعظیم الشان نظارہ دیکھ کر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ بہر حال وہ سنبھلے اور نہایت ادب وتپاک سے کورنش بجا لائے اور تخت کے قریب جا کر اپنے بادشاہ کا خط پیش کیا۔ ایک آسمانی رنگ کا غلاف تھا جس پر سونے کے حروف سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس غلاف کے اندر ایک صندوقچہ تھا جو نہایت خوبصورت اور مرصع کار تھا۔ اس صندوقچے پر سونے کی ایک مہر لگی ہوئی تھی جس کا وزن چار مثقال تھا۔ اس مہر کے ایک طرف مسیح علیہ السلام کی اور دوسری طرف شاہ قسطنطین کی تصویر کندہ تھی۔ اس صندوقچے کے اندر بلور کا ایک اور صندوقچہ تھا جس پر طلائی ونقری مینا کار بیل بوٹے منقوش تھے۔ اس کے اندر ایک نہایت خوبصورت ریشمی لفافہ تھا۔ جس کے اندر نہایت خوبصورت آسمانی رنگ کی جھلی پر طلائی حروف میں لکھا ہوا خط رکھا تھا۔ عنوان خط میں خلیفہ عبدالرحمٰن ناصر لدین اللہ کو نہایت شاندار القاب کے ساتھ مخاطب کیا گیا تھا۔ خلیفہ نے خط پڑھوا کر سنا۔ اس کے بعد محمد بن عبدالبر کی طرف اشارہ کیا کہ وہ حسب حال تقریر کریں۔ ان فقیہ صاحب کو برجستہ تقریر کرنے میں خاص ملکہ حاصل تھا مگر اس وقت اس دربار کی عظمت اور مجلس کے رعب کا یہ عالم تھا کہ فقیہ مذکور کھڑے ہوئے اور چند الفاظ ادا کرنے کے بعد بیہوش ہو کر گر پڑے۔ ان کے بعد ابوعلی اسماعیل بن قاسم کھڑے ہوئے اور حمد ونعت کے بعد کوئی لفظ منہ سے نہ نکال سکے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ فکر واندیشہ میں مستغرق ہیں۔ یہ رنگ دیکھ کر منذر بن سعید جو معمولی درجے کے علماء میں شامل تھے، کھڑے ہوئے اور بلا تامل تقریر شروع کر دی۔ یہ تقریر اس قدر لطیف وپرجوش اور حسب موقع تھی کہ بے اختیار تحسین وآفرین کی صدائیں بلند ہوئیں۔ خلیفہ نے اس حسن خدمت کے صلے میں منذر بن سعید کو قاضی القضاۃ کے عہدے پر مامور کر دیا۔ معمولی مراسم کے بعد دربار برخاست ہوا۔ سفیروں کو نہایت عزت واحترام کے ساتھ ٹھہرایا گیا اور بڑی شاندار مہمانی کی گئی۔ چند روز کے بعد قسطنطنیہ کی سفارت کو واپسی کی اجازت دی گئی اور اس کے ساتھ ہی خلیفہ نے ہشام بن ہذیل کو اپنی طرف سے بطور سفیر شاہ قسطنطین کے پاس روانہ کیا اور اس کو ہدایت کر دی کہ قسطنطین سے ایک دوستانہ معاہدہ لکھوا لائے۔ چنانچہ ہشام بن ہذیل کامیابی کے ساتھ سنہ ۳۳۸ھ میں شاہ قسطنطنیہ سے ایک دوستانہ عہد نامہ لکھوا کر واپس قرطبہ میں آیا۔ اس کے بعد بادشاہ اٹلی، بادشاہ جرمنی، بادشاہ فرانس، بادشاہ صقالیہ (سسلی) کے سفیر یکے بعد دیگرے دربار قرطبہ میں حاضر ہوئے اور اپنے اپنے بادشاہوں

کی طرف سے اظہار عقیدت بجا لائے اور محبت و ہمدردی کے تعلقات پیدا کرنے کی درخواست کی اور ہر ایک بادشاہ نے خلیفہ عبدالرحمٰن ناصر کی چشم عنایت اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے منت و سماجت اور خوشامد میں کوتاہی نہیں کی۔ یورپ کا ہر ایک بادشاہ یہ چاہتا تھا کہ خلیفہ عبدالرحمٰن میرا حامی و مددگار بن جائے تاکہ میں دشمنوں کے حملوں سے محفوظ ہو جاؤں۔

لین پول نے کہا ہے کہ سلطان عبدالرحمٰن کی خوشامد کرنے کو قسطنطنیہ، فرانس، جرمنی اور اطالیہ (اٹلی) کے بادشاہوں کے سفیر حاضر ہوئے۔ (مورز ان سپین: ص ۹۸)

لین پول نے مزید لکھا ہے:

''عبدالرحمٰن کی سلطنت کا نصف دور بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ اس نے سارے ممالک اسلامیہ میں اس سرے سے اس سرے تک امن و امان اور نیک عملی قائم کر دی۔ فرقوں کی حکومتیں دور کیں اور اپنی رعایا کی ساری جماعتوں پر سلطان کا ہی اقتدار تھا اور ان کے قلوب پر سکہ بیٹھ گیا تھا۔ دوسرے نصف عرصے میں اس نے بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں اپنی سلطنت قائم کی اور اندلس کو صاحب عظمت اور مرفہ حال بنا دیا۔ قرطبہ کبھی ایسا مالا مال اور خوش حال نہیں ہوا تھا جیسا کہ عبدالرحمٰن الثالث کے عہد خلافت میں ہوا۔'' (مورز ان اسپین: ص ۹۹)

خلیفہ عبدالرحمٰن نے اپنے بیٹے حکم کو اپنا ولی عہد بنایا تھا۔ دوسرا بیٹا عبداللہ نماز روزے کی طرف زیادہ مائل اور الزاہد کے نام سے مشہور تھا۔ عبداللہ کو قرطبہ کے ایک فقیہ نے جن کا نام عبدالباری تھا، بہکایا اور حکومت کی حرص دلا کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ خلیفہ عبدالرحمٰن اور حکم کو قتل کرنے کی ایک زبردست کوشش کی جائے۔ چنانچہ فقیہ عبدالباری اور عبداللہ نے مل کر خلیفہ اور ولی عہد کے قتل کرنے کی تیاری کی۔ اس سازش میں اور لوگوں کو بھی شریک کیا گیا۔ ۱۰ر ذی الحجہ سنہ ۳۲۹ھ یعنی بروز عیدالاضحیٰ اس سازش کا انکشاف ہو گیا اور خلیفہ مع ولی عہد قتل ہوتے ہوتے بچ گیا۔ خلیفہ نے اپنے بیٹے عبداللہ اور فقیہ عبدالباری دونوں کو گرفتار کر کے جیل خانے بھجوا دیا۔ پھر اسی روز اول اپنے بیٹے عبداللہ کو جیل خانے سے نکال کر قتل کرایا۔ فقیہ صاحب نے جب عبداللہ کے قتل ہونے کا حال سنا تو خود ہی جیل خانے میں خودکشی کر کے ہلاک ہو گئے۔

سنہ ۳۴۲ھ میں رذمیر بادشاہ جلیقیہ کے فوت ہونے پر اس کا بیٹا اردونی چہارم تخت نشین ہوا اور خلیفہ عبدالرحمٰن ناصر کی خدمت میں سفیر بھیج کر اپنی حکومت اور باپ کی جانشینی کی اجازت چاہی۔ خلیفہ نے اس کی تخت نشینی کو منظور کر کے اجازت نامہ بھیج دیا۔ سنہ ۳۴۵ھ میں فردی نند سردار قسطلہ نے اردونی چہارم کو اپنا سفارشی بنا کر خلیفہ کی خدمت میں اپنی مستقل ریاست و حکومت کے تسلیم کیے جانے کی درخواست بھیجی۔ خلیفہ نے فردی نند کی اس درخواست کو منظور کر لیا اور اس کو ریاست قسطلہ کا مستقل حاکم و فرماں روا بنا دیا۔ فردی نند اب تک ریاست جلیقیہ یعنی رذمیر کا ماتحت سمجھا جاتا تھا لیکن اب اردونی چہارم نے سفارش کر کے اس کو بھی مستقل فرماں

روا اور خود مختار رئیس بنوا دیا۔ اس سے قبل یہ صورت پیش آ چکی تھی کہ شانجہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اپنی آبائی ریاست لیون پر قابض ہو چکا تھا اور کئی برس سے ریاست لیون جلیقیہ سے جدا شانجہ کے تصرف میں تھی۔ ریاست نوار میں اس کی نانی طوطہ حکمران تھی۔ شانجہ مٹاپے میں مبتلا ہو کر اس قدر بے بس و ناتواں ہو گیا تھا کہ گھوڑے پر چڑھنا تو بڑی بات ہے پیدل بھی دو قدم نہیں چل سکتا تھا۔

سنہ ۳۴۶ھ میں فردی نند اور اردونی چہارم نے مل کر شانجہ کو ریاست لیون سے بے دخل کر دیا۔ شانجہ اپنی نانی طوطہ کے پاس ریاست نوار میں چلا گیا۔ ریاست نوار میں شانجہ کا ایک ماموں بادشاہ تھا مگر عنان حکومت اس کی نانی ہی کے ہاتھ میں تھی، جو قابلیت و تجربہ کاری کی وجہ سے اپنے بیٹے شاہ نوار کی سرپرست و اتالیق بھی تھی۔ ملکہ طوطہ نے خلیفہ کی خدمت میں بہت سے تحفے اور ہدیے بھیج کر درخواست کی کہ خلیفہ شانجہ کا ملک اردونی سے واپس دلا دے اور ایک طبیب قرطبہ سے بھیج دے جو شانجہ کے مرض کا علاج کرے۔ خلیفہ نے ایک شاہی طبیب کو نوار کی طرف فوراً روانہ کر دیا اور ملک کے واپس دلانے کا مسئلہ غور و تامل کے لیے دوسرے وقت پر ٹال دیا۔ طبیب کے علاج سے شانجہ کو آرام ہو گیا اور اس کی پہلی والی چستی و چالاکی پھر واپس آ گئی۔

دربار خلافت میں تین عیسائی بادشاہ بحیثیت فریادی:

اس کے بعد سنہ ۳۴۷ھ میں ملکہ طوطہ نے یہی مناسب سمجھا کہ میں خود خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض معروض کروں۔ چنانچہ وہ اپنے بیٹے شاہ نوار اور اپنے نواسے شاہ لیون کو لے کر قرطبہ کی جانب روانہ ہوئی۔ گویا تین عیسائی بادشاہ حدود فرانس سے خلیفہ کے دربار میں حاضر ہونے کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ ایک نہایت جاذب توجہ نظارہ تھا۔ راستے کے جن جن شہروں یا قصبوں میں یہ لوگ قیام کرتے تھے لوگ ان کو دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے تھے کہ کئی بادشاہ فریادی بن کر دربار قرطبہ کی طرف جا رہے ہیں۔ قرطبہ کے قریب پہنچے تو ان کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا۔ دربار میں خلیفہ کے سامنے حاضر ہوئے تو دربار کی شان اور خلیفہ کے رعب و جلال نے ان کو مبہوت و ششدر کر دیا۔ خلیفہ نے ان کی دل دہی اور تشفی کی اور ان لوگوں کے اتنی دور چل کر آنے اور فریاد کرنے کا اثر یہ ہوا کہ خلیفہ نے ان کے ساتھ اپنے فوجی دستوں کو روانہ کیا کہ ریاست لیون و جلیقیہ کی حکومت شانجہ کو دلا دیں۔ چنانچہ امیر المومنین عبدالرحمٰن ثالث کی فوجوں نے اردونی چہارم کو بے دخل کر کے شانجہ کو جلیقیہ و لیون کا بادشاہ بنا دیا اور اردونی بھاگ کر قسطلہ میں فردی نند کے پاس چلا گیا اور سلطانی فوجوں نے اس سے زیادہ تعرض نہیں کیا۔ اردونی کے انجام کو دیکھ کر شاہ برشلونہ اور رئیس طرکونہ نے اپنے سفیر دربار قرطبہ میں بھیج کر التجا کی کہ ہم دربار خلافت کے غلام ہیں اور اپنی اپنی ریاست کو عطیۂ سلطانی سمجھتے ہیں۔ اطاعت و فرماں برداری کے شرائط بجا لانے میں مطلق انکار و تامل نہیں ہے۔ لہٰذا ہم کو ہماری ریاستوں کی سندیں پھر عطا ہوں اور ہمارے اظہار اطاعت کی تجدید کو شرف قبولیت عطا فرمایا جائے۔ خلیفہ ناصر نے ان

عیسائی بادشاہوں کے نام اپنی رضا مندی وخوشنودی کے احکام روانہ کر کے ان کو مطمئن کیا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ سلطان عبدالرحمٰن الثالث نے اندلس کی حالت سدھارنے کے بعد افریقہ کے علاقے پر نظر ڈالی کیونکہ اس طرف بنی فاطمہ کا اقتدار روز بروز بڑھ رہا تھا کہ خلفائے بنی فاطمہ کے ارادے اندلس پر قبضہ کرنے کے تھے حتیٰ کہ سبتہ پر ان کا قبضہ تھا۔ سلطان نے اس بارے میں علماء کی جماعت سے کام لیا۔ انھوں نے بربریوں میں اپنی تقریروں کے ذریعے شیعہ سنی کا فتنہ کھڑا کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان نے جو فوج روانہ کی اس نے ساحل کے علاقہ کو تسخیر کر لیا اور سبتہ کا مہتمم بالشان قلعہ قبضے میں لے لیا۔ اس کی آمدنی شاندار بیڑے بنوانے میں صرف کر دی گئی جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں بحر روم میں گشت کرنا شروع کر دیا۔ ازاں بعد جس سرحد کے عیسائیوں نے شورش بپا کی ان کی سرکوبی کے لیے افسر روانہ کیا گیا۔ اس نے لیون کے بادشاہ پر حملہ کیا اور اس میں کام آیا۔ اس کا سر اتار کر قلعہ پر لٹکا دیا گیا۔ اس واقعہ سے سلطان کو سخت غصہ آیا اس نے سنہ ۳۲۸ھ/ ۹۲۰ء میں ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ سین سیٹون پر حملہ کیا اور اس کو تباہ کر دیا، اور آگے انہوار کی طرف متوجہ ہوا۔ ولڈ بجینکر کے درے پر عیسائیوں سے مقابلہ ہوا۔ اس میں ان کو شکست اٹھانا پڑی۔ مسلمانوں میں بربریت عود کر آئی کہ قلعہ میوز کے اکثر باشندوں کو تہ تیغ کر دیا۔ غرض کہ کامیاب جنگ سے مظفر ومنصور سلطان واپس قرطبہ پہنچا۔

اہل علم وفن کی قدر افزائی:

خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث نے جہاں کہیں علم وفن کے کسی باکمال کا نام سنا اس کو بلوایا اور بڑی قدر دانی کے ساتھ پیش آیا۔ اس کی قدر دانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغداد، قسطنطنیہ، قاہرہ، قیروان، دمشق، مدینہ، مکہ، یمن، ایران اور خراسان تک سے باکمال لوگ کھنچ کھنچ کر قرطبہ جمع ہو گئے۔ ان باکمالوں میں ہر علم وفن اور ہر ملت و مذہب کے لوگ شامل تھے اور دربار خلافت سے سب کی عزت افزائی وتربیت وپرورش ہوتی تھی۔

تعمیری ذوق:

خلیفہ عبدالرحمٰن کو سلاطین اندلس میں وہی مرتبہ حاصل تھا جو ہندوستان کے شاہان مغلیہ میں شاہجہان کو۔ مسجد قرطبہ کی تعمیر کا کام عبدالرحمٰن اول کے زمانے میں شروع ہو کر اس کے بیٹے ہشام کے زمانے میں ختم ہو چکا تھا مگر اس کے بعد بھی ہر ایک فرماں روائے اندلس نے اس مسجد کی شان وشوکت اور زیب وزینت کے بڑھانے میں ہمیشہ خزانوں کا منہ کھلا رکھا۔ خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث نے بھی اس مسجد کی تعمیر وتکمیل میں چالیس اور پچاس لاکھ کے درمیان روپیہ خرچ کیا۔ اس مسجد کا طول شرق سے غرب تک پانچ سو فٹ تھا۔ اس کی خوبصورت محرابیں ایک ہزار چار سو سترہ سنگ مرمر کے ستونوں پر قائم تھیں۔ محراب کے قریب ایک بلند منبر

خالص ہاتھی دانت اور چھتیس ہزار مختلف نگوں اور وضع کی لکڑی کے ٹکڑوں سے بنا اور ہر قسم کے جواہرات سے جڑا ہوا رکھا تھا۔ یہ منبر سات برس کے عرصہ میں تیار ہوا تھا۔ اس منبر کی قیمت ۳۵۰۷۰۵ دینار تھی۔

خلیفہ عبدالرحمٰن نے اس مسجد کے قدیم میناروں کو گرا کر ایک نیا مینار ایک سو آٹھ فٹ بلند تیار کرایا تھا۔ جس میں چڑھنے اور اترنے کے دو زینے تھے جن میں ایک سو سات درجے (Step) تھیں۔ اس مسجد میں چھوٹے بڑے دس ہزار جھاڑ روشنی کے جلا کرتے تھے، جن میں سے تین سب سے بڑے جھاڑ خالص چاندی کے اور باقی پیتل کے تھے۔ بڑے بڑے جھاڑوں میں ایک ہزار چار سو اسی پیالے روشن ہوتے تھے اور چاندی کے ان تین جھاڑوں میں چھتیس سیر تیل جلا کرتا تھا۔ تین سو ملازم اور خدام اس مسجد کے لیے متعین تھے۔

مسجد کی اس جدید تعمیر پر عبدالرحمٰن الثالث نے دو لاکھ اکسٹھ ہزار پانچ سو تیس دینار خرچ کیے تھے۔ اس جدید دور میں اگرچہ یورپ ہر چیز میں (معاذ اللہ) خدائی کا دعوٰی کرتا ہے لیکن مسجد کی تعمیر اس زمانے میں ایک نادرۂ کار عجوبہ روزگار تھی اور آج بھی ہر سال لاکھوں سیاح اس مسجد کو دیکھنے کے لیے جاتے ہیں۔ راقم بھی تین دفعہ اس مسجد کو دیکھنے کے لیے گیا۔ اس مسجد کی تعمیر عبدالرحمٰن الداخل کے زمانے میں شروع ہوئی اور ہشام نے اس کو اختتام تک پہنچایا، اس کے بعد اگرچہ ہر سلطان نے اس کو شاندار بنانے میں دولت صرف کی، لیکن عبدالرحمٰن الثالث نے اس کو صحیح معنوں میں عجوبۂ روزگار بنا دیا۔

قصر زہرا:

خلیفہ عبدالرحمٰن نے اپنی عیسائی بیوی زہرہ کے لیے قرطبہ سے چار میل کے فاصلے پر جبل العروس کے پرفضا دامن میں ایک رفیع الشان قصر تیار کرایا۔ یہ اس قدر وسیع عمارت تھی کہ اس کو بجائے قصرالزہرا کے مدینۃ الزہرا کہتے تھے۔ اس قصر کی وسعت کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس کے احاطے کی دیواروں میں پندرہ ہزار بلند اور شاندار دروازے تھے۔ یہ قصر ہمارے زمانے کے موجودہ رائج الوقت سکے کے اعتبار سے بیس کروڑ پچاس لاکھ روپیہ کی لاگت میں بن کر تیار ہوا تھا لیکن اگر اس زمانے میں روپیہ کی ارزانی اور ضروریات زندگی کی گرانی کا لحاظ کیا جائے تو قصرالزہرا کی لاگت ہم کو ایک ارب روپیہ سے کم نہیں بتلانی چاہیے۔ اس قصر کا طول چار میل اور عرض قریباً تین میل تھا۔ سنہ ۳۲۵ھ سے اس قصر کی تعمیر شروع ہو کر سنہ ۳۵۰ھ میں پچیس سال کے اندر ختم ہوئی۔ دس ہزار معماروں، چار ہزار اونٹوں اور خچروں سے روزانہ اس کے بنانے میں کام لیا جاتا تھا۔ یہ قصر چار ہزار تین سو سولہ برجوں اور ستونوں پر قائم تھا جو سنگ مرمر وغیرہ قیمتی پتھروں کے بنے ہوئے تھے۔ ان ستونوں میں سے بعض ستون فرانس و قسطنطنیہ وغیرہ کے بادشاہوں نے ہدیۃً ''عبدالرحمٰن ناصر کی خدمت میں بھیجے تھے۔ عبداللہ، حسن بن محمد، علی بن جعفر وغیرہ انجینئروں کو بھیج کر سنگ مرمر کی ایک مقدار افریقہ سے منگوائی گئی تھی۔ ایک سب سے بڑا فوارہ جو سونے کا معلوم ہوتا تھا اور اس پر نہایت خوش نما نقش و نگار تھے، جو احمد یونانی اور ربیع پادری

قسطنطنیہ سے لائے تھے۔ ایک فوارہ سنگ سبز کا ملک شام سے منگوایا گیا تھا۔ بارہ پرند اور چرند جانوروں کی صورتیں مختلف جواہرات اور سونے کی بنی ہوئی، اس میں لگائی گئی تھیں۔ ہر جانور کی چونچ میں سے پانی کا فوارہ بلند ہوتا تھا۔ اس فوارے میں کاریگر نے وہ دست کاری ظاہر کی تھی کہ یورپ کے جن سیاحوں نے ان کو دیکھا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ دیکھنا اور سننا تو بڑی بات ہے، خواب اور خیال کو بھی یہاں مجال دخل نہ تھی۔

قصر کے درمیان میں ایک فوارہ نما طشت پارے (Murcury) سے لبریز رکھا تھا اور اس کے دونوں جانب آٹھ دروازے ہاتھی دانت اور آبنوس کے منڈھے ہوئے تھے جو جواہرات سے مرصع تھے۔ جس وقت ان دروازوں میں سے آفتاب کی شعاعیں آتیں اور پارے کے حوض میں جنبش پیدا ہوتی تھی تو سارا کمرہ بجلی جیسی چمک سے بھر جاتا تھا، اور اہل دربار اپنی چکا چوند ہوتی ہوئی آنکھوں کو کپڑوں سے چھپا لیتے تھے۔ غرض کہ یہ قصر کیا تھا ایک طلسمی کارنامہ تھا۔ قصر الزہرا کے علاوہ قصر المعشوق، قصر السرور، قصر التاج، قصر الدمشق، ایسے محلات تھے جن کا ثانی روئے زمین پر نہیں تھا۔

قصر دمشق بنوامیہ کے پرانے وطن کی یاد دلاتا تھا۔ اس قصر کی چھتیں سنگ مرمر کے ستون پر قائم تھیں اور اس کے فرش پر پچی کاری کا کام تھا اور یہ اس قدر حسین وجمیل تھا کہ ایک شاعر اس کی تعریف میں کہتا ہے ۔

كل قصر بعد الدمشق يذم	فيه طاب الجنتى والذا لمشم
منظر رائق و ماء نمير	و ترىٰ عاطر وقصر الشيم
بت فيه والليل والفجر عندى	عنبر اشهب ومشك رقم

لکھا ہے کہ جس وقت قصر الزہرا ایک کروڑ پچاس لاکھ دینار کی لاگت سے تیار ہوا تو سلطان اپنی بیوی زہرا کے ساتھ اس میں رونق افروز ہوا، اور دونوں نے اس مرغزار کو جھروکوں سے دیکھا۔ سامنے قصر شاہی سنگ مرمر کی عمارت اور برجوں اور میناروں سے آراستہ مثل موتی کے دکھائی دیتا تھا، اور اس کی پشت پر ایک سربہ فلک کشیدہ کوہ سیاہ اپنا لطف علیحدہ لے رہا تھا۔ زہرا نے جب اس بے نظیر نظارے کو دیکھا تو قصر اور سیاہ پہاڑ کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''یا امیر المؤمنین! یہ قصر مثل ایک معشوقہ نازنین کے ہے جو بصد ناز وانداز اس حبشی کے پہلو میں متمکن ہے۔'' یہ سن کر امرائے دربار نے خلیفہ سے کہا کہ انسان کی کیا مجال کہ پہاڑ کو جنبش دے سکے۔ اس کا اس مقام سے ہٹانا اسی خالق حقیقی کے دست قدرت میں ہے جس نے اس کو اور ہم کو پیدا کیا۔ اس بات سے عبدالرحمٰن الثالث بھی سمجھ گیا اور یہ حکم دیا کہ اس پہاڑ کو فوراً صاف کر کے نیچے سے چوٹی تک میوہ دار درخت جیسے بادام اور انجیر و زیتون وغیرہ لگا دیے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، یوں اس حبشی نے سبز پوشاک زیب تن کر لی اور میوہ دار درختوں کی مہک اور خوشبو نے سارے جبل و دشت کو معطر کر دیا۔

اس قصر کا ایک حصہ قصر الخلفاء نامی بھی قابل دید تھا۔ اس کی چھت خالص سونے اور ایسے شفاف سنگ مرمر سے بنی ہوئی تھی کہ دوسری طرف کی چیز مثل آئینہ کے نظر آتی تھی۔ یہ چھت باہر کی جانب سونے

چاندی کے سفالوں سے سجی ہوئی تھی۔ اس کے وسط میں ایک خوبصورت مرصع فوارہ نصب تھا، جس کے سر پر وہ مشہور موتی جڑا ہوا تھا، جس کو شہنشاہ یونان نے بطور تحفہ عبدالرحمٰن ثالث کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اس فوارے کے علاوہ قصر کے بیچ میں ایک فوارہ نما طشت پارے سے لبریز رکھا تھا۔ اس قصر کے گرد نہایت خوش نما آئینے ہاتھی دانت کے چوکھٹوں میں جڑے ہوئے تھے۔ مختلف اقسام کی لکڑیوں کے مرصع دروازے سنگ مرمر اور بلوری چوکھٹوں پر نصب تھے۔ جس وقت یہ دروازے کھول دیے جاتے تھے اور آفتاب کی شعاع سے مکان روشن ومنور ہوتا تو کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ اس کی چھت اور دیواروں کی طرف نظر بھر کے دیکھ سکے۔ اس حالت میں اگر پارہ ہلا دیا جاتا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام مکان جنبش میں ہے۔ جو لوگ اس راز سے واقف نہ تھے وہ مکان کو فی الحقیقت جنبش میں سمجھ کر بے حد خائف ہوتے۔

اس قصر کے انتظام اور نگرانی کے لیے تیرہ ہزار سات سو پچاس ملازم اور تیرہ ہزار تین سو بیاسی غلام جو نصاریٰ قوم کے تھے، متعین تھے۔ حرم سرا کے اندر چھ ہزار عورتیں خدمت گزاری کے لیے حاضر رہا کرتی تھیں۔ حوضوں میں روزانہ بارہ ہزار روٹیاں علاوہ اور چیزوں کے مچھلیوں کی خورش (خوراک) کے لیے ڈالی جاتی تھیں۔ مدینۃ الزہرا وہ نادر الوجود شہر تھا جس کی وسعت، سنگ مرمر کی عمارات، دربار خاص و عام کی شان و شوکت، اس کے باغات کا پر فضا سماں کہ جہاں ہزار ہا فوارے اچھلتے، نہریں اور حوض پانی سے چھلکتے تھے، دیکھنے کے لیے دور دور سے سیاح آتے تھے۔ عربوں نے اس قصر کو اپنی صنعت و حرفت و دست کاری کی نمائش گاہ بنا دیا تھا۔ افسوس کہ عیسائی وحشیوں نے آئندہ زمانے میں جب قرطبہ پر قبضہ کیا تو قصر الزہرا کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ مسجدوں کو ڈھا دیا، مقبروں کو مسمار کر کے قبروں تک کو ادھیڑ ڈالا، انا للہ و انا الیہ راجعون۔

پاک باطنی:

قاضی القضاۃ منذر بن سعید بلوطی کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ ان کا ایک واقعہ جو عبدالرحمٰن ناصر کے ساتھ پیش آیا، ذکر کرنے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ عبدالرحمٰن نے قرطبہ میں ایک مکان کو اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے خریدنا چاہا۔ وہ مکان یتیم بچوں کی ملکیت تھا اور وہ یتیم بچے قاضی منذر کی نگرانی میں تھے۔ جب قاضی کے پاس اس مکان کی خریداری کا پیغام پہنچا تو قاضی صاحب نے فروخت کرنے سے انکار کر دیا اور خلیفہ کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ یتیموں کی جائیداد اس وقت منتقل ہو سکتی ہے جبکہ ان تین شرطوں میں سے کوئی ایک شرط پوری ہو:

1. کوئی سخت ضرورت لاحق ہو۔
2. جائیداد کے تلف ہو جانے کا اندیشہ ہو۔
3. ایسی قیمت ملتی ہو کہ جس کے لینے میں یتیموں کا آئندہ فائدہ متصور ہو۔

فی الحال ان تین شرطوں میں سے کوئی ایک شرط بھی موجود نہیں اور ملازمین سرکار نے جو قیمت اس

مکان کی تجویز کی ہے وہ بہت کم ہے۔ خلیفہ یہ پیغام سن کر خاموش ہو گیا اور اس نے سمجھا کہ قاضی بغیر قیمت بڑھائے نہیں مانے گا۔ ادھر قاضی منذر کو اندیشہ ہوا کہ کہیں خلیفہ اس مکان کو زبردستی نہ چھین لے۔ چنانچہ قاضی نے فوراً مکان کو منہدم کرا دیا۔ اس کے بعد ملازمین شاہی نے دگنی قیمت دے کر اس زمین کو خریدا۔ خلیفہ کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اس نے قاضی کو بلا کر مکان کے منہدم کرانے کا سبب دریافت کیا۔ قاضی منذر نے کہا، جس وقت میں نے مکان کے منہدم کرنے کا حکم دیا، اس وقت میرے زیر نظر قرآن کی یہ آیت تھی ﴿فَانْطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا قَالَ أَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا﴾ (الکہف ۱۸:۷۱) خلیفہ یہ سن کر خاموش ہو گیا اور اس روز سے قاضی منذر کی زیادہ عزت کرنے لگا۔ اس واقعہ سے خلیفہ اور قاضی دونوں کی پاک باطنی کا ثبوت ملتا ہے۔ قاضی منذر سنہ ۳۵۵ھ میں خلیفہ ناصر سے پانچ سال بعد فوت ہوئے تھے۔

قاضی منذر کا تقرر:

سرزمین اندلس سے ملحق خود مختار بادشاہوں نے سلطان عبدالرحمٰن الثالث کی خوشنودئ مزاج اور رضا مندی حاصل کرنے کی غرض سے اپنے سفراء قرطبہ بھیجے۔ چنانچہ ۳۳۶ھ/ ۹۴۷ء میں شاہ قسطنطنیہ نے بیش بہا تحائف بذریعہ سفیر سلطان کی خدمت میں بھیجے۔ خلیفہ نے سفیر کا نہایت اعزاز و اکرام کیا۔ شہر کثرت آئینہ بندی اور آرائش سے دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ تخت شاہی پر خلیفہ رونق افروز ہوا، گردو پیش شہزادے، والیان ملک اور ارکان سلطنت دست بستہ حاضر تھے۔ جس وقت سفیر اور اس کے ساتھی پیش ہوئے تو شاہی رعب و داب اور دربانوں اور درودیوار کی شان و شوکت دیکھ کر دنگ ہو گئے تو سر جھکائے نہایت ادب و احترام سے تخت کے قریب آ کر اپنے بادشاہ کا خط پیش کیا۔

عبدالرحمٰن الثالث نے دربار میں حاضر علماء کو حکم دیا کہ وہ اسلام کی شان و شوکت اور فضیلت اور بزرگی اور خلفائے اندلس کی فتوحات بیان کریں، لیکن حاضرین دربار کے دلوں پر کچھ ایسا رعب چھایا ہوا تھا کہ ان مشہور علماء میں یکے بعد دیگرے ہر شخص نے تقریر شروع کی لیکن دو چار لفظوں سے زیادہ نہ کہہ سکے۔ علماء کی یہ حالت دیکھ کر منذر بن سعید کھڑے ہوئے۔ اگرچہ وہ علم و فضل میں دوسرے علماء کی طرح مشہور نہ تھے لیکن انھوں نے اس خوش اسلوبی اور نہایت شستہ اور شاندار انداز میں اسلام کی خوبیاں بیان کیں اور ایک ایسا پرجوش اور برجستہ قصیدہ پڑھا کہ اہل دربار کی زبانیں داد و تحسین کے ڈونگرے برسانے لگیں۔ خلیفہ عبدالرحمٰن اس قدر خوش ہوا کہ اسی وقت انھیں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے عہدے پر سرفراز کر دیا۔ پھر قاضی منذر نے صحیح حق قضا ادا کیا جیسا کہ اوپر کے واقعے سے ظاہر ہوتا ہے۔

عبدالرحمٰن الثالث الناصر پہلا شخص ہے جس نے خلافت کا اعلان کیا اور مسجد قرطبہ کے منبر پر سے

''امیر المومنین'' کی سلطنت کی بقا اور ترقی کی دعائیں سنی گئیں اور اندلس میں اموی سلطنت اور خلافت صدیوں تک بڑی شان سے قائم رہی۔ اس مسجد قرطبہ میں قاضی منذر بن سعید خطابت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اور وہ نہ صرف بہت اچھے خطیب تھے بلکہ ایک بہت بڑے عالم بھی تھے اور مافی الضمیر کے اظہار کی جرأت بھی رکھتے تھے۔ خلیفہ عبدالرحمٰن کو عمارات تعمیر کرنے کا از حد شوق تھا۔ اس نے ''قصر الزہرا'' کے نام سے ایک شاہی بستی بسائی اور اس میں نہایت شاندار محل تعمیر کیے۔ ان تعمیرات کے آخری دنوں میں سلطان عبدالرحمٰن الثالث اتنا مشغول رہا کہ تین جمعے مسلسل وہ مسجد میں نہ آسکا۔ چوتھے جمعہ کو جب وہ مسجد میں آیا تو اس کی موجودگی میں قاضی منذر نے جو خطبہ دیا اس میں سلطان کی مسجد سے مسلسل تین جمعہ کی غیر حاضری اور تعمیرات میں اس قدر مصروف ہونے کو نام لیے بغیر تنقید کا نشانہ بنایا۔ قاضی منذر نے خطبے میں قرآن حکیم کی ایسی آیات پڑھیں جن میں دنیا میں عمارتیں کھڑے کرنے اور آخرت سے غافل ہو جانے پر وعیدیں تھیں جیسے:

﴿اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۝ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ﴾ (الشعراء۲۶: ۱۲۸تا۱۳۱)

''کیا تم ہر بلندی پر عبث یادگاریں تعمیر کرتے ہو اور شاندار محل بناتے ہو، گویا کہ تم کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے، اور جب تم کسی پر حملہ کرتے ہو تو جابرانہ حملہ کرتے ہو، پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔''

اس بارے میں قاضی منذر نے بہت سی احادیث بھی سنائیں جن سے دنیا کی بے ثباتی اور عمارتوں کی تعمیر کی حوصلہ شکنی ہوتی تھی، اور پھر ان قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کی تفسیر و تشریح بھی کی۔ اگرچہ اپنے اس خطبے میں قاضی صاحب نے سلطان کا نام نہیں لیا تھا اور لینا بھی نہیں چاہیے تھا لیکن سلطان اور مسجد کا ہر نمازی یہ سمجھ رہا تھا کہ اس سخت تنقید کا مخاطب کون ہے۔

تنقید کو تو کوئی شخص اپنے لیے پسند نہیں کرتا اور جب مجمع عام میں تنقید اور وہ بھی ایک ماتحت کی زبان سے، وہ تو ہر صورت میں باعث ناگواری ہوتی ہے، اور مزاج شاہی تو اس کو کسی صورت پسند نہیں کرتا۔ شاہی مزاج تو قصیدہ خوانی اور مدح سرائی کا عادی ہوتا ہے۔ تنقید کو تو ان کا مزاج ہضم ہی نہیں کر سکتا۔ یہ بادشاہوں کی ایک بہت بڑی کمزوری ہے کہ وہ اپنے کانوں سے یہ سننا چاہتے ہیں کہ ہم بہت اچھے ہیں۔ مولانا روم رحمہ اللہ نے بالکل صحیح فرمایا ؎

جانور فربہ شود از ناؤ و نوش — آدمی فربہ شود از راہِ گوش

یعنی جانور کھانے پینے سے موٹا ہوتا ہے جب کہ آدمی کان کے راستے سے موٹا ہوتا ہے۔

جب کوئی شخص عمومی طور پر اور کوئی بادشاہ خصوصی طور پر اپنے ماتحت کو تنقید کرتے ہوئے سنتا ہے تو اس

پر کبر کا سخت دورہ پڑتا ہے۔ بڑے بڑے دین دار لوگ بھی اس وقت قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔

قاضی منذر کی یہ تنقید سلطان عبدالرحمٰن الناصر پر بھی سخت گراں گزری، لیکن اس نے بڑے ضبط اور تحمل سے کام لیا اور اس تنقید سے سخت متاثر ہونے کے باوجود وہ مسجد میں کچھ نہ بولا اور نماز جمعہ ادا کر کے خاموشی کے ساتھ اپنے محل میں چلا گیا۔ محل میں پہنچ کر سلطان نے اپنے بیٹے الحکم سے کہا کہ آج قاضی منذر نے مجھ کو سخت تکلیف دی ہے اور میں اس کی باتوں سے سخت پریشان ہوا ہوں، لہٰذا اب میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ میں ان کے پیچھے کبھی جمعہ نہیں پڑھوں گا۔ الحکم نے اپنے ابا کی یہ بات سن کر کہا: ''قاضی منذر کا امام ہونا یا نہ ہونا آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ اس کو فوری طور پر معزول کر دیں اور اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کو خطیب مقرر کر دیں۔ وہ خطیب ایسی گستاخی بالکل نہیں کرے گا جو قاضی منذر نے کی ہے۔''

بیٹے کے منہ سے یہ کلمات سن کر سلطان عبدالرحمٰن غصے میں آ گیا۔ اس نے بیٹے کو ڈانٹ کر کہا: ''تمہارا برا ہو! ایک شخص جو ہدایت سے دور ہے اور راستہ سے بھٹکا ہوا ہے، کیا اس کی خوشی کی خاطر قاضی منذر جیسے خوبیوں والے شخص کو اس کے منصب سے معزول کر دوں۔ یہ بات کبھی نہیں ہو سکتی: (هذا ما لا يكون) مجھے ان کی ان باتوں سے دل پر چوٹ لگی ہے، اس لیے میں نے ان کے پیچھے جمعہ نہ پڑھنے کی قسم کھالی ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس کے کفارہ کی کوئی صورت نکل آئے اور نکل بھی آئے گی۔ تاہم قاضی منذر ہماری زندگی میں اور اپنی زندگی میں لوگوں کو نماز پڑھاتے رہیں گے۔ (بل مصلي بالناس حياتنا وحياته ان شاء الله تعالىٰ) چنانچہ قاضی منذر بدستور جامع قرطبہ میں جمع کی نماز پڑھاتے رہے۔ عبدالرحمٰن الناصر کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے نے بھی ان کو اس منصب پر باقی رکھا۔

باوجود اس تنقید کے سلطان عبدالرحمٰن الناصر قاضی صاحب کا قدر دان رہا اور ان کی جرأت و ہمت کی تعریف کرتا رہا۔ سلطان عبدالرحمٰن کے زمانے میں ایک مرتبہ قحط پڑا۔ ملک کے حالات بہت پریشان کن ہو گئے۔ سلطان نے اپنا ایک خاص آدمی قاضی منذر کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ آپ نماز استسقاء پڑھائیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بارش برسائے تاکہ قحط کی یہ کیفیت ختم ہو۔ جب قاضی صاحب کے پاس سلطان کا پیغام گیا تو قاضی صاحب نے پوچھا کہ سلطان نے میرے پاس دعا کا پیغام بھیجا ہے لیکن وہ خود کیا کر رہے ہیں؟ قاصد نے کہا:

''آج سے زیادہ ہم نے کبھی ان کو اللہ سے ڈرنے والا نہیں پایا۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ حیران و پریشان ہیں۔ تنہائی میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ فرش خاک پر سر بہ سجود ہیں۔ ان کی آنکھوں سے موسلا دھار بارش کی طرح آنسو رواں ہیں۔ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے ہیں اور حق تعالیٰ شانہ سے رو رو کر کہہ رہے ہیں: ''بارالہا! میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے، کیا تو میرے گناہوں کی وجہ سے لوگوں کو عذاب دے گا حالانکہ تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔''

قاصد کے منہ سے یہ الفاظ سن کر قاضی منذر کے چہرے پر اطمینان کے آثار ظاہر ہو گئے۔ انھوں نے قاصد سے فرمایا:

''اپنے ساتھ بارش لے کر واپس جاؤ۔ اب ضرور بارش ہوگی کیونکہ زمین کا حاکم جب الحاح وزاری کرتا ہے تو آسمان کا حاکم ضرور رحم فرماتا ہے۔ (اذا خشع جبار الارض فقد رحم جبار السماء) چنانچہ ایسا ہی ہوا قاصد واپس گیا تو بارش شروع ہوگئی۔''

امیر المومنین خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث ناصر لدین اللہ نے ۲ رمضان المبارک سنہ ۳۵۰ھ کو ۷۲ سال چند ماہ کی عمر میں بمقام قصر الزہرا میں وفات پائی۔

مال گزاری کی آمدن:

اس خلیفہ کے عہد میں دو کروڑ چون لاکھ اسی ہزار دینار سالانہ مال گزاری داخل خزانہ عامرہ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ سات لاکھ ۶۵ ہزار دینار مختلف ذرائع سے وصول ہوتے تھے۔ یہ تمام آمدنی ملک اور رعایا پر ہی خرچ کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ جو روپیہ بطور خراج و جزیہ عیسائیوں اور یہودیوں سے وصول ہوتا تھا، وہ خاص خزانہ شاہی میں داخل کر دیا جاتا تھا۔ اس آمدنی کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ اس میں سے ایک ثلث خاص سلطان کی جیب خاص کے لیے مقرر تھا۔ باقی کل رقم عمارتوں، پلوں اور سڑکوں وغیرہ پر خرچ کی جاتی تھی۔

خلیفہ کی وفات:

اس خلیفہ کی وفات کے بعد اس کے کاغذات میں سے خلیفہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک یادداشت نکلی جس میں خلیفہ نے اپنے پچاس سالہ عہد حکومت کے ان دنوں کا حال لکھا تھا، جن میں خلیفہ کو کوئی فکر نہ تھا اور ایسے دنوں کی تعداد جو افکار سے خالی تھی، صرف چودہ تھی۔ وفات کے وقت خلیفہ کے گیارہ لڑکے موجود تھے، جن میں حکم بن عبدالرحمٰن ولی عہد تھا۔

عبدالرحمٰن ثالث کے عہد حکومت پر تبصرہ:

خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کا زمانہ اندلس کی حکومت اسلامیہ کا نہایت شاندار زمانہ تھا۔ ملک میں ہر طرف امن وامان کا دور دورہ تھا۔ تجارت بہت بڑی ترقی پر تھی۔ اہل اندلس نے افریقہ و ایشیا کے دور دراز مقامات پر اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لی تھیں۔ بحری طاقت میں کوئی ملک اور کوئی قوم اندلس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ تمام اندلسی سمندروں پر گویا مسلمانوں کی حکومت تھی۔ اس خلیفہ نے اپنے سرداروں اور اہل کاروں کو شاہی اختیارات نہیں دیے بلکہ وہ خود ہر ایک اہم اور ضروری معاملے کی طرف متوجہ ہوتا اور اہل کاروں پر کاموں کو چھوڑ کر بے فکر

نہیں ہو جاتا تھا۔ اس نے ان عرب سرداروں اور فقیہوں کی طاقت کو جو حکومت و سلطنت پر حاوی تھے، بتدریج کم کر کے ان لوگوں کو جو خلیفہ کے ہمدرد و خیر اندیش تھے، بڑھایا اور اپنے ذاتی غلاموں کا ایک حفاظتی دستۂ فوج بنایا۔ خلیفہ کی نگاہ سے سلطنت کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ پوشیدہ نہیں رہتا تھا۔ تمام جزئیات تک خلیفہ کی نظر پہنچ جاتی تھی۔

اس خلیفہ نے جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور گروہوں میں جو مخالفت اور خانہ جنگی برپا رہتی تھی، اس کو بالکل مٹا دیا۔ ہر ایک جماعت اور ہر ایک گروہ کو اس کے مرتبہ کے موافق سلطنت کی طرف سے حقوق حاصل تھے اور کوئی گروہ سلطنت کا دشمن نہ تھا، آپس میں ایک دوسرے سے چھری کٹاری ہونا چاہتے تھے۔ اسی میں خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کی کامیابیوں کا راز مضمر تھا اور یہی وہ چیز تھی جس کے سبب اندلسی مسلمانوں کی عظمت تمام دنیا کی نگاہوں میں پیدا ہو گئی تھی۔

اس خلیفہ کے زمانے میں غیر مسلم لوگوں یعنی عیسائیوں اور یہودیوں وغیرہ کے ساتھ نہایت مروت اور نرمی کا برتاؤ ہوتا تھا۔ خلیفہ عبدالرحمٰن کی حدود حکومت میں رہنے والے تمام عیسائی خلیفہ عبدالرحمٰن کو اس قدر محبوب رکھتے تھے کہ اس معاملے میں وہ مسلمانوں سے ہرگز کم نہ تھے۔

مسلمان مولویوں کے تنگ دل اور سخت گیر طبقہ کو اس خلیفہ نے آنحضرت ﷺ کی رعایتوں کی طرف توجہ دلائی، جو وہ غیر مسلم لوگوں کے ساتھ روا رکھتے تھے اور ان کو مجبور کیا کہ وہ قرآن و حدیث کی اصل روح سے واقف ہوں اور حقیقت و شریعت سے آگاہ ہو کر تنگ چشمی کو چھوڑ دیں۔ اس کام میں خلیفہ کو کامیابی حاصل ہوئی اور اس کا زمانہ خیر و برکت کا زمانہ سمجھا گیا۔

جہاد کرنے اور کفار سے بذات خود لڑنے میں یہ خلیفہ کسی سے کم نہیں تھا اور اس کی فوجی کارروائیاں بہت ہی عظیم الشان تھیں۔ ساتھ ہی جب خلیفہ کے رفاہ رعایا، خدمت علم و فنون، اصلاح معاشرت، ترقی و تمدن، شوق عمارات، ترقی مال و دولت، ترقی زراعت وغیرہ کارناموں پر غور کیا جاتا ہے تو اس کا مرتبہ مزید بلند ہوتا ہے اور عبدالرحمٰن ثالث عبدالرحمٰن اول سے ہرگز کم ثابت نہیں ہوتا۔

اس خلیفہ کے زمانے میں نہ صرف قرطبہ بلکہ تمام ملک اندلس جنت کا نمونہ بن گیا تھا۔ کہیں چپہ بھر زمین ایسی نہ تھی جس میں کاشت نہ ہوتی ہو۔ خوبصورت باغات کی افراط و کثرت سے تمام ملک گلشن و گلزار اور چمن زار نظر آتا تھا۔ کوئی شہر و قصبہ اور گاؤں ایسا نہ تھا جس میں خوبصورت اور سر بفلک عمارات کی کثرت نہ ہو۔ وہ اندلس جو اس خلیفہ کی تخت نشینی سے پہلے بدامنی اور فتنہ و فساد کا گھر بنا ہوا تھا اس کے عہد سلطنت میں امن و امان اور فارغ البالی کا مسکن بن گیا تھا۔ قرطبہ اور دوسرے شہروں کی عمارات اور رونق و سلیقہ شعاری بغداد و دمشق وغیرہ سے بدر جہا بڑھ چڑھ کر تھی۔ اندلس کی آبادی کے مقابلے میں تمام براعظم یورپ ایک بیابان نظر آتا تھا جہاں تہذیب و شائستگی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ یورپ کے تمام بادشاہوں کی آمدنی مل کر بھی تنہا خلیفہ

عبدالرحمٰن ثالث کی آمدنی کے برابر نہ تھی۔ خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کے باقاعدہ فوجی جن کے نام رجسٹروں میں درج تھے، ڈیڑھ لاکھ تھے مگر بے قاعدہ فوج یعنی ضرورت کے وقت رضا کاروں وغیرہ کی تعداد جو فراہم ہو سکتی تھی، اس کا کوئی شمار نہ تھا۔ بارہ ہزار آدمیوں پر مشتمل جن میں آٹھ ہزار سوار اور چار ہزار پیدل تھے، خلیفہ کی محافظ تن فوج تھی۔

تمام جزیرہ نمائے اندلس میں سڑکوں اور شاہراہوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ مسافروں کی حفاظت کے لیے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چوکیاں قائم تھیں جہاں سپاہی گشت کرتے اور پہرہ دیتے رہتے تھے۔ ڈاک کا انتظام قاصدوں کے ذریعے انجام پاتا تھا جو ڈاک لے کر گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے جاتے تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ خبر اتنی جلدی پہنچ جاتی تھی کہ دوسرے ملکوں کے لوگ اس کو جادو سمجھتے تھے۔ لاتعداد بروج پہرہ و چوکی کے لیے بنے ہوئے تھے۔ یہ بروج ساحل بحر پر بھی بنے ہوئے تھے۔ ان برجوں کی چوٹیوں پر سے دارالخلافہ میں جہازوں کی نقل و حرکت کی خبر بلا توقف پہنچ جاتی تھی۔ بیت المال سے ایک بہت بڑی رقم ایسی عمارتوں کے لیے ہمیشہ لی جاتی تھی، جو رفاہ عام کے لیے بنوائی جاتی تھیں۔ ان عمارتوں کے بنوانے سے یہ بھی غرض تھی کہ کاریگروں اور مزدوروں کے لیے کام ہمیشہ مہیا رہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اس تمام ملک میں جو مسلمانوں کے قبضہ میں رہ چکا ہے غیر معمولی تعداد قلعوں اور پلوں کی پائی جاتی ہے۔ بیمار اور محتاج آدمیوں کے لیے سرکاری مکانات تھے۔ وہاں سرکاری خرچ سے ان کی خبر گیری کی جاتی تھی۔ تمام ممالک محروسہ میں دارالیتامیٰ قائم تھے۔ ان میں یتیموں کی پرورش اور تعلیم کا انتظام خلیفہ کے صرف خاص سے ہوتا تھا۔

قرطبہ کی آبادی دس لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ سڑکیں نہایت صاف و پختہ، مکانات عموماً سنگ مرمر کے اور نہایت خوبصورت تھے، پانی کے نکاس کی موریوں کا نہایت عمدہ اور قابل تعریف انتظام تھا۔ صفائی کے لیے ایک محکمہ قائم تھا جو ہمہ اوقات شہر کی صفائی کی نگرانی میں مصروف رہتا تھا۔ جابجا شہر کے اندر بھی نفیس و دل کشاہ باغیچے تھے اور نواح شہر میں تو ایسے جنت الفردوس باغیچوں کی بڑی ہی کثرت تھی۔ شہر میں مکانات کی تعداد ایک لاکھ تیرہ ہزار تھی۔ ان میں وزراء و امراء اور خلیفہ کے محلات و قصور شامل نہیں ہیں۔ اسی ہزار چار سو دکانیں، سات سو مسجدیں، نو سو حمام اور چار ہزار سے زاید وہ مکانات تھے جن میں مال تجارت رکھا رہتا تھا۔ ان کو گودام کہنا چاہیے۔ دنیا کے ہر ملک و شہر کے آدمی، ہر ملک کا لباس اور ہر ملک و سلطنت کے سکے قرطبہ میں نظر آتے تھے۔ اس شہر کا طول چوبیس میل اور عرض چھ میل تھا، جو وادی الکبیر کے کنارے کنارے پھیلا چلا گیا تھا۔ خاص شہر جس کے گرد پختہ فصیل تھی، وہ چودہ میل کے محیط میں تھا۔ رات کے وقت قرطبہ کے بازار میں اگر کوئی شخص بخط مستقیم سفر کرتا تو دس میل تک وہ بازاروں کے چراغوں کی روشنی میں چل سکتا تھا۔ روئے زمین کا کوئی شہر قرطبہ کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ دنیا کے کسی شہر میں اس قدر قلمی کتابیں نہیں تھیں جس قدر قرطبہ میں موجود تھیں۔ پہاڑ کا پانی ڈھائی میل کے فاصلے سے بذریعہ نل شہر کے اندر آتا تھا۔ باغوں میں اسی نل کے ذریعے فوارے

چھوٹتے تھے۔ شہر کے سات بڑے بڑے دروازے تھے، جن کے پھاٹکوں میں تالا جڑا رہتا تھا۔ شہر پناہ کے اندر شہر پانچ حصوں میں منقسم تھا۔ ہر ایک حصے کی شہر پناہ الگ الگ تھی۔ شہر کے پانچ حصوں میں سے ایک حصہ قصر شاہی تھا۔ اس کا قلعہ الگ تھا اور ارا کین سلطنت اسی میں رہتے تھے۔ شہر قرطبہ ہی میں نہیں تمام ملک اندلس میں کوئی فقیر بھیک مانگنے والا نظر نہیں آتا تھا۔ سلطان عبدالرحمٰن ثالث اپنے آخری ایام حکومت میں مدینۃ الزہرا میں چلا گیا تھا، جو قرطبہ کے قریب ایک دوسرا چھوٹا سا شہر بن گیا تھا اور رونق و خوبصورتی میں قرطبہ سے بہت بڑھ چڑھ کر تھا۔ اندلس میں ہر قسم کے میوے بافراط پیدا ہونے لگے تھے اور بازاروں میں بہت ارزاں فروخت ہوتے تھے۔

دارالخلافہ قرطبہ میں بکثرت مدارس اور دارالعلوم جاری تھے۔ جابجا مشاعرے، مناظرے اور علمی تحقیقات کے جلسے منعقد ہوتے تھے۔ شہزادے، امرا اور خود خلیفہ ان جلسوں میں شرکت اور سرپرستی کرتے۔ علماء کو انعام و وظائف عطا کرتے تھے۔ ہیئت، طب، فلسفہ، فقہ، حدیث اور تفسیر کے بے نظیر عالم قرطبہ میں موجود تھے۔ طلباء کے مصارف اور رہنے سہنے کا انتظام سب شاہی خزانہ کے ذمے تھا۔ آخری ایام حیات میں خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث نے اپنے ولی عہد حکم کو کاروبار سلطنت بہت کچھ سپرد کر دیا تھا اور خود اپنا وقت عبادت الٰہی میں زیادہ بسر کرنے لگا تھا۔

علمی ترقی:

مؤرخین نے لکھا ہے کہ قرطبہ شہر میں مدارس ثانیہ کی تعداد آٹھ سو کے قریب تھی۔ سب سے بڑی یونیورسٹی جامع مسجد قرطبہ تھی۔ یہی وہ جامعہ ہے جہاں سے ابن رشد، ابن سعد ادریس، ابن بشکوال، ابن زہر، ابن طفیل، اسقوطیہ، ابن حزم، ابن زیدون، المنصور، ابوالقاسم اولین موجد طیارہ اور ابن عمار جیسے باکمال اور یگانۂ روزگار افراد نکلے۔

اس جامعہ میں فلسفہ، منطق، ریاضی، طبیعیات، طب، قانون، فلکیات، الٰہیات اور حدیث و فقہ کی تعلیم ہوتی تھی۔ صرف مسلم طلباء ہی نہیں بلکہ فرانس، اطالیہ، جرمنی اور انگلستان کے طالب علم علماء عرب سے تحصیل علوم کرتے تھے۔ نصرانیت کے سب سے بڑے پیشوا سلوستر پاپائے روم نے بھی اسی جامعہ میں تعلیم پائی تھا، اور مارٹن لوتھر جو پروٹسٹنٹ مذہب کا بانی تھا وہ بھی قرطبہ کی یونیورسٹی کا پڑھا ہوا تھا۔ قرطبہ میں جامعہ کے سوا خلفائے اندلس کا دربار خود ایک جداگانہ کالج تھا جہاں ہر وقت علمائے مبصرین کے مناظرے اور مباحثے ہوا کرتے تھے۔ دربار خلافت کے علاوہ ہر والی اور گورنر کا دیوان خانہ علماء و فقہاء اور اطباء و مہذبین، شعراء اور محققین کے لیے درس گاہ بنا ہوا تھا۔ شہر کے ایک حلقے میں ۷۰ تعلیم یافتہ، زاہدہ، عابدہ اور خوش نویس خواتین ایسی رہتی تھیں جو خط کوفی میں کلام حکیم لکھا کرتی تھیں۔ لین پول لکھتا ہے:

"سائنس (علوم) کی ہر شاخ کی قرطبہ میں تعلیم ہوتی تھی اور علم طب میں جتنی ترقی جالینوس کے زمانے سے اس وقت تک کل صدیوں میں ہوئی تھی اس سے کہیں زیادہ اور عمدہ اضافہ یہاں کے حکماء اور اطباء کی تحقیقات اور تجربات سے ہوا۔ ابوالقاسم ایک نامور سرجن تھا۔ مغرب آج بھی اس کی سرجری کا قائل ہے۔ ابن زبیر بھی علم جراحی کا موجد تھا۔ ابن بیطار علم نباتات کا ماہر بھی یہیں کا رہنے والا تھا۔" (مورزان اسپین: ص ۱۰۳)

نفح الطیب میں ہے:

"فنون میں اندلس بہت فائق تھا۔ قرطبہ میں ایک لاکھ بتیس ہزار حریر بان تھے۔ علوم وفنون اور تہذیب وتمدن میں مسلمانوں کا شہر قرطبہ درحقیقت ساری دنیا کا سب سے زیادہ صاف ستھرا، چمکیلا اور پر رونق شہر تھا۔"

دریائے وادی الکبیر پر پل تعمیر کیا گیا تھا۔ اس پل کی سترہ محرابیں تھیں۔ سارا قرطبہ عالی شان عمارتوں سے معمور تھا۔ پچاس ہزار سے زیادہ امراء اور عہدے داروں کے اور ایک لاکھ سے زائد عوام کے مکان تھے۔ سات سو مسجدیں اور نو سو حمام تھے ۸۰۴۵۵ دوکانات تھیں۔ رات کو دس میل تک قرطبہ کے چراغوں کی روشنی میں مسافر جا سکتا تھا۔ قرطبہ کی کل آبادی ۱۱ لاکھ اور اندلس کی چھ کروڑ تھی۔

جبل قرطبہ سے تین میل کے فاصلے سے تمام شہر میں جستی نلوں کے ذریعے پانی لایا گیا تھا۔ امراء کے محلات میں سنگ مرمر کے سقاوے تھے اور ٹوٹیاں سنہری اور روپہلی لگی ہوئی تھیں۔ فوارے جا بجا نصب تھے۔ فصیل قرطبہ سلطان عبدالرحمٰن الداخل نے تعمیر کروائی۔ فصیل کا محیط چودہ میل تھا۔ فصیل میں نو درے تھے۔

وفات:

خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث الملقب بہ ناصرلدین اللہ نے مرتے وقت سلطنت اندلس کو اس حالت میں چھوڑا کہ عیسائی سلاطین جو سرحد پر تھے، اپنی سیکڑوں برس کی جدوجہد کے بعد مایوس و ناکام ہو کر سلطنت اسلامیہ اندلس کی غلامی و فرمانبرداری کا اقرار کرنے پر مجبور ہو کر اطاعت گزاری پر ہمہ وقت مستعد نظر آتے تھے اور غلاموں کی طرح دربار قرطبہ میں عرضیاں بھیجتے اور التجائیں کرتے تھے۔ جو عیسائی بادشاہ دور دراز کے ملکوں پر قابض و فرماں روا تھے، وہ بھی خلیفۂ اندلس کو رضا مند رکھنے کی کوششوں میں مصروف نظر آتے اور دربار قرطبہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات پر فخر کرتے تھے۔ مراکش کا ملک اندلس کی حکومت میں شامل تھا۔ تمام بحر روم اور دوسرے سمندروں پر بھی اندلس کے بحری بیڑے کی حکومت تھی اور سمندروں میں کوئی طاقت اندلس کے جہاز کو نہیں روک ٹوک سکتی تھی۔ کوئی اندرونی خطرہ بھی باقی نہ رہا تھا۔

ولی عہد حکومت الحکم کی والدہ ملکہ مرجانہ بہت عالمہ فاضلہ عورت تھیں اور بہت بڑی شاعرہ بھی تھیں۔

ایک روز عبدالرحمٰن الناصر نے فصد لینے کے لیے طبیب کو بلایا۔ طبیب چاہتا تھا کہ نشتر لگائے۔ دفعتاً ایک مینا اڑتی ہوئی آئی اور مکان کے اندر سونے کے گلدستے پر جو قریب رکھا تھا، بیٹھ گئی اور یہ شعر پڑھا ؎

ایها الفاصد رفقاً — با میر المومنینا
انما تفصد عرقاً — فیه محی العالمینا

''یعنی اے فصد کھولنے والے! نرمی سے امیرالمؤمنین کی فصد کھولنا۔ اس لیے کہ جس رگ پر تو نشتر لگانا چاہتا ہے یہ رگ اس کی ہے جو زندہ کرنے والا عالموں کا ہے۔''

یہ شعر سن کر سلطان پھڑک اٹھا۔ پوچھا یہ کس کی مینا ہے؟ کسی نے کیا جواب دینا تھا، خود مینا نے جواب میں کہا میں ملکہ مرجانہ کی مینا ہوں۔ عبدالرحمٰن الناصر بہت خوش ہوا اور بطور تحفہ اپنی بی بی مرجانہ کو تیس ہزار دینار دیے۔

خلیفہ حکم بن عبدالرحمٰن الثالث

اپنے باپ کی وفات کے تیسرے روز حکم ۵ ر رمضان المبارک سنہ ۳۵۰ھ کو بعمر ۴۸ سال قصرالزہرا میں تخت خلافت پر بیٹھا۔ وزراء، سپہ سالاران فوج، امراء، علماء اور اراکین سلطنت بیعت کے لیے حاضر دربار ہوئے۔ قاضی القضاۃ اور دوسرے قاضیوں نے اول بیعت کی۔ اس کے بعد خلیفہ کے بھائیوں اور شہزادوں نے رسم بیعت ادا کی۔ اس کے بعد وزراء و امراء اراکین سلطنت نے اقرار اطاعت کیا۔ صوبوں کے عامل جو قرطبہ میں حاضر ہو سکے تھے، انھوں نے اصالتاً شرف بیعت حاصل کیا۔ باقی لوگوں کے پاس ملک کے صوبوں اور بڑے بڑے شہروں میں بیعت لینے کے لیے خلیفہ نے وکلا روانہ کیے۔ قصر شاہی کے خادموں اور غلاموں نے بھی بیعت کی۔ تخت نشینی کی رسم بڑی دھوم دھام اور شان و شکوہ کے ساتھ ادا ہوئی۔ خلیفہ حکم ثانی نے اپنا لقب مستنصر باللہ تجویز کیا۔ جعفر مصحفی کو اپنا حاجب مقرر کیا۔

نظم و نسق کا جائزہ:

اس کے بعد خلیفہ حکم نے خصوصی توجہ کے ساتھ سلطنت کے تمام صیغوں اور محکموں کا جائزہ لیا۔ ہر ایک وزیر کے دفتر کا معائنہ کیا۔ فوج کے رجسٹروں کو جانچا اور افواج شاہی کی موجودات (حاضری) لی۔ غرض نہایت احتیاط کے ساتھ سلطنت کی جزئیات تک سے اپنے آپ کو واقف و آگاہ بنایا۔ حالانکہ وہ پہلے سے بھی سلطنت کے کاموں سے نہ آشنا تھا اور ہر صیغہ کی نگرانی کر چکا تھا۔ اپنے علم و واقفیت کی تجدید کر لینے کے بعد اس نے ہر ایک اہل کار کے پاس اس کے مامور و مستقل ہونے کے پروانے روانہ کیے۔ گویا ہر ایک اہل کار کو اس نئے خلیفہ نے از سر نو اس کی خدمت پر مامور کیا۔ اس طرز عمل سے نئے خلیفہ کی بیدار مغزی اور مستعدی کا سکہ دلوں پر بیٹھ گیا۔

سرحدی عیسائی سلاطین کی بغاوتیں:

خلیفہ حکم کو بچپن سے کتابیں پڑھنے اور علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر

کا ایک بڑا حصہ گزر چکا تھا۔ بڑے بڑے علماء وفضلاء اس کے سامنے کوئی علمی تقریر کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ دنیا کے کسی ملک اور کسی تخت سلطنت پر غالباً ایسا ذی علم اور تبحر بادشاہ نہیں بیٹھا۔ حکم ثانی کے علم وفضل اور مطالعہ کتب کی حکایتیں چونکہ پہلے ہی سے دور دور تک مشہور تھیں، اس لیے اس کے تخت نشین ہونے کی خبر سن کر عیسائی سرحدی سلاطین کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اپنے باپ کی طرح ایک بہادر صعوبت کش سپہ سالار ثابت نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ انھوں نے سرکشی اور طغیان کا اظہار کیا۔

بادشاہ قسطلہ نے اسلامی سرحدی شہروں پر دست درازی اور حملہ آوری شروع کر دی۔ خلیفہ حکم نے یہ حال سن کر اپنی تخت نشینی کے پہلے ہی سال میں بذات خود قسطلہ کی جانب فوج کشی کی اور عیسائیوں کو شکست فاش دے کر جلیقیہ کے ملک میں دور تک داخل ہو کر اور اقرار اطاعت لے کر واپس آیا۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ جلیقیہ کے سرکش عیسائی اس تنبیہ کو کافی نہ سمجھ کر شورش وفساد پر پھر آمادہ ہیں۔ چنانچہ خلیفہ حکم نے اپنے آزاد کردہ غلام غالب کو سپہ سالار افواج سرحد بنا کر روانہ کیا اور جلیقیہ والوں کی سرکوبی کے لیے تاکید کر دی۔ غالب نے وہاں پہنچ کر عیسائی افواج کو اپنی فوج سے کئی گنا زیادہ دیکھا مگر اس نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے حملہ کیا۔ سب کو شکست فاش دے کر بھگایا اور حکومت قسطلہ کے ایک بڑے حصے کو تاراج اور قلعوں کو منہدم کر کے قرطبہ کی جانب واپس ہوا۔

ابھی چند ہی روز گزرے ہوں گے کہ شانجہ کے باغی ہونے کی خبر پہنچی۔ اس کی مدد کے لیے لیون، نوار اور قسطلہ وغیرہ کئی عیسائی حکومتوں کی فوجیں مجتمع ہو گئیں۔ خلیفہ حکم نے یعلی بن محمد حاکم سرقسطلہ کو لکھا کہ تم ان باغیوں کی سرکوبی کا کام انجام دو۔ چنانچہ یعلی بن محمد نے تنہا ان افواج گراں کا مقابلہ بڑی بہادری اور قابلیت کے ساتھ کیا اور سب کو شکست دے کر خلیفہ حکم کی خدمت میں مع مال غنیمت حاضر ہوا۔ یعلی بن محمد ابھی قرطبہ ہی میں فروکش تھا کہ حاکم برشلونہ کے باغی ہونے کی خبر پہنچی اور ساتھ ہی معلوم ہوا کہ حاکم قسطلہ بھی پھر سامان بغاوت فراہم کر رہا ہے۔ خلیفہ حکم نے یعلی بن محمد کو برشلونہ کی جانب روانہ کیا اور غالب و ہذیل بن ہاشم کو حاکم قسطلہ کی سرکوبی پر مامور فرمایا۔ دونوں فوجیں برشلونہ وقسطلہ کی جانب روانہ ہوئیں اور دونوں جگہ عیسائیوں کو سخت نقصان اٹھا کر اقرار اطاعت پر مجبور ہونا پڑا۔

خلیفہ حکم کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں جب عیسائیوں کو پیہم ناکامیاں ہوئیں تو ان کی ہمتیں پست ہو گئیں اور ان کو یقین ہو گیا کہ خلیفہ حکم ثانی اپنے باپ سے کسی طرح عزم وقوت میں کم نہیں ہے۔ سنہ ۳۵۴ھ میں ایک مرتبہ پھر سرحدی عیسائیوں میں کشمکش اور سرکشی کے حالات نمایاں ہوئے مگر یعلی بن محمد اور قاسم بن مطرف نے سب کو سیدھا کر دیا۔ اسی سال نارمن لوگوں نے جزیرہ نمائے اندلس کے مغربی ساحل پر حملہ کر کے شہر بشونہ (بسن) کے نواح میں تاخت وتاراج شروع کی۔ خلیفہ کو جب اس کا حال معلوم ہوا تو اس نے اپنے امیر البحر عبدالرحمٰن بن رباحس کو حکم دیا کہ ان قزاقوں کو بھاگنے نہ دے اور خود فوج لے کر قرطبہ سے بسن کی جانب

روانہ ہوا مگر خلیفہ اور امیر البحر عبدالرحمٰن کے پہنچنے سے پہلے ہی ان قزاقوں کو وہاں کے باشندوں نے مقابلہ کر کے خشکی اور سمندر سے بھگا دیا تھا۔ نہ خشکی میں کوئی شخص نظر آیا، نہ ان کا کوئی جہاز ساحل پر موجود پایا گیا۔

عیسائی بادشاہوں کی مرعوبیت:

شانجہ کا چچازاد بھائی اردونی جو فردی نند حاکم قسطلہ کا داماد بھی تھا ریاست لیون کا فرماں روا تھا۔ جب شانجہ کو خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کی فوجوں نے لیون کا حاکم بنا دیا تو اردونی اپنے خسر فردی نند کے پاس چلا گیا تھا۔ اب اردونی نے جلیقیہ سے اپنے بیس ہمراہیوں کے ساتھ خلیفہ حکم کی خدمت میں حاضر ہونے اور فریاد کرنے کا قصد کیا۔ چنانچہ سنہ ۳۵۵ھ میں اردونی شاہ لیون شہر سالم میں مع اپنے ہمراہیوں کے پہنچا تو امیر غالب محافظ حدود شمالی نے اس کو روکا اور کہا کہ تم ممالک محروسہ اسلامیہ میں بلا اطلاع و اجازت کیسے داخل ہوئے؟ اردونی سابق بادشاہ لیون نے کہا کہ میں امیر المؤمنین کا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ میں اپنے آقا کے پاس جاتا ہوں۔ میں نے کسی اجازت اور اطلاع کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ تاہم غالب نے اس کو وہیں شہر سالم میں روک کر دربار خلافت کو اطلاع دی۔ یہاں سے اردونی کے آنے کی اجازت مرحمت ہوئی اور ساتھ ہی اس کے استقبال کے لیے ایک سردار کو روانہ کر دیا گیا۔

چنانچہ اردونی شہر قرطبہ کے قریب پہنچ گیا ازاں بعد شہر میں داخل ہوا، پھر جب وہ خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کی قبر کے سامنے پہنچا تو خود بخود فوراً گھوڑے سے اتر کر قریب پہنچا اور دیر تک دعا کرتا رہا اور قبر کو سجدہ کر کے آگے روانہ ہوا۔ خلیفہ حکم نے اردونی کو اجازت دی کہ وہ سفید لباس پہن کر، جو بنوامیہ میں عزت کا لباس سمجھا جاتا تھا، داخل دربار ہو۔ شہر طلیطلہ کا اسقف عبداللہ بن قاسم اور قرطبہ کے عیسائیوں کا مجسٹریٹ ولید بن خیرون اس کے ہمراہ برائے ادب آموزی و رہبری موجود تھے۔ اردونی جب دربار میں حاضر ہوا تو خلیفہ کے سامنے پہنچنے سے پہلے ہی اس مکان کی عظمت و ہیبت سے مرعوب ہو کر اور ٹوپی اتار کر دیر تک حیران و ششدر کھڑا رہا۔ ہمراہیوں نے آگے بڑھنے کے لیے اشارہ کیا۔ جب تخت کے سامنے پہنچا تو بے اختیار سجدے میں گر پڑا، پھر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر کسی قدر آگے بڑھا اور پھر سجدے میں گر پڑا۔ اسی طرح سجدے کرتا ہوا اس مقام تک پہنچا جو اس کے لیے مقرر کیا گیا تھا اور اس کرسی پر جو اس کے لیے بچھائی گئی تھی، بیٹھا۔ اب اس نے ولید بن خیرون کے اشارے پر کئی مرتبہ بولنے کی کوشش کی۔ اس پر اس قدر رعب طاری تھا کہ کچھ نہ بول سکا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر خلیفہ حکم کچھ دیر خاموش رہا تا کہ اس کو اپنے حواس بجا کرنے کا موقع ملے، پھر اس کے بعد خلیفہ نے کہا کہ:

''اے اردونی ہم تیرے یہاں آنے سے بہت خوش ہوئے، ہمارے الطاف خسروانہ سے تیری خواہشات پوری ہوں گی۔''

اردونی نے خلیفہ کا یہ کلام سن کر فرط مسرت سے اٹھ کر تخت کے سامنے سجدہ کیا اور نہایت عاجزی سے عرض کیا: ''اے میرے آقا! میں حضور کا ادنیٰ غلام ہوں۔'' خلیفہ نے فرمایا کہ ''ہم تجھ کو خیر خواہانِ دولت میں شمار کرتے ہیں اور تیری درخواستوں کو منظور کرتے ہیں۔ اگر کوئی خواہش ہو تو بیان کر۔'' اردونی یہ سن کر پھر دیر تک تخت کے سامنے سجدے میں پڑا رہا اور اس کے بعد نہایت عاجزی کے ساتھ عرض کیا کہ شانجہ میرا چچا زاد بھائی اس سے پہلے سابق خلیفہ کی خدمت میں اس طرح حاضر ہوا تھا کہ اس کا کوئی یار و مددگار نہ تھا اور رعایا اس سے خوش نہ تھی۔ خلیفہ مرحوم نے اس کی التجا سنی اور اس کو بادشاہ بنا دیا۔ میں نے خلیفہ مرحوم کے حکم اور فیصلے کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی اور ملک چھوڑ دیا۔ حالانکہ رعایا مجھ سے خوش تھی۔ میں اس وقت اپنے دلی جوش اور عقیدت کے ساتھ حاضر ہوا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ خلیفۂ وقت میرے استحقاق پر نظر کر کے میرا ملک مجھ کو مرحمت فرمائیں گے۔ خلیفہ نے یہ سن کر فرمایا کہ ہم تیرا مدعا سمجھ گئے ہیں۔ اگر شانجہ کے مقابلے میں تیرا استحقاق فائق ہے تو ضرور ملک تجھ کو ملے گا۔ یہ سن کر اردونی نے پھر سجدہ کیا۔ خلیفہ نے دربار برخاست کیا اور اردونی کو اس کی قیام گاہ پر عزت و آرام کے ساتھ پہنچا دیا گیا۔ اردونی کو قصر سلطان کے ایک مغربی حصے کے بالا خانے پر ٹھہرایا گیا تھا۔ وہاں جاتے ہوئے راستے میں اردونی نے ایک تخت بچھا ہوا دیکھا جس پر خلیفہ کبھی کبھی بیٹھ جاتا تھا۔ اس خالی تخت کو دیکھ کر اردونی نے اسی طرح سجدہ کیا کہ گویا خلیفہ اس پر بیٹھا ہے۔ اس کے بعد خلیفہ کے وزیر اعظم جعفر نے آ کر اردونی کو خلیفہ کی طرف سے ایک مکلّف خلعت دیا۔ اس طرح چند روز مہمان رکھ کر اپنے جید سرداروں کے ساتھ اسے واپس روانہ کیا کہ اس کو آبائی ریاست میں تخت نشین کر آئیں۔ اس کے بعد شانجہ اور سمورہ جلیقیہ کے رئیسوں نے بھی اظہار فرماں برداری کے لیے عرضیاں روانہ کیں اور بیش بہا تحفے بطور نذرانہ روانہ کیے۔ برشلونہ وطرکونہ کے حاکموں نے بھی قیمتی نذرانے اور خراج روانہ کر کے اظہار عقیدت کیا۔

ازاں بعد فرانس، اٹلی اور یورپ کے دوسرے عیسائی سلاطین نے جس طرح خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کی خدمت میں اپنے سفیر اور تحائف بھیجتے تھے، ویسے ہی خلیفہ حکم کا رعب بھی اپنے باپ کی طرح قائم ہو گیا۔ مغربی جلیقیہ کے عیسائی فرماں روا نے، جو ان دنوں بہت طاقتور تھا اور جس کا نام لرزیق تھا، اپنی ماں کو خلیفہ حکم کی خدمت میں روانہ کیا۔ خلیفہ نے مادر لرزیق کو عزت کے ساتھ دربار میں باریاب کیا اور اس کی خواہش کے موافق اس کے بیٹے کے لیے سند امارت و حکومت لکھ دی۔

مراکش کے حاکم کی بغاوت:

سنہ ۳۱۶ھ میں مراکش کے ادریسی حاکم نے جو خلیفہ قرطبہ کی طرف سے وہاں پر مامور تھا، بربریوں کی جمعیت کثیر فراہم کر کے سرکشی و خود مختاری کا اعلان کیا۔ خلیفہ نے سرقسطہ کے حاکم یعلی بن امیہ کو مراکش کی جانب روانہ کیا۔ اندلسی فوج کشی کا حال سن کر حاکم مراکش نے معز عبیدی سے اعانت طلب کی اور اس کی فرماں برداری

واطاعت کو قبول کر لیا۔ ادھر سے امیر جوہر فوج لے کر مراکش پہنچ گیا۔ معرکہ کارزار گرم ہوا۔ یعلی بن محمد اس معرکہ میں کام آیا اور یہ مہم ناکام رہی۔

اس خبر کو سن کر دربار قرطبہ میں فکر وملال کے آثار نمایاں ہوئے۔ خلیفہ نے اپنے آزاد کردہ غلام امیر غالب کو مراکش روانہ کیا۔ غالب کے پہنچنے پر جوہر تو مصر کی جانب چل دیا اور حسن حاکم مراکش مقابلے پر آمادہ ہوا۔ کئی معرکوں کے بعد غالب نے حسن کو ایک قلعے میں محصور کر کے اس بات پر مجبور کر لیا کہ وہ بلا شرط اپنے آپ کو غالب کے سپرد کر دے۔ چنانچہ غالب نے حاکم مراکش کو قرطبہ روانہ کیا۔ خلیفہ نے اس کے ساتھ عزت و محبت کا برتاؤ کیا اور بطور مہمان قرطبہ میں مقیم کر کے روزینہ مقرر کر دیا۔ چند روز کے بعد اس کی خواہش کے موافق اسے اسکندریہ کی جانب بھیج دیا۔ غالب نے ایک سال مراکش میں قیام کر کے وہاں کے تمام انتظام کو مضبوط ومکمل کیا اور سنہ ۳۶۳ھ میں مراکش کے بہت سے قیدیوں کو ہمراہ لیے ہوئے قرطبہ واپس آیا۔ جہاں اس کا بڑا شاندار استقبال کیا گیا۔

ولی عہدی:

سنہ ۳۶۵ھ میں اس خلیفہ نے اپنے بیٹے ہشام کو ولی عہد خلافت بنا کر امراء و وزراء اور ارا کین سلطنت سے بیعت لی اور تمام ممالک محروسہ میں عالموں سے بیعت ولی عہدی وکالتاً لی گئی۔

وفات:

۲ / ماہ صفر سنہ ۳۶۶ھ کو سولہ سال کی حکومت کرنے کے بعد ۶۴ سال کی عمر میں خلیفہ حاکم ثانی نے بعارضہ ''فالج'' قرطبہ میں وفات پائی۔ اس کی وفات کے وقت اس کے بیٹے ہشام کی عمر گیارہ سال کے قریب تھی۔ خلیفہ حکم ہی نے ولی عہدی کے وقت اس کا وزیر محمد بن ابی عامر کو تجویز کر دیا تھا۔ اگلے روز ہشام تخت نشین ہوا۔

خلیفہ حکم ثانی کے دور پر تبصرہ:

خلیفہ حکم ثانی کا اندلس کے نہایت نامور اور مشہور علماء میں شمار ہوتا ہے۔ اگر اس خلیفہ کے زمانے میں لڑائیوں اور چڑھائیوں کے مواقع زیادہ موجود ہوتے تو وہ یقیناً اعلیٰ درجہ کا سپہ سالار ثابت ہوتا مگر اس کے عہد حکومت میں بہت ہی کم مگر بہت اہم ہنگامے جنگ وجدل برپا ہوئے۔ جن میں عموماً لشکر اندلس کو کامیابی اور فتح مندی حاصل ہوئی۔

زیادہ وقت اس خلیفہ کا علمی مشاغل میں صرف ہوا۔ اس خلیفہ کا وزیر جعفر بھی ہارون الرشید کے وزیر جعفر برمکی سے کم لائق نہ تھا۔ خلیفہ نے انتظام ملکی کے متعلق اس کے اختیارات کو وسیع کر کے اپنے لیے علمی

مشاغل کا وقت بہت کچھ نکال لیا تھا۔ اس خلیفہ کے زمانے میں بے جا مذہبی تعصب بالکل نہیں رہا تھا۔ ہر قوم و مذہب کے آدمی کو اندلس میں کامل آزادی حاصل تھی۔ تنگ دلی اور پست خیالی کا نام ونشان تک دربار قرطبہ میں نہیں پایا جاتا تھا۔ عدل وانصاف کے قائم رکھنے کا اس خلیفہ کو بہت زیادہ خیال تھا۔ تمام رعایا خلیفہ سے خوش اور ہر طبقہ میں اس کی محبت وعظمت بے شائبۂ ریا موجود تھی۔

خلیفہ احکام قرآنی کا سختی سے پابند تھا اور مسلمانوں سے اس کی پابندی کراتا تھا۔ اس سے پہلے اندلس کے فوجی لوگوں میں شراب نوشی کا عیب بھی پایا جانے لگا تھا۔ اس خلیفہ نے شراب کا بنانا، بیچنا، استعمال کرنا قطعاً ممنوع اور جرم عظیم قرار دے کر اس پلیدی سے اپنے ملک کو پاک کیا۔ خلیفہ کی طرف سے ایک بڑی رقم روزانہ خیرات کی جاتی تھی۔ جابجا ملک کے بڑے بڑے شہروں میں کالج اور دارالعلوم قائم کیے۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہات میں بھی مدرسے موجود تھے۔ طلباء کے اکثر مصارف شاہی خزانے سے ادا ہوتے تھے۔ جو طالب علم باہر سے آتے تھے وہ جب تک اندلس کے اندر تحصیل علم میں مصروف رہتے، خلیفہ کے مہمان سمجھے جاتے تھے۔ سررشتۂ تعلیم کا اعلیٰ افسر خلیفہ نے اپنے بھائی منذر کو مقرر کیا تھا۔

حکم ثانی کا ذوق علمی:

خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے الحکم کی تعلیم وتربیت علامہ عثمان ساکن بلنسیہ سے دلوائی۔ علامہ عثمان مصحفی کا باپ تھا۔ دیگر یہ کہ حکم عالم شہزادگی میں بالعموم علمائے دربار کی صحبت میں زیادہ تر وقت گزارا کرتے تھے۔ شہزادے کو کتب بینی کا بہت شوق تھا۔ ذہین طبع، خوش مذاق، متواضع، علماء کا احترام کرنے والا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی طبیعت میں انصاف اور رواداری کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ غیر متعصب تھا۔ مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ حسن سلوک روا رکھتا تھا۔ اس نے عقلی علوم کی طرف غیر معمولی توجہ کی۔ مصر اور بغداد سے ان علوم کی کتابیں منگوا منگوا کر اس کثرت سے جمع کیں کہ خلفائے عباسیہ کا دور حکومت اپنے علمی ساز وسامان کے ساتھ لوگوں کی نگاہوں کے سامنے آگیا۔ علامہ ابن صاعد اندلسی نے لکھا ہے:

> ''اس نے بغداد، مصر اور ان کے علاوہ دیار مشرق سے علوم قدیمہ وجدیدہ کی نہایت عمدہ کتابیں منگوائیں اور ان کو اپنے باپ کی بقیہ زندگی کے زمانے میں پھر اس کے بعد اپنے دور حکومت میں اس طرح جمع کیا کہ وہ خلفائے عباسیہ کے اس علمی سرمایہ کی ہمسری کرنے لگا، جو انھوں نے ایک طویل زمانے میں جمع کیا تھا، اور اس کی یہ سرگرمی صرف اس لیے تھی کہ اس کو علم سے محبت تھی۔ کسب کمالات میں نہایت بلند ہمت تھا اور ان سلاطین کے مشابہ بننا چاہتا تھا جو بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم بھی تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے اس کے زمانے میں متقدمین کی کتابوں کے پڑھنے کی طرف نہایت شدت سے توجہ کی اور ان کے مذاہب کی تعلیم حاصل کی۔'' (طبقات الامم لابن صاعد اندلسی: ص۳۴۲)

مستشرق دانش ورڈوزی نے لکھا ہے:

''گو خلیفہ الحکم کے بزرگ بھی عالم اور علم دوست اور کتابیں جمع کرنے کے شائق تھے لیکن الحکم کے برابر عالم و فاضل بادشاہ اندلس میں نہیں گزرا۔ نہ علوم و معارف میں کسی کو اتنی قدرت ہوئی اور نہ کسی نے اتنی کتابیں اکٹھی کیں۔ خلیفہ کے ملازمین قاہرہ، دمشق، بغداد اور اسکندریہ میں موجود رہتے۔ یہ لوگ کتابیں نقل کرتے یا ان کو خرید لیتے تھے قطع نظر اس کے کہ کتاب پرانی ہے یا نہیں، جس قیمت پر ملتی خرید لی جاتی۔ ان نادر خزانوں سے الحکم کا قصر معمور تھا۔ ہر طرف کاتب، خطاط اور جلد ساز بیٹھے کام کرتے تھے۔''

خلیفہ حکم ثانی کو تمام علوم مروجہ میں دست گاہ حاصل تھی۔ کتابوں سے اس کو عشق تھا۔ دمشق، بغداد، قسطنطنیہ، قاہرہ، قیروان، مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ وغیرہ ان تمام مقامات میں جہاں علم کا چرچا تھا، خلیفہ حکم کے گماشتے موجود رہتے تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ جو اچھی نایاب کتاب پائیں اس کو خریدیں اور خلیفہ حکم کے پاس بھیج دیں۔ مصنفین کو ترغیب دیں کہ وہ اپنی تصنیف کا پہلا نسخہ خلیفہ کے پاس بھیجیں۔ علماء کو قرطبہ جانے کی ترغیب دیں، جہاں ان کی فراخ دلی کے ساتھ قدر و منزلت بڑھائی جاتی تھی چنانچہ وہ روزگار کے مسائل اور مال و دولت کے حصول کے جھنجھٹوں سے بے نیاز ہو جاتے تھے۔ کسی کتاب کے حاصل کرنے میں چاہے کتنی ہی مصیبت برداشت کرنی پڑے اور اشرفیوں کی چاہے کتنی ہی تھیلیاں خالی کرنی پڑیں، حکم کے کتب خانے کے لیے وہ کتاب ضرور ہی خریدی جاتی تھی۔ ہر ایک شہر میں خلیفہ حکم کی طرف سے لوگ صرف اسی کام پر متعین تھے کہ وہ کتابوں کی نقلیں کر کے قرطبہ میں بھیجیں۔ دنیا کے تمام بادشاہوں سے خلیفہ حکم کے مراسم تھے اور ان سب کے شاہی کتب خانوں میں نقل کرنے والے لوگ خلیفہ حکم کی طرف سے موجود رہتے تھے کہ تمام نایاب کتابوں کی نقلیں حاصل کریں۔

روئے زمین کے ہر ایک ملک اور ہر ایک شہر میں اس بات کی شہرت ہو گئی تھی کہ قرطبہ کا خلیفہ سب سے زیادہ مصنفین کا قدردان ہے۔ اس لیے بہت سے ایسے مصنفین تھے جو بغداد یا بصرہ وغیرہ میں رہتے تھے مگر اپنی کتابیں خلیفہ حکم کے نام سے معنون کر کے دربار قرطبہ میں بھیجتے تھے۔ یونانی اور عبرانی کتابوں کے ترجمے کرانے کے لیے سیکڑوں، ہزاروں علماء کا ایک زبردست محکمہ بنا دیا گیا تھا۔ اندلس بالخصوص قرطبہ کے ہر ایک شریف آدمی کو کتاب کا شوق ہو گیا تھا اور ہر گھر میں ایک کتب خانہ موجود ملتا تھا۔ صرف قرطبہ ہی میں نہیں بلکہ اندلس کے ہر ایک بڑے شہر میں ایک بڑا کتب خانہ سرکاری اہتمام سے موجود تھا۔ ہر ایک شخص جو امیر المومنین کی خدمت میں عزت و رسوخ حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ کوئی نایاب اور مفید کتاب بطور ہدیہ لے کر حاضر خدمت ہوتا تھا۔

حکم کا ذاتی کتب خانہ:

خلیفہ حکم کا ذاتی کتب خانہ اس قدر عالی شان تھا کہ اس کی عمارت قصر شاہی سے کم وسیع و شاندار نہ

تھی۔ اس کتب خانے کی عمارت کو سنگ مرمر سے بنایا گیا تھا۔ سنگ مرمر ہی کا خوبصورت فرش تھا، جس پر سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کی پچی کاری تھی۔ صندل، آبنوس اور اسی قسم کی قیمتی لکڑیوں کی الماریاں تھیں۔ ہر ایک الماری پر سنہرے حرفوں سے لکھا ہوا تھا کہ کس علم و فن کی کتابیں ہیں۔ اس دارالکتب میں ہزار ہا جلد ساز اور کاتب مصروف کار رہتے تھے۔ کتابوں کی تعداد چھ لاکھ کے قریب تھی۔

کتب خانے کی فہرست:

المستنصر باللہ (الحکم) کے کتب خانے کی فہرست چوالیس جلدوں میں تھی اور ہر جلد میں پچاس ورق تھے۔ ان جلدوں میں صرف کتابوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ بعض مصنفوں نے لکھا ہے کہ کتابوں کی تعداد چار لاکھ تھی، بقول بعض چھ لاکھ تھی، اور تمام کتابوں کو الحکم نے خود پڑھا تھا۔ ان میں سے اکثر پر الحکم نے نہایت محنت سے حواشی لکھے تھے۔ ادبیات عرب یعنی فن رجال، اخبار و انساب میں خلیفہ الحکم اپنا مثل نہ رکھتا تھا۔

(عبرت نامہ اندلس: ص ۸۸)

ایران اور شام میں جو کتابیں لکھی جاتی تھیں، مشرق میں ابھی کوئی ان کو پڑھنے بھی نہ پاتا تھا کہ خلیفہ کو ان کی خبر لگ جاتی تھی۔ چنانچہ ابوالفرج اصفہانی کو عراق میں کتاب الاغانی کی تالیف کے دوران جس میں عرب شعراء اور مغنیوں کے حالات لکھ رہا تھا، الحکم نے ایک ہزار دینار اس درخواست کے ساتھ بھیجے کہ کتاب ختم ہوتے ہی اس کی نقل فوراً قرطبہ روانہ کر دی جائے۔

علماء کے حق میں خواہ وہ اندلس کے ہوں یا باہر کے مستنصر باللہ نہایت سخی اور دریا دل تھا چنانچہ یہی وجہ تھی کہ اس کے دربار میں اہل علم کا مجمع لگا رہتا تھا۔ خلافت پناہی نہ صرف علماء کو بلکہ فلسفیوں کو بھی اپنی پناہ میں لے لیتے تھے تاکہ وہ متعصب لوگوں سے بے خوف ہو کر تحصیل علم میں مصروف رہیں۔ ایسے معارف پرست اور علم دوست بادشاہ کے سایۂ عاطفت میں تمام علوم و فنون کو برابر ترقی ملتی رہی۔ ابتدائی مدارس اچھے تھے اور تعداد میں بھی بہت تھے۔ اندلس کا ہر متنفس لکھنا پڑھنا جانتا تھا، لیکن اس کے مقابلے میں مسیحی یورپ میں سوائے بڑے درجے کے لوگوں یا پادریوں کے سب ناخواندہ ہوتے تھے۔ بادشاہ الحکم نے غریبوں کے بچوں کی تعلیم کے خیال سے ۲۷ مدرسے ایسے کھول دیے کہ جن میں غریبوں کے بچے مفت تعلیم حاصل کرتے تھے۔ معلموں کی تنخواہ بادشاہ کے صرف خاص سے ملتی تھی۔ جامع مسجد قرطبہ میں جہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا، ابوبکر بن معاویہ قرشی حدیث پڑھاتے تھے۔ ابوعلی القالی بغدادی نے ایک بڑی مستند کتاب زبانی لکھوا ڈالی۔ نحو کی تعلیم ابن القوطیہ دیتے تھے۔ اس دارالعلوم میں ایسے طلباء کی تعداد جو ان علماء کے درس میں حاضر ہوتے تھے، ہزار ہا ہوتی تھی۔ اکثر طلباء فقہ پڑھتے تھے کیونکہ اس علم کے باعث انھیں سلطنت میں عہدے ملتے تھے۔ (المقری: ۱/۱۳۶)

ہر ایک کتاب کے پہلے ورق پر خلیفہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا مصنف اور کتاب کا نام اور مصنف کا شجرہ

نسب درج ہوتا تھا۔ خلیفہ حکم کی قوت حافظہ بہت زبردست تھی۔ ساتھ ہی وہ اعلیٰ درجے کا ذہین ونقاد بھی تھا۔ ہر قسم کی نظم ونثر بلا تکلف لکھتا تھا۔

حکم کی تصنیف:

فن تاریخ سے اس خلیفہ کو بہت لگاؤ تھا۔ اندلس کی ایک تاریخ اس خلیفہ نے خود لکھی تھی مگر وہ زمانے کی دست برد سے ضائع ہو گئی۔ روئے زمین کے علماء خواہ وہ کسی قوم اور کسی مذہب اور کسی علم وفن سے تعلق رکھتے ہوں قرطبہ کی طرف کھنچ کھنچ کر چلے آئے تھے۔ غرضیکہ خلیفہ حکم کے زمانے میں قرطبہ تمام علوم وفنون کا ایک بے مثال ولانظیر مرکز بن گیا تھا۔

مشاہیر علماء اور اہل کمال کی قدردانی:

ابوعلی قالی بغدادی مصنف کتاب الامالی عبدالرحمٰن ثالث کے عہد میں وارد اندلس ہوا تھا۔ سلطان حکم اس بے نظیر عالم کو ایک دم کے لیے اپنے پاس سے جدا نہ کرتا تھا۔ ابوبکر الارزق جو اپنے زمانے کے مشہور عالم اور سلمہ بن عبدالملک بن مروان کے خاندان سے تھا وہ سنہ ۳۴۹ھ میں قرطبہ پہنچا اور ۵۸ سال کی عمر میں بماہ ذیقعدہ سنہ ۳۸۵ھ میں فوت ہو کر قرطبہ میں مدفون ہوا۔ خلیفہ حکم اس کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اسماعیل بن عبدالرحمٰن بن علی جو ابن زمع کے خاندان سے تھا، قاہرہ سے اندلس آیا اور خلیفہ حکم کے علمائے دربار میں شامل ہوا۔ ثقر البغدادی اور قیاس بن عمر وغیرہ مشہور خوش نویس تھے، جن کی خلیفہ حکم بڑی قدر کرتا تھا۔ ابوالفرج اصفہانی اور ابوبکر مالکی کے پاس ایک ایک ہزار دینار سرخ خلیفہ نے بھیجے۔ ابوعبداللہ محمد بن عبدون عذری دربار قرطبہ کا اعلیٰ درجے کا طبیب تھا۔ محمد بن مفرج فقہ اور حدیث کا مشہور عالم تھا۔ ابن مغیث، احمد بن عبدالملک، ابن ہشام القوی، یوسف بن ہارون، ابوالولید یونس اور احمد بن سعید ہمدانی مشہور شعراء تھے۔ محمد بن یوسف درانی نے خلیفہ حکم کے حکم سے افریقہ کی تاریخ مع جغرافیہ لکھی تھی۔ عیسیٰ بن محمد، ابوعمر احمد بن فرج، یعیش بن سعید خلیفہ حکم کے عہد میں مشہور مؤرخ اور زبردست عالم تھے جو دربار قرطبہ کی رونق تھے۔

علم نوازی کی مثال:

خلیفہ حکم کی علم دوستی اور عالم نوازی کی ایک حکایت قابل تذکرہ ہے کہ ایک روز ابوابراہیم نامی ایک فقیہ مسجد ابوعثمان میں وعظ بیان کر رہا تھا۔ اسی حالت میں شاہی چوب دار آیا اور اس نے ابوابراہیم سے کہا کہ امیر المومنین نے آپ کو اسی وقت بلایا ہے اور وہ باہر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ابوابراہیم نے کہا کہ تم امیر المومنین سے کہہ دو کہ میں اس وقت اللہ کے کام میں مصروف ہوں۔ جب تک اس کام سے فارغ نہ ہو لوں،

نہیں آ سکتا۔ چوب دار اس جواب کو سن کر حیران رہ گیا اور ڈرتے ڈرتے جا کر خلیفہ کی خدمت میں ابوابراہیم کا جواب عرض کیا۔ خلیفہ حکم نے سن کر چوب دار سے کہا کہ تم جا کر ابوابراہیم سے کہہ دو کہ میں اس بات کو سن کر بہت خوش ہوا کہ آپ اللہ کے کام میں مصروف ہیں۔ جب اس کام سے فارغ ہو جائیں تو تشریف لائیں۔ میں اس وقت تک دربار میں آپ کا منتظر رہوں گا۔ چوب دار نے یہ پیغام آ کر ابوابراہیم کو سنایا۔ ابوابراہیم نے کہا کہ تم جا کر امیر المؤمنین سے کہہ دو کہ میں بڑھاپے کی وجہ سے گھوڑے پر سوار ہو سکتا ہوں نہ پیدل چل سکتا ہوں۔ باب السدہ یہاں سے زیادہ دور ہے مگر باب الصنع یہاں سے قریب ہے۔ اگر باب الصنع کے کھول دینے کی اجازت دیں تو میں اس دروازے سے بہ آسانی حاضر دربار ہو سکوں گا۔ باب الصنع ہمیشہ بند رہتا تھا اور کسی خاص موقع پر ہی اس کے کھولنے کی اجازت ہوتی تھی۔ ابوابراہیم اس کے بعد پھر اپنے وعظ میں مصروف ہو گیا اور چوب دار یہ پیغام بھی خلیفہ تک پہنچا کر خلیفہ کے حکم سے آ کر مسجد میں بیٹھ گیا۔ جب ابوابراہیم اپنا وعظ ختم کر چکا تو چوب دار نے عرض کیا کہ باب الصنع آپ کے لیے کھول دیا گیا ہے اور امیر المؤمنین آپ کے منتظر ہیں۔ ابوابراہیم جب باب الصنع پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہاں امراء و وزراء اس کے استقبال کے لیے موجود ہیں۔ دربار میں گیا اور خلیفہ سے باتیں کر کے اسی دروازے سے عزت و احترام کے ساتھ واپس چلا آیا۔

حکم کے عہد حکومت کی امتیازی خصوصیت:

حکم ثانی کو بجا طور پر اندلس کا سب سے بڑا خلیفہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے زمانے میں رعب و وقارِ سلطنت، امن و امان ملک، وسعت سلطنت، سرسبزی و شادابی، مال و دولت، تجارت وغیرہ سب چیزیں اپنے معراج کمال کو پہنچی ہوئی تھیں اور سب سے زیادہ قابل تعریف اور قابل توجہ چیز علم و تعلم کی گرم بازاری تھی۔ علم کا آفتاب قرطبہ کے آسمان پر نصف النہار کو پہنچا ہوا تھا اور یہ وہ فخر ہے کہ خلیفہ حکم ثانی کے مقابلے میں ہارون و مامون و منصور بھی پیش نہیں کیا جا سکتا۔ خلیفہ حکم عالم بادشاہوں اور علم پرور سلاطین کی انجمن کا صدر اعظم ہونے کی وجہ سے فرماں روایان عالم میں خصوصی امتیاز رکھتا ہے لیکن حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا باقی نہیں رہتی جب اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ ایسے ذی علم، ایسے ذی ہوش، ایسے عقلمند خلیفہ کے تمام علم و عقل کو محبت پدری نے مغلوب کر لیا اور اس نے اپنے ایسے بیٹے کو اپنا جانشین تجویز کیا جو اس کی وفات کے وقت صرف گیارہ سال کی عمر رکھتا تھا۔ خلافت و سلطنت میں وراثت کو دخل دینے کی لعنت سے محفوظ رہنے کی توقع اگر ہو سکتی تھی تو حکم ثانی جیسے سمجھ دار خلیفہ ہی سے ہو سکتی تھی۔ مگر صد افسوس ہے اس کی سوچ پر کہ وہ اس معاملے میں کامیاب ثابت نہیں ہوا اور مامون الرشید عباسی اس سے بازی لے گیا۔ اس نے اول تو اپنے خاندان کی بھی پروا نہیں کی اور ایک علوی کو اپنا ولی عہد بنایا لیکن جب وہ ولی عہد خلافت خلیفہ مامون کے سامنے ہی فوت ہو گیا تو اس کے بعد اس کا بھائی معتصم اس کا جانشین ہوا۔

خلیفہ حکم ثانی کا بھائی مغیرہ ہر ایک اعتبار سے حکومت وسلطنت کی قابلیت رکھتا تھا اور حکم ثانی کا بجا طور پر جانشین ہو سکتا تھا مگر حکم ثانی نے مغیرہ کو محروم رکھ کر اپنے نابالغ بیٹے کو ولی عہد بنا کر اپنے آپ کو خلفائے اندلس کا آخری خلیفہ بنایا۔ حکم کے بعد بھی برائے نام خاندان بنو امیہ میں چند روز خلافت وحکومت رہی مگر حقیقت یہ ہے کہ حکم ثانی کے فوت ہوتے ہی بنو امیہ کی حکومت وخلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ خلیفہ حکم نے اپنے بیٹے کو ولی عہد خلافت بناتے ہوئے محمد بن ابی عامر کو اس کا اتالیق تجویز کر دیا تھا لیکن اس اتالیقی یا وزارت کا تعلق شہزادہ ہشام کی جاگیر اور اس کے عہد ولی عہدی ہی سے تھا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ ہشام بن حکم تخت نشین خلافت ہونے کے بعد بھی محمد بن ابی عامر کو اپنا وزیر بنائے اور عہدہ حجابت عطا کرے کیونکہ ایک خلیفہ کے فوت ہونے سے اس کے حاجب کا معزول ہونا ضروری نہیں تھا، جب تک کہ نیا خلیفہ اس کو معزول نہ کر دے۔

ہشام ثانی بن حکم ثانی المؤید باللہ

سنہ ۳۶۶ھ جب کہ خلیفہ حکم ثانی فوت ہوا اور اس کا بیٹا ہشام ثانی ۱۱ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تو خلافت اسلامیہ اندلس میں مندرجہ ذیل اشخاص سب سے زیادہ طاقتور اور قابو یافتہ تھے:

① جعفر بن عثمان مصحفی حاجب السلطنت یا وزیر اعظم، یہ خلیفہ حکم کے عہد حکومت سے وزارت عظمیٰ کے اعلیٰ عہدے پر مامور چلا آتا تھا۔ چنانچہ اسے ذی علم، علم دوست اور سب سے زیادہ معزز شخص سمجھا جاتا تھا۔

② ملکہ صبح، یہ حکم ثانی کی عیسائی بیوی اور ہشام بن حکم کی ماں تھی۔ خلیفہ حکم ثانی کے عہد حکومت میں بھی یہ اکثر امور سلطنت کے میں دخیل اور خلیفۂ وقت پر قابو یافتہ تھی۔ خلیفہ حکم کو اس کی خاطر بہت عزیز تھی۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ولی عہد خلافت کی ماں تھی۔ ساتھ ہی بہت عقلمند اور چالاک عورت تھی۔

③ غالب، یہ سپہ سالار اعظم افواج اسلامیہ اندلس تھا۔ خلیفہ حکم ثانی کا آزاد کردہ غلام تھا۔ اس کے ساتھ فوج کے سپاہیوں اور شہروں کے باشندوں کو محبت تھی۔

④ محمد بن ابی عامر بن محمد بن عبداللہ بن عامر بن محمد ولید بن یزید بن عبدالملک معافری؛ اس کا جد اعلیٰ عبدالملک معافری طارق بن زیادہ فاتح اول کے ہمراہ وارد اندلس ہوا تھا۔ محمد بن ابی عامر ہشام بن حکم کا اتالیق اور ملکہ صبح کی حمایت و اعانت حاصل رکھتا تھا۔

⑤ فائق خواجہ سرا، یہ قصر سلطانی کے محافظ دستے کا افسر اور توشہ خانے کا داروغہ تھا۔

⑥ جوذر خواجہ سرا، یہ شہر قرطبہ کے تمام بازاروں کا نگران یا کوتوال شہر تھا۔ مؤخر الذکر دونوں خواجہ سرا اس قدر قابو یافتہ تھے کہ بڑے بڑے امراء ان سے ڈرتے اور ان کی رضامندی حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

ارا کین دولت کے مشورے:

جب خلیفہ حکم ثانی کا انتقال ہوا تو فائق اور جوذر کے سوا اور کوئی اس وقت موجود نہ تھا۔ ان دونوں نے خلیفہ کے انتقال کے بعد مشورہ کیا کہ شہزادہ ہشام کی تخت نشینی حکومت اسلامیہ کے لیے خطرے سے خالی نہیں

ہے۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ خلیفہ حکم کے بھائی مغیرہ کو تخت نشین کیا جائے کیونکہ وہ بار خلافت کے تحمل کی قوت و قابلیت رکھتا ہے۔ جوذر کی رائے یہ تھی کہ وزیر اعظم جعفر مصحفی کو سب سے پہلے قتل کر دیا جائے تا کہ مغیرہ کی تخت نشینی میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ مگر فائق نے کہا کہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم وزیر مصحفی کے سامنے اپنا خیال بیان کریں اور اس کو اپنا ہم خیال بنائیں۔ بہت زیادہ ممکن ہے کہ جعفر ہمارا ہم خیال ہو جائے۔ اگر وہ ہم خیال نہ ہوا تو پھر اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اس تجویز کے موافق وزیر جعفر کو طلب کیا گیا۔ جب وزیر آ گیا تو اس کو خلیفہ کے فوت ہونے کی اطلاع دے کر ان دونوں نے اپنی رائے پیش کی۔ وزیر فوراً موقع کی نزاکت کو تاڑ گیا اور اس نے کہا کہ میں آپ دونوں کی رائے کے موافق ہی عمل کروں گا مگر دوسرے اراکین سلطنت کو بھی اس مشورے میں شریک کر لینا ضروری ہے۔ اس طرح ان دونوں کو دھوکا دے کر وہاں سے نکل آیا اور اپنے مکان پر آتے ہی اس نے ارکان واعیان سلطنت کو طلب کیا۔ جب سب جمع ہو گئے تو خلیفہ کی وفات کا حال سنا کر فائق اور جوذر کی رائے کا اظہار کیا اور کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ اسی وقت مغیرہ اور حکم کو قتل کر دیا جائے تا کہ ہر ایک فتنے کا سد باب ہو جائے۔ اس رائے کو سن کر سب نے پسند تو کیا مگر اس بے گناہ کے قتل کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ آخر محمد بن ابی عامر اٹھا اور اس نے کہا کہ میں اس کام کو انجام دیتا ہوں۔ جب محمد بن ابی عامر مغیرہ کے مکان پر پہنچا تو وہ سو رہا تھا۔ اس کو ابھی تک اپنے بھائی کے فوت ہونے کا حال معلوم نہ تھا۔ بیدار ہو کر جب اس نے محمد بن ابی عامر سے اس حادثے کا حال سنا تو بہت غمگین ہوا اور اپنے بھتیجے ہشام کی اطاعت کا اقرار اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی آمادگی ظاہر کی۔ محمد بن ابی عامر نے یہ رنگ دیکھ کر اور مغیرہ کو بالکل بے ضرر محسوس کر کے جعفر مصحفی کے پاس خبر بھیجی کہ مغیرہ ہر طرح ہشام کی فرماں برداری پر آمادہ ہے اور بغاوت و سرکشی کا کوئی خیال نہیں رکھتا۔ ایسی حالت میں زیادہ سے زیادہ اس قدر احتیاط کافی ہے کہ مغیرہ کو قید کر دیا جائے۔ اس کی جان لینے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی مگر وزیر جعفر نے فوراً پیغام بھیجا کہ اگر تم اس کام کو نہیں کر سکتے تو میں کسی دوسرے شخص کو بھیجتا ہوں تا کہ وہ بلا توقف مغیرہ کا کام تمام کر دے۔ یہ سن کر محمد بن ابی عامر نے مغیرہ کو بے گناہ قتل کر دیا اور جس کمرے میں اس کو قتل کیا تھا، اس کمرے کو اسی وقت تیغہ کرا دیا۔

تخت نشینی:

اس کے بعد خلیفہ ہشام کی رسم تخت نشینی ادا ہوئی۔ فائق اور جوذر کو اپنے منصوبے میں ناکامی ہوئی۔ انھوں نے اس کے بعد نوعمر خلیفہ کے خلاف لوگوں میں ہلچل پیدا کرنے کی کوشش کی اور مغیرہ کے بے گناہ مارے جانے کی طرف توجہ دلائی۔ اس سے ایک عجیب قسم کی برہمی اور ناراضگی لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوئی اور چند ہی روز کے بعد دارالسلطنت قرطبہ میں خبر پہنچی کہ شمالی سرحد کے عیسائی باج گزار حکمرانوں نے اسلامی علاقے میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا ہے اور نوعمر خلیفہ کے تخت نشین ہونے سے ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔ ان

حالات میں وزیراعظم جعفر نے اپنی قابلیت کا کوئی بہترین نمونہ نہیں دکھایا اور آپس کی مخالفتوں اور رقابتوں نے بھی اس کو بدحواس اور مجبور سا کر دیا۔

محمد بن عامر بحیثیت مشیر:

آخر ملکہ صبح کے حکم اور اشارے سے محمد بن ابی عامر کو وزیر جعفر کے کاموں میں اس کا شریک مقرر کیا گیا۔ چند ہی روز کے اندر محمد بن ابی عامر نے جعفر کو طاق میں بٹھا دیا اور تمام امور سلطنت پر خود حاوی ہو گیا۔ اب اس کے بعد اندلس کی حکومت اسلامیہ کے جو حالات بیان ہونے والے ہیں وہ درحقیقت ابن ابی عامر ہی کے کارنامے ہیں۔

محمد بن عامر کے حالات زندگی:

محمد بن ابی عامر سنہ ۳۵۷ھ میں اندلس کے مقام طرکش میں جہاں اس کا خاندان سکونت پذیر تھا، پیدا ہوا۔ اگرچہ اس کا مورث اعلیٰ عبدالملک معافری ایک یمنی سپاہی پیشہ شخص تھا مگر اس کے بعد اس کی اولاد میں زیادہ تر پڑھے لکھے اور ذی علم لوگ ہوتے رہے اور سپہ گری کی طرف اس خاندان کی توجہ کم رہی۔ محمد بن ابی عامر ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھا کہ اس کا باپ حج سے واپس آتا ہوا علاقہ طرابلس الغرب میں فوت ہو گیا تھا۔ محمد بن ابی عامر بہت تھوڑی عمر میں قرطبہ آ کر سرکاری مدرسے میں پڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ فارغ التحصیل ہو کر اس نے ایوان شاہی کے متصل ایک دکان کرایہ پر لی اور اس میں بیٹھ کر عرائض نویسی کا پیشہ اختیار کیا۔ اجرت لے کر لوگوں کے خطوط اور کچہریوں میں پیش ہونے والی عرضیاں لکھ دیا کرتا تھا۔ یہی اس کا ذریعۂ معاش تھا۔ اتفاقاً ملکہ صبح یعنی مادر ہشام کو ایک محرر کی ضرورت ہوئی جو اس کی جائیداد کا حساب کتاب لکھا کرے۔ کسی خواجہ سرا نے محمد بن ابی عامر کی ملکہ سے سفارش کر دی۔ چنانچہ محمد بن ابی عامر ملکہ کے یہاں محرروں میں نوکر ہو گیا۔ اس کی حسن کارگزاری کی شہرت اور ملکہ کی سفارش نے اس کو چند روز کے بعد اشبیلیہ کے محصولات کی وصولی کا افسر مقرر کر دیا۔ اس عہدے پر فائز ہو کر چونکہ اس کو قرطبہ سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ لہٰذا اس نے ملکہ صبح کی خدمت میں عرض معروض کر کے ملکہ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ خلیفہ حکم کی خدمت میں سفارش کر کے اس کو قرطبہ ہی میں کوئی عہدہ دلا دے۔ چنانچہ اس کو محکمہ دارالضرب کا افسر و مہتمم بنا دیا گیا۔ اس عہدۂ جلیلہ پر پہنچ کر محمد بن ابی عامر نے اپنی قابلیت کا خوب اظہار کیا۔ ملکہ صبح کو بھی قیمتی تحائف کے ذریعے خوش رکھا۔ وزیر مصحفی اور دوسرے امراء کو بھی اپنا ہمدرد و خیر خواہ بنا لیا اور بہت جلد اس قدر اعتبار پیدا کر لیا کہ خلیفہ حکم نے مرنے سے پہلے اس کو شہزادہ ہشام کا اتالیق مقرر کر دیا۔

محمد بن عامر کے کارنامے:

خلیفہ حکم کی وفات اور مغیرہ کے قتل کے بعد جب ہشام تخت نشین ہوا تو تمام کاروبار سلطنت وزیر جعفر مصحفی کے ہاتھ میں آگیا۔ سپہ سالار غالب بظاہر وزیر جعفر کا رقیب سمجھا جاتا تھا۔ ملکہ صبح پہلے سے زیادہ امور سلطنت میں دخیل اور حاوی ہوگئی تھی۔ اس کی سب عزت کرتے تھے اور وہ محمد بن ابی عامر پر زیادہ مہربان تھی۔ محمد بن ابی عامر نے وزیر جعفر اور سپہ سالار غالب کو مشورے دے کر سب سے پہلے خواجہ سراؤں کے زور کو توڑا۔ فائق کو میورقہ میں جلاوطن کر دیا، جہاں وہ گم نامی کے عالم میں فوت ہوا۔ جوذر کو استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا۔ ان کی جماعت کے لوگوں کو منتشر کر دیا گیا۔ اسی حالت میں شمالی عیسائیوں کے حملہ آور ہونے اور خراج کی ادائیگی سے انکار کرنے کی خبریں پہنچیں۔ وزیر جعفر نے محمد بن ابی عامر کو فوج دے کر عیسائیوں کے مقابلہ اور سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ محمد بن ابی عامر نے شمالی حدود میں پہنچ کر عیسائیوں کو پیہم اور عبرت آموز شکستیں دیں اور وہاں سے سالماً غانماً واپس آیا۔ ان فتوحات کی خبریں پہلے ہی قرطبہ میں پہنچ چکی تھیں اور محمد بن ابی عامر کی قبولیت اور عظمت دلوں میں بہت بڑھ گئی تھی۔ اہل قرطبہ نے اس کا شاندار استقبال کیا اور دربار میں قدرتی طور پر اس کا اثر و اختیار پہلے سے دو چند ہوگیا۔ اب محمد بن ابی عامر نے غالب کو اپنا شریک و ہم خیال بنا کر مصحفی کو وزارت سے معزول کرا دیا یہاں تک کہ اس کو قید کر دیا گیا اور اسی حالت میں فوت ہوا۔

غالب چونکہ تمام افواج اندلس میں محبوب و ہر دل عزیز تھا۔ لہٰذا اس پر ہاتھ ڈالنا آسان کام نہ تھا۔ محمد بن ابی عامر نے فوجی بھرتی جاری کی۔ جس میں شمال کے پہاڑی عیسائیوں اور مراکش و طرابلس الغرب کے بربریوں کو بھرتی کیا۔ ابن ابی عامر اب تنہا وزیر اعظم تھا۔ غالب کی خاطر مدارات اور تعظیم و تکریم حد سے زیادہ پسند کرتا تھا۔ غالب کی بیٹی سے اس نے شادی کر لی تھی۔ اس لیے غالب کی طرف سے اس کو کوئی خطرہ نہیں تھا مگر چونکہ ابن ابی عامر میں اولوالعزمی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی لیکن وہ مطلق العنان فرماں روا کی حیثیت سے اندلس میں حکومت نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے پرانی فوج کے ایک حصہ کو موقوف کر دیا۔ باقی کو غیر اہم اور غیر مناسب مواقع پر مامور کر کے فوج کی قومی جماعت بندیوں کو درہم برہم کر دیا۔ نئی فوج کی تعداد کو بتدریج بڑھا کر زیادہ قواعد دان اور مضبوط بنا لیا اور اس طرح بڑی ہوشیاری کے ساتھ غالب کی قوت کو کمزور کر دیا۔ اس کے بعد غالب کو بھی اس نے بہ آسانی اپنے راستے سے ہٹا دیا اور کسی قسم کا کوئی فتنہ برپا نہ ہوا۔ غالب اور ابن ابی عامر کے مابین کسی موقع پر تیز گفتگو ہوئی۔ سخت کلامی کے بعد زبان تیغ سے کام لینے تک نوبت پہنچی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابن ابی عامر کسی قدر زخمی ہوا اور غالب بھاگ کر عیسائی بادشاہ لیون کے پاس چلا گیا۔ اسی طرح حریفوں سے میدان خالی کر کے ابن ابی عامر نے ملکہ صبح کے اقتدار کو امور سلطنت سے بالکل خارج کر دیا اور ہشام ثانی کو قصر خلافت کے اندر اپنے مقرر کردہ خدام میں گویا نظر بند کر کے بٹھا دیا۔

ہشام قصر خلافت سے آگے نہیں نکل سکتا تھا۔ محل کے اندر عیش و عشرت اور لہو ولعب کے تمام سامان اس کے لیے فراہم تھے اور وہ اپنی اسی حالت پر قانع اور مطمئن تھا۔ بلا ابن ابی عامر کی پروانگی کے کوئی شخص ہشام سے مل بھی نہیں سکتا تھا۔ ابن عامر نے ہر طرح سے مضبوط و مطمئن ہو کر فوجی اصلاح و ترتیب کی طرف توجہ کی اور بہت جلد وہ اپنی بہادر اور جرار فوج میں محبوب و ہر دل عزیز بن گیا۔

عیسائیوں سے جہاد:

اس کے بعد اس نے عیسائیوں کے خلاف جہاد کیے اور کئی عیسائی ریاستوں کو ممالک محروسہ میں شامل کر کے باقیوں کو ایسی سخت سزائیں دیں کہ عیسائی سلاطین اس کے نام سے لرزنے اور کانپنے لگے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود عیسائی سلاطین اور عیسائی سرداروں نے اس کی فوج میں شریک ہو کر عیسائی ملکوں کو پامال کیا اور خود عیسائیوں نے اپنے ہاتھ سے اپنے گرجوں کو ڈھانے اور مسمار کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ مگر ابن ابی عامر نے ان کو معبدوں کی بے حرمتی و تباہی سے روک دیا، پھر اس نے افریقہ کی طرف توجہ کی۔ ادھر بھی سلطنت اندلس کی حدود کو وسیع کیا۔ غرض اس نے اپنے عہد حکومت میں چھپن جہاد کیے اور ہر ایک لڑائی میں فتح مند ہوا۔ آخری ایام حکومت میں اس نے اپنا خطاب ''منصور'' تجویز کیا۔ چنانچہ وہ نہ صرف منصور بلکہ منصور اعظم کے خطاب سے مشہور رہے۔

وفات:

سنہ ۳۹۴ھ میں ۲۷ سال کی حکومت کے بعد قسطلہ کے آخری جہاد سے واپس آتا ہوا مدینہ سالم میں جس کو میڈینا سلی کہتے ہیں، فوت ہو کر مدفون ہوا۔

محمد بن عامر منصور کے عہد پر تبصرہ:

منصور اعظم کی مثال ایسی سمجھنی چاہیے جیسے خلافت بغداد میں دیلمی و سلجوقی وغیرہ سلاطین کی تھی کہ خلیفہ برائے نام ہوتا تھا اور اصل حکومت ان امراء کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ منصور اعظم نے اپنے آپ کو حاجب یعنی وزیر اعظم ہی کے نام سے موسوم رکھا لیکن باقی تمام امور میں وہ مطلق العنان فرماں روا تھا۔ اس نے مدینہ زہرا کے نام سے ایک قصر قرطبہ کے قریب چند میل کے فاصلے پر تعمیر کرایا تھا جو قلعے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی میں وہ تمام دفاتر اور خزائن کو لے گیا تھا۔ خطبے میں خلیفہ ہشام کے ساتھ اس کا بھی نام لیا جاتا تھا۔ سکے میں بھی اس کا نام درج ہوتا تھا۔ امراء و اراکین سلطنت اس کی ایسی ہی تکریم کرتے اور تمام آداب دربار اسی طرح بجالاتے جس طرح وہ خلفائے بنوامیہ کے لیے بجالاتے تھے۔

ابن ابی عامر یعنی منصور اعظم کا وجود اندلس اور اندلس کی اسلامی حکومت وسلطنت کے لیے بہت ہی مبارک ومسعود تھا۔ اس نے لیون اور اس کی اردگرد کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو خلافت قرطبہ کا براہ راست ایک صوبہ بنا لیا تھا۔ برشلونہ، قسطلہ اور نوار کو اس نے خراج گزار اور پورے طور پر فرماں بردار بنانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ایک مرتبہ غرسیہ والیٔ ریاست لشکبنش کے پاس منصور اعظم کا کوئی ایلچی کسی ضرورت سے گیا۔ غرسیہ نے اس کا شاندار استقبال کیا اور اپنے تمام ملک کی اس کو سیر کرائی۔ اس سیر وسیاحت میں اس ایلچی کو معلوم ہوا کہ کسی کلیسا میں کوئی مسلمان عورت قید ہے جس کو راہبوں نے قید کر رکھا ہے۔ ایلچی نے واپس آ کر حالات سنائے اور اس مسلمان عورت کا بھی تذکرہ کیا۔ منصور اعظم اسی وقت فوج لے کر ریاست لشکبنش پر حملہ آور ہوا۔ جب حدود لشکبنش کے قریب پہنچا تو غرسیہ عاجزانہ حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا کہ مجھ سے کوئی حرکت گستاخانہ سرزد نہیں ہوئی۔ منصور نے کہا کہ تو نے وعدہ کیا تھا کہ اپنے ملک میں کوئی مسلمان قیدی نہ رکھے گا، پھر فلاں گرجے میں ایک مسلمان عورت کو کس لیے قید کیا گیا؟ غرسیہ نے فوراً عورت کو منصور کے حوالے کر کے اس گرجے کو منصور کے سامنے گرا دیا۔

۲۴/ ماہ جمادی الآخر سنہ ۳۸۷ھ کو منصور نے قرطبہ سے شہر قوریہ کی جانب کوچ کیا۔ قوریہ کو فتح کر کے جلیقیہ میں داخل ہوا۔ یہاں عیسائی سرداروں نے آ آ کر اس کے لشکر میں شرکت اختیار کی۔ ان سب کو لے کر منصور اعظم سمندر کے کنارے تک تمام علاقے کے سرکش لوگوں کو سزا دے کر اور اس طرف کے قلعوں کو جو سبب بغاوت تھے، مسمار کرا کر بحر اطلانطک کے چھوٹے چھوٹے جزیروں کو فتح کیا اور مفرورین کو جو وہاں جا کر پناہ گزین ہوئے تھے، گرفتار کیا۔ ساحل فرانس کے شہروں کو فتح کر کے اور ان عمارتوں کو جنھیں سازش کانوں کے طور پر بنایا گیا تھا، مسمار کرنے کے بعد واپس ہوا۔ یہ منصور اعظم کا اڑتالیسواں جہاد تھا۔

علم وفضل کی قدر افزائی:

منصور اعظم علم وفضل کا ایسا ہی قدر دان تھا جیسا کہ خلیفہ حکم ثانی۔ وہ خود بھی عالم تھا اور عالموں کی بڑی قدر کیا کرتا تھا مگر وہ لوگ جو لڑکپن میں اس کے ہم سبق رہ چکے تھے، منصور اعظم کی اس عظمت وشوکت کو دیکھ کر دل ہی دل میں حسد کے مارے جلے بھنے جاتے تھے۔ انھوں نے موقع پا کر منصور کے خلاف ایک سازش مرتب کی اور یہ الزام لگایا کہ منصور فلسفے کی جانب زیادہ مائل ہے اور اس پر دہریت کا رنگ غالب ہے مگر منصور نے اپنے خلاف اس قسم کی شہرت سن کر فوراً اس کی تلافی کی اور خود مذہبی علماء کی ایک بڑی مجلس منعقد کر کے اس قسم کی باتوں کا سدباب کر دیا۔ منصور نے بہت سے پل بنائے۔ جامع مسجد قرطبہ کی اس نے بھی توسیع کی۔ امن وامان اور رعایا کی خوش حالی اس کے زمانے میں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔ وہ ایسے مقامات پر بھی اپنی فوجیں لے گیا جہاں اس سے پہلے کوئی مسلمان حکمران نہیں پہنچا تھا۔ غرض منصور کا عہد حکومت ہر ایک اعتبار سے حکومت اندلس کا

نہایت شاندار زمانہ تھا۔منصور اعظم کے نام سے عیسائی سلاطین کے دل میں اس قدر خوف طاری ہوتا تھا کہ اس سے زیادہ کسی اموی خلیفہ سے بھی وہ نہیں ڈرتے تھے۔ منصور نے نہایت ادنیٰ درجے کی حالت سے ترقی کر کے اپنے آپ کو حکومت وسلطنت کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچایا۔ اس لیے وہ دنیا کے باحوصلہ اور قابل تکریم لوگوں کی صف میں اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ سنہ ۳۴۹ھ میں جب وہ فوت ہوا تو اگرچہ خلافت بنوامیہ ہشام ثانی کی بے بسی و نالائقی کے سبب اپنے آخری سانس پورے کر رہی تھی مگر اسلامی عظمت وشوکت اپنی معراج کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔

پروفیسر رائس ہارٹ ڈوزی نے درست لکھا ہے:

''منصور نے سلطنت کو وہ شان وعظمت بخشی تھی جو پہلے کسی کے خواب وخیال میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ منصور بڑے دل گردے کا شخص تھا اور وہ قوم وملک کا نہایت بہی خواہ تھا مگر پھر بھی اس کے خلاف ریشہ دوانیاں ہوتی رہتی تھیں حتیٰ کہ بعض امرائے عرب نے سلطانہ صبیح کو اس کے خلاف بھڑکایا۔ سلطانہ صبیح والدہ ہشام بڑی لائق اور عصمت مآب خاتون تھیں۔ یہی منصور کو اس کی لیاقت، پاک بازی اور دین داری کو دیکھ کر اس درجے پر پہنچانے کا سبب بنی تھی، مگر بہکانے میں آگئیں۔ ہشام کو سلطانہ نے چاہا کہ زمام حکومت ہاتھ میں لے، مگر وہ تو کنیزوں کے جھرمٹ میں زندگی بسر کرنا بہتر سمجھتا تھا، لیکن ماں کے سمجھانے سے کچھ رضا مند ہوا۔'' (عبرت نامۂ اندلس: ص ۱۷۵)

سلطانہ نے مغرب اقصیٰ کے ایک حاکم زبیری بن عطیہ کو بلا بھیجا۔ وہ آیا تو منصور نے اس کی بڑی خاطر ومدارت کی۔ سلطانہ نے خفیہ طور پر اس سے مدد طلب کی اور اسے حاجب کا عہدہ پیش کیا۔ وہ واپس گیا تو اس کے پیچھے سلطانہ نے خزانے میں سے ۶۰ لاکھ دینار میں ۸۰ ہزار دینار نکلوا کر کسی ترکیب سے اس کے پاس روانہ کیے، لیکن منصور کا انتظام نہایت معقول تھا۔ اس کو پتہ چل گیا۔ اس نے ہشام سے مل کر خزانے کو واپس کرا لیا۔ سلطانہ کو ناکامی ہوئی تو اس نے اپنی قسمت پر صبر کیا اور عمر کا بقیہ حصہ عبادت گزاری میں صرف کر دیا۔

(عبرت نامہ اندلس: ص ۱۸۰)

منصور بہت ذہین وفطین آدمی تھا۔ وہ سرحدی علاقے کے عیسائیوں کی شورشوں کو دفع کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ جب سرحد کے قریب فروکش ہوا تو ایک معتبر سوار کو درۂ طلبارش کی طرف روانہ کیا کہ وہاں پہرہ دے اور جو پہلا آدمی درہ سے گزرے اس کو میرے سامنے لایا جائے تمام رات برف باری اور بارش میں گزری۔ صبح لشکر گاہ سے ایک بڈھا گدھے پر سوار درے کی سمت آرہا تھا۔ صورت لکڑہارے کی سی تھی۔ سوار نے پوچھا: ''کہاں جارہے ہو؟'' اس نے کہا جنگل سے لکڑیاں کاٹنے۔ سوار نے کہا: ''تم منصور کے پاس چلو۔'' چنانچہ اس کو زبردستی لے آئے۔ ادھر منصور رات بھر سویا نہ تھا۔ جب لکڑہارا سامنے لایا گیا تو منصور نے صقلبی غلاموں سے کہا: اس بڈھے کی تلاشی لو، مگر اس کے لباس میں سے کچھ نہ نکلا۔ منصور کے حکم دیا کہ گدھے کا پالان دیکھو۔ جب اس کی تلاشی لی تو اس میں ایک خط نصرانیوں کی طرف سے بادشاہ لیون کے نام تھا جس میں لکھا تھا کہ

اسلامی لشکر گاہ کا ایک رخ کمزور ہے، اس پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ اس خط سے منصور کو سازش کا پتہ چل گیا۔ اس نے ان عیسائیوں اور بڈھے کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ یہ تدبیر بہت موثر ہوئی۔ اس کے بعد پھر کسی عیسائی کو سازش کی جرأت نہ ہوئی۔

منصور کا ایک سفیر نبرہ کے عیسائی بادشاہ غرسیہ کے پاس گیا۔ اس نے اس کو بہت کچھ انعام و اکرام دیا۔ وہ سفیر دورہ کرتا ہوا اتفاق سے ایک گرجے میں گیا۔ وہاں اسے ایک مسلمان ضعیفہ ملی جو بچپن میں عیسائیوں کی قید میں لونڈی کی حیثیت سے تھی اور گرجا میں رہتی تھی۔ سفیر سے اس بڑھیا نے اپنا سارا حال سنایا۔ جب وہ قرطبہ واپس آیا تو منصور سے عام حالات بیان کیے۔ جب منصور سن چکا تو پوچھا: ''کوئی ناگوار واقعہ تو نہیں گزرا؟'' سفیر کو اس بڑھیا کا خیال آیا اور اس نے منصور کو اس کا پورا واقعہ سنایا۔ منصور نے کہا: ''یہ واقعہ پہلے کہنا تھا۔ چنانچہ واقعہ سنتے ہی جنگ کے لیے تیار ہو گیا۔ غرسیہ کا بادشاہ کانپ اٹھا اور اس نے خط لکھا کہ مجھ سے کیا خطا ہوئی جو عتاب نازل ہو رہا ہے؟'' جو پیامبر شاہ غرسیہ کا خط لایا تھا، اس سے کہا: ''مجھ سے قسمیہ کہا گیا تھا کہ اب کوئی مسلمان عورت مرد میری قید میں نہیں ہے اور نہ رکھوں گا، مگر گرجے میں مسلمان عورت قید ہے۔'' وہ پیامبر واپس گیا۔ غرسیہ کے بادشاہ نے اس بڑھیا کو اور دو عورتیں مزید تلاش کر کے منصور کی خدمت میں بھیج دیں اور حلفاً کہا کہ ان عورتوں کا مجھ کو مطلق علم نہیں تھا، اور میں نے اس گرجا ہی کو مسمار کرا دیا ہے جس میں بڑھیا کو قید رکھا گیا تھا۔ (عبرت نامہ اندلس: ص ۱۹۴)

ڈوزی لکھتا ہے کہ:

''دشمن اس کے نام سے تھراتے تھے۔ فوج اس پر جان چھڑکتی تھی۔ یہ منصور ہی کی تربیت دی ہوئی قواعد دان فوج تھی جس نے اسپین کی سطوت و اقبال کو اس بلندی پر پہنچایا جو کبھی پہلے اس کو نصیب نہ ہوئی تھی یہاں تک کہ یہ عروج اس کو خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کے زمانے میں بھی نہیں ہوا تھا۔''

(عبرت نامہ اندلس: ص ۱۹۵)

منصور کے بارے میں مؤرخین کا فیصلہ ہے کہ وہ صادق العمل، فیاض اور عادل تھا۔ چنانچہ ڈوزی لکھتا ہے:

''منصور کا انصاف ضرب المثل تھا۔ ایک مرتبہ عوام الناس میں سے ایک شخص منصور کے پاس آیا اور کہا: ''اے مظلوموں کے داد رس! اس آدمی نے جو حضور کے پیچھے کھڑا ہے، مجھ پر ظلم کیا ہے۔ عدالت نے طلب کیا تو گیا نہیں۔ منصور کے پیچھے صقلبی سپر بردار تھا جس پر منصور بہت مہربان تھا، لیکن فریادی سے تفصیل سننے کے بعد منصور نے حکم دیا کہ قاضی عبدالرحمٰن بن فوطس سے جا کر کہو کہ اس معاملے کا فیصلہ کریں اور حق و انصاف ملحوظ رہے۔ قاضی نے مدعی کے حق میں فیصلہ دیا۔ مدعی منصور کے پاس آ کر شکریہ ادا کرنے لگا۔ منصور نے کہا شکریے کی ضرورت نہیں، تمہارا انصاف ہو گیا

اور تم کو اطمینان ہو گیا، مگر مجھے ابھی اطمینان نہیں ہوا کیونکہ مجھے اس نالائق صقلبی کو سزا دینی ہے جس نے باوجود اس کے کہ میرا ملازم تھا، ایک ذلیل کام کرنے میں شرم نہ کی۔ (عبرت نامہ اندلس: ص ۱۹۵)

منصور عالم فاضل اور فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت نیک، پرہیزگار اور خدا پرست انسان تھا۔ حکمرانوں کی طرف سے عورتیں اس کے سامنے پیش کی جاتیں لیکن وہ آنکھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہ دیکھتا۔ المقری کا بیان ہے کہ وہ کلام پاک اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا۔

اس نے ۲۶ سالہ عہد حجابت میں قریباً پچاس جہاد کیے۔ ہر جنگ سے واپس آ کر اپنے کپڑوں کی خاک جھڑوا کر جمع کرتا جاتا تھا کہ بوقت تجہیز و تکفین یہ مٹی اس کے چہرے پر چھڑک دی جائے تاکہ شاید اس کی حیا میں اللہ تعالیٰ اس کی شفاعت کر دے۔ اس نے اپنے خاص آبائی کھیت کی روئی سے اپنی لڑکیوں سے سوت کتوا کر کفن تیار کروایا تھا جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔

سنہ ۳۹۳ھ/۱۰۰۲ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو تمام اندلس میں صف ماتم بچھ گئی۔ اس کو مدینہ سالم میں دفن کیا گیا اور اس کے مزار پر یہ کتبہ لگایا گیا جس پر یہ عبارت کندہ تھی ؎

آثــار تـنـبـيـك عـن اخـبــاره حتـى كـانـك بـالعيـان تـراه

تـالـلـه لايـاتي الزمان بمثله ابـداً ولا يحمى الثغور سواه

یعنی اس کی نشانیاں تمھیں اس کی خبر بتائیں گی۔ گویا تم اسے اپنے سامنے دیکھ رہے ہو۔ خدا کی قسم! زمانہ اس کی مثل کبھی نہیں لائے گا اور نہ ہی سرحدوں کی اس کے سوا کوئی حفاظت کر سکے گا۔

منصور اعظم کے فوت ہونے کی خبر قرطبہ میں پہنچی تو ہوا خواہان بنوامیہ کو اس لیے خوشی ہوئی کہ اب ہشام ثانی جو شاہ شطرنج کی حیثیت رکھتا تھا، آزادانہ و خود مختارانہ فرمان روائی کر سکے گا۔ چنانچہ بعض خیر خواہوں نے خلیفہ ہشام تک پہنچنے اور یہ خوشخبری سنانے کی کوشش میں کامیابی حاصل کی۔ مگر ہشام نے منصور کے فوت ہونے کی خبر سن کر بے حد رنج و ملال کا اظہار کیا اور منصور کے بڑے بیٹے عبدالملک کے آنے پر کوئی حوصلہ افزاء خیال ظاہر نہیں کیا۔ جب عبدالملک شہر سالم میں اپنے باپ کو دفن کرنے کے بعد قرطبہ میں وارد ہوا تو خلیفہ ہشام ثانی نے اس کو فوراً طلب کر کے اپنا وزیر اعظم بنایا اور اب منصور کی مانند عبدالملک تمام سلطنت اندلس کے سیاہ و سفید کا مالک و مختار ہوا۔ خلیفہ ہشام نے اس کو سیف الدولہ اور ''مظفر'' کا خطاب دے دیا۔ مظفر نے اپنے باپ کی روش پر عمل کیا اور چھ سال حکومت کرنے کے بعد سنہ ۳۹۹ھ میں فوت ہوا۔ مظفر نے اپنے عہد حکومت میں آٹھ مرتبہ عیسائی ملکوں پر چڑھائیاں کیں اور ہر مرتبہ فتح مند ہوا۔ اس کے زمانے میں بھی علم و فن کی خوب ترقی ہوئی اور حکومت اسلامیہ کے اس رعب میں جو منصور کے زمانے میں قائم ہو چکا تھا، کسی قسم کی کمی نہیں آئی۔

مظفر کے فوت ہونے پر اس کا بھائی عبدالرحمٰن بن منصور وزارت عظمیٰ یا تخت سلطانی پر فائز ہوا۔ عبدالرحمٰن نے اپنا لقب ناصر تجویز کیا۔ ناصر کا بھائی مظفر اور اس کا باپ منصور دونوں اگرچہ سلطنت اندلس کے

خود مختار فرماں روا تھے مگر وہ اپنے آپ کو وزیر اعظم یا حاجب السلطنت ہی کہتے رہے۔ عبدالرحمٰن ناصر نے یہ دیکھ کر کہ اراکین دربار اور سرداران لشکر اور عمال و حکام سب اسی کے خیر خواہ اور اسی کے باپ کے ترتیب کردہ اور دست گرفتہ ہیں تو بلا خوف و خطر اپنے آپ کو خود مختار بنایا اور خلیفہ ہشام کی ظاہری تعظیم و تکریم میں بھی قصور کرنے لگا۔

اس کے بعد ناصر نے ہشام کو مجبور کیا کہ وہ اسی کو اپنا ولی عہد خلافت تجویز کرے۔ چنانچہ ہشام نے مجبوراً ایک فرمان کے مضمون پر جو ناصر نے لکھوا کر پیش کیا، دستخط کر دیے اور ممالک محروسہ کے تمام عمال کے نام وہ فرمان بھیجا گیا، جس میں لکھا تھا کہ ہمارے بعد عبدالرحمٰن ناصر کو خلیفہ بنایا جائے اور ہر فرد بشر اس کو ولی عہد خلافت تصور کرے۔ اس فرمان میں ناصر کی عالی نسبی اور قابلیت ملک داری کی بہت تعریف کی گئی تھی۔ اس فرمان یا سند ولی عہدی کی تمام ارکان واعیان سلطنت نے تائید و تصدیق کی اور جامع مسجد قرطبہ میں بھی اس کا اعلان کیا گیا۔ ناصر اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوا مگر یہی سند ولی عہدی اور سلطانی اس کے لیے موجب ہلاکت ثابت ہوئی۔

ہشام کی معزولی:

ناصر اپنی حکومت کے پہلے ہی سال اپنے بھائی اور باپ کی سنت کے موافق فوج لے کر سرحد کی طرف عیسائیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ قرطبہ میں قریشیوں اور امویوں کو یہ دیکھ کر کہ حکومت و خلافت بنو امیہ سے نکل کر ایک اور خاندان میں جا رہی ہے، سخت ملال ہوا تھا۔ انھوں نے خاندان خلافت کی حمایت کے لیے لوگوں کو خفیہ طور پر آمادہ کرنا شروع کیا۔ اب جبکہ ناصر مع فوج شمالی سرحد پر گیا ہوا تھا، قرطبہ والوں نے قرطبہ کی موجودہ فوج کے ان افسروں کو جو ناصر کے ہمدرد اور خیر خواہ تھے، قتل کر کے خلیفہ ہشام ثانی کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کے پڑپوتے محمد بن ہشام بن عبدالجبار بن خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کو تخت نشین کر کے ''مہدی باللہ'' کا لقب دیا۔ ناصر عبدالرحمٰن نے اس طرح ہشام کے معزول اور مہدی کے تخت نشین ہونے کی خبر سن کر فوراً قرطبہ کی جانب کوچ کیا۔ جب وہ قرطبہ کے قریب پہنچا تو اس کی فوج کے اکثر سردار اور بربری سپاہی خلیفہ مہدی کی خدمت میں چلے آئے۔ ناصر جب بہت ہی تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ حیران و پریشان رہ گیا تو اسی کے ساتھیوں میں سے ایک شخص نے ناصر کو قتل کر دیا اور اس کا سر اتار کر قرطبہ میں خلیفہ مہدی کے پاس لے آیا۔ اس طرح حکومت بنی عامر کا خاتمہ ہوا اور ساتھ ہی اندلس میں طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہوا۔

مہدی بن ہشام بن عبدالجبار:

ہشام نے لوگوں کی خواہش معلوم کر کے بلا توقف بذریعہ تحریر تخت خلافت سے دست برداری اختیار

کی۔ محمد بن ہشام المخاطب بہ مہدی نے اس کو قصر خلافت کے ایک حصے میں نظر بند کر دیا اور اپنے ایک چچا زاد بھائی محمد بن مغیرہ کو حاجب السلطنت اور دوسرے چچا زاد بھائی امیہ بن الحاف کو کوتوال قرطبہ مقرر کیا۔ اس کے بعد منصور اعظم کے شہر و قصر زہرا کی طرف فوج بھیجی۔ وہاں کے رہنے والوں نے بلا مقابلہ و مقاتلہ دروازے کھول دیے۔ خلیفہ مہدی کی تمام فوج نے قصر اور عمارات کو منہدم کر کے زمین کے برابر کر دیا اور تمام مال و اسباب لوٹ کر زہرا کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ یہ حادثہ سنہ ۳۹۹ھ یا سنہ ۴۰۰ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ اس کے بعد ناصر کے قتل اور خاندان ابن ابی عامر کی حکومت کے ختم ہونے کا واقعہ پیش آیا اور چوتھی صدی ہجری کے خاتمے پر اندلس کی حکومت اسلامیہ کی عظمت و شان ختم ہو گئی اور طائف الملوکی کا دروازہ کھل گیا۔

فوجیوں کا اقتدار:

خلیفہ ہشام ثانی کو معزول اور خلیفہ مہدی کو تخت نشین کر کے سلطان ناصر کی مخالفت میں فوراً قریشیوں اور امویوں کے شریک حال بن جانے میں بربری افواج نے سب سے زیادہ حصہ لیا تھا۔ لہٰذا اب خلیفہ مہدی کی حکومت و خلافت میں بربریوں اور فوجی آدمیوں کا اقتدار حد سے زیادہ بڑھ گیا اور خلافت کی باگ ڈور یک لخت فوجی لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئی۔ ان لوگوں نے رعایا پر تشدد شروع کیا۔ رعایا نے تنگ آ کر خلیفہ مہدی سے شکایت کی۔ مہدی نے رعایا کی فریاد کو اس لیے نہ سنا کہ وہ بربریوں کو ناراض کرنا خلاف مصلحت سمجھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل قرطبہ میں جو لوگ مہدی کے طرف دار اور اس کو تخت خلافت پر بٹھانے میں سرگرم رہے تھے، سب ناراض ہو گئے اور اس تکلیف دہ حکومت سے آزاد ہونے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ بربریوں کی زیادتیوں سے تنگ آ کر اہل شہر نے بربریوں کے چند افراد کو قتل کر دیا۔ خلیفہ مہدی نے ان قاتلوں کو قصاص میں قتل کیا۔ اس طرح رعایا کی ناراضگی دن بدن ترقی کرتی گئی۔

مہدی کے خلاف سازش:

ادھر خلیفہ مہدی بربریوں سے بھی بددل، ناخوش اور فوجیوں کے اس اقتدار کو مضر سلطنت سمجھ کر خفیہ طور پر ان کا زور توڑنے کی تدبیروں میں مصروف تھا۔ اتفاقاً اہل لشکر یعنی بربریوں کو اس بات کا علم ہو گیا کہ خلیفہ ہماری تباہی و بربادی کی فکر میں ہے۔ انھوں نے یہ سنتے ہی خاندان خلافت کے ایک شہزادے ہشام بن سلیمان بن عبدالرحمٰن ثالث کو تخت خلافت پر بٹھانے اور مہدی کے معزول کرنے کی سازش کی۔ اس سازش کا حال مہدی کو معلوم ہوا تو اس نے فتنے کے برپا ہونے سے پہلے ہی ہشام بن سلیمان اور اس کے بھائی ابوبکر دونوں کو گرفتار کر کے اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔

سلیمان بن حکم کی وفات:

ان دونوں کے مقتول ہونے کی خبر سن کر ایک اموی شہزادہ سلیمان بن حکم اپنی جان بچا کر قرطبہ سے بھاگا۔ قرطبہ سے باہر بربری لوگ جمع ہو رہے تھے اور اس فکر میں تھے کہ اب کس کو تخت خلافت کے لیے منتخب کیا جائے۔ سلیمان بن حکم کو آتا ہوا دیکھ کر سب خوش ہو گئے اور اس کو خلیفہ بنا کر ''مستعین باللہ'' کا خطاب دیا اور قرطبہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ سلیمان بن حکم نے کہا کہ ہماری طاقت ابھی اس قابل نہیں ہے کہ قرطبہ کو فتح کر سکیں۔ مناسب یہ ہے کہ طاقت کو اول بڑھایا جائے۔ یہ سوچ کر سلیمان بن حکم المخاطب بہ مستعین باللہ بربریوں کے توڑ کے لیے طلیطلہ پہنچا اور احمد بن نصیب کو اپنا وزیر اعظم بنایا۔ اس کے بعد مستعین باللہ نے مدینہ سالم کے حاکم واضح عامری سے خط و کتابت کر کے اس کو اپنے ساتھ شامل کرنا چاہا لیکن واضح عامری اس سے پیشتر خلیفہ مہدی کی بیعت کر چکا تھا، لہٰذا اس نے صاف انکار کیا۔

باہمی خانہ جنگی:

مستعین طلیطلہ سے بربریوں کی فوج لے کر مدینہ سالم کی طرف چلا۔ مہدی نے یہ سن کر کہ سلمان نے مدینہ سالم پر حملہ کیا ہے، اپنے غلام قیصر کو سواروں کا ایک دستہ دے کر واضح عامری کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ مدینہ سالم کے قریب لڑائی ہوئی۔ قیصر مارا گیا۔ واضح مدینہ سالم میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔

سلیمان اور مہدی کی عیسائی بادشاہ ابن اوفونش سے مدد کی درخواست:

مستعین نے جب دیکھا کہ اس شہر کا فتح ہونا دشوار ہے اور فوج کے لیے سامان رسد حسب ضرورت فراہم نہیں ہو سکتا تو اس نے ابن اوفونش یعنی عیسائی بادشاہ کے پاس سفیر بھیج کر درخواست کی کہ تم ہماری مدد کرو اور حسب ضرورت سامان رسد اور فوج بھیجو تا کہ ہم قرطبہ پر حملہ آور ہو کر تخت خلافت حاصل کر لیں۔ اس پیام و سلام کی خبر قرطبہ میں مہدی کے پاس پہنچی تو اس نے بھی عیسائی بادشاہ کے پاس پیغام بھیجا اور اپنی طرف مائل کرنے کے لیے وعدہ کیا کہ ہم تمام سرحدی قلعے اور شہر تمھارے سپرد کر دیں گے۔ دونوں کے پیغامات سن کر عیسائی بادشاہ نے مستعین کی امداد کرنی مناسب سمجھی اور ایک ہزار بیل، پندرہ ہزار بکرے اور ضروری سامان مستعین کے پاس بھیج دیا۔ اس کے بعد فوج بھی امداد کے لیے روانہ کی۔ اب مستعین باللہ نے واضح کو مدینہ سالم میں علیٰ حالہ چھوڑا اور قرطبہ کی جانب چلا۔ اس کی فوج میں بربری اور عیسائی دونوں موجود تھے۔ مستعین کو قرطبہ کی طرف جاتا ہوا دیکھ کر واضح بھی اپنی فوج لے کر اس کے پیچھے پیچھے چلا مگر اس سے غلطی یہ ہوئی کہ قرطبہ پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں مستعین پر حملہ آور ہوا۔ اس لڑائی میں اس کو شکست فاش حاصل ہوئی اور بہت سے ہمراہیوں کو قتل کرا کر صرف چار

سوآدمیوں کے ساتھ قرطبہ کی جانب بھاگا۔ واضح جب قرطبہ میں پہنچا اور مستعین کے حملہ آور ہونے کا حال مہدی کو معلوم ہوا تو وہ فوج لے کر مستعین کے مقابلہ کو قرطبہ سے باہر نکلا اور میدان سرادق میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ سخت خونریزی کے بعد مہدی کو شکست ہوئی۔ بیس ہزار اہل قرطبہ میدان سرادق میں مقتول ہوئے۔ بقیۃ السیف کو لیے ہوئے مہدی طلیطلہ کی جانب بھاگا اور مستعین فتح مند ہو کر قرطبہ میں داخل ہوا اور تخت خلافت پر جلوس کیا۔ یہ فتح چونکہ عیسائیوں کی مدد سے مستعین کو حاصل ہوئی تھی، لہٰذا عیسائیوں کی خوب خاطر مدارات ہوئی اور قرطبہ کے علماء وفضلاء نے ادفونش سے پھر خط وکتابت کی اور اس کو اپنی مدد پر آمادہ کیا۔ عیسائی بادشاہ اس موقع کی اہمیت کو خوب پہچانتا تھا اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس وقت مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر کمزور کر دینے کا نہایت ہی اچھا موقع میسر آ گیا ہے۔ چنانچہ اس نے مہدی سے فوراً عہد نامہ لکھا کہ جس قدر فوج اس کی مدد کو بھیج سکتا تھا، بھیج دی اور اس بات کی مطلق پروا نہیں کی کہ جو فوج مستعین کے ہمراہ گئی تھی وہ ابھی تک واپس نہیں آئی ہے کہ نہیں آئی۔ مہدی عیسائیوں کی امداد کے لیے قرطبہ پر حملہ آور ہوا۔ مقام عقبۃ البقر میں نہایت خونریز جنگ کے بعد مستعین کو شکست حاصل ہوئی اور مہدی دوبارہ فاتحانہ قرطبہ میں داخل ہو کر تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ عیسائیوں کی وہ فوج جو مستعین کے ساتھ تھی، مہدی کے لشکر میں شامل ہو گئی اور اس لڑائی میں بھی زیادہ تر مسلمان اور اہل قرطبہ ہی مارے گئے۔ مستعین نے قرطبہ سے نکل کر تمام ملک میں لوٹ مار اور قتل وغارت کا بازار گرم کر دیا۔ ادھر مہدی کے قرطبہ میں داخل ہونے کے بعد عیسائی لشکر نے باشندگان دارالخلافہ کا اپنی لوٹ کھسوٹ اور قتل وغارت سے ناک میں دم کر دیا۔ مہدی قرطبہ میں داخل ہوتے ہی عیش وعشرت میں مصروف ہو گیا۔ اس طرح تمام ملک اندلس جو امن وامان کا گہوارہ تھا، بدامنی کا گھر بن گیا اور ہر ایک وضیع وشریف کو اپنی جان ومال کا بچانا دشوار ہو گیا۔

مہدی کی معزولی:

واضح عامری مہدی کے ساتھ تھا۔ اس نے جب ملک کو اس طرح تباہ اور حکومت اسلامیہ کو برباد ہوتے دیکھا تو شہر قرطبہ کے بااثر لوگوں سے مشورہ کر کے مہدی کے معزول اور خلیفہ ہشام ثانی کے دوبارہ تخت نشین کرنے کی تیاری کی۔ چنانچہ ۱۱ر ذی الحجہ سنہ ۴۰۰ھ کو ہشام کو دوبارہ قید خانے سے نکال کر تخت خلافت پر بٹھایا گیا اور مہدی کو سر دربار ہشام کے روبرو عنبر نامی غلامی نے قتل کیا۔

ہشام کی دوبارہ تخت نشینی:

واضح عامری کو جو منصور بن ابی عامر کا آزاد غلام تھا، حجابت یعنی وزارت عظمیٰ کا عہدہ ملا۔ واضح نے مہدی کا سر مستعین کے پاس وادی شوس میں بھیجا اور لکھا کہ اب خلیفہ ہشام دوبارہ تخت خلافت پر متمکن ہو چکا ہے اور مہدی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ تم خلیفۂ وقت کی اطاعت اختیار کرو اور طریق سرکشی سے باز

رہو، چونکہ مستعین کے ساتھ اس غارت گری میں ابن اڈفونش عیسائی بادشاہ بھی شریک ہو گیا تھا اور واضح عامری کے اس پیغام کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا چنانچہ ابن اڈفونش اور مستعین نے مل کر قرطبہ پر حملہ کیا اور قرطبہ کے اردگرد کا تمام علاقہ برباد کر کے قرطبہ کا محاصرہ کر لیا۔

عیسائی بادشاہ کو دوسو قلعے دے کر صلح:

آخر طول محاصرہ سے تنگ آ کر عیسائی بادشاہ کو مستعین کی ہمراہی سے جدا کرنے کے لیے سلام و پیام کا سلسلہ جاری ہوا اور عیسائی بادشاہ کی خواہش کے موافق ہشام نے دوسو قلعے مع چند بڑے بڑے شہروں کے جو شمال کی جانب ابن اڈفونش کی ریاست کے متصل تھے، اس کو دے دیے اور سند لکھ کر بھیج دی۔ اڈفونش نے اس سند کے ذریعے اس نئے علاقے پر قبضہ کیا اور مستعین کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مستعین اور اس کے ہمراہی بربری برابر مصروف محاصرہ رہے مگر چونکہ محاصرہ کمزور ہو گیا تھا لہٰذا اب مقابلے اور معرکے کی صورت یہ ہوگئی کہ کبھی شہر والے بربریوں کو مارتے ہوئے دور تک پیچھے ہٹا دیتے اور کبھی بربری شہر والوں کو شکست دے کر شہر کے اندر گھس جاتے۔ یہ حالت بہت دنوں تک جاری رہی۔ اس عرصے میں کئی عیسائی حکمرانوں نے اپنی بغاوت اور مستعین کی مدد کرنے کا دباؤ ڈال کر دربار قرطبہ سے ابن اڈفونش کی طرح سرحدی صوبوں کی سندیں حاصل کیں اور بہت سا ملک عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا۔

ہشام کا انجام:

آخر ۳ رشوال سنہ ۴۰۳ھ میں مستعین نے بزور تیغ قرطبہ پر قبضہ حاصل کیا۔ ہشام ثانی یا تو اس ہنگامے میں قتل ہو گیا یا کہیں اس طرح غائب ہوا کہ پھر اس کا پتہ نہ چلا۔ واضح عامری اس سے چند روز پہلے قتل ہو چکا تھا۔ مستعین نے قرطبہ میں داخل ہو کر تخت خلافت پر جلوس کیا۔

مستعین باللہ:

مستعین کا ذکر اوپر سے چلا آتا ہے۔ اگرچہ اب یہ مستقل طور پر قرطبہ کا خلیفہ بن گیا تھا مگر جابجا صوبوں کے حاکم خود مختار بادشاہ بن بیٹھے۔ ابن عباد نے اشبیلیہ میں، ابن افطس نے بطلیوس میں، ابن ابی عامر نے بلنسیہ و مرسیہ میں، ابن ہود نے سرقسطہ میں اور مجاہد عامری نے دانیہ اور جزائر میں خود مختارانہ حکومتیں شروع کر دیں۔ شمالی عیسائی سلاطین نے اس مناسب موقع اور موزوں وقت سے فائدہ اٹھانے میں کمی نہیں کی۔ ہر ایک عیسائی ریاست نے اپنی حدود کو وسیع کر کے اپنے قریبی علاقوں کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ غرض اندلس میں طوائف الملوکی کا زمانہ شروع ہو گیا اور حکومت اسلامیہ پارہ پارہ ہو کر بے حد کمزور و ناتواں ہو گئی۔

مستعین کا قتل:

محرم سنہ ۴۰۷ھ تک مستعین نے قرطبہ اوراس کے مضافات پر حکومت کی اور تین سال چند ماہ برائے نام خلافت کے بعد اشبیلیہ کے متصل مقام طالقہ کے میدان میں علی بن حمود سے شکست کھا کر گرفتار و مقتول ہوا اور بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ درحقیقت بنوامیہ کی حکومت کا خاتمہ تو حکم ثانی کی وفات اور ہشام ثانی کی تخت نشینی کے وقت ہو چکا تھا مگر ہشام ثانی کے زمانے میں بھی خاندان بنوامیہ کی عظمت بحیثیت خاندان خلافت باقی تھی۔

بنوامیہ کی حکومت کا خاتمہ:

اب محرم سنہ ۴۰۷ھ میں مستعین کے قتل ہونے پر اس خاندان کی حکومت کا نام ونشان ہی اندلس سے جاتا رہا مگر بعض امویوں نے سنہ ۴۲۸ھ تک حکومت وسلطنت کے دوبارہ حاصل کرنے کی برائے نام کوشش کی۔ بعض برائے نام کامیاب بھی ہوئے مگر سنہ ۴۲۸ھ کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سنہ ۴۰۷ھ میں علی بن حمود، جس کا ذکر آگے آتا ہے مستعین کو قتل کرنے کے بعد قرطبہ پر قابض اور تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ سنہ ۴۱۳ھ تک وہ اور اس کا بھائی قاسم قرطبہ میں حکمران رہا۔ سنہ ۴۱۳ھ کے آخر ایام میں ابن حمود کی حکومت منقطع ہوئی اور اہل قرطبہ کی حمایت واعانت سے عبدالرحمٰن بن ہشام بن عبدالجبار برادر مہدی ماہ رمضان سنہ ۴۱۴ھ میں قرطبہ کے تخت پر بیٹھا اور ''مستظہر'' کا خطاب یا لقب اختیار کیا۔ اس کی حکومت کو ابھی دو مہینے ہی گزرے تھے کہ محمد بن عبدالرحمٰن بن عبیداللہ بن عبدالرحمٰن فتح مند ہو کر ''مستکفی'' کے لقب سے تخت نشین ہوا اور قرطبہ میں حکومت کرنے لگا۔ سنہ ۴۱۶ھ میں یحییٰ بن علی بن حمود نے حملہ کیا۔ مستکفی شکست کھا کر بلاد شمالی کی جانب بھاگ گیا اور وہیں فوت ہوا۔ یحییٰ بن علی بن حمود قرطبہ میں سنہ ۴۱۷ھ تک حکومت کرتا رہا۔ اس کے بعد وزیر السلطنت ابومحمد جمہور بن محمد بن جمہور نے ہشام بن محمد اموی کی غائبانہ بیعت کی۔ ہشام بن محمد ان دنوں ابن ہود کے پاس مقام لریدہ میں مقیم تھا، یہ سن کر کہ میرے نام پر بیعت کی گئی ہے، لریدہ سے مقام بدنت میں چلا آیا۔ یہاں تین سال مقیم رہا اور اپنا لقب ''معتمد باللہ'' رکھا۔ قرطبہ میں دونوں رؤسائے قرطبہ مل کر حکومت کرتے اور ہشام بن محمد کو اپنا خلیفہ مانتے رہے۔ جب ان امراء میں اختلاف اور لڑائی جھگڑے آپس میں نمودار ہوئے تو سنہ ۴۲۰ھ میں ہشام بن محمد اموی کو مقام بدنت سے قرطبہ میں لائے اور باقاعدہ تخت نشین کر کے اس کی بیعت کی۔ سنہ ۴۲۲ھ میں لشکریوں نے بغاوت وسرکشی اختیار کر کے ہشام بن محمد کو معزول کر دیا۔ ہشام معزول ہو کر قرطبہ سے لریدہ چلا آیا اور سنہ ۴۲۸ھ میں یہیں فوت ہو گیا۔ اس طرح ہشام بن محمد پر خاندان بنوامیہ کی برائے نام حکومت وخلافت کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

اموی حکومت پر تبصرہ:

عبدالرحمٰن اول نے سنہ ۱۳۸ھ میں اندلس میں داخل ہو کر اپنی حکومت کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کی اولاد میں ہشام بن محمد کے فوت ہونے پر سنہ ۴۲۸ھ میں دو سو نوے (۲۹۰) سال کے بعد اس کی حکومت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ عبدالرحمٰن اول کی اولاد میں بعض ایسے باحوصلہ اور اولوالعزم فرماں روا ہوئے کہ انھوں نے اندلس کو فخر الممالک بنا دیا۔ نہ صرف ملک کی سرسبزی و شادابی میں حیرت انگیز کارنامے دکھائے بلکہ انھوں نے علوم و فنون کے بھی ایسے دریا بہائے کہ آج تک تمام دنیا ان کی قصیدہ خوانی میں مصروف ہے اور پھر بھی حق ستائش ادا نہیں ہو سکا۔ موجودہ یورپ کی علمی ترقیات تمام و کمال انھیں علم دوست اور علم پرور اموی فرماں رواؤں کی رہین منت ہیں۔ قرطبہ میں خلفائے اندلس نے ایسی علمی مشعل روشن کی تھی جس سے تمام یورپ مستفید ہوا۔ انھی خلفائے اندلس کی علمی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج یورپ تمام دنیا کو علم و ہنر سکھانے کا مدعی ہے۔ خلفائے اندلس کی شوکت و طاقت کا بھی یہ عالم تھا کہ تمام یورپ ان سے کانپتا تھا اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سلاطین یورپ ہر قسم کی ذلتیں برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ اس جگہ غور کرنے کے قابل بات یہ ہے کہ ایسی شاندار سلطنت اور ایسی عظیم الشان اسلامی حکومت کے برباد ہونے کا سبب کیا تھا۔ اس کا جواب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں نے شریعت اسلام اور آنحضرت ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی میں قصور کیا۔ اسلام نے دنیا کی سلطنت و حکومت کو کسی خاندان یا کسی خاص قبیلے کا حق نہیں بتایا تھا۔ مسلمانوں نے اسلامی تعلیم کے خلاف حکومت میں وراثت کو دخل دیا اور باپ کے بعد بیٹے کو مستحق خلافت سمجھا۔ جیسا کہ دنیا میں پہلے سے رواج ہو گیا تھا۔ اسی رواج کو آنحضرت ﷺ نے مٹایا تھا مگر مسلمانوں نے چند سالوں کے بعد پھر اس لعنت کو اپنے گلے میں ڈال لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نالائق و نااہل لوگ تخت حکومت پر جلوہ فرما ہونے کا موقع پانے لگے۔ قرآن کریم اور شریعت اسلام کی طرف سے غفلت اختیار کرنے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں نا اتفاقی پیدا ہوئی اور وہ آپس میں ایک دوسرے سے لڑنے اور دست بہ گریباں ہونے لگے۔ آپس کی اس پھوٹ نے دشمنوں کو طاقت بہم پہنچائی اور مسلمان برباد ہو گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

غرناطہ

یوں تو مسلمانوں کی حکومت پورے اندلس پر رہی بلکہ ان کی فتوحات کا سلسلہ فرانس تک بڑھتا چلا گیا۔لیکن اس میں قرطبہ کے بعد غرناطہ کی ایک خاص حیثیت رہی۔اور سب سے آخر میں غرناطہ ہی سے اسلامی حکومت کا اختتام ہوا۔

غرناطہ شہر کا نام غرناطہ ہی تھا۔بعض اسے اغرناط بھی کہتے ہیں۔ یہ دونوں عجمی نام ہیں۔غرناطہ دراصل صوبہ ''البیرہ'' کا ایک شہر ہے۔ان دونوں آبادیوں (یعنی غرناطہ اور البیرہ کی آبادیوں) میں آٹھ میل کا فاصلہ ہے۔

البیرہ اندلس کے صوبوں میں سب سے بڑا صوبہ ہے اور بلاد مفتوحہ کے ٹھیک وسط میں واقع ہے۔اور رومیوں کی قدیم تاریخ میں اس کا نام ''سنام الاندلس'' (اندلس کی چوٹی) تھا، اور گذشتہ زمانہ میں اسے قسطیلہ کہا کرتے تھے۔ یہ بڑا معروف ومشہور مقام تھا۔اس زمانے میں اس کے باشندے دولت وثروت سے مالا مال تھے۔یہاں بہت بڑے نامور فقہاء اور علماء بھی موجود تھے جن کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔

البیرہ کی جامع مسجد:

ابومروان بن حیان نے اہل البیرہ کی کثیر دولت کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ البیرہ کی جامع مسجد کے قریب ایسے پچاس گھوڑے کھڑے ہوتے تھے جن کی لگاموں کے دھانے تمام تر چاندی کے ہوتے تھے کیونکہ وہاں شرفاء اور رؤساء بکثرت آباد تھے اور ان کی اس امارت پر البیرہ کے قدیم آثار جواب تک دیرینہ سالی کی بوسیدگی کا مقابلہ کر رہے ہیں، اور جو اس طویل مدت کے گزرنے کے باوجود زمانے کے دست ہلاکت سے محفوظ رہ گئے ہیں۔

یہ مسجد امیر المومنین محمد بن عبدالرحمٰن خلیفہ قرطبہ کے حکم سے بنائی گئی تھی۔اس کا سنگ بنیاد حنش بن عبداللہ صنعانی شافعی نے رکھا تھا۔اس کی محراب پر یہ کتبہ کندہ تھا۔

بسم الله بنيت الله امر ببنائها الامير محمد بن عبدالرحمن اكرمه الله رجاء ثوابه العظيم و توسيعًا لرعيته ، فتم بعون الله علىٰ يد عبدالله عامله علىٰ كورة البيرة فى ذى القعده سنة خمسين ومأتين۔

''بسم اللہ یہ مسجد اللہ کے لیے بنائی گئی اور اس کی تعمیر کا حکم امیر محمد بن عبدالرحمٰن نے ثواب عظیم اور رفاۂ عام کے لیے دیا، خدا اسے معزز فرمائے، اور بلفضلہٖ اس کی تکمیل عبداللہ گورنر صوبہ البیرہ کے ہاتھ سے ذی قعدہ ۲۵۰ھ میں ہوئی۔''

البیرہ کی تباہی:

زمانہ ہمیشہ البیرہ کے باشندوں کو انھی ہولناکیوں سے خوف زدہ کرتا رہا۔ ان کے مکانوں اور رہائش گاہوں پر برابر تباہی اور نکبت و ادبار کے سایے منڈلاتے رہے۔ عہد اسلامی کے فتنے ان کے گھروں کو تباہ و بربادی کی بادسموم سے جھلستے رہے۔ حتیٰ کہ عام طور پر شہر پر ویرانی کے بادل چھا گئے اور ان آفتوں نے اہل شہر کو پریشان اور پراگندہ خاطر کر دیا جس کی وجہ سے وہ جلاوطن ہونے پر مجبور ہو گئے۔

بربری جھگڑوں اور مناقشات کے زمانے میں جو سنہ ۳۰۰ھ اور اس کے بعد میں واقع ہوئے، یہاں کے لوگوں نے نقل مکانی کر کے غرناطہ میں جا کر پناہ لی۔ اسی وقت سے غرناطہ اس اقلیم کا دارالملک ہو گیا اور کچھ لوگ اسے شہروں کا رکھوالا بھی کہنے لگے۔ وہ بزرگی جو اسلامی تمدن نے پیدا کی تھی، اس کا یہ مرکز بن گیا۔ جس کا سبب یہ تھا کہ اس شہر کی ساخت استوار تھی، ہوا خوش گوار تھی، پانی کی روانی، غلہ کی فراوانی اور قیمتوں کی ارزانی عام تھی۔ خوف زدہ حضرات کو یہاں امن میسر ہوا۔ پراگندگی، افراتفری اور انارکی کی جگہ نظام نے لی۔ قدم جم گئے اور شہریت کو قرار و استحکام نصیب ہوا۔

اب غرناطہ اندلس کے شہروں میں قطب کی حیثیت رکھتا تھا۔ حکومت کا پایہ تخت ہوا، شاہی فرودگاہ کا مقام اسے حاصل ہوا۔

البیرہ کے واقع نگاروں میں سے کسی نے اس کے تذکرہ میں یہ لکھا ہے کہ شہر البیرہ کے اجڑ جانے کے بعد ولایت البیرہ کے بڑے اور قدیم شہروں میں صرف غرناطہ نے اس کی صحیح جانشینی کی ہے اور جب آبادی بعض وجوہات کی بنا پر البیرہ سے غرناطہ منتقل ہو گئی تو اسی کے محور پر بلاد اندلس کے آسمان کی گردش ہونے لگی۔ اب یہ شہر دوسرے شہروں کا مرکز، سلطان کا مستقر اور عدل و انصاف کا گہوارہ بن گیا۔ اندرونی اور بیرونی شہروں میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ آبادی کی وسعت، آب و ہوا کی لطافت اور موسم کی نظافت کے لحاظ سے کوئی خطہ اس کے ہم پایہ اور برابر نہیں تھا۔ اور نہ ہی کسی شہر پر اس کے اوصاف جمال کا اطلاق ہو سکتا تھا۔ کلک بیان اس کی جلال کے اظہار سے یک قلم قاصر ہے۔

غرناطہ کا جغرافیہ:

غرناطہ اقلیم خامس میں داخل ہے جو مشرق سے شروع ہو کر ممالک یاجوج و ماجوج سے گزرتی ہے اور

شمالی خراسان اور سواحل شام کے شمالی علاقوں سے گزر کر اندلس کے مشہور شہر قرطبہ اور اشبیلیہ اور ان کے متصل مقامات سے ہر کو بحر محیط کے مغربی ساحل پر ختم ہو جاتی ہے۔

صاعد بن احمد کی کتاب الطبقات میں ہے کہ اندلس کا بڑا حصہ اقلیم خامس میں واقع ہے اور کچھ حصہ اقلیم رابعہ میں داخل ہے جس میں حسب ذیل شہر ہیں:

اشبیلیہ، مالقہ، غرناطہ، المریہ اور المرتیہ۔

علمائے نجوم نے لکھا ہے کہ جس ساعت غرناطہ کی واغ بیل ڈالی گئی تھی اس وقت طالع قران السعدین کا تھا۔ اسی بنا پر اس نے ہر طرف سے اور ہر طرح سے مدارج طول بلد میں یہ شہر قریباً قرطبہ اور المریہ کے برابر ہے اور عرض بلد میں اشبیلیہ، المریہ، شاطبہ، طرطوشہ، سردانیہ اور انطاکیہ سے قریباً ایک درجہ کم ہے۔ اس کی آب و ہوا معتدل ہے اور اکثر حالات کے لحاظ سے وہ گویا شامی علاقہ ہے۔

غرناطہ اور قرطبہ کی درمیانی مسافت ۹۰ میل ہے اور وہ قرطبہ سے مشرقی اور جنوبی سمت میں واقع ہے۔ بحر شام (بحر متوسط) جو اندلس اور افریقہ کے درمیان مغرب اور جنوب کی سمت میں حائل ہے، وہ غرناطہ سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ کوہستانی سلسلہ غرناطہ سے مشرق اور جنوب کی جانب چلا گیا ہے۔ غرض ساحل کی قربت کے باعث ساحلی مقامات کے خوش رنگ نئے موسمی پھلوں اور بحری قافلوں کا یہ شہر گزرگاہ ہے۔ سامنے کوہستانی سلسلہ ہے جس کے سبب سے آخری فصل میں جس قدر میوے پیدا ہوتے ہیں، ان کے ذخائر کا یہ خرمن ہے۔ کنبانیہ اور براجلات کی وجہ سے گیہوں کا ایک دریا بہتا ہوا نظر آتا ہے اور دیگر غلوں کا بھی انبار لگا رہتا ہے۔ دنیا کے مشہور برفانی پہاڑوں ایک کوہ شکیز ہے جس پر موسم گرما اور سرما دونوں میں برابر برف جمی رہتی ہے۔ یہ پہاڑ غرناطہ کے جنوب کی جانب ۶ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ راقم الحروف جب غرناطہ گیا تو اس وقت موسم گرما تھا لیکن اس پہاڑ پر برابر برف کی تہیں دور سے اپنا سفید رنگ دکھلا رہی تھیں۔ اس کی آبشاروں سے ۳۶ دریا نکلتے ہیں اور دامن کوہ سے جابجا چشمے ابلتے ہیں۔ ان خصوصیات کی وجہ سے غرناطہ کی ہوا نہایت خوش گوار ہے۔ اطراف و جوانب میں پانی با فراط رہتا ہے۔ مرغزاروں اور باغوں کی کثرت سے ہر طرف درختوں کے جھرمٹ نظر آتے ہیں۔ نباتی دواؤں اور جڑی بوٹیوں کی متلاشی سبزہ زاروں اور خاص خاص مقامات پر چلتے پھرتے رہتے تھے۔ موسم سرما میں سردی کڑاکے کی پڑتی ہے جس کی وجہ سے ہر قسم کا روغن اور سیال منجمد ہو جاتا ہے کسی سال اتنی اتنی برف گرتی ہے کہ مکانات کے صحن اٹ جاتے ہیں۔ عمدہ ہوا کی وجہ سے یہاں کے لوگ تنومند ہوتے ہیں۔ ان کا چہرہ روکھا اور ہاضمہ قوی ہوتا ہے اور حرارت غریزی کی کثرت کے سبب وہ دلیر اور بہادر ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ شہر ایک مضبوط مورچہ اور ایک مستحکم مقام اور ایک شاہی پایۂ تخت تھا۔

ابن غانیہ نے مرابطین کی تحریک و دعوت کے موقع پر ان مجاہدین سے جو مرموتہ میں آباد تھے، یہ کہا تھا:

''اندلس مثل ڈھال کے ہے اور غرناطہ اس کا دستہ ہے۔ اے مرابطین کی جماعت! اگر تم دستے کو مضبوط پکڑے

رہو گے تو پھر ڈھال تمھارے ہاتھوں سے کبھی نہیں نکل سکتی۔‘‘

قاضی ابوبکر نے مرابطین کی تحریک و دعوت کے موقع پر ان مجاہدین سے جو مرموتہ میں آباد تھے، یہ کہا تھا: ’’اندلس مثل ڈھال کے ہے اور غرناطہ اس کا دستہ ہے۔ اے مرابطین کی جماعت! اگر تم دستے کو مضبوط پکڑے رہو گے تو پھر ڈھال تمھارے ہاتھوں کبھی نہیں نکل سکتی۔‘‘

قاضی ابوبکر بن شیریں رحمہ اللہ نے اپنے چند اشعار میں غرناطہ کی شدید سردی کی کیا خوب توجیہ کی ہے۔ ان اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

’’خدا غرناطہ کو محفوظ رکھے، یہ ایسی جگہ ہے کہ یہاں غمگین کو مسرت اور خوشی حاصل ہوتی ہے اور جلا وطن کو پناہ ملتی ہے۔

میرا دوست اس منظر کو دیکھ کر گھبرا اٹھا کہ تمام چراگاہیں سردی سے برفستان بن گئی ہیں۔

غرناطہ ایک سرحدی مقام ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ساکنین کو محفوظ رکھے اور جو سرحداولوں کی طرح نہ ہو وہ خوش نما نہیں ہوتا۔

صوبہ البیرہ:

مؤرخین نے لکھا ہے کہ صوبہ البیرہ قبرہ سے شرق اور جنوب کے درمیان واقع ہے۔ اس صوبہ کی زمین سیر حاصل ہے۔ یہاں نہریں بکثرت جاری ہیں۔ پھل پھلاریاں بے شمار ہیں۔ درختوں کے جھنڈے ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ زیادہ تر اخروٹ کے درخت نظر آتے ہیں۔ گنے کی فصل بھی کثرت سے ہوتی ہے۔ چاندی، سیسہ اور لوہے کی قیمتی کانیں بھی یہاں موجود ہیں۔ اندلس کے تمام صوبوں میں البیرہ سب سے بہتر صوبہ ہے۔ دمشقی لشکر اس صوبے میں آ کر فروکش ہوا تھا۔

رازی کا بیان ہے کہ صوبہ البیرہ کے بہترین شہروں میں ایک قسطیلہ ہے جو اس صوبہ کا دارالحکومت ہے۔ اس شہر کے قطعات ایسے ہیں کہ سوائے غوطہ دمشق کے دنیا کا کوئی خطہ خوبی اور عمدگی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

غرناطہ کی کانیں اور خاص پیداوار:

بعض مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ غرناطہ کی خوبی یہ ہے کہ سال بھر تک یکے بعد دیگرے کسی فصل سے کھیت خالی نہیں رہتے اور ہر وقت کشت زار سرسبز و شاداب رہتے ہیں۔ اس کے مختلف علاقوں میں سونے، چاندی، سیسہ، لوہا اور توتیا کی بیش قیمت کانیں پائی جاتی ہیں۔ غرناطہ کے اطراف واکناف میں ایک قسم کی لکڑی پائی جاتی ہے جو خوشبو اور مشک بیزی میں عود سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہ لکڑی بہت کام آتی ہے۔ علاوہ ازیں

سنبل بھی پیدا ہوتا ہے جو نہایت خوشبودار ہے۔ جنطیانا ایک چیز یہاں پیدا ہوتی ہے جو یہیں سے تمام دنیا میں جاتی ہے۔ یہ تریاقی دواؤں میں اعلیٰ درجہ کی دوا ہے۔ ابوجعفر منصور نے بھی اس کی خواہش کی تھی۔ طب یونانی میں ایک جوارش "جوارش جنطیانا" موجود ہے جو اس دوا سے بنائی جاتی ہے۔ مختلف قسم کی مرقشیشا اور لاجورد سے یہ زمین مالا مال ہے۔ غرناطہ کے قطعات اور اطراف میں قرمز، جڑی بوٹیاں اور معدنی اور نباتاتی دوائیں اس قدر پیدا ہوتی ہیں کہ ان کا تفصیل وار بیان کرنا مشکل ہے۔ ریشم کی پیداوار پر غرناطہ کو فخر ہے۔ اس کی منفعت عظیم اور کسب معیشت کی بنا پر اس کو دوسرے ملکوں پر خاص امتیاز حاصل ہے، اور اس سے جس قدر منافع حاصل ہوتا ہے، اس فضیلت میں سوائے بلاد عراق کے کوئی شہر اس کا شریک نہیں ہے۔

غرناطہ کے وسیع قطعات جو غوطہ دمشق کی مانند ہیں، ان کی تعریف میں راستہ چلنے والے رطب اللسان رہتے ہیں اور ان کی داستانیں شب گزاری کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان قطعات کو ایسی ہموار اور کشادہ زمین عطا کی ہے کہ کم وبیش چالیس میل کے قطعہ میں ہر وقت پانی کے نالے بہتے رہتے ہیں۔ متعدد چھوٹی بڑی نہریں جاری رہتی ہیں۔ چاروں طرف کوٹھیاں اور باغات کشت زاروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان مناظر پر نظر ڈالنے سے آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں، اور یہ تمام خوبیاں اس قطعہ سے متجاوز نہیں ہونے پاتی ہیں۔ اونچے پہاڑ ایک مثلث کی شکل میں اس کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اس قطعہ کا قبلہ رخ (جنوبی) حصہ مرکز شہر سے ملا ہوا بلندی پر ہے اور اونچی اونچی پہاڑیوں کا سہارا لیے ہوئے ہے۔ غرض اس شہر میں حسن کی انتہا ہے۔ نظر اس پر جم جاتی ہے اور اوج وکمال کا مفہوم اس پر ختم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے اس شہر اور یہاں کے مسلمانوں پر بڑا کرم کیا ہوا ہے۔

اندلس میں عام عربوں کی آمد:

کتاب کے آغاز میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے کہ عرب فاتحین اس ملک میں کس طرح وارد ہوئے۔ اس بارے میں کئی روایات ہیں جن کی تفصیل کتاب میں بیان کی جا چکی ہے۔ جب جزیرۂ اندلس میں اسلامی بادشاہت قائم ہوگئی تو اس کے شہر زیر نگین ہوتے چلے گئے۔ اسلام کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی ہونے لگی، تو پھر عرب اندرون اندلس قرطبہ اور دیگر مقامات میں آنے لگے۔ ان عربوں نے یہاں مکانات بنائے اور شہروں کی آبادی میں معتدبہ اضافہ کیا۔

اس سرزمین میں پہلے موسیٰ بن نصیر کے ساتھ عربوں کے گھرانے آئے اور پھر انھیں کے زمانے میں اور عربی گھرانے آتے ہیں۔ اس کے بعد بلج بن کشیر قشیری کی سرکردگی میں عربوں نے یہاں قدم رکھے۔ یہ لوگ شامی کہے جاتے تھے۔ قشیری کے ساتھ جو عرب اندلس میں داخل ہوئے تھے، سنہ ۱۲۵ھ میں وہ مختلف مقامات اندلس میں آباد ہوئے۔

مسلمانوں نے جب قسطیلہ کو فتح کیا تو یہاں کے یہودی باشندوں کو جو آئے روز عیسائیوں کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنتے تھے، قسطیلہ کے ایک قصبہ میں آباد کر دیا۔ چنانچہ پھر عربوں کا یہی طریقہ رہا کہ جب کسی شہر کو فتح کرتے تو وہاں کے یہودیوں کو اس کے قصبے میں آباد کر دیا کرتے تھے اور ان کی حفاظت کے لیے کچھ مسلمان ان کے ساتھ متعین کر دیتے تھے۔

عربوں کی باہمی جنگ:

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ جس وقت شامیوں کا قافلہ لشکر بلج کی سرکردگی میں بربر سے ہزیمت اٹھا کر افریقہ سے اندلس پہنچا تو چونکہ یہ لوگ کثرت تعداد اور قوت بہادری میں شیر جیسے تھے، اس لیے ان عربوں کو جو اندلس میں پہلے پہل آ کر قرطبہ میں سکونت پذیر ہو چکے تھے، ان کو ان نو واردین کا آنا بہت شاق گزرا۔ انھوں نے فوراً ان نو واردوں سے قرطبہ سے چلے جانے کا مطالبہ شروع کر دیا کیوں کہ گمان یہ تھا کہ دونوں جماعتوں یعنی جو عرب پہلے سے آباد تھے اور ان واردوں کی ماندو بود کے لیے قرطبہ کی سرزمین بالکل ناکافی تھی۔ آخر کار ان نو واردین سے لڑنے کے لیے قرطبہ کے عربوں نے آستینیں چڑھالیں اور باہمی جنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا یہاں تک کہ جب ابوالخطا حسام بن ضرار کلبی اندلس کا گورنر مقرر ہو کر ساحل تیونس سے سمندر کو عبور کر کے اندلس پہنچا اور چپ چاپ بغیر کسی اطلاع کے قرطبہ آیا اس وقت بھی وہاں خانہ جنگی کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ باایں ہمہ حنظلہ بن صفوان والی افریقہ کے حکم سے اندلس میں سبھوں کو ابوالخطاء کی اطاعت قبول کرنا پڑی۔ اس نے جیسا کہ مشہور ہے شامی قبائل کے سرداروں کو گرفتار کر کے اندلس سے چلے جانے پر مجبور کیا، بلکہ شامی قبائل کو صوبجات اندلس کے متفرق مقامات میں آباد کرنا مناسب سمجھا تا کہ فتنہ کا سدباب ہو سکے۔ چنانچہ اس تجویز پر اس نے عمل کیا اور عیسائی ذمیوں کی تہائی مال گزاری ان قبائل کے لیے مخصوص کر دی۔ مطلب یہ کہ جہاں جہاں یہ لوگ آباد کیے گئے وہاں کے عیسائی کاشت کاروں کو حکم ہوا کہ مال گزاری کا تہائی حصہ جو پہلے وہ سرکار میں داخل کرتے تھے، اب ان نو آباد لوگوں کو ادا کریں۔ اس طرح سے تمام شامی قبائل ایک ایک کر کے قرطبہ سے نکل کر دوسرے علاقوں میں سکونت پذیر ہو گئے۔

قبائل عرب کی آبادی:

ابومروان کا بیان ہے کہ ایک اور شخص طباس نامی جو اندلس کے عیسائیوں کا لیڈر، ذمیوں کا سردار اور ان سے فرمان روایان اسلام کے لیے خراج لینے پر ماموراور علم و سیاست میں بہت مشہور تھا۔ اسی نے شروع میں تو ابوالخطا کو مشورہ دیا تھا کہ شامی لشکر اور قبائل کو دارالامارۃ قرطبہ میں نہ رہنے دیا جائے کیونکہ یہ شہر ان کے قیام کا متحمل نہیں ہو سکتا بلکہ اندلس کے مختلف شہروں میں وہ اس طرح آباد کیے جائیں جس طرح وہ بلاد شام کے

مکانات میں رہتے تھے۔ ابوالخطا نے اس کے اس مشورہ پر عمل کیا۔ ساتھ ہی ان قبائل کی پسندیدگی کا بھی لحاظ رکھ کران کو اس طرح آباد کیا کہ دمشقی لشکر کو صوبہ البیرہ میں جگہ دی اور دوسرے لشکروں کو دوسرے صوبوں میں رکھا اور بعض قبائل کے رہنے کا انتظام صوبہ تدمیر میں کیا۔ غرض کہ یہ مقامات لشکری عربوں کے رہنے کے لیے قرار پائے۔ اور ان کے کھانے پینے اور آذوقہ کے لیے ذمیوں کی مال گزاری کی ایک تہائی جو وہ حکومت کو دیتے تھے وہ ان کے لیے مقرر کر دی۔ ان کے علاوہ اور جو لوگ باقی رہ گئے، وہ عرب اور شہر کے دوسرے باشندے، اور بربری قوم کے افراد یہ سب ساتھ رہنے لگے۔ یہ تمام قبائل آباد ہو کر قابل رشک زندگی بسر کرنے لگے۔ افزائش نسل اور فراوانی دولت میں روز بروز بڑھتے چلے گئے۔ البتہ جن لوگوں کے قدم فتوحات کے سلسلہ میں ابتداء ً یہاں آئے تھے، انھیں شہروں سے نکلنے پر مجبور نہیں کیا گیا تھا بلکہ خود انھوں نے جب شہروں کو اپنے شامی شہروں کے موافق پایا تو وہ سکونت پذیر ہو کر خوش وخرم زندگی بسر کرنے لگے اور ان کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہو گیا اور وہ مالا مال ہو گئے۔ جو لوگ اپنی پسند کے مقامات پر آباد ہو چکے تھے انھوں نے اپنی جگہ سے ہٹنا پسند نہیں کیا بلکہ وہیں شہریوں کے ساتھ مل جل کر رہنے لگے۔ جب کوئی جنگ چھڑتی یا وظیفہ تقسیم ہوتا تو اپنی اپنی فوج میں جا ملتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ان دنوں ''شاوہ'' کہے جاتے تھے۔

فوجی انتظام:

احمد بن موسیٰ کا بیان ہے کہ خلیفہ دوقسم کے جھنڈے ان عربوں کے لیے مقرر کرتا تھا۔ ایک غازیوں کا اور دوسرا مقیمین کا۔ غازی کو اپنی جنگی خدمت کے صلہ میں دوسو دینار ملتے اور مقیم تین ماہ تک بلا کسی معاوضہ کے رہتا، اور جب اس کی یہ مدت ختم ہو جاتی تھی تو اس کو کسی غازی کی جگہ پر بھیج دیا جاتا۔ جو اس کے خاندان سے یا اس کا کوئی مماثل ہوتا تھا، اور غازی تین ماہ آرام کرتا تھا۔ غازی معاہدین کے بھائی، اولاد اور برادر ہم زاد کو جو شامی فوجوں میں ہوتے تھے، انھیں اختتام جنگ پر دس دس دینار دیے جاتے تھے۔ معاہدین کا یہ فرض تھا کہ وہ سپہ سالار کے ساتھ رہ کر ان لوگوں کے حالات کی تحقیقات کیا کریں جو جنگی خدمات میں اپنے آپ کو انعام و اکرام کا مستحق بنتے تھے۔ چنانچہ معاہدین کے اعزاز کی بنا پر جس جس کی وہ سفارش کرتے تھے انھیں انعام و اکرام دیا جاتا تھا۔ ان معاہدین کی خدمات صرف فوج سے متعلق ہوتی تھیں، اور جو شامی غازی معاہدین کے خاندان سے نہ ہوتے انھیں اختتام جنگ پر پانچ پانچ دینار ملتے تھے، باشندگان شہر میں سے بجز معاہدین کے کسی کو کچھ نہیں دیا جاتا تھا۔ اور شہریوں کے لیے بھی دوقسم کے جھنڈے مقرر تھے۔ ایک غازیوں کا اور دوسرا مقیمین کا۔ ہر غازی کو سوسو دینار ملتے اور چھ ماہ کے بعد اس کو رخصت دی جاتی تھی، اور اس کی جگہ مقیم کام کرتا تھا۔

محاسب اور منشی خاص کر شامیوں میں سے ہوتے تھے اور تمام شامیوں کو عشر یعنی زمین کی پیداوار کے دسواں حصہ کی ادائیگی سے آزاد کر دیا گیا تھا، البتہ جنگی خدمات کے لیے انھیں ہر وقت آمادہ اور مستعد رہنا پڑتا

تھا۔ اور سوائے ان ذمیوں کی مال گزاری کے جن کے کاشت کار عیسائی اور مالک وہ خود تھے، انھیں اور کوئی محصول نہیں دینا پڑتا تھا۔ بقیہ شہری عربوں کو دیگر باشندگان شہر کی طرح عشر ادا کرنا پڑتا تھا۔ ان میں جو خاندان اور کنبے والے ہوتے تھے انھیں شامیوں کی طرح جنگ میں بھی شریک ہونا پڑتا تھا، اور اس کا کوئی صلہ یا معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا، اور ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جاتا تھا جس کا ذکر گذشتہ سطور میں کیا گیا ہے۔ باشندگان شہر کو جنگی خدمات کے لیے نام درج کرانا لازمی تھا۔

جنگ کی یہ صورت ہوتی تھی کہ خلیفہ دو لشکروں کو دو طرف بھیج دیتا تھا جس کا انھیں پہلے علم نہیں ہوتا تھا۔ اور تیسرا گروہ جس کا نام ''نظرا'' تھا جو کہ شامی اور باشندگان شہر کا ہوتا تھا، مخالفوں سے نبرد آزما ہوتا، اس کے ساتھ ہر فریق کے دیگر شہری باشندے بھی سرگرم پیکار ہوتے تھے۔

البیرہ کے مسلمانوں کے ساتھ نصاریٰ کا برتاؤ

جب البیرہ میں مسلمان متمکن ہو گئے اور گورنر ابوالخطا نے شامی قبائل کو ذمیوں کی مال گزاری کی تہائی آمدنی دے کر اس صوبہ میں آباد کیا تو وہ عیسائیوں کے ساتھ مل کر رہنے لگے اور ان کے ساتھ زراعت اور دیہات کی آبادکاری میں مصروف ہو گئے ان عیسائیوں کی روایات ان کے ہم مذہب شیوخ کرتے جو نہایت آزمودہ کار، مدبر، بااخلاق اور رعایا کی مال گزاری کی مقرر شرح سے واقف ہوتے تھے۔ ان میں سے بہت زیادہ عاقل ابن غلاس تھا جس کی شہرت، ناموری اور دبدبہ کا غلغلہ امراء اور رؤساء تک پہنچ گیا تھا۔

عیسائیوں کی ایک مشہور عبادت گاہ (گرجا) غرناطہ سے کچھ فاصلہ پر باب البیرہ کے مقابل راستہ اور ایک چشمہ کے درمیان مقام قولجر کے پاس واقع تھی، جس کو ان کے کسی مذہبی پیشوا نے بنایا تھا، اور بعض امراء روم یعنی عیسائی امراء کی خاص توجہ نے اس کو ایسا مزین اور مرصع کیا کہ کاریگری میں وہ بے مثل ہو گئی تھی۔ فقہاء کے شدید اصرار اور فتاویٰ سے متاثر ہو کر مراکش کے بادشاہ یوسف بن تاشفین نے اس عبادت گاہ کو منہدم کرنے کا حکم دے دیا۔ اس شاہی حکم کے بعد ماہ جمادی الاولیٰ سنہ ۴۹۲ھ دوشنبہ کے روز غرناطہ شہر کے تمام باشندگان اس کو مسمار کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے، اور آناً فاناً اس عالی شان عمارت کو مسمار کر کے چٹیل میدان کر دیا، اور ہر شخص جو کچھ پا سکا لے گیا۔ آج تک یہ جگہ مشہور ہے اور اس کی بوسیدہ دیواریں اپنی زبان حال سے اس کی مضبوطی اور استحکام کی خبر دے رہی ہیں، اور اسی کے ایک مقام پر اب ابن سہل بن مالک کا مزار ہے۔

جب باغی دشمن اسلام ابن رذمیر نے جنگوں کا سلسلہ شروع کیا تو حکومت مرابطین نے جو اس وقت بہت شان وشوکت سے قائم کی، نصاریٰ سے ایک معاہدہ لکھوایا تاکہ حکومت ہاتھ سے نہ جانے پائے، لیکن اطراف وجوانب کے باغی نصاریٰ نے ابن رذمیر سے گفتگو شروع کی اور متواتر خطوط اور قاصد روانہ کیے تاکہ وہ (ابن رذمیر) غرناطہ کو فتح کرے، لیکن جب اس کے آنے میں تاخیر ہوئی تو نصاریٰ نے بارہ ہزار نوجوان عیسائیوں کی ایک جماعت اس کے پاس بھیج دی جس نے اس کے جذبۂ شوق اور ہوس وطمع کو برانگیختہ کرنے کے خیال سے غرناطہ کے اوصاف وفضائل دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں بیان کرتے ہوئے کہا: ''یہاں کے وسیع میدان، یہاں کی پیداوار جو، گندم، السی، ریشم، انگور، زیتون اور انواع واقسام کے پھل، چشموں کی کثرت،

نہروں کی زیادتی، مستحکم قلعے، رعایا کی اطاعت پذیری، باشندوں کا اتفاق، بلند مقامات اور اونچے پہاڑوں کے عمدہ مناظر یہ سب ایسی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر قدیم عیسائی سلاطین نے قسطیلہ (غرناطہ) کا نام "سنام الاندلس" رکھا تھا۔

آخر کار ان باغی عیسائیوں نے ابن رذمیر کو راضی کر لیا۔ چنانچہ اس نے لشکر کو ترتیب دیا اور اوائل شعبان سنہ ۵۱۵ھ میں روانہ ہوا لیکن اپنی غرض پوشیدہ رکھی۔ وہ بلنسیہ آیا۔ وہاں سے مرسیہ گیا۔ پھر البیرہ پہنچا، اس کے بعد منصورہ میں آیا، اور بالآخر غرناطہ کا مصافحہ جنگی ہاتھوں سے کیا اور وہاں اپنی ناکامی پر ایک ماہ کے لیے ٹھہر گیا۔

مصنف انوار جلیلہ نے لکھا ہے کہ ابن رذمیر کے آتے ہی غرناطہ میں اس معاہدہ کا جو حکومت مرابطین نے غرناطہ کے عیسائیوں سے لکھوایا تھا، قصہ چھڑ گیا۔ اور عیسائیوں کی غرض ابن رذمیر کو غرناطہ بلانے ظاہر ہو گئی۔ غرناطہ کے موجودہ حاکم نے عیسائیوں کی سرزنش کا ارادہ کیا، لیکن اس میں اس کو ناکامی ہوئی۔ عیسائی ہر طرف سے بھاگ بھاگ کر ابن رذمیر کے پاس پہنچ گئے۔ جب دشمن کے عندیہ کی اطلاع اندلس اور افریقہ کی اسلامی فوجوں کو ملی تو یہاں پہنچ کر انھوں نے غرناطہ کو اپنے حصار میں لے لیا حتیٰ کہ وہ ایک دائرے میں مثل نقطہ مرکز کے بن گیا۔ ابن رذمیر داری آش سے قریہ وجمہ میں چلا آیا۔ اس وقت خطرے کی یہ حالت تھی کہ مسلمانوں نے غرناطہ میں عید الاضحیٰ کے روز مسلح رہ کر صلوٰۃ الخوف ادا کی، اور دوسرے روز ظہر کے بعد عیسائی فوجیں مقام جمل پر جو غرناطہ سے مشرق کی سمت واقع ہے، نمودار ہوئیں اور چھ میل کے فاصلے سے جنگ شروع ہو گئی۔ مجاہدین اسلام بھی اس شہر میں بکثرت آ گئے یہاں تک کہ سواد غرناطہ ان سے بھر گیا۔ آسمان سے مسلسل اولے بھی برسنے لگے اور پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ دشمن اپنی جگہ ۹۔۱۰ دن تک متواتر جمے رہے، لیکن وہ کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ صرف معاہدے کی رو سے رسد مہیا کر لیتے تھے لیکن وہ بھی بند کر دی گئی۔ غرناطہ (سنام الاندلس) کو حاصل کرنے کی جو امید قائم تھی وہ خاک میں مل گئی۔ ناچار ۲۳ ذی الحجہ سنہ ۵۱۵ھ کو ابن رذمیر نے یہاں سے کوچ کر جانے کا ارادہ کر لیا اور جن عیسائیوں نے ان کو بلایا تھا، جن میں ابن غلاس مشہور عیسائی سردار بھی تھا، اس کی سرکوبی کرنا چاہی تو جن لوگوں نے خود ابن رذمیر پر اس کی سستی اور تاخیر کرنے کا الزام لگایا اور کہا کہ اسی وقفہ میں اسلامی فوجیں آ گئیں جس کی وجہ سے وہ بھی مسلمانوں کے ساتھ ایک مصیبت اور ہلاکت میں پڑ گئے۔

بالآخر ابن رذمیر قریۂ مرسانہ سے بیش روانہ ہوا اور قلعہ یحصب کے کنارے کنارے سے چلتے ہوئے قبرہ اور رسامہ کی طرف اتر گیا، لیکن اسلامی فوجیں اس کے تعاقب میں اسلامی لشکر میدان دینسول میں مقابلے کے لیے تیار تھا۔ کبھی کبھی دونوں فوجوں میں مقابلہ بھی ہو جاتا اور غلبہ اسلامی لشکر کو ہو جاتا۔

ایک دن رات گئے اسلامی لشکر کے سردار نے اپنے خیمہ کو نشیبی زمین سے اٹھا کر بلند مقام پر نصب کرنے کا حکم دیا۔ اس سے مسلمانوں میں بدگمانیاں پیدا ہو گئیں۔ اور اس قدر ابتری واقع ہوئی کہ کچھ لوگ

بھاگ گئے اور دوسری طرف دشمن کا خوف برابر طاری رہا۔ بالآخر ابن رذمیر رات گزرنے پر دینسول میں داخل ہوا اور اس پر قبضہ کرلیا۔ دوسرے روز جب وہ ساحل کی طرف روانہ ہوا اور اپنی فوج کو جو مختلف ممالک کی تھی لکڑیوں کے بیڑے پر دریائے شنیل سے عبور کرایا۔

مختصر یہ کہ وہ غرناطہ کی طرف دوبارہ بڑھا لیکن اب اس کے قدم اس قریہ میں جو غرناطہ سے جانب جنوب مشرق ٦ میل کے فاصلہ پر تھے، نہ جم سکے۔ اس لیے وہ دو دن کے بعد قریۂ ہمدان چلا گیا۔

ابن صیرفی کا بیان ہے کہ کتب جفر میں یہ لکھا ہے کہ یہ سرزمین برباد ہوگی یہاں صرف یتیم اور بیوہ عورتیں رہ جائیں گی، اور اس روز تو یہ موقع آ ہی گیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے بچالیا اور وہ اس روز کے بعد ایک کھلے میدان کی طرف چلا گیا جو اس پر تنگ ہو رہا تھا اور اسلامی رسالہ بھی اسے تنگ کر رہا تھا۔

دشمن عین اطسہ چلا آیا۔ عظیم الشان فوج ساتھ تھی اور وہ مستعد ہو کر اور پوری احتیاط کے ساتھ بغیر کہیں آرام کیے ہوئے براجلات کو طے کرتا ہوا القوق میں آیا اور وادی آش تک پہنچ گیا۔ اس سفر میں اس کے بہت سے ساتھی ہلاک ہو گئے۔ پھر وہ مشرق کی طرف روانہ ہوا اور مرسیہ اور شاطبہ پہنچا۔ اسلامی فوجیں اس کے تعاقب میں تھیں۔ کہیں کہیں مقابلہ بھی ہو جاتا تھا۔ امراض وبائی بھی اس کی فوج میں پھیل گئے۔ اسی حالت میں وہ اپنے شہر پہنچا۔ جب وہ پیچھے مڑ کر اپنی حالت کو دیکھتا تو ہکا بکا رہ جاتا کیوں کہ بغیر کسی لڑائی کے اس کی یہ پسپائی بہت ہی ذلت آمیز تھی جس میں کہ قریب تھا کہ بخت اس کی تمام عزت و منزلت کو خاک میں ملا دے۔

غرناطہ سے ذمیوں کا اخراج:

جب مسلمانوں کو ذمیوں کا یہ فریب معلوم ہوا جس کی وجہ سے جھگڑا طول پکڑ گیا تھا تو ان میں ایک جوش پیدا ہوا۔ ان کے دل آتش غیظ و غضب سے جلنے لگے اور سینوں میں اسلامی جذبہ پیدا ہوا۔ قاضی ابو الولید بن رشد نے مسافرت اختیار کر کے یوسف بن تاشفین سے ملاقات کی اور اس سے یہاں کا تمام حال بیان کیا اور جو کچھ کہ ذمیوں نے شرارتیں کی تھیں وہ سب کہہ سنائیں، مثلاً رومیوں کو بلانا، نقض عہد کر کے ذمیت سے خارج ہونا۔ غرض تمام باتیں کہہ کر ان کو جلا وطن کرنے کا فتویٰ صادر کیا اور یہ کہا کہ یہ سزا بھی ان کے لیے کم ہے۔ یوسف بن تاشفین نے اس فتویٰ پر عمل کیا اور اس کے حکم سے رمضان کے مہینہ میں وہاں سے ایک بہت بڑی جماعت افریقہ کو جلا وطن کر دی گئی۔ راستوں کی دشواری اور آب و ہوا کی غیر مناسبت سے انھیں سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔ وہ تتر بتر ہو گئے۔ ان میں سے ایک بہت بڑی تعداد ہلاک ہوگئی۔ جس میں اکثر یہودی تھے۔ ایک گروہ اہل دول کی سفارش سے سنہ ۵۵۹ھ تک غرناطہ ہی میں رہا جہاں ان کی تعداد پھر کثیر ہوگئی۔
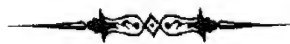
بیرون غرناطہ عربوں کے مقامات

اطراف غرناطہ کے مناظر:

شہر غرناطہ بڑے بڑے شاہی باغوں اور اونچے اونچے گھنے درختوں سے گھرا ہوا ہے، فصیل شہر اس طرح قائم ہے کہ اس کے کنگروں کی چوٹیاں درخت ساگوان کے سبزہ میں ہر وقت چمکتی رہتی ہیں، اس منظر کو دو بیتوں میں کسی موقع پر ظاہر کیا گیا جو حسب ذیل ہے:

''غرناطہ ایک ایسا شہر ہے کہ اس کے چہار طرف باغ ہی باغ ہیں گویا کسی حسین کا چہرہ ہے اور باغ اس کے رخسار ہیں اور اس کی وادی کسی نازک اندام کی کلائی ہے۔ اور اردگرد کے مستحکم پل اس کے کنگن ہیں۔''

شہر کے اطراف میں کوئی جگہ انگور کی بیلوں اور دوسرے باغوں سے خالی نہیں ہے۔ اگرچہ چند گز زمین خالی رہ گئی ہے تو وہ چنداں قابل اعتبار نہیں ہے، اطراف شہر کا نشیبی حصہ اس قدر سرسبز ہے کہ اس کی قیمت کی کوئی حد قائم نہیں کی جا سکتی، اہل ملک کے سوا دوسرے اس کی قیمت کی ادائی سے قاصر ہیں، اس میں بعض ایسے باغ ہیں کہ ان کے سال بھر کی پیداوار سے تقریباً ایک ہزار دینار حاصل ہوتے ہیں۔ اور ان کی اچھی اچھی سبزی، عمدہ عمدہ میوہ جات، اور دوسرے پھلوں کے ذخائر سے دکانیں ہر وقت سجی رہتی ہیں۔

شاہی باغات:

شاہی باغات شہر کے اطراف میں بہ شکل طوق محیط ہیں، ان کی تعداد تقریباً سو ہے جن میں سے بعض یہ ہیں:

''باغ عدان المیسۃ، باغ عصام، باغ عروہ، باغ قداح بن سحنوق، باغ ابن موذن، باغ ابن کابل، باغ نخلۃ العلیا، باغ نخلۃ السّلفی، باغ ابن عمران، باغ نافع، باغ مقبل، باغ عرض، باغ حضرۃ، باغ جرف، مدرج نجد، مدرج سبک، باغ عریف۔''

یہ تمام باغات اپنی خوبصورتی، منظر، سرسبزی، سیرابی، زمین کی عمدگی اور اشجار کی کثرت کے لحاظ سے بے مثل ہیں، ان کے قرب و جوار میں بعض موقوفہ اور بعض لوگوں کی مملوکہ زمینیں ہیں یہ بھی بہت عمدہ شمار کی جاتی ہیں۔

وادی سنجل یا شنیل:

وادی سنجل تمام باغوں کے متصل واقع ہے، اس پر نظر نہیں کام کرتی، اور زبان اس کی تعریف سے قاصر ہے، اس کی نہریں ہر وقت لہریں لیتی رہتی ہیں، جب ان میں اشجار کا عکس، اور بلند مقامات کی روشنی پڑتی ہے تو ان میں باغوں کی تصویر اتر آتی ہے، ان باغوں میں بعض ایسے درخت بھی ہیں جو بار بار پھل لاتے رہتے ہیں، یہ تمام چیزیں اس شہر کی خصوصیات میں داخل ہیں جن سے دوسرے خطے قطعاً محروم ہیں، بلاشبہ یہ وادی غرناطہ کے محاسن میں داخل ہے، اس میں پانی برف اور اولوں سے پگھل پگھل کر رواں رہتا ہے، اس کا بہاؤ ایسی ریت پر ہے جو زراعت کے لیے اکسیر ہے اس وادی پر درختوں کی چھاؤں برابر رہتی ہے اور یہ غرناطہ کی مشرقی و جنوبی سمت سے نکل کر عالیشان مکانات، بلند مقامات، اور اونچے اونچے محلات کو طے کرتی ہوئی اس کی مغربی سمت کو چلی گئی ہے۔

اہل شہر ان باغوں سے لطف و دلچسپی حاصل کرتے ہیں، اور کاروبار سے فارغ ہو کر جب وہ یہاں آتے ہیں تو اس وادی کی نہر پر ریت کا مرصع تخت اور گھنے درختوں کا عروسی کمرہ موجود پاتے ہیں، کہیں کہیں اخروٹ کے درخت بھی نصب ہیں جو مائل کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، یہ شخص دولت بادیسیہ کا ایک خادم تھا۔

غرناطہ کی شان میں ابوالحجاج یوسف بن سعید بن حسان نے حسب ذیل اشعار لکھے ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

”جب باد نسیم چلتی ہے تو غرناطہ کے اشتیاق میں سوزش قلب اور شوق دیدار پیدا ہوتا ہے، خدا غرناطہ کی ہر ایک گھاٹی کو برسنے والے بادلوں سے سیراب فرمائے، یہ وہ ملک ہے جس کے گھروں میں حسن رچ گیا ہے، اور یہ وہ سرزمین ہے جس کے شوق دید میں غم غلط ہوتا ہے، اے بلند ترین غرناطہ تجھے خدا کی قسم ہے بتا کیا ایک سرگرداں اور گریاں شخص کے لیے تیری طرف کوئی راہ ہے۔ مجھے اس کے مناظر کی تروتازگی اور وادیوں کی عمدگی نے، مشتاق بنا دیا ہے، یہی چیزیں آنکھوں کی طراوت ہیں، اے مخاطب دیکھ اور جب تو دیکھے گا تو نظر آئے گا، کہ قصر حمراء سے تجھ تک گل لالہ کا سلسلہ قائم ہے، جب غرناطہ کے بلند مقامات پر پھریرے لہراتے ہیں، اس وقت گویا شفق پر بجلیاں چمکتی ہیں، دریائے شنیل نے نیام سے ہندی تلوار کھینچ لی ہے جس پر موتی اور عقیق جڑے ہوئے ہیں، اس کے درخت پہلو سے جب خوشبو پھیلتی ہے، تو دانۂ مشک کی خوشبو کا دھوکہ ہوتا ہے، اور جب چشم ابر اشک ریز ہوتی ہے، تو اس کے باغوں میں بابونہ کے خوبصورت غنچے کھلاتے ہیں۔“

شعراء نے وادی سنجل کی تعریف میں ترانے لکھے ہیں، اور لوگوں نے اس کو دریائے نیل پر فضیلت دینے میں کافی طبع آزمائیاں کی ہیں، اس کا دوسرا نام شنیل ہے، اور (ش) کے ہزار عدد ہوتے ہیں اس بنا پر شاعرانہ انداز میں یوں کہنا چاہیے کہ اس کو نیل پر ہزار درجہ فوقیت حاصل ہے۔ ہم نے اسی مضمون کو نظم میں شیخ حسن بن الجیاب کی خاطر چیستاں کے رنگ میں ادا کیا تو آپ نے اسے بہت پسند فرمایا۔ شعروں کا ترجمہ یہ ہے:

''ایک نام ہے اس میں ہزار عدد اضافہ کرنے سے بھی بے کم و کاست اس کا مفہوم وہی رہتا ہے۔
دونوں اگرچہ مرتبہ اور شہر کے لحاظ سے مختلف ہیں مگر شین کی وجہ سے معنی میں متحد ہیں، بتاؤ کیا ہے؟''

دریائے شنیل کے دو حصے ہیں ہر ایک نہایت خوبصورتی اور پائداری کے ساتھ مضبوط چٹانوں سے استوار کیا گیا ہے، اس دریا کے متصل ایک قدیم اور مستحکم عمارت قائم ہے، جس کے سامنے ''لعب عیدی'' جسر اور جدار الرابط کے درمیان واقع ہے اس کے علاوہ ایک اور خوبصورت ملعب (بازیچہ گاہ) ہے جس کی دائیں جانب ایک گوشہ میں نہر رواں ہے اور بائیں جانب چمن ہے، اس ملعب کو انتہا رابطہ پر ہوئی ہے جو قصر سید کے باب کے پاس ہے اور اس شیریں دریائے شنیل سے بہت سی چھوٹی چھوٹی نہریں نکالی گئی ہیں، جن سے کافی تعداد میں پن چکیاں چلتی ہیں۔

غرناطہ کا حدود اربعہ

شہر غرناطہ کی تین سمتوں کو جن کی سطح مرتفع ہے انگور کے باغوں سے بہ شکل طوق گھیر لیا ہے، اوران کے سامنے پاس ہی میں پہاڑ کھڑے ہیں، یہی وجہ ہے کہ نشیب وفراز اور بلندی وپستی ہر جگہ نمایاں ہے، اس شہر کی صرف ایک سمت میں نہایت ہموار وکشادہ میدان ہے، جو مشرقی باب البیرہ سے گزر کر ایک عمیق خندق تک چلا گیا ہے، اس کا نام المشائخ ہے، اس میدان کی پہنائی طول وعرض میں بہت زیادہ ہے، اس میں بے شمار برج اور کارخانے قائم ہیں، اوران کی عمارتیں انواع واقسام کے پھل، زیتون، بادام، آلو بخارا، بہی وغرہ میوہ جات کے اشجار، انگور کی بیلوں، اور پھولوں کے گھنے درختوں میں روشن وتاباں نظر آتی ہیں، غرض اس خطہ میں بکثرت باغ بھی ہیں، اور گلزار بھی، قلعہ جات بھی ہیں، اور مملوکہ اراضی بھی اور رہنے کے لیے ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ مکانات بنے ہوئے ہیں۔

قاضی ابوالقاسم بن ابی العافیہ فقیہ رحمہ اللہ نے جن کے ایام طفولیت یہاں بسر ہوئے تھے، عروس الشعراء ابواسحاق ساحلی ادیب وسیاح کے جواب میں انھیں چیزوں کی طرف اپنے قصیدے میں اشارہ کیا ہے، قصیدہ کا ترجمہ یہ ہے:

''اے بعید الوطن تیرا اونٹ سفر میں پالان سے خوب کھیلا، جس طرح تند ہوائیں شاخوں سے کھیلتی ہیں، اور تو اس سواری کے ذریعے دور دراز مقام پر پہنچا، جہاں کوئی نہ پہنچ سکا۔ تو ہمارے مقامات و مساکن کا مشتاق کیوں نہ ہوا، حالاں کہ تو ان کے گلے اور سینے کا ہار تھا، ان مقامات میں ایک المشائخ ہے جس کے فرحت افزا باغوں میں قمریاں ستارے کے سرود کی طرح نغمہ سرا رہتی تھیں، اور ہماری خوابگاہ یہیں واقع تھی نیز یہاں کی شراب انگوری شراب کی طرح صاف وشفاف ہوتی تھی، اور زندگی یہاں خوش وخرم بسر ہوتی تھی اور خواہش نفس غنچۂ دنداں وثمر بالیدہ (بوسہ وکنار) سے بہرہ اندوز ہوتی تھی، جس وقت یہاں کی نازک قد وقامت والیاں معانقہ کرتی تھیں تو معلوم ہوتا تھا کہ درخت کی شاخیں ایک دوسرے سے گلے مل رہی ہیں، افسوس! وہ زمانہ اس کی خوبیاں اس کی تمنائیں اور اس کا عیش نشاط سب مفقود ہو گیا، اس زمانے کی راتیں ایسی ہوتی تھیں کہ بے مایہ بھی دوسری راتوں کی پروا

نہ کرتا تھا وہ کوتاہ اور دراز راتیں ہوتی تھیں مگر اب میں ان دونوں سے محروم ہوں۔"

رہ گیا وہ قطعہ جو پہاڑ سے سہارا لگائے ہوئے ہے اس کے ایک طرف بیاریز ہے جو دامن کوہ میں ہے اس سے ملحق کدیہ عین الدمع ہے جو جبل فخار کے قریب اور عین القبلۃ کی جانب واقع ہے، یہ قطعہ ہر وقت پانی سے سیراب رہتا ہے، اس کی وضع اور ہیئت نوادر سے شمار کی جاتی ہے اس میں نہایت عمدہ عمدہ باغ و چمن لگے ہوئے ہیں جو ہوا کے اعتدال، پانی کی شرینی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے اس کے اطراف مرتفع ہیں۔ جہاں قصر و ان منارے، عالیشان مکانات، چاندی کی عمارتیں اور بہتر سے بہتر پھولوں کے درخت ہیں، بڑے بڑے ہوشیار اور ماہرین صناع کے ذریعہ ان عمارتوں میں چاندی کی ملمع کاری کی گئی ہے، اور اس پر زرو جواہر کوڑیوں کی طرح صرف کیے گئے ہیں، اور ہر زمانہ میں عہدہ داران حکومت اور دوسرے لوگوں میں تعمیری سلسلہ کی منافست ہوتی رہی ہے، ان وجوہ سے یہ بقعہ اپنے حسن و جمال میں اعجوبۂ روزگار ہو گیا اور بطور ضرب المثل کے اس کی شہرت ہوگئی، چنانچہ یہاں کے ساکنین وزائرین میں جو لوگ فصیح و بلیغ تھے انھوں نے اپنی نظموں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کی تعریف میں بہترین شعر شیخ ابوالبرکات نے لکھا ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے:

"میری ان اشک بہانے والی آنکھ سے کہہ دو کہ وہ مقام عین الدمع کے فراق میں اتنے آنسو بہائے کہ ان کی انتہا خون پر ہو۔"

مقام عین الدمع کی شان میں ایک اور قصیدہ لکھا گیا تھا جس کے دو شعروں کا ترجمہ یہ ہے:

"اے عین الدمع تیری یاد میں بے شمار لولوئے اشک نثار کیے گئے ہیں شاید تیرا زمانہ واپس آئے جب راتوں کو بادنسیم چلتی ہے تو تیرا شوق میرے دل میں چٹکیاں لیتا ہے۔"

میں نے عین الدمع میں اپنا ایک قصر تعمیر کیا، جس کے قبہ پر اپنے یہ چند شعر لکھوائے جن کا ترجمہ یہ ہے:

"اگر عین الدمع حقیقی آنکھ ہوتا تو ہمارا یہ مقام اس کا دیدہ ہوتا، خدا اس کو عیش و عشرت کی جگہ باقی رکھے اور اس کی بہترین منزل میرے لیے ہمیشہ رہے، ستارۂ ثریا اس کی مٹی بننا چاہتا ہے اور ستارۂ شعری اس کی ستایش کرتا اور عوا اس کا محافظ ہے۔"

ابوالقاسم بن قرطبہ فقیہہ نے ایک طویل قصیدہ اس مقام کی شان میں لکھا ہے جس کے چند شعر اس موقع پر درج کیے جاتے ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

"مقام عین الدمع آنکھوں کی حد نظر ہے، اے مخاطب نور افروزی چاہتا ہے تو اس پر اپنی نظر ڈال اور شوق رکھتا ہے تو مقام اوزان پر جا کیونکہ اس کی بلندیوں پر گاوان دشتی (حسینان) کی چراگاہ ہے۔ وہاں فصل بہار کو سلام اور مصافحہ کرنا۔ پھر گلوں کے جمگھٹ میں انس کے رخسار کو بوسہ دینا۔ اور ان بلندیوں پر شراب کہنہ نوش کرنا، جو تیرے دل کے زنگ کو دور کر دے گی۔ یہ شراب اتنی کہنہ ہے کہ زمانے کو اس کی عمر یاد نہیں اور حوادث زمانہ سے بے خوف رہتی آئی ہے، وہ کسریٰ اور ساسان کے

حالات بھی بتاتی ہے۔اور سرسبز قدیم درخت انگور کی خبر دیتی ہے۔"

آپ کے اور چند اشعار ملاحظہ ہوں جن کا ترجمہ یہ ہے:

"عین الدمع نے ہمیں بے حد ملول کر دیا۔ کیونکہ وہاں شادمانی جام محبت سے ہمیں سیراب کرتی تھیں۔ وہاں ہر قسم کے عیش ونشاط کے سامان میسر تھے۔ یہاں تک کہ چڑیاں بھی وجد میں آ کر ہم سے سرگوشی کرتی تھیں وہاں پانی کی نہریں ان تلواروں کے مشابہ تھیں جو جنگ صفین میں بے نیام کی گئی تھیں۔اور وہاں ڈالیوں پر چشم گل تیز نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ گویا وہ ہرن کی آنکھیں تھیں جو ہمیں مشتاق کرتی تھیں۔"

ایک شاعر کے دو شعر اور ملاحظہ ہوں جن کا ترجمہ یہ ہے:

"میں نے عین الدمع میں ایک ایسی رات بسر کی کہ میں صرف اس کے مقامات ہی کو دیکھتا رہا اور اس نے مجھے احباب کی معیت سے بے نیاز کر دیا، جب باد صبا چلتی تھی تو خوشبو مجھ سے ہم کنار ہو جاتی تھی اور اس کی خواب آور ہوائیں مجھے محبوبہ کی آنکھوں کی عدم موجودگی سے صبر دلا دیتی ہیں۔"

الغرض اس خطہ کی تعریف وتوصیف میں اس کثرت سے لوگوں کے اقوال ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا ناممکن ہے، اگرچہ دیگر مقامات بھی فوائد ومنافع سے خالی نہیں مگر وہ اس خطہ کے رتبہ کو نہیں پہنچے۔تمام باغ وکشت زار کا سلسلہ غرناطہ کی مشرقی وجنوبی سمت سے شروع ہو کر مغربی سمت تک چلا گیا ہے، اس خطہ میں اونچے اونچے پہاڑ، وسیع میدان، کشادہ وادیاں اور خوفناک غار بکثرت ہیں، انگور کی بیلوں اور بڑے بڑے درختوں کی کوئی انتہا نہیں، مکانات وقصور بے حد، بے حساب ہیں، اس وقت بھی قصور کی تعداد چودہ ہزار ہے۔
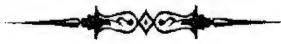
باغات اور قریوں کی تفصیل

شہر پناہ کے باہر باغات، عمارات اور زرخیز اراضی:

غرناطہ کے شہر پناہ کے باہر باغوں اور عمارتوں کا ایک وسیع سلسلہ ہموار زمین پر قائم ہے، جن کے گردا گرد نہایت زرخیز اور کثیر المنفعت اراضی واقع ہیں، ان میں سال بھر متواتر کئی فصلیں ہوتی ہیں، ہر وقت ان میں کبوتر دانے چگتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور ان کا کوئی حصہ زراعت سے کبھی خالی نہیں رہتا ہے، اس زمانے میں اراضی کا ایک بڑا قطعہ پچیس خالص طلائی دینار تک فروخت ہوتا ہے۔

شاہی اراضی:

چونکہ یہ اراضی شاہی ہیں، ان کی زراعت، انتظام، اور حالت بھی قابل رشک ہے اس لیے ان کی قیمت کا اندازہ نہیں ہوسکتا ہے، پورے علاقے میں اونچے اونچے مقامات، عالیشان برج، وسیع خرمن، اور کبوتر نیز دیگر پالتو جانوروں کے لیے چراگاہیں بنی ہوئی ہیں، اور یہ سب علاقے غرناطہ اور اس کی شہر پناہ کے ہر چہار طرف بہ شکل طوق نظر آتے ہیں، اور اس کے پاسبان ومحافظ کا کام دیتے ہیں، ان علاقوں کے نام یہ ہیں:

شاہی علاقوں اور قریوں کے نام:

دار ہذیل، دار ابن مرضی، دار بیضاء، دار سنیات، دار نبلہ ودتر، کہیں کہیں چراگاہیں دریا کے کنارے کنارے دور تک پھیلی ہوئی ہیں، مثلاً قریہ وکر کی چراگاہ ہے اس قریہ میں قلعہ خرید اور باغ وحشی عیون بھی ہے، دار خلف، عین الابراج، باغ صحاف، قریہ رومہ، اس قریہ میں ایک قلعہ اور باغ ہے، دار عطشی، اس قریہ میں ایک قلعہ ہے، دار ابن جزی بن مسلمہ، قلعۂ ابوعلی، قریہ ناحرہ، فضل بن مسلمہ کا یہ وطن ہے، اس قریہ میں ایک قلعہ بھی ہے، جس کے ہر چہار طرف لوگ آباد ہیں، قریہ شبانیہ، یہاں ایک قلعہ ہے، قریۂ اشکر، قریہ بشر، ان دونوں قریوں میں بھی ایک ایک قلعہ ہے۔ مزواط عبدالملک بن حبیب۔

قریوں کی کیفیت:

ان قریوں میں جو پر رونق اور بڑے بڑے ہیں، کاشت کاری کے جانور، اور وہ لوگ رہتے ہیں جو زمین جوتنے اور زراعت کی خدمت پر مامور ہیں، اکثر گاؤں کا رقبہ بڑا ہے، اوران میں مسجدیں بھی ہیں، ان کے ماسواء جس قدر شاہی قریئے ہیں ان کی تعداد بھی کافی ہے، مگران کی شہرت زیادہ نہیں ہے، ان قریوں میں ایسے بیش قیمت قطعات شامل ہیں جنھیں زراعت کی روح کہنا زیبا ہے۔

رعایا کے قریے اوران کی تعداد:

ان کے علاوہ باقی جس قدر قریے رعایا کے قبضے میں ہیں ان کی سرحدان سے متصل واقع ہے اور یہ بمنزلہ فروع کے شمار کیے جاتے ہیں، رعایا کے قریے دوقسم کے ہیں، ایک وہ جو بڑے بڑے ہیں اوران کے شرکاء کی تعداد ہزاروں تک ہے جس کی وجہ سے ان کی تشکیل گونا گوں ہوگئی ہے، اس موقع پر ہم ان کی کثرت تعداد کا لحاظ نہ کریں گے، بلکہ صرف ان کا نام ظاہر کردیں گے۔ دوسری قسم کے قریے وہ ہیں جو ایک یا دو یا چند مالکوں کے قبضہ میں ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے، الغرض تمام قریوں کی تعداد تین سو سے متجاوز ہے، ان میں وہ قریے شریک نہیں ہیں جو خاص پائے تخت کے حوالی میں یا اس کے متصل قلعہ جات کی حدود میں واقع ہیں۔ اکثر قریوں کے نام یہ ہیں:

قریوں کے نام:

حوز الساعدین، یہ متعدد قریوں کا مجموعہ ہے، خوز وتر، ابراہیم ابن زید المحاربی کا یہ وطن ہے، قریہ قلبحار، قریۂ یاجر الشامیین، قریۂ یاجر البلدیین، قریۂ قشتالہ، قاسم بن ام جو اصحاب سحنون میں سے ہیں ان کا یہ وطن ہے، اور عطیہ بن المحاربی کے جد بزرگوار اسی قریہ میں فروکش ہوئے تھے، قریۂ احجر، قریۂ ارملہ کبریٰ، قریۂ ارملہ صغریٰ، قریۂ رقاق و دہمدان بنی اضحیٰ کے جد یعنی غریب بن یزید بن شمر کا یہ وطن ہے، قریۂ غیفون، قریۂ لسانہ، حارۃ الجامع، حارۃ الفراء، قریہ غزلیانہ، حش البکر، غویرا الصغری، غویر الکبری، یہ قریہ اقلیم بلاط میں شمار کیا جاتا ہے، یربوع بن عبدالجلیل کا یہ وطن ہے اوران کے جد اعلیٰ یعنی یربوع بن عبدالملک بن حبیب نے یہاں آکر سکونت اختیار کی تھی۔ قریۂ قوار، قریۂ حارۃ عمروس، حش الظلم، قریۂ مطار، قریۂ صرموریہ، قریۂ بابیسانہ، قریۂ شوش، قریۂ عرلقہ، قریۂ مسیجہ، قنب قیس، قریہ برزنار، قریۂ غساں (مطر بن عیسیٰ کا یہ وطن ہے) قریۂ شودر ستنشر، قریۂ ابن ناطح، قریۂ ملاحۃ (ابوالقاسم محمد بن عبدالواحد غافقی ملاحی کا یہ وطن ہے) قریۂ غمر، (اصبغ بن مطرف یہیں کے باشندہ ہیں) قریۂ نعجر، وغزنطلۃ، قریۂ بیرہ، (قرأت بن حبیب کی مسجد اسی قریہ میں ہے) قریۂ قولجر، (سہل بن

مالک رحمہ اللہ کا یہ وطن ہے) قریہ شور، (محمد بن ہانی شاعر، کمال، اور محمد بن سہل جو خاندان بنی سہل ابن مالک کے جد اعلیٰ تھے اسی قریہ میں رہتے تھے) قریہ بلیانہ، قریہ برقاش، قریہ صنوجر، قریہ بلوط، قریہ انتیانہ، قریہ مرسانہ، قریہ دویر، قریہ شلان، قریہ طعن (طعن صاحب فلاحت کا یہ وطن ہے) قریہ جبش الدجاج، قریہ جبش نوح، قریہ جبش حلیفہ، قریہ طرف الوبانی، حش المدینہ، حش المعیشہ، حش السلسلۃ، قریۃ الطرف، قریہ البیرہ، قریہ شخروجہ (عیسیٰ بن محمد بن زنین کا یہ وطن ہے) عین اکورۃ، حش الفول، قریۃ یلومان، قریہ زق الخیض، قریہ غیضون الحوزہ، قریہ اشغطمو، قریہ ویموس الکبریٰ، قریہ ویموس الصغریٰ، قریہ دارالغازی، قریہ سوبدۃ، قریۃ الرکن، قریۃ الفنت (صخر بن ابان کا یہ وطن ہے) قریۃ الکدیۃ، حش صحلی، حش بنی رسیلۃ، حش رقیب، حش بلوطہ، حش رواس، حش مرزوق، قریہ قبالہ، قریہ بنال۔

بڑے قریے:

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان میں اکثر ایسے قریے ہیں جنھیں قصبات کی حیثیت حاصل ہے، ان میں تقریباً پچاس خطیب خطبہ دینے کے لیے مقرر ہیں، جب یہ منبروں پر جلوہ افروز ہوتے ہیں تو لوگ ہمہ تن خدائے عزوجل کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، اور اسی کی طرف دست بدعا ہوتے ہیں۔

مقطعوں کی تعداد:

ان تمام مقطعوں کی تعداد جن میں بارانی جو سال کے ہر موسم میں آباد رہتے ہیں اور نہری جو نہایت ہی قیمتی اور سرسبز ہیں، باسٹھ ہزار سے زیادہ ہے اگر ان میں شاہی املاک اوقاف مسجد اور دوسرے اوقاف جو رفاہ عام کے لیے مخصوص ہیں شامل کیے جائیں تو ان کی کل تعداد پانچ لاکھ ساٹھ ہزار ہے۔

شاہی اراضی کی پیداوار تین لاکھ قدح سے متجاوز ہے اور اس میں مختلف قسم کے غلے شامل ہیں۔

پن چکیاں:

غرناطہ کی شہر پناہ کے اندر اور باہر ایک سو تیس پن چکیاں چلتی ہیں۔
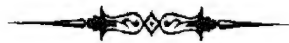
اخلاق، عادات، اور دیگر حالات

اب تک ہم نے سرزمین غرناطہ کے آثار و مقامات، مواضعات و باغات، ایوان اور سیر گاہوں کا تذکرہ کیا ہے، اور ان سب کی پوری تصویر کھینچ کر دکھا دی ہے، اب ہم یہاں کے باشندوں کے بعض اخلاق و عادات اور دیگر حالات اجمالاً بیان کریں گے۔

مذہب، اخلاق:

اہل غرناطہ مذہب اور اعمال میں اہل سنت واقع ہیں، تمام مشہور فرقے امام دارالہجرت حضرت مالک بن انس رحمہ اللہ کے پیرو ہیں، لوگ امراء اور افسروں کی اطاعت کرتے ہیں اور مال گزاری اور خراج کی ادائی کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں۔

حلیہ:

یہاں کے لوگ خوبصورت ہوتے ہیں، ناک متوسط درجے کی، بال کالے کالے اور لمبے، قد میانہ، اور پستی کی طرف مائل، رنگ سپید و سرخ، اور زبان فصیح عربی ہے، گفتگو میں اکثر اعراب ظاہر کرتے اور زیادہ تر امالۃ سے یعنی الفاظ کے مخارج کو گھٹا کر باتیں کرتے ہیں، اور نزاعی معاملات میں وہ نہایت خوددار رہتے ہیں۔

نسب:

وہ عربی النسل ہیں، ان میں بربری بھی ہیں، اور مہاجر بھی، اور مہاجر کی تعداد زیادہ ہے۔

لباس:

موسم سرما میں وہ علی العموم رنگین پوشاک استعمال کرتے ہیں۔ کتاں، ریشم، سوت، اور موعر کے کپڑے پہنتے ہیں، امارت اور رتبے کے لحاظ سے کپڑوں میں تفاوت ہوتا ہے اور موسم گرما میں افریقی چادریں، تیونسی

کرتے اور لنگیاں ہوتی ہیں، جب وہ پوشاک بدل کر جامع مساجد میں آتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا خوشنما چمنستان میں نرم نرم ہواؤں سے غنچے شگفتہ ہو رہے ہیں۔

قبائل:

وہ نسباً عرب ہیں جیسا کہ پروانجات، سندات، اور شاہی کاغذات سے پتہ چلتا ہے، ان میں زیادہ تر حسب ذیل قبائل ہیں:

''قرشی، فہری، امودی، اموی، انصاری، اوسی، خزرجی، قحطانی، حمیری، مخزومی، تنوخی، غسانی، ازدی، قیسی، مغافری، کنانی، تمیمی، ھذلی، بکری، کلابی، نمری، یعمری، مازنی ثقفی، سلمی، فزاری، باھلی، عبسی، عنسی، عذری، ضبی، سکونی، تمیمی، عبشمی، مری، عقیلی، فہمی، صریحی، حزلی، قشیری، کلبی، قضاعی، اصحی، مرادی، رعینی، تحصیبی، تحیبی، صدفی، غافقی، جفری، خمی، جذامی سلولی، حکمی، ھمدانی، مذحجی، خشنی، بلوی، جھنی، مزنی، طائی، اسدی، اشجعی، عائلی، خولانی، ایازی، لیثی، خثعمی، سکسکی، زبیدی، ثعلبی، کلاعی، دوسی، حواری، سلمانی۔

ان قبائل میں سلمی، دوسی، حواری اور زبیدی کی تعداد کم ہے، اور انصاری، حمیدی، جذامی، قیسی، اور غسانی زیادہ تر ہیں، قبائل کے یہ نام ان کی اصالت، اور عربی النسل ہونے کے شاہد اور دلیل ہیں۔

فوج:

غرناطہ کی فوج دو قسم کی ہے، ایک اندلسی، اور دوسری بربری، اندلسی فوج کا قائد خود اسی قوم کا کوئی رئیس ہوتا ہے، ورنہ ملک کے شیوخ میں سے جو عاقل اور فرزانہ ہو وہ مقرر کیا جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں یہاں کی فوجی وضع فرانسیسی وضع کے مشابہ تھی، جس کا بڑا سبب پڑوس کا اثر تھا، یعنی پورے جسم کی زرہ، اور ڈھال بڑے بڑے خود، چوڑے نیزے، بیڈھنگی زین، اور پس پشت جھنڈیاں استعمال کی جاتی تھیں، مگر اب ان کے بجائے مختصر جوشن، پتلی دھار کی تلوار، عربی ڈھال، سادے تیر، زور لچکدار نیزے کام میں لائے جاتے ہیں۔

بربری فوج میں قبائل مرینیۃ، زناتیۃ، نجانیۃ، مغراویۃ، عجیبۃ، اور مغربی عرب کے آدمی لیے جاتے ہیں، ہر قبیلہ کا ایک سردار اپنے قبیلہ والوں کی نگرانی کرتا ہے، اور یہ سب ایک بڑے سردار کی قیادت میں رہتے ہیں۔

عمامہ کا رواج:

اہل غرناطہ کے لباس میں عمامۃ کا رواج بالکل کم ہو گیا ہے، البتہ شیوخ، علماء، قضاۃ، اور عربی فوج میں ابھی کچھ کچھ رواج باقی ہے۔

عصا کا استعمال:

لوگ عام طور سے عصا بطور حربہ کے ہاتھ میں رکھتے ہیں، یہ لمبے اور گرہ دار ہوتے ہیں، ان میں لچک اتنی ہوتی ہے کہ ہر جگہ سے مڑ سکتے ہیں، اور ہلکے اتنے کہ انگلیوں سے اٹھائے جاتے ہیں، اور یہ ''امداس'' کے نام سے مشہور ہیں، نیزہ فرانسیسی کمانیں اپنے ساتھ رکھتے ہیں جس سے ان کی مشق ہمیشہ جاری رہتی ہے، اور متوسط درجہ کے تیر استعمال کرتے ہیں، اس ملک کے تہوار بہت خوش آئند ہوتے ہیں اور ان میں اقتصادی اصول کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

دولت وثروت:

یہاں کے عام شہروں میں دولت وثروت امنڈتی ہوئی نظر آتی ہے، حتیٰ کہ ان کی دکانوں سے بھی یہ بات عیاں ہے جہاں ان کی مصنوعات فروخت ہوتی ہیں، مثلاً جوتے بیچنے والوں وغیرہ کی دکانوں سے ان کی دولت ظاہر ہے۔

غذا:

غذا میں زیادہ تر عمدہ گیہوں سال بھر تک استعمال کیے جاتے ہیں، مگر غرباء، بادیہ نشین، اور کھیتوں کے مزدور موسم سرما میں عربی جوار، اور عمدہ قسم کی اناج مثلاً چنا، مسور، مٹر وغیرہ کھاتے ہیں۔

میوہ جات:

ہر قسم کے خشک میوہ جات سال بھر میسر آتے ہیں، انگور بافراط نصف سال تک ملتے ہیں، انجیر، منقی، سیب، انار قسطل، بلوط، ناریل، بادام اور دیگر میوہ جات کبھی ختم نہیں ہوتے، صرف ان ایام میں وہ کمیاب ہو جاتے ہیں، جب لوگوں کو ان کی طرف رغبت ہی نہیں ہوتی ہے۔

سکے:

کاروبار میں مبادلہ خالص سونا اور چاندی کے ذریعہ ہوتا ہے، سونا عمدہ قسم کا ہوتا ہے، اور اس میں کھوٹ بالکل نہیں ہوتی ہے۔

درہم مربع شکل کے ہیں جن کا وزن مہدی کے مقرر کردہ وزن کے مطابق موحدین کی حکومت کے زمانے سے قائم چلا آتا ہے، یعنی ایک اوقیہ چاندی میں ستر درہم بنائے جاتے ہیں، دراہم میں تحریریں ہمیشہ مختلف ہوتی آئی ہیں، ہمارے زمانہ میں درہم کی ایک طرف ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' اور

دوسری طرف "لا غالب الا الله" منقوش رہتا ہے، نصف درہم کو قیراط کہتے ہیں، اس کے ایک رخ پر "الحمدلله رب العالمین" اور اس کی پشت پر "وما النصر الا من عندالله" مرقوم رہتا ہے، اور آدھے قیراط بھی بنتے ہیں جس کی ایک جانب "هدی الله هو الهدی" اور دوسری جانب "والعاقبة للتقوىٰ" درج کیا جاتا ہے۔

دینار ایک اوقیہ سونے میں چھ مضروب ہو کر ایک دینار کا دو ثلث سونا بچ رہتا ہے، یعنی ہر ایک دینار کا وزن ۶/۴۰ اوقیہ سونا ہوتا ہے، اس کے ایک طرف "قل اللهم مالك الملك تابيدك الخير" اور اطراف میں "والهکم اله واحد لا اله الا هو الرحمن الرحیم" دوسری طرف "الامین عبدالله یوسف بن امیر المسلمین ابی الحجاج بن امیر المسلمین ابی الولید اسماعیل بن نصرا یده الله نصره" اور اطراف میں "لاغالب الا الله" لکھا جاتا ہے۔

اس کتاب کے اختتام تالیف کے دوران یہ تحریریں بھی بدل گئیں، حاشیہ پر "لا غالب الا الله" دوسرے رخ پر "الامیر عبدالغنی محمد بن یوسف بن اسماعیل بن نصر ایده الله واعانه" اور اس کے ربع دائرہ میں "بمدینة غرناطة حرسها الله" لکھا جانے لگا۔

موسمی سفر:

غرناطہ کے باشندوں کی خاص عادت یہ ہے کہ وہ انگور کی فصل میں اپنے اپنے گھروں کا ساز وسامان اور اہل وعیال کو ساتھ لے کر تاکستان میں چلے جاتے ہیں، جہاں انگور کا شیرہ نکالا جاتا ہے، اس وقت جانوروں کی پشت پر اسلحے بار کر کے اپنی شجاعت و بسالت پر اعتماد کرتے ہیں، اور چوں کہ شہروں کی باہمی قربت ہے اس لیے اس سے بھی انھیں بہت کچھ ڈھارس ہوتی ہے۔

زیورات:

سونے کے زیورات میں گلے کے ہار، کنگن، بالیاں، اور پازیب، خوش حال طبقے میں استعمال کیے جاتے ہیں، دوسرے طبقے کے لوگوں میں پاؤں کے اکثر زیورات چاندی کے ہوتے ہیں۔

جواہرات:

نفیس اور عمدہ عمدہ بیش قیمت جواہرات یاقوت، زبرجد اور زمرد وغیرہ بڑے طبقے کے لوگوں میں جو حکومت کے اعیان وارکان، یا دولت مند اور مشہور خاندانوں کے افراد ہیں بکثرت رائج ہیں۔

بیگمات:

یہاں کی بیگمات خوبصورت ہوتی ہیں، ان کا حسن شہرۂ آفاق ہے، وہ نازک اندام گیسو دراز، دردنداں، عنبر فشاں، سبک رفتار، خوش گفتار اور نیک کردار ہوتی ہیں۔ اور شاذ و نادر ہی ان کا قد دراز ہوتا ہے، اب ان کے زیب و زینت کی بوقلمونی انتہا کو پہنچ گئی ہے، رنگین پوشاک، زریں ملبوسات، اور اقسام کے زیورات کی نمائش اور مقابلہ کی حد ختم کر چکی ہیں۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ انھیں زمانے کی نظر بد سے محفوظ رکھے، آفات و مصائب کی درازستیوں سے بچائے، کسی چیز کو آزمائش و فتنہ نہ قرار دے، ہر شخص کی پردہ پوشی کرے، اور بہ طفیل عزت و قدرت اپنے لطف خفی سے بھی کسی کو محروم نہ فرمائے۔

شخصیات غرناطہ

احمد بن محمد بن حمد ہشام القرشی

احمد نام، ابوجعفر کنیت، اور ابن فرکون عرف ہے، غرناطہ کے باشندے، اور نسباً قرشی تھے نسب کی ابتدا معلوم کرنے کے لیے آپ کا قرشی ہونا کافی ہے۔

ابن فرکون اندلس کے اس خطہ (غرناطہ) میں قاضیوں کے صدر تھے، مسائل میں ید طولیٰ رکھتے تھے، مشتبہ احکام میں دسترس حاصل تھی، مطالعہ اور تجربہ وسیع تھا، فصل مقدمات میں اس قدر سخت گیر تھے کہ اپنا فیصلہ نافذ کیے بغیر نہ رہتے، مسائل میں اجتہاد اور وقت نظر سے کام لیتے، فنون عربیہ، فقہ، قراءۃ، اور فرائض میں یکساں دخل رکھتے تھے، قرآن شریف خوش الحانی سے پڑھتے اور اس کی تلاوت نہایت عمدگی سے کیا کرتے تھے، لوگوں کے دلوں میں ان کا وقار تھا، مزاج میں ذرا نخوت تھی، کمتر درجہ کے فقہاء اور عاقدین شروط کو حقیر و ذلیل نگاہوں سے دیکھتے تھے، یہاں تک کہ مخاطب میں بھی لوگوں کی کنیتوں کو حذف کر دیتے تھے، اور جو سلوک وہ نوعمر لوگوں کے ساتھ پسند کرتے وہی سن رسیدہ لوگوں کے لیے بھی روا رکھتے تھے، اور اس کو وہ برا نہیں جانتے، حتیٰ کہ فصل مقدمات کے اجلاسوں میں بھی وہ اپنی تیز تر و نادر روزگار زبان کی باگ ڈھیلی کر دیتے تھے۔ آخر کار بعض لوگ ذاتی اغراض کی بناء پر انھیں مطعون کرنے لگے۔

وہ اپنی ذاتی قوت اور عالی فضائل کی بناء پر رندۃ، مالقہ، اور دیگر مشہور مقامات میں منصب قضا پر فائز ہوئے، اور آخر میں وہ جاہ وجلال اور حرمت و احترام کے زیر سایہ قاضی جماعت بنا دیے گئے۔

استاد صالح ابوعبداللہ ابن مسغور کا ایک انگور کا باغ دارالحکومت (غرناطہ) کے باہر چند میل کے فاصلہ پر تھا، اس باغ میں ابن فرکون ابن مسغور سے پڑھا کرتے تھے، اس وقت ان کا عالم شباب تھا، وہ اپنا اس زمانے کا ایک واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

''عصیر (شیرۂ انگور) کی فصل تھی، استاد نے مجھے رُب کی ایک مقدار دی، کہ شہر سے بیچ کر لا دوں، میں رُب لے کر چلا، راستہ میں خوب بارش ہوئی جس سے میں نہایت خستہ و پریشان ہوگیا، جب کام

پورا کر کے واپس آیا، تو استاد کے بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو سخت ملامت کی اور کہا ''تم ایک کمزور بچہ سے کام لیتے ہو اور ذاتی مصالح کی خاطر اس کو مشکل کاموں میں الجھائے رکھتے ہو، حالانکہ وہ تمھارے پاس تعلیم حاصل کرنے کو آتا ہے، یہ علماء اور صالحین کی شان کے خلاف ہے۔'' استاد نے بڑے بھائی سے کہا آپ اس لڑکے کو اپنے حال پر چھوڑ دیجیے وہ یقیناً ایک دن غرناطہ کا قاضی جماعت ہو کر رہے گا، بعد کو جب مجھے یہ پیشین گوئی یاد آئی تو استاد کی فراست کی تصدیق ہو گئی، خدا کی ان پر رحمت نازل ہو۔''

اساتذہ:

جن اساتذہ اور شیوخ سے انھوں نے تعلیم پائی تھی ان کے نام یہ ہیں:

استاذ ابوالقاسم بن اصغر، قاضی ابوالحسین محمد بن یحییٰ بن ربیع اشعری، شیخ مفتی ابوبکر محمد بن ابراہیم بن مفرح ادسی بن دباغ اشبیلی، خطیب زاہد ابوالحسن عدال، استاد نحوی ابوالحسن علی بن محمد بن علی بن یوسف ابن صائغ معروف ابن مسغور، اول الذکر کے علاوہ باقی اساتذہ سے غرناطہ میں تعلیم پائی۔

جب حکومت میں انقلاب پیدا ہوا تو معزول بادشاہ کی اتباع میں وفاداری اور رحم دلی کے طور پر ان سے کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ جب حکومت سلطان ابوالولید کے ہاتھ میں چلی آئی تو وہی واقعات ان کے زوال اور گمنامی کا باعث ہوئے، حاسدین نے دام تزویر پھیلا کر چند نقائص کا ان پر الزام لگایا، جس کی وجہ سے وہ عہدۂ قضاء سے برطرف کر دیے گئے، مدت تک خانہ برباد، تارک وطن، اور ہر قسم کے چارۂ کار سے محروم ہو کر اپنی املاک میں جو پایۂ تخت سے باہر تھیں، گوشہ گیر ہو گئے، سروسامان میں کچھ بے قیمت اثاثہ اور معمولی کتابیں تھیں جن کی طرف وہ متوجہ رہا کرتے، ان سے اپنی طبیعت بہلاتے اور اس طرح اوقات گذاری کرتے تھے۔

وزیر ابوبکر بن الحکم نے ایک دفعہ مجھ سے بیان کیا کہ میں نے ان کی معزولی کے بعد ان کے گھر پر جا کر ملاقات کی اور ایک امر ان کی طرف منسوب کیا جو ان کے لیے بالکل ناسزاوار تھا تو انھوں نے مجھے یہ چند اشعار سنائے جو ان کے دلی قلق اور آزردہ خاطری کی خبر دیتے تھے۔

میں نے ''التاج'' میں جو میری ایک تاریخ کی کتاب ہے ان کا تذکرہ کیا ہے جو بعینہ حسب ذیل ہے:

''ابن فرکون جماعت کے شیخ اور قاضی تھے، احکام کے نافذ اور منسوخ کرنے کا انھیں پورا اختیار حاصل تھا، جماعت کی تیز تر تلواریں ان کے ادنیٰ سے اشارے سے نیام سے نکل پڑتی تھیں، اور پھر انھیں کے حکم سے وہ نیام میں واپس جا سکتی تھیں، ذاتی فضیلت کی بنا پر انھوں نے سیادت و سرداری حاصل کی، ایوان قضاء کے نقش و نگار جو مٹ چکے تھے ان کو از سرنو درس و تدریس کے ذریعہ قائم کیا، اجتہاد کی زمین میں بیداری کے تخم ڈالے اور اپنے لگائے ہوئے پودوں کے پھل بھی انھوں نے

توڑے، انھوں نے اس قدر وقار حاصل کیا کہ وہ وقار کی گرانباری بھی محبوب ہوگئی، اور فخر کے ایسے مرتبہ پر فائز ہوئے کہ فخر کی زمین قابل رشک زمینوں کے لیے بھی محسود ہوگئی، ہر نادر شے بلا توقف ان کی دعوت پر لبیک کہتی تھی، وہ عصائے نادر زمین پر ڈال دیتے تھے اور وہ اژدہا بن جاتا تھا، وہ ہمیشہ اپنے ارادے بلند رکھتے تھے اور مشکلات کا مقابلہ پوری طاقت سے کرتے تھے، آخر کار وہ بلند رتبہ پر فائز کیے گئے، اور جو شایان شان حالت ہوسکتی تھی وہ انھیں حاصل ہوئی، ادب کے تمام شعبوں میں انھیں یکساں دخل تھا، اور شاعری میں انھیں وافر حصہ ملا تھا۔"

یہ مضمون اس قول پر آ کر ختم ہوتا ہے کہ سلطان ابوعبداللہ بن نصر کو جب زمانۂ دراز کے بعد مرض سے شفا حاصل ہوئی، تو انھوں نے تہنیت میں یہ اشعار پیش کیے۔ جن کا ترجمہ یہ ہے:

"اے ممدوح تیری شفا سے ملک کو عزت اور قوت حاصل ہوئی اور تیری صحت سے ہم نے عید منائی، جب تو بیمار تھا تو لوگوں کو آرام نصیب نہ ہوا اور دنیا بھی تیرے لیے بے قرار و بے چین تھی۔"

علم و فضل کے جس طبقہ اور مرتبہ میں ان کا شمار ہے اس نقطۂ نظر سے ان کے تمام اشعار بلحاظ حسن وخوبی کے ایک قسم کے نہ تھے اس لیے میں نے یہ چند شعر منتخب کیے۔

سنہ ولادت وسنہ وفات:

۶۴۹ھ میں وہ پیدا ہوئے، اور ۱۶/ ذیقعدہ ۷۲۹ء میں وفات پائی۔ کتاب عائد الصلۃ میں انھیں صرف قاضی لکھا گیا ہے مگر کتاب التاج المحلی میں ان کا تذکرہ قاضی اور ادیب کے اوصاف کے ساتھ کیا ہے، اور ابوبکر بن الحکیم نے بھی اپنی کتاب الفوائد المستغربہ والوراد المستعذبہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔

احمد بن عبداللہ مخزومی بلنسی شقوری

احمد نام، ابومطرف کنیت تھی، ابومطرف کا تعلق کسی مشہور خاندان سے نہیں تھا، شقری الاصل کہے جاتے تھے، ابن عبدالملک نے آپ کے نسب کے متعلق ایک روایت نقل کی ہے اگر یہ فی الواقع درست ہے جب بھی اس سے گریز کرنا بہتر ہے۔

ابن عبدالملک کا بیان ہے، کہ ابتداء میں ابومطرف کی تمام تر توجہ روایات کی تحصیل میں مبذول رہی تھی، بکثرت حدیث کی سماعت کی اور اپنے خاندان کے مشائخ سے اس کی تعلیم پائی، دیگر علوم میں اچھی استعداد تھی، عقلیات اور اصول فقہ میں بصیرت رکھتے تھے، جب ادب کی طرف میلان ہوا تو اس میں اتنی مہارت پیدا کی کہ بڑے بڑے خوش گو شاعروں میں ان کا شمار ہونے لگا، انشاء پردازی میں مشہور اور یگانہ تھے، زمانہ ان کی مانند دوسرا انشاء پرداز پیش کرنے سے قاصر تھا، خصوصاً جب وہ اپنے برادران و اخوان کو مخاطب کرتے تھے تو وقت ان کی انشاء حسن کے انتہائی درجہ پر ہوتی تھی، اس کے نمونے مطول ومنتخب بھی موجود ہیں اور مختصر و چیدہ بھی، آپ کا کلام نثر ہو یا نظم تاریخ کے اشارہ سے لوگوں کو معلوم ہو جاتا تھا، وہ اپنے کلام میں مختلف قسم کے علمی مسائل نہایت روشن طریقے پر درج کرتے تھے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جملہ حیثیتوں کا لحاظ کر کے ابومطرف ان مضامین میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے جن سے انھیں دلی شغف تھا، علوم میں بصیرت، تفنن، اور درک اُن کا ذاتی جوہر تھا، وہ محدث تھے، اور بہت زیادہ روایت کرتے تھے، نیز روایت بہت صحیح ہوتی تھی، تاریخ اور واقعات میں تبحر حاصل تھا، اور ان دونوں اصول یعنی حدیث و تاریخ میں ید طولیٰ رکھتے تھے، کلام بہت شیریں ہوتا تھا اور اس میں مواد کی کثرت اور معانی کی بہتات، اور حسن کی فراوانی ہوتی تھی، الفاظ نکھرے ہوئے، اور معنی صاف ہوتے تھے۔

الحاصل وہ اپنے پیشہ کی شکایت، قسمت کا گلہ، ساتھ ہی کلام کی رونق، ماخذ کی خوبی، اور نثر کو نظم کے قالب میں ڈھال کر دکھانے میں ثانی بدیع الزماں تھے۔

ابومطرف کے اساتذہ کے نام یہ ہین، ابوالخطاب بن واجب، ابوالربیع بن سلام، ابوعبداللہ بن جرج، ابوعلی بن شلوبین، ابوعمر بن عات، ابومحمد بن حوط اللہ، ان اساتذہ سے ابومطرف نے ملاقاتیں کیں، پڑھا، سماعت

کی، اور روایت کی اجازت لی تھی۔ اور اہل مشرق میں ابو الفتوح نصر بن ابوالفرج وغیرہ سے روایت حدیث کی اجازت حاصل کی۔

جن تلامذہ نے ابومطرف سے روایت اور حدیث بیان کی ہے ان کے نام یہ ہیں:

ابومطرف کے فرزند ابوالقاسم، ابوبکر بن الخطاب، ابواسحٰق بلقینی، جعید، حسن طاہر بن علی شقوری، ابو عبداللہ نبری، ابوجعفر بن زبیر، ابن شنیف، ابن ربیع، ان کے علاوہ دوسرے تلامذہ بھی ہیں جن کا ذکر باعث طوالت ہے۔

ابومطرف نے سب سے پہلے ابوعبدالعزیز بن عبداللہ بن خطاب کی مصاحبت اختیار کی جو اس وقت تک اپنے شہر میں منصب ریاست پر فائز المرام نہیں ہوا تھا تاہم اس زمانے میں بھی لوگوں کو اس سے بہت فائدہ پہنچا، اس کے بعد ابومطرف نے شرقی اندلس کے رئیس ابوجمیل ریان بن سعد اور دوسرے رؤساء کی طرف سے مکاتیب کی خدمات انجام دیں، پھر وہ عدوۃ (افریقیۃ) گئے، وہاں رشید ابومحمد بن ابوالولید نے مراکش میں انھیں اپنا کاتب مقرر کیا، کچھ دنوں کے بعد اس خدمت سے ہٹا کر ملیانہ کا جو شرقی اندلس میں واقع ہے قاضی بنایا، پھر وہ رباط الفتح بھیجے گئے، اسی اثناء میں رشید نے وفات پائی اور اس کا بھائی ابوالحسن معتضد جانشین ہوا، اس نے ابومطرف کو عہدۂ قضاء پر برقرار رکھا مگر مکناسۃ زیتون میں منتقل کر دیا، جب معتضد کے قتل کا واقعہ پیش آیا تو وہ سبتہ کی طرف کوچ کر گئے، اثنائے سفر میں ان پر سخت مصائب نازل ہوئے، سبتہ سے دریائی سفر اختیار کر کے افریقہ پہنچے اور بجایہ کے امیر ابوزکریا کے پاس حاضر ہو کر تونس چلے آئے، یہاں زمانے نے ان کی مساعدت کی اور شہر اریس کے قاضی مقرر ہوئے، پھر فاس میں منتقل کر دیے گئے جہاں بہت دنوں تک اس خدمت کو انجام دیا، آخر میں مستنصر باللہ محمد بن ابوزکریا نے اپنے پاس طلب کر کے ان کی نہایت قدر افزائی کی یہاں تک کہ وہ مستنصر کی خاص تفریحی مجلسوں میں شریک ہونے لگے، اور رفتہ رفتہ اس کے مزاج میں بہت دخیل ہو گئے جس کی وجہ سے وہ مطعون خلائق بنے اور ان پر نکتہ چینیاں ہونے لگیں۔

انشاء پردازی اور شاعری میں کمال رکھتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز انھوں نے حضرت نبی کریم ﷺ کو چند قلم عطا فرماتے ہوئے خواب میں دیکھا، لوگوں نے اس کی یہ تعبیر بیان کی کہ انشاء پردازی میں ان کی شہرت ہوگی۔ اور اس میں وہ سربلند ہوں گے، واللہ اعلم۔

عباس ابن امیہ کے خط کے جواب میں توریہ کے طرز پر ابومطرف نے ایک خط لکھا جو اپنے رنگ میں بالکل نرالا تھا، اس خط میں بلنسیہ میں رومیوں کے غالب آنے کی خبر دی ہے، مضمون یہ ہے:

”للہ یہ تو فرمایئے کہ آپ کا مقصد کیا ہے، آپ کس فیصلے کو باقی رکھنا چاہتے ہیں اور کس کو مٹائیں گے؟ اصل و زوائد سب فنا ہو گئے، انعام وصلہ کا دور ختم ہو گیا، سراسر تعجب، یاس اور ناامیدی کی حالت طاری ہے، بلندی کی علامت مٹ گئی، جمعیت مفقود ہے، علت اور صحت کی جنگ برپا ہے،

مثلث اور فصیح کا مقابلہ ہے، جماعت میں گردش کی طاقت باقی نہیں ہے، اس کے حشو و زوائد قائم ہیں، ملت کے ستون جھک گئے، اور ہماری تعداد جمع قلت کے برابر ہو گئی ہے، پستی کی علامت نمایاں ہے اور بدل البعض کی جگہ بدل الکل نے لے لی ہے۔''

اشعار کے نمونے:

ایک قطعہ جس میں ابومطرف نے علوم کا توریہ کیا ہے، اس کے بعض اشعار یہ ہیں جن کا ترجمہ ہے:
''ہم ایک مدت تک عہدۂ کتابت پر قائم رہے اس کے بعد ہمیں عہدۂ قضا حاصل ہوا۔ باوجود خستگی اور پریشانی کے اب ہماری جدوجہد کے لیے بجز منزل بعید اور ناخوشگوار زندگی کے کچھ باقی نہیں ہے۔ ہماری نسبت بدلی اور نہیں بھی۔ جس طرح ایک مہندی نسبت کا خیال کرتا ہے۔''
خطوط کی ابتداء میں اشعار لکھا کرتے تھے ان کے نمونے ذیل میں لکھے جاتے ہیں، مثلاً

ان الکتاب اتی وساحة طرسه دواح توشح بالبدیع مبرقع وله حقوق ضاق وقت وجوبها ومن العجائب ضیق وموسع۔

''خط پہنچا اوس کے کاغذ کی پہنائی بڑے درخت کی طرح ہے۔ اور وہ نادر کلام سے آراستہ اور برقع پوش ہے جب وہ لفافہ میں رکھا جاتا ہے تو تنگ ہو جاتا ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ خط تنگ بھی ہے اور فراخ بھی۔''

دوسری قسم کے اشعار

بایعونا مودة هی عندی کالمصرات بیعها بالخداع فساقضی بردها ثم اقضی بعدها من مدامعی الف صاع۔

''لوگوں نے مجھ سے محبت کی بیع کا معاملہ کیا مگر وہ مصرات کی مانند تھی جن کی بیع فریب میں داخل ہے اس لیے میں اس محبت کو واپس کر دوں گا مگر اس کے بعد اپنے آنسوؤں کے ہزار پیمانہ صاع ادا کروں گا۔''

ابومطرف کی تصانیف میں ایک کتاب شہر مرتبہ کے متعلق ہے جس میں اس شہر پر رومی عیسائیوں کے غالب آنے کا تذکرہ بھی کیا ہے، اس کتاب کی تالیف میں عماد اصفہانی کی کتاب ''الفتح القدسی'' کا تتبع کیا ہے، ایک کتاب فخر الدین بن الخطیب رازی کی کتاب المعالم کے نہج پر جو اصول فقہ میں ہے لکھی ہے، ایک کتاب ''التبیان'' علم بیان میں کمال الدین ابومحمد عبدالکریم سماکی کی تردید میں تالیف کی ہے، ابن صاحب الصلوٰۃ کی تاریخ کا نہایت عمدہ اختصار کیا ہے، ان کے علاوہ ابومطرف نے متعدد حواشی اور مقالات لکھے ہیں۔
ابومطرف کے تمام مضامین اور اشعار کو استاذ ابوعبداللہ ابن ہانی سبتی نے نہایت عمدگی سے ترتیب دے

کر دو جلدوں میں جمع کر دیا ہے اور اس کتاب کا نام "بغية المستطرف وغنية المتطرف من كلام امام الكتابة ابن عميرة ابى المطرف" رکھا ہے۔

شیخ ابوالحسن بن الجیاب اپنے شیوخ اور ایک شخص سے جو ابومطرف کے حالات اور اخبار کی تلاش میں رہا کرتا تھا ابومطرف کے غرناطہ میں آنے کی خبر بیان کرتے ہیں، راوی کہتا ہے کہ میں ابومطرف کے ساتھ زمانہ دراز تک رہا ہوں، وہ دُبلے پتلے زرد رنگ کے تھے اور ناک چوڑی چپٹی تھی، وہ سخت حاجت مند ہو گئے تھے مالقہ میں ان پر مصیبت آئی اور ان کا تمام مال و متاع جاتا رہا جس سے وہ محتاج ہو گئے، اس وقت ان پر بڑھاپا طاری ہو چکا تھا اور اپنی بدبختی کے آماجگاہ بن چکے تھے۔

شیخ ابوالحسن عینی کا بیان ہے کہ ابومطرف نے مجھے خط لکھا جس میں اپنے مال و متاع کے لوٹے جانے کی اطلاع دی تھی، واقعہ یہ ہے کہ جب المعتضد قتل کیا گیا تو ابومطرف نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور مکناستہ کو چھوڑ کر نسبۃ کی راہ اختیار کی اس وقت آپ کے پاس نقد رقم، سونا اور زیورات تھے جن کی مجموعی مالیت چار ہزار عشیری دینار کے برابر تھی، سفر میں جن رفقاء کا ساتھ دیا تھا ان میں بنی مربن کی ایک جماعت بھی تھی اسی جماعت نے آپ کا سارا سامان لوٹ لیا اور آپ کے دوسرے رفقائے سفر کے اسباب کو بھی نہ چھوڑا۔

ابومطرف کی ولادت رمضان ۵۸۲ھ میں جزیرۂ شقر اور بقول بعض بلنسیہ میں ہوئی تھی۔

۲۰ ذی الحجہ ۲۵۶ میں شب جمعہ کو تونس میں وفات پائی، عبدالملک کا قول ہے کہ ابن الزبیر کو ابو مطرف کی تاریخ وفات میں وہم پیدا ہو گیا ہے کیونکہ اس نے سنہ وفات تقریباً ۶۵۰ھ یا اس سے کچھ بعد قرار دیا ہے۔
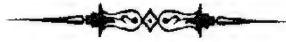
احمد بن عبدالرحمٰن انصاری الخزرجی

احمد نام، ابوالعباس کنیت ہے، ثغر اعلیٰ کے رہنے والے تھے۔ آپ کی اصل سرقسطہ سے شروع ہوتی ہے، جہاں انصار کے گھرانے آباد تھے، جب یہاں فتنوں کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ کے پردادا عبدالرحمٰن چھوٹے بیٹے کو لے کر بلنسیہ چلے گئے، آپ کے والد عبدالرحمٰن یہیں پیدا ہوئے، انھیں آپ کے دادا ساتھ لے کر مریۃ میں جا بسے، اور آپ کی ولادت بھی یہیں ہوئی، پھر آپ کے والد آپ کو سبتہ لے آئے، اور مدت تک یہاں مقیم رہے۔

حالات:

آپ محدث تھے، روایت زیادہ کرتے تھے اور اس میں ثقہ وضابط تسلیم کیے گئے، قرأت اور علم تجوید میں ماہر تھے، فقہ از بر یاد تھی، مسائل بہت محفوظ تھے، اصول فقہ میں کافی درک تھا، علم کلام میں فوقیت رکھتے تھے، دستاویز اور وثیقہ تحریر کرنے اور اس کی کنہیات میں کافی بصیرت حاصل تھی، احکام اور فیصلہ جات کی دانست میں مہارت تھی، نہایت بلیغ انشا پرواز، اور باکمال شاعر تھے، خوش نویسی میں تمام ہم عصروں پر فضیلت رکھتے تھے، دنیاوی مال ومتاع سے بے نیاز، دنیا کی آلودگی سے پاک، اور بہت قناعت پسند تھے، اور اپنی بے مائگی پر شاد وخرم رہتے تھے، طبیعت بہت خوددار اور ہمت بلند تھی، اور ساری عمر اسی طرح گزاری، بہت سے دواوین اور کتابوں کے بہت سے دفتر نہایت خوشخط اور نہایت ضبط کے ساتھ نقل کیے۔

جب آپ چھوٹے تھے تو آپ کے والد نے متعدد شیوخ کے پاس جا کر آپ سے سماعت کرائی، اور خود بھی کبھی اس سماعت میں شریک ہو جاتے، خدا انھیں نفع پہنچائے۔

ابوعبداللہ بن حسون قاضی مراکش نے آپ کو اپنے پاس طلب کر کے کتابت کے عہدہ پر مقرر کیا، بعد کو اس عہدہ سے علیحدہ کر کے فصل خصومات اور مسجد مراکش کی امامت آپ کے سپرد کی، کچھ عرصہ کے بعد فصل خصومات کی خدمت چھوڑ کر صرف مسجد کی امامت کرنے لگے۔

جب حکومت موحدین کے ہاتھ میں آئی تو عبدالمومن نے آپ کو طالبان علم کے زمرہ میں شمار کیا اور

آپ کے اعزاز وتکریم میں ذرا بھی کمی نہ کی، یہاں تک کہ مراکش کے دارالسلطنت میں فصل خصومات کے لیے آپ ہی کو تجویز کیا، زمانہ تک اس خدمت کو آپ نے انجام دیا، پھر غرناطہ میں عہدۂ قضا پر مامور کیے گئے، اور پھر اشبیلیہ میں اسی خدمت میں منتقل کر کے ولی عہد کے ہمرکاب بھیجے گئے، جب حکومت ابو یعقوب کو ملی تو اس نے خزانۂ علمیہ کی خدمت آپ کے سپرد کی، اس زمانہ میں اکابر اہل علم اور فضلاء میں سے کسی کا تقرر اس خدمت پر ہوا کرتا تھا۔ آپ کو عبدالمومن کے خاندان سے جس قدر مواہب وعطیات ملے ان کی مقدار بہت زیادہ ہے۔

آپ نے قرآن شریف اپنے والد سے پڑھا، اور زیادہ تر انھیں سے تعلیم پائی، اور ان سے سند لی، آپ کے اساتذہ میں ایک ابوالحسن تطلمی بھی ہیں، آپ فرمایا کرتے تھے کہ ابوالحسن پہلے شخص ہیں جن کے سامنے میں نے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔

جن تلامذہ نے آپ سے روایت کی ہے ان کے نام یہ ہیں:

ابوعبداللہ، ابن کالد یزید بن یزید بن رفاعۃ، ابومحمد بن محمد بن علی بن وہب القضاعی۔

غرناطہ میں آپ کی آمد:

آپ قاضی ابوالقاسم بن حمزہ کی صحبت میں غرناطہ پہنچے، قاضی صاحب آپ کی تعریف میں برابر رطب اللسان رہے، جب وہ غرناطہ کے قاضی مقرر کیے گئے تو آپ کو انھوں نے اپنا جانشین بنایا، آپ نے بھی ہمیشہ ان کی مزاج داری کی، جب قضا کا عہدہ ابوالفضل عیاض بن موسیٰ کے سپرد ہوا تو وہ بھی دوستی اور قرابت کا پاس کرتے ہوئے آپ کے پشت پناہ بنے رہے، اور باہم شیر وشکر رہا کیے، جب ابوالفضل عیاض اس عہدہ سے سبکدوش ہو گئے تو آپ وادی آش چلے آئے، اور یہاں قضا اور امامت مسجد کی خدمت پر مامور ہو گئے، ۵۳۹ھ میں غرناطہ واپس آئے، اور ابومحمد بن عبدالمومن بن علی کے دور حکومت میں یہاں کے قاضی بنائے گئے، اس وقت سے آپ کی سیرت کی بہت ستائش کی جانے لگی، آپ کے عدل وانصاف کے گیت گائے جانے لگے۔ اور آپ کی پاکیزگی اور پاک دامنی لوگوں پر آشکارا ہو گئی۔

جو شخص قادر الکلام اور وسیع المعلومات ہو وہی زہد کی زمین میں شعر کہہ سکتا ہے، چنانچہ آپ کے یہ چند اشعار اسی زمین کے ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

''اے خدا اور حقیقت تیرا ملک بڑا ہے۔ جب تو کسی امر میں مانع ہو تو مخلوق کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ دنیا والوں نے مجھ پر ستم ڈھائے لیکن میں خوش ہوں کیونکہ اس کا ثواب کم نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا وہ فقیر ہے حالانکہ فقیر میرے نزدیک بڑی چیز ہے ہاں! وہ لوگ سچے ہیں، اے خدا بے شک میں تیرا فقیر ہوں۔''

اس مفہوم کے آپ کے اشعار بکثرت ہیں جن کی بندش نہایت چست ہے، اس سے آپ کی جودت

طبع کا پتہ چلتا ہے، دیگر اشعار ملاحظہ ہوں:

''میں دشمن کو ظاہراً بناوٹ سے خوش کر دیتا ہوں اگر مجھے اس کے خوش کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے بہت سے نوجوانوں سے میں ہنس کر ملتا ہوں، حالانکہ ان کی دشمنی سے میرا سینہ چاک چاک رہتا ہے۔''

آپ نے جس قدر مفید کتابیں تصنیف کی ہیں ان سے آپ کی طبع روشن اور مبلغ علم کا اندازہ ہوتا ہے، ایک کتاب ''الشہاب'' کی شرح میں ہے جو نہایت نادر سمجھی جاتی ہے، دوسری کتاب ''انوار الافکار'' ہے اس میں ان زہاد اور ابرار کے حالات قلم بند کیے ہیں جو جزیرۂ اندلس میں وارد ہوئے تھے، ابھی یہ کتاب مکمل نہیں ہوئی تھی کہ آپ کی وفات ہوگئی، اس کی تکمیل آپ کے فرزند عبداللہ نے کی۔

آپ ان لوگوں میں سے تھے جن پر مراکش میں موحدین کے داخلہ کے روز سخت مصائب نازل ہوئے تھے، موحدین نے روز شنبہ ۱۸ر شوال ۵۴۱ھ میں علی الاعلان تمام بالغ مردوں کا خون مباح کر دیا تھا، تین روز تک قتل عام ہوا، صرف وہ لوگ قتل سے بچ سکے جو کسی غار، یا بالا خانہ، اور یا کسی پوشیدہ مقام میں چھپ گئے تھے، اس قتل عام کے بعد جن لوگوں کے قتل کا حکم خاص طور سے جاری ہوا تھا ان کی عام معافی کا اعلان کیا گیا ان کی تعداد کم وبیش ستر تھی، بقیۃ السیف مشرکین قیدی اور ان کی اولاد کی طرح فروخت کیے گئے اور یا انھیں معافی دی گئی، ابوالعباس ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جو موت کے چنگل سے چھوٹ گئے اور جذبۂ عفو نے غلامی کے پھندے سے انھیں رہا کر دیا، یہ واقعہ مراکش کی تباہی معلوم کرنے کے لیے کافی ہے، اس ہنگامے اور دیگر حوادث میں آپ کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ضائع ہوا، یہ کتابیں آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں اور نہایت بیش قیمت تھی۔

آپ کی ولادت آخر ربیع الاول ۵۰۲ھ میں ہوئی تھی۔

وفات:

روز یکشنبہ ۸ر جمادی الاولی ۵۵۹ھ میں ظہر اور عصر کے درمیانی اوقات میں وفات پائی دوسرے روز دوشنبہ کو نماز ظہر کے بعد تجہیز و تکفین عمل میں آئی، قاضی ابو یوسف حجاج نے جنازہ کی نماز پڑھائی، جنازہ میں بڑا اژدہام تھا، خلقت چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی، مرد عورتیں سبھی شریک تھے ہاتھوں ہاتھ لوگوں نے جنازہ اٹھایا، خدا غریق رحمت فرمائے۔

ابوبکر بن الطفیل جو آپ کے ایک پڑوسی اور دوست تھے اور اس وقت اشبیلیہ میں تشریف رکھتے تھے وفات کی خبر سن کر انھوں نے آپ کا مرثیہ لکھا اور اپنے فرزند کی معرفت ایک خط کے ساتھ تعزیت کی غرض سے روانہ کیا، اس مرثیہ کے دو شعر یہاں لکھے جاتے ہیں۔ جن کا ترجمہ یہ ہے:

''کس حادثہ سے زمانہ بدل گیا ہے۔ اور چاند تارے کیوں تاریک ہو گئے ہیں؟ رات اس قدر کیوں دراز ہوگئی ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب تارے نہیں ڈوبیں گے۔''

احمد بن ابراہیم بن الزبیر الثقفی بن کعب

احمد نام، اور ابوجعفر کنیت ہے، آپ کے سلسلۂ نسب میں ایک شخص کعب کا نام آیا ہے اس کا نسب نامہ یہ ہے:

کعب بن مالک بن علقمہ بن حباب بن مسلم بن عدی بن مرۃ بن عوف بن ثقیف۔

شہر جیان سے جو اہل قنسرین کی فرودگاہ ہے آپ کی اصل شروع ہوتی ہے، آپ ان عربوں کی نسل سے ہیں جنھوں نے باہر سے آکر اندلس میں بودوباش اختیار کر لی تھی، شہر جیان میں آپ کا بہت بڑا خاندان آباد ہے، آپ خاندانی شریف تھے، اور آپ کی خوش حالی مشہور تھی۔

جب ۶۴۳ھ میں دشمنوں نے شہر جیان پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا تو آپ کے والد آپ کو لے کر وہاں سے نکل گئے، اس وقت آپ کے والد کے پاس دولت و ثروت کی خطیر رقم موجود تھی جو آپ کی تحصیل علم میں معاون ہوئی، قرطبہ اور اشبیلیہ کے وہ بعید الوطن اور مہاجر علماء جنھیں زمانے کے شدائد نے محتاج بنا دیا تھا مثلاً ابوالحسن صائغ وغیرہ ان کی بھی اس رقم سے امداد کی جس کی وجہ سے یہ لوگ آپ کے معاون اور مخلص ہو گئے۔

ذاتی خصوصیات:

آپ اکابر علماء و اساتذہ اور محدثین کے آخری یادگار تھے، پاکیزگی اخلاق میں آپ کا کوئی ثانی نہ تھا، علوم و فنون کی تحصیل میں آپ نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، سماعت درس میں صبر و استقلال، تعلیم و تدریس کا انہماک آپ کی مشہور خصوصیت تھی، باوجودیکہ عمر اسی (۸۰) سال کی ہو چکی تھی پھر بھی آپ کے درس و تدریس میں کسی قسم کا خلل واقع نہیں ہوا، اور نہ اس میں آپ کو کبھی کوئی تکلیف محسوس ہوتی، خشوع و خضوع اور خوف الٰہی کی کیفیت ہر وقت آپ پر طاری رہتی تھی، ہمیشہ آنکھوں سے سیل اشک رواں رہتا تھا، امر حق میں تشدد فرماتے تھے، اہل بدعت کے سخت مخالف، اور اتباع سنت کے نہایت پابند تھے، گفتگو فصاحت آمیز ہوتی، چہرہ سے ہیبت ٹپکتی تھی، عوام و خواص آپ کی بڑی عظمت کرتے تھے، اور اس قدر شیریں گفتار تھے کہ ہم جلیس آپ کی صحبت سے لطف اندوز ہوتے تھے، آپ کے متعلق بہت سی حکایات بیان کی جاتی ہیں جو تمام تر وقار، عظمت اور جلالت

پر مشتمل ہیں۔

سرزمین اندلس میں فن ادب، تجوید قرآن، اور روایات حدیث کی ریاست آپ پر ختم ہوگئی ہے، فقہ اور تفسیر میں بھی دوسرے علماء کے ہم پایہ تھے۔

آپ نے جلیل القدر مغربی لوگوں سے علوم حاصل کیے تھے، ان میں ایک ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم بن مشہور غرناطی طائی بھی تھے۔

پایۂ تخت غرناطہ میں نکاح اور خطبہ کے قاضی مقرر کیے گئے تھے، آپ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی، گھر گھر آپ کا چرچا تھا، اور اس وصف میں آپ کا کوئی مماثل نہ تھا۔

آپ کی تالیفات کی تفصیل یہ ہے:

① ''کتاب صلۃ الصلہ لابن بشکوال'' میں نے بھی اس سے اپنی ایک کتاب کو ربط دے کر اس کا نام عائد الصلۃ رکھا ہے، اور اس کا افتتاح بھی آپ کے نام سے کیا ہے۔

② ''ملاک التاویل'' اس میں قرآن شریف کے متشابہ الفاظ کا بیان ہے، یہ کتاب اپنے موضوع میں نہایت نادر سمجھی جاتی ہے۔

③ ''البرہان'' اس میں قرآن کی سورتوں کی ترتیب کا ذکر ہے۔

④ ''شرح الاشارہ للباجی'' یہ اصول میں ہے۔

⑤ ''سبیل الرشاد'' جہاد کی فضیلت کے بیان میں ہے۔

⑥ ''روع الجاہل عن اعتاب المجاہل'' اس میں شودیہ کا رد ہے یہ کتاب نہایت قیمتی ہے اس سے آپ کے تفنن طبع اور کمال کا پتہ چلتا ہے۔

⑦ ''کتاب الزمان والمکان'' یہ کتاب آپ کے لیے ایک داغ ہے، خدا آپ سے درگزر فرمائے۔

آپ کے اشعار اچھے نہیں ہوتے تھے تاہم اس قابل ہیں ان کا ذکر کیا جائے، شیخ ابوالبرکات نے اپنی ایک کتاب میں جس کا نام ''شعر من لہ شعرلہ'' رکھا ہے، آپ کے حسب ذیل اشعار درج کیے ہیں، اس کتاب میں شاعروں کے وہی اشعار نقل کیے ہیں جن کا شمار اساتذۂ فن شاعری کی کسی صنعت میں نہیں ہوسکتا ہے۔

''میرے اور میرے سوال کے لیے یہ امر مذموم نہیں ہے کہ میں اپنے قریب یا بعید سے سوال کروں، گناہوں نے میرے کندھوں کو بوجھل کر دیا ہے اور ان کی ظلمت اور ہوتی نظر نہیں آتی ہے اے خدا میں طالب عفو ہوں میرے گناہ بہت ہیں اگر تیرا عفو نہ ہو تو میرے لیے برائی ہے۔''

بنی اشقیلولۃ کے ایک تجیبی رئیس سے جس نے مالقہ میں اقتدار حاصل کر لیا تھا آپ کے تعلقات خراب ہوگئے تھے، اور بنو شعوذہ کے ایک شخص نے جو نہایت مفتری اور کرامت کا مدعی تھا چند لوگوں کو بہکا کر ان سے آپ کی چغلی کرا کر تعلقات کو اور بھی زیادہ خراب کر دیا تھا۔

اس مفتری شخص کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کرامت کے ذریعہ نبوت کا دعویٰ کرنا چاہتا ہے، اس کا نام ابراہیم اور فزاری عرف تھا، وہ نہایت ہوشیار، چابک دست اور فتنہ پرداز تھا، آئندہ کی خبریں دیتا اور تقشّف ومکاری کے ذریعہ لوگوں کے عادات واطوار سے باخبر رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ عوام الناس جو بہائم صفت ہوتے ہیں، گونگے بہرے بن کر اس کے پیرو ہو گئے تھے، اور اس کی خاطر ان لوگوں نے آپ کی جان کو خطرہ میں ڈال دیا تھا۔

ایک زمانے کے بعد جب یہ مفتری شخص آپ کے ہاتھ سے غرناطہ میں قتل کیا گیا تو اس تجیبی رئیس کی قرار واقعی سزا کے لیے بھی آپ نے عجلت کی ہر چند اس نے فریاد کی مگر اس کی کچھ شنوائی نہ ہوئی۔

بہر حال آپ کو تجیبی رئیس کے مقابلہ کی اطلاع ملی، آپ نے اسی وقت مالقہ سے راہ فرار اختیار کی، تاہم آپ کے گھر پر حملہ کیا گیا اور لوگوں نے آپ کی کتابوں کے ذخیرہ پر قبضہ کر لیا، اس ذخیرہ میں آپ کے شیوخ کے چند مفید حواشی بھی تھے، جن کے ضائع ہونے کا صدمہ آپ کو مدت تک رہا تھا، اور اس صدمہ سے آپ کی مصیبت اور زیادہ ہو گئی تھی، اسی حالت میں آپ غرناطہ چلے آئے اور سلطان امیر ابوعبداللہ بن امیر غالب باللہ ابونصر کے زیر سایہ آپ نے پناہ لی، سلطان نے آپ کے ساتھ عمدہ سلوک کیا، اور آپ کی حقیقت سے آگاہ ہوا، رفتہ رفتہ آپ سے استفادہ کرنے کے لیے جم غفیر کا اژدہام ہونے لگا۔

آپ کے پڑوس میں ایک بزرگ صالح نصری سلسلہ کے رہا کرتے تھے، جن سے نسبت حاصل کرنے کے لیے آپ وہاں جایا کرتے تھے، وہ بزرگ صالح لوگوں کی چغلی کی وجہ سے شاہی عتاب میں تھے، ان کے پاس آپ کی آمد ورفت کی بھی مخبری کی گئی، مگر چونکہ ابھی آپ کی آمد ورفت مشکوک تھی اس لیے صرف اسی قدر سزا کی گئی کہ آپ ان متہم بزرگ کے پڑوس والے گھر سے نکال دیے گئے، اور کہیں آنے جانے کی آپ کو اجازت نہ دی گئی، بجز اس کے کہ آپ اپنے گھر میں اس طرح گوشہ گیر ہو کر رہیں کہ لوگ آپ سے نہ مل سکیں اور نہ آپ کے متعلق کچھ مداخلت کریں۔

اسی حالت میں آپ پر ایک زمانہ گزر گیا، آخر کار یہ مصیبت کی گھڑی دور ہوئی، کالے بادل چھٹ گئے، اور یہ بدر کامل بے حجاب ہو کر باہر نکل آیا، اس کے بعد آپ کی حالت سنور گئی، آپ کے عقیدت مندوں کی کثرت ہوئی، اور آپ کے علم کے غاشیہ بردار بہت پیدا ہو گئے، اس وقت آپ نے کتابوں کی تدوین شروع کی، اور طلبہ کو سماعت، روایت، اور تجربہ حاصل کرنے کا موقع دیا، طلبہ آپ سے پڑھ کر فارغ ہوئے اور آپ نے اپنے حلقۂ درس وتدریس میں شہرت پائی، پھر آپ کو اپنے دشمنوں پر قدرت حاصل ہوئی اور آپ کے انجام نے خوش گوار صورت اختیار کر لی، بہت سی ضائع شدہ کتابیں بھی مل گئیں، اور جب مالقہ میں امیر ابوعبداللہ بن نصر کی حکومت قائم ہو چکی تو آپ نے فزاری مذکورہ کو طلب کیا، گواہوں کے ذریعہ اس پر غالب آئے اور اس کی تحریک دعوت کو مردہ کرنے کی انتہائی کوشش کی، یہاں تک کہ فزاری آپ کے ہاتھ سے غرناطہ میں قتل کیا گیا۔

شیخ ابوالحسن بن الجیاب نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ جب فزاری قید خانہ سے مقتل میں لایا گیا تو وہ زور زور سے سورۂ (یٰس) پڑھنے لگا، ایک شریر شخص نے جو سزائے قید میں اس کا شریک تھا اس سے کہا، اپنا قرآن پڑھو، آج ہمارے قرآن کے کیوں طفیلی بنتے ہو، یا اسی کے مثل کوئی اور جملہ کہا تھا جو بطور ضرب المثل کے رہ گیا۔

آپ کی ولادت شہر جیان میں ۶۲۷ھ کے آخر میں ہوئی۔

۸/ربیع الاول ۷۰۸ھ غرناطہ میں آپ کی وفات ہوئی، جنازہ میں خلقت کا ہجوم تھا، ہر سمت سے لوگ کھنچ کر چلے آئے تھے، نعش کو طلبہ اپنے سروں پر اٹھا کر قبر تک لائے، اس وقت سخت کہرام برپا تھا، اور ہر شخص کی زبان پر آپ کی تعریف کے کلمات جاری تھے، اللہ تعالیٰ آپ پر رحمت نازل فرمائے، آپ کے تلامذہ میں ایک جماعت نے آپ کا مرثیہ لکھا۔

منجملہ ان کے قاضی ابوجعفر بنابی جبل نے جو مرثیہ لکھا تھا اس کے ابتدائی چند اشعار یہ ہیں۔

''اسلام اور علم کے عزیز اور بزرگ فرد تھے آپ کی وفات سے میری آنکھوں میں کیونکر نیند آ سکتی ہے۔ آنکھوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ اپنی رگوں سے اس حادثہ پر سرخ و سیاہ خون نہیں برساتی ہیں بخدا اگر سیل اشک رواں ہوکر دریا بن جائے جب بھی مرحوم کا ادنیٰ حق ادا نہ ہوگا۔ قسم ہے زندگی کی اس صدمہ سے ہماری روحوں کا پگھل جانا اور جگر کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ضروری ہے۔''

احمد بن عبدالنور بن احمد بن راشد

احمد نام، ابوجعفر کنیت ہے، مالقہ کے رہنے والے تھے، آپ کا خاندان بنوراشد کے نام سے مشہور تھا، شیخ ابوالبرکات کا بیان ہے کہ میں نے احمد بن عبدالنور کا نام انھیں کے ایک خط سے نقل کیا ہے، آپ نے اپنے نسب کے متعلق کچھ نہیں لکھا تھا اس لیے اس کا علم نہ ہوسکا، آپ کا مشہور نام ابن عبدالنور تھا۔

ابن عبدالنور کو عربیت میں کامل دستگاہ حاصل تھی، اور یہی آپ کا اصلی سرمایہ تھا، تاہم قدماء کی منطق، عروض، فرائض عبادات، اور شاعری میں دخل تھا، معمے اور چیستاں کے حل کرنے میں طبیعت کو خاص مناسبت تھی، قرآن شریف نہایت خوش الحانی اور خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے۔

آپ نے مالقہ سے سبتہ کا سفر کیا، پھر اندلس آئے اور وادی آش میں مدت تک تعلیمی خدمت انجام دی، مریۃ اور برجۃ میں بھی اکثر آیا کیے اور یہاں بھی قرآن شریف اور دیگر علوم کی جن میں دخل رکھتے تھے لوگوں کو تعلیم دی، کبھی نیابت عہدۂ قضا کی خدمت بھی انجام دی، سفر کے سلسلے میں غرناطہ بھی آئے۔

آپ نے قرآن شریف کی تعلیم ابوعمرو الدانی کی قرأت کے طریقہ پر خطیب ابوالحسن الحجاج بن ابی ریحانہ مبرلی سے حاصل کی، یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ آپ کے شہر میں شیخ موصوف کے سوا کوئی دوسرا استاذ بھی تھا یا نہیں کیونکہ آپ کو شیوخ سے ملنے اور ان سے استفادہ کرنے کا چنداں شوق نہ تھا، البتہ اتنا علم ہے کہ آپ ابوالحسن بن الاخضر مفری عروضی سے سبتہ میں ملے تھے اور عروض میں ان سے مذاکرہ کیا تھا لیکن ان سے استفادہ کرنے یا نہ کرنے کی اطلاع نہیں ملی۔

قاضی ابوعبداللہ بن بطال نے بیان کیا کہ وہ اور ابن عبدالنور دونوں نے ایک ساتھ ابن مفرج مالقی سے جزولیۃ پڑھی تھی اور ابن عبدالنور نے اس پر حاشیہ لکھ کر ابن مفرج کی خدمت میں پیش کیا تھا، ابن مفرج کا پورا نام محمد بن یحییٰ علی بن مفرج مالقی ہے الحجاج موصوف سے ابوعمرو الدانی کی تیسیر، زجاجی کی جمل، اور احمد بن یحییٰ ثعلب کی فصیح اور اشعار الستہ روایت کی ہے۔

مجھے ایک کتاب کی اطلاع ملی ہے جو جھلی پر لکھی ہوئی تھی، اس کی اجازت آپ نے کسی شیخ سے حاصل کی تھی مگر اس میں اس کی صراحت نہ تھی کہ الحجاج سے اس کی تحصیل کس طور کی ہے، اسی کتاب میں، میں نے ایسے

اوہام لکھے ہوئے دیکھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ ابن عبدالنور نے اس کتاب کی تحصیل میں عقل وشعور سے بالکل کام نہیں لیا تھا، یہ کتاب آپ کے التفات کے قابل ہرگز نہ تھی۔

بعض اصحاب کی تحریر سے معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے فقہ ابوریحانہ سے پڑھی تھی غالباً یہ واقعہ آپ کے بچپن کا ہوگا جبکہ طلب علم کی خلش دل میں پیدا نہ ہوئی ہوگی، کیونکہ جن علوم وفنون کو آپ نے حاصل کیا تھا ابوریحانہ کو ان میں دستگاہ نہیں تھی اور نہ وہ ان فنون کے ساتھ منسوب تھے۔

ابن عبدالنور کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

کتاب الحلیۃ، بسم اللہ اور درود کے بیان میں ہے، کتاب رصف المبانی، حروف معانی میں ہے، یہ آپ کی بلند پایہ تصنیف ہے اس سے عربیت میں آپ کی استادی کا اندازہ ہوتا ہے، ایک جزو عروض میں ہے، ایک جزو عروض کے شواذ میں ہے، ابوموسیٰ جزولی کی کتاب کامل کی شرح لکھی ہے، جس کی ضخامت تقریباً موطا کے برابر ہے، ابوعبداللہ بن ہشام الفہری، المعروف ابن الشواش کی کتاب مغرب کی بھی شرح لکھی ہے یہ شرح پوری نہ ہوسکی صرف ہمزۂ وصل تک لکھ سکے تھے اور ابوعلی کی ایضاح کی مانند ہے، جمل پر حاشیہ لکھا ہے لیکن وہ بھی ناتمام ہے۔

آپ کے اشعار متوسط درجہ کے ہوتے تھے نہ جید اور نہ ردی، شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہ تھی، شعر بہ تکلف کہتے تھے اور اس کے لیے خاص ارادہ کرتے تھے، جس کا عذر یہ تھا کہ وہ اچھے شعر نہ کہتے تھے۔

شیخ ابوالبرکات کا بیان ہے کہ میں نے ان کے ایک جزو اشعار بہ نظر امعان پڑھ ڈالے تاکہ ان میں جو اچھے ہوں انھیں منتخب کر کے اس تذکرہ میں درج کروں گا مگر بعض اشعار تو بالکل ''کوے کی کائیں کائیں'' کے مشابہ تھے میں نے ان کے ایسے اشعار بھی لکھ لیے ہیں اس لیے نہیں کہ میں نے ان کو دیگر اشعار پر ترجیح دی ہے بلکہ اس لیے کہ یہ ان کا نقش اول تھا۔

منجملہ اشعار کے ایک قصیدہ کے چند اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں جن کو میں نے خود شاعری کی تحریر سے نقل کیا ہے۔ جن کا ترجمہ یہ ہے:

''میرے محبوب کے محاسن کی جس قدر شرح لکھی جائے کم ہے۔ اس کی ہمت عالی ہے اور خلق وسیع ہے۔ اس کا نور جمال ارباب بصیرت کو مبہوت کر دیتا ہے۔ اور اگر صبح تاریک ہو جائے تو اس کے نور جمال سے آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ جب وہ قریب آتا ہے تو اس کی نظر تیر جگر خراش بن جاتی ہے۔ اور جس جس عضو میں پہنچتی ہے اس کو زخمی کر دیتی ہے۔ جب وہ فخر وغرور میں لڑتا اور تبختر سے پشت پھیرتا ہے تو اس کے قد کی لچک سے نیزے کو بھی غیرت ہوتی ہے۔ اگر اس کے دندان مشکبو سے کسی گلزار کے پاس خوشبو اڑتی ہے تو گلوں کی خوشبو کو شرمندہ کر دیتی ہے۔ وہ زمانہ ہے اور بوقت مسرت سراپا امید بھی ہے۔ اس کے گیسو سیاہی میں رات کے مماثل ہیں اور اس کا چہرہ چمک میں صبح کے

مماثل ہے۔ اس کی شراب محبت سے میرا نفس مخمور ہے۔ اس شراب کے نشہ میں میرا دل ہوش میں نہیں آتا۔ اس کی محبت میں دل متحیر ہے اور اخفائے محبت سے آنکھ کو اس قدر اذیت پہنچتی ہے کہ سیل اشک رواں ہو گیا ہے۔''

دنیاوی باتوں میں آپ کی نادانی اور سادہ لوحی کے اس قدر واقعات آپ کے خدمت گزار اور دوسرے ثقہ لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں کہ اگر وہ حد تواتر کو نہ پہنچے ہوتے تو کوئی شخص بھی ان کی تصدیق نہ کرتا، یہ تمام واقعات ابو علی شلوبین کی حکایت سے بالکل مشابہ ہیں۔

ایک دفعہ آپ نے چادر کا ایک ٹکڑا کسی شخص سے خریدا اور اسے پانی میں بھگویا، پانی میں تر ہونے سے سمٹ کر وہ چھوٹا ہو گیا جیسا کہ عموماً کپڑے پانی میں ڈالنے سے چھوٹے ہو جاتے ہیں اب اس ٹکڑے کو ناپا تو وہ پہلے سے چھوٹا تھا بائع سے باقی کپڑے کا مطالبہ کیا اس نے کپڑے کے چھوٹے ہونے کی وجہ بتائی لیکن اس کے سمجھنے سے آپ کی قوت فہم قاصر رہی۔

ایک دفعہ طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ آپ مریۃ کے کسی باغ میں گئے، طلبہ نے دودھ اور کچھ چاول ساتھ رکھ لیے تھے، چاولوں کے گلانے کے لیے ہانڈی کی ضرورت تھی مگر وہاں دستیاب نہ ہوئی ایک ہانڈی ملی جس میں کچھ روغن زفت (تارکول) تھا جو اونٹوں کے جسم پر لگایا جاتا ہے آپ نے کہا بس اسی ہانڈی میں چاول گلاؤ۔ ساتھیوں نے جواب دیا کہ اس میں چاول کیسے پک سکتے ہیں؟ اگر چوپایوں کے کھانے کی کوئی چیز بھی اس میں پکائی جائے تو وہ بھی نہ کھائیں گے اور یہ تو شیر برنج ہے، آپ نے ساتھیوں کو جواب دیا تم لوگ اپنے معدوں کو دھو ڈالو تو یہ کھانا حلق سے نیچے کر لو گے۔ ساتھ والوں کو بڑی حیرت تھی کہ آپ کس طرح اس ہانڈی کی پکی ہوئی چیز بطیب خاطر کھانے کو تیار ہیں، اور کس طرح آپ نے معدہ کے متعلق ایسا قیاس کیا ہے۔

ایک دفعہ کچھ لوگوں نے کسی سیر گاہ میں گوشت پکایا آپ نے اس کا نمک چکھا اس میں نمک کم تھا آپ نے اس میں نمک ڈالا اور فوراً شوربے میں نمک گھلنے سے پہلے دوبارہ گوشت کو چکھا اب بھی اس میں نمک کم پایا پھر اس میں نمک ڈالا یہاں تک کہ گوشت میں اتنا نمک تیز ہو گیا کہ کوئی اس کو کھا نہ سکا۔

ایک دفعہ آپ نے ایک حوض کی نالی میں ہاتھ ڈالا اتفاق سے ہاتھ ایک بڑے مینڈک پر جا پڑا وہیں سے آواز دی لوگو! یہاں ایک نرم پتھر ہے۔

ایک روز آپ نے قائد ابوالحسن بن کماشہ سے ایک اسپ شاہی کاغذی رنگ کا جو امراء کی سواری میں رہتا تھا مستعار مانگا اور کہا کہ یہ گھوڑا میرے پاس بھیج دیجیے، قائد نے خیال کیا کہ آپ سوار ہو کر کہیں جانا چاہتے ہیں، مگر آپ کی سادہ لوحی کا خیال کر کے پوچھا کہ آپ گھوڑا کیا کریں گے۔ آپ نے جواب دیا کہ رہٹ سے پانی کھنچواؤں گا، قائد نے کہا کہ ان شاء اللہ گھوڑے کے علاوہ دوسرے جانوروں سے بھی آپ کی یہ ضرورت پوری ہو سکتی ہے، چنانچہ آپ کے لیے ایک گدھا بھیج دیا جس سے پانی کھینچا جاتا تھا، الغرض اس قسم کی باتوں

میں آپ شعور وتمیز سے بالکل عاری تھے، مولف کہتا ہے کہ موجودات الٰہی میں بہت سی عبرتیں ہیں ان میں نادر تر عالم انسانی ہے، مختلف خواہشات اور متضاد وطبائع کے ساتھ انسان پیدا کیا گیا ہے، اسرار وغوامض کا وہ احاطہ کرتا ہے لیکن قریب تر اشیاء کے فہم سے وہ قاصر رہتا ہے۔

مجھ سے متعدد آدمیوں نے جن میں ایک میرے چچا ابوالقاسم اور ابن زبیر بھی شامل ہیں ابوالحسن ابن سراج سے بروایت ابوالقاسم بن بشکوال بیان کیا ہے کہ ایک روز افسر شرطی (پولیس) کے سامنے فقیہ ابوعمر ہندی صاحب وثائق کی ابراہیم بن محمد سے حجت وتکرار ہوئی مگر وہ اپنی حجت میں عاجز آ گئے اور اپنی ہار مان لی، افسر شرطی نے کہا ابوعمر! تمھارا عجب حال ہے دوسروں کے معاملے میں تم بڑے تیز وطرار رہتے ہو مگر جب تمھارا خاص اپنا معاملہ پیش آتا ہے تو تمھاری زبان بند ہو جاتی ہے، ابوعمر نے جواب دیا "کذلك يبين الله آياته للناس" (خدا اپنی نشانیاں لوگوں پر اسی طرح ظاہر کرتا ہے) پھر تمثیلاً ایک شعر پڑھا جس کا ترجمہ یہ ہے:

''میں چراغ کے فتیلہ کے مانند ہوں جو خود جلتا ہے مگر لوگوں کو روشنی دیتا ہے۔''

شیخ ابوالعباس کاتب وہ آخری شخص ہیں جن کے ساتھ میں نے اصحاب ابن العمار سے حدیث لکھی ہے، انھوں نے مجھ سے یہ بجایۃ میں بیان کیا کہ میں ابوالحسن عازم قرطاجنی کے پاس تونس میں آیا اور چونکہ میں کپڑے اچھے سی لیا کرتا تھا اس لیے انھوں نے مجھ سے کہا کہ مستنصر نے اپنی پوشاک میں سے ایک جربی جبہ مجھے عطا کیا ہے لیکن اس کی قطع ہمارے شرقی اندلس کے کپڑوں کی سی نہیں ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی آستینیں کھول کر ہمارے کپڑوں کی طرح بنا دو، میں نے پوچھا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ آستین کا سرا کھول کر اس کا تنگ حصہ اوپر جوڑ دو اور کشادہ حصہ اطراف میں ڈال دو میں نے کہا کہ اوپر کے حصہ میں جو کمی ہو گی وہ کس طرح پوری کی جائے گی کیونکہ جب آستین کا تنگ حصہ کشادہ جگہ وصل کیا جائے گا تو اس میں شکن پڑ جائے گی ہاں پیوند لگا کر آستین درست کی جاسکتی ہے اس کے سوا کوئی دوسری تدبیر نہیں ہے لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی بالآخر جب میں ان کی باتوں سے تنگ آ گیا تو انھیں چھوڑ کر واپس آ گیا، ایک طرف ان کی ذہانت کا یہ نمونہ ہے دوسری طرف اسی ذہانت سے انھوں نے مقصورہ اور دوسری عجیب وغریب کتابیں لکھی ہیں۔

ابن عبدالنور کی ولادت رمضان ۶۳۰ھ میں ہوئی۔

سہ شنبہ ۲۷ ربیع الآخر ۷۰۲ھ میں وفات پائی اور بیرون باب بجایۃ ایک گورستان میں شیخ ابوالعباس بن مکتوم زاہد کی تربت کے پاس مدفون ہوئے۔
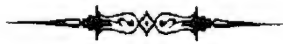
احمد بن محمد بن ابو الخلیل مفرج اموی

احمد نام، اور ابو العباس کنیت تھی، عشاب اور ابن الرومیہ کے عرف سے مشہور تھے، ابن فرقون نے ان کی کنیت ابو جعفر لکھی ہے۔

اموی خاندان کے موالی میں ان کا شمار ہے، اشبیلیہ کے رہنے والے تھے، اس شہر کی شہرت بھی زیادہ تر انھی کی وجہ سے ہے۔

قاضی ابو عبداللہ کہتے ہیں کہ عشاب کے پردادا کو قرطبہ کے کسی طبیب نے متبنیٰ بنالیا تھا، انھوں نے علم النبات بھی اپنے آقا ہی سے حاصل کیا تھا۔

عشاب اپنے زمانے میں یگانۂ روزگار تھے، ان کا کوئی ثانی نہ تھا، ان کی شخصیت اپنی جنس میں ممتاز تھی، حدیث کے امام، حافظ، اور نقاد تھے، محدثین کی تاریخ، انساب ولادت، وفات، اور جرح و تعدیل سے بخوبی آگاہ تھے، علم نبات کی واقفیت، جڑی بوٹیوں کی تمیز و تحلیل، اور ان کے اصول کے اثبات میں وہ نہ صرف اپنے زمانہ میں بلکہ متقدمین و متاخرین کے مقابلہ میں بھی نوع انسانی کے عجیب تر نمونہ تھے، جڑی بوٹیوں کی پیداوار مشرق میں ہو یا مغرب میں، اور ان کی جائے پیدائش کے حالات میں جس قدر اختلافات ہوں، ان تمام باتوں کو تحقیق، مشاہدہ، اور حس کے ذریعہ معلوم کر لیتے تھے، اس میں کوئی شخص ان کی نہ تردید کر سکتا تھا اور نہ تکذیب، وہ سراپا حجت تھے، جس سے کسی کو انکار نہ تھا، علم نبات میں وہ مسلم اور مرجع قرار دیے گئے تھے، علم حدیث اور علم نبات دونوں علوم میں ان کی حالت مساوی تھی، کیونکہ دونوں کا قدر مشترک بھی واحد ہے، مختلف مقامات کی سیر کرنا، ہر چیز کو لکھنا، لفظی مشکلات کی تحقیق کرنا، اور ادیان و ابدان کے اصول کو محفوظ رکھنا، ازیں قبیل دوسری باتیں دونوں علم کے لیے ضروری ہیں۔

عشاب زاہد اور صاحب ایثار تھے، زندگی بہت کشادگی سے بسر کرتے تھے، ان کے پاس ہر وقت کتابوں کا ذخیرہ رہتا تھا، اور علم وفن میں کتابیں برابر فراہم کرتے رہتے تھے، اکثر اپنی کتابوں میں سے اصل و نفیس نسخہ جو نادر الوجود ہوتا تھا جس کسی نے مانگا ثواب اور تعلیمی اعانت کے خیال سے اس کو دے دیتے تھے، اس بات میں ان کے بکثرت واقعات ان کے فضل و کرم کے شاہد ہیں، علمی شغف اتنا بڑھا ہوا تھا کہ نوشت و خواند

کے خیال سے وہ راتوں کو جاگا کرتے تھے، کیونکہ دوسرے اوقات میں لوگوں کی ضرورتیں ان سے وابستہ رہتی تھیں، جس کی وجہ سے یہ تھی کہ طبی علاج میں یہ بہت خوبیوں کے آدمی تھے، اور اپنی ثقاہت تدوین کے سبب سے مرجع عام بنے ہوئے تھے۔

عبدالملک کہتے ہیں کہ عشاب اپنے فن میں سارے مغرب کے امام تھے، وہ اندلس اور مغربی عدوہ (افریقیہ) کے چپہ چپہ میں پھرے، مشرق کی سیاحت کی، اور افریقیہ، مصر، شام، عراق اور حجاز کے مشہور لوگوں سے ملے، ان سے استفادہ کیا، اور جو چیزیں مغرب میں نہیں ہوتی ہیں ان کا بہ چشم خود معائنہ کیا اور ان کے متعلق بکثرت لوگوں سے مجمع عام میں معارضہ ومناظرہ کر کے ان پر اپنی فضیلت علمی ظاہر کی، اور ان سے خراج تحسین وصول کیا۔

یہ ہمیشہ چیزوں کے حقائق کے متعلق بحثیں کیا کرتے تھے، اور ان کے اسرار وغوامض کے پردے فاش کرنے میں مصروف رہتے تھے، جس کی وجہ سے انھیں اشیاء کے متعلق اس قدر اطلاع اور آگاہی حاصل تھی کہ متقدمین اسلام میں کوئی شخص ان کا ہم پلہ نہیں گزرا، اسی وجہ سے یہ فرد روزگار اور اپنے عہد کے یکتا تسلیم کیے گئے ہیں، اس پر سب کا اجماع ہے، کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے۔

عشاب سنی تھے، عقیدہ صاف رکھتے تھے، اہل الرائے کی طرف ان کا میلان تھا صلاح وتقویٰ اور تدین میں ابومحمد علی بن احمد بن سعید بن حزم کے ساتھ انھیں بہت غلو تھا، انھوں نے ابومحمد بن حزم کی تصانیف کی اشاعت میں کافی حصہ لیا، یہ تصانیف انھیں اس قدر پسند خاطر تھیں کہ بصرف زر کثیر پوری توجہ کے ساتھ زاویۂ خمول سے نکال کر لوگوں میں ان کو روشناس کرایا، یہاں تک کہ ابن حزم کی تمام کتابیں ایک ایک کر کے فراہم کیں، اور کوئی کتاب ان کی دسترس سے باہر نہ رہی، بجز ان کتابوں کے جن کی کوئی اہمیت ان کے دل میں نہ تھی، اس مقصد کی کامیابی میں دولت وثروت بھی ان کی بہت زیادہ معاون ہوئی۔

عشاب کے اساتذہ کی فہرست ایک بحر ناپیدا کنار ہے، اندلس میں جن شیوخ سے روایت کی ہے ان کے نام یہ ہیں:

ابواسحٰق دمشقی، ابوعبداللہ بابری، ابوالبرکات ابن داود، ابوبکر بن طلحہ، ابوعبداللہ بن اسجد، ابن العربی، ابوعلی حافظ، ابوزکریا بن مرزوق، ابن یوسف، ابن میمون شریشی، ابوالحسن بن زرقون، ابوذر مصعب، ابوالعباس بن سید الناس، ابوالقاسم بارقی، ابن جمہور، ابومحمد بن محمد بن الجنان، عبدالمنعم بن فرس، ابوالولید ابن عفیر، ان مذکورہ اساتذہ سے عشاب نے پڑھا اور سماعت کی ہے۔

اہل اندلس اور مغرب میں جن اساتذہ سے انھیں تحریری اجازت ملی ہے، ان کے نام یہ ہیں:

ابوالبقاء بن قدیم، ابوجعفر حکم الجفار، ابوالحسن شغوری، ابوسلیمان بن حوطہ اللہ، ابوزکریا دمشقی، ابوعبداللہ اندرشی، ابولاقاسم بن شمجوق، ابومحمد حجری۔

بغداد اور عراق کے شیوخ کی ایک جماعت نے انھیں روایت کی اجازت دی ہے ان میں چند کے نام یہ ہیں۔ظفر بن محمد، عبدالرحمٰن بن مبارک، علی بن محمد یزیدی، فناخسرو، فیروز بن سعید، ابن سینہ، محمد بن نصر، صیدلانی، ابن تیمیہ، ابن عبدالرحمٰن فارسی، ابن الفضل موذن، ابن عمر بن فخار، مسعود بن محمد بن حسان، منصور بن عبدالمنعم صاعدی، ابن ہوازن قشیری، ابوالحسن نیساپوری۔

۶۱۲ھ میں بغرض حج سفر کیا، ۶۱۳ھ میں فریضۂ حج سے فارغ ہوئے، مشرق میں محبّ الدین کے لقب سے شہرت پائی، اس سفر میں تین سال تک سیاحت کرتے رہے، اثنائے سیاحت میں چوٹی کے اکابر علماء سے ملاقاتیں کیں، ان میں چند کے نام یہ ہیں:

بجایہ میں ابوالحسن بن نصر اور ابومحمد بن مکی سے، تونس میں ابومحمد مرجانی سے، اسکندریہ میں ابوالاصبغ بن عبدالعزیز اندلسی، ابوالحسن بن خیبر اندلسی، ابوالفضل بن جعفر بن ابوالحسن بن ابوالبرکات اور ابومحمد عبدالکریم ربعی سے ملاقاتیں کیں، مصر میں ابوالمیمون بن ہبتہ اللہ قریشی سے ملاقات کی، اور ابومحمد بن سحنون غماری سے نہ ملے صرف اجازت لی، مکہ میں ابوعلی حسن بن محمد بن حسین، اور ابوالفتح نصر بن ابوالفرج مصری سے، بغداد میں احمد بن ابوالسادات، احمد بن ابوبکر، ابن ابوخط طلحہ، ابونصر قریشی، ابراہیم بن ابویاسر قطیعی، رسلان المسدی، اسعد بن نفاق، اسماعیل بن براکش جوہری، اسماعیل بن ابوالبرکات سے ملاقاتیں کیں۔

عشاب کے شیوخ اور مرویات کی فہرست کئی سو صفحات پر مشتمل ہے، ان شیوخ کے نام عراق اور دیگر ممالک کے اعتبار سے مرتب کیے گئے ہیں۔

قاضی ابوعبداللہ مراکشی نے اس فہرست کے ذکر کے بعد لکھا ہے کہ ابوالعباس نباتی (عشاب) نے اپنے نوشتہ جات کا تذکرہ تین قسم کی فہرستوں میں کیا ہے، بسیط، متوسط، اور مختصر، ان میں سے میں نے بعض کو خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا، اور بعض کو ان کے شاگردوں کا منقولہ پایا۔

عشاب نے بغداد میں بڑی وسعت کے ساتھ روایات بیان کی ہیں، ابوعبداللہ بن سعید لوشی نے بغداد میں، حافظ ابوبکر بن مقط نے مصر میں اور ایک گروہ نے دیگر ممالک میں ان سے روایت حاصل کی، پھر انھوں نے وسیع روایت کے ساتھ وطن کی طرف مراجعت کی اور اپنے ساتھ نادر کتابوں کا ذخیرہ بھی لائے۔

علم حدیث اور علم نبات میں عشاب کی نہایت مفید، بلند پایہ، اور نادر تصانیف ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے، حدیث میں حسب ذیل کتابیں ہیں:

کتاب المعلم، اس میں مسلم سے جو زوائد حدیث بخاری میں مذکور ہیں ان کو جمع کیا ہے، دارقطنی کی غریب حدیث مالک، کا اختصار، نظم الدراری، اس کتاب میں مسلم کی ان مفردات کو فراہم کیا ہے جو بخاری میں نہیں ہیں، توہین طرق حدیث اربعین، حکم الدعاء فی ادبار الصلوات، کیفیۃ الاذان یوم الجمعۃ، ابواحمد بن علی کی، الکامل فی الضعفاء والمنکرین، کا اختصار، الحافل فی تذییل الکامل، اخبار محمد بن اسحاق۔

علم النبات میں یہ کتابیں ہیں:

شرح حشائش ویاسفوریدوس، ادویۃ جالینوس، الرحلۃ النباتیہ، المستدرکہ، یہ کتاب اپنی شان میں مخصوص، اپنے فن میں معجز اور نہایت نادر تھی، لیکن مصنف کی وفات کے بعد یہ مفقود ہوگئی، ایک کتاب ان اوہام کی تنبیہ میں لکھی ہے جو ادویہ جالینوس کے ترجمے میں ہوئے تھے، اور ایک کتاب غافقی کے اختلاط کی تنبیہ میں ہے، ان کتابوں کے علاوہ عشاب کی اور بھی جامع تصانیف، مفید مقالات اور گوناگوں حواشی ہیں۔

ابن عبدالملک، ابن الزبیر اور دیگر تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ عشاب کے ایک شاگرد ابومحمد ابن الجزیری نے جو محدث اور نقاد بھی تھے نہایت توجہ اور خاص اہتمام سے عشاب کے حالات، اور مناقب و مآثر کو ایک مجموعہ میں جمع کر دیا ہے۔

ابوالحسن بن سعید نے ''القدح المعلی'' میں لکھا ہے کہ عشاب مشرقی اور مغربی بلاد کی سیاحت کر کے، جب واپس آئے تو میں اشبیلیہ میں ان کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا، اس وقت انھیں ادب سے بڑی دلچسپی لیتے ہوئے دیکھا، اس فن میں وہ اس طرح لطف اندوز ہوتے تھے جس طرح بحتری حلب میں اس فن سے حظ حاصل کرتا تھا، وہ اپنی شاعری کا اظہار نہیں کرتے تھے، تاہم ان کے اصحاب ان سے اشعار سنتے اور روایت کرتے تھے، میں بھی کبھی کبھی ان سے اشعار سنتا تھا چنانچہ ان کے یہ اشعار میں نے لکھ لیے ہیں۔ جن کا ترجمہ یہ ہے:

''وہ گویا ہر دن ہے جو جام شراب اور قوس کے ساتھ ایسی جنت میں رہتا ہے جو چشم کو گوش کو مسرتوں سے بھر دیتی ہے اس جنت کے محاسن کی جائے دید پر اپنی نظر ڈال تیری فکر اس کے گل و گلزار میں سیر کرے گی۔ یہاں شام کی سنہری رنگتوں کو دیکھ اور بوقت صبح پرندوں کے چہچہوں کو سن پھر اس شخص سے کہہ جو اپنی لذتوں میں پڑا ہوا ہے کہ تو مجھے اپنی حالت پر چھوڑ دے کیونکہ تیرا شمار بشریت میں نہیں ہے۔''

ابوالحسن بن سعید کہتے ہیں کہ عشاب اکثر اپنے اشعار میں محاسن کو نہایت بسط و اطناب سے بیان کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کے اشعار ابھی ختم نہیں ہوتے تھے اور میرے دل میں دمشق کی تصویر کھنچ جاتی تھی، اور شوق دل میں گدگدی پیدا کرتا تھا کہ پیام اجل کو لبیک کہنے سے پہلے وہاں جا کر اپنی تمنائیں پوری کروں اور ہزار مرتبہ بھی دمشق کو دیکھوں جب بھی آنکھیں اس کے محاسن سے سیر نہ ہوں۔

عشاب نے کئی مرتبہ غرناطہ کا سفر کیا، سفر کی غرض حدیث کی سماعت، نباتات کی تحقیق اور غرناطہ کے پہاڑوں میں نباتی جوہروں کی تلاش و جستجو تھی، یہ پہاڑ درحقیقت دواؤں کے خزانے ہیں، اور ان پہاڑوں سے قیمتی فوائد کے حصول کا خیال کیا جاتا ہے، جن کا بیان عشاب کی تالیفات میں مذکور ہے، اور جس کی تصدیق کے لیے کسی شاہد کی ضرورت نہیں ہے۔

عشاب محرم ۵۶۱ھ میں پیدا ہوئے۔

۳۰ ربیع الآخر ۶۳۷ھ میں دوشنبہ کی شام کو جس وقت شفق ڈوب رہی تھی اشبیلیہ میں وفات پائی۔

ابن الزبیر کا بیان ہے کہ عشاب کی وفات کے بعد ان کے تلامذہ کی ایک جماعت نے مرثیہ لکھا، چند کے نام یہ ہیں:

ابومحمد جزیری، ابوامیہ اسماعیل بن عفیر، ابوالاصبغ عبدالعزیز کتبوری، ابوبکر محمد بن جابر سقطی، ابوالعباس بن سلیمان۔

جزیری مذکور نے ان تمام مرثیہ نویسوں کا تذکرہ ایک کتاب میں کیا ہے جسے شیخ ابوالعباس عشاب کے فضائل میں لکھی ہے۔
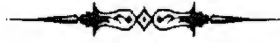
احمد بن عبد الملک بن سعید ابن عمار بن یاسر صحابی رسول اللہ ﷺ

احمد نام، ابو جعفر کنیت تھی۔

بنو سعید عنسی کا گھرانہ قلعۂ یحصب اندلس میں مشہور ہے، اس خاندان کے مورث اعلیٰ عبد اللہ بن سعید بن عمار بن یاسر یہاں آ کر فروکش ہوئے تھے، اس خاندان کو بڑی منزلت حاصل تھی، اور قرطبہ میں بھی اس نے اہل یمن کا مرتبہ پایا تھا، قرطبہ میں جس مقام پر قنطرہ (پل) واقع ہے اس کے قریب ہی اس خاندان کے گھر معروف و مشہور ہیں، اس خاندان میں سپہ سالار، وزیر، قاضی اور کاتب ہوتے آئے ہیں، اس بیان سے اور آئندہ جو کچھ مذکور ہوگا اس سے اس خاندان کی وجاہت معلوم ہوسکتی ہے۔

ملاحی کہتے ہیں کہ احمد بن عبد الملک جلیل القدر اور مشہور طالبان علم میں سے تھے، ادب میں ید طولیٰ رکھتے تھے، تحریر نہایت مفید ہوتی تھی، ان کے تمام اشعار مدون ہیں۔ ابو الحسن بن سعید نے اپنی کتاب "الطالع" میں لکھا ہے کہ احمد بن عبد الملک کی نشو و نما ادب میں ہوئی، وہ اشعار کے حافظ تھے، شریف رضی، مہیار، ابن خفاجہ، اور ابن وقاق کی نظمیں انھیں ازبر یاد تھیں، جس کی وجہ سے ان کی طبیعت میں رقت پیدا ہوگئی تھی اور مضامین میں بکثرت ایجاد و اختراع کرتے تھے۔

حفصہ بنت الحجاج رکونی جو بڑی ادیبہ اور شاعرۂ روزگار تھی اس کی نشو و نما بھی ابو جعفر کے ساتھ ساتھ ہوئی تھی، اس شاعرہ سے انھیں شدید عشق تھا، اور اس کی محبت میں وہ نہایت وارفتہ ہوگئے تھے، ان دونوں کی ہم نشینی اور باہم شعر خوانی اتنی پائدار تھی جتنی ابو عبادہ اور علوۃ کے درمیان تھی۔

موحدین کے ایک حکمران نے جبل فتح میں عیش و نشاط کی محفلیں گرم کر رکھی تھیں، اس کے دربار میں سارے اندلس کے وفد باریاب ہو رہے تھے، شعراء اپنے قصیدے اور خطباء اپنے خطبے اس کو سنا رہے تھے، اس وقت غرناطہ کے وفد میں ابو جعفر بھی جو بالکل کم سن تھے اپنے باپ، بھائی اور قوم کے ساتھ آئے، اور اپنی جماعت کو لے کر خلیفہ کے دربار میں باریاب ہوئے، اور اپنا قصیدہ پڑھ کر سنایا۔

ابو الحسن بن سعید کہتے ہیں کہ میں نے اس قصیدہ کے چند اشعار ابو جعفر کے والد کے خط سے نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں:

''اے بادشاہ! زمانہ تیری گفتگو کی طرف ہمہ تن گوش ہے تو ارشاد فرما، آج امر ونہی کا اختیار تیرے سوا کسی کو نہیں ہے جس کا دل چاہے تو ارادہ کر وہ ہو کر رہے گی۔ اور تو قصد فرما کوئی برِاعظم اور کوئی دریا تیری فتوحات سے باقی نہ رہے گا۔ تیرے لیے یہ نیک فال ہے کہ یہ دریا تیری کثیر فوج کی پائمال کی ہوئی مٹی کو بوسہ دے رہا ہے۔ دریا سے جو آواز اٹھ رہی ہے وہ تیرے سلام کا جواب ہے۔ اور ان کی طرف سے پیام سلام ہے جو تیرے نزدیک ناتوان ہیں۔ یہ دریا اس لیے جوش میں ہے تاکہ تیرے روبرو تیرے مخالف سے مقابلہ کر کے اس کو حکومت کا موقع نہ دے جزیرۂ اندلس پر سعادت بلند ہے۔ کیونکہ تیری حکومت کی خبر یہاں برابر تازہ ہوتی رہتی ہے طارق بن زیاد بھی تیرے آگے سرنگوں ہے۔ اور موسیٰ بن نصیر کو بھی تیری جیسی نصرت حاصل نہ تھی بلکہ وہ دونوں اندلس میں اس لیے آئے تھے تاکہ تیرا داخلہ یہاں اس طرح ہو۔ جس طرح بدر کامل ہالہ میں داخل ہوتا ہے۔''

ابوالحسن بن سعید کا بیان ہے کہ جب ابوجعفر نے اپنا قصیدہ ختم کیا تو خلیفہ نے ان کی بہت تعریف کی، اور ان کے والد عبدالملک سے کہا کہ ''تمھارے دو بیٹوں میں کون تمھارے نزدیک بہتر ہے؟'' عبدالملک نے جواب دیا کہ ''سیدی! محمد آپ کی بارگاہ میں اندلس کے بہادروں اور سپہ سالاروں کے ساتھ حاضر ہوا ہے، اور ابو جعفر شعرا کی جماعت کے ساتھ دربار میں پیش ہوا ہے، اب آپ خود فیصلہ فرمالیں کہ ان دونوں بیٹوں میں میرے نزدیک کس کا بہتر ہونا آپ کو محبوب ہے۔'' خلیفہ نے کہا کہ ''جو شخص جس کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہی اس کے لیے آسان ہوتا ہے، جب کوئی شخص کسی فن میں بڑھا ہوا ہو تو اس پر افسوس نہ کرنا چاہیے، البتہ افسوس اس پر ہے، جو بے رتبہ اور حرماں نصیب ہے۔'' اس کے بعد چوٹی کے شعراء اور اکابر نے خلیفہ کو اپنے اپنے قصائد پڑھ کر سنائے۔

جب غرناطہ کا ولی خلیفۂ مذکور کا فرزند السید ابوسعید قرار پایا تو اس نے ابوجعفر کو اپنا وزیر مقرر کیا، اس کے بعد ان کی منزلت وتوقیر برابر قائم رہی، یہاں تک کہ ایک واقعہ پیش آیا جو ان کی تباہی کا باعث ہوا۔

متعدد راوی جن میں ابوجعفر کے قرابت دار بھی ہیں بیان کرتے ہیں کہ حفصہ شاعرہ کی وجہ سے ابوجعفر اور سید ابوسعید میں باہم سخت کشیدگی پیدا ہوئی، حفصہ ابوجعفر کی محبوبہ تھی، پھر اس کے وصال سے سید بہرہ اندوز ہونے لگا، تاہم ابوجعفر سے اس کا تعلق قائم رہا، اس بناء پر ابوجعفر اور سید ایک دوسرے کے حریف ہو گئے، ابوجعفر کے حاسدوں کو نہایت اچھا موقع ہاتھ آیا، ان لوگوں نے ان کے خلاف سید کو بدگمان اور برانگیختہ کر دیا، اور ان میں سے ایک نے چغلی کر کے یہ بیان کیا کہ ابوجعفر نے ایک روز حفصہ سے کہا ہے کہ سید سے تمھیں اس قدر شدید عشق کیوں ہے؟ اس کا رنگ گندمی ہے، میں تمھارے لیے ایک سیہ غلام بیس دینار میں خرید سکتا ہوں جو سید سے بہت اچھا ہوگا۔'' سید یہ باتیں سن کر ابوجعفر کی ایذا رسانی کے درپے ہو گیا اور وہ بھی اپنی حفاظت کی تدبیریں کرنے لگے، اسی زمانہ میں ابوجعفر نے یہ اشعار موزوں کیے تھے۔

''کون مجھ سے میری زندگی اور زندگی کی مسرتیں میری وزارت، میری تہذیب اور میرا ادب مول لیتا ہے بعوض چرواہے کے اس مقام کے جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہو اور دنیا کے انتہائی کنارے پر ہو۔ دنیا میں اسی کا حکم قابل قبول ہے جو خطا کاروں پر ہمیشہ عفوورحم کا برتاؤ کرتا ہے۔ میں اپنی زندگی سے ایک شخص کے باعث تنگ آ گیا ہوں۔ جو غضب ناک، چہرہ سیاہ اور رتبہ والا ہے۔ جب میں اس کو دیکھتا ہوں تو موت مجھے گھورتی ہے۔ اور جب میں اس سے پرہیز کرتا ہوں تو یہ شخص میری فکر میں رہتا ہے۔ باوجود زمانہ تک اس کے ساتھ سیاست برتنے کے اب دنیا میں نہ اس کو خوش کرنے کی اور نہ راہ فرار اختیار کرنے کی میں ہدایت پاتا ہوں۔''

ابوجعفر نے اپنی تدبیروں میں اپنے والد اور بھائی کو شریک کرنا چاہا، اس وقت ملک میں ابن مرونیش کا فتنہ برپا تھا، مگر اس کے بھائی محمد اور اس کے باپ نے جواب دیا کہ ''اگر آج کوئی تحریک بلند کرتے ہیں تو اس شاہی خاندان کے زوال کا باعث ہم ہی ہوں گے، یہاں تک کہ یہ قومی سلطنت بھی مٹ جائے گی، بہتر یہ ہے، کہ صبر کریں، اس کا انجام نیک ہوگا، ہم تجھے ان حرکتوں سے منع کرتے ہیں تاہم تو اپنی خواہش کا تابع رہتا ہے۔'' بعدازاں ابوجعفر نے عبدالرحمٰن کو ہموار کیا جو اس کا بھائی تھا، اور دونوں اس پر متفق ہو گئے کہ ابن مرونیش کے نام سے قلعہ میں بغاوت پیدا کی جائے، اس منصوبہ میں حاتم بن حاتم بن سعید نے بھی جوان دونوں کا قرابت مند تھا مساعدت کی، بالآخر ان لوگوں نے ابن مرونیش سے خط وکتابت شروع کی اس نے فی الفور خط کا جواب دیا، اور ان کے پاس چند آزمودہ گھوڑے بھیج دیے، اور خود قلعہ میں داخل ہو کر اس پر قبضہ کرنے کا تہیہ کیا، ابوجعفر کی جماعت افشائے راز سے ترساں تھی، اس لیے حاتم اور عبدالرحمٰن بسرعت تمام قلعہ میں داخل ہو گئے، اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے، مگر ابوجعفر اپنی بزدلی سے پیچھے رہ گئے، اور اپنے ساتھیوں کو کھو بیٹھے، جب انھوں نے دیکھا کہ قلعہ تک راستہ میں لوگ ان کی تلاش وجستجو میں مصروف ہیں تو مخفی طور سے مالقہ کی راہ لی تاکہ وہاں سے دریائی سفر اختیار کر کے ابن مرونیش سے جا ملیں، سید نے ان کے لیے ہر جگہ جاسوس لگا رکھے تھے، یہ مالقہ میں گرفتار کر لیے گئے، اور اس کی اطلاع سید کو دی گئی اس نے ان کے سولی پر لٹکا دینے کا حکم دیا، خدا کی ان پر رحمت نازل ہو۔

ابوالحسن بن سعید بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے حسن بن دویرہ نے کہا ہے کہ جب ابوجعفر گرفتار کیے گئے تو میں مالقہ میں موجود تھا، میں ان سے جا کر ملا، وہ قید کی حالت میں تھے، اور اپنے لیے کسی قسم کی اجازت سید سے حاصل نہیں کی تھی، انھیں مقید دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، ابوجعفر نے کہا کہ ''تم مجھ پر روتے ہو، حالانکہ میں دنیا کی لذیذ نعمتوں سے بہرہ اندوز ہو چکا ہوں۔ میں نے مرغیوں کے دل وجگر کھائے ہیں، جام بلوریں میں پانی پیا ہے، اسپ صبا رفتار پر سوار ہوا ہوں، فرش دیبا پر سویا ہوں، بیگمات اور کنیزوں سے لطف اندوز ہوا ہوں، شمع تاباں روشن کر چکا ہوں، اب ظالم حجاج کے قبضہ میں ہوں، اور منصور حلاج کی سی مصیبت کا

منتظر ہوں، میں خدا کے پاس جا رہا ہوں، اور جو خدائے غفار کے پاس جاتا ہے وہ کسی عذر اور حجت کا محتاج نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا کیا ایسے شخص پر نہ روؤں جو ایسی مسجع ومقفی باتیں کرتا ہو، پھر ان کی جستجو ہونے لگی تو میں اٹھ کر وہاں سے چلا آیا، اس کے بعد میں نے انھیں اس وقت دیکھا جب وہ سولی پر لٹک رہے تھے، خدا انھیں غریق رحمت فرمائے۔

ابوجعفر کے اشعار کا دیوان مدون اور مرتب ہے، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، ان کی جلالت معلوم کرنے کے لیے اس قدر اشعار کافی ہیں۔

حاتم بن سعید بیان کرتے ہیں کہ جب کبھی دورِ ساغر چلتا تھا تو ابوجعفر کے دل میں حفصہ کا عشق موجزن ہوتا تھا، اس وقت قدرت ان کی زبان پر یہ الفاظ جاری کر دیتی تھی: ''اے حفصہ! میری جان تیرے سوا کوئی نہیں لے گا'' اس جملہ سے ابوجعفر کی مراد حفصہ کی محبت تھی، گویا قضا و قدر ان کے اس کلام سے متعلق تھی، چنانچہ اسی عشق کی قربان گاہ پر ابوجعفر کی جان شیریں بھینٹ چڑھا دی گئی۔

جب حفصہ کو اپنے عاشق کے قتل کی اطلاع ملی تو اس نے سوگ منایا، ماتمی کپڑے پہنے، اور پکار پکار کر اپنے حزن والم کا اظہار کرنے لگی، اس پر اسے قتل کی دھمکیاں دی گئیں تو اس نے یہ اشعار پڑھے:

''ماتمی کپڑے پہننے سے لوگ مجھے دھمکیاں دیتے ہیں۔ یہ سوگ اس عاشق کے لیے ہے جس کو لوگوں نے ہلاک کر دیا۔ خدا اس پر رحم فرمائے جو ان دشمنوں کے مقتول پر آنسو بہاتا یا اس پر نوحہ کرتا ہے۔

اس مقتول کو ابر صباحی سیراب کرے۔ جس طرح اس کا دست سخا شہروں کو سیراب کرتا تھا۔''

ابوجعفر کے قتل کے بعد سید حفصہ سے بہرہ ور نہ ہو سکا، چند دنوں کے بعد یہ بھی لحد میں اپنے عاشق سے جا ملی۔

ابوجعفر کے سولی پر لٹکائے جانے کا واقعہ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ جمادی الاولیٰ ۵۵۰ء میں پیش آیا۔

احمد بن محمد بن طلحہ

احمد بن محمد نام، ابو جعفر کنیت ہے، اپنے دادا کی طرف منسوب تھے، اس لیے ابن طلحہ کے عرف سے مشہور ہوئے جزیرۂ شقر ان کا وطن تھا۔

القدح المعلی کے مصنف کا بیان ہے کہ جزیرۂ شقر جو اعمال بلنسیہ میں سے ہے وہاں کے ایک مشہور گھرانے سے ابن طلحہ کا تعلق ہے، خاندان بنو عبدالمومن میں جو والی گزرے ان کی طرف سے یہ کاتب مقرر کیے گئے تھے اور جب اندلس پر ابن ہود کا تسلط ہوا تو اس نے انھیں اپنا کاتب مقرر کیا، اور کبھی کبھی وزارت کے عہدہ سے بھی یہ سرفراز کیے گئے، میرے والدان کے بہت زیادہ ہم بزم اور ہم نشین تھے اور وہ ایک دوسرے کی ملاقات کو جایا کرتے تھے دونوں میں گہری ملاقات تھی، اس صحبت کی جتنی باتیں میرا حافظہ محفوظ رکھ سکا وہ یاد ہیں ان کے سوا میں نے کچھ اور ابن طلحہ سے استفادہ نہیں کیا۔

مصنف مذکور کہتے ہیں کہ ایک روز میں نے ابن طلحہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ آپ لوگ حبیب، بحتری، اور متنبّی کے متعلق قیامت برپا کرتے ہیں، حالانکہ آپ کے زمانے میں ایک ایسا شخص موجود ہے جس میں وہ باتیں موجود ہیں جن سے تمام متقدمین اور متاخرین محروم تھے یہ سن کر درمیان سے ایک شخص جھپٹ کر سامنے آیا اور پوچھا ابو جعفر! وہ شخص کہاں ہے؟ کیا وہ تمھی ہو؟ ابن طلحہ نے کہا ہاں میں ہی ہوں، اور تمھیں تعجب کیوں ہے، میرے اشعار سنو:

''اے مخاطب کیا آج تو ہمارے خوشگواروں کو دیکھتا ہے جس نے افق کی گردن میں عقیق کا طوق ڈال دیا ہے اور جس نے شاخوں کے پتوں کو نطق بخشا ہے۔ جس کی وجہ سے ہر ایک شاخ طرب کی حالت میں اور آفتاب بھی باغ کے گل لالہ کے جام میں شراب نوش کر رہا ہے۔''

لوگوں نے ان اشعار کی داد نہ دی بلکہ ابن طلحہ کے رنج و ملال کو اور زیادہ کر دیا، لیکن میں نے ان سے کہا، سیدی! واللہ یہ اشعار سحر حلال ہیں میں نے ان کی مانند اپنے معاصرین کے اشعار نہیں سنے ہیں، بخدا ایسے اشعار اور مجھے سنایئے، ابن طلحہ نے کہا خدا تمھارا بھلا کرے، تم منصف بن منصف ہو، لو سنو! اور اپنے کان کھولو، پھر انھوں نے یہ اشعار پڑھ کر سنائے:

''اے ساقی! ساغر کو گردش دے کیونکہ آسمان خوشبو سے بسے ہوئے عروسی جامہ میں نمودار ہوا ہے

وقت شام نے زمین کے رخسات کو زعفرانی کر دیا ہے اور دریا کی آنکھوں میں سرمہ ڈال دیا ہے، شاخوں کی گردنیں موتیوں سے چمک رہی ہیں جن سے راتیں بھی روشن ہو جاتی ہیں۔''

ابن طلحہ اپنے مخدوم متوکل علی اللہ بن ہود کے ساتھ برابر غرناطہ میں آتے رہتے تھے اور ہمیشہ اس کی نقل و حرکت اور جنگی مہموں میں ساتھ رہتے تھے، ابن ہود نے متعدد شکستیں پائی تھیں، ابن طلحہ نے ان تمام واقعات کو نظم میں ادا کیا ہے۔

واقعہ قتل:

لوگوں کا بیان ہے کہ ابن طلحہ ابوالعباس سبتی کے احسانات پر قناعت نہ کر سکے، بلکہ اپنے طنز آمیز کلام سے سبتی کی طبیعت کو ہمیشہ مشتعل کرتے رہے، ایک روز کا واقعہ ہے کہ سبتی نے اپنی مجلس میں بیان کیا کہ مجھے ایک تیر یہاں لگا اور یہاں تک نفوذ کر گیا، ابن طلحہ نے ایک شخص سے جو پہلو میں بیٹھا تھا کہا: ''واللہ کاش وہ قوس قزح ہوتی'' ابوالعباس سبتی اس تشبیہ اور تلمیح کو سمجھ گیا، اور شخص مذکور سے بلا کر اور قسمیں دے کر پوچھا، اس نے ابن طلحہ کے مقولے کو دہرایا، سبتی نے اس بات کو دل میں پوشیدہ رکھا، یہاں تک کہ ابن طلحہ نے سبتی کی شان میں یہ ہجو لکھی:

''ایک صاحب توفیق کی خبر سن کر ہم اس کی طرف روانہ ہوئے اور اس کے حسب و علم نے بھی ہم سے سفارش کی ہم نے چاہا کہ اس کے ہاتھ کا بوسہ لیں اور اس کے فضل و کرم سے زندگی میں ہمیشہ سربلندی حاصل کریں مگر اس کے لسان حال نے ہمیں سنایا۔ کہ اُس کا ہاتھ شل ہو گیا ہے اس لیے یہ مقصد نا تمام رہے گا۔''

اس ہجو سے سبتی کو بہت رنج ہوا اس نے ان کے حالات کی نگرانی شروع کی ایک روز اس کے پاس ابن طلحہ کے چند اشعار پہنچے جو ماہ رمضان مبارک کے متعلق تھے اور اس وقت وہ ناگفتہ بہ حالت میں مبتلا تھا۔

''ایک فضولی نے ایمان کی حالت میں ہماری سختیوں کو دیکھ کر کہا تم ماہ رمضان کی تکلیف کے شاکی ہو تمھاری عقل اور دین نے اس تکلیف سے تمھیں کیوں نہ بچایا ہم نے کہا کہ ہمارے علاوہ دوسروں کی مصاحبت اختیار کرو ہم لوگ زنادقہ ہیں اور نیرنگیاں ہمارے مذہب میں داخل ہیں ہم ہر ایک دین کو قبول کر سکتے ہیں۔ مگر عوام کے دین کو کبھی نہیں قبول کر سکتے۔ ہم دہر کی صباح تک دعا کرتے رہیں گے اور ابلیس آمین کہتا جائے گا۔ اے ماہ رمضان تجھے ہماری طرف سے یہ پیام پہنچے کہ مستقبل میں جو کچھ تیرے اندر ہو گا اس سے ہمیں شدید انکار ہے۔''

راوی کہتا ہے کہ ابن طلحہ اسی حالت میں تھے کہ سبتی کا ایک آدمی انکے پاس پہنچا اور ان کا خاتمہ کر دیا، اس قتل سے عوام کو خوشی ہوئی یہ واقعہ ۶۸۱ھ کا ہے۔

یہ امر مخفی نہیں ہے کہ ابن طلحہ اندلس کے اکابر میں سے تھے، انھیں معانی کی ندرت پر بہت زیادہ عبور حاصل تھا، خدا ان پر رحمت نازل فرمائے۔

احمد بن عباس بن ابی زکریا

احمد بن عباس نام، ابوجعفر کنیت اور ابن زکریا عرف ہے، ابن تبانی کی تحریر سے ثابت ہے کہ وہ نسباً انصاری تھے۔

ابن زکریا بہت بڑے انشا پرداز، خوش نویس، فصیح، ادیب، کثیر المعلومات، فقیہ، جامع علوم، حاضر جواب، ذہین، خوبصورت، خوش خلق، اور آداب وملحوظات شاہی پر حاوی تھے انھیں ادب سے اتنی دلچسپی تھی کہ اسے اپنی تمام لذتوں پر ترجیح دیتے تھے، علمی دواوین کے فراہم کرنے میں ان کی غیر معمولی توجہ غلو کی حد تک پہنچ چکی تھی، اس علمی سرمائے سے وہ مخصوص لوگوں کو نفع پہنچاتے تھے دواوین کے ساتھ ان کا فرط بخل اس قدر تھا کہ وہ ان میں سے کچھ بجز ان حالات کے کہ کوئی غرض وابستہ ہو کبھی باہر نہیں جانے دیتے تھے، ان دواوین کے ذریعے سے تجار اور کاغذ کا کاروبار کرنے والے دولت مند ہو گئے تھے اور خود انھوں نے جو علمی ذخیرہ جمع کیا وہ ایسا تھا کہ کسی بادشاہ کے پاس بھی نہ ہوگا۔

لوگ بیان کرتے ہیں کہ ابن زکریا کے پاس سونا، سکے، کتابیں، اراضی، ظروف، اثاثہ، اسباب، اور چوپائے وغیرہ اس قدر تھے کہ ان کے کسی مماثل کے پاس بھی ان چیزوں کی اتنی فراوانی نہ تھی۔

ابن زکریا ابوتمام غالب بیانی اور ابوعبداللہ بن صاحب الاحباس سے روایت کرتے ہیں۔

ابن زکریا زہیر عامری کے وزیر تھے انھیں وزارت باپ کے ورثے میں ملی تھی، درحقیقت وزارت متکبرانہ اعزاز کا تکیہ ہے جس سے بکثرت نعمتیں حاصل ہیں مگر خدا اس کے شر سے محفوظ رکھے۔

ابن زکریا غرناطہ اس وقت آئے جب وہ نکبت کی حالت میں مبتلا تھے جس کا بیان آگے آتا ہے۔

نکبت:

لوگوں کا خیال ہے امیر زہیر اور امیر غرناطہ بادیس سے دوستانہ تعلقات کا انقطاع ان کی نکبت کا قوی سبب تھا۔ جس سے دونوں میں نفاق و شقاق اور فتنہ وفساد برپا ہو گیا تھا۔ یہ مشیت الٰہی تھی کہ بادیس نے اپنے حریف پر غلبہ پایا اور اس کی قوم کی تلواریں نیام سے نکل کر زہیر کے قتل کا باعث ہوئیں جس کے بعد اس کی قیام

گاہیں سنسان ہوگئیں۔ اسی روز ابن زکریا گرفتار ہوکر بادلیس کے روبرو پیش کیے گئے اس وقت اس کا سینہ جوش انتقام سے کھول رہا تھا، اس لیے اس نے انھیں فوراً قید خانے میں ڈال دیا، اوران کے خون سے اپنا ہاتھ رنگین کرنا چاہا، ابن زکریا کی گرفتاری سرعت کے ساتھ عمل میں آئی اوران کے تمام اصحاب ذلت وخواری کے ساتھ (قدموں کے نیچے) پامال کیے گئے۔

ابن حیان کہتے ہیں کہ ابن عباس (ابن زکریا) کوایک شعر سے بے حد انس تھا ان کی یہ عادت تھی کہ شطرنج بازی کے اوقات میں وہ یہ شعر یا اس کے ہم معنی دوسرے اشعار جو بروقت ذہن میں آتے پڑھا کرتے تھے،شعر یہ ہے:

''چشم حوادث میرے لیے خفتہ ہےاور زمانے پرحرام ہے کہ وہ مجھ پر ظلم ڈھائے۔''

عوام میں جب اس شعر کا چرچا ہوا تو وہ بہت برہم ہوئے مگر کسی شاعر نے ایک مصرع بدل کر شعر کو اس طرح درست کردیا:

''چشم حوادث میرے لیے خفتہ ہے مگر عنقریب قضاوقدر جو ہمیشہ بیدار رہتی ہے اسے جگادے گی۔''

اس واقعے کے تھوڑے دنوں بعد ابن زکریا گرفتار ہو گئے حوادث زمانے نے انھیں متنبہ کردیا اوران کے فخر وعزت کو خاک میں ملا کر انھیں ذلیل اور اسیر کیا، یہاں تک کہ بیس سیر وزن کی بیڑیاں ان کے پاؤں میں ڈالی گئیں، جب بیڑیوں کے کانٹے چبھتے تھے تو وہ تلملا اٹھتے تھے اور اس کا درد وکرب اس تکلیف سے زیادہ محسوس کرتے تھے جو جویریہ کو ان کے دور امارت میں بیڑیوں سے پہنچی تھی،جس وقت کہ ان کا غرور وتکبر حد سے تجاوز کر گیا تھا، انجام کار شہنشاہ قادر و جبار کی گرفت میں وہ بھی آ گئے اور اللہ ہر چیز پر غالب ہے۔

ابن مروان کا بیان ہے کہ بادلیس نے ابن زکریا اور دیگر اسیروں کے قتل میں تاخیر کی ابن زکریا نے اپنی طرف سے تیس ہزار طلائی دینار زرفدیہ دینا چاہااس رقم کا نام سن کر بادلیس کی طبیعت للچائی، اوراس نے اس مسئلے کو اپنے بھائی کے سامنے پیش کیا مگر اس نے انکار کردیا اوران کے قتل کا مشورہ دیا تاکہ ان کی رہائی سے پھر دوبارہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوجس کے فرو کرنے میں زرفدیہ کی المضاعف رقم نہ صرف کرنی پڑے۔

راوی کہتا ہے کہ ایک روز بادلیس نے اپنے بھائی کے ساتھ کہیں سے واپس آ رہا تھا اور قلعۂ غرناطہ میں اس مکان کے پاس سے گزرا جس میں ابن زکریا مقید تھے تو وہ اوراس کے بھائی بلکین دونوں قصر میں گئے اور ابن زکریا کو قید خانے سے طلب کیا،وہ بیڑیوں میں گھسٹے ہوئے آئے اور بادلیس کے روبرو کھڑے ہو گئے، بادلیس نے ان کی شان میں سخت ناشائستہ کلمات استعمال کیے جن سے وہ رونے لگے،تاہم انھوں نے ملاطفت کی باتیں کیں اور بادلیس سے التجا کی کہ وہ انھیں پہلی آسائش کی زندگی بسر کرنے کا موقع عطا کرے،اس نے جواب دیا کہ میں آج ہی تمھیں اس رنج والم سے نجات دیتا ہوں مگر تم اس سے شدید تر تکلیف میں مبتلا کیے جاؤ گے، پھراس نے اپنے بھائی سے بربری زبان میں کچھ باتیں کیں جن سے ابن زکریا کے سامنے موت کی تصویر

آ کر کھڑی ہوگئی، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور زر فدیہ کی رقم المضاعف دینے کو تیار ہوئے اس وقت بادیس آتش درنعل ہوا اور اس نے اپنی برچھی کو حرکت دے کر اس کی انی ابن زکریا کے سینہ میں جھونک دی، انھوں نے اللہ تعالیٰ سے فریاد کی، لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت ابن زکریا نے اپنے اہل وعیال کو یاد کیا، بہرحال بادیس کے حکم سے ان کا سر قلم کیا گیا اور ان کی لاش قصر سے باہر سپرد خاک کی گئی۔

بادیس کے خادم کا بیان ہے کہ میں نے ابن زکریا کے جسد کو قید خانے میں قتل کے دوسرے روز دیکھا تو بادیس نے مجھ سے کہا کہ ان کے سر اور جسد کو مٹی میں چھپا دے میں نے ان کی قبر کھودی اور سر اور جسد کو ابوالفتوح کے پہلو میں جو بادیس کا ایک دوسرا مقتول تھا دفن کر دیا کیونکہ مجھے بادیس نے حکم دیا تھا کہ میرے ایک دشمن کو دوسرے دشمن کے پہلو میں دفن کرنا تاکہ دونوں روز قصاص تک ساتھ رہیں۔

ابن زکریا کے قتل کا واقعہ ۲۱؍ذی الحجہ ۴۲۷ بوقت شام اسیری سے ۵۲ روز کے بعد پیش آیا، اس وقت ان کی عمر تیس سال تھی، خدا کی ان پر رحمت نازل ہو۔
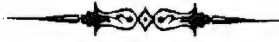
ابراہیم بن محمد بن مفرج بن ہمشک التامر

ابراہیم بن محمد نام اور ابن ہمشک عرف ہے، نسلاً رومی تھا۔

ابن ہمشک کے اجداد میں مفرج یاہمشک نامی ایک عیسائی تھا جو سرقسطہ میں ملوک ہود کے ایک بادشاہ کے ہاتھ پر اسلام لایا، اور اسی خاندان میں رہنے لگا، چونکہ اس نومسلم کا ایک کان کٹا ہوا تھا، اس لیے جب عیسائی میدان کارزار میں اسے دیکھتے تھے تو فوراً پہچان کر اپنی زبان میں ''ہامشک'' کے لفظ سے پکارتے تھے جس کے معنی ہیں''اے گوش بریدہ'' ان عیسائیوں کی زبان میں ''ہا'' کے وہی معنی ہیں جو عربی میں (تنبیہ کے لیے) لفظ ''اما'' کے ہیں، اور ''مشک'' گوش بریدہ کو کہتے ہیں۔

جب بنو ہود سرقسطہ سے نکل گئے تو ابن ہمشک کی زندگی پر گمنامی کا پردہ پڑ گیا، مگر یہ فطرتاً نچلا نہیں بیٹھ سکتا تھا اس لیے اس نے شکاری خدمات انجام دینے کے لیے بعض موحدین کی ملازمت اختیار کر لی اور شکاری مقامات میں ان کی رہنمائی کرنے لگا، کچھ دنوں کے بعد وہ حاکم وقت کے پاس قشتالے آیا اور عیسائیوں کے ساتھ رہنے لگا، مگر پھر اپنے قصور پر نادم ہوا اور سفارشیں بہم پہنچا کر لمتونی امراء کے پاس جو اندلس میں باقی رہ گئے تھے چلا گیا۔

جب یحییٰ بن غانیہ قرطبہ کا والی مقرر ہوا تو ابن ہمشک اس کا درباری بنا، ۵۳۹ھ میں جو فتنوں کا زمانہ تھا ابن احمر نے قرطبہ کو اپنی بغاوتوں کا آماجگاہ بنایا اور اپنا لقب امیر المومنین رکھا، اس وقت ابن غانیہ نے ابن ہمشک کو اس کی تجربہ کاری، اور عجمی زبان کی واقفیت کی بنا پر اپنا معتبر سفیر بنا کر ابن احمر کے پاس بھیجا تاکہ وہ دونوں میں مصالحت پیدا کر دے، اس سفارت میں ابن ہمشک کامیاب ہوا جس کی وجہ سے اس کی قدر و منزلت میں چار چاند لگ گئے، مگر جب اندلس میں باغیوں نے ہر طرف سے سر اٹھایا اور فتنوں نے بہت زور باندھا تو ابن ہمشک مشرق میں امیر ابن عیاض کے پاس چلا گیا، یہاں اس نے حصن شقوبش میں خاص امتیازات حاصل کیے اور مدینہ شقورہ پر غلبہ کے ساتھ اپنا اقتدار جمایا چونکہ اس شہر کو خاص اہمیت حاصل تھی، اس لیے ابن ہمشک طاقتور ہو گیا، اس لیے امیر شرق محمد بن مرونیش سے مساویانہ تعلقات پیدا کیے اور اپنی دختر کو اس کے عقد مناکحت میں دیا جس سے وہ امارت و ریاست دونوں سے ہمکنار ہو گیا اب وہ اپنے داماد ابن مرونیش کی طرف

سے سرکشوں کی سرکوبی میں مصروف ہوا اور اس میں بالکل تیغ بے نیام ہوگیا، نیز افواج کی کمان ہاتھ میں لے کر چند ممالک فتح کیے، مگر زیادہ دن نہ گزرنے پائے تھے کہ خسر اور داماد کے تعلقات خراب ہوگئے، اور باہم دونوں میں خوب خوب ہنگامے ہوئے، ان ہنگاموں میں ابن ہمشک نے اپنا ملک کھو دیا زوال حکومت کے بعد اس کا شمار اندلس کے پرشوکت مگر چیرہ دست اور سفاک باغیوں میں ہونے لگا۔

ابن صفوان کا ایک شعر ہے:

''وہ دیار جو زمانے کی شکایتیں کرتے ہیں انھیں نے ہمیں ابن ہمشک کی عزت کی باتیں سنائیں۔''

محمد بن ایوب بن غالب المدعو بہ ابن حمامتہ ابو اسحق رئیس کہتے ہیں کہ ابن ہمشک شجاعت، ریاست، جرأت، بہادری، اقدام، احتیاط، اصابت رائے، فنون جنگ سے واقف تھا، اور خودداری، سطوت، اور پیش قدمی میں نہایت شہرت رکھتا تھا، اور جو ارادے دل میں پیدا ہوتے تھے وہ کر گزرتا تھا۔

بعض مؤرخین جو ابن ہمشک سے واقف تھے کہتے ہیں کہ وہ اگرچہ شہسواروں کا سپہ سالار تھا مگر فتنہ و فساد کو دوست رکھتا تھا، کبھی وہ کسی دین دار کی صحبت میں نہیں بیٹھا، اور نہ اس کے ساتھیوں میں کوئی شخص متقی اور پارسا تھا، وہ منجانب اللہ مخلوقات پر مسلط کیا گیا تھا اور اللہ نے اس کی رسی ڈھیلی کر دی تھی اس لیے اس نے ہمسایہ ملکوں کو بے حد نقصان پہنچایا، اور بندگان خدا کو تباہ و برباد کیا۔

ابن ہمشک نہایت جابر، شقی القلب، تندخو، تندمزاج، سخت گیر اور جری تھا، لوگوں کے ساتھ بیہودہ حرکات کرتا تھا اس کی بیہودگی کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کو بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دیتا، بلند مقامات اور اونچے اونچے برجوں سے دھکیل دیتا، ان کی پشتوں سے پٹھوں اور نسوں کو اس طرح نکلواتا تھا جس طرح کمانوں سے رودے علیحدہ کیے جاتے ہیں اور درخت کی ان ڈالیوں کو جو ایک دوسرے سے پیوستہ نہ ہوسکتی تھیں باہم ملاتا اور ان کے بیچ میں آدمیوں کو باندھ دیتا تھا اس طرح ہر ایک شاخ انسانی اعضاء کا ایک ایک حصہ لے کر اپنی اپنی جگہ پہنچ جاتی تھی۔

ایک روز کسی صالح نے ابن ہمشک کو خواب میں دیکھا اس سے پوچھا کہ خدا نے تیرے ساتھ کیا سلوک کیا اس نے یہ اشعار پڑھے:

''جسے دنیا میں اس ذات کی مخلوق کو بگاڑنا پسند آتا ہے جس نے مخلوق کو رحموں میں حسب مشیت صورتیں بخشی ہیں تو اسے ایک دن اس کی گرفت میں اس طرح صبر کرنا ہوگا جس طرح میں پا نہ زنجیر ہیزم جھاؤ کے انگاروں پر صبر کر کے چلتا ہوں۔''

کہتے ہیں کہ ایک روز ابن ہمشک شکار کے لیے گیا سو چیدہ شہسوار ہمرکاب تھے، مغنی اور ارباب نشاط کا ایک گروہ بھی ساتھ تھا، دفعتہً سب کے سب دشمنوں کے سواروں کو دیکھ کر دہشت زدہ ہوگئے، ان کی تعداد دو چند تھی وہ حملہ کے لیے بڑھتے چلے آرہے تھے، لوگوں نے کہا کہ دشمنوں کے دو سو شہسوار ہیں، ابن ہمشک نے کہا

اگر تم سب سو دشمنوں کا مقابلہ کرو اور میں تنہا ایک سو کا مقابلہ کروں تو ہماری تعداد بھی ان کے برابر ہو جائے گی، اس موقع پر ابن ہمشک نے اپنے آپ کو سو سواروں کے برابر شمار کیا، پھر اس نے شراب کا ایک پیالہ طلب کیا اور مغنی سے کہا کہ کچھ اشعار پڑھو مغنی نے وہی اشعار پڑھے جو ابن ہمشک کو زیادہ مرغوب تھے۔

''وہ مجلس میں شرگیں ہو کر ملتا ہے مگر اس کے نیزوں کے سرے کھلے ہوئے ہیں ہاں یوں ہی بلندیاں حاصل ہوتی ہیں متانت اور مزاح کے طریقے جدا جدا ہیں۔''

جب مغنی اشعار پڑھ چکا تو ابن ہمشک دشمنوں کی طرف بڑھا اور ساتھیوں کو لے کر دفعتہً ان پر حملہ آور ہوا غنیم نے شکست پائی اور اس کے اکثر آدمی کام آئے ابن ہمشک مظفر و منصور مال غنیمت لے کر اپنے شہر واپس آیا، کچھ دنوں کے بعد پھر وہ اسی مقام پر شکار کے لیے گیا اور اپنے ایک باز کو چکور پر چھوڑ دیا، باز نے چکور کا شکار کیا، ابن ہمشک نے اسے ذبح کرنا چاہا مگر چھری نہیں ملی، وہ اسے تلاش کر رہا تھا کہ اتفاقاً اس کی نظر نیزہ کے ایک پھل پر جا پڑی جو پچھلی جنگ کے غنائم میں سے تھا اس نے نیزہ کا پھل مٹی سے نکالا اور اس سے چکور کو ذبح کیا، پھر اسی مقام پر فروکش ہوا اور شراب طلب کی اور مغنی سے کہا کہ کچھ گائے اس نے ابوالطیب کے یہ اشعار سنائے:

''میں نے عذیب اور ابرق کے درمیان اپنے نیزوں کی زد اور گھوڑوں کی دوڑ کو یاد کیا اور ان لوگوں کی صحبت کو یاد کیا جو اپنے شکار کو سروں پر ٹوٹی ہوئی تلواروں سے ذبح کرتے تھے۔''

بعض لوگ یہ قصے بنی مردنیش کے کسی امیر کے متعلق روایت کرتے ہیں، بہر حال یہ واقعات دلچسپ ہیں۔

کہتے ہیں کہ جمادی الاول ۵۵۶ھ میں ابن ہمشک نے اپنی جماعت کو لے کر غرناطہ پر چڑھائی کی اور بعض جماعتوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کی اس وقت موحدین میں باہمی اختلافات رونما تھے، اور غرناطہ کے والی سید ابوسعید افریقہ گئے ہوئے تھے، ابن ہمشک اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک روز رات کو شہر میں داخل ہو گیا، موحدین قلعہ بند ہو گئے اور جنگ کا کوئی دقیقہ پناہ گزینوں کے لیے اٹھا نہ رکھا، مجانیق نصب کیے اور جس کسی پر قابو چلا اسے مجانیق پر رکھ کر اچھالا، اور لوگوں کو انواع و اقسام کے مصائب سے قتل کیا، جب ان واقعات کی اطلاع سید ابوسعید کو ملی وہ فی الفور دریا عبور کر کے غرناطہ کی طرف روانہ ہوئے، سید ابو محمد اور ابو حفص بھی اندلس اور موحدین کی تمام فوجوں کو لے کر سید ابوسعید کے پاس آ گئے ان تمام فوجوں نے غرناطہ سے باہر پڑاؤ ڈالا، ابن ہمشک شہر سے نکل کر کھلے میدان میں آیا اور دونوں فریق غرناطہ سے باہر رقاد کی چراگاہ میں صف آرا ہوئے۔ اور باہم جنگ شروع ہوئی اس لڑائی میں موحدین کی فوج کو شکست ہوئی، بھاگنے والوں کے لیے کھیتوں کے حدود اور پانی کے نالے چراگاہ میں سدراہ ہوئے، جس کی وجہ سے غنیم نے بے شمار موحدین کو قتل کیا اور اس جنگ میں سید ابو محمد مارے گئے، اور سید ابوسعید مالقہ چلے گئے، اور ابن ہمشک شہر غرناطہ میں واپس آیا اور اسیروں کے کان ناک کٹوا کر مثلہ بنایا اس وقت اس منظر کو تمام محصورین اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

جب یہ خبریں خلیفہ کو مراکش میں پہنچیں جو ایک مقام سلا میں موجود تھا اس نے اسی وقت یہاں سے کوچ کا حکم دیا اور ایک لشکر تیار کر کے اپنے فرزند سید ابو یعقوب اور شیخ ابو یوسف بن سلیمان کو جو زعیم وقت اور مدیر تھے، ساتھ لے کر سمندر عبور کیا، اور مالقہ جا کر سید ابو سعید سے ملا، یہاں ہر طرف سے مختلف جماعتیں مجاہدین اور رضا کاروں کے گروہ در گروہ خلیفہ کے پاس پے در پے جمع ہوئے، یہ تمام لشکر دلق کی طرف جو غرناطہ کا ایک قریہ تھا بڑھتا ہوا چلا گیا، اس معرکہ میں ابن ہمشک کو پے در پے شکستیں ہوئیں، اور اس کے ساتھ کے عیسائی اور دوسرے لشکروں کو بھی کافی ہزیمت ہوئی۔

کہتے ہیں کہ ابن ہمشک اور (ابو محمد ابن سعد) ابن مردینش کے تعلقات کی خرابی کا باعث خود ابن ہمشک کی دختر تھی جو امیر ابو محمد بن سعد بن مردینش کو بیاہی گئی تھی۔

جب ابن مردینش نے اپنی بیوی کو طلاق دی تو وہ اپنے فرزند کو ابن مردینش کے حوالہ کر کے جو اسی کے صلب سے تھا اپنے باپ کے پاس چلی گئی اور اسی کے سایۂ عافیت میں رہنے لگی۔

ایک روز ابن ہمشک کی دختر سے کسی نے پوچھا کہ وہ اپنے فرزند کو چھوڑ کر کیوں رہنا گوارا کرتی اور کس طرح صبر و شکیب کی زندگی بسر کرتی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ''بچہ سگ بد بداست'' مجھے ایسے بچہ کی ضرورت نہیں ہے، اس کی یہ بات خواتین اندلس میں ضرب المثل کے طور پر پھیل گئی ہے جس کے باعث ابن مردینش اور ابن ہمشک میں فتنہ و فساد کا بازار اور گرم ہو گیا، سختیاں بڑھ گئیں اور دونوں فریق کے آدمی اس قدر ہلاک ہوئے کہ جن کا شمار اللہ ہی جانتا ہے کہا جاتا ہے کہ ابن ہمشک کے ملک کی تباہی کا اہم سبب یہ واقعہ بھی تھا۔

جب ابن سعد (ابن مردینش) نے اپنی توجہ ابن ہمشک کے ملک کی طرف مبذول کی اور اس کے اکثر حصوں پر قابض ہو گیا، تو ابن ہمشک نے موحدین سے امان مانگی اور پناہ لے کر ان کی خدمت کرنے لگا، پھر وہ سمندر عبور کر کے ۵۶۵ھ میں خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا خلیفہ اس کے ساتھ نہایت اعزاز و تکریم سے پیش آیا، اور ۵۷۱ھ کے اوائل تک اپنے علاقوں میں رہنے کی اسے اجازت دی مگر آخر میں اس سے کہا کہ وہ اپنے اہل و عیال کو لے کر عدوۃ واپس جائے اور اس حکم کو بجالایا اور مکناسہ میں سکونت پذیر ہوا۔ خلیفہ نے اس کے لیے بیش قیمت جاگیریں عطا کیں اور ہمیشہ اس پر عنایت کی نظر رکھی، یہاں تک ابن ہمشک نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

کہتے ہیں کہ ابن ہمشک مکناسہ میں زیادہ دنوں تک نہیں رہنے پایا تھا کہ خدا نے اسے فالج میں مبتلا کیا، جس کی عجیب و غریب اور نہایت بدتر کیفیت تھی، انجام کار وہ اس مرض میں ہلاک ہوا، مرض کی کیفیت یہ تھی کہ جب وہ گرم حمام میں جاتا تھا تو اس کی گرمی سے چیخ کر باہر نکل آتا تھا اور جب باہر آتا تھا تو سردی اسے بیتاب کرتی تھی اسی حالت میں اس نے اپنی جان دی۔

ابراہیم بن امیر المسلمین ابوالحسن بن عبدالحق

ابراہیم نام اور ابوسالم کنیت ہے۔

جس طرح آفتاب اپنی صورت اور منزل میں نمایاں ہے اسی طرح ابوسالم کا خاندان شہرت اور عظمت میں نمایاں تھا خود وہ شاہ اعظم بلکہ فلک نہم تھا۔

مغرب اقصیٰ میں بنومزین امیروں کا ایک خاندان آباد تھا، جس سے ابوسالم ہے، اس خاندان میں کئی اسلامی بادشاہ گزرے جو مذہب کے حامی، بذل ونوال کے بادل، جنگل کے شیر، مظلوموں کے فریادرس اور کافروں کے لیے تیر تھے۔

ابوسالم کا باپ سلطان ابوالحسن شاہان اکابر میں سے تھا اس کی شہرت دور دور تک تھی، وہ بلند ہمت اور بلند ارادہ تھا، سنت کا اتباع کرنا، شاہی مراسم کا برقرار رکھنا، مصیبت میں صبر کرنا اور ہمت میں استوار رہنا اس کا شیوہ تھا۔

ابوسالم کا بھائی ابوعنان فارس بھی جلیل القدر بادشاہ اور امیر المسلمین تھا، وہ حسب کا خلاصہ، علم کا پرچم، معدن کا لولو، قصیدے کا مطلع، اور سعادت کا بدر تھا، اس کا شمار خرق الٰہی میں سے تھا، اس کی ستائش سے زبان قاصر اور عبارت کا دامن تنگ ہے، خدا اس خاندان کا سایہ دنیائے اسلام پر قائم رکھے، اس کے ہالے کو دو جہاں کے ماہتاب سے زینت بخشے، اور اس میں سے جس کا انتخاب فرمائے اس کا بول بالا رہے۔

ابوسالم ایک خوش ہیئت نوجوان تھا، اس کے چہرے پر شگفتگی تھی، حیا وقار، خاموشی اور کم سخنی کے اوصاف سے متصف تھا۔ گندم گوں، پرحشمت، خلیق اور صاحب فضل تھا۔

ابوسالم کو اس کے باپ نے القاب اور امارت کا رتبہ عطا کر کے سجلاسہ کا حاکم بنایا تھا یہ مقام بنومرین کا ایک علاقہ تھا، اس نے تھوڑے ہی دنوں میں اپنے آپ کو موجودہ رتبے سے بڑھ کر ثابت کیا۔

جب ابوسالم کے باپ کا انتقال ہوگیا تو ایک ایسے شخص کی ضرورت لاحق ہوئی جو ملک کی شیرازہ بندی کر سکے، اور اپنی قوتوں کو ایک مرکز پر فراہم کر کے خونریزی کا سدباب کر دے، چنانچہ ابوسالم کا بھائی، سلطان

ابوعنان فارس جو اپنے باپ کا وارث اور ذاتی و اکتسابی حیثیت سے حکومت کا مستحق تھا تاج وتخت کا وارث قرار پایا، اس نے اپنے آپ کو نفسانی خواہشوں سے محفوظ رکھ کر نیکی، شفقت، اور تقویٰ پر عمل کیا، مگر اس نے ابوسالم اور اس کے بھائی ابوالفضل محمد کو اندلس کی طرف جلاوطن کر دیا، اسی زمانے میں سلطان اندلس کی طرف سے سفیر بنا کر یہاں بھیجا گیا تھا۔

ابوسالم بلاد اندلس کے ایک مقام جریلہ میں اترا اور وہاں سے غرناطہ کی طرف روانہ ہوا۔

۲۰ر جمادی الاولیٰ ۷۵۲ھ میں ابوسالم اور ابوالفضل غرناطہ میں وارد ہوئے سلطان غرناطہ نے اعزاز و اکرام کے ساتھ ان کا استقبال کیا، یہ دونوں سواری سے اتر کر پا پیادہ خدمت سلطانی میں حاضر ہوئے، سلطان ان سے ہم کلام ہوا، ان کی مہمان نوازی کے حقوق ادا کیے، بڑی خاطر مدارات سے رکھا، خاص مکانوں میں اتارا، ان کی دلجوئی کی، اور ہر وقت اپنی توجہ ان کے حال پر مبذول رکھی۔ مگر کچھ دنوں کے بعد ابوالفضل محمد اپنی نفسانی خواہش اور طمع کی وجہ سے ہلاک ہو گیا، اور ابوسالم ابراہیم نظر بند کیا گیا کیونکہ اس نے اپنے بھائی امیرالمسلمین فارس کو خوش کرنے کے لیے اواخر ذی الحجہ ۷۵۹ھ میں کوشش کی تھی مگر جب ابوعنان فارس کے وزیر باتدبیر نے اس کے فرزند ابوبکر سعید کو تخت نشین کیا تو ابوسالم اپنی عافیت گاہ کی طرف جانے کے لیے آمادہ ہوا، اسی اثناء میں وطن کے لوگوں نے اسے مدعو کیا اور طمع نے بھی اسے بے چین کر دیا، جس کی اطلاع اندلس کے سلطان کو ہو گئی تو وہ اسی سال جمادی الاولیٰ کی آخری تاریخوں میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر بعض دریائی راستوں سے غرناطہ چھوڑ کر نکل گیا، اور دشمن کی سرحد میں جو غرناطہ سے ملی ہوئی تھی پہنچ کر قشتالہ کے بادشاہ سے ملا، جو ان دنوں اشبیلیہ میں مقیم تھا، اور دطلونہ سے اپنے حریف کی طرف ایک مہم روانہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

ابوسالم اس بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی طلبی کے خطوط اس کے سامنے پیش کیے اور اپنے مقصد کے حاصل ہونے سے اس بادشاہ کو جو فوائد ہو سکتے تھے ظاہر کیے، چنانچہ اس نے ابوسالم کی باتوں کو قبول کر کے ایک جنگی بیڑا اس کے ساتھ کر دیا، اور اس میں ان لوگوں کو شریک کیا جو ابوسالم کی تحریک میں حصہ لے سکتے تھے۔ جب دریائے مغرب کے تھپیڑوں سے بیڑہ ازمور کے ساحل پر پہنچ گیا تو اس نے اہل مراکش کے ایفائے وعدہ کا انتظار کیا مگر اسے جلد معلوم ہو گیا کہ تمام لوگوں نے منصور بن سلیمان کے ہاتھ پر اس کے دام میں آ کر بیعت کر لی ہے، اور وہ بلد جدید پر جو مملکت فاس کا دارالسلطنت تھا، قبضہ کر کے اپنی حکومت مستحکم کر چکا ہے، اس خبر سے ابوسالم کی کوششوں پر پانی پھر گیا، اور اس کا سارا منصوبہ غلط ہو گیا، ناچار اس نے بیڑے کو یہاں سے واپس کیا، مگر جب اصیلا کی سرحد میں بلاد غمارہ کے قریب پہنچا تو وہاں کچھ لوگ نظر آئے جو ابوسالم کے پاس حاضر ہوئے اور وفاداری کا عہد کر کے اس کی ڈولی کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر ایک کوہستانی میدان میں لے گئے اور اس کے ہر چہار طرف حلقہ باندھ کر کھڑے ہوئے اور اس کی حفاظت کے لیے ایک دوسرے سے منافست کرنے لگے۔

ابو سالم نے اس نئی جماعت کو لے کر اصیلا پر حملہ کیا پھر طنجہ پر حملہ آور ہوا اور یہ دونوں مقام اس کے قبضہ میں آ گئے، سبتہ اور جبل الفتح کا بھی یہی حال ہوا، اس کے بعد خاص خاص لوگ اس کے پاس آئے اور محصور وزیر نے بھی اس سے نامہ و پیام شروع کیا۔

چونکہ منصور کے طرف دار سخت رسوا ہوئے تھے اس لیے وہ اس سے روگرداں ہو کر علانیہ ابو سالم کی جماعت میں داخل ہو گئے، اس نے ان کی خطائیں معاف کر کے ان سے بیعت لی، پھر وہ اسی سال بروز پنج شنبہ ۱۵ر شعبان کو محصور شہر میں داخل ہوا اور وزیر سے جواب تک محصور تھا، اپنی تحریک دعوت میں حصہ لینے کے لیے گفت وشنید کی۔

الحاصل اللہ تعالیٰ نے ابو سالم کو اس کا ملک واپس کر دیا، اس کی حکومت کے حدود مقرر ہو گئے، اور حق بہ حقدار رسید کی مثل صادق آئی اس کے بعد اس نے اپنے باپ کا عہد تازہ کر کے تمام لوگوں کو اپنی اطاعت کی طرف مائل کیا۔

کچھ دنوں کے بعد ابو سالم کے عجیب وغریب اور متضاد حالات نمایاں ہوئے۔ مثلاً اس نے اپنے ایک فرزند کو اس کام پر مامور کیا کہ اس کے باپ کی جس قدر نسل موجود ہے اس کا وہ قلع قمع کر دے، چنانچہ اس نے نوجوان اور خوبصورت لڑکوں کو جو بالغ یا بلوغ کے قریب تھے اور جن کی تعداد تقریباً بیس تھی جمع کیا اور بغیر کسی شک وشبہ کے جس سے خون مباح ہوتا ہے انھیں قتل کر دیا، اس خونریزی کے بعد ابو سالم نے خیال کیا کہ فضا بالکل صاف ہو گئی ہے، اس لیے وہ عیش وعشرت کرنے لگا، حاجیوں اور دربانوں کی باتیں سننے لگا گویا اس نے اپنی حکومت میں اکثر لوگوں کو شریک کر لیا، جس کی وجہ سے رعایا کے مال لٹنے لگے، ملک کی مال گزاری کم ہوتی گئی، مظالم بڑھتے گئے، لوگ عطیات سے محروم کیے جانے لگے، طرح طرح کی جھوٹی افواہیں مشہور ہونے لگیں، راستوں پر ڈاکے پڑنے لگے، انجام کار اس کا جو حشر ہوا وہ عام طور سے مشہور ہے۔

اوائل رجب ۷۶۱ھ میں ابو سالم نے تلمسان پر چڑھائی کرنے کے لیے اطراف ملک سے لوگوں کو مدعو کیا اور ایک لشکر گراں لے کر آگے بڑھا، اس کی اولوالعزمی دیکھ کر تلمسان کا سلطان مقابلہ کی تاب نہ لا سکا اور راہ گریز اختیار کی، ابو سالم نے یہ شہر فتح کر لیا مگر اس کے بعد اپنا رعب قائم نہ رکھ سکا اس لیے یہاں ضلالت اور گمراہی کا بازار گرم ہو گیا، اسی زمانے میں چند لوگ ابو سالم کی مملکت میں داخل ہونے کے آرزومند تھے اور بہ ہزار دقت سلا میں جو ساحلی مقام تھا پہنچے، اور جس روز تلمسان فتح ہوا اس روز میں ابو سالم کے باپ کی تربت پر مقیم ہوا، اور یہاں میرے آنے کی غرض یہ تھی کہ کسی توسل سے ابو سالم کی خدمت میں فتح کی تہنیت پیش کر کے اپنی اندلس والی املاک واگذاشت کراؤں، چنانچہ میں نے ابو سالم کو اس طرح مخاطب کیا:

''اے آقا! تو سلطنتوں کا فاتح، زمانے کی منفعت عطیات الٰہی کی نشانی اور ان لوگوں کا امام ہے جو دست وچشم کے مالک ہیں۔''

۲۰ ذیقعدہ ۶۲ ھ کو بلد جدید میں جو فاس کا پایہ تخت اور دارالحکومت تھا عمر بن عبداللہ بن علی نامی ایک خائن غدار، نانجار، بدطینت، اور ملعون شخص نے ابوسالم پر حملہ کیا، وہ اس روز ''قصر سلطانی'' میں جو بلد قدیم میں واقع تھا آسمانی نحوست کے خیال سے منتقل ہو گیا تھا اس خائن شخص نے نہایت عمدہ موقع پا کر لوگوں کو ابوسالم کے ایک مجنون بھائی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی دعوت دی۔ ابوسالم متحیر ہوا کہ کیا کرے اور کس طرح کھوئی ہوئی دولت دوبارہ حاصل ہو۔ اس نے شہر کے گرد چکر لگا کر ایک کامیاب حیلے کی کوئی صورت پیدا کرنی چاہی مگر اس میں وہ ناکام رہا یہاں تک کہ اس کے ساتھیوں پر تیروں کا مینہ برسانے لگا، تو فوج اور دوسرے لوگوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا، قسمت روگرداں ہو گئی، اور زمانے میں رسوائی ہوئی، جب رات نے اپنی تاریک چادر پھیلا دی تو وہ تن تنہا جان بچا کر قصر میں واپس آیا، تمام وزراء بھی اس کے پاس آئے مگر وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ تھے اور ان کی رایوں میں اصابت بھی نہیں رہی تھی، اگر وہ چاہتے تو ابوسالم کو لے کر کسی دشوار گزار پہاڑ کی طرف چلے جاتے اس سے ان کی عذر خواہی اور وفاداری کے گیت گائے جاتے، مگر وہ سب الٹے پاؤں واپس ہو کر غداروں کے ساتھ مل گئے، اور ان کے جسم سے حیا اور مردانگی کا لباس اتر گیا، خدا کے حکم سے ان کا انجام بھی بُرا ہوا۔

ابوسالم مجبور ہو کر بادیہ کی طرف چلا دوسرے روز دن کی روشنی نے اس کا راز فاش کر دیا، سراغ رسانوں نے اس کو گرفتار کر لیا، اور پھر کشاں کشاں قتل گاہ میں لائے اور بیرون شہر اس کا سر تن سے جدا کر دیا، یہ واقعہ غدر کے دوسرے روز پیش آیا۔

اللہ تعالیٰ ابوسالم کو شہادت کا درجہ عطا فرمائے اور اس کو شہادت سے نفع بخشے، وہ حیا، اخلاق، امن پسندی، اور عافیت خواہی میں اپنے گھرانے اور قوم کی آخری یادگار تھا۔

شہر کے باہر جس قلعے میں ابوسالم کی لاش پیوند خاک کی گئی وہاں حاضر ہو کر میں نے اس کی تربت پر ایک قصیدہ پڑھا، جس میں اس کے بعض حقوق ظاہر کیے:

بنی الدنیا بنی لمع السراب ۔۔۔ لدوا للموت وبنوا للبخراب

''اے دنیا اور چمکدار سراب کی اولاد، تم موت کے لیے جنو اور ویرانی کے لیے عمارتیں بناؤ

ابراہیم بن یحییٰ بن عبدالواحد ہنتانی

نام اور کنیت:

ابراہیم نام، اور ابو اسحٰق کنیت ہے، باپ کا نام ابوزکریا یحییٰ ہے۔ ابو اسحٰق تونس اور بلاد افریقیہ کا بادشاہ، اور اس کا باپ افریقیہ کا امیر تھا، ابو اسحٰق بلاد افریقیہ میں شاہان با اقتدار کی اصل اور موحدین کی ایک شاخ تھا، اور ابو محمد عبدالمومن بن علی جو ابوالملوک تھا اس کی قومیت کو بلاد افریقیہ میں لانے کا سبب بھی ابو اسحٰق ہی ہوا، الغرض ابو اسحاق کی نسل مقرب افریقیہ، اندلس میں پھیل گئی تھی جو عام طور سے مشہور ہے۔

جن ملوک کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے ان کا مورث اعلیٰ عمر بن یحییٰ نامی مہدی کے ان دس اصحاب میں سے تھا جنھوں نے مہدی کے ہاتھ پر بیعت کر کے غربت میں اس کا حق رفاقت ادا کیا تھا، عمر بن یحییٰ اور اس کا فرزند ہمیشہ صداقت اور علو سے مرتبہ میں مشہور رہے۔

جب ناصر ابو عبداللہ بن منصور بن ابو یوسف بن یعقوب بن عبدالمومن بن علی سریر آرا ہوا تو وہ افریقیہ میں آ کر مہدیہ میں اترا، اس وقت ابن غانیہ اوباش عربوں کو ساتھ لے کر مقابلہ کو آیا، ناصر نے ابو اسحٰق کے دادا شیخ ابو محمد عبدالواحد بن ابو حفص کی سرکردگی میں فوج روانہ کی، شیخ پوری تیاری اور جنگی ساز و سامان کے ساتھ مہدیہ سے روانہ ہوا۔ دونوں جماعتیں باہم صف آرا ہوئیں، ابن غانیہ سخت مصائب میں گھر گیا اس موقع پر شیخ نے اپنی فوج کو پوری مدد دی۔

”مہدیہ کی فتح کے بعد ناصر تونس واپس آیا اور ملک میں دورے کر کے ہر جگہ کے فتنہ و فساد کو فرو کر کے مغرب چلا گیا۔“

جب شیخ ابو محمد بن ابو حفص کے ذاتی اوصاف مثلاً تیزی، چابکدستی اور مالی احتیاط کے جوہر ناصر پر کھلے تو اس نے شیخ کو بلاد افریقیہ کا افسر مقرر کر کے ۶۰۳ھ میں تمام امور کی نگرانی اس کے سپرد کر دی۔

۶۰۶ھ میں شیخ کا ابن غانیہ سے دوبارہ مقابلہ ہوا، اس دفعہ بھی غنیم کو شکست ہوئی اور اس کے تمام مورچے شیخ کے قبضے میں آ گئے، اس طرح شیخ کا عروج و اقبال مسلسل ترقی کرتا گیا، ۶۲۹ھ میں جب وہ اپنے

خاندان کے لیے جو بنو عبدالمومن ہی کی ایک شاخ تھا دعوت کی تحریک کی اشاعت کر رہا تھا کہ اس کی زندگی کا لبریز جام چھلک گیا۔

شیخ کی وفات کے بعد اس کا بڑا فرزند عبداللہ سلطان مستنصر باللہ بن ناصر کے عہد میں باپ کا جانشین ہوا، یہ بھی بنو عبدالمومن کی نسل سے تھا۔ اور چونکہ حکومت کے اضمحلال کی حالت میں شیخ ابو محمد اور مستنصر کے چچا سید ابوالعلاء کبیر میں یہ معاملہ طے پایا تھا کہ تونس پر سید ابوالعلاء کے نام سے حکومت ہوگی مگر تمام معاملات کی نگرانی خود شیخ کے ہاتھ میں رہے گی اس بنا پر عبداللہ بھی اسی مسلک پر عامل رہا۔

عبداللہ اپنے باپ کے مسلک پر قائم تھا کہ اسی اثناء میں زمام حکومت مامون ابوالعلاء ادریس کے ہاتھ میں چلی گئی، اس نے اپنے بھائی اور چچا کا انتقام لینے کے لیے مراکش کے ارکان دولت کے سر قلم کرا دیے، اس واقع کے کچھ دنوں کے بعد اہل اندلس نے اشبیلیہ میں سید ابوالربیع پر حملہ کر دیا، اور شہر کے لوگوں کا ناطقہ بند کر کے ان میں پھوٹ ڈال دی، اور ان کی دعوت کی تحریک کو پراگندہ کر دیا، جس سے ان میں اختلاف اور زیادہ نمایاں ہو گیا، اور ان کے تمام معاملات کی گتھیاں الجھ گئیں، اسی زمانے میں امیر ابوزکریا اندلس سے اپنے بھائی عبداللہ کے پاس افریقیہ پہنچا، اور اس سے مطلق العنان حکومت قائم کرنے کا خواہش مند ہوا، مگر اس نے اتنی سختی سے انکار کیا کہ ابوزکریا کو جان کے لالے پڑ گئے، وہ بھاگ کر قابس گیا، اور یہاں کے شیوخ مکی اور سلف کو جو بنو مکی کے خاندان سے تھے عوام کے روبرو جمع کیا اور ان کی مدح سرائی اور تمہید کے بعد موحدین کی مخفی تحریک کے عنوان پر ایک تقریر کی، جس کا یہ اثر ہوا کہ سارے مجمع نے وعدہ کیا کہ جب عبداللہ تونس سے قیروان ہوتا ہوا یہاں آئے گا اس وقت ہم تمھارے مددگار ہوں گے، چنانچہ جب عبداللہ قابس گیا تو یہاں کے لوگوں نے اس سے تمام مال و زر کے حوالے کر دینے کا مطالبہ کیا، اس نے مال دینے سے تامل کیا تو لوگوں نے اس کے بھائی امیر ابوزکریا کو طلب کیا تاہم عبداللہ کو کسی قسم کی دہشت نہیں ہوئی کیونکہ وہ ایک امامن میں جا چھپا تھا لشکریوں نے حملہ کر کے اسے گرفتار کیا اور اسے مراکش بھیج دیا، اور اس کی جگہ امیر ابوزکریا قائم مقام ہو گیا اس نے تمام لشکر اور خاص لوگوں سے بیعت لی اور استبدادی حکومت قائم کی پھر وہ تونس گیا اور وہاں کے عام لوگوں سے بیعت لے کر قلعے کے سردار کو قتل کر دیا، اور جب یہ خبریں بجایہ کے لوگوں کو پہنچیں تو انھوں نے بھی اپنے والی سید ابوعمران کو گرفتار کر کے قتل کر دیا، جس کے بعد سے امیر ابوزکریا کی حکومت کی بنیاد مضبوط ہو گئی، اور سلطنت کے نظم و نسق درست ہو گئے۔

امیر ابوزکریا نہایت دانشمند اور سیاسی آدمی تھا، ادب اور فن طب میں بھی دخل رکھتا تھا، اس کی عقل تیز اور رائے صائب تھی، خوش تدبیر اور بہترین سیاست داں تھا، اس کی فطرت اسی کے لیے موزوں تھی، اس نے مالگزاریاں وصول کیں، ہر قسم کے ساز و سامان فراہم کیے، آدمیوں کو آراستہ کیا فوج بڑھائی، عربوں کو ہزیمت دی، اور بہت سے ممالک فتح کیے۔

امیر ابوزکریا نے مراکش کے خلیفہ سے جس کا لقب سعید تھا اتنے مراسم پیدا کیے کہ دونوں نے ایک دوسرے سے ملنے کا ارادہ کیا۔ مگر کارکنان قضا وقدر کو یہ منظور نہ تھا، مشہور ہے کہ سعید تلمسان تک پہنچا تھا کہ دفعۃً اس کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔

سعید کی موت کی خبر کے ساتھ ساتھ ابوزکریا کو اپنے فرزند ابویحییٰ ولی عہد کے مرنے کی خبر بجایہ سے پہنچی، جس سے اس کو بے حد رنج اور قلق ہوا، یہاں تک کہ اس پر جزع وفزع کی حالت طاری ہوئی، اس نے بیٹے کا ایک مرثیہ لکھا جس کے چند مشہور شعر یہ ہیں:

''خبردار اپنے عزیز کی موت پر رونے والے میں بھی بیٹے کی موت سے ستم زدہ ہوں۔ بے شک میرے پاس مال اور اہل وعیال سب کچھ تھا اب میں نے سب کھو کر کچھ باقی نہیں رکھا، میں اپنے وارث کی جدائی پر حسرت سے اس طرح روؤں گا جیسے ایک زخمی روتا ہے جو نہ تڑپتا اور نہ تسلی پاتا ہے۔ جدائی کے روز پر افسوس کرتا ہوں۔ مگر امید رکھتا ہوں کہ کشائش کے روز تمام جماعتیں باہم ملیں گی میں قضا وقدر کے فیصلے پر راضی ہوں اور جانتا ہوں کہ میرا رب حاکم اور عادل ہے۔''

ابن عذار مراکشی نے ''البیان المعرب'' میں ان ابیات کی نسبت امیر ابوزکریا کی طرف کی ہے۔

سعید کی موت ۳۰ رصفر روز سہ شنبہ ۶۴۶ھ میں واقع ہوئی، اس کے چار روز کے بعد ابوزکریا اثنائے راہ میں علیل ہوا اور بلد عناب میں جا کر وفات پائی۔

ابوزکریا کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے امیر عبداللہ کے ہاتھ پر تونس میں لوگوں نے بیعت کی، جب یہ سریر آرا ہوا تو ملک منظم، لشکر آراستہ، سلطنت پرزور، اور مال وزر وافر تھا، جس سے وہ انتہائی غرور ونخوت، شیخی اور گھمنڈ میں مبتلا ہو گیا، اور اس نے اپنا خطاب امیر المومنین اور لقب مستنصر باللہ رکھا، ان باتوں سے اعیان دولت کو دشمنی پیدا ہوئی، اور اس کے چچا ابوعبداللہ بن عبدالواحد معروف بہ لحیانی نے امور سلطنت میں مداخلت شروع کر دی اور عام لوگوں سے چھپا کر اپنے گھر پر بیعت لینے لگا، اس کی بھنک مستنصر باللہ کے کانوں میں پڑی اس نے ابوالحسن، ابوجہل ابوالحملات بن مردنیش اور ظافر الکبیر کے سے دانش منداور خاص لوگوں کی رائیوں پر عمل کر کے بغاوت کے رونما ہونے سے پہلے اس کے فوری علاج کی طرف توجہ کی، چنانچہ یہ لوگ اس کے چچا کے گھر گئے اور جس قدر لوگ وہاں موجود تھے سب کو تہ تیغ کر دیا جس میں ابوعبداللہ بن عبدالواحد بھی تھا، اس کے بعد اس سے جھوٹی خبروں اور غلط افواہوں کی اشاعت کا سلسلہ رک گیا، تمام جھگڑے ختم ہو گئے، اور حکومت ایک طور پر چلنے لگی۔

امیر ابوعبداللہ کی سخاوت، جرأت، انہماک اور شاہان وقت پر تفاخر کرنے کے واقعات بہت مشہور ہیں، اس کی وفات ۶۷۴ھ میں واقع ہوئی۔

امیر ابوعبداللہ کے بعد اس کا فرزند ملقب بہ واثق باللہ باپ کا جانشین ہوا اور ابھی اس نے زیادہ دنوں

تک حکومت نہیں کی تھی کہ اسے زہر دے دیا گیا۔

جب اس کے چچا ابو اسحٰق کو اپنے بھتیجے مستنصر باللہ کی وفات کی خبر پہنچی تو وہ اندلس سے سمندر عبور کر کے تلمسان گیا، اور موحدین سے ساز باز کر لی ان میں ایک ابو ہلال تھا جس نے بجایا کی حکومت ابو اسحٰق کے حوالے کر دی، پھر اس نے تونس پر چڑھائی کر کے قبضہ کر لیا اور واثق باللہ اس کے بھائی اور بیٹوں کو قتل کر دیا، ان مقتولین میں سب سے زیادہ نوخیز فضل نامی ایک بچہ تھا، جب ابو اسحٰق کی مستقل حکومت قائم ہوگئی تو افریقیہ میں گھر گھر اس کی بیعت پھیل گئی۔

ابو اسحٰق کے حالات:

ابو اسحٰق خوبصورت، متوسط قامت، گندم گوں، حسین، لحیم، بہادر، شجاع اور چست تھا۔ اس کے مزاج میں نرمی اور احتیاط نہ تھی، نفسانی خواہشوں میں غرق اور لذتوں میں ڈوبا رہتا تھا تاہم امور سلطنت میں وہ کبھی ناکام نہیں ہوا، بڑھاپے میں اس کو حکومت ملی تھی یعنی جب اس کے سیاہ بالوں میں سفیدی نمودار ہو چکی تھی اس لیے وہ لہو ولعب کا بے حد دلدادہ ہو گیا تھا، ایک دفعہ لوگوں کی نظروں سے گم ہو گیا اور بڑی تلاش و جستجو کے بعد باقلا کے ایک لہلہاتے ہوئے کھیت میں بدمست سوتا ہوا پایا گیا اس کے جسم پر پھول ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے، جب وہ حکومت کے اجلاس پر نہیں آیا تو لوگوں نے خیال کیا کہ ابو اسحٰق کا ایک خاص آدمی ابو الحسن بن سہل اسے معزول کر کے اس کے بیٹے ابو فارس کو جانشین کرنے کے لیے سازشیں کرنا چاہتا ہے اس کی اطلاع ابو اسحٰق کو ہوئی اس نے بروقت سواروں کو تیاری کا حکم دیا، اور خود مستعد ہو کر اپنے بیٹے کو طلب کیا اور ابو الحسن بن سہل کو بھی بلایا تا کہ وہ اپنی موت کا ہر طرف نظارہ کر لے، پھر وہ اسی وقت قتل کیا گیا اور شہر کی گلیوں میں اس کی لاش گشت کرائی گئی اور بیٹے کو سرزنش کر کے بجایہ بھیج دیا اس کے بعد سے حالات میں پہلے کی طرح سکون پیدا ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ جب امیر مستنصر باللہ نے اپنے چچا ابو عبداللہ کو قتل کرا دیا تو امیر کا بھائی ابو اسحٰق بھاگ کر اندلس آیا اور یہاں کے امیر ابو عبداللہ ابن غالب باللہ ابو عبداللہ بن نصر سے جو اپنے خانوادہ کا دوسرا تاجدار تھا پناہ چاہی، اندلس کے امیر نے اسے خوش آمدید کہا، اور اعزاز کے ساتھ اس پر نظر عنایت رکھی، اور بطور مہمان نوازی کے غرناطہ سے باہر ایک عمدہ قصر جو سید کی طرف منسوب تھا، رہنے کو دیا۔

اسی اثناء میں ابو اسحٰق نے بلاد روم کے چند معرکوں میں شریک ہو کر دشمن کے مقابلہ میں اپنی بہادری اور دلیری کے جوہر دکھائے۔

جب ابو اسحٰق کو اپنے بھائی کے مرنے کی خبر ملی تو وہ فوراً اندلس سے تلمسان گیا اور موحدین سے ساز باز کر لی اور بجایہ کے ابو ہلال کی مدد سے یہاں کی حکومت حاصل کی اور پھر تونس پر جا کر قبضہ کیا، رفتہ رفتہ اپنے بھتیجے واثق کی تمام مملکت پر متصرف ہو کر اس کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کیے اور اس کے ساتھ اوروں کو بھی قتل

کر کے گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا۔

کہتے ہیں کہ جب ابو اسحٰق کو حکومت ملی تو ایک نوجوان نصیر نامی جو مستنصر باللہ کے خاص آدمیوں میں سے تھا، مال و اسباب کے سلسلے میں متہتم ثابت ہوا، جب اس کی طلبی ہوئی تو وہ فرصت کا موقع پا کر مغرب بھاگ گیا اور وہاں ریگستان کے عربوں کو بھڑکا کر فساد برپا کرنے میں پوری طاقت صرف کی۔ اور حکومت کو الٹ دینا چاہا، اتفاقاً اس کی راہ و رسم بجایہ کے ایک دعویدار حکومت سے پیدا ہوگئی جو ابن ابی عمارہ کے نام سے مشہور تھا۔

شیخ الحاج ابو عثمان لواتی نے جو ایک سن رسیدہ دولت مند اور ثقہ تھے مجھ سے بیان فرمایا کہ میں ابن ابی عمارہ کے ساتھ ایک روز تونس کی کسی دوکان میں گیا، اس وقت اس نے اپنے متعلق کچھ پیشین گوئیاں کیں۔ چونکہ ابن ابی عمارہ کی شباہت اس فضل کی سی تھی جسے امیر ابو اسحٰق نے بچوں کے ساتھ قتل کر دیا تھا، اس لیے نصیر اپنی تدبیروں کو عملی جامعہ پہنانے کے لیے ابن ابی عمارہ کو دیکھ کر رونے لگا۔ اور کہنے لگا کہ تو ہمارے آقا کا ہم شکل ہے، نصیر نے حکومت کی طمع دے کر اسے اس بات کی ترغیب دی کہ حاکم کے عیب میں جو چیز مشہور تھی اس کو قضا و قدر نے ظاہر کر دیا ہے، یہ فقرہ کس کر اس نے ابن ابی عمارہ کو شیشے میں اتار لیا، اور اس کو شاہانہ آداب والقاب سکھا کر، لوگوں کے نام، عادات و خصائل اور قصروں کے اوصاف کی تلقین کی اور وہ علامتیں بتا دیں جنھیں مستنصر امرائے عرب کے ساتھ پوشیدہ طور پر استعمال کرتا تھا، اور بجز نصیر کے کوئی نہ جانتا تھا چنانچہ عبد نصیر نے ماتمی کپڑے پہنے، ابن ابی عمارہ کو گھوڑے پر سوار کیا اور آہ نالہ بلند کرتا ہوا آگے آگے پیادہ پا غمگین صورت بنائے چلا، اور عربوں کے پاس جا پہنچا، عربوں نے ابن ابی عمارہ کا نام بلند کر کے اس کی شان بہت بڑھا دی۔

جب ابو اسحٰق کو ابن ابی عمارہ کے حالات کی خبر ہوئی تو وہ اپنے بیٹے کو بجایہ سے طلب کر کے مقابلے کے لیے نکلا، فریقین میں جنگ ہوئی ابو اسحٰق نے شکست کھائی، اس کے اکثر ساتھی ابن ابی عمارہ کے مطیع ہو گئے اس کا بیٹا مارا گیا، اس کا بھائی امیر ابو حفص قلعہ سنان میں جا کر پناہ گزین ہوا اور وہ خود بھاگ کر بجایا گیا، ابن ابی عمارہ نے اسی وقت فوج کا ایک دستہ موحدین سرداروں کی نگرانی میں تعاقب کے لیے روانہ کیا، یہ دستہ بجایا پہنچا، لوگ سمجھے کہ یہ شکست خوردہ فوج کا ایک حصہ ہے اس لیے قلعے والوں نے اس سے کوئی باز پرس نہیں کی، اس دستے نے امیر ابو اسحٰق کو گرفتار کر لیا اور اس کا سر کاٹ کر ابن ابی عمارہ کے پاس بھیج دیا۔

ابن ابی عمارہ اس کامیابی کے بعد تونس آیا اور یہاں کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی، اور تقریباً تین سال بغیر کسی مزاحمت کے نہایت اچھی زندگی بسر کی مگر اس مدت میں اس نے ابو اسحٰق کے خزانوں کو لٹا دیا اور اس کے خاندان کے مرد اور عورتوں کے ساتھ سخت بدسلوکیاں کیں، جب اس کا حال لوگوں پر ظاہر ہو گیا، اس کی سرکشی سے ملک چیخ اٹھا اور ارکان دولت کی بھی آنکھیں کھلیں، تو امیر ابو حفص اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لیے اٹھا اور ابن ابی عمارہ کو مغلوب کر کے اس کا نام و نشان تک مٹا دیا، اور اس کے دامن پر عار کا جو دھبہ تھا دھو ڈالا، ملک بے شک ملکِ خدا ہے، اس کے نزدیک دنیا کا وزن مچھر کے پروں کے برابر بھی نہیں۔

ابراہیم بن ابوبکر بن عبداللہ بن موسیٰ انصاری

ابراہیم نام، ابواسحٰق کنیت، اور تلمسانی عرف ہے، سبتہ میں آکر آباد ہو گئے تھے۔

تلمسانی فقیہ عقد شرائط کے واقف کار، لغت اور فرائض کے ماہر ادیب اور شاعر تھے، جس چیز کا ارادہ کرتے اسے پختہ کاری اور خوبصورتی سے انجام دیتے، جس وقت ان کی عمر ۱۸ سال کی تھی ایک منظوم کتاب از جوزہ فرائض میں لکھی، جو اپنے فن میں نہایت محکم اور اپنی وضع میں عجیب وغریب تھی۔

ابن عبدالملک کہتے ہیں کہ "مجھے تلمسانی کے متعلق تجربے سے معلوم ہوا کہ وہ تیز طبیعت کے آدمی ہیں، ان کا ذہن ہر وقت حاضر رہتا ہے، تواضع، نیکوکاری، خوبی ملاقات، اور حسن معاشرت میں بے مثال ہیں، ان کی تالیف عمدہ اور میانہ رو ہے، معاشی امور میں جو چیز توجہ کے قابل ہوتی ہے اسی کو اختیار کرتے ہیں وضع اور لباس میں اتنی سادگی ہے کہ سبتہ کے عام مروجہ لباس سے بھی تقریباً فروتر ہے۔

ابن زبیر کا بیان ہے کہ تلمسانی ادیب، لغوی، فاضل اور فرائض کے امام ہیں۔

تلمسانی نے مالقہ میں ابوبکر بن دسمان، ابوصالح محمد بن محمد زاہد اور ابوعبداللہ بن حفید سے پڑھا اور اسی شہر میں ابوالحسن سہل بن مالک سے روایت کی، ابوبکر بن محرز سے مل کر اجازت لی، ابوالحسن بن طاہر رباح اور ابو علی شلوبین نے انھیں اجازت نامے لکھ دیے، اور سبتہ میں ابوالعباس بن علی ابن عمیرہ ہواری (جو ایک سن رسیدہ بزرگ تھے) اور ابوالمطرف احمد بن عبداللہ بن عبیدہ سے مل کر اجازت لی اور ابو یعقوب یوسف بن موسیٰ حسانی عمارمی کے پاس جا کر سماعت کی۔

تلمسانی سے اکثر خود ان کے معاصرین نے روایت کی ہے، ان میں ایک ابوعبداللہ ابن عبدالملک بھی ہیں۔

تلمسانی کی تالیفات میں ایک مشہور کتاب "از جوزہ" فرائض میں ہے اس فن میں کوئی کتاب اس سے بہتر نہیں لکھی گئی، آنحضرت ﷺ کی سیرت اور مدح میں متعدد نظمیں لکھیں، ایک کتاب "المعشرات" عربی اوزان پر، ایک قصیدہ میلاد نبوی میں اور ایک مقالہ علم عروض میں ہے۔

تلمسانی پرگو شاعر تھے، شاعری میں ان کا شمار عالی اور متوسط طبقے کے درمیان ہے ان کے اکثر اشعار

اچھے ہوتے ہیں، اور شاعری میں عجیب وغریب باتیں کہتے ہیں، مثلاً:

''دھوکا دینا لوگوں کی پرانی خصلت ہے اور یہ عادت تمام مخلوقات میں ساری ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص تیری نعمتوں کو پہچانے اور ان کی قدر کرے بلکہ اکثر ان نعمتوں کا بدلہ تیرے لیے مضر ہوتا ہے۔ آفتاب کو دیکھو وہ اپنا نور ماہتاب پر ڈالتا ہے مگر ماہتاب آفتاب کو گھنا دیتا ہے۔''

تلمسانی اپنے متعلق خود بیان کرتے ہیں کہ ان کی عمر نو برس کی تھی کہ ان کے والد انھیں لے کر اندلس آئے اور غرناطہ میں تین سال مقیم رہ کر مالقہ چلے گئے اور مدت تک یہاں بود و باش اختیار کی، ان کی نوشت و خواند زیادہ تر یہیں ہوئی بعد ازاں تلمسانی سبتہ پہنچے اور یہاں شیخ ابوالحکم مالک بن ابوالرحل کی بہن سے شادی کر لی۔

شیخ ابوالحکم ہمارے شیخ ابوالحسن تلمسانی کے دادا تھے جن کا تذکرہ وشہرت کی وجہ سے اکثر تالیف و تصنیف اور علوم وفنون میں کیا جاتا ہے۔

تلمسانی کے مدحیہ قصائد اور عمدہ نظمیں بہت ہیں، ایک قصیدے میں فقیہ ابوالقاسم عربی امیر سبتہ کی مدح کی ہے، اس کے چند شعر یہ ہیں:

''ان کو دیکھو جو اونٹوں کی نکیل پکڑ کر چلے گئے اور محبت کو کھنڈروں میں مقید کر گئے کیا تمھارا گمان ہے کہ اس قافلے کی گرد پھر انھیں اور تمھارے اشتیاق کو پورا کرے گی، کیا تم نے طور پر آگ دیکھی۔''

عبدالملک کہتے ہیں کہ تلمسانی نے مجھ سے بیان کیا کہ ان کی ولادت ۶۰۹ھ میں بمقام تلمسان ہوئی تھی۔ ۶۹۰ھ میں بمقام سبتہ زیادہ عمر میں وفات پائی اور لوگوں کو ان سے بہت کچھ فوائد حاصل ہوئے۔

کتاب عاید الصلہ میں مذکور ہے کہ آپ ادب میں نظم ہو یا نثر یگانہ روزگار تھے، آپ کا کلام صاف، پررونق، خوبصورت مواد سے لبریز اور بے حد شیریں ہوتا تھا، مختلف فنون میں آپ کو دخل تھا، آپ کریم النفس تھے اور اپنے مقصد کو پوری قدرت سے ادا کرتے تھے۔

جب آپ کی فضیلت کا غلغلہ بلند ہوا، اور لوگوں پر آپ کے جوہر کھلے تو سیاحت کے لیے نکلے، اور مشرقی بلاد کی سیاحت کر کے بلاد سوڈان میں پہنچے، اور بادشاہ تک رسائی حاصل کر کے ایک زمانے تک یہاں سکونت پذیر رہے، عزت شہرت، اور جلالت کی انتہائی معراج پر پہنچ کر بے شمار مال و زر حاصل کیا، بعد ازاں مغرب میں واپس آ کر اپنے وطن کے اطراف میں رہنے لگے، مگر آپ کو تقدیر دوبارہ بلاد سوڈان کے مرکزی مقام پر کھینچ لے گئی اور اب کی دفعہ آپ کو پہلے سے زیادہ مال و زر ہاتھ آیا۔

شاہ مغرب کی خدمت میں آپ نے نوادر کلام تحفہ پیش کیا جس کے صلے میں آپ کو زر خطیر عطا کیا گیا۔ اس بادشاہ کی شان میں آپ نے نہایت عمدہ مدحیہ قصیدہ لکھا۔

کتاب التاج میں آپ کا تذکرہ یوں مذکور ہے:

”آپ بہت بڑے سیاح، راہ روں کے حلیف تھے، اور ہر شخص کی مدح میں قصاید لکھ دیتے تھے آپ نے اپنے شہر میں ادب کا جھنڈا بلند کیا اور اس کو لے کر آگے بڑھے آپ جب نظم لکھتے تو اس کی تشبیب کو موتیوں کی طرح پروتے، اور نثر لکھتے تو اس میں مرثیہ کی شان پیدا کرتے، اور گوئے سبقت لے جانے والوں کے منہ پر خاک ڈال دیتے جب ان کی کساد بازاری وحق تلفی ہوئی اس وقت حزم و احتیاط برتنے لگے اور اپنی کمزوریوں پر قابو رکھتے۔ مینہ کی طرح کبھی اس مملکت میں جاتے کبھی دوسری میں جاتے۔ اپنی مطلب براری کے لیے بھی لومڑی بن جاتے اور کبھی شیر اور لوگوں کے سامنے دنیائے عجائب بیان کرتے پھرتے تیز رو اونٹنیوں پر سوار ہو کر صرام پہنچے وہاں برابی اور اہرام مصری دیکھتے ہوئے ملک شام کے سرحدی مقامات اور دمشق وغوطہ کی سیر کرتے ہوئے آپ مدینۃ السلام (بغداد) پہنچے، اور یہاں سے قافلوں کے ساتھ یمن اور اس کے ساحلی مقامات میں پھرتے رہے، یہاں تک کہ مجاز سے حقیقت کی طرف پلٹے یعنی حجاز جا کر رکن اور حجر اسود کو بوسہ دیا اور واپسی میں آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت سے فائز ہو کر شاہ سوڈان سے ملے، وہ آپ کو عطیات سے مالا مال کر کے اپنے ملک ساتھ لے گیا اور دنیا کی پہلی اقلیم میں جو خطۂ ارض کی آبادی کا بعید تر حصہ ہے وہ رہنے لگے، اور وہاں اس طرح رہے جیسے شراب کسی ظرف کی تہ میں رہتی ہے، یا نور حدقۂ چشم میں اور اگرچہ وہ صورت وشکل اور زبان کے لحاظ سے اجنبی تھے مگر نہایت عمدگی سے قلمی خدمت انجام دیتے رہے، اثنائے سفر میں انھوں نے چند رسالے لکھے تھے جو ان کی ادبی جلالت قدر کے شاہد ہیں۔“

جب آپ مراکش پہنچے تو اپنے وطن غرناطہ کے باشندوں کو حسب ذیل خط میں آپ نے یوں مخاطب کیا:

آپ لوگوں کو میرا ایسا سلام پہنچے جس کے جامے میں دارین لپٹا ہوا ہے اور جس کے صدا کو شاداب چمن نے گھیر لیا ہے، جو نجد کو عرار اور اس کی تیز خوشبو کی یاد بھلا دے۔ درخت پر اس کا دامن پڑے تو معطر ہو جائے، اور درخت بان کی شاخ کے ساتھ سرگوشی کرے تو وہ اس کی بات سے جوش میں آ کر جھومنے لگے، لالہ کے لبوں سے نمی جذب کرے، حدایق کے پردے کے اندر پہنچ کر گلاب کے رخساروں کو تحیات کہے، نجدی عاشقہ اس سے جوش میں آ کر بطن تہامہ کی محبت چھوڑ بیٹھے، اور ابن دہمان اس کے اشتیاق میں نالہ کرنے لگے، تمیمی اس کے مقابلہ میں اپنی خوشبو سے غافل ہو جائے اور نمیری زینب کی خوشبو کو جو بطن نعمان سے آئی تھی بھول جائے سمر اور بان کے درخت سر اٹھا کر اس کو دیکھنے لگیں، اور آس اور ریان اس کی خوشبو اپنے جسم پر مالش کریں۔ یہاں تک کہ جب اس کے تحیات کے انفاس لطیف اور خوشگوار ہو جائیں اور نفوس نفیسہ پر حاوی ہو کر ان کو رفیق بنا چکیں، اور دارین کو اپنی چادر میں لپیٹ چکیں، جوز اان کی ثنا کا ہار گوندھے، اعشی ان کی طرف متوجہ ہو کر اپنے باغ سے غافل اور بے پروا ہو جائے اور ابن بردان کے حق میں اطراف مسواک کی شہادت دے، تب وہ غرناطہ کے مقام ربع الجود میں ٹھہر جائیں، اور وہاں کے ڈول میں ڈوری کی گرہ تک بھر کر اس کے لہلہاتے

ہوئے کھیتوں کو پانی کے قطروں سے نہیں بلکہ ان کی خوشبو سے سیراب کریں۔

وہاں مجالس کے صدور جو صدور کے حامل ہیں اور معالی کے ترائب جو عقود وسخور سے آراستہ ہیں اور بلند مکانات کے محاسن جو حسن میں بروج کی چمک دمک کا مقابلہ کرتے ہیں، اور سبزہ زار اپنے موسم میں اور ایوانات کے صحن اپنے ایوانات کے اندر اور مجالس شوریٰ اپنی پوری سرگرمی کے وقت میں سب ان سے ایسے خوشنما اور دلفریب بن جائیں کہ اگر ان کو نعمان دیکھ لے تو اپنے سریر کو چھوڑ دے اور کسریٰ اپنے ایوان اور تخت کو دور پھینک دے، اور سیف اپنے غمان کو کم رتبہ سمجھنے لگے، اور حسان جلق کو اس کے غسان کے لیے ترک کر دے۔

بلادبها نيطت علی تمائمي واول ارض مس جلدي ترابها

"یہ وہ ملک ہے جہاں مجھے تعویذ باندھے گئے اور وہ پہلی سرزمین ہے جہاں کی خاک میرے جسم سے مس ہوئی۔"

جب فریضہ سلام کی مہر ٹوٹ چکے، ثنائے واجب بخوبی بیان ہو چکے، عرار کی خوشبو مجالس میں پھیل چکے پرانے احباب واخوان اپنے محامد کے پھول چن لیں، تمام اہل فضل کی نعمتوں کی سورتیں ثناء وتوصیف کے منبروں پر تلاوت کی جا چکیں، اور ان کے روشن ہالہ اور دائرہ کے گرد طلبہ ایک ستارہ روشن کر لیں، تب وہاں میرے درد وغم کی داستان اور میرے شوق وذوق کا حال بیان ہو۔

اللہ تعالیٰ ان معاہد کو اس قدر سیراب کرے کہ بھرے ہوئے ظرف چھلک جائیں، اور ان باتوں کو اس طرح غوطہ دے کہ ان کے محبت بھرے سینے موتیوں سے گھر جائیں، چشم نرگس ان کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے، درخت خوشی سے باہم معانقہ کرنے لگیں، نہریں ٹیلوں کے کنارے خوش فعلی سے بل کھانے لگیں، گل بابونہ کے لب درختوں کے رقص سے متبسم ہو جائیں، باغ کے رخسار شرم سے سرخ ہو جائیں، گلاب کے حدیقے بہت بلند ہو جائیں، اور صبا بھی ان کی طرف خوشگوار اور خوشبو خبر پہنچائے، یہاں تک کہ مطربہ اپنے باغ کی آمد ورفت سے، رونے والیاں اپنے مصائب کے بیان سے، بکری اپنے بہترین سرسبز وشاداب باغ کے لالہ سے، اور اخطل اپنے کلیسا کے منقش وزرنگار لباس سے بے پروا ہو جائیں، خورنق، بغداد، رصافہ اور سرادحسن میں ان مشاہد سے جو حسن میں حاضر اور غائب دونوں کا مقابلہ کرتے ہیں زیادہ خوبصورت نہیں ہیں، مصر کو اپنے نیل پر کیا فخر ہو سکتا ہے، جب ہزار نیل غرناطہ کے ایک شنیل میں داخل ہیں حرف شین اسی لیے زیادہ کیا گیا ہے کہ اس تعداد پر دلالت کرے۔

"خدارا کیسا برانگیختہ کرنے والا شوق ہے اور کیسا جذب محبت ہے جو عزم میں حرکت پیدا کر دیتا ہے جب اس کو کوئی نیا جذب محبت ہیجان میں لاتا ہے تو وہ عہد قدیم کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔"

میری آنکھ کی پتلیاں ہر طرف پھر رہی ہیں، ہر عضو زبان بن کر بول رہا ہے، اور ہم سرگشتہ وحیران گھوم رہے ہیں لیکن میرا قلب خستگی میں مبتلا اور فراق کا کشتہ ہو رہا ہے۔ ہوائے سرد جب چلتی ہے تو اس کو اپنے

ساتھ لیے پھرتی ہے، اور تڑپتی ہوئی بجلی جہاں کہیں اڑ کر جاتی ہے اس کو بھی اپنے ساتھ اڑا لے جاتی ہے، ہم ان کے قرب کو وقت کی دیر سمجھتے تھے، اور کہتے تھے کہ اب وہ سرزمین آتی ہے جو ان سے قریب کر دے گی، اللہ بخوبی قادر ہے کہ دوری کے باوجود قرب پہنچا دے اور یاس و ناامیدی کے بعد زخم فراق کو شفا بخشے کہ وہ آتش فشاں نے اپنی آگ کے لیے میرے شوق کو مستعار لیا ہے، اور قیس میرے وجد کے میدان میں نہیں چل سکتا پھر خیال کرو کہ اس وقت میرا کیا حال ہوگا جب ہم ان سرسبز راستوں کا چکر لگائیں گے، اور مقیم ہو کر سبزہ زار کی ہوا میں سانس لیں گے، اور ان معاہد پر نظر ڈالیں گے اور اس مجد و کرم کے لذیذ پھلوں کو توڑنے کا خیال کریں گے، حقیقت میں محبّ کا اضطراب قرب کی حالت میں بہت بڑھ جاتا ہے اور غم عشق کا برداشت کرنا اس کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

وابرح مایکون الشق یوما اذا دنت الدیار من الدیار

''شوق اس روز بہت سخت ہوتا ہے، جب ایک ملک دوسرے ملک سے قریب ہوتا جاتا ہے۔''

گھروں کی مسافت قریب ہوگئی، لیکن زمانہ تغیر پذیر ہے، اور تقدیر پر کسی کی حکومت نہیں، اس کا کیا بگڑتا ہے اگر تھوڑی دیر ٹھہر جائے اور دوستوں کے مل لینے سے ان کی پیاس بجھا دے، اور ایک ساعت کے لیے مل بیٹھنے کی اجازت دے دے اور اس مختصر سی امید کو پوری کر دے اور جس طرح برسوں کی مسافت کو طے کر دیا ہے اسی طرح دنوں کی مسافت کو بھی طے کر دے۔

اے مجھے مایوس کرنے والے زمانے! تجھ کو میری تکلیف پر کچھ رحم نہیں آیا اور احباب کو سلام کرنے کا موقع نہیں دیا، تو نے ہم کو بادیہ پیمائی کرنے، اچکنے، دوڑنے، مشرق و مغرب میں منتقل ہوتے رہنے اور گھوڑے کی پیٹھ اور اونٹ کے کاندھے پر سوار رہنے کے لیے چھوڑ دیا ہے، اے فراق کے راہبر فراق کی محمل کو چھوڑ کر جسم میں اس کے بار اٹھانے کی طاقت نہیں رہی، اور اے اونٹ تم اس دھیمی چال سے کیوں چل رہے ہو کاش میری بیماری عقیم ہوتی کہ اس سے دوستوں میں جدائی ڈالنے والا ذات البین نہ پیدا ہوتا۔

پھر تم جھوٹی فال نکالنے والے اور منحوس کوے کو مفارقت کا نذیر اور جدائی کا رسول کیوں سمجھتے ہو؟ فال نکالنے والے کے گھر سے اس کا بیٹا کیسے دور رہا؟ جو کچھ دیکھ رہے ہو حقیقت میں یہ صرف کاندھے اور پیٹھ والے کا کام ہے جو مہار اور نکیل میں منتقل ہوتا رہتا اور دن رات آمد و رفت کرتا رہتا ہے، مدت ہوئی کہ وہ رات بھر ہوا کی مثل چل کر صبح سویرے منزل بعد پر پہنچا، اور عاشق سرگرداں کو اجڑے ہوئے دیار اور مٹے ہوئے نشانات کے درمیان چھوڑ گیا تاکہ وہ مستعدی کے ساتھ نشان زخم کا پتا لگائے اور ٹیلوں سے زمانۂ گذشتہ کا حال دریافت کرتا رہے۔

اگر انصاف کرو تو معدوم چشمہ اور بھاگے ہوئے اونٹ کا کیا قصور ہے جو حوض اور چکر سے چھٹ کر رسی، عصا اور کوڑے کے سپرد ہوا، اگر باز کو اختیار دیا جائے تو وہ بھی قیام کر لے اور طائر قطا کو اپنی حالت پر چھوڑ

دیا جائے تو وہ بھی رات کو سور ہے، لیکن زمانہ متلون ہے، اور ہمیشہ ابنائے زمانہ پر بے خطا تیر چلاتا رہتا ہے، بس یہی وہ ہے جو مجمع کو درہم برہم کرتا رہتا ہے، اور جو تلوار اس کے سہارے پر اٹھائی جاتی ہے اس کو گرا دیتا ہے، اس نے کسی ایسے پیاسے کا لب جو اپنے غم کی آگ میں جل رہا ہو تر نہیں کیا اور نہ اس کو پانی پلایا۔

قسم ہے اس فاختہ کا غم زیادہ نہیں ہے جو مہندی اور طوق دانی اور عشق و شوق کی شکایت کرنے والی ہے جو اپنے نشیمن میں بیٹھی ہوئی اپنا قصہ بیان کر رہی ہے اور اپنے نفس گرم کی چنگاریاں آنکھ سے باہر پھینک رہی ہے جس نے درخت اور اس کی شاخوں کو اپنی منزل بنایا ہے، جس کی موزوں آواز شعر کا مقابلہ کرتی ہے، جو لکڑی سے اس طرح آواز نکالتی ہے گویا عود بجا رہی ہے، اور اپنی پُر درد آواز کا اس طرح اعادہ کرتی ہے، گویا کسی اجنبی کو سنا رہی ہے، عاشق، بیخود اس کی آواز سے چونک کر ہوش میں آجاتا ہے اور اس کے نالۂ شوق کا جواب دینے لگتا ہے، یہاں تک کہ اپنی انگلیوں کو دیکھ کر اس کے خاکی رنگ کا شبہ کرنے لگتا ہے، اور اس کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ ''اے رنگین ساق والی! تجھ کو شوق سے کیا واسطہ، یہ کیا حال ہے کہ تو رو رہی ہے اور تیرے آنسو چڑھے ہوئے ہیں، تو سوگوار ہے اور تیرے بازو آراستہ ہیں، تو نے نیچے کے پردوں کو عاری اور اوپر کے پردوں کو آراستہ کر رکھا ہے، اور اپنے پاؤں میں مہندی لگا کر ماتم کی مجلس میں حاضر ہوئی ہے، بلاشبہ تو نشہ میں مغلوب اور پھولوں اور درختوں کی یار وفادار ہے، منبر اور تخت کے درمیان آمد و رفت کرتی، باغ اور نہروں کے درمیان خرام ناز کرتی رہتی ہے، تو نے گانے بجانے میں بہت افراط کیا ہے، لیکن وہ صرف پانی کی آواز کی نقل اور حرف راء کی تکرار کا شوق ہے۔

فاختہ جواب دیتی ہے کہ صاحب بصیرت کی طرح غور سے دیکھو، ہم مصیبت میں غرق ہیں، ہم نے جزو کو کل کا کنایہ بنا لیا ہے، ہم میدانوں میں رہتے اور وہاں جو کچھ پاتے تھے اس پر زندگی بسر کرتے تھے، صبح سے شام تک اپنے رفیق کے ساتھ دل بہلاتے رہتے تھے، کبھی اتراتے ہوئے نہر سے نالے کی طرح چلے آتے، کبھی تخت سے زمین کی طرف چلے جاتے، کبھی دانہ چگتے اور کسی وقت محبت و پیار کی باتیں کرتے، کبھی پاؤں سے شاخوں کو ہلاتے رہتے، اور پیچیدہ شاخوں کو نوچتے اور کھینچتے رہتے تھے، زمانے نے میرے رفیق کو آفات میں مبتلا کر کے ہم سے جدا کر دیا، اور اس کے بعد میرا یہ حال ہو گیا کہ آنکھوں سے خون ٹپکتا رہتا اور ہر وقت رنج و غم دامن گیر رہا کرتا ہے، چشمے کے بعد اس کے نشان سے پیاس بجھاتے ہیں، جب میری آتش محبت بھڑکتی ہے تو میری منقار مشتعل ہو جاتی ہے، اور جب میرے دل و جگر میں خراش پیدا ہوتی ہے تو اس کے خون سے میرا پاؤں رنگین ہو جاتا ہے، قسم ہے ہم اپنے رفیق کی وفا کا طوق نہیں اتاریں گے یہاں تک کہ اس کے بعد ہم بھی ہلاک ہو جائیں۔

اور اس خوش حال و فارغ البال شریف و صاحب جمال عورت کا غم بھی زیادہ نہیں جس کو زمانے نے کشادہ دست بنا کر اس کے لڑکے کو چھین لیا ہو، جس کا حال یہ رہا ہو کہ جب وہ اپنے گرد آلود بچے کو تعویذ پہناتی

اور اس ہونہار فرزند کو عمامہ باندھتی اس وقت بزدل شخص کے دل میں بھی جوش پیدا ہو جاتا تھا اور حاسدوں کی نگاہیں دوسری طرف پھر جاتی تھیں، یہاں تک کہ اس کا یہ نونہال بچپن کی مدت پوری کر کے سن شعور کو پہنچا تو وہ شریف عورت اپنے اس اکلوتے کے ساتھ جو اس کے نزدیک نہایت گراں قدر اور اس دریگانہ کے ساتھ جو اپنے خاندان کے گلے کا ہار بنا ہوا تھا، اپنے کنج عافیت میں زندگی بسر کرنے لگی وہ اس کے لیے راتوں کو نرم ہوا کے جھونکوں کی تمنا کرتی، اور تیر نظر کے خطرات سے اس کے حق میں ہر وقت ڈرتی رہتی تھی، یہاں تک کو جب لڑکے کے دل میں نام و نمود کی امنگ پیدا ہوئی اور تعویذ کی جگہ تلوار کے پرتلے کو ملی، اور اولالعزمی نے للکار کر کہا کہ زن و فرزند کوئی چیز نہیں تو اس نے سامان باندھا، اور نیزہ سنبھال کر زرہ بکتر میں اتراتا ہوا اور نیزہ زنی میں ماہر ہو کر باہر نکلا۔ دفعۃً ایک مضبوط پنجہ والے شیر نے جس کے بال اور مونڈھے کھلے ہوئے تھے حملہ کر کے اس کو موت کے حوالے کر دیا، اور اس کی چادر کا کنارہ اس کے پہلو میں چھوڑ دیا، جب اس کی مصیبت زدہ ماں کو ٹھیک حال معلوم نہیں ہوا تو دریافت حال کے لیے باہر نکلی اور اس کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا کہ اس دغا باز شیر کے پاس جسم کے پانچوں جوڑ اور گوشت کے کچھ ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں جن کو وہ اپنے تیز دانت اور مضبوط پنجوں سے نوچ رہا ہے۔

غرض ان دونوں مصیبت زدوں کا رنج و غم میرے اس رنج سے زیادہ نہیں ہے جو ہم کو اس ملک کا ہے جہاں ہر قسم کی خوبی اور نیکی طلوع ہوتی رہتی ہے، اور جہاں ہر قسم کی خوبیوں کا کمال شرف اور شرف کمال ظاہر ہوتا رہتا ہے، جہاں ایسے بلند ہمت اور شریف خصلت لوگ پیدا ہوئے جن سے خود بلندی کی آنکھ ٹھنڈی ہوئی، اور جو زمانے کے گلے کے زیور بنے، ان لوگوں نے علم کے اس قدر شگوفے کھلائے کہ سارا ملک شاداب باغوں سے بھر گیا، اور ادب کا ایسا دائرہ بنایا جس کے گرد سعادت مندی ہی کے بدر گروش کرنے لگے، زمانے نے ان کے محاسن کو اپنے گلے اور سینے کا زیور بنایا اور افق نے آفتاب و ماہتاب کے لیے ان سے روشنی مستعار لی، فکر نے ان کے ساتھ خلوص ظاہر کیا، اور مجد نے ان کے لیے اپنا سینہ کھول دیا۔

یہ لوگ زمانے کی آنکھ کی پتلی، اور حسن و احسان کے حدود کے نقطۂ اتصال ہیں، جو زانے ان کے مفاخر کو نظم اور نثرہ نے ان کے مآثر کو نثر کیا، شعریٰ نے ان کے اشعار سے فائدہ اٹھایا، اور ثور ان کی گھنڈیوں سے برآمد ہوا، ثریا نے ان کے اخبار کہنے سننے کی، دلو نے ان کے حوض سے پانی پینے کی اسد نے ان کی دیوار کے گرد پناہ لینے کی، لغایم نے ان کی نعمتوں سے غذا حاصل کرنے کی، اور مجرہ (کہکشاں) نے ان کے فیض کرم سے مدد حاصل کرنے کی خواہش کی۔

مشک ان کے محاسن میں پس کر رقیق ہو گیا، صبح نے ان کی خبروں سے جوش میں آ کر اپنا گریباں چاک کر ڈالا، نہر نے ان کے حمی (علاقۂ محفوظہ) کے گرد چکر لگا کر حلقہ بنایا، اور خود فخر نے ان کی مفاخرت کی دیوار اٹھائی اور اس کو حلقہ میں لپٹا، ان کی بلاغت سے شاعر لبید کی زبان گونگی ہو گئی، اور اس نے عبدالحمید کو ناحمید بنا دیا، ابن ہلال نے ان کے محاسن پر تکبیر و تہلیل کہی، اور فارابی کے قلم نے جو کچھ لکھا اور تحریر کیا تھا سب کو چھپا

دیا، اور ایاس نے ان کے درجے کے قریب پہنچنے سے مایوس ہو کر جو قصر تعمیر کیا تھا اسے قصر (مختصر) کر دیا۔ اور اسی مکتوب کا ایک حصہ یہ ہے:

کوئی صاف و شفاف یا رنگین وخوشنما نقش و نگار اس سے زیادہ خوبصورت نہیں ہے جو ان لوگوں کے انفاس نے نقش کیا ہے، اور جو ان کے صحیفہ پر رسم ہوا ہے ان کے یہاں بہتیرے دُرِ ناسفتہ ایسے ہیں جن کی پرورش گندم علم سے ہوئی ہے، اور بکثرت گوہر یکتا ایسے ہیں جن کی آرائش خوش بیانی کے موتی سے ہوئی ہے، معارف ان کے انوار سے روشنی حاصل کرتے ہیں، اور فضائل ان کے منارہ کی بلندی پر فخر کرتے ہیں، اور ان کی عقل وفکر کی روشنی سے مشکلات رفع ہو جاتی ہیں۔

عروس مجد کو ان لوگوں نے آراستہ کر کے جلوہ آرا کیا، میدان سعادت میں داخل ہو کر اپنے بازوؤں سے خود رفعت کے ساتھ مزاحمت کی، ذرۂ خاک کو ستاروں کے مرتبے پر پہنچا دیا، ان کے محل کو تکبیر اسی طرح لازم ہے جس طرح حرف یاء کو تصغیر، اور افہام کے مرتبے میں ان کو اسی طرح تقدم حاصل ہے جس طرح ہمزۂ استفہام کو، ان لوگوں نے مراتب عالیہ کو حرف استعلاء کا قائم مقام بنا دیا ہے ان کی انتہا بہت دور ہے، اور آفتاب مداحوں کی مدح سے مستغنی ہے، پھر اس حالت میں ہم اور کیا کہیں ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ اپنے شوق کی تکلیف کو جس میں ہم مبتلا ہیں، اور درد و اشتیاق کو جو ہمیں محسوس ہو رہا ہے بیان کریں، اور نفس کو ملاقات کی امید سے تسلی دیتے رہیں اور جو نسیم ان کی طرف سے آئے اس سے دل بہلاتے رہیں۔

اگرچہ زمانے نے ہم کو ان کے حوض پر وارد ہونے سے باز رکھا، اور ان کے باغ کی گل چینی سے محروم کر دیا، پھر بھی ہماری محبت زائل نہ ہوئی اور ہمارے دلی خیالات میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا اور نہ ہمارا قلم ان کی سیاہی سے خشک ہوا ہے، ہماری محبت ان کے ساتھ روشن ہے اور ہم ان کے عہد کریم کی طرف آنے کی ہمت رکھتے ہیں، اگر یہ لوگ ہمیں محبت خالص کی طرف بلائیں تو وہ دیکھیں گے کہ ہم عہد قدیم والوں کے سامنے اپنا عمامہ اتار دیں گے اور اگر ہماری طرف مکاتبت کے قلم کو متوجہ کریں، اور اپنی گراں مایہ مخاطبت سے ہم کو سرفراز کریں تو دل دردمند کو اس کی زنجیر اسیری سے نجات دیں گے، اور تپش محبت کو جو اپنی حرارت سے جلا رہی ہے سرد کریں گے کہ اس غرض کے لیے کتابت کافی ہے اور بلاشبہ چشمہ کا نشان چشمہ سے بے نیاز کر دیتا ہے اور خالص، کریم، خوشبو، اور خوبصورت سلام خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کو پہنچے جو مرتبۂ بلند اور محل عالی رکھتے ہیں، نیز ان کے بڑوں پر اور ان تمام مخلص و قدیم احباب محسن برادر اور رفیق صادق پر پہنچے جو وہاں موجود ہیں، ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

غرض آپ میں خوبیاں بہت تھیں ایک دفعہ آپ کو بلاد سوڈان میں آتے ہوئے راستے میں ڈاکوؤں نے گھیر لیا تھا، آپ نے جاہ اور شہرت کے ساتھ زندگی بسر کی اور آپ کی متعدد زنجی کنیزیں تھیں جن سے سیاہ فام اولادیں گبریلوں کی طرح پیدا ہوئیں، اوائل ۷۳۹ھ میں معلوم ہوا کہ تنبکتو میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

اسماعیل بن فرج بن اسمٰعیل ابن قیس انصاری خزرجی

اسمٰعیل نام ہے۔ اندلس کے امیر المؤمنین تھے۔

امیر المومنین اسمٰعیل کی اولیت ان کی قوم کے بادشاہوں کے سلسلے اور ان کے نانا امیر المسلمین ابوعبداللہ بن غالب باللہ کے نام کے ضمن میں موجود ہے۔

کتاب ''طرف العصرفی تاریخ دولت بنی نصر'' میں ان کا تذکرہ اس طور سے کیا گیا ہے:

اسمٰعیل خوش خلق، خوش منظر نہایت آزاد، صاف دل، باحیا، پاک دامن اور صحیح العقل تھے، معرکوں میں ثابت قدم رہتے تھے، طہارت کی گود میں نشو ونما پائی تھی، ابوالہوسی سے محفوظ تھے۔

امیر اسمٰعیل کے نانا امیر کے والد کے چچازاد بھائی تھے اور بادشاہ بھی تھے، وہ ٹھیک اپنے نانا کے نقش قدم پر چلتے تھے، ابتدا میں اسلحہ کو درست کرنے گھوڑوں کو صاف ستھرا رکھنے اور شکاری جانوروں کی پرواخت میں مصروف رہا کرتے تھے، یہاں تک کہ زمانے نے ان کی مساعدت کی، اور تقدیر یاور ہوئی، تو وہ تاج وتخت کے مالک بنائے گئے اور سلطنت ان کے گھرانے میں منتقل ہوگئی۔

امیر اسمٰعیل نے رعایا میں عدل و انصاف کے قوانین نافذ کیے، مال گزاری کی معتدل شرح رکھی، سرحدوں کے استحکام اور دشمنان الٰہی کی مدافعت میں سعی، بلیغ کی، جس کے باعث وہ اپنی قوم کے شریف فرد، اپنے گھرانے کے در یکتا، اور اپنے زمانے کی نیکی تصور کیے گئے، امیر ممدوح کے کچھ حالات آئندہ مذکور ہوں گے جن سے ان کی جلالت اور فضیلت آشکارا ہوگی۔

امیر اسمٰعیل کا قدوقامت متوسط، چہرہ حسین، ہاتھ موٹے تازے، رنگ گورا، داڑھی گھنی مائل بہ سرخی و سیاہی، آنکھیں خوبصورت کشادہ اور سرگیں جن میں ملاحت بھری ہوئی، دہن کشادہ، ناک اونچی، اور آواز بلند تھی۔

امیر اسمٰعیل کی ماں فاطمہ شہزادی ملک کی چیدہ خاتون، امیر المومنین ابوعبداللہ کی صاحب زادی، اور شاہی خاندان کی ایک برگزیدہ شہزادی تھیں، گویا یہ ہار کا درمیانی ہیرہ تھیں، حرم میں ان کا وجود فخر کا باعث تھا، عزت، حرمت اور صلۂ رحمی میں نہایت بلند درجہ رکھتی تھیں، جب تک وہ زندہ رہیں برابر ان سے رائیں لی گئیں، یہ بہ نفس نفیس فواید کی ایک فہرست اور انساب کی تاریخ تھیں، سلطان ابوالحجاج کے عہد میں جو ان کے پوتے تھے

وفات پائی، اس وقت عمر نوے سال سے تجاوز کر چکی تھی، جنازے میں خلقت کا ہجوم تھا اپنے پوتے کے لیے ورثہ میں جو کچھ چھوڑا اس کی مقدار بہت تھی، ان کا ایک مرثیہ لکھا تھا، وہ یہ ہے:

''ہم زمانے کے شر کو جان کر شب باشی کرتے ہیں۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ تمام مخلوق ایک قہار کے قبضے میں ہے، ہم دنیاوی عزت کا دھوکہ کھا کر دنیا کی طرف مائل ہوتے ہیں مگر جس سے وفا کی امید ہوتی ہے وہ دھوکا دیتا ہے ہم نادانی سے اپنے عزم کو زمانے سے ٹالتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایک دن سے دوسرا دن اور ایک ماہ سے دوسرا ماہ ہو جاتا ہے، افسوس! نفسانی مرغوبات اور خواہشات کا نفس اس طرح دھوکہ دیتا ہے کہ ہم باقی رہنے والی چیز کو چھوڑ دیتے ہیں۔ زمانے کی کوئی جدید شے اپنی جدت پر باقی نہیں رہتی۔ اور نہ زمانہ بُری چیزوں کے پیدا کرنے سے باز رہتا ہے، مصائب کو ایک دوسرے پر اسی طرح فضیلت ہے۔ جس طرح بلند رتبہ کے مصیبت زدوں کو ایک دوسرے پر ہے، دیکھو! مسجد و بزرگی کے مکانات ناپید ہو گئے اور اس کے تمام شاداب درخت سوکھ گئے اوج کے چہرہ پر حزن کے آثار نمایاں ہو گئے اور بشاشت کے بعد وہ چیں بہ جبیں ہو گیا۔''

کتاب مذکور میں بسلسلہ وفیات امیر اسمٰعیل کی ماں کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے:

امیر المسلمین ابوعبداللہ بن امیر المومنین غالب باللہ کی صاحب زادی فاطمہ نہایت پاک دامن، نیک طینت، اور شریف سلطانہ تھیں، امارت کے نظام کو محفوظ رکھنا، صلہ رحمی اور قرابت کا خیال کرنا، نیک کاموں کو انجام دینا، خاندانوں کی عیب پوشی کرنا ان کا ذاتی وصف تھا، پاکیزگی نفس، علوے ہمت، دینی متانت، پردے کی سختی، عزم کے نفاذ، اور صبر کے اظہار میں سلف صالح کی پیرو تھیں، اپنے پوتے امیر المسلمین ابوالحجاج کے عہد حکومت میں جنت کو سدھاریں، آخر عمر تک اپنے احسانات سے ہر ایک کو مرہون منت رکھا، لوگ ان کی دعاؤں کے طالب رہتے، اور ان کے تجربات اور تاریخی معلومات سے استفادہ کرتے تھے، صباح یکشنبہ ۷/ ذی الحجہ ۷۴۹ھ کو الحمرا کے مقبرۂ جنان میں دفن کی گئیں۔

اسمٰعیل کے چار بیٹے تھے، بڑا فرزند محمد ولی عہد تھا، منجھلا فرج اپنے بھائی محمد کے مرنے کے بعد بیرون اندلس دوسرے ملکوں میں مارا مارا پھرا، بالآخر قلعہ المریہ کے قید خانے میں ۷۵۱ھ میں ہلاک ہو گیا، گمان کیا جاتا ہے کہ وہ قتل کیا گیا، تیسرے فرزند ابوالحجاج نے (خدا غریق رحمت کرے) اپنی قوم کے سلاطین کے مقابلے میں زیادہ دنوں تک حکومت کی اور حکمرانی میں سب سے زیادہ سعید ثابت ہوا، چھوٹے فرزند اسمٰعیل نے اپنے بھائی کے عہد میں شباب کا زمانہ خوفناک جھگڑوں میں گزارا، اور پھر وہ قصر متخلص میں قیام پذیر رہے جو شالوبانیہ کے سواد میں واقع ہے، اور یہیں اسے آذوقہ بہم پہنچایا جاتا رہا، امیر اسمٰعیل کی دو صاحب زادیاں تھیں، ابوالحجاج نے ان کا نکاح قرابت کے دو شخصوں سے کر دیا تھا۔

امیر اسمٰعیل کے ابتدائے عہد حکومت میں ابوعبداللہ محمد بن ابوالفتح فہری جو ایک بڑے بہادر سالار عسکر

تھے، وزارت کے عہدے پر مامور کیے گئے، ان کا خاندان سالار عسکری میں مشہور تھا، اور ملوک بنو نصر میں ان کی بڑی توقیر اور عزت تھی، وزیر موصوف کے ساتھ فقیہ وزیر ابوالحسن علی بن مسعود بن علی بن مسعود محاربی بھی عہدۂ وزارت میں برابر کے شریک وسہیم بنائے گئے، جو غرناطہ کے ممتاز اعیان میں سے تھے، انھوں نے اپنے شریک کار کے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہا اور وزارت کے حلۂ فاخرہ کو تنہا زیب تن کرنے کی سعی کی، بالآخر وہ وزارت کے اسم اور مسمی دونوں کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، اسی اثناء میں قائد ابوعبداللہ ابن ابوالفتح کا انتقال ہوا تو وہ تنہا اس عہدے کے حق دار باقی رہ گئے۔

امیر اسمٰعیل کے دور حکومت میں جس شخص نے سب سے پہلے کتابت کی خدمت انجام دی وہ فقیہ کاتب ابوجعفر بن صفوان تھے۔ ابن صفوان نے کچھ دنوں مالقہ میں چند دنوں تک اثنائے سفر میں اور پھر چندے شہر غرناطہ میں امیر کی طرف سے کتابت کی خدمت انجام دی، ان سے شیخ ابوالحسن ابن جیاب نے جائزہ لیا، جو اس خدمت کتابت کے لیے بڑے فاضل اور بزرگ تھے اور جب تک زندہ رہے کوئی دوسرا شخص اس خدمت پر مامور نہیں کیا گیا۔

امیر اسمٰعیل نے عہدۂ قضا شیخ فقیہ ابوبکر یحییٰ بن مسعود بن علی کو عطا کیا، جو وزیر ابوالحسن کے بھائی تھے، اور فصل مقدمات کی اہلیت رکھتے تھے، وہ شرعی مسائل اور اپنے فیصلوں کو نافذ کرنے میں بہت سختیاں کرتے تھے اور ان کی ذاتی وجاہت بھی اس میں معین تھی، جس کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں ان کی دھاک بیٹھ گئی تھی، تازیست وہ اس خدمت پر مامور رہے۔

امیر اسمٰعیل کے زمانۂ حکومت میں مغربی عسکر کے رئیس شیخ ابوسعید عثمان بن ابو العلاء ادریس بن عبداللہ بن عبدالحق تھے، جو اپنی قوم کے رکن رکین، اپنے خاندان کے فرد اعلیٰ بہت بڑے شجاع، اور تنعم میں امیر اسمٰعیل کے برابر والے تھے، ان کے پاس دولت بہت تھی، لوگوں کے ساتھ لطف کا برتاؤ کرتے تھے، جب معزول سلطان کا انتقال ہوا تو ان کے لیے بھی فضا صاف ہوگئی اور انھوں نے بھی اپنے لیے سعی کی۔

ملوک ہم عصر:

امیر اسمٰعیل کے عہد میں جتنے ملوک سریر آرا تھے ان کا اجمالی تذکرہ یہ ہے:

عدوہ مغرب میں مغربی ملوک میں سے ابوسعید عثمانی بن سلطان اعظم مجاہد و مرابط ابو یوسف عبدالحق ایک مشہور سلطان تھے جو سلاطین میں سخی تر بڑے مہمان نواز آرام و عافیت کے دشمن، رفاہ عام کے دوست، صاحب نعمت، باحشمت، اور عام و خاص کے لیے باعث سعادت تھے، امیر اسمٰعیل اور سلطان ابوسعید سے مراسلت رہتی تھی، امیر اسمٰعیل اور پھر ان کے فرزند ابوعبداللہ کے ابتدائے دور حکومت تک سلطان ابوسعید کی حکومت مغرب میں قائم رہی۔

شہر تلمسان میں امیر ابوحمو موسیٰ بن عثمان بن نعمیر ابن بن زبان کی حکمرانی تھی، جسے اس کے فرزند نے ۶ر جمادی الآخرہ ۷۱۸ھ میں قتل کر دیا اور پھر خود حکمران بن گیا، اور مسلسل حکمرانی کے بعد ابوالحجاج کے اوائل عہد حکومت میں راہی ملک عدم ہوا، ان دونوں نے ایک دوسرے کو مراسلے اور ہدیے بھیجے تھے۔

شہر تونس میں شیخ ابویحییٰ زکریا بن ابوحفص ملقب بہ امیر المسلمین مشہور بہ لحیانی امیر تھے جو بہت معمر اور صاحب رتبہ تھے، لحیانی نے ایک سن رسیدہ امیر ابوالبقا خالد بن ابوزکریا بن ابوحفص پر حملہ کر کے ۹ر جمادی الآخرہ ۷۱۱ھ میں تونس کی حکومت حاصل کی تھی، اور ابوالبقا کو معزول کر کے قید کر دیا تھا۔ جس سے تونس میں سخت ہنگامہ برپا ہوا، اور جب شوال ۷۱۳ھ میں ابوالبقا کو دھوکے سے قتل کر دیا گیا تو یہاں اور زیادہ شورش ہوئی، مجبور ہو کر وہ ۷۱۵ھ کے وسط میں اپنے داماد شیخ ابوعبداللہ بن ابوعمر کو اپنا قائم مقام کر کے طرابلس کی طرف چلے گئے اور پھر یہاں واپس نہ آئے، اس کے بعد سے افریقیہ کی حکومت کا مطلع کبھی صاف نہ ہوا، باری باری سے حفصی خاندان کے کئی بادشاہ یہاں حکمران ہوئے جن کے نام یہ ہیں:

امیر ابوعبداللہ بن ابوعمر مذکور، ابوعبداللہ بن لحیانی، سلطان ابوبکر بن امیر ابوزکریا بن امیر ابواسحٰق، یہ حفصی خاندان کے آخری حکمران تھے، یہاں ان کی مسلسل حکمرانی قائم رہی، اور ان کی حکومت کا عہد امیر اسمٰعیل کے دونوں فرزندوں کے عہد حکومت سے جو اندلس کے حکمران تھے مل گیا تھا خدا ان سب پر رحم فرمائے۔

قشتالہ میں طاغیہ ہردانہ بن شانجہ بن ہنشر بن ہراندہ رومی بادشاہ تھا اس کا عہد امیر اسمٰعیل کی تخت نشینی سے متصل تھا، قشتالہ، اور لیون دونوں ملک اس کے زیر نگین تھے، اشبیلیہ، قرطبہ، مرسیہ، اور جیان پر بھی یہ قابض تھا۔

ابن ہنشہ وہ شخص ہے جس کے ساتھ ارا ک اور عقاب کے واقعات پیش آئے تھے، اور ان واقعات میں اسے سخت ہزیمت ہوئی تھی۔

ابن شانجہ جس کا نام ارشدون تھا، وہ شخص ہے جس نے اپنے داماد کو ملک برطال دیا تھا، ان دونوں کا سلسلۂ نسب چند اجداد کے بعد اوپر مل جاتا ہے جس کا تفصیلاً بیان کرنا ہماری غرض و غایت سے باہر ہے۔

ارغون میں جو مشرقی اندلس میں واقع ہے طاغیہ جامس بن بطرہ بن جامس حکمران تھا، اس نے بلنسیہ پر نہایت غلبے کے ساتھ قبضہ کیا تھا، پھر یہاں کی بادشاہی ابن بطرہ بن ہنشہ کو ملی، ان دونوں کا سلسلہ بھی چند اجداد کے بعد اوپر جا کر مل جاتا ہے، امیر اسمٰعیل کے آخری عہد میں اس کا انتقال ہوا اور ملک ارغون کے تخت پر ہنشہ بن جامش متمکن ہوا جو امیر اسمٰعیل کے آخر زمانے تک سریر آرا رہا تھا۔

برطال میں ہنشہ بن یومس بن ہنشہ بن شانجہ بن ہنشہ بن شانجہ ابن ہونشہ کی بادشاہت تھی، ابتدا میں اس کا نام دوقاد تھا۔

یوم عید الفطر ۷۰۸ھ میں سلطان ابوالجیوش نصر بن سلطان ابوعبداللہ محمد بن سلطان غالب باللہ ابو

عبداللہ بن نصر نے حملہ کر کے اپنے بھائی عبداللہ ارمد کو معزول کر دیا، اور اس کے وزیر ابن الحکم کو مکان کے دروازے میں دھوکہ سے قتل کر کے اندلس کے تخت پر خود متمکن ہو گیا اگرچہ عبداللہ کی کمزوری سے نصر کی حکومت قائم ہو گئی مگر در پردہ اس کے خلاف بھی سازش کا بازار گرم ہو گیا، اور خاص خاص لوگوں کی منافست سے حالت اور زبوں ہو گئی، چنانچہ ابوسعید فرج نامی ایک رئیس کبیر جو عبداللہ اور نصر کا برادر عم زاد تھا، جسے سلطنت کا علم اور رشتہ داروں کا ستون کہنا چاہیے حکومت کے معاملات میں بہت دخیل تھا، آبائی میراث کا حق رکھتا تھا، اور اباً عن جدٍ مالقہ اور اس کے مضافات کی نگرانی کرتا تھا اور تھوڑے دنوں سے سبتہ کا بھی جو معزول سلطان کے صوبہ جات میں داخل تھا نگران ہو گیا تھا، اس رئیس نے موجودہ حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنے بیٹے امیر اسمٰعیل کو ان مقامات کا مختار بنا دیا، اور یہاں کی تمام رعایا اس کی مطیع اور فرماں بردار ہو گئی، اگرچہ رئیس ابوسعید سے بعض امور کی بنا پر رعایا ناخوش تھی۔

امیر اسمٰعیل دستور کے مطابق رسم تہنیت اور بیعت کے لیے سلطان نصر کے پاس غرناطہ آیا، مگر بعض ارکان حکومت نے اسے متنبہ کر کے مشورہ دیا کہ وہ جلد اپنے شہر واپس جا کر اپنی کامل خود مختاری کا اعلان کر دے اور ان لوگوں نے ہر ممکن طریقے سے امداد دینے کا وعدہ بھی کیا، امیر اسمٰعیل اسی وقت وہاں سے واپس ہو گیا، اور ابھی اس کی واپسی کو زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ غرناطہ میں فتنہ وفساد کی آگ بھڑک اٹھی، اور لوگوں کے دل غیظ و غضب سے مشتعل ہو گئے، امیر اسمٰعیل نے ۱۷ر رمضان سنہ مذکورہ میں اپنے شہر میں پہنچتے ہی اپنی کامل خود مختاری کا اعلان کر دیا، شاہانہ کروفر قائم کیا، فوجی محکمے کی تنظیم کی، اور ایک ہی حملے میں تنقیرہ کو مسخر کر لیا، یہ دیکھ کر اہل المریہ نے اس کی اطاعت قبول کی، پھر وہ بلش کی طرف بڑھا، اور یہاں بھی اس نے جنگ کی اور آلات مجانیق نصب کیے، آخر کار یہاں کے باشندے بھی اس کے مطیع ہو گئے، رفتہ رفتہ اس کی تحریک دعوت نے زور باندھا، مال گزاری کی رقم اچھی مقدار میں وصول ہونے لگی، اور کثرت سے عوام اور جنگجو آدمی اس کی تحریک دعوت میں شریک ہو گئے۔

یکم محرم ۷۱۲ھ کو امیر اسمٰعیل نے غرناطہ پر چڑھائی کی، اور قریہ عطشا میں فوج اتار دی ادھر سلطان نصر پورے جنگی سامان کے ساتھ فوج گراں لے کر مقابلے کو نکلا، ۱۳ر محرم کو دونوں فوجوں میں جنگ ہوئی جس میں امیر اسمٰعیل کی چھوٹی جماعت غالب رہی اور غرناطہ کی فوج کو ہزیمت ہوئی، سلطان نصر کا گھوڑا ایک نہر کے پاس ٹھوکر کھا کر گرا، تھوڑی دیر کے بعد سلطان سنبھلا اور بے نیل مرام شہر غرناطہ میں داخل ہوا، اور ادھر مالقہ کی فوج اپنے شہر کامران واپس گئی۔

اس کامیابی سے رئیس ابوسعید اور اس کے فرزند اسمٰعیل نے سربلندی حاصل کی اور دونوں نے ملک کے فتنوں سے خوب فائدے اٹھائے، مگر چونکہ امیر اسمٰعیل کو مال وزر کی سخت ضرورت لاحق ہوئی۔ ملک کی ضرورتوں کا اس پر سخت دباؤ پڑا، اور بغیر مال وزر کے اسے فضیحتوں کا سامنا تھا اس لیے امیر اسمٰعیل کے سلطان

نصر سے صلح کی سلسلہ جنبانی کی اور ان شرائط پر صلح کر لی:

شہر مالقہ میں امیر اسمٰعیل کی حکومت علیٰ حالہ رہے گی، اور امیر پر سلطان کی سیادت قبول کرنا، خراج دینا اور سلطانی لشکر کو رسد باہم پہنچانا لازم ہوگا۔

شرائط صلح ربیع الاول سنہ مذکور میں طے پائے۔

اسی سال غرناطہ میں ایک اور فتنہ اٹھا، وہاں کے شیوخ کے ماہ رمضان میں بغاوت کر کے سلطان کو تخت سے اتارنے، اور معزول سلطان کو دوبارہ تخت نشین کرنے کے لیے بہت شور وغل مچایا، مگر جب سلطان نے ان باغیوں کا زور توڑ دیا تو ان کے تمام سرگروہ مالقہ چلے گئے، امیر اسمٰعیل کے لیے یہ نادر موقع ہاتھ آیا، اس نے آخر شوال میں پے در پے کوچ کر کے لوشہ پر چڑھائی کر دی اور اسے تسخیر کر کے کافی خزانہ لے کر وطن واپس آ گیا۔

افسران فوج میں ایک سردار پر امیر اسمٰعیل کی خاص نظر لطف رہتی تھی، اتفاق سے وہ امیر کے نزدیک متہم ثابت ہوا تو اس نے سردار کو قید خانے میں ڈال دیا مگر جب اس کی طرف سے امیر کا دل صاف ہو گیا تو حلف لے کر اسے چھوڑ دیا، اس بات سے امیر کے حاشیہ نشینوں کے دل سخت رنجیدہ ہوئے، اور دوسروں کو بھی اس کا صدمہ ہوا، مگر امیر کی قوت وشوکت کی وجہ سے وہ کچھ نہ کر سکے، تاہم یہ لوگ سلطان سے جو ملک گیری کی ہوس رکھتا تھا مل گئے، امیر کو خطرہ لاحق ہوا کہ ان کی وجہ سے سلطان احواز اور جدونہ کی طرف رخ کرے گا اس لیے اس نے خود ہی غرناطہ پر حملہ کر دیا، سلطان کی فوج عبدالحق بن عثمان کی سرکردگی میں مقابلے کے لیے نکلی، مگر حملہ آوروں نے اس زور کا حملہ کیا کہ اگر سلطان ثابت قدمی سے نہ لڑتا تو اس کی فوج ہر طرف سے گھر جاتی، تاہم وہ ہزیمت اٹھا کر بھاگی۔

حملہ آور شہر پناہ کے دامن تک تعاقب کرتے ہوئے پہنچ گئے، اور غوغائیوں کی جماعت جو سلطان کو معزول کر کے انقلاب حکومت کی خواہاں تھی اس حملہ سے خاموش ہوگئی، باب البیرہ فوراً بند کر دیا گیا، امیر کی فوج قفل توڑ کر شہر غرناطہ میں جا گھسی، سلطان اپنے اہل وعیال، تمام ذخائر اور خاص لوگوں کو لے کر الحمرا کے قلعے میں جا کر پناہ گزین ہوا، اور امیر ابوالولید (اسمٰعیل) ابن متول کے پرانے قلعے میں جو الحمرا کے مقابل دار کبریٰ میں واقع تھا داخل ہوا، اور لوگوں کو مال وزر دینے کے لیے تحریری فرمان نافذ کیا، اور خطائیں معاف کر کے منتشر لوگوں کی تالیف قلوب کی۔

الحمرا میں جتنے لوگ محصور ہو گئے تھے باوجودیکہ ان کے پاس رسد کافی تھی، مال وافر تھا، اور مدافعت کی قدرت رکھتے تھے، بااین ہمہ وہ ہمت ہار گئے اور اتنے کور چشم ہو گئے کہ انھیں کچھ نظر نہ آیا، مجبور ہو کر انھوں نے امیر اسمٰعیل سے اپنے اور سلطان کے لیے ایک معاہدہ مرتب کرنے کی درخواست کی، جس کا مفہوم یہ تھا کہ وہ لوگ تمام مال واسباب اور ذخیروں کے معاوضے میں سلطان کو لے کر وادی آش منتقل ہو جائیں گے، چنانچہ یہ معاہدہ مرتب ہوا، اور ۲۸ رشوال ۷۱۳ھ میں سلطان معزول ہو کر غرناطہ سے کوچ کر کے وادی آش چلا گیا، اور

یہاں وہ کبھی جنگ اور کبھی صلح کی حالت میں زندگی بسر کرتا رہا یہاں تک کہ شمشیر اجل نے اس کا خاتمہ کر دیا۔

سلطان کے انتقال کے بعد امیر اسمٰعیل کے لیے فضا صاف ہوگئی، لوگوں نے اس کی سیاست تسلیم کر لی، دور ونزدیک اس کی اطاعت پھیل گئی اور کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی، اور بقا صرف خدائے وحدہ لاشریک کے لیے مخصوص ہے۔

امیر اسمٰعیل اہل بدعت کے لیے سخت اور اہل ملت کے لیے نرم تھے ایک روز امیر کے سامنے سادات کا ذکر چھڑا تو اس نے ان میں سے بعض کے لیے زر فدیہ کی گراں قدر رقم ادا کی، اور بعض کو اپنی فوج کی لڑائیوں سے علیحدہ کر دیا، لوگوں کا گمان ہے کہ امیر نے خواب میں آنحضرت ﷺ کو سادات کے ساتھ سلوک کرنے پر شکریہ ادا کرتے ہوئے دیکھا۔

امیر شرعی حدود قائم کرنے اور سکرات کے روکنے میں سخت واقع ہوا تھا، ولیمہ کی دعوتوں میں معززین کے پاس طوائفوں کی آمد ورفت کو ممنوع قرار دیا، اور ان کی طرب انگیزی سے لطف اندوزی کی اجازت صرف ان لوگوں کو دی جو اسی قماش کے تھے۔

یہودیوں کے لیے یہ لازم کر دیا کہ وہ کوئی ایسی علامت اختیار کریں جو دوسروں سے ان کا امتیاز کر سکے اور مخاطبت وراہروی میں جو حق شریعت نے انھیں دیا ہے اسے ملحوظ رکھیں، چنانچہ سروں پر زرد لفہ باندھنا ان کا شعار قرار دیا گیا۔

ایک شیخ جن سے اکثر لوگ مزاح کرتے تھے بیان کرتے ہیں کہ ایک روز ہم چند آدمیوں نے عیش و نشاط کی مجلس گرم کی، میرے سر پر سرخ لفہ بندھا تھا، دوستوں نے مجھے گہری نیند سلا دیا اور زرد کپڑے کے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک لفہ تیار کر کے میرے سر پر سرخ لفہ کی جگہ لپیٹ دیا، پھر انھوں نے مجھے جگایا جب میں اٹھ بیٹھا تو مجھے پیسے دیے کہ میں کچھ سبزی اور میوہ بازار سے لے آؤں میں اسی طرح بازار چلا گیا، اور ایک دکان دار سے بھاؤ کرنے لگا، اس نے مجھے دیکھ کر اپنے ساتھی سے کہا، خدا امیر کو جزائے خیر دے، میں اس لعین کو مسلمان سمجھتا تھا اور عندالملاقات سلام کرنے میں سبقت کرتا تھا، یہ کہہ کر اس نے مجھ پر تھوک دیا میں اس وقت دکاندار سے دست وگریباں ہوتے ہوئے رہ گیا، کیونکہ مجھے فوراً اپنے فریب دیے جانے کی اطلاع ہوگئی تھی میں نے لفہ نوچ ڈالا، اور بازار سے واپس جا کر دوستوں کی بُری طرح خبر لی، اس وقت میری ندامت کی کوئی انتہا نہ تھی، چونکہ ان کا جاسوس مجھ سے پہلے جا چکا تھا اس لیے میرا وہاں پہنچنا تھا کہ وہ ہنستے ہنستے لوٹ گئے، غرض امیر اسمٰعیل کے مناقب بہت ہیں۔

رومیوں کی فوج نے معزول سلطان کی امداد سے امیر اسمٰعیل کی فوج کو وادی فرتونہ میں سخت ہزیمت دی، طاغیہ، بطرہ، کافل رومی بادشاہ اس جنگ کا بانی تھا، اس سے پہلے امیر کے باپ اور چچا کے عہد میں اس رومی بادشاہ کی کوئی بڑی ہستی نہ تھی، بلکہ وہ اس کی مدافعت بہ آسانی کرتے تھے، امیر اسمٰعیل کی ہزیمت کا واقعہ

۷۱۶ھ میں پیش آیا، جس میں چوٹی کے آدمی مارے گئے، حصن منتماس، حصن بیج، حصن طشکر، اور ثغر روط کو تسخیر کر کے پایۂ تخت غرناطہ پر حملہ کرنے کے ارادے سے یہاں کی چراگاہ کی طرف رخ کیا، مگر اللہ تعالیٰ نے حملہ رد کر کے اس کا قلع قمع کر دیا، اور اسلام کو نصرت عطا فرمائی، سواد غرناطہ میں تین میل کے فاصلے پر مسرج کے مقام پر اس طاغیہ کو کامل شکست ہوئی، تمام سوار اور پیدل فوج کام آئی، اس کا سارا سامان لوٹا گیا، اور مسلمانوں کو فتح عظیم نصیب ہوئی، جس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور مسلمانوں کی سعادت دوبارہ واپس آ گئی، یہ واقعہ ۶؍ جمادی الاولی ۷۱۷ھ کو رونما ہوا، اسی واقعے کے متعلق شیخ ابوالحسن جیاب کاتب کے یہ اشعار ہیں:

الحمد حق الحمد للرحمن — كافي العدو و ناصر الايمان

ومكيف الصنع الكريم ودافع — الخطب العظيم وواهب الاحسان

في كل أمر للمهيمن حكمة — أعيت على الاذكار والا ذهان

"تمام حمد خدائے رحمٰن کے لیے ہے جو ایمان کی مدد کرنے والا اور دشمن سے بچانے والا ہے۔ جو بڑے بڑے مصائب دور کر کے احسان اور بھلائی کرنے والا ہے ہر ایک بات میں اس محافظ کی حکمت مضمر ہے جس کے ادراک سے فکر و ذہن عاجز ہے۔"

بقیۃ السیف نے راہ گریز اختیار کی، اور رومی مقتول بادشاہ کی لاش کو مسلمانوں نے ایک چوبی تابوت میں رکھ کر الحمرا کی فصیل پر باب یعقوب کے پاس جو شہر میں جاتے ہوئے بائیں سمت ملتا ہے لٹکا دیا تا کہ اس فتح کی عام شہرت ہو اور اس فخر کی یاد تا دیر قائم رہے۔

غرض معزول سلطان نے وفات پائی اور امیر اسمٰعیل کے لیے فضا صاف اور زمانہ موافق ہو گیا، لوگ عام طور سے متحد ہو گئے اور ان میں جہاد کی روح پیدا ہو گئی، امیر اسمٰعیل نے رجب ۷۲۴ھ میں دشمن کے ملک پر چڑھائی کی، اور حصن اشکر شجار پر فوج کے پرے جمائے جو بسط کے سرے پر عرض میں واقع ہے، امیر نے اس کا محاصرہ کر کے جنگ شروع کی، اور ایک بہت بڑے آلہ سے جو نفط سے بنا تھا لوہے کے آتشیں گولے مضبوط برجوں پر پھینکے جن کے شرارے اڑ اڑ کر محصورین کے حلقے میں پہنچے، ان لوگوں سے جن کی آواز آسمان کی کڑک کے مانند تھی محصورین کو بہت نقصان پہنچا اور خدا نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈال دیا کہ وہ ہاتھ باندھ کر سیدھے امیر کے پاس چلے آئے اور چار و نا چار اطاعت قبول کر لی، یہ واقعہ ۲۴؍ رجب کا ہے امیر اسمٰعیل نے اپنے جہاد کا مرکز شہر سے باہر قائم کیا تھا، اور خندق کھودنے میں اس نے بھی شرکت کی تھی، فتح یابی کے بعد وہ یہاں سے واپس ہوا۔

اس جنگ سے مسلمانوں کو بے شمار برکتیں حاصل ہوئیں، اور اندلس کے مشرقی علاقے میں اہم فوائد ظاہر ہوئے، شعرا نے اس جنگ کی فضیلت نمایاں کرنے اور شہرت دینے کے لیے قصائد لکھے۔

۱۰؍ رجب ۷۲۵ھ میں امیر نے پورے ساز و سامان فوج اور رضا کاروں کی فراوانی کے ساتھ جہاد

کے لیے مرتنش کا رخ کیا، آب و ہوا کے لحاظ سے یہ ایک اچھا اور بڑا شہر تھا، ان حملہ آوروں کے پہنچتے ہی وہاں ہر طرف تہلکہ پڑ گیا اور تمام لوگ ایک جگہ مجتمع ہو گئے، حملہ آوروں نے کمانوں میں تیر جوڑے اور شہر کے دروازے کی طرف چلائے، مگر سامنے بڑے بڑے درخت اور انگور کی کاشت کا ایک دریا حائل تھا اس لیے پہلے ان کو تباہ و برباد کرنا چاہا، مگر ان کے محافظین باہر نکل کر کٹ مرنے کے لیے تیار ہو گئے، اور برابر ان کی حمایت اور حفاظت پر تلے رہے اور حملہ آوروں کو اندر جانے سے باز رکھا، تاہم انھیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی، اور گوانگوری کاشت کا دریا حائل تھا مگر حملہ آور شہر پناہ کی دیواروں پر چڑھ گئے اور سوار ہو کر امیر کو دروازے پر طلب کیا، چنانچہ وہ پورے غلبہ کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، یہاں کے باشندوں نے قلعہ میں جا کر پناہ لی، امیر وہاں بھی بزور داخل ہو گیا اور حملہ آوروں کے سامنے عورت، مرد، بچہ اور بوڑھا جو آیا قتل ہوا، امیر عدیم المثال ظفر اور نصرت کے ساتھ ۲۴ر رجب مذکور کو غرناطہ واپس آیا۔

وفات:

جب امیر اسمٰعیل مرتنش سے واپس آیا تو وہ ایک رئیس محمد ابن اسمٰعیل سے جو اس کا برادر عم زاد اور صاحب جزیرہ کے عرف سے مشہور تھا کسی بات سے خفا ہو گیا، اور بہت سختی سے دھمکیاں دیں جس سے وہ بھی طیش میں آ گیا اور ارباب دولت اور خدم و حشم کے روبرو باب قصر میں امیر کو قتل کر دیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ امیر ہر طرح سے مطمئن اور فوج و طاقت کے لحاظ سے غالب تھا، قتل کا واقعہ دوشنبہ کو مرتنش سے واپس آنے کے تیسرے دن پیش آیا، اس سے پہلے امیر نے اپنے تمام ملازمین اور رشتہ داروں سے حکومت کے متعلق ایک معاہدہ کیا تھا۔

قتل کا واقعہ یوں پیش آیا کہ امیر مجلس عام میں شرکت کے لیے دورویہ صفوں سے گزر رہا تھا کہ قاتل جھپٹ کر قریب آیا اور خنجر سے جسے ہاتھ میں چھپا رکھا تھا امیر پر تین وار کیے، ایک وار ہنسلی سے اوپر گردن کے پاس لگا جس سے وہ فوراً بیہوش ہو کر گر پڑا، وزیر بکر نے شور مچایا تو اس پر بھی قاتل کے ساتھیوں کی تلواریں برس پڑیں، ایک ہنگامہ رستخیز ہو گیا۔ ہر طرف تلواریں نیام سے باہر نکل آئیں، لوگ امیر کو قاتل سے چھڑانے میں مشغول ہو گئے، کچھ وزیر کی طرف متوجہ ہوئے اور کچھ لوگ موقع پا کر امیر کو یہاں سے اٹھا لے گئے مگر جب انھیں معلوم ہوا کہ امیر زخم کے صدمے سے جاں بحق تسلیم ہو چکا ہے تو وہ حیران ہو کر بھاگنے لگے، مگر ان کے راستے بند تھے، یہ جہاں پہنچتے تہ تیغ کیے گئے اور جو لوگ بالکل بے قصور تھے وہ بھی سوء ظن کی بنا پر ماخوذ ہوئے اور ان کی آزمائش کی گئی، غوغائیوں نے لوگوں کے گھر لوٹے، اور ان کے اعضا دیواروں پر لٹکائے یہ دن بہت سخت، اور یہ منزل نہایت مشکل تھی، بادشاہ قصر کے ایک مکان میں پڑا تھا، اس میں کچھ کچھ جان باقی تھی اور وہ اس وجہ سے کہ کٹی ہوئی شریان کے منہ پر عمامہ کا پیچ لپٹ گیا تھا، جس وقت عمامہ سر کا خون جاری ہوا بقیہ جان بھی نکل گئی، قتل کے واقعے کے بعد امیر اسمٰعیل کے فرزند امیر ابوعبداللہ کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کی، جو بجائے خود ایک مشہور واقعہ ہے۔

وفات کے دوسرے دن سہ شنبہ کی تاریک شب میں قصر کے باغیچے میں امیر اسمٰعیل اپنے جد کے پہلو میں دفن کیا گیا، قبر پر انتہائی کمال اور استحکام کے ساتھ رنگسازی، نقاشی، اور گل کاری کی گئی جس کا وصف احاطۂ تحریر سے باہر ہے، اور قبر کے سرہانے سنگ رخام کی لوح پر شیخ کا حسب ذیل کلام افتتاحی کلمات کے بعد کندہ کیا گیا:

یہ مشہور سلطان کی قبر ہے جو شہروں کا فاتح، دین اسلام کا حامی، آبائی طریقوں کا زندہ کرنے والا، امام عادل، بہادر سردار، حرب اور محراب کا رئیس، پاک دامن پاک انساب، جہاد کی تلوار، بلاد کا نور، ایمان کی نصرت میں شمشیر بکف، دل میں خدا سے خائف اور راہ الٰہی کا مجاہد تھا اور فضل خداوندی سے وہ ہمیشہ منصور رہا کون؟ یعنی:

''امیر المسلمین ابوالولید بن الہمام الاعلیٰ الطاہر الذات والفخار، الکریم المآثر والآثار، کبیر الامامۃ النصریۃ، وعماد الدولۃ الغالبیۃ، المقدس المرحوم ابی سعید فرج بن علم الاعلام وحامی حمی الاسلام، ضوالامام الغالب، وظہیرہ العلی المراتب المقدس المرحوم ابوالولید اسماعیل بن نصر۔''

خدا اس کی روح کو پاک اور اپنے باران رحمت سے سیراب فرمائے، اور اسے جہاد وشہادت کا نفع بخش کر مزید احسانات سے ابدی حیات عطا فرمائے، امیر مرحوم نے جہاد کا پورا پورا حق ادا کر کے بلاد کے فتح کرنے میں خدا کی تائید حاصل کی، اس نے جہاد میں ہزاروں کو تہ تیغ کیا جس کا اجر اسے قیامت میں ملے گا، جب خدا کے حکم سے اس کی اجل آئی تو اس کی عمر نیک عمل پر ختم ہوئی، اور خدا نے اسے اپنے کرم اور ثواب کی طرف کھینچا، اس وقت بھی اس کے کپڑے جہاد کے غبار سے آلودہ تھے، اس کی شہادت نے اس کا قدم شہدائے ملوک کی جماعت میں راسخ کر کے اس کی سعادت کا جھنڈا بلند کر دیا۔

امیر اسمٰعیل کی پیدائش ۱۷؍شوال ۶۷۷ھ میں جمعہ کی صبح کی مبارک ساعت میں ہوئی، بروز پنجشنبہ ۲۷؍شوال ۷۱۳ھ میں اس کی بیعت لی گئی، اور بروز دوشنبہ ۲۶؍رجب ۷۲۵ھ میں اس نے جام شہادت نوش کیا۔ پاک ہے وہ ذات جو حقیقی مالک ہے اور مخلوق کی فنا کے بعد صرف اسی کو بقا ہے۔

ابوبکر بن ابراہیم مسبوقی صحراوی

ابوبکر نام ہے، امرائے مرابطین میں سے ہیں، اور علی بن یوسف بن تاشفین کے بہنوئی تھے، ان کا فرزند یحییٰ تھا جو علی بن یوسف کی بہن کے بطن سے تھا، اسی لیے ابوبکر کی کنیت ابو یحییٰ ہے، یہ بہت سخی مشہور تھے۔

ابوبکر فضل وکرم میں ضرب المثل، سخاوت کے علم بردار اسلام اور عہد جاہلیت کے ارباب جودوکرم کے سردار، اور بے انتہا باحیا اور شجاع تھے، بزم فضائل میں انھیں نمایاں حیثیت حاصل تھی، مشہور حکیم ابوبکر بن صائغ ان کے وزیر اور مقرب خاص تھے، جس کے باعث امیر ابوبکر کی حکومت خوش اسلوبی سے قائم رہی، اور ان کی قدر ومنزلت میں چار چاند لگ گئے، امیر ابوبکر کے فیاضانہ واقعات جو وزیر ابن صائغ کے ساتھ پیش آئے بہت مشہور ہیں۔

ولایت:

امیر ابوبکر ۵۰۰ھ میں غرناطہ کے والی بنائے گئے، پھر وہ سرقسطہ منتقل کر دیے گئے، اور جب مستعین بن ہود نے روطہ پر چڑھائی کی تو یہ دوبارہ سرقسطہ میں آئے اور یہاں شاہی آداب ومراسم قائم کر کے عیش ونشاط کی محفل گرم کی، اس وقت ان کی حالت یہ تھی کہ شاہی لباس میں ملبوس ہو کر جلوہ افروز ہوتے اور ندیموں کے روبرو اپنا تاج رکھ دیتے تھے۔

جب رومی طاغیہ نے سرقسطہ پر حملہ کیا تو وہ اس معرکہ میں ہلاک ہوئے اور یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب وہ صحرا کو ترک کر چکے تھے۔

ایک مؤرخ کا بیان ہے کہ امیر ابوبکر صحرا کے بعض قبائل کے سردار تھے، اور ان کے برادر عم زاد ایک نہایت بدشخص تھے، ایک روز ابوبکر اپنے بھائی کے پاس خیمے میں گئے، وہاں ان کی بیوی بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں ان کا حسن دیکھ کر ابوبکر کا دل ان کی زلفوں میں الجھ گیا، وہ خیمہ میں اس لیے گئے تھے کہ اپنے بھائی سے ایک دوست کو یہاں لانے کی اجازت طلب کریں، لیکن اس دوست کا نام لیتے وقت بھول کر اپنے بھائی کی بیوی کا نام لیا جن پر ان کا دل ابھی آچکا تھا، ان کے بھائی نے بڑی دیر کی خاموشی اور غور وفکر کے بعد کہا: ''میں اسے

نہیں پہچانتا اور یہاں آنے کی اسے اجازت بھی نہیں دی جا سکتی ہے'' یہ سن کر ابو بکر کے ہوش اڑ گئے، ان کی کھوئی ہوئی عقل واپس آئی اور اب انھیں احساس ہوا کہ کتنی بڑی قبیح حرکت کے وہ مرتکب ہوئے، چنانچہ وہ خیمے سے نکلے اور اونٹ پر سوار ہو گئے، ان پر اتنی ندامت طاری ہوئی کہ ترک وطن گوارا کیا، دوستوں کی ایک مختصر جماعت کے ہمراہ شب در روز چلتے ہوئے سجلماسہ پہنچے جو ان کے ایک برادر عم زاد علی بن یوسف کی قلمرو کا پہلا علاقہ تھا، جب علی بن یوسف کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو اس نے ان کے حقوق اور مرتبہ کے خیال سے اپنی بہن سے ان کا نکاح کر دیا، اور انھیں غرناطہ کا والی بنایا، اور پھر سرقسطہ کی ولایت پر منتقل کر دیا، یہ شہر مشرقی اندلس میں واقع ہے اور بنو ہنود کا یہ دارالحکومت تھا۔

فیاضی کے بعض واقعات:

کہتے ہیں کہ جب ابو بکر سجلماسہ کے قریب پہنچے تو چونکہ وہ بالکل اجنبی تھے، ان کے حالات سے کوئی واقف نہ تھا، اس لیے وہ سواد شہر میں ایک درخت کے نیچے اترے، وہ کسی کو یہاں نہ جانتے، اور کوئی ان کے پاس آتا بھی نہ تھا، ایک روز ایک لوہار وہاں پہنچا جس کے پاس ایک بکری تھی، اس نے اپنی بکری ذبح کر کے ان کی دعوت کی، اور ان سے اپنا تعارف کرایا، ابو بکر کو اس واقعے سے بہت تعجب ہوا، جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو ابو بکر نے لوہار سے پوچھا اگر تم بھائی بن کر ہمارے مرجع امید تک ساتھ چلنا پسند کرو تو ہماری ملاقات تمھارے لیے باعث ستائش ہوگی، آہنگر رفاقت کے لیے تیار ہو گیا، اور ساتھ ہو کر ابو بکر کی خدمت کرتا چلا، جب یہ قافلہ مراکش کے قریب پہنچا، تو ابو بکر نے علی بن یوسف بن تاشفین سے اپنا تعارف کے بعد خدمت میں حاضری کی اجازت چاہی، علی نے ایک عمدہ گھوڑا ایک جوڑا، اور ہزار دینار کا ایک توڑا ابو بکر کو بھیجا، انھوں نے یہ سب چیزیں آہنگر کو دے دیں، وہ ابو بکر کی اس فیاضی کو دیکھ کر مبہوت ہو گیا، جب علی کو اس کے فرستادہ شخص سے اس چشم دید واقعے کی اطلاع ہوئی تو اس نے ایک اور گھوڑا، ایک خلعت، اور ہزار دینار ابو بکر کے پاس دوبارہ بھیجے۔

جب ابو بکر شہر مراکش میں داخل ہو کر علی بن یوسف سے ملے تو اس نے انھیں ایک مکان میں اتارا، ابو بکر نے یہاں اپنے ساتھ آہنگر کو بھی رکھا اور اپنے مال میں جو ان کے پاس بھیجا گیا تھا اس کو بھی شریک کر کے اسے دولت مند بنا دیا۔

جب ابو بکر سرقسطہ کے والی بنائے گئے تو انھوں نے وزیر حکیم ابو بکر بن صائغ کو اپنا مقرب خاص بنا کر ہمیشہ ان پر الطاف کی نظر رکھی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ ابن صائغ سرقسطہ کی مجلس میں ابو بکر کے پاس نہ آئے، دوسرے روز جب وہ علی الصباح حاضر ہوئے تو ابو بکر نے ان سے پوچھا حکیم صاحب! آپ کہاں چلے گئے تھے؟ ابن صائغ نے جواب دیا، اے آقا! میں مرض سودا اور غم میں مبتلا ہو گیا تھا، یہ سن کر ابو بکر نے ایک نوجوان شخص سے جو وہاں قریب ہی

کھڑا تھا اشارہ سے عجمی زبان میں کچھ کہا، وہ اسی وقت اشرفیوں سے بھری ہوئی ایک کشتی لایا جس میں قسم قسم کے عمدہ پھول بھی تھے، اور حکیم اب صایغ کے حوالہ کی، ابن باجہ نے (حکیم ابن صایغ کا دوسرا نام ہے) کہا، یا مولائی! جالینوس کو بھی یہ طبی نسخہ معلوم نہیں تھا، ابن صایغ کی اس بات سے ابوبکر ہنس پڑے۔

ایک روز ابن صایغ نے ابوبکر کو مدحیہ اشعار سنائے، اس وقت شراب کا دور چل رہا تھا اور ابوبکر نشۂ طرب میں از خود رفتہ تھے، ابن صایغ نے قسم کھائی کہ میں سیم وزر پر قدم رکھتا اپنے گھر جاؤں گا، ابوبکر نے خدام سے کہا کہ ابن صایغ کے راستہ میں قیمتی چیزیں ظروف میں ڈال کر بھرتے جاؤ یہاں تک کہ وہ ان پر قدم رکھتے ہوئے اپنے گھر تک پہنچ جائیں، اس بات سے حکیم ابن صایغ کے رفقاء کو حسد پیدا ہوا مگر ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ بھی اس قسم کا مطالبہ کریں۔

ایک دفعہ امیر ابوبکر نے سفر کا ارادہ کیا، اور اپنے ندیموں کو حکم دیا کہ وہ بھی ساتھ چلیں، حکیم ابن صایغ نے بھی سفر کی تیاری کی، اور بار برداری کے عمدہ اور زرد سات خچروں پر قبائیں، خیمے، کپڑے، فرش، اور مال وزر بار کیا، جب ابوبکر مقام مقبرہ میں فروکش ہوئے تو یہ خچر ان کے سامنے سے بڑی اچھی ہیئت میں گزرے، ابوبکر نے ہم بزموں سے پوچھا کہ یہ خچر کس کے ہیں؟ اور ہمارے آدمیوں میں ایسا کون شخص ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ یہ خچر سرقسطہ کے حکیم ابن صایغ کے ہیں، ان پر ساز وسامان کے علاوہ ایک ایک ہزار دینار سرخ لدے ہوئے ہیں، یہ سن کر ابوبکر بہت مسرور ہوئے اور پھر پوچھا کیا تم سچ کہتے ہو؟ لوگوں نے کہا، جی ہاں! ابوبکر نے خزانچی کو حکم دیا کہ ابن باجہ کو پانچ ہزار دینار دے دو تاکہ بارہ ہزار پورے ہو جائیں، میں نے کئی دفعہ ان کی زبان سے اس بات کی تمنا کرتے ہوئے سنا ہے، پھر حکیم ابن صایغ سے بلا کر پوچھا، حکیم صاحب! یہ تیاری کیسی ہے؟ ابن صایغ نے جواب دیا، آقا! یہ سب چیزیں حضور کی عطیات اور موہوبات ہیں، بندہ کو معلوم ہوا کہ حضور کو ان عطیات کے اظہار سے مسرت ہوتی ہے، یہ سن کر ابوبکر خوش ہوئے۔

ابوبکر کے اس قسم کے واقعات بکثرت ہیں، خدا ان پر رحمت نازل فرمائے۔

کہتے ہیں کہ جب امیر ابوبکر ۵۰۰ھ میں غرناطہ کے والی مقرر ہوئے تو کسی مشتبہ امر کی وجہ سے وہ اپنی قوم کے خلاف ہو گئے، ان کی قوم بھی کشیدہ ہو کر ان کے خلاف معرکہ آرا ہوئی اور انھیں گرفتار کر کے علی بن یوسف کے پاس بھیج دیا، اس نے ان کی خطا معاف کر دی، اور انھیں ان کے عہدے پر برقرار رکھ کر سرقسطہ میں منتقل کر دیا، یہ ملاحی کا بیان ہے لیکن میرے نزدیک یہ واقعہ ابوبکر کا نہیں ہے، بلکہ جس شخص کے ساتھ یہ ماجرا گزرا وہ ابوبکر بن علی بن یوسف بن تاشفین تھے۔

۵۱۰ھ میں ابوبکر نے سرقسطہ میں وفات پائی، وفات سے پہلے رومی طاغیہ کی چیرہ دستیوں سے بہت تنگ دل ہو گئے تھے، جس وقت ان کی موت کی خبر امیر ابواسحاق ابراہیم بن تاشفین کو پہنچی جو مرسیہ کے والی تھے تو وہ فوراً سرقسطہ آئے، اور یہاں کے تمام معاملات کی دیکھ بھال کی اور نظم ونسق کو درست کر کے مرسیہ واپس گئے۔

حکیم ابوبکر بن صائغ نے ابوبکر کے چند مرثیے لکھے، جن میں ذیل کے اشعار مشہور ہیں:
''سلام زیارت اور ابر بہاری کا پہلا پانی اس دوسری قبر پر نازل ہو جس کی ہم پھر زیارت نہیں کریں گے کیا یہ سچ ہے کہ ابوبکر قضا کر گئے اور اب تم ان کی ڈیوڑھی پر وفود کی جماعت وارد ہوتے نہیں دیکھو گے اگرچہ ان کی قبر سے یہ قبریں مانوس ہو گئی ہیں، مگر ان کے ملک اور محل وحشت زدہ ہو رہے ہیں۔''

بادیس بن حیوس بن ماکسن صنہاجی

بادیس نام، ابومناد کنیت، اور حاطب مظفر باللہ ناصر لدین اللہ لقب تھا۔

بادیس ایک طرف جری، سرکش، جابر، اور شر انگیز تھا، دوسری طرف شجاع، مدبر، دانش مند، صابر، صاحب رائے اور بلند ہمت تھا، تیغ زنی، غارت گری، چقماق شر سے شعلہ فشانی، اور مال و زر کی پس اندازی میں مشہور اور حریص تھا، اس کے عہد میں حکومت موقر اور القاب شاندار ہو گئے اور رعایا کو امن ملا، اس کی تلوار کے سائے میں آبادی بڑھی، اس کے خوف سے ملک میں اطاعت پھیلی، اس کے رعب سے ہر جگہ نگرانی قائم ہوئی، اور اس کے ملک کی وسعت زیادہ ہوگئی۔

بادیس خوش قسمت تھا فتح یابی اور دشمنوں پر نصرت اس کا طرۂ امتیاز تھی، رؤسا اس کی مصالحت کو غنیمت جانتے، اور اعداء اس کے ساتھ جنگ کرنی پسند نہیں کرتے تھے۔

ابن عساکر لکھتے ہیں کہ بادیس کی کنیت ابومسعود تھی، وہ دور اندیش اور گرد و پیش کے علاقے کا حامی تھا، خطبے میں مالقہ کے علوئین کا نام لیتا، اور ان کے لیے دعائیں کرتا تھا، جب ادریس بن حمود کا انتقال ہو گیا تو وہ ۴۸ھ میں مالقہ کا بھی حکمران بن گیا۔

فتح اپنی کتاب قلائد میں بیان کرتے ہیں کہ بادیس بن حیوس غرناطہ کا بادشاہ تھا، اپنے فریق کو تباہ کرنا، عدل و انصاف سے گریزاں رہنا، اور اللہ تعالیٰ پر بے باکی سے جرأت کرنا اس کا شیوہ تھا، وہ انجام پر بغیر غور و فکر کیے جو چاہتا کر گزرتا، وہ زبان سے پہلے نوک سنان سے کام لیتا تھا، اور اس کا شر اس کے خیر پر غالب تھا، وہ گناہوں کا مرتکب ہوتا اس پر کئی راتیں گزر جاتیں مگر وہ نادم نہ ہوتا جب وہ پانی پینا چاہتا تو خونی چاہ سے اپنی پیاس بجھاتا، وہ مکاروں سے زیادہ مکار، اور مجرموں سے زیادہ مجرم تھا، ہر وقت اپنے مقاصد میں شعلۂ جوالہ، اور نواح و مصافات کا طالب رہتا تھا، شتاب یا درنگ کسی کا اس پر داؤ نہیں چلا، اور اس کے جوار میں بغیر خوف کے کوئی شب باش نہیں ہوا۔

بادیس کے چند واقعات:

زہیر عامری اور اس کے رفقاء کے ساتھ بادیس کی جو جنگ ہوئی اسے زہیر کے نام کے ساتھ دیکھنا

چاہیے، وہاں کچھ واقعات درج کیے گئے ہیں، نیز بادیس کا مالقہ جانا، وہاں ابن عباد کے لشکر سے معرکہ آرا ہونا، اس شہر پر تسلط پانا، اور یہاں کے باشندوں کا قلعہ بند ہو کر فریاد کرنا، یہ وہ واقعات ہیں جو سب کو معلوم ہیں، اور اس قدر مشہور ہیں کہ انھیں طول دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

بادیس کا ابونصر بن ابوالسفری امیر رندہ مشدی کو قتل کر کے ابن عباد کی طرف واپس آنے کا واقعہ ابن حبان نے بالاستیعاب بیان کیا ہے، نیز وہ بادیس کی بربریت اور قساوت قلبی کا ایک واقعہ ابوبکر رستشانی فقیہ کی روایت سے لکھتے ہیں کہ ایک صادق اور ثقہ تاجر شہر غرناطہ میں بادیس بن حیوس کے پاس تھا جس کا بیان ہے کہ بادیس نے ابوبکر والی تاکرنا پر بڑے بڑے مصائب توڑے، اور اس کی عصبیت کا خون اتنا جوش زن ہوا کہ اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، چیخیں ماریں اور شراب جس پر وہ بے صبر تھا چھوڑ دی، اور اس کی نفسانی خباثت نے یہاں تک اسے وہم میں مبتلا کر دیا کہ اس کی رعایا بھی ابونصر کی طرح مکر وفریب سے آلودہ نظر آنے لگی، اس لیے اس نے تمام اہل غرناطہ کو ایک جگہ مجتمع کر کے غلاموں کے ذریعے سے ایک ایک کا گلا گھونٹ کر اپنے نفس کو محفوظ کرنا چاہا چنانچہ اس نے یہ تدبیر سوچی کہ آئندہ جمعہ کو جب سب لوگ جامع مسجد میں جمع ہوں تو وہ اپنی مجوزہ تدبیر اور قوت کو کام میں لائے، اس نے اپنے یہودی وزیر یوسف بن اسماعیل سے بھی جو نہایت مدبر تھا اور جس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا تخلیہ میں رائے لی، اور اخفائے راز کی تاکید کی، اور دل میں مصمم ارادہ کیا کہ اگر وزیر نے اس خیال کی تائید نہ بھی کی پھر بھی وہ اپنے ارادے کو پورا کرے گا، وزیر نے بادیس کو اس ارادے سے روکا، اور اس خیال کی غلطی ظاہر کی، اور اس نے اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے سوچنے اور نرمی اختیار کرنے کی استدعا کی، اور کہا فرض کیجیے کہ آپ ان لوگوں کے ساتھ جو نظر کے سامنے ہوں گے اپنا ارادہ پورا کر لیں گے، گو اس میں بھی خطرات ہیں، مگر پایۂ تخت کے تمام لوگوں کا کس طرح احاطہ کریں گے، کیا یہ خیال ہے کہ وہ ان مصائب کو بھول کر اور مطمئن ہو کر اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہیں گے؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ پوری جمعیت کے ساتھ منظم ہو کر اور تلواریں لے کر آپ کے مقابلہ میں آ کھڑے ہوں گے، اور آپ کو ناچار اس متلاطم دریا میں فوج لے کر کودنا پڑے گا، بادیس نے وزیر کی نصیحت نہیں مانی اور پھر اپنا راز اس سے بھی مخفی رکھ کر آئندہ جمعہ کو قتل عام کے لیے سواروں کو اسلحہ سے آراستہ کیا بالآخر یہ راز افشا ہو گیا، جس سے شہر میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہودی وزیر نے چند عورتوں کو خفیہ طور سے غرناطہ کے سربرآوردہ مسلمانوں کے پاس جن سے ان کی شناسائی تھی بھیجا تاکہ وہ جمعہ کو مسجد میں نہ آئیں بلکہ اس روز کہیں روپوش ہو جائیں، یہ خبر اتنی پھیلی کہ اکثر لوگ جمعہ کی نماز میں شریک نہ ہوئے صرف عوام میں سے چند آدمی بربری مشائخ کے ساتھ آئے، اور کچھ وہ لوگ مسجد میں گئے جو اصل واقعہ سے بے خبر تھے، بادیس کی فوج مسلح قصر کے چاروں طرف تیار کھڑی تھی اس کو جب مسجد میں لوگوں کے نہ آنے کی اطلاع ملی تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا، اور بہت رنجیدہ ہوا، اور اسے یقین ہو گیا کہ وزیر نے اس راز کو افشا کیا ہے، وزیر نے افشائے راز سے انکار کیا، اور کہا یہ خبر لوگوں سے کس طرح پوشیدہ رہ

سکتی تھی، آپ پر نہ کسی دشمن نے حملہ کیا اور نہ کسی سفر میں آپ کے جانے کا تذکرہ تھا، باوجود اس کے تمام فوجیں مسلح کھڑی تھیں، اس سے لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہوگا کہ آپ کا ارادہ ان کے قتل کا ہے۔

اے امیر! درحقیقت اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ بڑی مہربانی کی کہ لوگوں کو آپ سے متنفر ہونے کا موقع نہیں دیا، اور ان کے شر سے آپ کو محفوظ رکھا۔

اے ہمارے سردار! اگر آپ اس مسئلے میں دوبارہ غور فرمائیں تو عنقریب ہماری رائے کی ستائش فرما کر ہماری نصیحت کو قابل رشک قرار دیں گے، اس موقع پر صنہاجہ کے ایک شیخ نے بھی وزیر کی تائید کی، بالآخر بادیس نے کچھ دیر کے بعد اپنی رائے بدل دی اور اللہ تعالیٰ نے اسے شرح صدر عطا فرمایا۔

اب یہاں سے بادیس کے وزیر کی بعض باتوں کی تعریف بیان کی جاتی ہے ابن عذار مراکشی اپنی کتاب ''البیان المعرب'' میں لکھتے ہیں کہ بادیس نے اپنے باپ کے کاتب اور وزیر ابن نغزلہ یہودی کو نیز اس مذہب کے تمام کارندوں کو اپنے اپنے عہدوں پر بحال رکھا، ان لوگوں نے بادیس کے عہد میں بہت کچھ جاہ و مرتبہ حاصل کر کے مسلمانوں پر بڑی دست درازیاں کیں۔

ابن حبان کہتے ہیں کہ یہ وزیر لعین بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے دور تھا، مگر فی ذاتہ علم، حلم، فہم، ذکاوت، امانت، ثابت قدمی، تدبیر اور مکر میں تمام لوگوں سے کامل تر تھا، اسے اپنے نفس پر پوری قدرت حاصل تھی، اخلاق وسیع رکھتا تھا، زمانے کو خوب پہچانتا تھا، دشمنوں کے ساتھ مدارات کرنا اور اپنے حلم سے ان کی دشمنی زائل کرنا اسی کا کام تھا، ارباب قلم، اور اصحاب تعلیم کی طرف اس کی توجہ بہت مبذول رہتی تھی، اس نے عربی اتنی سیکھی تھی کہ اس زبان میں غور وفکر کرتا، کتابیں پڑھتا، اور اصول کا مطالعہ کرتا تھا، جس سے اس کے قلم اور زبان میں روانی آ گئی تھی، جب کبھی اسے ذاتی یا سرکاری کوئی ضرورت پیش آئی تو وہ اسی زبان میں لکھتا تھا، تحریر میں وہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد، محمد رسول اللہ ﷺ کی نعت و درود، اور دین اسلام کی تعریف و فضائل بیان کر کے اپنے مدعا کو ظاہر کرتا تھا، عربی انشا پردازی میں متوسط درجے کے مسلمان انشا پردازوں کے برابر تھا، علوم ریاضی سے واقف، علم نجوم میں نکتہ رس، اور اس نکتہ رسی سے تمام ریاضی دانوں پر فائق، علم ہندسہ اور علم منطق سے آگاہ، اور جدول کے ایک ایک مسئلے سے مطلع تھا، اور گو وہ کم سخن تھا مگر ذکی تھا، اس کی نظروں میں ظاہری اسباب کی وقعت نہ تھی، وہ ہمیشہ فکر میں غلطاں رہتا تھا، اور کتابوں کے جمع کرنے کی اسے دھن لگی رہتی تھی۔

محرم کے دوسرے عشرہ ۴۵۹ھ میں ابن نغزلہ یہودی نے انتقال کیا، یہودیوں نے اس کا جنازہ اٹھایا، انکسار سے اس کے سامنے اپنی گردنیں جھکائیں اور اس پر نہایت آہ وزاری سے ماتم کیا۔

ابن نغزلہ یہودی نے اپنے فرزند ابوحسین یوسف کی تعلیم و تربیت اور کتابوں کے مطالعے کے لیے اکناف ملک سے ادیب اور معلموں کو فراہم کیا اور ان سے یوسف کو فن کتابت کی تعلیم دلا کر اس کو اپنے ابن مخدوم بلکین کا کاتب بنا دیا تھا، تاکہ قواعد ملازمت کے تحت آئندہ وہ اس کی جگہ لے سکے، چنانچہ جب اسمٰعیل کا انتقال

ہوا تو بادیس نے یوسف کو اپنا مقرب بنایا اور اس پر اپنی خوشنودی کا اظہار کر کے باپ کا عہدہ اس کو عطا کیا۔

صاحب البیان لکھتے ہیں کہ وزیر اسمٰعیل نے مرتے وقت ایک فرزند چھوڑا جس کا نام یوسف تھا، اس یہودی بچے نے یہودیت کی ذلت نہیں دیکھی دین کی قدر سے بالکل ناآشنا تھا، وہ بہت خوبصورت تھا، اور اس کی نظر تیز تھی، اس نے مختلف حالات میں نہایت جدوجہد سے خدمت انجام دی، مال جمع کرنے اور وصول کرنے میں بڑی کوششیں کیں، اور حکومت کے تمام خدمات پر یہودیوں کو مامور کر دیا، جس سے امیر کے نزدیک اس کا رتبہ اور بڑھ گیا۔

اس یہودی نے محل سرا میں کثرت سے عورتوں اور کمسن بچوں کو جاسوسی کے لیے مقرر کیا تھا اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا جس کے باعث اگر کوئی شخص محل میں سانس بھی لیتا تو اس کی خبر یوسف کو ہو جاتی تھی۔

یوسف نے بادیس کے سامنے اس کو زہر دینے کی تہمت خود اس کی اکثر کنیزوں اور خادموں پر رکھی، اور اسی سلسلے میں بلکین کے ایک قریبی رشتہ دار فائد نامی کو جو خدمت اور وجاہت میں اس یہودی کا ہمسر تھا باہمی چشمک کی بنا پر قتل کرا دیا، اور دوسرے لوگوں کو بھی اس الزام کا ہدف بنایا، یوسف یہودی کی ان حرکات سے عام لوگوں کے دلوں میں اس کے خلاف غیظ وغضب پیدا ہوا، ان کی زبانوں سے بددعائیں نکلیں، اور زاہد ابواسحٰق البیری نے ایک مشہور قصیدہ لکھ کر عوام کے جذبات بھڑکائے، اتفاق وقت کہ اس زمانے میں صنہاجی جماعتوں نے غرناطہ پر چڑھائی کر دی، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ زاہد ابواسحٰق البیری کی استدعا پر یہ حملہ ہوا تھا کہ صنہاجی مسلہ شہر المریہ کے امیر تک جس نے ان جماعتوں کو حملہ کے لیے بھیجا تھا پہنچ جائے غرض ایک طرف یہ حالات درپیش تھے، اور دوسری طرف بادیس اپنی بدکرداریوں میں مبتلا تھا اور شراب اس کے منہ سے چھوٹتی نہ تھی، جب ان باتوں کی اطلاع صنہاجیوں کو ہوئی تو وہ عوام کو اپنے ساتھ لے کر یوسف یہودی کے گھر میں گھس گئے، وہ کسی گوشے میں چھپ گیا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ایک گھر میں جہاں کوئلے رکھے تھے چلا گیا، تاکہ کوئلوں سے اپنا منہ کالا کر کے لوگوں کو شناخت کا موقع نہ دے، مگر جس گھڑی اس کی شناخت ہوئی اسی وقت اس کا سر تن سے جدا کیا گیا، اور شہر غرناطہ کے ایک دروازے پر اسے سولی دی گئی، اس روز کثرت سے یہودی قتل ہوئے اور ان کے گھر لوٹے گئے، یہ واقعہ ۴۵۹ھ کا ہے۔

آج بھی یوسف اور اس کے باپ کی قبریں یہودیوں کی ملک کہی جاتی ہیں، یہودی بہ تواتر بیان کرتے ہیں کہ یہ دونوں قبریں باب البیرہ سے کچھ فاصلہ پر بخط مستقیم راستہ کی ایک جانب واقع ہیں، وہ بوسیدہ اور سخت پتھروں سے ڈھکی ہوئی ہیں، یوسف یہودی کا درجۂ ادب وعقل، اور عیش وتنعم میں بہت مشہور تھا۔

ہم نے اس یہودی کا تذکرہ بڑے بڑے ادبا اور افراد کے سلسلے میں اس لیے بیان کیا کہ بجز مذہب کے اور کوئی چیز اس کی مانع نہ تھی۔

ابن صیرفی کہتے ہیں کہ ابوالفضل جعفر ایک نوجوان شخص نے جو صداقت، عزت نفس، شجاعت اور

فیاضی کے اوصاف سے متصف تھے، مجھ سے بیان کیا کہ ایک روز بادیس ندیموں کے ساتھ قصر کی بڑی مجلس میں شراب کے دور سے لطف اندوز تھا، اور صقلبی خدام و غلام اس کے احکام کی بجا آوری کے لیے صف بستہ کھڑے تھے، دفعتہً کوئی ایسی خبر پہنچی جس کے سننے کے لیے بادیس مجلس سے اٹھ کر باہر گیا، اور جب واپس آیا تو اس کا چہرہ پژمردہ اور اس کی طبیعت مکدر تھی، تمام ندیم اس کیفیت کو دیکھ کر سہم گئے، اور ان کو یہ خوف ہوا کہ جانوں پر کوئی نئی آفت آنے والی ہے، بادیس نے پوچھا تم لوگ سمجھے کیا واقعہ ہے؟ سب نے جواب دیا واللہ ہمیں کچھ بھی خبر نہیں، اس نے کہا مرابطین دمنہ تک پہنچ گئے ہیں، یہ سن کر سب کا رنگ فق ہو گیا اور وہ بادیس کی نصرت، درازی عمر، اور بقائے دولت کی دعائیں کرنے لگے، مگر بادیس کی خاموشی سے یہ سب پھر خاموش ہو گئے، جب بادیس نے مجلس بے رنگ دیکھی، تو کہا، تمھیں اس واقعے سے کیا مطلب ہے؟ اپنا کام کرو، آج شراب کا دور چلے، کل دوسرا کام ہوگا، ابھی تو ہمارے اور مرابطین کے درمیان وسیع صحرا، اونچے پہاڑ، اور دریا کی موجیں حائل ہیں، گو وہ ضرور ایک دن ہمارے شہر پر قابض ہو کر ہماری اس نشست پر متمکن ہوں گے، مگر ہم میں سے کسی کے زمانے میں یہ واقعہ نہیں پیش آئے گا، البتہ ہمارے پوتے کو معزول کر کے قصر میں داخل ہوئے اور ایک ایک گوشہ کو دیکھا، میں بھی ساقط تھا، اور گشت کرتے ہوئے بادیس کی مجلس میں پہنچے تو یہاں وہی فرش بچھا جس پر بادیس نشست کرتا تھا اس وقت مجھے اس کی پیشین گوئی یاد آئی جس سے مجھے بے انتہا تعجب ہوا اور اس کا اثر میرے چہرے پر نمودار ہوا، امیر المسلمین نے میری طرف متوجہ ہو کر حال پوچھا، میں نے اصل واقعہ بیان کر کے بادیس کا قول نقل کیا تو وہ بھی متعجب ہوئے، پھر وہ ساتھ والوں کو لے کر مسجد میں گئے اور چند رکعتیں نماز پڑھ کر بادیس کی قبر پر ترحم کی ایک نگاہ ڈالی۔

ابوالقاسم بن خلف بیان کرتے ہیں کہ بادیس نے ۲۰/ شوال شب یکشنبہ کو ۴۶۵ھ میں وفات پائی، اور قصر کی مسجد میں پیوند خاک کیا گیا۔

مولف کہتا ہے کہ اب اس مسجد کا نشان تک مٹ گیا ہے مگر بادیس کی قبر ہنوز باقی ہے، جس کی چاروں طرف کٹہرے ہیں، ان کٹہروں میں دروازے لگے ہیں، اور ایک سکوت کا عالم یہاں طاری ہے، قبر کے گرداگرد سنگ رخام بچھا ہے، جس کا سلسلہ امیر مجاہد ابوزکریا یحییٰ بن غانیہ کی قبر تک چلا گیا ہے، جو بادیس کی قبر کے پہلو میں دولت موحدین کے عہد میں دفن کیے گئے۔

بادیس کی وفات کے بعد اس کے متعلق خلیفہ نے اپنی رائے بدل دی، اور اس کی سرکشی اور جبروت کے واقعات بھی پرانے ہو گئے، اور چونکہ انسان کی سرشت میں اوہام کی اطاعت اور گمراہیوں کی طرف میلان داخل ہے اس لیے آج کل اس کی قبر پر اہل حاجت اور مریضوں کی بھیڑ رہتی ہے، لوگ اپنے بیمار چوپایوں کو بھی وہاں لے جاتے ہیں، ازدحام اتنا رہتا ہے کہ حضرت معروف کرخی رحمہ اللہ اور حضرت ابو یزید بسطامی رحمہ اللہ کی قبروں پر بھی اتنی کثرت نہ ہوتی ہوگی۔

سب سے زیادہ عجیب وغریب واقعہ یہ ہے کہ اہل خیر میں سے ایک شخص نے جن کا عرف ابن باقی تھا اور جو بادیس کے گھر کی قلعہ قدمی والی مسجد میں امامت اور بچوں کو خوش نویسی کی تعلیم دینے کے لیے مامور تھے سلطان سے ایک رقعے میں اس کی اجازت طلب کی کہ جب وہ مرجائیں تو بادیس کے پہلو میں دفن کیے جائیں۔
بے شک خداوند کریم کا عفو اس سے کہیں وسیع ہے کہ بادیس جیسے شخص پر تنگی فرمائے، جس نے نفسانی خواہشوں میں حد سے زیادہ تجاوز کر کے اپنے رب کے حقوق کو ضائع کر دیا تھا۔

اگرچہ آج بادیس کے گھر کھنڈر ہو گئے ہیں، ان کی ہیئت بدل گئی ہے اور اس کے باغ لوگوں کی ملکیت میں تقسیم ہو گئے ہیں، تاہم یہاں بادیس کے جتنے مقامات ہیں وہ اب تک اسی کی طرف منسوب ہیں اور اب بھی اس کے واقعات زباں زد عام وخاص ہیں۔

ایک قصیدے میں بادیس کے بعض مشاہد اور مقامات کی طرف اشارہ کیا ہے، یہ قصیدہ چند فنون پر مشتمل ہے، اور اس کے اغراض عجیب وغریب ہیں، اگرچہ اس کتاب کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے وہ ضروری نہیں ہے تاہم اس سے زبان کو چٹخارہ اور فکاہات کا لطف حاصل ہوتا ہے، اس کا ایک شعر یہ ہے:

عسی خطرة بالركب يا حادي العيس   علی الهضبة الشماء من قصر باديس

''اے اونچے ٹیلے پر اونٹوں کو ہانکنے والے قصر بادیس کی طرف سے قافلہ پر خطرہ قریب ہو گیا ہے۔''

تاشفین بن علی بن یوسف

تاشفین نام ہے، باپ کے بعد عددہ کے امیر المسلمین بنائے گئے، ان کے عہد میں موحدین سے جنگوں کا سلسلہ برابر قائم رہا۔

ابن الوراق نے کتاب المقیاس میں اور دیگر مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ ۵۲۲ھ میں علی بن یوسف امیر لمتونہ نے جو مرابط کے نام سے مشہور تھے اپنے ایک بیٹے سیر کو ولی عہد قرار دے کر اپنی بقیہ زندگی میں تاج و تخت کا مالک بنا دیا، اور دوسرے بیٹے تاشفین میں اندلس کی گورنری کی اہلیت دیکھ کر ان کو غرناطہ، اور المریہ کا گورنر مقرر کیا، اور پھر قرطبہ کو بھی ان کے حدود گورنری میں داخل کر دیا۔

مولف کہتے ہیں کہ مؤرخین کا یہ کہنا کہ تاشفین میں اندلس کی گورنری کی اہلیت دیکھ کر ان کو غرناطہ کا گورنر مقرر کیا، اس قول سے ہماری توصیف کی جو شہر غرناطہ کی بزرگی کے متعلق ہے، بڑی شہادت ملتی ہے۔

تاشفین نے اندلس کے مصالح کا کافی لحاظ کیا، جس کے باعث انھوں نے اس سرزمین کی دوسری حکومتوں پر نصرت کی برکتیں حاصل کیں اور اس وقت ان کی قسمت نے بھی یاوری کی، مگر جب موحدین سے لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ان کی تقدیر برگشتہ ہوگئی۔

تاشفین نے اندلس میں عیسائیوں پر بڑی بڑی جنگوں میں فتح مندی پائی جس سے ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی، ان کی یہ کامیابیاں سیر کو جو ولی عہد تھا شاق گزرنے لگیں، اس نے باپ سے کہا کہ ''آپ نے مجھے جس حکومت کا اہل قرار دیا ہے اس کی انجام دہی تاشفین کے مقابلے میں غیر خوشگوار ہوگی، انھوں نے نیک نامی حاصل کر کے مجھے گمنام کر دیا ہے اور تمام اہل مملکت بھی ان کی طرف مائل ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ کوئی میرا نام بھی ان کے ساتھ نہیں لیتا، اس گفتگو سے سیر نے اپنے باپ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ تاشفین کو اندلس سے معزول کر کے اپنے پاس بلا لے، چنانچہ تاشفین ۵۳۱ھ کے وسط میں اندلس سے مراکش میں بلائے گئے، اور دوسرے لوگوں کی مانند سیر کے زیر اطاعت کر دیے گئے، اور اس کے دربار میں ایک حاجب سے زیادہ انھیں رتبہ نہیں دیا گیا، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے سیر بری طرح ہلاک ہوا۔

سیر کے مرنے کا اس کے باپ کو بے انتہا رنج اور قلق ہوا اور اس کے غم میں سوگ منایا، کیونکہ وہ اپنی

بیوی قمر کو جو سیر کی ماں تھیں بہت محبوب رکھتے تھے، اور ان کی ہر ایک بات کو دوسری باتوں پر ترجیح دیتے تھے، قمر ہی نے سیر کی خاطر تاشفین کو معزول کرایا تھا، مگر قضا وقدر کے فیصلے نے سیر کو ہلاک کر کے اس کی ماں کی تمام امیدوں اور ارادوں پر پانی پھیر دیا۔

جب امیر سیر نے وفات پائی تو اس کی ماں قمر نے اپنے شوہر کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے دوسرے فرزند اسحٰق کو امیر بنائیں، اسحٰق کی حقیقی ماں کا انتقال ہو چکا تھا، قمر نے اس کی پرورش کی تھی، اور اس کو اپنا متبنیٰ بنایا تھا، جس کے باعث وہ اپنی سوتیلی ماں کا محبوب تھا، امیر علی بن یوسف نے بیوی کو جواب دیا کہ اسحٰق کم عمر ہے اور ابھی سن رشد کو نہیں پہنچا ہے، تاہم میں عام و خاص لوگوں کو مسجد میں جمع کر کے مشورہ لیتا ہوں اگر سب نے مجھے اُختیار دیا تو میں تمھارے مشورے کے مطابق عمل کروں گا، چنانچہ امیر علی نے لوگوں کو مجتمع کر کے یہ مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا، سب نے بیک آواز تاشفین کا نام لیا، امیر علی کے لیے ان کی مخالفت کرنی سیاست کے خلاف تھی، اس لیے تاشفین ہی کو اپنا ولی عہد بنا کر دینار و درہم پر اپنے نام کے ساتھ ان کا نام بھی منقوش کرایا، اور امور مملکت کی نگرانی ان کے حوالے کر دی، عددہ، اندلس، اور بلاد مغرب میں بھی ان کی بیعت کے خطوط لوگوں کو لکھے گئے، اور ہر ایک جگہ سے ان کی بیعت کی اطلاعیں آئیں۔

تاشفین کی تخت نشینی کو زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ ان کے خلاف موحدین کی فوجیں اٹھ کھڑی ہوئیں، اور یہ ان کی تقدیر کی برگشتگی اور زمانے کی نامساعدت تھی کہ ہر ایک جنگ کا نتیجہ بجائے موافق آنے کے برعکس ظاہر ہونے لگا، اگرچہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اندلس میں انھیں مظفر و منصور رکھا تھا۔

ابو مروان وراق کہتے ہیں کہ امیر علی بن یوسف بن تاشفین کو اپنے فرزند تاشفین سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ تقدیر کی نامساعدت سے منقطع ہو گئیں، اور بیٹے کو منحوس خیال کر کے معزول کر دینا چاہا، اور ان کی جگہ چھوٹے بیٹے اسحٰق کو اپنا ولی عہد بنانے کا ارادہ کر کے اشبیلیہ کے عامل کو اپنے پاس طلب کیا تا کہ وہ اس کی اتالیقی خدمت انجام دے، مگر بعض تردد انگیز خبروں کے موصول ہونے سے امیر علی بن یوسف اپنے ارادے کی تکمیل نہ کر سکے، اور ۷/رجب ۵۳۷ھ میں تاشفین کو دشمنوں کے مقابلے پر پوری جنگی تیاری کے ساتھ بھیجا اور عقب سے مزید کمک روانہ کی۔

تاشفین نے ۷/رجب ۵۳۷ھ میں باپ سے حکومت کا جائزہ لیا، یہ نہایت جواں مرد، شجاع اور خوش اندام تھے، شریعت کے قوانین پر چلتے، اور جادۂ مستقیم پر گامزن رہتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ تاشفین نے کبھی شراب نہیں پی، کسی مغنیہ کا گانا نہیں سنا، اور جس طرح سلاطین لہو و لعب میں مصروف رہتے ہیں وہ کبھی اس میں مشغول نہ ہوئے۔

ابن صیرفی کہتے ہیں کہ ''تاشفین جواں مرد، بہادر، خوش اخلاق، اور عام و خاص کے محبوب تھے، انھوں نے سرحدوں کو مستحکم کیا، دشمن پر ہوشیار جاسوس متعین کیے، فوجی قوت بڑھائی، اور اسلحہ سے مسلح رہنے کی

تاکید کی، اور ان کے روز ینے بڑھائے، اسپ سوار تیر اندازوں کی تعداد میں اضافہ کیا، اور ان کی بڑی ہمت افزائی کی، یہ اسباب تھے جن کے باعث جب وہ جنگ کے لیے اٹھتے تو غالب رہتے، اور مظفر و منصور واپس آتے تھے، انھوں نے بہت سے ممالک فتح کیے، عقل وحزم سے حکمرانی کی، رعایا کی جانوں کو اور فوج کے دلوں کو عدل وانصاف سے اپنے قبضے میں کیا۔“

ابن صیرفی کہتے ہیں کہ ”اگر شرط اختصار کا خیال نہ ہوتا تو تاشفین کے عمدہ عادات وخصائل کے واقعات اس کثرت سے ضبط تحریر میں لاتا کہ وسعت کو بھی تنگی کی شکایت ہوتی، اور کتابوں میں بھی گنجائش باقی نہ رہتی۔“

ایک مؤرخ کا بیان ہے کہ تاشفین قرطبہ میں ابو وہب زاہد کی قبر پر زیارت کے لیے حاضر ہو کر معتکف ہوئے، ارباب ارادت کی صحبت میں بیٹھا، اور اپنی مجلس میں حاجیوں اور دربانوں کی رکاوٹوں کو دور کر کے اعیان واکابر کو شریک کیا اور ان سے مذاکرہ کیا۔

ابن صیرانی کہتے ہیں کہ تاشفین جب غرناطہ میں وارد ہوئے تو دن کو روزے رکھے، راتیں بیداری میں گزاریں، قرآن شریف کی تلاوت کی، پوشیدہ صدقے دیے، اور حق وصداقت کو ہمیشہ ترجیح دی۔

کہتے ہیں کہ ایک روز تاشفین مرج القلوب (ایک چراگاہ کا نام ہے) کی طرف جو قلعہ یحصب کے نواح میں تھا، گئے، اور اپنے نحیف خادم سے تفریحاً کہا ”یہ تیری چراگاہ ہے“ خادم نے جواب دیا: ”نہیں حضور یہ تو آپ کی اور آپ کے باپ کی چراگاہ ہے، میں کون ہوں“ یہ سن کر تاشفین ہنس پڑے اور اس سے کچھ تعرض نہیں کیا۔

ورود غرناطہ:

ارباب تاریخ بیان کرتے ہیں کہ جب امیر ابو محمد تاشفین بن امیر المسلمین علی بن امیر المسلمین یوسف ۵۲۳ھ میں گورنر ہو کر ۱۷/ ذی الحجہ کو غرناطہ میں وارد ہوئے تو انھوں نے یہاں کے تمام قلعوں کو مستحکم کیا، سرحدوں کی ناکہ بندی کی، ہوشیار جاسوس متعین کیے، اسلحہ خانہ لوگوں کی نشست اور قصاص کے لیے قصر کے میدان میں مسقّف چبوترے اور مکانات بنوائے، نہریں کھدوائیں، ڈھالیں اور زرہیں تیار کرائیں، خود اور تلواروں پر صیقل کرائی، گھوڑے پالے، سرحدوں میں مسجدیں تعمیر کرائیں، اور ایک مسجد قصر میں بنوائی، مقدمات کی سماعت، اور عرایض کے پڑھنے اور جواب دینے کے لیے باقاعدہ اجلاس قائم کیا، فرامین لکھے، فقہا اور طلبہ کو اعزاز بخشا اور ہفتے میں جمعہ کا ایک دن مناظرے کے لیے مخصوص کیا۔

ابوبکر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تاشفین کے ساتھ زبیر بن عمر لمتونی کو وزارت کے عہدے پر غرناطہ بھیجا جو جود وکرم، شجاعت وبسالت اور حزم واصالت میں زمانے کے نور تھے، اور اس حدیث نبوی کے مصداق تھے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے جس والی کی بھلائی چاہتا ہے اس کی نیت درست کر دیتا ہے اور اس کے لیے ایک صالح

وزیر مقرر فرماتا ہے تاکہ اگر والی کچھ بھولے تو یہ اس کو یاد دلائے اور اگر نہ بھولے تو وہ اس کی اعانت کرتا رہے۔

وزیر ابو محمد حسین بن زید بن ایوب بن حامد بن محمد امیر تاشفین کے عامل تھے۔

امیر کے کاتبوں کے نام یہ ہیں:

ابوعبداللہ بن ابوالخصال یہ رئیس اور عالم تھے، ابوبکر صیرفی یہ کاتب اور مؤرخ تھے۔

واقعات جنگ:

امیر تاشفین کے بعض جنگی واقعات یہ ہیں:

رمضان ۵۲۴ھ میں امیر تاشفین نے غرناطہ کی فوج اور رضا کاروں کو لے کر حصن السکہ کی طرف کوچ کیا، یہ مقام اعمال طلیطلہ میں سے ہے، اثنائے راہ میں قرطبہ کی فوج بھی آ کر مل گئی، حصن السکہ پر دشمن کا قبضہ ہو چکا تھا اور اس نے اپنے ایک مشہور سپہ سالار کی سرکردگی میں یہاں بہت زور باندھ کر مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا تھا، امیر نے یہاں پہنچتے ہی دشمن کا محاصرہ کرلیا اور لڑ کر بزور اس مقام کو فتح کرلیا، اس جنگ میں دشمن کی تمام فوج تہ تیغ ہوگئی، صرف سپہ سالار برنک اور اس کے ساتھ چند سوار زندہ بچ کر نکل گئے، امیر موصوف مظفر و منصور غرناطہ واپس آئے، شہر کے باشندوں نے اس شان و شوکت سے ان کا استقبال کیا جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ہے۔

صفر ۵۲۵ھ میں امیر نے پھر اپنے دشمن سے مقابلہ کیا اور پہلے ہی حملہ میں اس کا ناطقہ بند کر دیا۔

ربیع الاول ۵۲۶ھ میں امیر کو اطلاع ملی کی طلیطلہ کے دشمن نے قرطبہ کی طرف پیش قدمی شروع کی ہے، امیر اسی وقت بعجلت کوچ کر کے قرطبہ پہنچے اور پھر یہاں سے روانہ ہو کر مقام ارجونہ میں آئے اور یہاں تمام سامان اور سیف زنوں کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا اور مختصر سامان اور جماعت لے کر دشمن کی طرف آگے بڑھ گئے اور جب پیچھے سے آنے والی فوج سامانوں کو لے کر دریائے انتطش اور وادی احمر کے کنارہ پر آ کر مل گئی تو وہ شباشب تیز گامی سے چل کر قریہ براشہ میں غنیم کے قریب پہنچ گئے، صبح ہوئی تو دونوں کی فوجوں نے اپنے اپنے حریف کو دیکھا، اسی وقت نیزے اور جھنڈے بلند ہوئے، طبل جنگ پر چوٹ پڑی اور ٹڈی دل فوجیں میدان کارزار میں چھا گئیں، دشمن کی فوج مال غنیمت کی طرف بڑھی، اور دونوں صفیں اس قدر باہم مل گئیں کہ نیزے بیکار ہوگئے اور تلواریں چلنے لگیں، مسلمانوں کی تلواروں نے اپنے پورا حق ادا کیا اور لڑائی کا پانسہ آخر انھیں کے ہاتھ آیا، دشمن کے تمام آدمی تیغ اجل کی نذر ہوئے، اور امیر تاشفین فتح مند و کامران غرناطہ واپس آئے۔

پھر اسی سال غنیم کی فوج بلاد اسلام کا رخ کر کے علی الصباح ۱۵/رجب کو اشبیلیہ پہنچی، اس کے لیے مقابلے کو امیر ابوجعفر بن الحجاج نکلے، مگر وہ پسپا ہو کر مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ شہید ہوگئے، غنیم کی فوج نے شہر سے دو فرسخ کے فاصلہ پر اتر کر شہر کو تاخت و تاراج کیا، بہتوں کو قتل اور اکثر لوگوں کو گرفتار کیا، جب ان

واقعات کی اطلاع امیر تاشفین کو پہنچی تو وہ پے در پے منزلیں طے کر کے اشبیلیہ پہنچے، اس وقت غنیم یہاں کے باشندوں کو انواع واقسام کے مصائب وتکالیف میں مبتلا کر کے ہزاروں مشہور بہادر اور دلیر سپاہیوں کو لے کر بطلیوس، باجہ، اور بارزہ کی طرف روانہ ہو گیا تھا، اور اس کی باقی ماندہ فوج اشبیلیہ میں تھی جس سے امیر نے مقابلہ کیا، اور ایسی کامیابی حاصل کی جس کا کوئی حساب وشمار نہیں ہے، اس کے بعد وہ رہنماؤں کو لے کر یہاں سے روانہ ہوئے، اور تیزی کے ساتھ ہر ایک گھاٹی اور بلندی کو طے کر کے زلاقہ کے قریب ایک وسیع میدان میں پہنچے جہاں دشمن کو چاروناچار اس سے گزرنا تھا ابھی کچھ دیر نہ ہوئی تھی کہ امیر کے طلایہ نے دشمن کے پہنچنے کی خبر دی جس کے ساتھ اس قدر مال غنیمت تھا کہ جس سے زمین معمور تھی۔

جب دونوں طرف کی فوجیں مقابلے کے لیے میدان میں اتریں اور ہنگامہ رست خیز برپا ہونے کی نوبت آئی تو امیر نے اپنی فوج اس طرح آراستہ کی کہ قلب میں سربرآوردہ مرابطین کی جماعت کو لے کر بلند جھنڈوں کے ساتھ جن میں آیتیں لکھی تھیں خود رہے، ساقہ میں اندلس کے اولوالعزم روسائے سلطنت کو سرخ جھنڈے دے کر جن میں بہت شکلیں بنی ہوئی تھیں متعین کیا، میمنہ اور میسرہ میں سرحدی اور ساحلی لوگوں کو جن کی صلابت اور طاقت مشہور تھی رکھا، اور ان کے جھنڈوں میں سفید وسیاہ ڈوریاں لگی ہوئی تھیں، اور مقدمۃ الجیش میں قبیلۂ زناتہ کے عوام اور مشہور لوگوں کو مامور کیا، اور ان کے مختلف رنگین جھنڈے باترتیب قائم کیے، جب فوج آراستہ ہو گئی تو باہم مقابلہ شروع ہوا، ہر ایک نے ثابت قدمی اور بہادری کے جوہر دکھائے، تلواروں کی جھنکار بلند ہوئی، پے در پے کئی حملے ہوئے، اور کشتوں کے پشتے لگ گئے، انجام کار اللہ تعالیٰ نے کافروں کو ہزیمت دی، اور وہ منہ پھیر کر بھاگنے لگے، اس وقت ہر طرف سے ان پر تلواریں چلنے لگیں، اور ان کی گردنیں کٹ کٹ کر گرنے لگیں، یہاں تک کہ غنیم کی ساری فوج ہلاک ہو گئی، اور جو زندہ بچے وہ گرفتار کر لیے گئے، اس معرکہ میں امیر کو اتنی عظیم الشان فتح ہوئی جس کی کوئی نظیر نہیں، امیر تاشفین مظفر ومنصور اسی سال جمادی الاولیٰ میں اپنے شہر واپس گئے۔

امیر تاشفین کی شان میں جو مدحیہ قصائد لکھے گئے تھے ان کے بعض شعر یہ ہیں جن کا ترجمہ ہے:

''ہاں ہندی تلواریں تیری طرف سے لڑتی ہیں اور تیری تلوار کے مطالبے کو رومی فوج پورا کرتی ہے
تیری تلواریں دشمنوں پر چلتی ہیں اور جب بات آسان ہو تو وہ رک جاتی ہیں۔''

یہ قصائد حماسی اغراض پر مشتمل ہیں، درحقیقت بادشاہ کی حالت ایک بازار کی سی ہوتی ہے جہاں وہی چیزیں آتی ہیں جن کی مانگ ہوتی ہے۔

امیر تاشفین کا ۵۳۱ھ یا ۵۳۲ھ میں اندلس سے واپس جانا، اور مراکش میں اپنے بھائی میر کے زیردست ہونا، اور پھر باپ کے بعد حکمران ہونا یہ تمام واقعات اوپر گزر چکے ہیں۔

راوی کہتا ہے کہ امیر تاشفین امیر المومنین ابو محمد عبدالمومن بن علی خلیفہ مہدی کی مدافعت کو نکلے، مگر

چونکہ اللہ نے عبدالمومن کے غلبے کا فیصلہ کر کے تاشفین کی مدافعت اور سعادت کی مدت ختم کر دی تھی اس لیے ان کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی، عبدالمومن نے انھیں شکست دی، جس کے بعد ان کی جنگی طاقت منتشر ہو گئی، اور وہ خود مقام دہران میں جا کر پناہ گزین ہوئے، مگر غنیم کی فوج نے جو ان پر مسلط تھی فوراً ان کا محاصرہ کر لیا۔

کہتے ہیں کہ امیر نے اس موقع پر دریا کے ایک ساحل تک پہنچنے کی تدبیر کی جہاں ان کے جنگی بیڑے کا سپہ سالار ابن میمون انھیں اندلس لے جانے کے لیے پہلے سے موجود تھا، چنانچہ وہ ایک رات کو خاص لوگوں کی ایک جماعت لے کر ساحل کی طرف روانہ ہوئے، مگر رات کی تاریکی نے ان کے ساتھیوں کو منتشر کر دیا، اور وہ خوف و ہراس سے ادھر ادھر بھٹک گئے اور دشوار گزار راستوں نے ان کی شیرازہ بندی توڑ دی، ان میں سے بعض قتل ہو گئے، اور بعض ساحل تک پہنچے، امیر کا گھوڑا راستے میں مر گیا اور دوسرے روز وہ خود بھی مردہ پائے گئے۔

یہ واقعہ ۲۷؍ رمضان کو بوقت شب ۵۳۹ھ میں پیش آیا، موحدین امیر کی لاش کو سولی پر لٹکا کر ان کی حکومت پر قابض ہو گئے، اور بقا صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔

حکومت بنوحمود

ہارون الرشید عباسی کے عہد خلافت میں مراکش میں خاندانِ ادریسیہ کی ایک خود مختار حکومت قائم ہو گئی تھی، لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد یہ ادریسی حکومت بھی ختم ہو گئی۔ منصور اعظم جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے، کے عہد وزارت وحکومت میں مراکش سے جو بربری لوگ اندلس آئے ان میں خاندان ادریسیہ کے دو شخص جو دونوں حقیقی بھائی تھے، بھی اندلس آئے۔ ان کے نام علی اور قاسم تھے۔ یہ دونوں حمود بن میمون کے بیٹے تھے۔ علی بن حمود اور قاسم بن حمود دونوں منصور اعظم کی فوج میں ملازم ہو گئے۔ انھوں نے مختلف لڑائیوں میں اپنی بہادری کے جوہر دکھائے اور اپنی جنگی قابلیت کا اظہار کیا جس سے خوش ہو کر منصور نے انھیں فوج میں افسر بنا دیا۔ یہ دونوں بھائی بربری فوج کے اعلیٰ افسر تھے کیونکہ یہ دونوں بربروں کے ساتھ ہی اندلس میں آئے تھے۔ بربری بھی ان کی افسری سے خوش تھے کیونکہ ان کا خاندان ایک عرصے تک مراکش کے اقتدار پر قابض رہ چکا تھا۔ انھی دونوں بھائیوں نے بربری فوج کے ساتھ منصور بن ابی عامر کے خاندان کی بیخ کنی کی اور پھر انھی دونوں نے مستعین اموی کو خلیفہ بنایا۔ مستعین نے قرطبہ میں تخت خلافت پر بیٹھ کر علی بن حمود کو طنجہ اور دیگر صوبہ جاتِ افریقہ کا والی مقرر کیا۔

مستعین کوئی اچھا حکمران ثابت نہ ہوا۔ اس کے دور خلافت میں اندلس کے قریباً تمام صوبے خود مختار ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کر علی بن حمود نے بھی طنجہ وغیرہ میں اپنی خود مختار حکومت کا اعلان کر دیا اور اپنے آپ کو خلیفہ مستعین کی اطاعت وفرماں برداری سے آزاد کر لیا۔ ایک اور صوبے کے گورنر کی حمایت حاصل کر کے علی بن حمود نے جہازوں کے ذریعے ساحل اندلس پر اپنی فوج اتار دی۔ طنجہ اور دوسرے صوبہ جات افریقہ میں اس نے اپنا قائم مقام اپنے بیٹے یحییٰ کو بنایا اور خود اندلس میں آ کر قرطبہ پر قبضہ کرنے کے لیے اپنی فوج کے ساتھ یہ نعرہ لگا کر روانہ ہوا کہ خلیفہ ہشام کے خون کا بدلہ لینے آیا ہوں۔ مالقہ کے مقام پر مستعین اور علی بن حمود کا مقابلہ ہوا۔ محرم سنہ ۴۰۷ھ میں مستعین کو علی کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی اور علی نے قرطبہ پر قبضہ کر لیا اور مستعین کو قتل کرا دیا اور خود قرطبہ کی حکومت کا مالک و مختار بن گیا۔ اس نے اپنا لقب ''ناصر لدین اللہ'' رکھا چونکہ بربری قوم کا اثر غالب تھا اور بربری اس کے ساتھ خوش تھے، اس لیے جنگ مالقہ کے بعد علی بن حمود کو کسی قسم کی مخالفت اور

پریشانی کا مقابلہ نہ کرنا پڑا۔ علی کی حکومت کا ابتدائی دور تو قدرے اچھا تھا کیونکہ آغازِ کار میں وہ عدل وانصاف کی جانب زیادہ مائل نظر آتا تھا، لیکن پھر اس نے اپنی غلط حرکتوں کے باعث بربروں کو بھی ناراض کر دیا۔ رعایا پر نئے نئے ٹیکس لگائے اور ان پر سختی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوج اور رعایا دونوں اس سے ناراض ہو گئے۔ خیران صقلبی والی المیرہ کی مدد سے اس نے اندلس میں فوج اتاری تھی، اس نے ایک سازش کے تحت علی بن حمود کو اس کے ایک صقلبی محافظ سے ذی قعدہ سنہ ۴۰۸ھ میں حمام میں قتل کرا دیا۔ اس کے قتل کا سن کر لوگ خوش ہوئے اور بربری لوگوں نے علی بن حمود کے بھائی قاسم بن حمود کو جو مستعین کے زمانے میں جزیرہ خضراء کا حاکم تھا، قرطبہ بلایا اور اس کو علی بن حمود کی جگہ تخت حکومت پر بٹھایا۔ قاسم چونکہ قرطبہ سے قریب تھا، اس لیے اس کو تخت نشین کر دیا گیا، لیکن عام بربری فوجیوں کی خواہش قاسم کے بجائے علی کے بیٹے یحییٰ کو طنجہ سے بلا کر تخت حکومت پر بٹھانے کی تھی۔ دوسرے یہ کہ خیران صقلبی نے عبدالرحمٰن بن محمد کو لے کر ملک کا دورہ کیا تو اسے پتہ چلا کہ لوگ عبدالرحمٰن کی جانب مائل ہو گئے۔ لیکن چند روز کے بعد والیٔ غرناطہ کے مقابلے میں جو ایک بربری سردار تھا خیران صقلبی نے عین معرکۂ جنگ میں دھوکا دے کر عبدالرحمٰن بن محمد کو قتل کر دیا۔

یحییٰ بن علی کا ایک بھائی ادریس بن علی مالقہ کا حاکم تھا۔ وہ اپنے بھائی ادریس کو اپنی مدد پر آمادہ کر کے طنجہ سے فوج کے ساتھ جہازوں کے ذریعے روانہ ہو کر اندلس آیا اور اپنے چچا قاسم بن حمود کے خلاف حکومت کا دعویٰ کر دیا۔ خیران صقلبی بھی یحییٰ سے آ ملا۔ یحییٰ کے بھائی ادریس نے خیران کے بارے میں یحییٰ کو توجہ دلائی کہ خیران بڑا چالاک اور فتنہ پرداز ہے اور یہ کہ یہ شخص اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ ہے۔ یہ کسی کا خیر خواہ نہیں بلکہ صرف اپنے مطلب کا یار ہے۔ لیکن یحییٰ نے جواب میں کہا کہ ہم کو بہر حال اس کی امداد اور ہمدردی سے اس وقت فائدہ اٹھانا چاہیے۔ چنانچہ یحییٰ فوج کے ساتھ قرطبہ کی جانب روانہ ہوا۔ قاسم اس حملہ آوری کا حال سن کر قرطبہ سے بھاگ گیا اور اشبیلیہ میں جا کر قاضی ابن عباد کے ہاں پناہ گزیں ہو گیا۔ لہٰذا ان کے درمیان کوئی جنگ وغیرہ نہ ہوئی۔

یحییٰ بن علی بن حمود:

قاسم یکم جمادی الاولیٰ سنہ ۴۱۰ھ کو قرطبہ سے فرار ہوا اور پورے ایک ماہ کے بعد یحییٰ بن علی قرطبہ میں بغیر کسی رکاوٹ کے تخت نشین ہوا اور اپنا لقب ''متعالی'' رکھا۔ یحییٰ صرف شہر قرطبہ پر قابض ہو کر اپنے آپ کو اندلس کا فرماں روا سمجھنے لگا حالانکہ قرطبہ سے باہر اس کی حکومت کو کوئی تسلیم نہیں کرتا تھا اور قریباً ہر صوبے میں گورنر خود مختار فرماں روائی کرتے تھے۔ یحییٰ کی حماقت اور غفلت کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں پھر بغاوتوں اور سازشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ قرطبہ کی فوج کے بہت سے سردار قاسم کے پاس اشبیلیہ میں جا کر اس کو اس بات پر آمادہ کرنے لگے کہ قرطبہ پر حملہ کر دو۔ اس قسم کی کارروائیوں سے مطلع ہو کر یحییٰ اس قدر خائف ہوا کہ قرطبہ سے بھاگ کر مالقہ چلا گیا۔

قاسم بن حمود دوبارہ اقتدار میں:

قاسم یہ خبریں سن کر سنہ ۴۱۳ھ میں دوبارہ قرطبہ میں آکر حکومت کرنے لگا۔ یحییٰ مالقہ میں مقیم اور قابض تھا۔ اس کے بھائی ادریس نے یہ دیکھ کر کہ مالقہ کی حکومت بھائی نے چھین لی ہے، مالقہ سے روانہ ہوکر طنجہ پر قبضہ کرلیا۔ چنانچہ اس طرح قاسم قرطبہ میں، یحییٰ بن علی مالقہ میں اور ادریس بن علی طنجہ میں حکومت کرنے لگے۔

چند روز کے بعد امرائے بربر قاسم سے ناراض ہوگئے۔ ادھر باشندگان قرطبہ یہ چاہنے لگے کہ کسی اموی شہزادے کو تخت حکومت پر بٹھایا جائے۔ قاسم کو جب اس بات کا علم ہوا تو اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر امویوں کو قید اور قتل کرنا شروع کردیا۔ یہ ظلم وتشدد دیکھ کر رعایا نے بغاوت کردی۔ اہل شہر کی بغاوت فرو کرنے کے لیے قاسم نے بربری فوج کو استعمال کیا، لیکن شہریوں نے اکٹھے ہوکر نہایت پامردی سے مقابلہ کیا اور قاسم اور اس کی فوج کو شکست دے کر باہر نکال دیا۔ بربری فوج تو شکست سے دوچار ہوکر یحییٰ کے پاس مالقہ چلی گئی اور قاسم قرطبہ سے نکل کر اشبیلیہ کی طرف آیا۔ قاسم نے اپنے ایک بیٹے کو اشبیلیہ کا حاکم بنا کر محمد بن زہری اور محمد بن عباد کو اس کا وزیر بنایا تھا۔ جب ان دونوں وزیروں نے سنا کہ قاسم قرطبہ سے شکست کھا کر اشبیلیہ آرہا ہے تو ان دونوں نے اشبیلیہ کا دروازہ بند کرلیا۔ قاسم نے شہر سے باہر مقیم ہوکر ان دونوں امیروں کے پاس پیغام بھیجا کہ میرے بیٹے کو میرے پاس بھیج دو تاکہ میں یہاں سے کسی دوسری طرف چلا جاؤں۔ چنانچہ انھوں نے قاسم کے بیٹے اور اس کے تمام رشتہ داروں کو اس کے پاس بھیج دیا۔ قاسم اپنے تمام متعلقین اور حبشی غلاموں کو لے کر قلعہ سریش میں مقیم ہوگیا یہاں تک کہ یحییٰ بن علی نے سنہ ۴۱۵ھ میں قلعہ سریش کو فتح کرکے قاسم کو قید کردیا اور سنہ ۴۱۷ھ میں قاسم کو یحییٰ کے حکم سے قتل کردیا گیا۔

عبدالرحمٰن بن ہشام:

قاسم جب قرطبہ سے فرار ہوکر اشبیلیہ کی جانب روانہ ہوا تو قرطبہ کئی روز تک بغیر حاکم کے رہا۔ قرطبہ والوں کو یہ فکر تھی کہ کسی اموی کو تخت خلافت پر بٹھائیں کیونکہ وہی اس کے جائز حق دار ہیں۔ آخر کار تین اموی شہزادے تخت حکومت کے دعویدار ہوئے۔ ۱۵؍رمضان المبارک سنہ ۴۱۴ھ کو اہل قرطبہ نے ایک مجمع عام میں ان تینوں شہزادوں میں سے ایک کا انتخاب کیا اور یہ شہزادہ تھا عبدالرحمٰن بن ہشام جو مستظہر کے لقب سے مسند خلافت پر بیٹھا۔ مستظہر نے تخت نشین ہوکر اپنے وزراء کی رائے کے خلاف ابوعمران نامی ایک بربری سردار کو جو قید تھا، رہا کردیا اور اس کو سرداری عطا کردی۔ اسی ابوعمران کی سازش سے ۳؍ذی قعدہ سنہ ۴۱۴ھ کو مستظہر مقتول ہوا۔

محمد بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ مستکفی:

مستظہر کے قتل کے بعد محمد بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ ''مستکفی'' کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ سنہ ۴۱۶ھ میں یحییٰ بن علی بن حمود جو اپنے چچا قاسم کو گرفتار کر چکا تھا اور سریش، مالقہ اور جزیرہ پر قابض تھا، فوج کے ساتھ قرطبہ کی طرف روانہ ہوا۔ مستکفی اس حملہ آوری کی خبر سن کر کچھ ایسا حواس باختہ ہوا کہ قرطبہ سے شمالی حدود کی جانب بھاگ گیا اور وہیں ۲۵ ربیع الاول سنہ ۴۱۶ھ کو انتقال کر گیا۔ یحییٰ نے قرطبہ میں داخل ہو کر اپنے ایک افسر ابن عطاف کو قرطبہ کی حکومت سونپ دی اور خود مالقہ کی جانب چلا گیا اور وہاں جا کر ابو القاسم بن عباد حاکم اشبیلیہ کو زیر کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ چند روز کے بعد اہل قرطبہ نے ابن عطاف کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور اس کو فوج سمیت قرطبہ سے نکال دیا۔

اہل قرطبہ میں ابو محمد جمہور بن محمد نامی ایک شخص سب سے زیادہ با اثر اور با رسوخ تھا۔ اس کے مشورے سے اہل قرطبہ نے ہشام اموی کو جو لریدہ میں مقیم تھا اپنا خلیفہ تسلیم کیا۔ ہشام تین سال تک قرطبہ میں نہ آ سکا۔ سنہ ۴۲۰ھ میں وہ قرطبہ میں داخل ہوا اور ''معتمد باللہ'' کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ دو سال کے بعد سنہ ۴۲۲ھ میں فوج اور قرطبہ کے عوام نے اس کو معزول کر کے قرطبہ سے نکال دیا اور وہ لریدہ میں واپس آ کر سنہ ۴۲۸ھ تک زندہ رہا۔ یحییٰ بن علی نے اشبیلیہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا اور وہ اہل قرطبہ کو دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔ ہشام کے قرطبہ سے چلے جانے کے بعد اہل قرطبہ نے یحییٰ کی اطاعت قبول کر لی۔ یحییٰ نے سنہ ۴۲۶ھ میں اشبیلیہ کو مطیع کر لیا۔ اس طرح یحییٰ کا رعب اس طوائف الملوکی میں سب سے زیادہ قائم ہو گیا۔ اسی سال ابوالقاسم بن عباد حاکم اشبیلیہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا معتضد تخت نشین ہوا۔ اہل اشبیلیہ نے پھر علم آزادی بلند کیا اور یحییٰ بن علی نے اشبیلیہ پر حملہ کیا۔ اسی حملہ میں یحییٰ بن علی مقتول ہوا۔ یہ واقعہ سنہ ۴۲۷ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ یحییٰ بن علی کے مقتول ہونے پر اس کے ہوا خواہ مالقہ میں چلے گئے جو یحییٰ کا مستقر حکومت تھا۔ وہاں انھوں نے یحییٰ کے بھائی ادریس بن علی کو سبطہ سے بلوا کر تخت نشین کیا اور سبطہ کی حکومت حسن بن یحییٰ کو ملی۔ ادریس بن علی نے مالقہ میں تخت نشین ہو کر اپنا لقب ''متاید باللہ'' رکھا۔ قرطبہ میں ابو محمد جمہور نے جمہوری حکومت قائم کی۔ ممبران کونسل نے ابو محمد کو اپنا صدر منتخب کیا۔ اس طرح شہر قرطبہ میں امن و امان قائم رہا۔ ادریس بن علی نے والی قرمونہ اور والی المیریہ کو اپنا شریک بنا کر اشبیلیہ پر حملہ کیا اور تین چار سال تک اشبیلیہ کی فوجوں سے لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ سنہ ۴۳۱ھ میں ادریس بن علی فوت ہو گیا۔ بعض سرداروں نے اس کے بیٹے یحییٰ بن ادریس کو مالقہ کے تخت پر بٹھانا چاہا لیکن بعض نے مخالفت کی۔ بالآخر حسن بن یحییٰ سبطہ سے آ کر مالقہ کے تخت پر بیٹھا اور اپنا لقب ''مستنصر'' رکھا۔ سنہ ۴۳۸ھ میں حسن کی چچا زاد بہن یعنی ادریس کی لڑکی نے اس کو زہر دے کر مار ڈالا۔ اس کے بعد تین چار سال تک اس خاندان کے غلاموں اور نوکروں نے مالقہ پر یکے بعد دیگرے حکومت کی۔

ادریس بن یحییٰ حمودی:

سنہ ۴۴۳ھ میں ادریس بن یحییٰ مالقہ کے تخت پر متمکن ہوا۔ غرناطہ اور قرمونہ کی ریاستوں نے اس کی اطاعت قبول کی۔ ادریس بن یحییٰ نے اپنا لقب ''عالی'' رکھا اور سبطہ کی حکومت اپنے باپ کے غلاموں سکوت اور زرق کو عطا کی۔ سنہ ۴۴۸ھ میں محمد بن علی بن حمود نے خروج کیا اور ادریس بن یحییٰ شکست کھا کر قمارش چلا گیا۔ محمد بن ادریس نے مالقہ میں تخت نشین ہو کر اپنا لقب ''مہدی'' رکھا اور اپنے بھائی ''سنالی'' کو اپنا ولی عہد بنایا۔ سنہ ۴۴۹ھ میں محمد بن ادریس نے وفات پائی۔ اس کے فوت ہونے کی خبر سن کر ادریس بن یحییٰ دوبارہ مالقہ میں آ کر تخت نشین ہو گیا اور سنہ ۴۵۰ھ میں ادریس بن یحییٰ بھی اس جہان فانی سے انتقال کر گیا۔

محمد اصغر:

ادریس بن یحییٰ کی وفات کے بعد محمد اصغر بن ادریس بن علی بن حمود مالقہ کے تخت پر بیٹھا۔ سنہ ۴۵۱ھ میں بادیس بن حابوس شاہِ غرناطہ نے مالقہ پر حملہ کر کے محمد اصغر کو مالقہ سے نکال دیا۔ محمد اصغر مالقہ سے المیریہ چلا آیا اور سنہ ۴۵۶ھ تک یہاں نہایت پریشانی کی حالت میں مقیم رہا۔ سنہ ۴۵۶ھ میں ملیلہ (افریقہ) والوں کی درخواست پر افریقہ چلا گیا اور وہاں کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر وہاں سنہ ۴۶۰ھ تک حکومت کرتا رہا۔ محمد اصغر خاندان حمود کا آخری تاجدار تھا۔ اس نے مالقہ میں سنہ ۴۵۱ھ تک حکومت کی۔ اسی خاندان حمود کا ایک اور شخص قاسم بن محمد الملقب بہ ''واثق باللہ'' صوبہ جزیرہ میں حکمران تھا۔ وہ بھی سنہ ۴۵۰ھ تک وہاں کا حکمران رہا۔ معتضد بن ابوالقاسم بادشاہ اشبیلیہ نے حملہ کر کے سنہ ۴۵۰ھ میں جزیرہ پر قبضہ کر لیا اور قاسم بن محمد کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ اس طرح خاندان حمود کی حکومت کا سرزمین اندلس سے خاتمہ ہو گیا۔

مرابطین کی حکومت

بنو امیہ کی حکومت تو چوتھی صدی ہجری کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔ اس کے ختم کرنے میں عیسائیوں سے زیادہ مسلمانوں کا ہاتھ تھا جو آئے روز ملک میں شورش اور بغاوت کر کے مرکز کو کمزور کرتے رہتے تھے۔ مسلمان خود بغاوت کرنے کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کو بھی بغاوت پر ابھارتے تھے۔ چنانچہ اندلس میں مسلمان حکومت کو جتنا نقصان خود مسلمانوں نے پہنچایا ہے اتنا عیسائیوں اور یہودیوں نے نہیں پہنچایا بلکہ جتنا نقصان عیسائیوں نے پہنچایا اس میں زیادہ تر مسلمان ان کے شریک ہوتے تھے۔ بنو امیہ کی حکومت ختم ہونے کے ساتھ ہی ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ مختلف خاندان الگ الگ صوبوں میں خود مختارانہ حکومت کرنے لگے جس کا فائدہ عیسائیوں کو پہنچا۔ جن خاندانوں نے الگ الگ صوبوں میں حکومتیں قائم کیں ان میں بنو عباد، بنو ذوالنون اور بنو ہود وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں بادیس بن حابوس نے غرناطہ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ ان چھوٹی چھوٹی ریاستی حکومتوں کو شکست دینا عیسائیوں کے لیے آسان ہوگیا۔ جو مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں خود مختارانہ حکومت کر رہی تھیں، ان میں سے اکثر و بیشتر عیسائی بادشاہوں کو خراج ادا کرتی تھیں۔ معتمد جو بنو عباد کا حکمران تھا، اس کے پاس الفانسو چہارم کا سفیر ابن شالب نامی یہودی پہنچا اور خراج کا مطالبہ کیا۔ معتمد نے بلا توقف یہودی سفیر کے پاس زر خراج بھیج دیا۔ سفیر نے یہ روپیہ معتمد کے پاس یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ میں چاندی کے سکے نہیں لوں گا بلکہ سونے کے دینار لوں گا۔ معتمد کو سفیر کی اس بات پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے سفیر کو اپنے پاس بلایا اور اس گستاخی کی سزا میں اس کو ایک لکڑی کے تختے پر لٹا کر اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں لوہے کی میخیں ٹھکوا دیں۔ سفیر نے اپنے آپ کو معرض ہلاکت میں دیکھ کر معتمد سے التجا کی کہ اگر تو مجھ کو چھوڑ دے تو میں اپنے برابر وزن کر کے تجھے سونا دوں گا، لیکن معتمد نے سفیر کو ہلاک کر کے اس کے ساتھیوں کو پس دیوار زنداں کر دیا۔ معتمد یہ جو سب کچھ کر رہا تھا وہ اس لیے کہ الفانسو چہارم اس پر مشتعل ہو کر حملہ آور ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ الفانسو بے حد مشتعل ہوا اور اس نے مسلمانوں کی حکومت کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا، لیکن مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگیوں نے انھیں اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ وہ عیسائیوں کی حکومتوں اور خصوصی طور پر الفانسو چہارم کی حکومت کا مقابلہ کر سکیں۔ معتمد نے عواقب امور پر نظر کر کے مراکش کے بادشاہ یوسف بن تاشفین سے امداد و اعانت کی التجا کی،

اور اسے یہ بھی لکھا کہ اگر اس نے اس وقت مسلمانوں کی مدد نہ کی تو اندلس میں اسلام کا نام ونشان گم ہو جائے گا۔
یوسف بن تاشفین خاندان مرابطین کا جو ابھی چند روز ہوئے افریقہ میں برسر اقتدار آیا تھا، ایک نامور اور فتح مند بادشاہ تھا۔ وہ معتمد کی درخواست پر فوراً اندلس آیا اور اشبیلیہ پہنچا۔ اس کے آنے پر الفانسو چہارم بھی لشکر جرار کے ساتھ اشبیلیہ کی طرف بڑھا اور سنہ ۴۸۰ھ/۲۳ر اکتوبر سنہ ۱۰۸۶ء کو یوسف بن تاشفین اور الفانسو چہارم کی فوجوں میں زبردست مقابلہ ہوا۔ یوسف کی فوج کی تعداد بیس ہزار تھی جب کہ عیسائی فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تھی، تاہم الفانسو چہارم کو سخت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلمانوں کی اس فتح نے مسلمانوں کے قدم اندلس میں کئی سو سال کے لیے جما دیے اور مسلمانوں کا رعب عیسائیوں کے دلوں میں قائم ہو گیا۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ الفانسو چہارم صرف تین آدمی لے کر فرار ہوا۔ باقی سب کے سب وہیں کھیت رہے۔ اس عظیم الشان فتح سے مسلمانوں کو چاہیے تھا کہ وہ اپنی حالت کو درست کر لیتے لیکن یوسف بن تاشفین کے مراکش واپس جانے کے بعد امرائے اندلس میں پھر خانہ جنگی شروع ہو گئی، اور اس سے عیسائیوں کے مردہ حوصلوں میں پھر جان پڑ گئی۔ چنانچہ طوائف الملوکی کو پیدا کرنے اور مسلمانوں کی خانہ جنگی کو جاری رکھنے کے لیے عیسائیوں نے خوب مؤثر کوششیں کیں اور انھوں نے کوئی موقع اور کوئی وقت ضائع نہ ہونے دیا۔ سنہ ۴۶۷ھ میں الفانسو چہارم نے خود بھی مسلمانوں کے مقابلے کی تیاریاں شروع کیں اور تمام عیسائی بادشاہوں کو جو اسلامی اندلس کی سرحدوں پر موجود تھے تیاری اور حملہ آوری کی ترغیب دی۔ چنانچہ اس نے سنہ ۴۶۷ھ میں طلیطلہ کو القادر باللہ کے قبضے سے نکال کر اپنی حکومت میں شامل کیا۔ اس نے مسلمانوں پر نہایت سختیاں کیں تاکہ وہ عیسائی ہو جائیں، مسجدوں کو منہدم کرنے اور بڑی بڑی مسجدوں کو گرجا گھروں میں تبدیل کرنے میں قطعاً تامل نہ کیا۔ دوسری طرف ارغون کے عیسائی بادشاہ نے صوبہ بلنسیہ پر فوج کشی کر کے وہاں کی مسجدوں کو منہدم اور مسمار کرنے میں ذرا بھر باک نہ کیا۔ اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلمان اب تک بارہا عیسائیوں کو شکستیں دے کر ان کے شہروں میں فاتحانہ داخل ہوئے لیکن ایک موقع پر بھی عیسائیوں نے مسلمانوں سے سنگ دلی نہیں دیکھی تھی کہ انھوں نے عیسائیوں کی عورتوں اور بچوں کو قتل کیا ہو یا ان کے گرجوں کو مسمار کیا ہو یا ان کو زبردستی مسلمان بنایا ہو لیکن عیسائی جب بھی مسلمانوں کے کسی شہر میں فاتحانہ داخل ہوئے تو انھوں نے ہر وہ کام کیا جس کو دیکھ کر انسانیت بھی شرماتی تھی۔

الفانسو چہارم نے طلیطلہ پر قبضہ کر کے اشبیلیہ کی حکومت کی حدود میں قدم بڑھانے کی جرأت کی۔ اشبیلیہ کا حکمران معتمد بن معتضد عبادی چونکہ المیریہ سے برسر پیکار تھا اس لیے اس نے فوراً زرخراج الفانسو چہارم کے پاس روانہ کیا اور اس بلا کو اپنے سر سے ٹالنا چاہا۔ لیکن الفانسو چہارم نے معتمد کے پاس پیغام بھیجا کہ میری بیوی جو حاملہ ہے اس کو وضع حمل کے دوران مسجد قرطبہ میں رکھنا چاہتا ہوں تاکہ بچہ وہیں پیدا ہو، اور پھر اس کے قیام کا بندوبست بھی کر دو اور اس کے لیے قصر زہرا کو ابھی سے خالی کرا دو۔ قرطبہ ان دنوں معتمد کی حکومت میں شامل تھا۔ الفانسو چہارم کے اس جملے نے اس کی دینی غیرت وحمیت کو انگیخت لگائی اور معتمد نے الفانسو چہارم کی

اس بات کو قبول کرنے سے یک قلم انکار کر دیا۔ اور اس کے یہودی سفیر کو گستاخی کی سزا میں قتل کر دیا۔ الفانسو یہ سنتے ہی دریائے وادیٔ الکبیر کے کنارے اشبیلیہ کے کنارے آکر خیمہ زن ہو گیا اور معتمد کو لکھا کہ فوراً شہر اور محلات شاہی میرے لیے خالی کر دو۔ معتمد نے اس خط کی پشت پر جواب لکھ کر واپس بھیج دیا کہ ہم ان شاء اللہ بہت جلد تجھ کو تیری گستاخیوں کا مزا چکھا دیں گے۔ اس مختصر، دوٹوک اور غیر مبہم جواب سے الفانسو کے قلب پر ایک رعب طاری ہو گیا اور وہ اشبیلیہ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکا، لیکن اس نے اپنے جاسوسوں اور عام لوگوں کے ذریعے تمام اندلس میں یہ مشہور کرا دیا کہ معتمد نے اپنی مدد کے لیے مراکش سے یوسف بن تاشفین کو بلایا ہے۔ یہ بھی کفر کی ایک چال تھی۔ اس خبر کو شہرت دینے میں یہ مصلحت تھی کہ نام نہاد روسائے اندلس مراکش کے بادشاہ کا اپنے ملک میں داخل ہونا سخت ناپسند کرتے اور اس کو اپنے لیے بے عزتی کا باعث سمجھتے جب کہ عیسائیوں سے معاہدے کرنے اور انھیں خراج ادا کرنے میں ان کو شرم نہیں آتی تھی۔ وہ نام نہاد روسائے اندلس اس قدر بے حمیت ہو گئے تھے۔ اس خبر کے مشہور ہوتے ہی مسلمان بادشاہوں نے معتمد کو لعنت ملامت کے خطوط لکھے کہ تو نے یوسف بن تاشفین کو کیوں کر اندلس میں بلانا گوارا کیا؟ معتمد نے ان سب نام نہاد مسلمان بادشاہوں کو یہ جواب لکھا:

''مجھ کو خنزیروں کی پاسبانی سے اونٹوں کی نگہبانی کرنا پسند ہے۔''

اس کے بعد معتمد نے ایک وفد یوسف بن تاشفین کے پاس روانہ کیا اور عیسائیوں کے مقابلے میں مدد طلب کی۔ یوسف بن تاشفین فوراً اندلس آیا۔ الفانسو بھی اس زبردست دشمن کے مقابلے کی تیاریوں میں مصروف ہوا اور اس نے ہر طرف سے بہادر، تجربہ کار اور جنگ جو فراہم کر کے ساٹھ ہزار کا ایک لشکر جرار تیار کیا۔ اس زبردست لشکر کو دیکھ کر الفانسو نے از راہ غرور و تکبر کہا کہ اگر میرے مقابلے کے لیے آسمان سے فرشتے بھی اتر آئیں تو میں اس لشکر عظیم سے ان کو بھی شکست دے سکتا ہوں۔ اس کے بعد الفانسو نے یوسف بن تاشفین کو جب کہ وہ معتمد کے پاس اشبیلیہ میں پہنچ چکا تھا، ایک خط بھیجا۔ اس میں اپنی کثرت فوج اور عسکری طاقت وقوت کا ذکر کر کے یوسف کو مغلظات گالیاں بھی دیں۔ یوسف نے اپنے معتمد ابوبکر بن القصیر کو اس خط کا جواب لکھنے کے لیے کہا۔ اس نے جو مدلل اور مطول جواب لکھا یوسف کو وہ پسند نہ آیا۔ یوسف نے اپنے قلم سے الفانسو کے خط کی پشت پر یہ جملہ لکھ کر روانہ کر دیا:

''جو زندہ بچے گا وہ دیکھ لے گا۔''

اس مختصر اور پر مغز جواب کو پڑھ کر الفانسو خوف زدہ ہو گیا۔ آخر ذلاقہ کے میدان میں دونوں افواج کے مابین لڑائی ہوئی۔ اسلامی لشکر کی تعداد بیس ہزار جب کہ عیسائی لشکر ساٹھ ہزار سے بھی زیادہ تھا۔ بروز بدھ رجب سنہ ۴۷۹ھ کو جب اسلامی لشکر آگے بڑھا تو الفانسو نے پیغام بھیجا کہ ہم ہفتے کے روز نبرد آزما ہوں گے لیکن یہ اس نے دھوکا دیا تھا۔ اس نے جمعے کے روز مسلمانوں پر بے خبری میں حملہ کر دیا۔ اس سے اسلامی لشکر

میں ایک قسم کی پریشانی نمودار ہوئی، لیکن مسلمانوں نے سنبھل کر عیسائیوں کے حملے کو روکا اور بڑی بہادری سے لڑنے لگے۔ معتمد کی ران کے نیچے اس روز تین گھوڑے ہلاک ہوئے تھے اور وہ بڑی بہادری سے لڑا۔ یوسف نے جب حملہ کیا تو عیسائی اس حملہ کی تاب نہ لا سکے۔ الفانسو بھی اس جنگ میں زخمی ہوا اور اپنی تمام فوج اس میدان کٹوا کر ۲۰ رجب المرجب سنہ ۴۷۹ھ چند سو آدمیوں کے ساتھ میدان ذلاقہ سے فرار ہوا۔ مسلمان فوج فتح کے بعد چار روز تک اسی میدان میں مقیم رہی۔ معتمد نے مال غنیمت کے بارے میں یوسف بن تاشفین سے عرض کیا کہ کس نسبت سے اسے تقسیم کیا جائے۔ یوسف نے کہا: ''میں تمھاری مدد کرنے آیا ہوں، مال غنیمت حاصل کرنے نہیں آیا۔'' ذلاقہ سے یوسف اور معتمد دونوں اشبیلیہ آئے۔ یہاں یوسف چند روز قیام کر کے واپس افریقہ چلا گیا۔ لیکن بدقسمت مسلمانوں نے الفانسو کی اس عظیم الشان شکست سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور باہمی خانہ جنگیوں میں مصروف رہے۔ مسلمانوں کی اس حالت کو دیکھ کر عیسائیوں نے پھر ہمت کی اور فوجی تیاریاں کر کے مسلمانوں کے قبضے سے شہروں کو نکالنا شروع کر دیا اور اشبیلیہ کے بعض قلعوں پر بھی قبضہ کر لیا۔

ربیع الاول سنہ ۴۸۱ھ میں امراء اندلس کی درخواست پر یوسف بن تاشفین کو پھر اندلس آنا پڑا۔ مگر اس مرتبہ اندلس کے مسلمانوں کی کم نصیبی اور ذلت یہاں تک ترقی کر چکی تھی کہ وہ یوسف بن تاشفین کے ساتھ ایک کیمپ میں شامل ہو کر بھی آپس میں لڑنے سے باز نہ رہے۔ یوسف ان کی اس حالت کو دیکھ کر دل برداشتہ ہوا اور مراکش واپس چلا گیا لیکن یہاں کے امراء کو کوئی حیا نہ آئی اور نہ اس بات کا احساس ہوا کہ مستقبل کے مؤرخ کا بے رحم قلم ہمارے بارے میں کیا لکھے گا۔

دو سال کے بعد سنہ ۴۸۳ھ میں یوسف بن تاشفین عیسائیوں کو ان کے ظلم و تشدد کی سزا دینے کے لیے پھر اندلس آیا کیونکہ اندلس کے مسلمان سلاطین یوسف کو اپنا سرپرست تسلیم کر چکے تھے اور عیسائیوں کو اپنے مقبوضات پر حملہ آور دیکھ کر یوسف سے امداد کے خواہاں تھے۔ اس مرتبہ یوسف جو اندلس میں آیا تو عیسائیوں کو ہر میدان میں شکست دیتا ہوا طلیطلہ کے سامنے جا پہنچا کیونکہ الفانسو چہارم نے طلیطلہ کو اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا اور وہ خود بھی طلیطلہ میں موجود تھا۔ یوسف نے طلیطلہ کا محاصرہ کر لیا اور امرائے اندلس سے امداد چاہی کہ محاصرہ کو کامیاب بنانے میں شریک ہوں لیکن کسی ایک نے بھی مدد نہ کی۔ یوسف کو مجبوراً محاصرہ اٹھانا پڑا اور وہ طلیطلہ سے واپس چلا گیا۔ اب اس نے امرائے اندلس کو ٹھیک کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ اس نے عبداللہ حاکم غرناطہ اور اس کے بھائی تمیم حاکم مالقہ کو گرفتار کر کے افریقہ بھیج دیا۔ اس کے بعد رمضان المبارک سنہ ۴۸۳ھ میں یوسف اپنے بھتیجے اور سپہ سالار سیر بن ابی بکر بن تاشفین کو اندلس میں فوج کے ساتھ چھوڑ کر خود افریقہ چلا گیا اور اسے عیسائیوں کی سرکوبی کی ہدایت کر دی۔ اس سپہ سالار نے الفانسو سے لڑ کر اس کے کئی مقبوضات چھین لیے۔ اس جہاد میں اندلس کے مسلمان امراء کو سیر بن ابی بکر کی امداد کرنی ضروری اور لازمی تھی، لیکن ان بدبختوں اور کم نصیبوں نے اس کی امداد اور عیسائیوں کے مقابلے سے صاف انکار کر دیا۔ سیر بن ابی بکر نے امرائے اندلس کی

نالائقیوں پر کوئی التفات نہ کیا اور اپنی فتوحات کو جاری رکھا یہاں تک کہ اس نے اندلس کا ایک معقول حصہ مع صوبہ پرتگال عیسائیوں سے چھین لیا۔ اب اس نے یوسف بن تاشفین کو لکھا کہ جزیرہ نما اندلس کا کافی رقبہ ہم نے عیسائیوں سے لڑ کر چھین لیا ہے لیکن اندلس کے مسلمان امراء نے اس بارے میں ہماری کوئی امداد نہیں کی، اور وہ ہمارے بجائے عیسائیوں سے مودت اور محبت کے رشتے استوار کر رہے ہیں اور اپنے اس غلط طرز عمل سے اسلام اور امت مسلمہ دونوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں، اس لیے ان کی نسبت بھی کوئی حکم صادر فرمایا جائے۔

یوسف نے سیر بن ابی بکر کو لکھا کہ تم جہاد کے اس سلسلے کو جاری رکھو، اور اندلس کے امراء سے پھر امداد واعانت کی خواہش کرو۔ اگر وہ تمھارے ساتھ شریک ہو جائیں تو ان سے تعرض نہ کرو لیکن اگر وہ عیسائیوں کے مقابلے میں تمھاری حمایت نہ کریں تو تم ان کے ملکوں کو بھی ان سے چھین لو۔ لیکن اس بات کا خاص خیال رکھو کہ اول ان مسلمان امراء کی ریاستوں پر قبضے کرو جو عیسائیوں کی سرحدوں پر واقع ہیں تاکہ وہ مسلمانوں کے قبضے سے نکل کر عیسائیوں کے قبضے میں نہ جا سکیں۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ چنانچہ مسلمانوں کی وہ تمام چھوٹی چھوٹی ریاستیں ان سے چھین لی گئیں جن کا عیسائیوں کے قبضے میں جانے کا اندیشہ تھا۔ اگرچہ وہاں کی سب چھوٹی چھوٹی ریاستیں تو چھین لی گئیں، لیکن معتمد شاہ اشبیلیہ نے مرابطین سے جنگ کرنے کی تیاری شروع کی، یہی سب سے بڑا طاقتور بادشاہ تھا جو اندلس میں باقی رہ گیا تھا۔ اس نے الفانسو سے بھی امداد طلب کی۔ چنانچہ الفانسو نے عیسائیوں کی ایک فوج اس کی مدد کے لیے بھیج دی۔ اس امداد کا سن کر سیر بن ابی بکر نے ایک طرف فوراً اشبیلیہ کا محاصرہ کر لیا اور دوسری طرف ایک سردار کو عیسائی فوج کی روک تھام کے لیے روانہ کر دیا۔ اس سردار نے عیسائیوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ ادھر سیر بن ابی بکر نے اشبیلیہ کو فتح کر کے معتمد کو مع اہل خاندان گرفتار کر کے افریقہ بھیج دیا۔ جہاں وہ سنہ ۴۸۸ھ ماہ ربیع الاول میں اسی نظر بندی کی حالت میں فوت ہو گیا۔

اب حالت یہ تھی کہ سنہ ۴۸۵ء میں تمام اسلامی اندلس یوسف بن تاشفین کے قبضے اور تصرف میں آ گیا تھا اور طوائف الملوکی کا خاتمہ ہو کر یوسف بن تاشفین بادشاہ مرابطین کے وائسرائے اور گورنر اندلس پر حکمرانی کرنے لگے۔ اس طرح اندلس کا وہ ملک جو پارہ پارہ ہو کر عیسائیوں کے قبضے میں جانے والا تھا، مراکش کے مسلمان بادشاہ یوسف بن تاشفین کے قبضے میں آ کر محفوظ ہو گیا اور عیسائیوں کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اگرچہ اندلس کے شمالی علاقوں کے بعض حصوں پر اب بھی عیسائی قابض تھے لیکن اندلس کا بڑا حصہ، زرخیز اور آباد جنوبی علاقہ مسلمانوں کے زیر حکومت تھا۔ یوسف بن تاشفین کو سنہ ۴۷۹ھ خلیفۂ بغداد مقتدی بامر اللہ نے امیر المسلمین کا خطاب اور خلعت فاخرہ عطا فرمایا تھا۔

یوسف بن تاشفین کی وفات:

اندلس پر قبضہ کرنے کے بعد امیر المسلمین یوسف بن تاشفین پندرہ سال تک اس دنیائے فانی میں

زندہ رہا اور محرم الحرام سنہ ۵۰۰ھ میں اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ یہ زمانہ اندلس میں نہایت امن و امان کا گزرا۔ اگرچہ اندلس کے عربی النسل باشندے یوسف بن تاشفین کی حکومت کے سخت خلاف تھے اور بربری لوگوں کو اپنے اوپر حکمران دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے، لیکن یہ ان کی غلطی تھی۔ اگر بربری مسلمان ان پر حکمران نہ ہوتے تو ان کو پھر عیسائیوں کی غلامی کر کے ان کے خنزیر چرانے پڑتے۔

علی بن یوسف بن تاشفین:

یوسف بن تاشفین کی وفات حسرت آیات کے بعد اس کے ۳۳ سالہ بیٹے ابوالحسن علی کو تخت پر بٹھایا گیا۔ سنہ ۵۰۳ھ میں علی بن یوسف نے طلیطلہ کا محاصرہ کیا۔ یہ شہر اپنے محل وقوع اور مضبوط فصیل کے باعث فتح نہ ہو سکا، لیکن علی نے وادی الحجارہ اور گرد و نواح کے اکثر شہروں کو فتح کر لیا۔ اسی سال علی بشونہ (لسبن) اور پرتگال کے بقیہ شہروں کو بھی عیسائیوں سے چھین لیا۔ علی نے اپنے بھائی تمیم بن یوسف کو اندلس کا وائسرائے مقرر کر دیا۔ تمیم نے الفانسو اول بن رومیر شاہ برشلونہ کی جنگی تیاریوں کا حال سن کر اس کی پیش قدمی کو اپنے حملے سے روک دیا اور سرقسطہ کو عیسائیوں سے چھین کر اسلامی مقبوضات کو وسعت دی۔ شاہ برشلونہ نے شاہ فرانس کو اپنی مدد پر آمادہ کر کے سنہ ۵۱۲ھ میں سرقسطہ کا محاصرہ کر لیا۔ عیسائیوں کی فوجیں سامان اور کثرت تعداد کے باعث اس قدر زیادہ طاقتور تھیں کہ سرقسطہ کے مسلمان ان کے مقابلے کی تاب نہ لا سکے۔ سامان رسد کی نایابی کے باعث جب جان پر آ بنی تو انھوں نے شہر کا دروازہ کھول دیا۔ اس طرح سرقسطہ عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا اور اس صوبے کے دوسرے شہروں اور قلعوں کو بھی عیسائیوں نے فتح کر لیا۔ یہ بری اور رنج دہ خبر جب علی بن یوسف کو پہنچی تو وہ سنہ ۵۱۳ھ میں مراکش سے اندلس آیا اور اشبیلیہ اور قرطبہ سے ہوتا ہوا سرقسطہ پہنچا اور ان تمام علاقوں کو فتح کر کے اور عیسائیوں کو اچھی طرح سزا دے کر اور اقرار فرمان برداری لے کر سنہ ۵۱۵ھ میں واپس مراکش پہنچا۔ الفانسو چہارم جس نے طلیطلہ کو اپنا دارالسلطنت بنا لیا تھا سنہ ۵۱۳ھ میں فوت ہو گیا تھا، لیکن انفانسو اول شاہ برشلونہ موجود تھا۔ اسی کو ابن رومیر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، علی بن یوسف کے اندلس سے مراکش جاتے ہی ابن رومیر نے اسلامی مقبوضات پر چڑھائی کر دی۔ اس چڑھائی کا سبب یہ تھا کہ غرناطہ کے عیسائی باشندوں نے اس کو لکھا تھا کہ تم غرناطہ پر حملے کر دو، ہم تمھارے اس حملہ کو کامیاب بنانے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔ چنانچہ ابن رومیر غرناطہ تک اپنی زبردست فوجیں لے کر پہنچ گیا۔ عیسائیوں کی امیدوں پر دراصل یوسف بن تاشفین کی فتوحات سے پانی پھر گیا تھا اور وہ مرابطین سے بہت خوف زدہ تھے، لیکن خود اندلس کے بعض مسلمان باشندے مرابطین کی عداوت میں عیسائیوں کی حمایت اور ہمدردی کا دم بھرتے تھے، اس رذیل اور ذلیل طرز عمل سے عیسائیوں کی ہمتیں پھر بڑھ گئی تھیں اور وہ مرابطین کی فوجوں کے مقابلے میں آنے لگے تھے۔ ابن رومیر کا یہ حملہ بھی اسی وجہ سے ہوا تھا لیکن ذی الحجہ سنہ ۵۱۵ھ میں غرناطہ کے قریب مسلمانوں نے اس کو تمیم بن یوسف بن تاشفین کی قیادت میں ایسی شکست دی کہ وہ اپنی آدھی فوج مروا کر برشلونہ

کی طرف بھاگ گیا۔ غرناطہ اور اس کے گرد و نواح میں عیسائی آبادی زیادہ تھی۔ یہاں کے باشندے ہمیشہ مسلمانوں کی مخالفت اور عیسائی بادشاہوں کی کامیابی کے لیے مختلف قسم کی سازشوں میں مصروف رہتے تھے۔ ان حالات سے باخبر ہو کر علی بن یوسف نے سنہ ۵۱۶ھ میں خود اندلس آ کر بہت سے عیسائیوں کو جو غرناطہ اور اس کے نواح میں سکونت پذیر تھے، افریقہ بھیج دیا اور بعض کو اندلس کے دوسرے مقامات میں منتقل کر دیا۔ سنہ ۵۲۰ھ میں علی بن یوسف بن تاشفین نے اپنے بیٹے تاشفین بن علی کو اندلس کا وائسرائے مقرر کیا اور ۲۶ برس مراکش اور اندلس پر حکومت کرنے کے بعد رجب سنہ ۵۳۷ھ میں انتقال کر گیا۔

ابو محمد تاشفین بن علی:

علی بن یوسف کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابو محمد تاشفین بن علی مسند حکومت پر بیٹھا۔ سنہ ۵۱۶ھ میں آخری مرتبہ علی بن یوسف آخری مرتبہ اندلس آیا تھا۔ اس کے بعد اس کو اندلس میں آنا نصیب نہیں ہوا۔ وہ مراکش میں محمد بن عبداللہ المعروف بہ مہدی موعود کے جھگڑوں میں مصروف رہا۔ مہدی موعود کا یہ فتنہ روز بروز ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ علی کا بیٹا ابو محمد تاشفین بھی باپ کے بعد تخت نشین ہوتے ہی مراکش کے اندرونی ہنگامے میں اس طرح مصروف رہا کہ وہ اندلس کی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکا۔ جب تاشفین بن علی مراکش جا کر سنہ ۵۳۷ھ میں باپ کی جگہ تخت نشین ہوا تو اس نے یحییٰ بن علی بن غالب کو اندلس کا وائسرائے مقرر کیا۔ یحییٰ نے جہاں تک ممکن ہوا اندلس کو بچایا اور عیسائیوں کا زور گھٹانے میں مصروف رہا۔ دوسری طرف مرابطین کی حکومت ضعف و انحطاط کے آثار نمودار ہوتے گئے یہاں تک کہ ۲۷ رمضان المبارک ۵۳۹ھ میں تاشفین بن علی ناکامی اور مایوسی کی حالت میں عبدالمومن سے شکست کھا کر انتقال کر گیا۔

تاشفین کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم بن تاشفین تخت نشین ہوا لیکن سنہ ۵۴۱ھ میں عبدالمومن نے مراکش کو فتح کیا اور ابراہیم بن تاشفین کو قتل کر دیا۔ اس طرح مرابطین کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اندلس میں جب مرابطین کے مغلوب و مقہور ہونے کی خبریں پہنچیں تو عیسائیوں نے پھر بڑے زور و شور کے ساتھ اسلامی مقبوضات پر حملے شروع کر دیے۔ سنہ ۵۳۸ھ میں ابن رومیر نے بعض شہروں کو فتح کیا تو یحییٰ بن علی نے ایک سخت لڑائی کے بعد ابن رومیر کو قتل کر دیا اور اس طرح سلطنت اسلامیہ کا رعب قائم کر دیا، لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی اور کم نصیبی کی یہ انتہا ہے کہ خود مسلمانوں ہی نے ان کی حکومت کو ختم کیا پھر اندلس میں مسلمانوں ہی کو اس کا سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔

مرابطین کی حکومت کے خاتمے کے اندلس پر اثرات:

عبدالمومن جو کہ ابن تومرت کا خاص مرید تھا، اس نے مرابطین کی حکومت کو مراکش میں ختم تو کر دیا

لیکن اس کے اثرات اندلس میں مسلمانوں کی حکومتوں پر بہت برے پڑے۔ مرابطین نے اندلس کے عیسائیوں پر مسلمانوں کا ایک رعب قائم کیا ہوا تھا، لیکن جونہی ان کی حکومت ختم ہوئی اندلس کے والیوں نے جابجا اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ جس طرح خلافت بنوامیہ کی اندلس میں بربادی کے بعد اندلس میں طوائف الملوکی نے جنم لیا تھا، اسی طرح اب بھی جو شخص جس چھوٹے بڑے شہر کا حاکم تھا اس نے وہاں اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی اندلس چھوٹے چھوٹے کثیر التعداد ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا، اور یہاں کے نام نہاد اور کمزور ترین حکمرانوں نے بڑے بڑے شاہانہ خطاب اپنے لیے تجویز کر لیے۔ پھر عیسائیوں سے زیادہ یہ ایک دوسرے کے دشمن بن گئے اور آپس میں ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے پر آمادہ ہو گئے۔ تمام اسلامی اندلس باہمی لڑائیوں اور ہنگامہ آرائیوں کے شور و غل سے گونج اٹھا۔ مسلمانوں کے اس باہمی تشتت وانتشار اور لڑائیوں سے عیسائیوں کو جزیرہ نما اندلس پر قابض ہو جانے کا زریں موقع مل گیا۔ خود وائسرائے اندلس یحییٰ بن علی بھی قرطبہ پر قبضہ کر کے طوائف الملوکی کا شکار ہو چکا تھا اور وہ اب دوسروں سے زیادہ طاقتور نہ رہا تھا۔ عبدالمومن نے مراکش سے مرابطین کی حکومت ختم کر کے بلاتوقف اپنا ایک سپہ سالار اندلس کی طرف روانہ کر دیا اور سنہ ۵۴۲ھ میں اندلس پر قابض ہو گیا اور چند روزہ طوائف الملوکی کے بعد اندلس اس طرح موحدین کی حدود و سلطنت میں شامل ہو گیا۔ مرابطین کے عہد حکومت میں علماء اور فقہاء کا خوب زور و شور تھا۔ یوسف اور علی دونوں بادشاہ مالکی مذہب کے پیرو اور علماء کے نہایت قدردان تھے۔ یہ دونوں عابد، زاہد اور علم دوست فرمان روا تھے مگر وہ اس معاملے میں کچھ اس قدر بڑھ گئے تھے کہ وہ فلسفہ اور علم کلام کے جانی دشمن بن گئے تھے۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ امام غزالی کی تصنیفات کے سخت خلاف تھے کیونکہ ان میں فلسفے اور علم الکلام پر مباحث موجود تھے۔

موحدین کی حکومت

مغرب کے قبائل میں ایک شخص محمد بن عبداللہ بن تومرت تھا۔ یہ شخص مراکش کے علاقہ سوس کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ یہ اصل میں بربری تھا لیکن بعد میں اس نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہے۔ سنہ ۵۰۱ھ میں یہ محمد بن عبداللہ اپنے وطن سے ممالک مشرقیہ کی طرف حصول علم کے لیے گیا۔ اس نے جامع قرطبہ میں معمولی ملازمت کر کے علوم دینی کی تحصیل شروع کر دی۔ پھر بغداد کا سفر کیا اور مدرسہ نظامیہ کے صدر مدرس امام غزالی رحمہ اللہ کے درس میں شریک ہوا۔ ابوبکر شاشی سے بغداد میں اصول فقہ اور دیگر دینی علوم حاصل کیے۔ مبارک بن عبدالجبار اور دوسرے بزرگوں سے حدیث پڑھی۔ علوم دینیہ کے حصول سے فراغت کے بعد یہ مغرب میں واپس آیا اور امام غزالی رحمہ اللہ کے خیالات کی اشاعت شروع کر دی۔ پھر کوہ اطلس کے قریب ایک صحرا میں قیام پذیر ہو گیا۔ مذہب سے اس کا شغف دیکھ کر بہت سے لوگ اس کے معتقد ہو گئے۔ لوگوں کے اس اعتقاد کو دیکھ کر اس نے مہدی ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اس کے معتقدین میں ایک شخص عبدالمومن بھی تھا۔ اس نے تومرت کی بڑی خدمت کی۔ یہ بھی بربری تھا۔ یہ ابن تومرت کی خدمت کرتے ہوئے اس کے خاص الخاص تلامذہ اور معتقدین کے زمرہ میں شامل ہو گیا، اور اس نے ابن تومرت کے خیالات اور عقائد کی نشر و اشاعت میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ عبدالمومن اپنے فطری جذبات و خیالات میں ابن تومرت سے پوری پوری مشابہت رکھتا تھا۔ جب لوگوں کی ایک کثیر تعداد ابن تومرت کی طرف متوجہ ہونے لگی تو مرابطین کے فقہائے دربار نے امیر کو مشورہ دیا کہ ابن تومرت کو قتل کر دیا جائے، لیکن علی بن یوسف بن تاشفین نے کہا کہ مجھے کوئی وجہ اس کے قتل کرنے کی نظر نہیں آتی۔ آخر کار علماء کے اصرار سے اس کو مراکش سے نکلوا دیا گیا اور یہ سلسلہ کوہ اطلس کے ایک گاؤں میں چلا گیا۔ بربری قبائل یہاں بھی جوق در جوق آ آ کر اس کی جماعت میں شامل ہونے لگے۔

لوگوں کی بڑھی ہوئی عقیدت اکثر و بیشتر آدمی کے دماغ کو خراب کر دیتی ہے اور وہ بڑے بڑے دعوے کرنے شروع کر دیتا ہے:

اللہ کے کچھ بندے معبود ہی بن بیٹھے
لوگوں میں نظر آئی جب خوئے جبیں سائی

ابن تومرت نے بھی لوگوں کی اس عقیدت کو دیکھ کر مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا اور اپنے مریدین کے طبقات مقرر کر دیے۔ طبقۂ اول کے لوگوں کو مہاجرین اور طبقہ ثانی کے لوگوں کو مومنین کا خطاب دیا۔ اسی طرح اس نے اپنے معتقدین کے سات آٹھ طبقات قائم کر دیے۔ اس زمانے میں مرابطین کا اقتدار بہت بڑھا ہوا تھا اور مراکش اور اندلس کے ایک بہت بڑے حصے پر ان کی حکومت کا پرچم لہرا رہا تھا۔ جب ابن تومرت کے ساتھ ایک بہت بڑی جماعت اکٹھی ہوگئی تو اس نے عبدالمومن کو سپہ سالار بنا دیا اور مرابطین کی حکومت کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔ اس وقت مرابطین کا بادشاہ علی بن تاشفین تھا۔

ابن تومرت نے تمام مسلمانوں کو دعوت دی کہ یہی زمانہ آداب دینیہ کے پھر زندہ کرنے کا ہے، اور میں مہدی ہوں اور فضائل اسلام اور عدل و انصاف کو از سر نو پھیلانے کے لیے آیا ہوں۔ اس نے اپنی جائے اقامت میں جو کہ سوس کے شہر تنمال میں تھی، ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ خواص کی ایک مجلس شوریٰ قائم کی جس میں انفوس جیسے دانش مند شاگرد شامل کیے۔ دوسری مجلس عام ستر (۷۰) آدمیوں کی قائم کی۔ مجلس خواص کا رکن رکین عبدالمومن کو بنایا۔

عبدالمومن کون تھا؟ مؤرخین نے بتایا ہے کہ یہ قبائل مسمودہ کے قبیلہ کومیہ کا ایک فرد تھا۔ اس کے باپ کا نام علی تھا۔ عبدالمومن سنہ ۴۸۷ھ میں پیدا ہوا۔ مراکش کے بعض قبائل مرابطین سے بغض و عناد رکھتے تھے، وہ سب ابن تومرت کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ جب فدائین کی ایک اچھی خاصی تعداد جمع ہوگئی تو سنہ ۵۰۶ھ میں انھوں نے مرابطین کی حکومت کے خلاف جنگ شروع کر دی اور تین لڑائیوں میں ان پر فتح حاصل کر لی۔ سنہ ۵۱۷ھ میں شہر مراکش کا محاصرہ کر لیا جو مرابطین کا دارالسلطنت تھا لیکن ناکامی کے باعث ابن تومرت کو ہٹنا پڑا، ازاں بعد عبدالرحمٰن نے پھر ہمت سے کام لیا اور تمام نقصانات کی تلافی کر لی۔ سنہ ۵۲۵ھ میں ابن تومرت تو مر گیا لیکن اس نے عبدالمومن کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ عبدالمومن نے بار حکومت کو سنبھالا۔ یہ عالم بھی تھا اور سپہ سالار بھی۔ اس کی جبلت میں استقلال کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ابن تومرت کی تعلیم کا خلاصہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی کامل توحید کو آشکارا کرنا تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کو اس کی ذات سے جدا تسلیم نہیں کرتا تھا، اس لیے اس کے تمام مریدین عام طور پر ''موحدین'' کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

عبدالمومن بار حکومت سنبھالنے کے بعد اپنے ساتھیوں کی دل جوئی اور خاطر و مدارات کچھ اس انداز سے کیا کرتا تھا کہ ہر ایک اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اس کی توجہ چونکہ ملک گیری کی طرف منعطف ہوئی تھی، لہٰذا اس نے تھوڑے ہی عرصے میں ایک ایسی مملکت پیدا کر لی جو مرابطین کی مملکت سے بڑھ کر تھی۔ جس قدر قبائل تنمال سے لے کر شہر ضالہ تک تھے وہ سب عبدالمومن کے تابع فرمان ہو گئے۔ سنہ ۵۳۲ھ میں بلاد فاس اور بلاد ضالہ کو بھی حاصل کر لیا۔ پھر تلمسان اور شہر عران پر بھی قبضہ جمایا اور اب اس کی نگاہ مراکش پر تھی۔ اس وقت تاشفین بن علی مرابطین کا حکمران تھا۔ اس سے تلمسان کے مقام پر جنگ ہوئی اور وہ شکست کھا گیا اور سنہ ۵۴۰ھ میں

مر گیا۔عبدالمومن کے سامنے جو قلعے آتے گئے وہ انھیں فتح کرتا ہوا ساحلی علاقے تک پہنچا۔اس قلعہ کے لوگ قلعہ بند ہو کر مقابلے کے لیے تیار تھے۔عبدالمومن نے اس دریا میں نہایت مضبوط بند باندھا جس کی وجہ سے اس کا پانی بڑھنے اور چڑھنے لگا۔ پھر اس نے دفعتاً اس بند کو کھول دیا۔اس ناگہانی سیلاب اور پانی کے ریلے سے دیوارِ شہر پناہ گر پڑی اور شہر غارت ہو گیا۔سنہ ۵۴۱ھ میں اس نے مراکش پر بھی قبضہ کر لیا۔

عبدالمومن نے نارمنڈی کے عیسائیوں کی طرف بھی توجہ کی۔شہر حنالہ سے کوچ کا حکم دیا۔ایک طبل بجوایا جس کا عمق پندرہ گز تھا اور اس کی آواز نصف میل کے فاصلے تک سنائی دیتی تھی۔ پھر وہ تیونس کی طرف روانہ ہوا۔سفر میں اسے چاروں طرف سے معزز سرداران قریش اور اکابر و مشائخ گھیرے ہوئے تھے۔وہ سب عمدہ گھوڑوں پر سوار تھے جن پر طلائی اور نقرئی زین کسے ہوئے تھے،اور ان کے ہاتھوں میں نیزے تھے جن کے نیچے ہاتھی دانت کی بوریاں تھیں اور اوپر مختلف رنگوں کی ڈوریاں لگی ہوئی تھیں۔ان کے پیچھے باجے والے تھے جن کے پاس قرنائیں اور جھانج وغیرہ آلات طرب تھے۔یہ لشکر صبح سے دوپہر تک چلتا اور باقی وقت آرام کرتا۔اس لشکر کے چار حصے تھے۔ہر ایک کا علم جداگانہ تھا اور ہر ایک کا زادراہ اور جملہ لوازمات ساتھ رہتے۔ آخر کار نارمنڈیوں سے مقابلہ ہوا اور انھیں شکست دی۔ پھر تیونس اور قیروان فتح کر لیے اور اس کے بعد جزیرہ سسلیہ کے بادشاہ کو بھی زک دی۔ پھر جزیرہ بلیارہ تک موحدین نے اپنی حکومت کے دائرہ کو وسیع کر لیا۔

سنہ ۵۳۶ھ میں اپنے ایک سرادر ابو عمران موسیٰ بن سعید کو اندلس روانہ کیا۔اس نے سب سے پہلے جزیرہ طریف پر قبضہ کیا۔ پھر اگلے سال مالقہ اور اشبیلیہ کی طرف بڑھا۔اس کے بعد قرطبہ پر بھی موحدین کا قبضہ ہو گیا۔سنہ ۵۴۱ھ میں عبدالمومن نے خود اندلس آنے کا ارادہ کیا لیکن عین روانگی کے وقت مراکش کی مشرقی حدود میں شورش اور بغاوت کے نمودار ہونے کی خبر سن کر رک گیا اور اپنے بیٹوں کو اندلس روانہ کیا۔ چنانچہ ابوسعید بن عبدالمومن نے السیرہ کو فتح کیا۔قرطبہ اس سے قبل سنہ ۵۴۵ھ عبدالمومن کے ایک جرنیل یحییٰ بن میمون نے جب کہ عیسائی اس کا محاصرہ کیے ہوئے تھے،عیسائیوں کو بھگا کر فتح کر لیا تھا۔سنہ ۵۴۸ھ میں عبدالمومن آبنائے جبل الطارق کو عبور کر کے اندلس میں داخل ہوا اور اندلس کے جنوبی ساحل پر ایک شہر کا سنگ بنیاد رکھا گیا جس کا نام ''الفتح'' رکھا گیا۔یہیں اندلس کے تمام والی اور امراء آ آ کر عبدالمومن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔سب نے اقرار اطاعت کیا اور اپنی فرماں برداری کا یقین دلایا۔اس طرح تمام اسلامی اندلس پھر ایک ہی سلطنت سے وابستہ ہو گیا۔

سنہ ۵۵۵ھ عبدالمومن نے اپنے بیٹے ابوسعید کو غرناطہ کا حاکم اور تمام اسلامی اندلس کا وائسرائے مقرر کیا۔سنہ ۵۵۶ھ میں ابوسعید کو کسی اہم کام کے سلسلے میں باپ کے پاس مراکش جانا پڑا۔اس کی غیر موجودگی میں ابراہیم نامی ایک شخص نے موقع پا کر غرناطہ پر قبضہ کر لیا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔یہ خبر سن کر ابوسعید اپنے بھائی کو ساتھ لے کر اندلس آیا۔ابراہیم نے غرناطہ سے نکل کر ان کا مقابلہ کیا۔دونوں فوجوں میں گھمسان کا

رن پڑا۔ ابوحفص اس لڑائی میں مارا گیا۔ ابوسعید نے شکست کھائی اور مالقہ میں جا کر قیام کیا۔ ابراہیم کا داماد مردنیش مرسیہ اور جیاں کا حاکم تھا۔ اس نے بھی ابراہیم کا ساتھ دیا اور اندلس میں مسلمانوں کی حکومت پھر معرض خطر میں پڑ گئی۔ عبدالمومن نے سنہ ۵۵۷ھ میں اپنے تیسرے بیٹے ابو یعقوب کو اور اپنے فوجی جرنیل شیخ ابو یوسف بن سلیمان کو ابوسعید کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ ادھر ابوسعید نے بھی مالقہ میں کافی فوج فراہم کر لی تھی۔ اب یہ تینوں پھر فوج لے کر غرناطہ پر حملہ آور ہوئے اور غرناطہ کے متصل پھر ایک دفعہ زبردست جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں موحدین کے لشکر کو فتح حاصل ہوئی۔ مردنیش تو فرار ہو گیا اور ابراہیم نے عفو کی درخواست کی جو منظور ہوئی۔ اس بغاوت کے فرو ہونے کے بعد عبدالمومن کے لیے اب کوئی پریشانی باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ اب اس نے عیسائیوں کے مقابلے کے لیے اندلس اور افریقہ میں فوجوں کو جمع کرنا شروع کیا۔ تین لاکھ فوج مراکش میں عبدالمومن کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی اور دو لاکھ سپاہی کے قریب اندلس میں جہاد کے لیے آمادہ اور متحد ہو گئے۔ اس طرح پانچ لاکھ کے قریب لشکر کو لے کر عبدالمومن نے ارادہ کیا کہ اندلس کی شمالی عیسائی ریاستوں کو فتح کرتا ہوا یورپ کو مفتوح بنائے، لیکن عبدالمومن کی وفات کا وقت آ گیا اور وہ اپنے اس ارادے کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ اگر عبدالمومن کی عمر وفا کرتی تو وہ عیسائیوں کے خلاف جہاد میں یقیناً کامیابی حاصل کرتا لیکن عین اس وقت جب کہ وہ اس جہاد کے لیے اپنی اس کثیر التعداد فوج کے ساتھ روانہ ہونے کو تھا، جمادی الآخر سنہ ۵۵۸ھ کے آخری جمعہ کو انتقال کر گیا۔

ابو یعقوب:

عبدالمومن تو اللہ کے حضور پہنچ گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابو یعقوب یوسف تخت نشین ہوا اور عیسائی ریاستوں اور یورپ کے ملکوں کو فتح کرنے کی مہم جس کو عبدالمومن پورا کرنا چاہتا تھا، بعض اندرونی پیچیدگیوں کے باعث ناتمام رہی۔ عبدالمومن کی وفات کے بعد عیسائیوں کو موقع ملا اور انھوں نے اندلس کے بعض مغربی اضلاع پر قبضہ کر لیا اور ان کا کوئی تدارک نہ ہو سکا۔ دوسری طرف مردنیش حاکم جیاں و مرسیہ نے خود مختاری کا اعلان کر کے عیسائیوں کو تقویت پہنچائی۔ ابو یعقوب نے مراکش سے دس ہزار فوج لے کر اندلس کا قصد کیا اور اشبیلیہ میں آ کر مقیم ہوا۔ ابو یعقوب کے اشبیلیہ آنے کے بعد ہی مردنیش حاکم مرسیہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بیٹوں نے آ کر اپنے باپ کا تمام علاقہ ابو یعقوب یوسف کی نذر کر دیا اور اطاعت و فرماں برداری کی گردنیں جھکا دیں۔ ابو یعقوب نے بھی ان کے ساتھ بڑی رعایت کا برتاؤ کیا اور ان کے باپ کے علاقے پر ان کو حاکم مقرر کر دیا۔ اس کے بعد وہ مغربی اندلس کے عیسائیوں کی طرف متوجہ ہوا اور وہ تمام علاقہ جو انھوں نے دبا لیا تھا، واپس چھین لیا۔ اس کے بعد طلیطلہ کا محاصرہ کیا، لیکن پھر کسی ضرورت کے باعث محاصرہ اٹھا کر واپس مراکش چلا گیا۔ ازاں بعد ایک بغاوت کے سلسلے میں ابو یعقوب واپس اندلس آیا اور شنترین کے باغیوں کا محاصرہ کیا،

لیکن محاصرہ کو ایک ہی مہینہ گزرا تھا کہ ابو یعقوب سخت بیمار ہو کر ۷/رجب سنہ ۵۸۰ بروز جمعہ انتقال کر گیا۔ اس کی لاش مراکش لے جا کر دفن کر دی گئی۔

ابو یعقوب بڑا نیک دل، علم دوست اور روشن خیال شخص تھا۔ ابو بکر محمد بن طفیل جو فلسفہ اور علم کلام کا امام سمجھا جاتا ہے، ابو یعقوب کا مصاحب اور مشیر خاص تھا۔ اسی طرح اور دوسرے کئی علماء اس کے مشیر تھے۔ ابو بکر محمد بن طفیل کی ترغیب سے ابو یعقوب نے ابو الولید محمد بن احمد بن محمد بن رشد کو قرطبہ سے بلوا کر اپنے مصاحبین میں شامل کیا۔ یہ وہی ابن رشد ہیں جو فلسفہ کے مشہور امام اور ارسطو کی تصانیف پر بہترین تنقید کرنے اور اس کی کمزوریاں ظاہر کرنے والے شخص ہیں۔ آج بھی اپنے رشد کے نام سے یورپ اور تمام علمی دنیا کا بچہ بچہ آشنا ہے۔ فقہ میں بھی ان کی ایک کتاب ''بدایۃ المجتہد'' کے نام سے اہل علم کے ہاں معتبر سمجھی جاتی ہے۔ ابو یعقوب کے عہد حکومت میں مراکش سے طرابلس تک ممالک افریقہ اور تمام اندلس، جزیرہ صقلیہ اور بحر روم کے دوسرے جزائر سب موحدین کی سلطنت میں شامل ہو گئے تھے اور موحدین کا یہ فرمان روا دنیا کے عظیم الشان بادشاہوں میں شمار ہوتا تھا۔

ابو یوسف منصور:

ابو یعقوب یوسف کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ابو یوسف تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۳۲ سال تھی۔ یہ ایک عیسائی عورت ساحرہ نامی کے بطن سے تھا۔ منصور ہر طرح اپنے باپ کے مشابہ تھا۔ کتابوں کا شائق اور علماء کا قدر دان تھا۔ اس نے اپنی حکومت کا اکثر زمانہ اندلس میں گزارا۔ سنہ ۵۸۵ھ میں منصور نے اندلس کے مغربی حصے سے عیسائیوں کے اثر کو بالکل ختم کر دیا۔ طلیطلہ کے بادشاہ الفانسو ثانی نے منصور کے حضور پانچ سال کے لیے صلح کی درخواست پیش کی جو منظور کر لی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ کے ہر ملک کے عیسائی اکٹھے ہو کر شام اور فلسطین پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ الفانسو دوم کو یہ خوف تھا کہ کہیں منصور میرا نام ونشان نہ مٹا دے۔ اس لیے اس نے پانچ سالہ صلح کی درخواست کی اور اس کو منظور کروا کر اپنا پورا اطمینان کر لیا کہ اس عرصے میں صلیبی مجاہدین فارغ ہو کر میری مدد کو پہنچ سکیں گے۔ خود اندلس کے عیسائی بھی شام اور فلسطین سے صلیبی حملوں میں بکثرت شامل ہوتے تھے۔

شاہ طلیطلہ کا دھوکہ اور شکست:

طلیطلہ کے بادشاہ الفانسو دوم منصور سے پنج سالہ صلح کر کے بالکل مطمئن ہو گیا کیونکہ وہ مسلمانوں کے بارے میں جانتا تھا کہ وہ وعدہ کر کے کبھی حملہ آور نہیں ہوں گے۔ اس پنج سالہ صلح نامے سے اس نے دو فائدے اٹھائے۔ ایک تو صلیبی جنگوں میں عیسائیوں کی مدد کی۔ دوسرے اس عرصے میں اس نے خوب فوجی تیاریاں کیں

اور عیسائی سلاطین کو اپنی مدد کے لیے آمادہ کیا اور اپنی اس تیاری کو بھی صلیبی جنگوں کی مثل مذہبی جہاد قرار دے کر آسانی کے ساتھ عیسائیوں سے امداد و اعانت حاصل کی۔ جب پنج سالہ مدت صلح گزر گئی تو رجب سنہ ۵۹۱ھ میں کئی عیسائی بادشاہوں اور ان کی فوجوں کو ساتھ لیے ہوئے بطلیوس کے علاقہ مالار میں پہنچا تھا کہ دوسری طرف سے منصور مقابلے کے لیے پہنچ گیا۔ یہاں دونوں لشکروں کے درمیان خوب گھمسان کا رن پڑا۔ عیسائیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی فوج کی تعداد بہت ہی تھوڑی تھی لیکن عیسائی اپنی فوج کے ایک لاکھ ۴۶ ہزار آدمیوں کو قتل اور تیس ہزار کو قید کرا کر میدان جنگ سے فرار ہوئے۔ یہ ایک بہت بڑی اور نہایت عظیم الشان فتح تھی جو منصور کو حاصل ہوئی اور اس فتح نے عیسائیوں کی ہمت کو بہت پست کر دیا۔ اس لڑائی میں ڈیڑھ لاکھ خیمے، اسی ہزار گھوڑے، ایک لاکھ خچر اور چار لاکھ بار برداری کے گدھے اور ساٹھ ہزار مختلف وضع کے زرہ بکتر مسلمانوں کے ہاتھ آئے جس سے بہ آسانی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ عیسائیوں کی تیاریاں کیسی مکمل اور کتنی بڑی تھیں؟ اور منصور کے خلاف الفانسو دوم نے کیسی زبردست طاقت فراہم کی تھی۔ منصور نے یہ مال غنیمت جس میں بہت سا زر و جواہر بھی شامل تھا، سب کا سب اپنی فوج کے سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔

الفانسو دوم میدان جنگ سے اپنی بقیہ فوج کے ساتھ رباح میں پناہ گزین ہوا۔ منصور بھی پاشنہ کوب پہنچا اور اس قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ الفانسو یہاں سے بھاگ کر طلیطلہ آ گیا اور اس شرم انگیز شکست کے غم و غصہ میں سر اور داڑھی کو منڈوا ڈالا اور صلیب کو اٹھا کر قسم کھائی کہ جب تک ان لاکھوں عیسائی مقتولوں کا انتقام نہ لے لوں گا اس وقت تک عیش و آرام کو حرام سمجھوں گا۔ منصور کو جب معلوم ہوا کہ الفانسو نے طلیطلہ میں جا کر اس طرح قسم کھائی ہے اور وہ دوبارہ جنگی تیاریوں میں مصروف ہے تو وہ بلا توقف طلیطلہ پر حملہ آور ہوا اور شہر کا محاصرہ کر کے قلعہ شکن توپوں سے فصیل اور قلعہ کی دیواروں کو چھلنی کر دیا۔ قریب تھا کہ شہر اور الفانسو دونوں منصور کے قبضے میں آ جائیں اس سقیم حالت میں الفانسو نے اپنی ماں اور بیوی اور بیٹیوں کو منصور کے پاس بھیجا۔ یہ عورتیں سر برہنہ روتی ہوئی منصور کے پاس آئیں اور الفانسو کی ماں نے اپنے بیٹے کے لیے عفو تقصیرات کی درخواست کرتے ہوئے اس قدر آہ و زاری کی کہ منصور اس کی اس حالت کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکا۔ آنسوؤں کے دریا نے خون کے آنسوؤں پر غلبہ حاصل کر لیا اور قہر و غضب کو صفت رحم سے مغلوب ہونا پڑا۔ منصور مسلمان تھا۔ اگر کوئی عیسائی ہوتا تو وہ کسی مسلمان ماں کی اس طرح کی آہ و زاری سے متاثر نہ ہوتا لیکن مسلمان آخر کار رحمۃ للعالمین ﷺ کی امت ہیں۔ منصور نے الفانسو کی ماں، بیوی اور بیٹیوں کی بہت دل دہی اور تشفی کی۔ ان کو گراں بہا زیورات اور انعام و اکرام سے مالا مال کر کے عزت و حرمت کے ساتھ شہر میں واپس بھیجا اور اسی وقت طلیطلہ کا محاصرہ ختم کر کے واپس قرطبہ آ گیا۔ الفانسو نے منصور کے قرطبہ چلے جانے کے بعد اپنے سفیروں کو اقرار اطاعت اور عہد نامہ کی تحریر و تکمیل کے لیے روانہ کیا اور انھوں نے حاضر دربار ہو کر عہد نامہ کی تحریر و تکمیل کی۔ منصور کے پاس جو تیس چالیس ہزار قیدی تھے، ان کو منصور نے مراکش بھیج کر آباد کرا دیا اور ان کو ایک الگ

قبیلہ قرار دیا گیا۔

منصور نہایت نیک طینت، بہادر، زاہد و عابد اور متبع سنت فرمان روا تھا۔ ابن رشد نے سنہ ۵۹۴ھ کے آخری ایام میں منصور کے عہد حکومت میں مراکش میں وفات پائی۔ صفر سنہ ۵۹۵ھ میں منصور قریباً پندرہ سال کی فرماں روائی کے بعد انتقال کر گیا۔ اسی سال انگلستان کا بادشاہ رچرڈ بھی فوت ہوا جو صلیبی جنگوں میں ایک اہم کردار ادا کر رہا تھا، لیکن صلاح الدین ایوبی نے اس کی کسی تدبیر کو کامیاب نہ ہونے دیا اور یہ عیسائی بادشاہ رچرڈ شیر دل کا خطاب پانے کے باوجود صلاح الدین ایوبی کے مقابلے میں کامیابی اور کامرانی حاصل نہ کر سکا۔

ابوعبداللہ محمد:

منصور کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابوعبداللہ محمد ماہ صفر سنہ ۵۹۵ھ میں بعمر سترہ (۱۷) سال تخت نشین ہوا اور اپنا لقب ناصرلدین اللہ رکھا۔ بادشاہ ناصر کے عہد حکومت میں مراکش کے مشرقی ممالک میں بغاوت و بدامنی پیدا ہوئی اور سلطنت مرابطین کے بعض متوسلین نے جمعیت فراہم کر کے ملکوں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ ناصر اس بغاوت و بدامنی کے رفع کرنے کے لیے مراکش میں مقیم رہا۔ ادھر سلطان صلاح الدین ایوبی سے شام و فلسطین کے میدانوں میں شکست کھا کر جو بقیۃ السیف عیسائی یورپ کے ملکوں میں واپس آئے، انھوں نے شام و فلسطین کی ہزیمتوں کا انتقام اندلس و مراکش کی اسلامی سلطنت سے لینا چاہا اور برشلونہ، کیسٹل اور لیون وغیرہ کے عیسائی سلاطین کے پاس یورپ کے ہر ملک سے عیسائی جنگجو آ کر جمع ہوئے۔ روم کے پوپ نے سلطنت موحدین کے خلاف جہاد کا عام اعلان کیا۔ انھی ایام میں انگلستان کے بادشاہ جان کے خلاف انگلستانی امراء نے کوشش شروع کی اور پوپ انوسنٹ سوم نے بادشاہ جان کے ملت عیسوی سے خارج ہونے کا اعلان کیا۔ جان نے اپنے تین سرداروں کا ایک وفد ناصرلدین اللہ کے پاس مراکش روانہ کیا۔ اس سفارت میں ٹامس ہارڈنگٹن، ریلف فرنکولس اور لندن کا پادری رابرٹ شامل تھے۔ یہ سفارت سنہ ۶۰۶ھ میں مراکش پہنچی۔ ارکان سفارت کئی ایوان اور ڈیوڑھیوں میں سے گزرتے ہوئے جن کے دونوں طرف شاہی خدام کی صفیں ایستادہ تھیں، امیر ناصرلدین اللہ کے سامنے پہنچے۔ اس وقت امیر موصوف مطالعہ کتب میں مصروف تھا۔ ارکان وفد نے شاہ انگلستان کا خط پیش کیا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ آپ میری مدد کریں اور میرے ملک کی بغاوت فرو کرنے کے لیے فوجیں بھیج دیں۔ یہ بھی لکھا تھا کہ میں دین عیسوی کو ترک کر کے مسلمان ہونے پر آمادہ ہوں۔ پادری رابرٹ اس سفارت کا پیشوا تھا۔ اس نے بھی امیر ناصر سے ایسی باتیں کیں جس سے امیر ناصر کو یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ یہ لوگ دنیوی مقاصد کے لیے بطور رشوت تبدیلی مذہب کا لالچ دیتے ہیں۔ اس لیے ناصرلدین اللہ نے اس سفارت کی کچھ زیادہ قدر نہ کی اور کم التفاتی کے ساتھ رخصت کر کے اس امر کا منتظر رہا کہ شاہ انگلستان اگر اسلام کی صداقت کو تسلیم کر چکا ہے تو وہ ضرور میری اس کم التفاتی کے بعد بھی اپنے اسلام کا اعلان کرے گا اور اس

وقت اس کی امداد کے لیے جنگی بیڑہ روانہ کر دیا جائے گا۔

امیر ناصر بہت دھیمی طبیعت کا آدمی تھا۔ جنگ و پیکار کے ہنگامے برپا کرنے کا اس کو شوق نہیں تھا۔ اسی لیے وہ فوج جو اس کے باپ کے زمانے میں بڑی طاقتور اور باہمت تھی، امیر ناصر کی کم التفاتی سے اس کے سردار بددل ہو رہے تھے۔ علاوہ ازیں سابق امیر کے عہد حکومت میں فوج کے ہر سپاہی کو علاوہ مقرر تنخواہ کے ہر سہ ماہی پر بادشاہ کی طرف سے انعامات ملا کرتے تھے۔ امیر ناصر کے عہد میں ان انعامات کے موقوف ہونے سے سپاہی افسردہ خاطر تھے۔ سنہ ۶۰۸ھ میں امیر ناصر افریقہ کی مہمات سے فارغ ہو کر اندلس کی جانب متوجہ ہوا۔ یہاں طلیطلہ میں شاہ کیسٹل الفانسو کے گرد یورپ کے ہر ملک اور ہر حصے سے عیسائی لوگ جوق در جوق آ آ کر جمع ہو رہے تھے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام براعظم یورپ کی پوری طاقت اور شاہان یورپ کے جمیع جنگی سامان اسلام کشی کے لیے جزیرہ نمائے اندلس میں فراہم ہو گئے تھے۔ شام و فلسطین کے مقابلے میں اندلس یورپ سے قریب بھی تھا اور عیسائی ریاستوں کی حدود اندلس کے ہموار میدانوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس لیے وسط اندلس میں عیسائی طاقت کی یہ سب سے بڑی نمائش بہ آسانی ممکن ہوئی۔

ناصرلدین اللہ نے عیسائیوں کی اس عظیم الشان تیاری اور یورپ کے ہر ملک میں مسلمانوں کے خلاف اعلان جہاد کا حال سن کر مراکش و اندلس سے فوجوں کو فراہم کیا اور جہاد کا اعلان کرایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھ لاکھ کے قریب منظم فوج اور مجاہدین اشبیلیہ میں جمع ہو گئے۔ اس لشکر کو لے کر امیر ناصرلدین اللہ شہر جیان کی طرف روانہ ہوا۔ ادھر الفانسو اپنے لاتعداد لشکر کو لیے ہوئے شہر سالم کے قریب مقام العقاب میں آ کر خیمہ زن ہوا۔ دوسری جانب سے اسلامی لشکر بھی شہر جیان سے العقاب میں آیا۔ عیسائی انتقام کے جوش میں از خود رفتہ ہو رہے تھے اور ملک شام کی ناکامیوں کا بدلہ اندلس میں مسلمانوں سے لینا چاہتے تھے۔ ادھر اسلامی لشکر کی حالت عجیب تھی۔ باقاعدہ فوج جو اچھی طرح مقابلہ کی قابلیت رکھتی تھی، سب اپنے امیر سے برگشتہ تھی کیونکہ ان کو کئی مہینے سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ فوجی افسروں کی خواہش یہ تھی کہ اس لڑائی میں ان کے بادشاہ کو شکست ہو اور وہ اس تلخ تجربہ کے بعد فوج پر روپیہ صرف کرنے اور انعام و اکرام دینے میں بخل کو کام میں نہ لائے۔ چنانچہ ۱۵/ ماہ سنہ ۶۰۹ھ کو جب لڑائی شروع ہوئی تو اسلامی لشکر سے بعض سردار اپنی ماتحت جمعیتوں کو لے کر جدا ہو گئے۔ بعض سرداروں اور سپاہیوں نے حملے کے وقت دانستہ اپنے نیزوں کو ٹیڑھا کر کے بجائے اس کے کہ دشمنوں کے سینوں کو چھیدتے، زمین میں گاڑا اور تلواروں کو دشمنوں کی طرف پھینک دیا۔ بعض نے عجیب و غریب تمسخر انگیز حرکات کا اظہار کیا اور معرکۂ جنگ کے شروع ہونے کے بعد امیر ناصر کے احکام کی تعمیل ترک کر دی۔ زبردست اور باقاعدہ مسلح فوج کی یہ نامعقول و ناستودہ حرکات دیکھ کر مجاہدین کے حوصلے بھی پست ہو گئے۔ امیر ناصر کے بخل کا یہ خطرناک نتیجہ اور مراکش و بربری لشکر کی یہ رذیلانہ غداری اسلام اور مسلمانوں کے لیے بے حد مضر ثابت ہوئی۔ اندلس کے کسی میدان میں آج تک اتنی بڑی فوجیں نبرد آزمانہ ہوئی تھیں۔ عین معرکۂ جنگ میں اسلامی

لشکر کا ایک بڑا حصہ یہ غداری نہ دکھاتا تو یورپ کی اس عظیم الشان اور متفقہ فوج کو یقیناً مسلمانوں کے ہاتھ سے ہزیمت اٹھانی پڑتی اور آئندہ کبھی عیسائیوں کو مسلمانوں کے مقابلے کی ہمت نہ ہوتی کیونکہ جو انجام وہ شام و فلسطین میں دیکھ کر آئے تھے، اس سے بدتر انجام ان کا اندلس میں ہوتا۔ مگر حسرت و افسوس کے ساتھ بیان کرنا پڑتا ہے کہ اس چھ لاکھ کے اسلامی لشکر کا انجام یہ ہوا کہ اپنے امیر کی نافرمانی کر کے سب کا سب عیسائیوں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ امیر ناصر نے شمشیر زنی میں مطلق کوتاہی نہیں کی اور اکثر مجاہدین نے اپنے امیر کا ساتھ دیا۔ صرف ایک ہزار آدمی اس چھ لاکھ کے لشکر میں سے زندہ بچے اور وہ بھی بہ مشکل امیر ناصر کو میدان جنگ سے واپس لانے میں کامیاب ہوئے۔ باقی سب یا تو میدان جنگ میں لڑ کر شہید ہوئے یا عیسائیوں کے ہاتھ میں قید و گرفتار ہو گئے۔ گرفتار ہونے والوں کو توقع تھی کہ ہم کو آزاد کرا لیا جائے گا مگر عیسائیوں نے اسی میدان العقاب میں سب کو ذبح کر ڈالا۔

امیر ناصر اشبیلیہ میں شکست خوردہ واپس آیا اور عیسائیوں نے اندلس کے شہروں کو لوٹنا اور مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ شہر جیان کی تمام مسلم آبادی کو گرفتار کر کے مردوں، بچوں اور بوڑھوں، عورتوں کو قتل کر ڈالا۔ الفانسو نے جب دیکھا کہ عیسائی مجاہدین تمام ملک کو تہ تیغ کرنے اور اموال و اسباب کے لوٹنے میں مطلق العنان ہیں تو اس نے ان کو روکنا اور اپنے زیر اقتدار رکھنا چاہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے ناراض ہو ہو کر دوسرے ممالک کے عیسائی اپنے اپنے ملکوں کو واپس ہونے لگے جس کو الفانسو نے بہت ہی غنیمت سمجھا۔ جنگ العقاب نے اندلس میں اسلامی سلطنت کی جڑوں کو ہلا دیا۔ اس کے بعد سلطنت موحدین اور مغرب میں مسلمانوں کی حکومت جلد جلد زوال پذیر ہونے لگی۔ ساقش میں بہت سے قصبے اور گاؤں اس لڑائی کے بعد ویران ہوئے کیونکہ ان کے باشندے اس لڑائی میں کام آ گئے تھے۔ امیر ناصر چند روز اشبیلیہ میں مقیم رہ کر مراکش میں آیا اور ۱۰/ شعبان سنہ ۶۱۰ھ بروز چہار شنبہ فوت ہو کر اگلے روز، بروز پنجشنبہ مدفون ہوا۔

یوسف مستنصر:

امیر ناصر کی وفات کے بعد ۱۱/ شعبان سنہ ۶۱۰ھ کو اس کا بیٹا یوسف تخت نشین ہوا اور اپنا لقب مستنصر رکھا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۱۶ سال کی تھی۔ وہ یکم شوال سنہ ۵۹۴ھ کو پیدا ہوا تھا۔ دس سال تخت نشین رہ کر سنہ ۶۲۰ھ کے ماہ شوال میں لاولد فوت ہوا۔ یہ نہایت عیش پرست اور کم ہمت شخص تھا۔ اس کے عہد حکمرانی میں عیسائیوں نے اندلس کے اکثر حصہ پر قبضہ کر لیا۔ بعض صوبوں کے والیوں نے اپنے صوبوں کو جواں مردی کے ساتھ عیسائیوں کی دستبرد سے محفوظ رکھا مگر مستنصر مرتے وقت تک مراکش سے باہر نہ نکلا اور بادشاہ ہو کر کبھی اندلس میں نہ آیا۔

عبدالواحد:

مستنصر کی وفات کے بعد اس کا بھائی عبدالواحد تخت نشین ہوا۔ نو مہینے کے بعد موحدین کے امراء نے اس کو معزول و مقتول کر کے شیرازہ حکومت کو درہم برہم کر دیا۔

عبدالواحد عادل:

ان دنوں امیر منصور کا ایک بیٹا یعنی امیر ناصر کا بھائی مسمی عبدالواحد اندلس کے صوبہ مرسیہ کا والی تھا۔ اس نے عبدلواحد بن ناصر کے مقتول ہونے کا حال سن کر خود سلطنت کا دعویٰ کیا اور اپنا لقب عادل رکھا۔ عادل نے مرسیہ میں تخت سلطنت پر جلوس کیا۔

اسی سال یعنی سنہ ۶۲۱ ھ میں عیسائیوں نے اس پر حملہ کیا۔ اس لڑائی میں عادل کو شکست ہوئی۔ اس شکست کے بعد عادل اپنے بھائی ادریس کو اشبیلیہ میں اپنا نائب السلطنت مقرر کر کے خود مراکش چلا گیا۔ وہاں اہل مراکش نے ایک نوعمر لڑکے یحییٰ بن ناصر کو اپنا بادشاہ بنا کر عادل کا مقابلہ کیا۔ اس لڑائی میں عادل گرفتار ہو گیا۔ یہ حالت دیکھ کر ادریس نے اشبیلیہ میں اپنی تخت نشینی کی رسم ادا کی اور اپنا لقب مامون رکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ موحدین کا رعب اندلس اور مراکش دونوں ملکوں سے اٹھ چکا تھا۔ مراکش میں بنی مرین ملک کو دباتے چلے جاتے تھے۔ ادھر اندلس میں مسلمان امراء کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمارے ملک پر مراکش و بربر کے لوگ کیوں حکمران ہوں؟ اب ہم کو خود اپنا کوئی امیر منتخب کرنا چاہیے تاکہ ہم عیسائیوں کی محکومی سے بچ سکیں۔ ورنہ اگر اور چند روز تک ہمارا ملک ایسے ہی کمزور مراکشی فرماں رواؤں کے ماتحت رہا تو عیسائی بڑی آسانی سے تمام اندلس پر قابض و متصرف ہو کر ہم کو اپنا غلام بنالیں گے۔ چنانچہ شاہان سرقسطہ بنی ہود کی نسل سے ایک شخص محمد بن یوسف نے مامون کو اندلس سے خارج کر کے اپنی حکومت کی بنیاد قائم کی۔

حکومت موحدین کا خاتمہ:

اس طرح سنہ ۶۲۵ ھ میں موحدین کی حکومت کا نام و نشان اندلس سے گم ہو گیا۔ مامون نے اندلس کو چھوڑ کر مراکش کی بندرگاہ سبطہ میں قیام کیا۔ وہاں پر جب اس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا رشید تخت نشین ہوا۔ بنی مرین مراکش میں اپنی طاقت کو دم بدم ترقی دے رہے تھے۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۶۶۸ ھ میں موحدین کا نام و نشان گم ہو گیا اور مراکش میں بنی مرین کی حکومت پورے طور پر قائم ہوگئی۔

اندلس میں طوائف الملوکی

اندلس کی خلافت بنوامیہ کے تاخت و تاراج کے بعد تمام اسلامی اندلس میں بہت سی خودمختار مسلم ریاستیں قائم ہوگئی تھیں جن کا زیادہ تر کام آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت تھا۔ اس باہمی مخالفت سے مخالف عیسائی طاقتوں کو بہت فائدہ پہنچا اور انھوں مختلف ریاستوں کو ہڑپ کرنے کے بعد اسلامی حکومت کے رقبہ کو کم کر کے اپنی حدود سلطنت کو وسیع کرلیا۔ مرابطین نے ان مسلم علاقوں کو عیسائیوں سے واپس لیا۔ مرابطین کی سلطنت کی بربادی کے بعد جب موحدین کی حکومت قائم ہوئی تو اس تبدیلی سے بھی عیسائیوں نے فائدہ اٹھایا اور عیسائی مقبوضات اندلس میں وسیع ہوگئے۔ اب موحدین کی حکومت کے انحطاط اور زوال کے بعد تمام یورپ مسلمانوں کی بیخ کنی اور بربادی پر آمادہ ہوگیا۔ جنگ العقاب نے نہ صرف موحدین کی حکومت کو پیغام مرگ دیا بلکہ عیسائیوں کے مقبوضات کو وسیع سے وسیع تر کردیا۔ یہ ایسا خطرناک موقع تھا کہ مسلمانوں کا نام ونشان اندلس سے مٹایا جاسکتا تھا، لیکن عیسائی فوجیوں کی نالائقیوں اور بدعنوانیوں نے اندلسی عیسائیوں کو ان سے متنفر کردیا۔ لہٰذا مسلمانوں کی تاراجی اور بربادی بلکہ کلی استیصال کا کام کسی دوسرے وقت کے لیے ملتوی ہوگیا۔ موحدین کی سلطنت جب ختم ہوئی تو اندلس کا نصف سے زیادہ شمالی حصہ اور قریباً تمام مغربی صوبے عیسائیوں کے قبضے میں چلے گئے تھے، اور مسلمان سمٹتے سمٹتے جنوب مشرق کی طرف آگئے تھے، اب جو طوائف الملوکی پیدا تو ہوئی اس میں اسلامی اندلس کا رقبہ نہایت مختصر اور محدود ہوکر رہ گیا تھا اور اسلامی حکومتیں چھوٹے چھوٹے علاقوں میں منقسم ہوگئی تھیں اور ہر رئیس سلطنت کے قبضے میں چھوٹے چھوٹے علاقے تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ آپس میں دست وگریباں تھے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ اب حالت یہاں تک بگڑ چکی تھی کہ ایک مسلمان رئیس دوسرے مسلمان رئیس کو تباہ و برباد کرانے کے لیے عیسائی بادشاہ کو دعوت دیتا اور اس برادر کشی کے کام سے فارغ ہوکر اپنی حکومت کے بعض شہر اور قلعے بھی عیسائی بادشاہ کی نذر کردیتا۔ اس طرح مسلمانوں کی ان نالائقیوں سے عیسائی بہت خوش ہوتے کہ ہمارا مقصود ہمارے دشمن کے ہاتھوں ہی سے حاصل ہورہا ہے۔

سنہ ۵۰۳ھ احمد مستعین بن ابوعامر عیسائیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے سرقسطہ کے سامنے شہید ہوا تھا۔ یہ سرقسطہ کے بادشاہوں میں چوتھا بادشاہ تھا۔ اس کی اولاد میں ایک شخص محمد بن یوسف تھا جو موحدین کی حکومت

کے آخری ایام میں اندلس میں رئیسانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس نے جب معاملہ ڈھیلا ہوتے دیکھا تو وہ قزاقوں کے ایک گروہ میں شامل ہو کر ان کا سردار بن گیا اور رفتہ رفتہ اپنی جمعیت بڑھا کر مرسیہ کے عامل ابوالعباس کو شکست دے کر مرسیہ پر قابض ہو گیا اور پھر جلد ہی غرناطہ، مالقہ اور المیریہ وغیرہ پر بھی قابض ہو گیا۔ بعد ازاں موحدین کے بادشاہ المومن کو اندلس سے خارج کر کے قرطبہ وغیرہ پر بھی قابض ہو گیا۔ پھر سنہ ۶۲۶ھ میں قریباً تمام اسلامی اندلس اس کے زیر فرمان ہو گیا۔ محمد بن یوسف کی اس مثال کو دیکھ کر ملک میں اور بھی کئی باحوصلہ سردار اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی الگ الگ حکومت بنانے کی تدابیر سوچنے لگے۔ محمد بن یوسف نے یہ صورت حال دیکھ کر عباسی خلیفہ کو ایک درخواست بغداد میں ارسال کی اور لکھا کہ میں نے آپ کے نام سے تمام اندلس کو فتح کر لیا ہے، لہٰذا التجا ہے کہ مجھے اس حکومت کا والی مقرر کر کے اس کی سند ارسال فرمائی جائے۔ خلیفۂ بغداد نے اس درخواست کو تائید غیبی سمجھ کر اندلس کی سند حکومت مع خلعت محمد بن یوسف کے سفیر کو عطا کر دی۔ جب خلیفہ بغداد مستنصر کے ہاں سے سند ولایت آ گئی تو محمد بن یوسف نے غرناطہ کی جامع مسجد میں لوگوں کو اکٹھے ہونے کا حکم دیا اور خود عباسی خلیفہ کا خلعت پہن کر سیاہ علم ہاتھ میں لے کر آیا اور لوگوں کو عباسی خلیفہ مستنصر کا فرمان پڑھ کر سنایا اور لوگوں کو بتایا کہ خلیفۂ بغداد نے ہماری سرپرستی قبول فرمالی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ تمام مخالف رئیسوں نے خاموشی اختیار کر لی اور بظاہر اس کی بیعت بھی کر لی لیکن چندروز کے بعد یہ تمام امراء پھر اس کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے اور باہم خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کی اس باہمی خانہ جنگی کو دیکھ کر مسلمانوں کے شہروں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ سنہ ۶۲۷ھ میں انھوں نے شہر مریدہ پر جو قرطبہ کے بعد سب سے بڑا شہر تھا، قبضہ کر لیا۔ اہل مریدہ نے محمد بن یوسف کو اطلاع دی۔ محمد بن یوسف فوراً فوج لے کر مریدہ پہنچا اور الفانسو نہم شاہ لیون پر بلا تامل حملہ آور ہوا لیکن محمد بن یوسف کو عیسائی فوج سے شکست کھانی پڑی۔ جب وہ شکست خوردہ واپس آیا تو مرسیہ کو اپنا دارالحکومت بنا کر حکومت کرنے لگا۔

اب باہمی خانہ جنگی کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور چھوٹے چھوٹے امراء اور رؤساء نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں۔ ان چھوٹے چھوٹے رؤساء کی تباہی اور بربادی میں فردی نند شریک کار رہا۔ طریق کار یہ تھا کہ عیسائی پہلے دو مسلمانوں کو آپس میں لڑاتے پھر ایک کے حمایتی اور طرف دار ہو کر دوسرے کو تباہ کر دیتے، اس کے بعد پھر اس سے لڑائی چھیڑ دیتے اور اس کو تباہ کر دیتے۔ اس طرح مسلمانوں کے شہروں پر قابض ہوتے جاتے۔ اسی سلسلے میں فردی نند شاہ کیسٹل (قسطلہ) نے ۲۳ شوال سنہ ۶۳۶ھ میں دارالخلافہ قرطبہ کو فتح کر کے عیسائی سلطنت کی پائیدار بنیاد ڈال دی۔ اس طرح اس نے عظیم الشان اسلامی شہر کی عظمت خاک میں ملا دی۔ اس تاریخ کو اندلس اسلامی عظمت و شوکت کے خاتمے کی تاریخ سمجھنا چاہیے۔ اس سلسلے میں ایک رئیس ابن الاحمر نے فردی نند ثالث سے صلح کر کے اور بعض شہر اور قلعے اس کو دے کر اپنی طرف سے ایک عرصہ تک اس کو مطمئن رکھا اور اس فرصت میں غرناطہ، مالقہ، لارقہ، المیریہ اور جیان وغیرہ پر اپنا قبضہ جما لیا اور جزیرہ نما اندلس کے ایک

چوتھائی حصے پر ایک مضبوط ریاست قائم کر لی جو آئندہ اڑھائی سو سال تک قائم رہی۔ لیکن اب بجائے تمام جزیرہ نمائے اندلس کے صرف جنوبی اور مشرقی حصوں میں اسلامی حکومت محدود ہو کر رہ گئی۔ اور اب بجائے قرطبہ کے غرناطہ اسلامی اندلس کا دارالحکومت قرار پایا۔ اس چھوٹی سی اسلامی سلطنت کا رقبہ پچاس ہزار مربع میل تھا جو جزیرہ نما اندلس کا چوتھائی تھا۔ لیکن بعد میں یہ ریاست کچھ ایسی ختم ہوئی کہ پورے اندلس سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹ گیا۔ یہ سب کچھ مسلمانوں کے باہمی تشتت و انتشار اور خانہ جنگی کا نتیجہ تھا کیونکہ مسلمان عیسائیوں سے لڑنے کے بجائے آپس میں لڑتے رہے۔
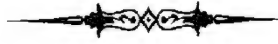
غرناطہ

نصر بن یوسف جو ابن الاحمر کے نام سے مشہور تھا، اس نے سنہ ۶۳۲ھ میں اشبیلیہ کے حاکم ابن خالد کو اپنا دوست اور خلیفہ بنا کر غرناطہ اور مالقہ پر قبضہ کیا۔ سنہ ۶۴۳ھ میں حاکم المیریہ نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور سنہ ۶۶۳ھ میں لارقہ کی رعایا نے بھی اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ جب تمام مسلمان ریاستیں ایک ایک کر کے عیسائیوں نے ہضم کر لیں تو اب انھوں نے ابن الاحمر کی ریاست کو بھی ہضم کرنا چاہا۔ ابن الاحمر نے افریقہ اور مراکش کے بادشاہ یعقوب بن عبدالحق سے اپنے تعلقات نہایت استوار رکھے ہوئے تھے اور جب کبھی عیسائیوں کے مقابلے میں ضرورت پیش آئی یعقوب مرینی کی طرف سے اس کو فوجی اور عسکری امداد ملتی۔ اس وجہ سے ابن الاحمر نے عیسائیوں کے حملوں کو کئی بار پسپا کیا اور انھیں شکستیں دیں۔ اس طرح اس نے اپنی چھوٹی سی سلطنت کو عیسائیوں کی دست برد سے بچائے رکھا۔ ابن الاحمر نے غرناطہ میں قصر ''الحمراء'' کی بنیاد رکھی تھی جو اندلس میں مسلمانوں کی مٹی ہوئی عظمت و شوکت کے عہد کی ایک عجوبہ روزگار عمارت سمجھی جاتی ہے اور ہفت عجائبات عالم میں اس کا شمار ہوتا ہے حالانکہ قرطبہ کے قصر ''الزہرا'' سے اس کو کوئی نسبت نہیں تھی جسے عیسائی وحشیوں اور درندوں نے صفحۂ ہستی سے ختم کر دیا۔ ابن الاحمر عیسائیوں کو ایک لڑائی میں شکست دینے کے بعد واپس آ رہا تھا کہ ۱۵؍ جمادی الآخر سنہ ۶۷۱ھ کو محل کے قریب پہنچ کر اتفاقاً گھوڑے کے ٹھوکر کھانے سے نیچے گرا، اور ۲۹؍ جمادی الآخر سنہ ۶۷۱ھ کو اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔

ابن الاحمر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابوعبداللہ محمد تخت نشین ہوا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۳۸ سال تھی۔ اس نے اپنے باپ کی ہدایت اور وصیت کے مطابق مراکش اور افریقہ کے بنی مرین کے بادشاہ سے دوستی کا سلسلہ جاری رکھا اور نہایت ہوشیاری اور مستعدی کے ساتھ سلطنت کی مہمات میں مصروف ہوا۔ عیسائی حکمرانوں کو غرناطہ کی سلطنت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی، وہ اس کو بھی ہڑپ کرنا چاہتے تھے۔ سنہ ۶۷۳ھ میں عیسائیوں نے سلطنت غرناطہ پر چڑھائی کر دی۔ ابوعبداللہ محمد نے یعقوب بن عبدالحق مرینی سے فوجی امداد طلب کی۔ یعقوب نے فوری طور پر اپنے بیٹے کو فوج دے کر محمد کی امداد کے لیے اندلس روانہ کر دیا۔ اس کے بعد وہ خود بھی فوج لے کر اندلس روانہ ہو گیا اور جزیرہ الخضراء کو ایک باغی امیر سے چھین کر اپنی فوج کا ہیڈ کوارٹر بنایا۔

ابوعبداللہ محمد نے بھی قلعہ طریفہ یعقوب کی نذر کیا کہ بادشاہ اپنی فوجی چھاؤنی یہاں قائم کرے۔ سلطان محمد اور مراکش کا سلطان یعقوب دونوں مل کر عیسائیوں پر حملہ آور ہوئے۔ ۱۵ ربیع الاول سنہ ۶۷۴ھ کو ایک سخت لڑائی کے بعد عیسائیوں کو شکست فاش ہوئی۔ اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے عیسائیوں نے دوبارہ فوج کشی کی اور مسلمانوں نے پھر ان کو شکست فاش دی۔ اس کے بعد محرم سنہ ۶۹۵ھ میں شاہ قسطلہ نے غرناطہ کی سرحد پر فوجیں جمع کرنی شروع کر دیں۔ سلطان محمد نے یہ خبر سن کر فوراً حملہ کر دیا اور عیسائیوں کو شکست دے کر ان کی کئی چھاؤنیاں ان سے چھین لیں۔ سنہ ۶۹۹ھ میں سلطان ابوعبداللہ محمد نے عیسائیوں سے بعض سرحدی قلعے بھی چھین لیے۔ سلطان محمد تیس (۳۰) سال حکومت کر کے ۸ شعبان سنہ ۷۰۱ھ میں اس دار فانی سے انتقال کر گیا۔ سلطان بڑا علم دوست بھی تھا اس وجہ سے اس کو سلطان محمد فقیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سلطان محمد فقیہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمد مخلوع تخت نشین ہوا۔ سلطان محمد فقیہ سے اپنی زندگی میں ایک بہت بڑی غلطی ہوئی، وہ یہ کہ اس نے سلطان یعقوب بن عبدالحق کی فوجی چھاؤنی کو اپنے لیے خطرناک سمجھ کر عیسائیوں کو مشتعل کیا اور پھر ان کو امداد دے کر اس کو بنی مرین کے قبضہ سے نکلوا کر اس پر عیسائیوں کا قبضہ کرا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں کو ایک ایسی چھاؤنی مل گئی جس کی وجہ سے وہ غرناطہ کو کسی بحری راستے سے امداد آنے سے محروم کر سکتے تھے۔

ابوعبداللہ محمد کا بیٹا محمد مخلوع تخت نشین تو ہو گیا لیکن اس نے محمد بن محمد حکم لخمی وزیر سلطنت کو تمام اختیارات سلطنت دے دیے۔ وزیر سلطنت سے اکثر لوگ ناخوش تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے محمد مخلوع کے بھائی نصر کو بغاوت پر آمادہ کیا اور وزیر سلطنت کے مقام کو لوٹ کر قصر شاہی پر دھاوا بول دیا اور محمد مخلوع کو گرفتار کر کے اس کے بھائی نصر کو تخت شاہی پر بٹھا دیا۔ محمد مخلوع کی گرفتاری اور نصر بن محمد کی تخت نشینی کا واقعہ یکم شوال سنہ ۷۰۸ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ سنہ ۷۰۹ھ میں شاہ قسطلہ نے الجزائر پر حملہ کر دیا۔ یہ شہر تو اس وقت فتح نہ ہوا لیکن جبل الطارق پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اسی دوران میں سلطنت غرناطہ میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور سلطنت دو ٹکڑوں میں منقسم ہو گئی۔ دوسری طرف شاہ برشلونہ نے المیریہ پر حملہ کر دیا۔ نصر نے المیریہ کو بچانے کے لیے فوج بھیجی، لیکن اسی اثناء میں سلطان نصر بیمار ہو گیا۔ لوگوں نے جب دیکھا کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تو انھوں نے اس کے بھائی محمد مخلوع کو رہا کر کے اس کی جگہ پر مسند حکومت پر بٹھانا چاہا۔ اتفاقاً نصر تندرست ہو گیا۔ اس نے سلطان محمد مخلوع کو قتل کروا دیا۔ اسی دوران میں ایک رئیس ابوسعید نے بلبیس کو فتح کر لیا۔ ابوسعید اور اس کے بیٹے ابوولید نے مالقہ کو دارالحکومت بنا کر سلطنت غرناطہ میں سے اپنے مقبوضہ حصۂ ملک میں خودمختارانہ حکومت بنا لی۔ پھر محرم سنہ ۷۱۳ھ میں ابوالولید دارالسلطنت غرناطہ کے قریب قریۃ العطشاء میں اپنی فوج کے ساتھ خیمہ زن ہو گیا۔ سلطان نصر بھی غرناطہ سے فوج لے کر نکلا۔ ۱۳ محرم سنہ ۷۱۳ھ کو سلطان نصر نے ابوالولید سے شکست کھائی اور غرناطہ میں آ کر پناہ لی، اور غرناطہ پہنچ کر اس نے ابوالولید سے صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کی لیکن غرناطہ کے

بعض باشندوں نے ابوالولید کو صلح سے روکا اور غرناطہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ وہ غرناطہ پر حملہ کرنے کے لیے فوراً تیار ہو گیا۔ شدونہ کے مقام پر ابوالولید اور غرناطہ کی فوجوں کا زبردست مقابلہ ہوا اور ابوالولید کو فتح حاصل ہوئی۔ وہ فاتحانہ طور پر غرناطہ میں داخل ہوا۔ سلطان نصر قصر الحمراء میں محصور ہو گیا۔ آخر کار ۲۱ رشوال سنہ ۱۳ے ھ کو سلطان نے تخت سلطنت سے دست بردار ہو کر زمام حکومت ابوالولید کو سونپ دی۔ ابوالولید نے نصر کو غرناطہ کے بجائے وادی آش میں جا کر رہنے کی اجازت دی اور خود غرناطہ کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر نہایت ہوشیاری اور مستعدی سے امور سلطنت کو انجام دینا شروع کر دیا۔ عیسائیوں نے جب دیکھا کہ اب غرناطہ کے تخت پر پہلے سے زیادہ ہوشیار اور چابک دست شخص قابض ہو گیا ہے، تو وہ حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ چنانچہ شاہ قسطلہ نے سنہ ۱۶ے ھ سلطنت غرناطہ کے سرحدی مقامات پر حملہ کیا اور کئی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ ابوالولید بھی آرام سے نہ بیٹھا۔ اس نے سلسلۂ جنگ کو جاری رکھا اور آخر محرم سنہ ۱۹ے ھ میں عیسائیوں کو ان مقبوضات سے مار مار کر نکال دیا اور اپنا تمام علاقہ ان سے خالی کرا لیا۔ ابوالولید کی یہ چیرہ دستی دیکھ کر عیسائیوں نے صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا اور تمام عیسائی سرداروں، بادشاہوں اور رئیسوں کو مسلمانوں کی بیخ کنی پر آمادہ کر لیا۔ پادریوں نے اپنے مواعظ اور تقریروں سے عیسائی ممالک میں جوش پیدا کر دیا۔ اندلس کے لاٹ پادری نے اس جہاد میں خاص طور پر حصہ لیا۔ طلیطلہ شہر میں عیسائی افواج کا اجتماع ہوا جس میں دو لاکھ سے زیادہ عیسائی فوجی جمع ہوئے اور یہ عہد کیا کہ سلطنت غرناطہ کو تباہ و برباد کر کے مسلمانوں کا نام و نشان تک جزیرہ نمائے اندلس سے مٹا دیں گے۔ اس عظیم لشکر کی سپہ سالاری سلطنت قسطلہ کے ولی عہد بطروہ کے سپرد کی گئی۔ یورپ کے مختلف ممالک سے ۲۵ کے قریب عیسائی بادشاہ اس لشکر میں آ کر شریک ہوئے۔ پوپ اعظم نے ہر ایک رئیس اور سردار کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کو فتح و برکت کی دعا دی اور تمام براعظم یورپ میں پادریوں نے دعائیں مانگیں کہ اس مرتبہ جزیرہ نمائے اندلس سے مسلمانوں کی بیخ کنی میں کامیابی حاصل ہو۔

ان تعجب انگیز اور حیرت زا تیاریوں کا حال سن کر غرناطہ کے مسلمانوں کو بڑی پریشانی اور فکر لاحق ہوئی۔ ابوالولید نے مراکش کے بادشاہ ابوسعید کے پاس مدد کے لیے پیغام بھیجا، لیکن مراکش کے بادشاہ نے مدد دینے سے انکار کر دیا، یا یہ کہ وہ کوئی مدد نہ دے سکا۔ جب مراکش کی طرف سے مایوسی ہوئی تو غرناطہ کے مسلمانوں کی حالت دیدنی تھی۔ ابوالولید عیسائی فوج کے مقابلہ کے لیے زیادہ سے زیادہ جو فوج جمع کر سکا اس کی کل تعداد ساڑھے پانچ ہزار تھی جس میں چار ہزار پیادے اور ڈیڑھ ہزار سوار تھے۔ عیسائیوں کے کئی لاکھ کے لشکر جرار کے مقابلے میں اس قدر قلیل تعداد کی کوئی حقیقت نہ تھی، لیکن اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کر کے اس مٹھی بھر کو لے کر سلطان ۲۰ ربیع الثانی سنہ ۱۹ے ھ کو غرناطہ سے روانہ ہوا۔ سلطان ابوالولید نے اپنے ایک سردار شیخ الغزوہ نامی کو پانچ سو آدمیوں کا ایک دستہ دے کر بطور ہراول آگے بھیجا اور خود پانچ ہزار فوج لے کر اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ راستہ بھر امرائے لشکر سے مشورے ہوتے رہے کہ ہم کس طرح مخالف فوج پر فتح حاصل کر سکتے

ہیں۔ آخرکار مسلمانوں کے ہراول کا عیسائیوں کے ہراول سے مقابلہ ہوا اور عیسائی ہراول شکست سے دو چار ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے بعد سلطان ابوالولید نے مقام البیرہ کے متصل ایک جھاڑی میں اپنے ایک سردار ابو الجیوش کو ایک ہزار سواروں کے ساتھ چھپا دیا۔ شیخ الغزاۃ کو پانچ سو سپاہیوں کے ساتھ آگے بھیجا اور حکم دیا کہ تم عیسائیوں کے سامنے پہنچ کر پیچھے ہٹنا اور ان کو اپنے تعاقب میں لگائے لانا۔ ابوالجیوش کو یہ ہدایت دی کہ جب عیسائی فوج تمہارے برابر سے گزر جائے تو تم جھاڑیوں سے نکل کر اس کے عقب پر حملہ آور ہونا۔ صرف تین سو سوار لے کر سلطان ابوالولید ایک مناسب مقام پر ٹھہر گیا اور باقی فوج کو ایک اور سردار کی قیادت میں دے کر مناسب ہدایات کے ساتھ آہستہ بڑھنے کا حکم دیا۔ شیخ الغزاۃ ۶ر جمادی الاولیٰ سنہ ۷۱۹ھ کو علی الصبح عیسائی لشکر جرار کے سامنے پہنچا۔ عیسائیوں نے پانچ سو کی اس قلیل جماعت کو دیکھ کر فوراً حملہ کیا۔ شیخ الغزاۃ نے حسب ہدایت پیچھے ہٹنا شروع کر دیا اور عیسائی درندوں کا لشکر جرار مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کے شوق میں نہایت جوش وخروش کے ساتھ متحرک ہوا۔ شیخ الغزاۃ پیچھے ہٹتا جاتا تھا اور عیسائی لشکر خوشی اور مسرت کے جوش میں آگے بڑھتا چلا جاتا تھا۔ جب ابوالجیوش کے سامنے سے یہ لشکر گزرا تو وہ اپنے ایک ہزار ساتھیوں کو لے کر شیر نیستاں کی طرح جھاڑیوں سے نکل کر عیسائیوں کے لشکر کے عقب پر ٹوٹ پڑا۔ ابوالجیوش کے حملہ آور ہوتے ہی شیخ الغزاۃ بھی رک کر حملہ آور ہوا، اور اس کے ساتھ ہی سلطان ابوالولید بھی تیسری سمت سے ان تین سو سواروں کو لے کر حملہ آور ہو گیا، اور ساتھ ہی بقیہ فوج نے بھی بڑی بہادری اور بے جگری کے ساتھ حملہ کر دیا۔ بظاہر یہ چند ہزار حملہ آور اس کئی لاکھ کے لشکر جرار کے سامنے کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے لیکن ان چند ہزار مسلمانوں نے اپنی جان پر کھیل کر اور زندگیوں کا نذرانہ راہِ حق میں پیش کر کے شوق شہادت میں اس شدت سے حملے کیے کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو گئی، اور عیسائی لشکر تاب مقاومت نہ لا سکا اور جس طرف جس کا منہ اٹھا بھاگنے لگا۔ ایک لاکھ عیسائی میدان میں کھیت رہے اور باقی اپنی جان بچا کر بھاگ گئے۔ غالباً یہ جنگ ''جنگ البیرہ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ اپنی نوعیت میں ایک بے مثال جنگ تھی کہ کئی لاکھ کے لشکر کو صرف ساڑھے پانچ ہزار سپاہیوں نے ایسی شکست دی کہ وہ اپنی ایک لاکھ لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک طرف تیرہ آدمی شہید ہوئے اور دوسری طرف ایک لاکھ آدمی کام آئے۔ میدان جنگ میں لشکر کے سپہ سالار اعظم بطروہ اور پچیس معاونین کی لاشیں بھی موجود تھیں۔ سات ہزار قیدیوں میں بطروہ کی بیوی اور بیٹے بھی شریک تھے۔ بطروہ کی لاش ایک صندوق میں رکھ کر شہر غرناطہ کے دروازے پر لٹکا دی گئی۔ اس شکست فاش نے عیسائیوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ وہ حیران تھے کہ اس قدر قلیل لشکر نے ہمیں کس طرح اتنی بڑی شکست دے دی لیکن عیسائیوں کو یہ پتہ چل گیا غرناطہ کی ریاست کو شکست دینا اور اندلس سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ چنانچہ عیسائیوں میں ایک سوگ کی کیفیت پیدا ہو گئی اور دوسری طرف ابوالولید اور ریاست غرناطہ کے دوسرے مسلمانوں نے خوشی اور مسرت سے اللہ تعالیٰ کا

شکرادا کیا کہ اس نے حریف کو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اب عیسائیوں کی درخواست پر ابوالولید ان سے صلح کر کے اپنی سلطنت کے اندرونی انتظام اور استحکام میں مصروف ہو گیا۔ رجب سنہ ۷۲۵ھ میں سلطان نے قلعہ سرطاش فتح کیا۔ اس کے بعد جب سلطان غرناطہ آیا تو ۲۷ رجب سنہ ۷۲۵ھ کو اس کے بھتیجے نے اس کو دھوکے سے قتل کر دیا۔ اراکین سلطنت نے اس کو قصاص میں قتل کر کے ابوالولید کے بیٹے محمد کو تخت نشین کر دیا۔

سلطان محمد نے تخت نشین ہو کر ابوالعلا عثمان کو اپنا وزیر بنایا لیکن عثمان نے اپنے اقتدار اور اختیار کو حد سے زیادہ بڑھا دیا۔ چنانچہ اس کو سلطنت کے لیے مضر سمجھتے ہوئے محمد نے اس کو ۷۲۹ھ میں قتل کرا دیا۔ سنہ ۷۳۳ھ میں سلطان محمد نے جبل الطارق کو عیسائیوں سے خالی کرا دیا۔ عیسائی جبل الطارق کو بچانے کے لیے اپنی بری اور بحری فوج کو حرکت میں لائے لیکن انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ جبل الطارق کو عیسائیوں سے خالی کروا کر سلطان واپس غرناطہ آ رہا تھا کہ ابوالعلاء عثمان کے بیٹوں اور رشتہ داروں نے موقع پا کر سلطان محمد کو قتل کر دیا۔ سلطان کے ساتھیوں نے اس کی لاش کو مالقہ لا کر دفن کر دیا۔

سلطان محمد کے قتل کے بعد اس کا بھائی یوسف تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر صرف سولہ سال تھی، لیکن یہ نہایت عقل مند، اللہ والا اور بہادر شخص تھا، اس نے نہایت دانش مندی اور قابلیت سے سلطنت کو سنبھالا۔ عیسائیوں کو جبل الطارق کے ہاتھ سے جانے کا بڑا دکھ تھا لہٰذا انھوں نے پھر جبل الطارق اور اس کے گردونواح میں حملہ آوری شروع کر دی۔ سلطان یوسف نے مراکش کے بادشاہ ابوالحسن مرینی سے مدد طلب کی۔ اس نے اپنے بیٹے کو فوج دے کر جبل الطارق کی طرف بھیجا۔ ادھر سلطان یوسف بھی فوج لے کر پہنچ گیا۔ جنگ میں عیسائیوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ مراکش کا سلطان جب واپس مراکش جانے لگا تو عیسائیوں نے دھوکہ دے کر ایک سخت حملہ کیا جس میں مسلمانوں کا بہت نقصان ہوا۔ سنہ ۷۴۰ھ میں سلطان ابوالحسن خود ساٹھ ہزار فوج لے کر اندلس آیا۔ ادھر سے سلطان یوسف بھی اس کی اعانت کے لیے پہنچ گیا۔ عیسائیوں نے اس جنگ کے لیے بڑی تیاری کی ہوئی تھی۔ ان کے پاس سامان جنگ بھی مسلمانوں سے زیادہ تھا۔ طریف کے متصل ایک میدان میں زور کا رن پڑا۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور ایک بڑی تعداد نے جام شہادت نوش کیا۔ اس شکست کے نتیجے میں عیسائیوں نے سلطنت غرناطہ کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا۔ سلطان ابوالحسن مراکش چلا گیا اور سلطان یوسف نے غرناطہ میں پناہ لی۔ اس جنگ میں بڑے بڑے علماء اور زہاد جو لشکر میں شامل تھے، شہید ہوئے۔ انھی شہداء میں لسان الدین ابن الخطیب کے والد عبداللہ سلمان بھی تھے۔

سنہ ۷۴۹ھ میں سلطان یوسف نے ابن الخطیب کو اپنا وزیراعظم بنایا اور عیسائیوں سے اپنی شکست کا انتقام لینے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ سنہ ۷۵۵ھ میں سلطان یوسف عیسائیوں سے جہاد کے لیے تیار ہو چکا تھا کہ عید کے روز جب وہ نماز عید ادا کر رہا تھا ایک مجہول الحال شخص نے سجدے کی حالت میں سلطان کو شہید کر دیا۔ چنانچہ قصر الحمرا میں اسے دفن کر دیا گیا۔

یوسف کے بعد اس کا بیٹا محمد تخت نشین ہوا اور اس نے ''غنی باللہ'' کا لقب اختیار کیا۔ تخت نشین ہونے کے چند روز بعد سلطان محمد نے لسان الدین ابن الخطیب کو شاہِ مراکش ابوالحسن مرینی کے پاس بھیجا کہ اس کو وہ عیسائیوں کے خلاف امداد پر آمادہ کرے۔ ابوالحسن نے غنی باللہ کی امداد کے لیے فوج بھیج دی لیکن عیسائیوں سے معمولی لڑائیوں کے بعد کوئی قابل ذکر نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ البتہ یہ ہوا کہ سلطان محمد کے سوتیلے بھائی اسماعیل نے ۲۸ر رمضان المبارک سنہ ۷۶۰ھ جب کہ سلطان غنی باللہ شہر سے باہر جنت العریف میں مقیم تھا، قلعہ غرناطہ پر قبضہ کر لیا۔ دوبارہ قبضہ حاصل کرنے کے لیے سلطان محمد نے بہت کوشش کی یہاں تک کہ عیسائی بادشاہ شاہ قسطلہ سے بھی خط و کتابت کی لیکن کوئی تسلی بخش نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ چنانچہ سلطان محمد غنی باللہ ۱۱ر ذی الحجہ سنہ ۷۶۰ھ کو وادیٔ آش سے مراکش کی جانب روانہ ہوا اور مراکش میں سلطان ابوسالم کے مہمان کی حیثیت سے زندگی گزارنے لگا اور غرناطہ میں سلطان اسماعیل کی حکومت شروع ہوگئی۔

سلطان اسماعیل اگرچہ تخت حکومت پر قابض تو ہو گیا، لیکن اس سے کاروبار حکومت چل نہ سکا۔ چنانچہ اس نے قسطلہ کے عیسائی بادشاہ سے خط و کتابت کر کے صلح کی بنیاد قائم کی۔ شاہ قسطلہ ان دنوں برشلونہ کے بادشاہ کے ساتھ برسر پیکار تھا، اس لیے اس نے بھی اس صلح کو غنیمت سمجھا۔ لیکن ۴ر شعبان سنہ ۷۶۱ھ میں سلطان اسماعیل کا بھائی ابو یحییٰ عبداللہ سلطان اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر کے خود تخت حکومت پر بیٹھ گیا۔ ۲ر شوال سنہ ۷۶۲ھ کو ۲۱ ماہ کی جلا وطنی کے بعد سلطان محمد مراکش کے بادشاہ کے تعاون سے اندلس میں آیا اور سلطنت غرناطہ کے علاقے پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ ابو یحییٰ عبداللہ نے اپنے کو کمزور سمجھتے ہوئے خود قسطلہ کے عیسائی بادشاہ کے پاس امداد حاصل کرنے کے لیے گیا۔ قسطلہ کے بادشاہ نے اس کی یہ امداد کی کہ ۲ر رجب سنہ ۷۶۲ھ کو اس کے تمام ساتھیوں کے ساتھ اس کو اشبیلیہ کے قریب قتل کرا دیا اور اس کے تمام مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ یہ بھی ایک عیسائی بادشاہ کی کمینگی کا اظہار تھا، کہ اس نے ایک پناہ خواہ کو قتل کروا دیا، لیکن مسلمانوں کی بھی اس سے بڑی اور کیا حماقت ہوگی کہ اپنوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے اپنے دشمنوں سے امداد طلب کرتے تھے جو ان کا اندلس کی سرزمین سے نام و نشان مٹانے کے لیے تدابیر کر رہے تھے۔

سلطان محمد مخلوع نے ۲۰ر جمادی الآخر سنہ ۷۶۳ھ کو غرناطہ پر قبضہ کر کے تخت سلطنت پر جلوس کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب جبل الطارق مراکش کے مقبوضات میں شامل تھا اور کئی سال سے سلطنت غرناطہ قسطلہ کی عیسائی حکومت کی باج گزار ہوگئی تھی۔ سلطان محمد نے اس مرتبہ غرناطہ پر قابض ہو کر نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ اپنی حکومت کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ حسن اتفاق سے مراکش میں ابوسالم کے فوت ہونے پر اس کی اولاد میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ ادھر شاہ قسطلہ اور اس کے بھائی میں لڑائیاں ہونے لگیں۔ دونوں طرف کی خانہ جنگیوں سے سلطان محمد نے فائدہ اٹھایا۔ ایک طرف تو اس نے قلعہ جبل الطارق پر قبضہ کر لیا اور دوسری طرف سلطنت قسطلہ کو خراج دینے سے یک قلم انکار کر دیا۔ یہ واقعہ سنہ ۷۷۲ھ کا ہے۔ چنانچہ جب شاہ قسطلہ کے

سفیروں کو کوئی خراج نہ دیا گیا اور عیسائیوں نے اس پر خاموشی اختیار کر لی کیونکہ وہ زبردستی خراج نہیں لے سکتے تھے تو خراج سے اس انکار پر سلطان محمد کے رعب و وقار نے خوب ترقی کی اور عیسائی اس سے خوف کھانے لگے۔

سنہ ۷۹۳ھ میں سلطان محمد فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا یوسف ثانی تخت نشین ہوا۔ یہ صلح پسند اور نہایت عقل مند شخص تھا۔ اس نے شاہ قسطلہ سے قیام صلح کے لیے کوششیں شروع کیں۔ یوسف ثانی سنہ ۷۹۸ھ میں انتقال کر گیا تو محمد اپنے بڑے بھائی کو تخت سے محروم کر کے خود تخت نشین ہو گیا۔

اس خاندان میں محمد نام کے بہت سے شخص ہوئے ہیں، لہٰذا اس محمد بن یوسف کو محمد ہفتم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ محمد ہفتم کی تخت نشینی کے چند روز بعد پھر عیسائیوں سے چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی اور مسلمانوں نے عیسائیوں کو متعدد شکستیں دے کر قسطلہ کی حکومت کے بعض علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ انھی دنوں قسطلہ کا بادشاہ فوت ہو گیا اور اس نے اپنا ایک شیر خوار بچہ جان نامی چھوڑا۔ اسی شیر خوار بچے کو تخت قسطلہ پر بٹھا کر اس کے چچا فردی نند نے سلطنت کے تمام امور اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ فردی نند نے بھی سلسلۂ جنگ کو جاری رکھا۔ چونکہ عیسائیوں کی فوج تعداد میں بہت زیادہ تھی۔ اس لیے محمد ہفتم نے عیسائی فوج کو محاذ جنگ پر مصروف رکھ کر اپنی فوج کے ایک حصے سے شہر جیان کی طرف حملہ کیا۔ اس ترکیب سے عیسائیوں کو اپنی فوج کا کافی حصہ اس طرف منتقل کرنا پڑا اور ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ فردی نند نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست پیش کی جو محمد ہفتم نے منظور کر لی۔ اس طرح اس جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ سنہ ۸۰۳ھ میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے لشکروں میں پھر ایک بہت بڑی جنگ برپا ہو گئی۔ اس جنگ میں غالب و مغلوب کا کوئی اندازہ نہ ہو سکا۔ آخر کار عیسائیوں نے پھر صلح کی درخواست کی۔ آٹھ ماہ کے لیے وقتی صلح ہوئی۔ ابھی یہ مدت پوری نہ ہونے پائی تھی کہ سلطان محمد انتقال کر گیا اور اس کی جگہ اس کا بھائی یوسف جو نظر بند تھا، تخت نشین ہوا۔ چنانچہ تاریخ میں اس کو یوسف ثالث کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یوسف ثالث نے تخت حکومت پر بیٹھنے کے بعد اپنے ایک سردار عبداللہ کو فردی نند کے پاس بھیجا اور صلح کی مدت میں دو سال کی توسیع کروا دی۔ جب دو سال کی یہ مدت ختم ہونے لگی تو یوسف ثالث نے اپنے بھائی علی کو شاہ قسطلہ کے پاس بطور سفیر بھیجا اور مدت صلح میں اور توسیع چاہی۔ عیسائیوں نے سلطان کی اس صلح جوئی کو کمزوری پر محمول کر کے کہا کہ اگر تمہارا سلطان ہمیں خراج دینا قبول کر لے تو ہم مدت صلح میں توسیع کر لیں گے۔ علی نے عیسائیوں کی اس درخواست کو نامنظور کر دیا اور واپس غرناطہ آ گیا۔ فردی نند نے اس کے بعد ایک بہت بڑا لشکر لے کر غرناطہ پر حملہ کر دیا۔ خوب گھمسان کا رن پڑا جس کے نتیجے میں سلطنت غرناطہ کا ایک حصہ عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ابھی یہ جنگ اختتام کو نہیں پہنچی تھی کہ سلطنت فاس (مراکش) کے ایک لشکر نے اپنے شہزادہ ابو سعید کی زیر قیادت قلعہ جبل الطارق پر حملہ کر دیا۔ سلطان یوسف ثالث نے اپنے بھائی احمد کو فوج دے کر قلعہ جبل الطارق کو بچانے کے لیے بھیجا۔ وہاں دونوں شہزادوں میں جنگ کے بجائے صلح ہو گئی۔ اور ابو سعید

شہزادہ احمد کے ساتھ بطور مہمان غرناطہ چلا آیا۔ مراکش کے بادشاہ کو پتہ چلا کہ شہزادہ ابو سعید غرناطہ میں ہے تو اس نے یوسف ثالث کو خط لکھا کہ کسی طرح ابو سعید کو وہیں قتل کرا دو۔ یوسف ثالث نے اس خط پر عمل نہ کیا بلکہ ابو سعید کو اس کے بھائی کا خط دکھا دیا اور اسے بتایا کہ تمھارے بھائی نے تجھے قتل کروانے کے لیے جبل الطارق کی مہم پر بھیجا تھا۔ ابو سعید نے سنہ ۸۲۰ھ میں سلطان یوسف ثالث سے مدد لے کر اور اندلس ہی میں ہر قسم کا سامان مہیا کر کے مراکش پر حملہ کر دیا اور اپنے بھائی کو تخت شاہی سے بے دخل کر کے خود تخت نشین ہو گیا اور سلطان یوسف ثالث کا شکریہ ادا کیا جس نے اس کی جان بچائی تھی۔

سنہ ۸۲۰ھ ہی میں قسطلہ کے بادشاہ جان نے بالغ ہو کر زمام حکومت سنبھال لی اور اپنے چچا فردی نند کو معزول کر کے اپنی ماں کے مشورے کے ساتھ یوسف ثالث سے صلح کا رشتہ استوار کیا۔ سلطان یوسف ثالث نہایت منصف مزاج اور عادل شخص تھا یہاں تک کہ عیسائی بھی اپنے تنازعات میں اس کے فیصلوں کو قبول کرتے تھے۔ سلطان یوسف ثالث سنہ ۸۲۲ھ میں اس دار فانی سے کوچ کر گیا اور اس کے بعد اس کا بیٹا محمد ہشتم تخت نشین ہوا۔

محمد ہشتم نے تخت نشین ہوتے ہی قسطلہ اور مراکش کے بادشاہوں سے صلح کی تجدید کی اور امیر یوسف کو اپنا وزیر اعظم بنایا۔ امیر یوسف کے آباء واجداد غرناطہ کے قاضی ہوتے آئے تھے۔ وزیر تو بڑا لائق تھا لیکن محمد ہشتم خود بڑا نالائق اور سفلہ پرور تھا۔ اس وجہ سے غرناطہ کے لوگ اس سے بددل ہو گئے۔ اس کی اس نالائقی کو دیکھ کر آخر کار محمد نہم نے غرناطہ پر قبضہ کر لیا۔ اس قبضے پر محمد ہشتم غرناطہ سے بھاگ کر تیونس چلا گیا۔ وہاں کے بادشاہ ابو الفارس نے اس کو نہایت عزت و تکریم سے اپنے پاس رکھا اور اس کو مدد دینے کا بھی وعدہ کیا۔

محمد نہم بادشاہ تو بن گیا لیکن وزیر یوسف کو اپنا مخالف بنا لیا اور اس کی تخریب کے درپے ہوا۔ وزیر یوسف غرناطہ کے پندرہ سو آدمیوں کو ساتھ لے کر مرسیہ بھاگ گیا اور پھر وہاں سے خط و کتابت کر کے قسطلہ کے بادشاہ کے پاس چلا گیا اور قسطلہ کے بادشاہ جان کو محمد ہشتم کی امداد پر آمادہ کرنا چاہا۔ بادشاہ جان نے مسلمانوں کو باہم لڑانے کے لیے وزیر یوسف سے یہ کہا کہ اپنے ساتھیوں سے با اثر اشخاص کا ایک وفد تیونس کے بادشاہ کے پاس بھیجو اور اس کو بھی محمد ہشتم کی امداد پر آمادہ کرو۔ چنانچہ ایک وفد وہاں گیا اور تیونس کے بادشاہ نے پانچ سو سوار اور ایک معقول رقم بطور امداد دے کر اور اپنے جہازوں پر سوار کرا کر محمد ہشتم کو اندلس کی طرف روانہ کیا۔

جب محمد ہشتم اندلس کے ساحل پر اترا تو وزیر یوسف کی کوششوں سے صوبہ المیریا کے باشندوں نے اس کی امداد کے لیے آمادگی ظاہر کی۔ محمد نہم اور محمد ہشتم کے درمیان جنگ ہوئی۔ محمد نہم کی فوج کا ایک بڑا حصہ وزیر یوسف کی کوشش سے محمد ہشتم کے ساتھ مل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محمد نہم کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا اور وہ خود تخت نشین ہو گیا۔ محمد ہشتم کو جب دوبارہ حکومت ملی تو اب وہ پہلے والا محمد ہشتم نہیں رہا تھا بلکہ اس نے وزیر یوسف کی رائے کے مطابق اپنے آپ کو بدل دیا اور رعایا کی دل جوئی اور خیر خواہی میں مصروف ہو گیا۔ اب محمد ہشتم نے قسطلہ کے

بادشاہ کے ساتھ دوامی صلح کرنے کا ارادہ کیا لیکن عیسائی بادشاہ نے خراج کی شرط لگا دی۔ اس کو محمد ہشتم نے نامنظور کیا لیکن چونکہ شاہ قسطلہ کو بھی بعض اندرونی پیچیدگیوں کے باعث اطمینان حاصل نہ تھا، لہٰذا اس نے کوئی فتنہ برپا نہ کیا۔ چند روز کے بعد شاہ قسطلہ نے حملہ کیا۔ چنانچہ گاہے بگاہے کئی لڑائیاں ہوئیں، کبھی مسلمانوں اور کبھی عیسائیوں کو کامیابی ہوئی۔ ابھی لڑائیوں کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ محمد ہشتم کے ایک رشتے دار یوسف بن الاحمر نے علم بغاوت بلند کر دیا اور اپنے دوستوں کی مدد سے البیرہ میں سلطنت غرناطہ کے تخت کا مدعی ہو گیا اور شاہ قسطلہ سے خط و کتابت کر کے اس بات کا اقرار کیا کہ اگر آپ کی مدد سے میں سلطنت غرناطہ پر قابض ہو گیا تو بلا چون و چرا سالانہ خراج ادا کیا کروں گا اور ضرورت کے وقت اپنی فوج کے ساتھ آپ کی مدد بھی کروں گا۔ عیسائیوں کے لیے یہ ایک بڑی خوشی کی بات تھی۔ چنانچہ شاہ قسطلہ نے فوری طور پر اپنی فوجیں یوسف کی مدد کے لیے البیرہ بھیج دیں۔ محمد ہشتم کو جب پتہ چلا تو اس نے البیرہ پر حملہ کر دیا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ شاہ قسطلہ خود بھی اس جنگ میں موجود تھا۔ دونوں طرف سے بہت سے آدمی کام آئے اور فاتح اور مفتوح اور غالب اور مغلوب کا فیصلہ ہوئے بغیر شاہ قسطلہ یوسف کو قرطبہ کی جانب لے گیا اور محمد ہشتم غرناطہ کی جانب چلا گیا۔

شاہ قسطلہ نے قرطبہ میں دربار عام منعقد کر کے یوسف بن الاحمر کے غرناطہ کا بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا اور اس کو ہر قسم کی مدد دینے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد یوسف کو فوج دے کر روانہ کیا تا کہ وہ غرناطہ پر قبضہ کر لے۔ یوسف نے روانہ ہو کر حدود سلطنت غرناطہ میں عیسائیوں کی مدد سے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ عیسائیوں کو اب ہر قسم کا اطمینان تھا کہ ایک غدار مسلمان ان کے ساتھ تھا۔ اب دو مسلمان آپس میں ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے تھے اور عیسائی نہایت اطمینان کے ساتھ دور سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ سلطان محمد ہشتم نے اپنے وزیر یوسف کو فوج دے کر یوسف بن الاحمر کی سرکوبی پر مامور کیا۔ سنہ ۸۳۹ھ میں وزیر یوسف ایک لڑائی میں یوسف بن الاحمر کے ہاتھ سے مارا گیا۔ جب یہ خبر غرناطہ پہنچی تو رعایا میں سخت بے چینی اور اضطراب پیدا ہوا اور محمد ہشتم کے خلاف رائے زنی ہونے لگی۔ لوگوں کا یہ رنگ دیکھ کر محمد ہشتم قصر الحمرا کا تمام خزانہ اپنے ساتھ لے کر غرناطہ سے مالقہ چلا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یوسف بن الاحمر غرناطہ پر قابض ہو گیا۔ یوسف نے غرناطہ میں تخت نشینی کی رسم ادا کر کے شاہ قسطلہ کو اقرار فرمان برداری کا عریضہ ارسال کیا اور پھر محمد ہشتم کی گرفتاری کے لیے فوج تیار کرنے لگا۔ ابھی مالقہ کی جانب فوج روانہ نہیں کر سکا تھا کہ صرف چھ ماہ بادشاہ رہ کر اس دار فانی سے کوچ کر گیا اور عیسائیوں کو اقرار فرمان برداری کا عریضہ لکھ کر قیامت تک کے لیے اپنے ماتھے پر ندامت و نفرت کا ٹیکہ لگا گیا۔ محمد ہشتم نے جونہی یوسف بن الاحمر کے مرنے کی خبر سنی تو فوری طور پر غرناطہ میں آ کر تیسری مرتبہ تخت نشین ہو گیا۔ امیر عبدالحق کو اپنا وزیر اور امیر عبدالبر کو اپنا سپہ سالار بنایا۔ عیسائیوں نے یہ حالت دیکھ کر پھر فوج کشی کی لیکن غرناطہ کے سپہ سالار نے انھیں شکست دے کر واپس بھگا دیا۔ اس شکست سے عیسائیوں کی ہمت پست ہو گئی اور ان کے دلوں پر غرناطہ کی سلطنت کا رعب پھر قائم ہو گیا۔ لیکن شومی قسمت سے پھر ان کی خانہ جنگی

کے سامان پیدا ہو گئے۔ ہوا یہ کہ سلطان محمد ہشتم کا ایک بھتیجا ابن عثمان المیریا کا حاکم تھا۔ اس نے اپنے چچا کے خلاف غرناطہ کے عوام کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ جب اس کو یقین ہو گیا کہ غرناطہ کے عوام اس کی حمایت اور طرف داری کریں گے تو فوری طور پر غرناطہ میں آ کر باغیوں کے سردار کی حیثیت سے قصر الحمرا پر قابض ہو گیا اور محمد ہشتم کو تیسری دفعہ تخت سے اتار کر پس دیوار زنداں کر دیا۔ امیر عبدالبر نے غرناطہ سے بھاگ کر اپنے خیر خواہوں اور ہوا خواہوں کو اکٹھا کیا اور سلطان محمد ہشتم کی رہائی کی تدابیر کرنے لگا۔ امیر عبدالبر کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر میں سلطان محمد ہشتم کی رہائی کا مطالبہ یا اعلان کروں گا تو ہو سکتا ہے کہ ابن عثمان محمد ہشتم کو قتل کر دے۔ لہٰذا اس نے محمد ہشتم کے دوسرے بھتیجے ابن اسماعیل کو اپنا ساتھی اور شریک کار بنانے اور سلطنت کے استحقاق کا دعویٰ کرنے کی ترغیب دی جس کے لیے وہ فوری طور پر رضا مند ہو گیا۔ شاہ قسطلہ سے خط و کتابت کرنے کے بعد وہ عبدالبر سے آملا۔ عیسائیوں کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ ایک طرف ابن اسماعیل نے اور دوسری طرف شاہ قسطلہ نے ابن عثمان پر فوج کشی شروع کی۔ یہ سلسلہ ایک طویل عرصے تک جاری رہا۔ سنہ ۸۵۲ھ میں دو عیسائی بادشاہوں شاہ ارغون اور شاہ اربونیہ نے شاہ قسطلہ کے خلاف فوج کشی شروع کر دی جس سے شاہ قسطلہ اپنی مصیبت میں گرفتار ہو گیا اور اس نے مسلمانوں کی سرحد سے اپنی فوجیں ہٹا لیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابن اسماعیل بھی اس وقت تک کے لیے خاموش ہو گیا جب تک شاہ قسطلہ اپنی خانہ جنگی سے فراغت حاصل نہ کر لے۔ دوسری طرف ابن عثمان کو جب یہ معلوم ہوا کہ شاہ ارغون اور شاہ اربونیہ سلطنت قسطلہ کے خلاف متحد ہو گئے ہیں تو اس نے اپنے سفیران دونوں عیسائی بادشاہوں کے پاس بھیج کر ان سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لیے اور ان سے وعدہ کیا کہ جب تم قسطلہ پر حملہ آور ہو گے تو میں بھی تمھاری امداد کے طور پر ادھر سے حملہ آور ہوں گا۔ چنانچہ سنہ ۸۵۴ھ میں ابن عثمان نے قسطلہ کی سلطنت پر حملہ کیا اور صوبہ مرسیہ کو تاخت و تاراج کرتا اور قسطلہ کی فوجوں کو دور تک بھگاتا اور بہت سے مال غنیمت کے ساتھ واپس غرناطہ آیا۔ اگلے سال ابن عثمان نے صوبہ اندلوسیہ پر حملہ کیا اور مرسیہ کی طرح اس صوبے کو بھی خوب تاخت و تاراج کیا۔ اگر سلطان ابن عثمان چاہتا تو وہ قرطبہ پر بھی قبضہ کر سکتا تھا، لیکن اس نے قرطبہ کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ سنہ ۸۵۸ھ تک ارغون اور اربونیہ کی سلطنت کی قسطلہ سے مخالفت جاری رہی اور ابن عثمان بھی ان دونوں بادشاہوں کی امداد کرتا رہا لیکن بعد میں شاہ قسطلہ کی ان دونوں سے صلح ہو گئی لہٰذا اب اس نے ابن اسماعیل کو جو ان دنوں قسطلہ کی سرحد پر خاموش اور منتظر تھا، فوج دے کر سنہ ۸۵۹ھ میں ابن عثمان پر حملہ کرایا۔ ابن اسماعیل کو چونکہ اکثر امراء کی حمایت اور ہمدردی حاصل تھی اس لیے اس کے مقابلے میں ابن عثمان کو شکست ہوئی اور وہ چند ساتھیوں کے ساتھ بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ گزین ہوا اور ابن اسماعیل غرناطہ میں داخل ہو کر تخت نشین ہو گیا۔

سلطان ابن اسماعیل کو شاہ قسطلہ کے تعاون سے غرناطہ کی حکومت تو مل گئی، لیکن چند ہی دنوں کے بعد شاہ قسطلہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا اس کے بعد تخت نشین ہوا۔ اس کے بیٹے نے ابن اسماعیل کے ساتھ پھر

جنگ کا سلسلہ شروع کر دیا، اور سنہ ۸۷۰ھ تک عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان لڑائیوں کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہا۔ ان لڑائیوں میں ابن اسماعیل کے بیٹے ابوالحسن نے بہادری اور جرأت کے بڑے جوہر دکھائے اور بڑی ناموری حاصل کی۔ سنہ ۸۷۰ھ ابن اسماعیل تو اس دنیائے فانی سے انتقال کر گیا اور اب اس کا بیٹا ابوالحسن اس کے بعد مسند حکومت پر بیٹھا۔ ابوالحسن ایک تجربہ کار سپہ سالار تھا، اس وجہ سے بجائے عیسائیوں کی کثرت تعداد کے باعث ان سے ڈرنے کے اس نے عیسائیوں کے ساتھ لڑائیوں کا سلسلہ نہایت حسن وخوبی سے جاری وساری رکھا، لیکن چند روز کے بعد مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا یہ عجیب سامان پیدا ہوا کہ حکومت قسطلہ کے نوجوان بادشاہ فردی نند کی شادی حکومت ارغون کی شہزادی ازبیلا کے ساتھ ہو گئی۔ یہ شادی مسلمانوں کے لیے نہایت بدشگونی کا باعث ہوئی کیونکہ اس شادی کے ساتھ ہی ارغونہ کی سلطنت قسطلہ کے مل کر ایک بہت بڑی عیسائی سلطنت بن گئی۔ ان دونوں حکومتوں کا مرنا جینا ایک ہو گیا۔ فردی نند اور ازبیلا دونوں نہایت متعصب اور پادری مزاج عیسائی تھے۔ اس لیے ان دونوں نے مل کر اس بات کا عزم کیا کہ جزیرہ نمائے اندلس سے نہ صرف اسلامی حکومت کا نام ونشان مٹا دینا چاہیے بلکہ مسلمانوں کے ایک ایک فرد کو بھی اس صفحۂ ہستی سے ختم کر دینا چاہیے اور اس جزیرہ نما میں ایک بھی مسلمان کو اللہ کا نام لینے کے لیے زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ادھر فردی نند اور ازبیلا میں یہ عہد ہو رہا تھا ادھر سلطان ابوالحسن نے مصلحت وقت کے تحت اس عیسائی سلطنت کے ساتھ صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کی۔ چنانچہ فردی نند نے سنہ ۸۸۰ھ میں سلطان ابوالحسن کو لکھا کہ اگر تم صلح کے خواہاں ہو تو ہمیں خراج دینا منظور کرو۔ ابوالحسن ایک بہادر اور جرأت مند بادشاہ تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو فوراً خراج منظور کر لیتا جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان کردہ واقعات کے مطابق کئی بادشاہوں نے عیسائی حکومتوں کا باج گزار بننا قبول کر لیا تھا۔ کسی حکومت کا باج گزار ہونا ایک انتہائی توہین آمیز اور ذلت افروز عمل ہے، لیکن ابوالحسن نے فردی نند کو لکھا کہ غرناطہ کے دارالضرب (ٹکسال) میں اب بجائے سونے کے سکوں کے فولادی شمشیریں تیار ہوتی ہیں تاکہ عیسائیوں کی گردنیں اڑائی جاسکیں۔ اس جرأت مندانہ اور جوان مردانہ جواب نے چند روز کے لیے فردی نند کو مبہوت ومرعوب کر دیا کہ ایک ایسا شخص جو خود مجھ سے صلح و آشتی کی درخواست کر رہا ہے، مجھ کو اتنا سخت اور جرأت مندانہ جواب دے رہا ہے۔ چنانچہ ابوالحسن کے اس جواب سے کئی سالوں تک جنگ کا سلسلہ ملتوی رہا۔ اس عرصے میں سلطان ابوالحسن نے اس بات کا مصمم ارادہ کر لیا کہ ہم اس ملک میں آزاد اور خود مختار رہیں گے اور عیسائیوں کے باج گزار اور محکوم بننے کے عوض موت کو ترجیح دیں گے۔ یہ وہی بات تھی جو اس کے کئی سو سال بعد سلطان فتح علی خان ٹیپو نے انگریزوں سے کہی تھی، اور ایک مسلمان کی شان بھی یہی ہے۔ وہ خراج لیتا تو ہے خراج دیتا نہیں۔ اس کی گردن صرف اللہ کے حضور جھکتی ہے اور کسی بادشاہ اور جاگیر دار کے سامنے نہیں جھکتی۔ دوسری طرف فردی نند اور ازبیلا جو دونوں مل کر کاروبار حکومت چلا رہے اور مسلمانوں کے خلاف اپنے دلوں میں نہایت بغض وکینہ رکھتے تھے اور ان کا نام ونشان مٹانے کے لیے ہر وقت

تیار رہتے تھے، فوجی تیاری میں مصروف رہے۔

عیسائیوں کی فوجی اور جنگی تیاریوں کا حال سن کر ابوالحسن نے خود ہی سنہ ۸۸۶ھ میں سلطنت قسطلہ کے ایک نہایت مضبوط اور اہم قلعے صخرہ پر جو دریائے وادیٔ الکبیر کے کنارے پر واقع تھا اور جس کو فردی نند کے دادا نے مسلمانوں سے فتح کیا تھا، حملہ کیا اور ایک ہی رات کے محاصرہ کے بعد عیسائیوں سے چھین لیا۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ جس وقت سلطان ابوالحسن غرناطہ میں تخت نشین ہوا تو سلطنت غرناطہ کا رقبہ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگیوں اور نالائقیوں کی وجہ سے صرف چار ہزار مربع میل یا اس سے بھی کم رہ گیا تھا، اور سلطنت قسطلہ کا رقبہ وسیع ہو کر سوا لاکھ مربع میل سے بھی کچھ زیادہ تھا۔ فردی نند کو قلعہ صخرہ کے چھن جانے کا سخت صدمہ ہوا اور اس نے سلطنت غرناطہ کے قلعہ الحمہ پر دھوکے سے حملہ کیا۔ چونکہ اس قلعے کی حفاظت کے لیے اس وقت وہاں کوئی فوج موجود نہ تھی، لہٰذا معمولی کوشش کے بعد عیسائیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں نے قلعہ صخرہ کو فتح کر کے وہاں کے غیر مصافی عیسائیوں کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں پہنچائی، لیکن عیسائیوں نے قلعہ الحمہ پر قابض ہو کر وہاں کی تمام مسلمان رعایا کو بلا امتیاز مرد و زن قتل کر دیا۔ فردی نند نے الحمہ پر دس ہزار عیسائی فوج حفاظت کے لیے چھوڑ دی اور خود واپس چلا گیا۔ غرناطہ میں جب الحمہ کے قتل عام کی خبر پہنچی تو تمام شہر میں کہرام مچ گیا۔ سلطان ابوالحسن نے ایک سردار کو اس قلعہ کے واپس لینے کے لیے روانہ کیا۔ اس نے جاتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ فردی نند کا ایک جرنیل یعنی حاکم قرطبہ فوج لے کر قرطبہ سے قلعہ الحمہ کو بچانے کے لیے چلا۔ یہ خبر سن کر عرب سردار نے اپنی فوج کا ایک حصہ قلعے کے محاصرے پر چھوڑا اور ایک حصہ حاکم قرطبہ کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ راستے میں دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا، نتیجہ یہ ہوا کہ حاکم قرطبہ شکست کھا کر بھاگ گیا۔ ٹھیک اسی وقت دوسری طرف سے حاکم اشبیلیہ یعنی دوسرا عیسائی جرنیل ایک زبردست فوج کے ساتھ نمودار ہو گیا۔ چونکہ قلعے کے محاصرے پر بہت تھوڑی سی فوج باقی تھی لہٰذا مصلحت وقت کے تحت مسلمانوں کی فوج واپس غرناطہ چلی آئی اور مسلمانوں کا اس قلعہ پر قبضہ نہ ہو سکا۔ قلعہ الحمہ نہایت مضبوط اور زبردست اور غرناطہ کے قریب قلعہ تھا اس لیے اس کا عیسائیوں کے قبضے میں چلے جانا نہایت خطرناک تھا۔ چنانچہ جمادی الاولیٰ سنہ ۸۸۷ھ میں ابوالحسن کو پتہ چلا کہ فردی نند اپنی پوری فوج کے ساتھ غرناطہ پر حملہ آور ہونے کے لیے آ رہا ہے۔ اس کی آمد پر غرناطہ کی سرحد پر لوشہ کے مقام پر ۲۷ر جمادی الاولیٰ ۸۸۷ھ کو ایک زبردست جنگ ہوئی جس میں ابوالحسن نے فردی نند کو شکست فاش دے کر بھگا دیا یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ اس موقع پر دوسری طرف غرناطہ میں سلطان کا بیٹا ابوعبداللہ محمد باپ کے خلاف سازش میں شریک تھا۔

اس فتح کے بعد سلطان ابوالحسن عیسائیوں کو مار بھگانے اور اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کی تدبیروں میں مصروف ہونا چاہتا تھا کہ اسے پتہ چلا کہ اس کے بیٹے ابوعبداللہ نے المیریہ، بسطہ اور غرناطہ پر قبضہ کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ سلطان مجبوراً مالقہ میں آ کر مقیم ہو گیا۔ اس طرح غرناطہ اور نصف مشرقی حصے میں ابو

عبداللہ محمد کی حکومت قائم ہوگئی۔

بعض روایات میں ہے کہ سلطان ابوالحسن کی ایک عیسائی کنیز تھی جس سے اس کو بے حد محبت تھی۔ اس کنیز کے علاوہ سلطان کی ملکہ سلطان عبداللہ کی بیٹی تھی۔ بیوی اور کنیز دونوں سے اولاد تھی۔ بیوی کے بطن سے ابوعبداللہ اور یوسف تھے لیکن سلطان کی توجہ لونڈی پر زیادہ تھی۔ اس وجہ سے ابوعبداللہ اور یوسف دونوں کو خوف تھا کہ کہیں سلطان ابوالحسن تاج وتخت سے ہمیں محروم نہ کر دے اور کنیز کی اولاد کو اپنا جانشین نہ بنا دے۔ اس اندیشے سے اس وقت جب کہ سلطان لوشہ میں شاہ قسطلہ سے برسر پیکار تھا، ابوعبداللہ اور یوسف باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے غرناطہ کے ایک حصے پر قابض ہو گئے۔

ادھر عیسائیوں کے ساتھ جنگ جاری تھی اور وہ اس بغاوت کو فرو کرنے تدبیر سوچنے لگا۔ عیسائیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مالقہ پر حملہ کر دیا، مگر ان کو سخت ناکامی ہوئی اور قسطلہ کے تجربہ کار سپہ سالار، جرنیل اور دس ہزار سپاہی سلطان ابوالحسن کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ ابوعبداللہ محمد نے باپ کو پریشان کرنے کے لیے مالقہ پر حملہ کر دیا۔ باپ بیٹے ہر دو صف آرا ہوئے۔ ابوعبداللہ کو شکست ہوئی اور وہ غرناطہ بھاگ گیا، لیکن ایک چھوٹی سی ریاست دو حصوں میں منقسم ہوگئی جس کی وجہ سے اس کی طاقت آدھی رہ گئی۔ اس چھوٹی سی ریاست کو دو حصوں کو منقسم دیکھ کر عیسائیوں کے منہ سے حرص کی رال ٹپکنے لگی۔

مالقہ میں پہلے عیسائیوں کو اور پھر اپنے بیٹے ابوعبداللہ کو شکست دینے کے بعد سلطان ابوالحسن مالقہ میں داخل ہوا تو اس پر فالج کا حملہ ہوگیا اور اس کی بصارت جاتی رہی۔ دوسری جانب ابوعبداللہ نے باپ کی طرف سے مطمئن ہو کر اور فوج اکٹھی کر کے عیسائیوں کے علاقے پر حملہ کر دیا۔ لوشینہ پہنچ کر فوج کو تاخت و تاراج کرنے کا حکم دے دیا۔ وہاں کی عیسائی فوج کے کمانڈر نے اس ناتجربہ مسلمان کو دھوکہ دیا اور اپنی فوج کو لیے ہوئے الگ کمین گاہ میں منتظر بیٹھا رہا۔ جب ابوعبداللہ مال غنیمت لے کر واپس جانے لگا تو اس نے ایک درے میں راستہ روک کر اور ابوعبداللہ اور اس کی فوج کو چاروں طرف سے گھیر کر تمام اسلامی لشکر کو قتل اور ابوعبداللہ کو گرفتار کر لیا اور اس گرفتار شدہ شہزادے کو شاہ قسطلہ کے پاس بھیج دیا۔ یہ خبر سن کر باشندگان غرناطہ سلطان ابوالحسن کے پاس پہنچے اور اسے غرناطہ آنے کی درخواست کی۔ سلطان غرناطہ تو آ گیا لیکن اپنے بیٹوں کی باغیانہ سرگرمیوں کے باعث امور سلطنت سے اس کا دل اچاٹ ہوگیا اور کچھ اپنی بیماری کی وجہ سے بھی اس نے معذوری کا اظہار کر دیا، اور اپنے بھائی ابوعبداللہ زغل کو اپنی جگہ غرناطہ کے تخت پر بٹھا کر خود حق سلطنت سے دست بردار ہو گیا۔

سلطان ابوعبداللہ زغل:

سلطان ابوعبداللہ زغل نے اپنے بھائی سے حکومت لے کر ابھی کاروبار سلطنت شروع ہی کیا تھا کہ

عیسائیوں کے ایک بہت بڑے لشکر نے صوبہ مالقہ پر حملہ کر دیا اور جو قلعے غیر محفوظ اور بے انتظام تھے ان پر وہ نہایت آسانی سے قابض ہو گئے۔ آخر کار انھوں نے قلعہ بقوان کا محاصرہ کیا اور اپنی شدید گولہ باری سے قلعہ کی ایک دیوار مسمار کر دی۔ مسلمان جو بہت تھوڑی تعداد میں قلعہ کے اندر محصور تھے، انھوں نے نہایت شجاعت، جرأت اور بہادری سے مقابلہ کیا اور عیسائیوں ایک بہت بڑی تعداد کو کاٹ کر رکھ دیا۔ آخر یہ محصورین ایک ایک کر کے سب شہید ہو گئے اور یہ قلعہ بھی عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ جمادی الاولیٰ سنہ ۸۹۰ھ کو سلطان زغل غرناطہ سے سرحدی انتظام وانصرام کے لیے روانہ ہوا۔ ابھی یہ غرناطہ کے متصل قلعہ مثلین کے انتظام میں مصروف تھا اور قلعے کے باہر ایک میدان میں خیمہ زن تھا کہ عیسائیوں کے ایک بہت بڑے لشکر نے بالکل غیر متوقع طور پر حملہ کر دیا اور یکایک آ کر مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ مسلمانوں کو اس حملے کا وہم وگمان بھی نہیں تھا لہٰذا مسلمانوں کو سخت پریشانی ہوئی۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کو قتل کرتے ہوئے بڑھنا شروع کر دیا اور سلطان وہ زغل کے خیمے کے قریب پہنچ گئے۔ سلطان کو خطرے کی حالت میں دیکھ مسلمان فوج نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پوری ہمت اور جرأت کے ساتھ عیسائیوں پر حملہ آور ہوئے۔ اب بہت جلد لڑائی کا نقشہ بدل گیا۔ اب عیسائی بدحواس ہو کر بھاگے اور ہزار ہا لاشیں اس میدان میں چھوڑ گئے۔ عیسائیوں کا پورا توپ خانہ بھی مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ ان حملہ آوروں کے پیچھے شاہ فردی نند بھی ایک لشکر جرار لے کر آ رہا تھا۔ اس نے ان بھاگنے والوں کو راستے میں روک کر حالات معلوم کیے اور آگے بڑھنے کا ارادہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ سلطان زغل نے عیسائیوں سے چھینی ہوئی توپوں کو قلعہ مثلین پر چڑھا کر اس کو خوب مضبوط کر لیا ہے اور ہر قسم کی مدافعت کے لیے تیار ہے۔ یہ سن کر فردی نند کو ہمت نہ ہوئی اور وہ اپنی فوج عظیم کے ساتھ واپس چلا گیا اور دوسرے قلعوں کو جو غیر محفوظ تھے فتح کرنے اور غرناطہ کی اسلامی ریاست کے رقبے کو کم اور مسلمانوں کو کمزور کرنے میں مصروف رہا۔

فردی نند کو اپنی چند کامیابیوں کے باوجود اس بات کا پورا پورا یقین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی حکومت کا استیصال کوئی آسان کام نہیں، اور اگرچہ اسلامی ریاست کا رقبہ محدود اور مختصر رہ گیا ہے پھر بھی اگر مسلمان باہم متحد اور متفق ہو کر شمشیر بکف ہو جائیں تو ان کے لیے جزیرہ نمائے اندلس کو دوبارہ فتح کرنا کوئی مشکل کام نہیں، جیسا کہ طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر کے زمانے میں مٹھی بھر مسلمانوں نے عیسائی حکومت کو تاخت وتاراج کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ تو مسلمانوں کی بدقسمتی اور حماقت تھی جو یہ باہمی لڑائیوں میں مصروف رہے اور ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے رہے جس سے عیسائیوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ فردی نند کی اس مآل اندیشی اور دانش مندی نے اس کو چند روز کے لیے جنگی سرگرمیوں سے روک دیا اور اس نے دھوکے اور فریب سے کام لینے میں اپنی بہتری سمجھی۔ اس کے پاس ایک پتہ موجود تھا اور وہ تھا ابو عبداللہ محمد جو جنگ نوشینہ میں گرفتار ہو کر آیا تھا۔ اس نے اب اس پتے سے کھیلنا چاہا اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہوا اور یہی ابو عبداللہ محمد اندلس میں اس اسلامی حکومت کے اختتام کا باعث بنا جس کو عریف، طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر اور عبدالرحمٰن الداخل نے اپنے خون جگر سے

قائم کیا۔ اندلس کا یہ جعفر و صادق نہ صرف اسلامی حکومت کے اختتام کا باعث بنا بلکہ اس سرزمین سے اس نے مسلمانوں کو بھی فردی نند اور ازبیلا کے ہاتھوں ختم کروادیا اور آج بھی اشبیلیہ اور قرطبہ کی مساجد اور یونیورسٹیاں اور الحمرا کے محلات اس پر نفرین اور لعنت کے آوازے کستے ہیں۔

فردی نند نے یہ کیا کہ ابوعبداللہ محمد کو جیل خانے سے اپنے پاس بلوا کر بڑی محبت، ہمدردی اور دل سوزی کی باتیں کہیں اور اس کے ذہن میں یہ ڈالنے کی کوشش کی کہ سلطنت غرناطہ کے اصل وارث اور حق دار تم ہو۔ تمھارے چچا زغل نے اس پر غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ زغل کو بے دخل کر کے تم خود سلطنت غرناطہ پر قابض ہو جاؤ۔ اس مقصد کے حصول کے لیے تمھیں جس قسم کی مدد درکار ہوگی وہ میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میری ہمسایہ اسلامی حکومت اچھی حالت میں رہے اور ہمارے درمیان کبھی جنگ اور لڑائی کی نوبت نہ آئے۔ ابوعبداللہ محمد پہلے ہی تاج وتخت کا حریص تھا، پھر وہ فردی نند کی قید میں تھا۔ لہٰذا وہ فردی نند کے سبز باغ دکھانے پر اس کے دام تزویر میں پھنس گیا اور انجام کو نہ سوچا۔ اس پر مستزاد یہ کہ فردی نند نے اس سے وعدہ کیا کہ جس قدر شہر تیرے قبضے میں آجائیں گے میں ان کو اور ان میں بسنے والی رعایا کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچاؤں گا، لیکن زغل سے مجھ کو کوئی ہمدردی نہیں۔ ابوعبداللہ محمد فردی نند سے وعدہ وعید کر کے سیدھا مالقہ آیا اور یہاں کے لوگوں کو فردی نند کے وعدوں سے مطلع کر کے اپنی فرمان برداری کی درخواست کی۔ مالقہ والوں نے یہ سمجھ کر کہ ہم اگر ابوعبداللہ محمد کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیں گے تو عیسائیوں کے حملوں سے محفوظ ہو جائیں گے، فوراً اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد ابوعبداللہ محمد نے اپنے قبضے کو وسیع کرنا شروع کر دیا۔ زغل نے اس بغاوت کو فرو کرنے کی کوشش کی، لیکن ان عیسائیوں نے جو ابھی تک اسلامی حکومت میں آباد اور مقام بیزین میں سب سے زیادہ موجود تھے، ابوعبداللہ کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آخر ایک نہایت اہم مقام لوشہ کو ابو عبداللہ نے زغل سے طلب کیا کہ اگر تم لوشہ کی حکومت میرے سپرد کر دو تو میں آپ کے ساتھ مل کر فردی نند پر حملہ کروں گا۔ زغل نے اپنی رعایا کے اکثر لوگوں اور بعض سرداروں کو اس طرف متوجہ دیکھ کر لوشہ عبداللہ کو دے دیا۔ ادھر ابوعبداللہ نے لوشہ پر قبضہ کیا اور دوسری طرف فردی نند نے اپنی فوج کے ساتھ لوشہ کی طرف کوچ کیا۔ ابوعبداللہ نے نہایت گرم جوشی سے فردی نند کا استقبال کیا اور لوشہ پر اس کا قبضہ کرا کر جمادی الآخر سنہ ۸۹۱ھ قلعہ البیرہ، مثلین اور صحرہ کے محاصرے کو روانہ ہوا۔ یہ قلعے بھی ابوعبداللہ نے عیسائی فوجوں کی مدد سے زیر قبضہ کر کے فردی نند کو دے دیے، اور سلطنت غرناطہ کا ایک بڑا اہم اور قیمتی حصہ جس کا فتح کرنا فردی نند کے لیے نہایت مشکل تھا، ابوعبداللہ کی وجہ سے نہایت آسانی سے عیسائیوں کے قبضے میں آگیا۔ گویا صنم خانے کو کعبہ سے پاسباں مل گئے۔ وجہ یہ ہوئی کہ رعایا کے اکثر افراد ابوعبداللہ کو اپنا شہزادہ اور تخت وتاج کا وارث سمجھ کر اس کی مخالفت سے دست کش ہو گئے تھے، اور عام طور پر لڑائی کا وہ جوش پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا جس کا ایک عیسائی حملہ آور کے مقابلے میں پیدا ہونا ضروری تھا۔ جب یہ سارے اہم مقامات مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر فردی

نند کے قبضے میں چلے گئے تو اس وقت مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور ان کو پتہ چلا کہ ابو عبداللہ تو عیسائی بادشاہ کا ایجنٹ ہے اور اس نے مسلمانوں کے شہروں اور قلعوں پر دھوکے سے قبضہ کر کے ان کو قسطلہ کے بادشاہ کے سپرد کر دیا ہے۔ مقام نبیرین بالکل شہر غرناطہ سے ملا ہوا تھا۔ یہاں عیسائیوں کی آبادی تھی، اس لیے ابو عبداللہ نے نبیرین میں قیام کر کے اہل غرناطہ کو اپنی حمایت پر آمادہ کرنا چاہا۔ یہاں یہ ریشہ دوانیاں جاری تھیں، ادھر اہل مالقہ نے سلطان زغل کی فرماں برداری اور اطاعت کا ارادہ کر کے عیسائی حکومت کے تمام نشانات کو مٹا دیا۔ فردی نند نے ربیع الثانی سنہ ۸۹۲ھ میں بذات خود ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ مالقہ پر حملہ کیا اور جنگی جہاز بھی مالقہ کے ساحل پر روانہ کیے۔ فردی نند کے اس حملے کی خبر سن کر سلطان زغل غرناطہ سے مالقہ کی طرف فوج لے کر روانہ ہوا۔ دوسری طرف ابوعبداللہ محمد ۱۵ر جمادی الاولیٰ سنہ ۸۹۲ھ میں غرناطہ کو خالی دیکھ کر اس پر قابض ہو گیا۔ زغل نے جب یہ سنا کہ غرناطہ پر ابوعبداللہ محمد قابض ہو گیا ہے تو وہ مالقہ کو فردی نند کے محاصرے میں چھوڑ کر خود غرناطہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں معلوم ہوا کہ ابوعبداللہ کا غرناطہ پر مکمل قبضہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ زغل وادیٔ آش میں ٹھہر گیا۔ اہل مالقہ نے عیسائیوں کے حملوں کو نہایت جرأت اور بہادری سے روکا، ساتھ ہی مراکش، تیونس، مصر کے بادشاہوں اور ترکی کے سلطان کو لکھا کہ اس نازک وقت میں ہماری مدد کرو اور ہمیں عیسائیوں کے پنجوں سے نجات دلاؤ، لیکن کسی نے بھی ان کی مدد کے لیے فوج نہ بھیجی۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر شعبان سنہ ۸۹۲ھ میں مالقہ فردی نند کے حوالے کر دیا گیا۔ تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ اہل مالقہ نے جب اپنی نا اتفاقیوں اور خانہ جنگیوں کی پاداش میں ہر طرف سے مایوس ہو کر فردی نند سے صلح اور امن کی درخواست کی تو اس نے کہلا بھیجا کہ اب تمھارے پاس سامان رسد ختم ہو گیا ہے اور تم ہر طرف سے مایوس بھی ہو چکے ہو، لہٰذا بلا شرط شہر کی کنجیاں ہمارے پاس بھیج دو اور ہمارے رحم و کرم کے امیدوار رہو۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ چنانچہ فردی نند نے شہر پر قبضہ کرنے کے بعد یہ حکم دیا کہ ہر ایک مسلمان کو قید کر کے اس کی تمام جائیداد کو بحق سرکار ضبط کر لیا جائے۔ فردی نند نے تمام اخلاقی حدود و قیود کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ پندرہ ہزار مسلمانوں کو عیسائیوں نے اپنا غلام بنا لیا۔ باقی تمام باشندگان مالقہ کو بے سروسامانی کے عالم میں وہاں سے جلاوطن کر دیا۔ ان میں سے اکثر فاقوں، سفر کی صعوبتوں اور بے سروسامانی کے سبب ہلاک ہو گئے۔ بعض ساحل افریقہ تک پہنچے اور وہیں آباد ہو گئے۔ مالقہ پر قبضہ کرنے کے بعد فردی نند نے تمام نواحی قلعوں اور شہروں کو فتح کر کے وہاں کی تمام مسلم آبادی کو مقتول اور جلاوطن کر دیا۔ اس کے بعد اس نے یکے بعد دیگرے ایک ایک شہر اور ایک ایک قلعے کو فتح کرنا اور وہاں کے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ جب وہ وادیٔ آش میں پہنچا جہاں سلطان زغل مقیم تھا، تو اس نے کوشش کی کہ کسی طرح زغل میرا ساتھی اور شریک کار ہو جائے۔ ابو عبداللہ جو غرناطہ پر قابض ہو کر اب فردی نند کی پیش قدمی کو ناپسند کرتا تھا اور غرناطہ اور اس کے نواحی علاقے کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا، اہل غرناطہ کی جرأت و پامردی سے مقابلے پر آنے اور عیسائیوں سے جنگ کرنے

پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اس حالت میں فردی نند نے زغل کو اپنا دوست اور ساتھی بنانے اور غرناطہ کی حکومت اس کو دوبارہ دلوانے کا سبز باغ دکھایا۔ اب زغل نہایت بے دست و پا تھا، لہٰذا اس نے مجبوراً یا پھر حقیقتاً ابوعبداللہ کی تباہی و بربادی دیکھنے کے شوق میں وادیٔ آش اور صوبہ المیریا فردی نند کے حوالے کر دیا اور اس کے بدلے میں اشبیلیہ کے علاقے میں کچھ اراضی فردی نند سے لے لی۔ مختصر یہ کہ اس عیسائی بادشاہ نے آخر وقت تک بھی مسلمانوں کی تباہی و بربادی میں مسلمانوں سے امداد لینی ضروری سمجھی۔ زغل کے فردی نند کے ساتھ ملنے سے فردی نند کا المیریہ اور وادیٔ آش پر قبضہ ہو گیا اور ان دونوں پر قبضہ ہونے سے اندلس سے مسلمانوں کی حکومت کا نام ونشان گم ہو گیا۔ اب صرف شہر غرناطہ اور اس کے چند مضافات ہی مسلمانوں کے قبضے میں رہ گئے۔ جب زغل فردی نند کا شریک اور ساتھی ہو گیا تو اس وقت ابوعبداللہ محمد الحمرا میں اپنے چچا زغل کی اس بدانجامی کا حال سن کر خوش ہو رہا تھا کہ اس کے قبضے سے تمام ملک نکل گیا اور وہ اب بے دست و پا ہو گیا کیونکہ ابوعبداللہ محمد کو یقین تھا کہ غرناطہ میں اب تنہا میری ہی حکومت ہوگی اور فردی نند چونکہ میرا دوست ہے اور میں نے ''ننگ ملک و ننگ دین ننگ وطن'' بن کر بھی فردی نند کی حمایت کی ہے اور اندلس کے کئی شہر اپنے چچا کے قبضہ سے نکال کر اس کو دیے ہیں، اس لیے اب فردی نند غرناطہ لینے کی جرأت ہرگز نہیں کرے گا، لیکن اس کو کیا پتہ تھا کہ فردی نند یہ سب کچھ غرناطہ لینے ہی کے لیے کر رہا ہے۔ چنانچہ فردی نند نے ابوعبداللہ کو لکھا:

''جس طرح الزاغل نے المیریہ اور وادیٔ آش خود اپنی رضا مندی سے میرے سپرد کر دیے ہیں تم بھی غرناطہ اور الحمرا میرے حوالے کر دو اور اس کے بدلہ میں جتنی دولت طلب کرو گے وہ تمھیں دے دی جائے گی، اور اس کے علاوہ اندلس کا جو صوبہ کہو گے اس پر تمھاری حکومت قائم کر دی جائے گی۔''

یہ ایک سبز باغ تھا جو ابوعبداللہ کو دکھایا جا رہا تھا کیونکہ اس سے قبل فردی نند اپنے کسی معاہدے پر قائم نہیں رہا تھا، اور ویسے بھی یہ عام اصول ہے کہ فاتح اور غالب کا کوئی وعدہ پختہ نہیں ہوتا۔ فردی نند کی اس تحریر کے آنے کے بعد ابوعبداللہ نے غرناطہ کے باشندوں میں بااثر افراد کو اکٹھا کر کے فردی نند کا خط سنایا اور کہا کہ فردی نند کو الزغل نے غرناطہ لینے کی ترغیب دی ہے۔ اب ہمارے لیے دو ہی راستے ہیں: یا تو غرناطہ اور قصر الحمرا فردی نند کے سپرد کر دیں یا یہ کہ جنگ کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ غرناطہ کے لوگ ابوعبداللہ کی غداریوں، وطن دشمنیوں اور دینی اقدار کے پامال کرنے سے خوب واقف تھے اور جانتے تھے کہ اسی شخص نے اندلس میں اسلامی حکومت کے برباد کرنے کے تمام سامان مہیا کیے ہیں اور یہی وہ شخص جس نے اپنے باپ ابوالحسن کے ساتھ غداری کی تھی اور جب وہ عیسائیوں کو اندلس میں شکست پر شکست دے رہا تھا، یہی شخص تھا جس نے اس کی ٹانگ کھینچی اور اس کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے اس بیٹے کا یہ برا کردار دیکھ کر زمام حکومت اپنے بھائی الزغل کو دے کر ہمیشہ کے لیے حکومت سے دست کش ہو گیا۔ لیکن اب حالات یہ تھے کہ باشندگان اندلس سوائے اس کے اور کسی بات پر متفق نہیں ہو سکتے تھے کہ عیسائیوں سے جنگ کرنی چاہیے۔ چنانچہ سب نے جنگ کرنے کا

مشورہ دیا۔ ابوعبداللہ کی دلی خواہش کیا تھی یہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے لیکن باشندگان اندلس کو جنگ پر آمادہ دیکھ کر اس نے بھی اسی پر اپنی آمادگی ظاہر کی۔ چنانچہ ابوعبداللہ نے فردی نند کو اس کے خط کے جواب میں لکھا:

''میں تو آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہوں لیکن میری رعایا کسی طرح آمادہ نہیں ہے۔''

اور ابوعبداللہ نے کچھ عرصے بعد عیسائیوں کے بعض قلعوں پر قبضہ کر لیا۔

ادھر فردی نند شاہ قسطلہ اپنا زبردست لشکر جرار لیے آ پہنچا اور اس نے آتے ہی رجب سنہ ۸۹۵ھ میں غرناطہ کا محاصرہ کر لیا۔ اہل غرناطہ نے شہر کی مدافعت میں اپنی پوری ہمت اور جرأت سے کام لیا اور لڑائیوں کا ایک سلسلہ جاری ہو گیا۔ عیسائیوں نے غرناطہ کے کئی نواحی قلعوں پر قبضہ کر لیا لیکن مسلمانوں نے قدم قدم پر اس بے جگری سے عیسائیوں کا مقابلہ کیا کہ عیسائیوں کے دانت کھٹے کر دیے اور ان تمام قلعوں کو جن پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا تھا، واپس لے لیا۔ فردی نند نے مسلمانوں کی یہ زبردست مدافعت دیکھ کر یہ مناسب سمجھا کہ غرناطہ کی فتح کو کسی دوسرے وقت پر ملتوی کیا جائے اور زیادہ جنگی سازوسامان اور زیادہ تازہ دم فوج لا کر محاصرہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ غرناطہ کا محاصرہ اٹھا کر چلا گیا۔ ابوعبداللہ نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اہل غرناطہ کو لے کر اس علاقے کی طرف پیش قدمی کی جو عیسائیوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ بعض قلعوں کو فتح کر کے وہاں کی عیسائی افواج کو تہ تیغ کیا اور وہاں مسلمانوں کی فوج مقرر کی۔ غرناطہ میں واپس آ کر اس نے پھر جنگی تیاری شروع کر دی اور فوج لے کر بشرات کی جانب روانہ ہوا۔ یہاں کے بعض قصبوں کو اپنے قبضے میں لیا اور قلعہ اندرش کو فتح کر کے عیسائی جھنڈا وہاں سے اتار پھینکا اور اسلامی علم وہاں نصب کیا۔ علاقہ بشرات کے تمام باشندوں نے اطاعت قبول کر کے اپنی اعانت کا یقین دلایا اور از سر نو اس ملک میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی گئی۔

اتفاقاً بشرات کے کسی گاؤں میں ابوعبداللہ کا چچا الزغل بھی مقیم تھا۔ اس نے ابوعبداللہ اس طرح اپنے مقصد میں کامیاب و کامران دیکھ کر مقابلے کی تیاری کی اور وہاں سے المیریہ جا کر عیسائیوں کو اپنے گرد اکٹھا کیا اور ابوعبداللہ کے خلاف تیاری کر کے فردی نند کو اطلاع دی کہ ابوعبداللہ اس قدر طاقتور ہو گیا ہے کہ اگر اس کی طرف سے چند روز بے التفاتی اختیار کی گئی تو پھر اس کا مقابلہ کرنا اور اس کو پیش قدمی کرنے سے روکنا نہایت مشکل ہو جائے گا۔ زغل کا یہ خیال درست تھا لیکن اس نے خود ابوعبداللہ کے مدمقابل ہو کر اور لڑائیوں کا سلسلہ جاری کر کے ابوعبداللہ اور اہل غرناطہ کی ترقی کی اس رفتار کو روک دیا جو چند روز میں فردی نند اور عیسائیوں کے بس سے باہر ہو جاتی۔ اس موقع پر الزغل کو چاہیے تھا کہ وہ مسلمان دشمنی سے کام نہ لیتا بلکہ اتحاد و اتفاق سے کام لیتا اور ذاتی رقابتوں اور دشمنیوں کو یک قلم فراموش کر کے اسلامی مقصد کو فوت نہ ہونے دیتا لیکن مسلمانوں کی بدنصیبی نے ان کو یہ روز بد دکھایا اور اس خانہ جنگی اور نااتفاقی نے ان کو سنبھلنے نہ دیا، اور طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر اور عبدالرحمٰن الداخل کی جزیرہ نمائے اندلس میں نہایت کاوشوں سے قائم کردہ حکومت کو ان عیسائیوں کے ہاتھوں نیلام کر دیا جن کے لاکھوں کے لشکر کو ساڑھے پانچ ہزار کے لشکر نے نہ صرف میدان جنگ سے بھگا دیا

بلکہ ان کے ایک لاکھ سے زائد آدمی بھی مارے گئے تھے۔ جن کی ماؤں، بیویوں اور بیٹیوں نے مسلمانوں کی منتیں کر کے طلیطلہ کے محاصرے کو ختم کرایا۔ آج انھی مسلمانوں کی وطن دشمن اور اسلام دشمن نسل عیسائیوں کے ساتھ مل کر اپنی ہی حکومت کو تباہ و برباد کر رہی تھی۔ چنانچہ رمضان المبارک سنہ ۸۹۵ھ میں الزغل نے عیسائی فوجوں کو فراہم اور متفق کر کے قلعہ اندرش کو مسلمانوں کے قبضے سے نکال لیا۔ سلطان ابوعبداللہ محمد نے اسی مہینے اہل غرناطہ کی جرأت و پامردی اور جواں ہمتی سے قلعہ ہمدان، منکب اور شلوبانیہ کو فتح کر لیا۔ شلوبانیہ کا قلعہ ابھی فتح نہیں ہوا تھا کہ پتہ چلا کہ فردی نند شاہ قسطلہ اپنی عظیم فوج کے ساتھ غرناطہ کے قریب پہنچ گیا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ جزیرہ نمائے اندلس کی وہ اسلامی حکومت جس کے گھوڑے فرانس کے مختلف شہروں میں ہنہناتے تھے اب ان کے ناخلف جانشینوں کے باعث وہ عظیم سلطنت غرناطہ کے چھوٹے سے رقبہ میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

سلطان ابوعبداللہ محمد کو جب یہ خبر ملی کہ فردی نند ایک لشکر جرار کے ساتھ غرناطہ کے قریب پہنچ گیا ہے تو وہ فوری طور پر قلعہ شلوبانیہ سے غرناطہ کی طرف متوجہ ہوا اور ۳ رشوال کو غرناطہ میں پہنچا۔ عیسائی لشکر نے برج ملاحہ کو منہدم کر دیا تھا۔ آٹھویں روز فردی نند نے غرناطہ کو چھوڑ کر وادیٔ آش کا راستہ لیا اور وہاں پہنچ کر نہتے مسلمانوں کو چن چن کر قتل کیا، نہ کسی بچے کو چھوڑا اور نہ بوڑھے کو، نہ عورت کو چھوڑا اور نہ جوان کو، جو خوش قسمت اس کی شمشیر ظلم سے بچ گئے ان کو جلا وطن کر دیا گیا۔ ایک شخص بھی قسم کھانے کو وہاں اللہ کا نام لینے والا نہ رہا۔ قلعہ اندرش کو بھی مسمار کر کے زمین کے برابر کر دیا۔ اس ظلم وستم اور قتل و غارت کے بعد عیسائی لشکر واپس چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آئے ہی اس قتل و غارت کے لیے تھے۔

فردی نند نے قسطلہ واپس جاتے ہوئے زغل کو، جس نے فردی نند کی بہت موثر حمایت کی تھی اور عبداللہ کی سخت مخالفت کی تھی، بلا کر حکم سنایا کہ اب آپ کی اس ملک کو کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ جو کام ہم نے آپ سے لینا تھا وہ لے لیا، ہم آپ کے زیر بار احسان نہیں بلکہ ہم آپ پر صرف اس قدر احسان کر سکتے ہیں کہ اگر آپ اندلس سے کہیں باہر جانا چاہیں تو ہم آپ کو جانے دیں۔ جو شخص اپنوں سے اس طرح غداری کر سکتا ہے وہ ہمارا کبھی خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔ زغل یہ حکم سن کر پریشان بھی ہوا اور ورطۂ حیرت میں بھی ڈوب گیا کہ میں نے عیسائیوں کی کس قدر مدد کی اور اپنوں کے ساتھ کیسی غداری کی لیکن عیسائی پھر بھی مجھے زیر بار احسان کر رہے ہیں۔ چنانچہ زغل فردی نند کا یہ حکم سنتے ہی اندلس سے روانہ ہو کر افریقہ چلا گیا۔ اور تلمسان کے مقام پر اپنی باقی ماندہ زندگی کے دن گم نامی کی حالت میں گزار کر راہی ملک عدم ہوا۔

اس موقع پر فردی نند کا عزم و استقلال اور احتیاط قابل داد ہے۔ وہ چونکہ اندلس سے مسلمانوں کا نام و نشان ختم کرنا چاہتا تھا لہٰذا اس کے کاموں میں صبر و تامل اور عقل و دانائی کا حصہ زیادہ تھا، عجلت پسندی سے وہ کوسوں دور تھا۔ اس نے کس دانش مندی اور دانائی سے مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر ان کی طاقت کو کمزور کیا۔

بھائی سے بھائی کا گلا کٹوایا، ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفاق اور نفرت کا بیج بویا۔ پہلے ابوعبداللہ محمد سے الزغل کے خلاف کام لیا پھر الزغل سے ابوعبداللہ پر متعدد حملے کروا کر اس کی عسکری طاقت کو اس قدر کمزور کر دیا کہ اب وہ الزغل کے بغیر بھی اس سے غرناطہ کو چھین سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے پہلے الزغل کو اندلس سے نکالا کہ کہیں یہ دونوں چچا اور بھتیجا آپس میں اتحاد و اتفاق نہ کر لیں۔ جب الزغل اندلس سے افریقہ چلا گیا اور ابو عبداللہ محمد کی حکومت سمٹ کر غرناطہ کے شہر بلکہ الحمرا تک رہ گئی تو اب اس کے لیے ابوعبداللہ سے غرناطہ چھیننا بالکل آسان ہو گیا۔

فردی نند جب وادیٔ آش میں مسلمانوں کا قتل عام کر کے واپس چلا گیا تو ابوعبداللہ نے برشلونہ کی طرف قدم بڑھایا اور اس کا محاصرہ کر کے اس کو فتح کر لیا، لیکن چند ہی روز کے بعد یعنی ماہ ذی قعدہ کے آخری ایام میں عیسائیوں نے اکٹھے ہو کر اس شہر کو مسلمانوں کے قبضہ سے چھڑا لیا اور وہاں اسلام کا نام لینے والے کسی شخص کو زندہ نہ چھوڑا۔ اب اہل غرناطہ اپنی تعداد کی کمی اور کاموں کی کثرت کے باعث افسردہ اور پژمردہ ہو گئے تھے۔ اس افسردگی اور پژمردگی کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ آئے روز اندلس سے مسلمانوں کے جا بجا قتل اور جلاوطن ہونے کے حالات سنتے رہتے تھے اور بیرونی ممالک سے کسی قسم کی امداد نہ پہنچنے کا انھیں یقین ہو گیا تھا۔ ان کی اپنی تعداد عیسائی فوجوں کے مقابلے میں نہایت کم تھی اور روز بروز بڑے بڑے عیسائی لشکروں سے لڑ کر وہ تھک بھی چکے تھے۔ اب اندلس میں صرف وہی مسلمان رہ گئے تھے جو غرناطہ شہر میں رہتے تھے۔

اندلس سے اسلامی حکومت کا مکمل خاتمہ:

مسلمانوں نے اندلس پر قریباً آٹھ سو سال حکومت کی۔ سب سے پہلا اسلامی لشکر چار جہازوں پر پیر ۵/ رجب سنہ ۹۲ھ کو آبنائے کو عبور کر کے ایک پہاڑی پر اترا جو بعد میں طارق بن زیاد کی طرف منسوب ہو کر جبل الطارق کے نام سے موسوم ہوئی جس کو جبرالٹر کہا جاتا ہے۔ المقری نے نفح الطیب ۲۱۴/۱ میں لکھا کہ طارق ابن زیاد سے بھی ایک سال قبل یعنی رمضان ۹۱ھ/ جولائی ۷۱۰ء میں طریف کی سرکردگی میں جزیرۂ اندلس پر فوج کشی ہوئی۔ (اول من دخل جزیرۃ اندلس من المسلمین برسم الجھاد طریف) اس کے ایک سال بعد طارق ابن زیاد جولین کے تجارتی جہازوں پر اندلس میں وارد ہوا۔ اس کے اترنے کا کسی کو بھی یوں احساس نہ ہوا کہ باہر سے کوئی حملہ آور آیا ہے۔ یہ چاروں جہاز ان سپاہیوں کو ساحل پر اتار کر باقی ماندہ سپاہیوں کو لانے کے لیے واپس چلے گئے۔ اب ۱۲/ جمادی الآخر ۸۹۶ھ میں فردی نند شاہ قسطلہ اپنی ملکہ ازبیلا کے ساتھ عظیم الشان قلعہ شکن توپ خانے اور ایک لشکر جرار لے کر غرناطہ کے متصل پہنچا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے سرسبز و شاداب باغوں، کھیتوں اور آباد بستیوں کو تاخت و تاراج کرنا، فصلوں اور مکانات کو جلانا اور مسلمان باشندوں کے خون کی ندیاں بہانا شروع کر دیا۔ غرناطہ کے سامنے پہنچ کر اس نے چھاؤنی ڈال دی اور شہر

کا محاصرہ کر لیا۔ اہل شہر نے محصور ہو کر اور اپنی زندگیوں سے مایوس ہو کر اپنے دفاع میں پھر جان لڑانی شروع کر دی۔ شہر کا ایک حصہ چونکہ کوہ شلیر سے ملا ہوا تھا لہٰذا عیسائی فوجیں شہر کا مکمل محاصرہ نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ محاصرہ قریباً آٹھ مہینے تک جاری رہا۔ جزیرہ نمائے اندلس میں اب اس محصور شہر کے سوا اور کوئی شہر اسلامی حکومت کا باقی نہیں رہا تھا۔ جب موسم سرما شروع ہوا اور پہاڑوں پر برف پڑنے کی وجہ سے راستے بند ہو گئے تو شہر والوں کو جو رسد کوہ شلیر کی طرف سے پہنچتی تھی، وہ یک قلم موقوف ہو گئی۔ لہٰذا صفر سنہ ۸۹۷ھ میں محاصرہ کی سختی کے باعث مسلمان گھبرا گئے اور مشورے سے مسلمان بادشاہوں کو اور قسطنطنیہ کے بادشاہ بایزید ثانی کو اپنی معاونت کے لیے خط لکھا جس میں تحریر تھا:

''صدیوں سے عیسائی ہمیں دباتے چلے آ رہے ہیں۔ اب ہم ان کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہے۔ ہم کو ہر طرح کا نقصان پہنچایا جا رہا ہے باوجودیکہ ہم نے بڑی سے بڑی قربانیاں دیں۔ اب مسلمان غلام بنا لیے گئے۔ جن مشکلات اور مسائل میں ہم آج گرفتار ہیں ان کا آخری نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ دین اسلام کا وجود اس ملک میں یک قلم ختم ہو جائے گا اور کوئی مسلمان باقی نہ رہے گا۔''

مسٹر اسکاٹ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

''سلطان بایزید ثانی اپنے ہم مذہبوں کی یہ دردناک تحریر دیکھ کر ایسا اثر پذیر ہوا کہ اس نے دو فرانسکن راہبوں کو روم بھیجا اور پوپ کو یہ دھمکی دی کی سلطنت ترکیہ میں تمام عیسائی نظریے اور عمل کی پوری پوری آزادی رکھتے ہیں۔ اگر اندلس کے مسلمانوں پر یہی ظلم جاری رہا تو اس کا بدلہ ہم اپنی عیسائی رعایا سے لیں گے، ورنہ آپ فوراً اپنے رعب و اقتدار کو کام میں لا کر اپنے کیتھولک غلاموں کو ان حرکتوں سے باز رکھیں جو وہ کر رہے ہیں۔'' (اخبار الاندلس: ۲/ ۲۹۱)

پوپ نے سلطان بایزید ثانی کے ایلچیوں کو اپنا خط دے کر فردی نند کے پاس بھیج دیا، لیکن فردی نند کی آنکھوں میں مسلمانوں کے انتقام کا خون سوار تھا لہٰذا اس نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ بایزید ثانی بذات خود امیر مصر سے برسر پیکار تھا۔ فردی نند نے اس سے مدد کا وعدہ کیا جس کی وجہ سے اسے مسلمانان اندلس سے ہمدردی جاتی رہی۔ اسکاٹ ہی لکھتا ہے:

''اندلس کے نام لیواؤں کو اپنے حال اور قسمت پر چھوڑ دیا گیا۔'' (اخبار الاندلس: ۲/ ۲۹۱)

ہر طرف سے مایوس ہو کر صفر سنہ ۸۹۷ھ میں غرناطہ کے مسلمانوں نے سلطان ابو عبداللہ سے درخواست کی کہ جب تک ہمارے جسم میں جان باقی ہے ہم دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ اب بھوک کے مرنے کے عوض ہم میدان کارزار میں تیر و تفنگ کھا کر اپنی جان دینا پسند کریں گے۔ ہم کو طارق بن زیاد کا معرکہ یاد ہے کہ اس فاتح اول نے اپنی مٹھی بھر فوج سے ایک لاکھ عیسائی فوج کو شکست فاش دی تھی، ہماری تعداد جو اس وقت محصور ہے بیس ہزار سے کچھ کم ہے، لیکن چونکہ ہم مسلمان ہیں لہٰذا ہم کو ایک لاکھ باسامان فوج سے ہرگز ہراساں

ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابوعبداللہ محمد نے دیکھا کہ اہل شہر کا اضطراب روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر فوراً جنگ یا صلح کا فیصلہ نہ ہوا تو لوگ باغی ہو کر کوئی ایسی حرکت کر بیٹھیں گے جس سے کوئی بڑا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس نے وزراء اور امراء کو طلب کیا اور قصر الحمرا میں ایک مجلس مشاورت منعقد کی۔ شہر کے علماء اور شیوخ کو بھی اس میں دعوت دی گئی۔ چنانچہ وہ بھی اس مجلس مشاورت میں شریک ہوئے۔ ابوعبداللہ نے اہل مجلس سے کہا کہ اب عیسائی جب تک شہر پر قبضہ نہ کرلیں گے، محاصرہ ختم نہیں کریں گے۔ آپ حضرات بتائیں کہ ایسے نازک وقت میں کیا تدبیر کی جائے؟ سلطان ابوعبداللہ کا حوصلہ اس قدر پست ہو گیا تھا کہ ان چند الفاظ کے سوا اور کوئی جملہ اس کی زبان سے نہ نکل سکا۔ اس کے اس جملے کے جواب میں تمام حاضرین نے کہا: ''مناسب یہی ہے کہ فردی نند سے صلح کر لی جائے، لیکن بہادر سپہ سالار موسیٰ بن ابیل غسانی جوش اور غصے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے برملا کہا کہ ابھی تک کامیابی کی امید باقی ہے، ہم کو ہرگز ہمت نہیں ہارنی چاہیے اور اللہ پر بھروسہ کر کے ہمیں آخر وقت تک عیسائیوں کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ مجھ کو امید ہے کہ ہم ان شاء اللہ عیسائیوں کو ضرور بھگا دیں گے اور ان کا محاصرہ اپنے شہر سے ضرور ہٹا دیں گے۔ عام باشندگان غرناطہ کی یہی رائے تھی جو موسیٰ نے ظاہر کی لیکن اس مجلس میں جو لوگ شریک تھے ان میں سے کسی نے موسیٰ کی تائید نہ کی۔ یہی قرار پایا کہ اگر ہم جنگ میں کامیاب نہ ہوئے تو عیسائی ایک مسلمان کو بھی زندہ نہ چھوڑیں گے، لہٰذا ایسی شرائط پر صلح کر لی جائے جس سے عوام کے جان و مال کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ بعض تواریخ میں ہے کہ ابوعبداللہ نے جب قصر الحمرا میں مجلس مشاورت منعقد کی تو تمام اکابر غرناطہ اس میں شریک ہوئے۔ ان میں علماء اور شیوخ بھی تھے اور امراء اور رؤسا اور وزراء بھی۔ غیرت مند چاہتے تھے کہ تخت یا تختہ یعنی بہادری سے مرا جائے مگر کثیر تعداد ان بزدلوں کی تھی جو یہ چاہتے تھے کہ اسلامی حکومت رہے یا نہ رہے اپنا مال اور جان محفوظ ہو جائے لیکن وہ یہ بھول گئے تھے کہ فاتح کا کوئی وعدہ پکا نہیں ہوتا۔ اس کا وعدہ ریت کی ایک دیوار ہوتا ہے جب چاہے گر جائے۔ چنانچہ وزیر ابوالقاسم عبدالملک کی معرفت شاہ قسطلہ فردی نند سے صلح کی باتیں ہونے لگیں۔ جو شرائط اس سے کی گئیں وہ مسلمانوں کے جان و مال کے تحفظ کے لیے بظاہر اچھی تھیں۔ اس پر فردی نند اور ازبیلا نے دستخط کیے۔ اس کے ساتھ ابوعبداللہ نے ایک معاہدہ اور کیا کہ شاہ قسطلہ غرناطہ کے معاوضے میں ایک کروڑ چالیس لاکھ پانچ صد کی رقم اس وقت دے گا جب پہلے قلعہ الحمرا پر قبضہ ہو جائے، اور ابوعبداللہ چاہے اندلس میں یا افریقہ میں بحری سفر کے اخراجات بھی دیے جائیں گے۔ اس کے لیے صرف دو ماہ کی مہلت دی گئی تھی۔ دو ماہ گزرنے کو ہوئے تو ابوعبداللہ نے پھر ایک روز عمائدین شہر کو اکٹھا کیا کہ اب کیا کیا جائے؟ سب کہتے تھے کہ فردی نند کو حکومت دے دی جائے لیکن سپہ سالار فوج موسیٰ غسانی نے کہا کہ اس ذلت سے تو بہتر ہے کہ لڑ کر جان دے دی جائے لیکن مجلس میں سے کوئی اس کا موید اور ہم نوا نہ ہوا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور نصرانیوں سے بھڑ گیا اور زخمی ہو کر دریائے شنبل میں کود پڑا۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ عیسائی قلعے کی حالت سے ناواقف تھے۔ اس وقت تک وہ مسلمانوں کو کوئی

نقصان نہیں پہنچا سکے تھے، لہٰذا بہت بد دل اور افسردہ ہو رہے تھے۔ ابوالقاسم وزیر کے پہنچنے اور پیغام صلح سننے سے بہت ہی خوش ہوئے۔ شاہ قسطلہ نے ابوالقاسم کی اس درخواست کو فوراً منظور کر لیا، اس راز کو رعایا سے پوشیدہ رکھنے کی غرض سے ابوالقاسم رات کی تاریکی میں قلعے سے باہر جا کر صلح نامہ کے شرائط طے کیا کرتا تھا۔ بڑی ردوکد کے بعد مندرجہ ذیل شرائط طے ہوئیں اور صلح نامہ پر ابوعبداللہ اور فردی نند کے دستخط ہوئے۔

صلح کی شرائط:

اس صلح نامہ کی جو شرائط طے ہوئیں ان میں سے چند اہم شرائط یہ ہیں:

① مسلمانوں کو اختیار ہوگا کہ وہ شہر میں رہیں یا شہر سے باہر چلے جائیں۔ کسی مسلمان کے جان و مال کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔
② مسلمانوں کے مذہبی امور میں عیسائی کوئی مداخلت نہیں کریں گے۔
③ کوئی عیسائی مسلمانوں کی مسجد میں نہیں گھسے گا۔
④ مساجد اور مسلم اوقاف دستور کے مطابق قائم رہیں گے۔
⑤ مسلمانوں کے تمام معاملات شریعت اسلامیہ کے مطابق مسلمان قاضی طے کریں گے۔
⑥ دونوں طرف کے قیدی رہا کر دیے جائیں گے۔
⑦ اگر کوئی مسلمان اندلس سے افریقہ جانا چاہے گا تو اسے سرکاری جہاز میں یا سرکاری اخراجات پر افریقہ پہنچا دیا جائے گا۔
⑧ جو عیسائی مسلمان ہو گئے ہوئے ہیں ان کو اسلام کے ترک کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔
⑨ اس جنگ میں جو مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا ہے وہ بدستور ان کے پاس رہے گا۔
⑩ موجودہ ٹیکس کے علاوہ اور کوئی نیا ٹیکس مسلمانوں پر نہیں لگایا جائے گا۔
⑪ تین سال تک مسلمانوں سے کسی قسم کا کوئی ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔ جو ٹیکس وہ اب ادا کر رہے ہیں وہ بھی تین سال تک انھیں معاف رہے گا۔
⑫ سلطان ابوعبداللہ محمد کے سپرد البشرات کی حکومت کر دی جائے گی۔
⑬ آج سے ساٹھ روز کے اندر قلعہ الحمراء، توپ خانہ اور دیگر سامان جنگ جو اس وقت قلعہ میں موجود ہے اس پر عیسائیوں کا قبضہ کرا دیا جائے گا۔
⑭ آج سے ساٹھ روز کے اندر اس معاہدے کی شرائط کی تکمیل پورے طور پر کر دی جائے گی۔
⑮ غرناطہ کا شہر ایک سال تک آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔ سال کے بعد عیسائی شرائط بالا کی پابندی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس پر قبضہ کریں گے۔

اس معاہدے پر یکم ربیع الاول سنہ ۸۹۷ھ/۳رجنوری سنہ ۱۴۹۳ء کو دستخط ہوئے تھے۔ معاہدے کا معاملہ فوج اور اہل شہر دونوں سے پوشیدہ رکھا گیا لیکن یہ معاملہ پوشیدہ نہ رہ سکا۔ اس معاہدے سے عام طور پر بددلی پھیل گئی اور جابجا آوازیں بلند ہونے لگیں کہ ابوعبداللہ نے مفت میں سلطنت گنوا دی۔ سلطان ان آوازوں کے اٹھنے سے بہت پریشان ہوا۔ اس کو عوام کی اتنی فکر نہ تھی جتنی اپنی جان کی تھی۔ معاہدے میں عوام کے بارے میں جس قدر بھی شرائط رکھی گئی تھیں وہ عوام کو دھوکا دینے کے لیے تھیں۔ فوج میں بھی ایک اچھا خاصا گروہ اس معاہدے کے خلاف تھا خصوصی طور پر سپہ سالار فوج۔ ابوعبداللہ نے اس مخالفت کو بھانپ کر اس خیال سے کہ شہر والوں اور فوج کی بغاوت، کہیں بنا بنایا کھیل نہ بگاڑ دے، ساٹھ روز پورے ہونے سے پہلے ہی ۱۲ربیع الاول سنہ ۸۹۷ھ کو قصر الحمرا عیسائیوں کے سپرد کر دیا۔

بعض تواریخ میں ہے کہ ۲رجنوری ۱۴۹۳ء/۴ربیع الاول ۸۹۷ھ بعد نماز فجر ابوعبداللہ نے اپنے اہل وعیال کو قصر الحمرا سے روانہ کر دیا اور خود پچاس رفقاء کے ساتھ تین بجے سہ پہر باب الجدود سے نکل کر فردی نند اور ازبیلا کے پاس گیا جو اپنے خدم وحشم کے ساتھ ابوعبداللہ کی حماقت اور ملت دشمنی پر نہایت خوش وخرم کھڑے تھے۔ ابوعبداللہ نے تعظیماً گھوڑے سے اترنا چاہا کیونکہ اب وہ غالب تھے اور یہ مغلوب، لیکن فردی نند نے منع کر دیا۔ صرف مصافحہ کر کے چابی لے لی اور ملکہ ازبیلا کو دے دی۔ ملکہ نے اپنے بیٹے کو دی اور اس نے سپہ سالار توطیلہ کے سپرد کر دی۔ ولی عہد ابوعبداللہ ان کے ہاں یرغمال تھا، اس کو رہا کر دیا گیا اور ابوعبداللہ اس کو ساتھ لے کر جبل البشرات پر چلا گیا، اور پھر سرزمین اندلس سے ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔

شہر میں داخل ہونے سے قبل فردی نند نے اندلس کے سب سے بڑے پادری مندورہ کو حکم دیا کہ وہ فوج کو ساتھ لے کر پہلے شہر میں داخل ہو اور قلعہ الحمرا کے سب سے اونچے اور بلند برج سے اسلامی نشان کو گرا کر صلیب نصب کر دے تاکہ اس نیک شگون کو دیکھتے ہی بادشاہ اپنی ملکہ ازبیلا کے ساتھ شہر میں داخل ہو۔ جب سلطان ابوعبداللہ نے پادری مندورہ کو قلعہ الحمرا میں آتے دیکھا تو وہ پچاس امراء کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر قلعہ سے باہر نکل آیا۔ اس وقت کی کیفیت کا تصور ہر شخص کر سکتا ہے کہ اہل شہر پر کیسی اداسی چھائی ہوئی ہوگی اور مسلمانوں کے دلوں پر کیا گزری ہوگی کہ جس ملک پر ہم نے آٹھ سو سال حکومت کی آج اس ملک کو ہم ان لوگوں کے سپرد کر رہے ہیں جو ہمارے نام سے بھی گھبراتے تھے۔ اس کے برعکس عیسائیوں کی خوشی کا حال بھی تحریر میں نہیں آ سکتا۔

عیسائی بادشاہ فردی نند اور اس کی ملکہ ازبیلا فوجی لباس میں اپنے لشکر کے ساتھ صلیب کے بلند ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ سب کی نظریں قصر الحمرا کے بلند برج کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ سامنے سے غدار ملت ابوعبداللہ نے فردی نند کے قریب آ کر شہر کی کنجیاں اس کے حوالے کیں اور کہا: ”اے طاقتور بادشاہ! اب ہم تیری رعایا ہیں۔ یہ شہر اور تمام ملک ہم تیرے سپرد کرتے ہیں کیونکہ اللہ کی یہی مرضی تھی۔ ہم کو یقین ہے کہ تو رعایا کے

ساتھ ہمیشہ شریفانہ اور فیاضانہ برتاؤ اور سلوک روا رکھے گا۔" فردی نند نے اس کے یہ جملے سن کر کچھ کہنا چاہا لیکن ابوعبداللہ اپنے بزدل اور غدار پچاس ساتھیوں کے ساتھ بلاتوقف جبل البشرات کی طرف آگے بڑھ گیا جہاں اس کا مال واسباب، اہل وعیال اور رشتہ دار پہلے ہی جا چکے تھے، اتنے میں چاندی کی صلیب قصر الحمرا کے بلند و بالا برج پر نمودار ہو کر آفتاب کی شعاعوں میں چمکنے لگی اور عیسائی بادشاہ اپنی ملکہ ازبیلا کے ساتھ فاتحانہ طور پر قصر الحمرا میں داخل ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جب ابوعبداللہ البشرات پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو بے ساختہ اس نے مڑ کر غرناطہ کی طرف دیکھا اور اپنے خاندان کی گذشتہ شان وعظمت پر آخری نظر ڈال کر بے ساختہ زار وقطار رونے لگا۔ اس کی ماں جو اس وقت اس کے ساتھ تھی اس نے زور سے اس کے منہ پر ایک تھپڑ مارا اور کہا:

"جب تو ایک سپاہی پیشہ مرد ہونے کے باوجود اپنے ملک کو نہ بچا سکا تو اب عورتوں کی طرح اس پر رونے سے کیا فائدہ؟"

عیسائیوں نے الحمرا پر قابض ہو کر معاہدے کی تمام شرائط کو گلدستہ طاق نسیان بنا دیا۔ ہلال کے غروب اور صلیب کے بلند ہونے کی خوشی میں پورے اندلس بلکہ تمام دنیائے مسیحی میں جشن ہائے مسرت منائے گئے۔ ایک لاکھ عربی کتب جلا کر عیسائیوں نے شہر میں چراغاں کیا۔ الحمرا پر قبضہ ہونے کے ساتھ غرناطہ پر بھی قبضہ ہو گیا۔ اب تمام جزیرہ نمائے اندلس پر عیسائی حکومت کا قبضہ تھا۔ ایک شہر بھی مسلمانوں کے پاس نہ تھا۔ ابوعبداللہ کو تھوڑے سے روپے دے کر البشرات بھی اس سے لے لیا گیا اور وہاں سے ابوعبداللہ نقل مکانی کر کے مراکش میں جا کر شاہ مراکش کا نوکر ہو گیا۔ وہاں وہ نہایت کس مپرسی کی حالت میں اپنی زندگی کے دن گزارنے لگا۔ افریقہ میں اس کا قیام فاس میں تھا۔ المقری نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

"جس دنوں میں فاس میں اپنی تاریخ لکھ رہا تھا یعنی ۱۰۳۷ھ میں ان دنوں ابوعبداللہ کے پس ماندگان کی گزراوقات خیرات پر تھی۔"

ایک عرصہ دراز تک ابوعبداللہ کسمپرسی کی حالت میں رہ کر سنہ ۱۰۴۴ھ میں فاس میں راہی ملک عدم ہو گیا۔
غرناطہ پر قبضہ کرنے کے بعد اس عیسائی حکمران نے اہل غرناطہ کو حکم دیا: "عیسائی بن جاؤ یا پھر شہر سے نکل جاؤ اور لوگوں کو زبردستی بپتسمہ دیا گیا۔ عورتوں کو مسجد میں بند کر کے بارود سے اڑا دیا گیا۔ لاکھوں مسلمان جلا دیے گئے۔ بہت سے ہجرت کر کے افریقہ چلے گئے۔

۲ر جنوری سنہ ۱۴۹۲ء اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کا آخری دن تھا۔ غرناطہ میں نصیری خاندان کی یہ حکومت ۱۲۴۶ء میں قائم ہوئی تھی۔ تیرھویں صدی سے لے کر پندرھویں صدی کے اواخر تک کا یہ تمام عرصہ کسی نہ کسی طرح اندلسی مسلمانوں کے لیے افراتفری اور ذہنی پریشانی کا دور تھا۔ اس دوران کئی چھوٹی چھوٹی خودمختار مسلم ریاستوں کا قیام عمل میں آیا اور ایسا خود ان کے باہمی تشتت وانتشار کا باعث ہوا۔ مسلمانوں کے بادشاہ

ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ہمیشہ آپس میں دست وگریبان رہے۔ یہی حکمران اپنی باہمی لڑائیوں اور جنگوں کے سلسلے میں مذموم مقاصد کے حصول کی خاطر ہمسایہ عیسائی ریاستوں سے بھاری تاوان کے عوض مدد طلب کیا کرتے تھے۔ انتہائی قابل افسوس بات یہ ہے کہ بات اسی تاوان کی ادائیگی پر ہی ختم نہ ہوتی تھی بلکہ یہ مسلمان حکمران اپنی ہمسایہ عیسائی ریاستوں کو سالانہ خراج بھی ادا کیا کرتے تھے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ صدیوں کی جمع شدہ دولت سے مسلمان حکمرانوں کے شاہی محل تو ہیرے جواہرات اور سونے چاندی سے بھرے ہوئے تھے، لیکن اپنی حکمرانی برقرار رکھنے کی خاطر تاوان اور خراج وغیرہ کی ادائیگی کا سارا بوجھ وہ اپنے عوام پر ڈال دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ ریاستیں روز بروز کمزور ہوتی گئیں اور یکے بعد دیگرے وہی نام نہاد امداد دینے والی عیسائی ریاستیں انھیں ایک ایک کر کے ہڑپ کرتی چلی گئیں۔ غرناطہ کی ریاست بھی اس پورے منظر نامے کا ایک حصہ تھی۔ اگرچہ اڑھائی سو سال تک جیسے تیسے کر کے غرناطہ کی ریاست نے اپنی خود مختاری قائم رکھی، لیکن اس کے کوتاہ اندیش اور عقل وخرد سے کورے حکمران یہ حقیقت یک قلم فراموش کر چکے تھے کہ بیگانی بیساکھیوں کے سہارے زیادہ دیر تک جینا ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس عہد کے اواخر میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی وجہ سے آخری سسکیاں لیتی ہوئی یہ ریاست بالآخر دم توڑ گئی۔ غرناطہ کی یہی مسلم ریاست اپنا وجود برقرار رکھنے کی خاطر ہمسایہ قشتالہ نامی کیتھولک ریاست کو سالانہ خراج ادا کیا کرتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس خراج کی مقدار میں بھی اضافہ ہوتا رہا، نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ ریاست کے لیے اس بھاری رقم کی ادائیگی محال ہوگئی۔ اس صورت حال سے تنگ آ کر ابوعبداللہ کے والد ابوالحسن نے نہ صرف رقم کی ادائیگی سے صاف انکار کر دیا بلکہ ۱۲۸۱ء میں قشتالہ کے زہرہ نامی شہر پر چڑھائی بھی کر دی۔ فوجی نقطہ نگاہ سے غیر مناسب منصوبہ بندی کی بنا پر یہ حملہ ایک فاش غلطی تھی۔ اس حملے کے جواب میں ڈیوک آف کاویز نے ۱۲۸۲ء میں غرناطہ کے آس پاس کے بہت سے علاقوں پر مختصر عرصے میں قبضہ کر لیا۔ انھی مفتوحہ علاقوں میں سے ایک الحمہ کا قلعہ بھی تھا۔ یہ قلعہ غرناطہ کے بہت قریب ہونے کے علاوہ ملاغہ شہر کے راستے پر واقع ہے۔ یہ غرناطہ کے بعد اس آخری اندلسی ریاست کا دوسرا بڑا شہر اور واحد بندرگاہ تھی۔ الحمہ دراصل وہ قلعہ نما قصبہ تھا جس کی فتح کا خواب عیسائی حکمران بڑے عرصے سے دیکھ رہے۔ اس قلعے پر قبضے کی وجہ سے غرناطہ کی ریاست کو دو ناقابل تلافی نقصان پہنچے۔ پہلا یہ کہ ریاست غرناطہ کا رقبہ سکڑ کر صرف غرناطہ شہر تک محدود ہو گیا۔ دوسرا یہ کہ چاروں طرف سے دشمنوں میں گھر جانے کے باعث بیرونی دنیا سے اس کا رابطہ قریباً منقطع ہو گیا۔

ابوالحسن کی اس فاش غلطی کے باعث حریف نے اپنی سابقہ روایت کے مطابق اس کی اینٹ سے اینٹ بجائے کے بجائے جلد از جلد یہاں مزید فوجیں بھیج کر اپنے قبضے کو مستحکم کیا۔ اس طرح وہ غرناطہ شہر کو فتح کرنے کی تمام تیاری مکمل کر چکے تھے۔ اس مہم جوئی کی قیادت کے پیش نظر شاہ فردی نند اور ملکہ ازابیلا نے شہر کا محاصرہ کر کے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اسی دوران دوسری طرف الحمرا کے محل کی اندرونی حالت یہ تھی

کہ دربار پوری طرح سازشوں میں گھرا ہوا تھا۔ سوائے موسیٰ غسانی اور اس کے چند ساتھیوں کے کوئی بھی اسلامی حکومت کا خیر خواہ نہ تھا۔ بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار ہند کے درباریوں اور وزراء کی طرح اکثر و بیشتر فردی نند سے ملے ہوئے تھے۔ انھی حالات میں پانچ مختلف نوعیت کے واقعات ایسے ہوئے کہ انھوں نے اس دم توڑتی ہوئی ریاست کو بالآخر موت کی نیند سلا دیا۔

ان پانچ واقعات میں سے پہلا واقعہ یہ تھا کہ ابوالحسن اس وقت بڑھاپے کی منزلوں میں سے گزر رہا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے اور دونوں ہی ولی عہدی کے حصول کی خاطر باہم دست و گریبان تھے۔ ان دو بیٹوں میں سے ایک کا نام ابوعبداللہ محمد تھا جو اس کی مسلمان بیوی فاطمہ سے تھا جب کہ دوسرا بیٹا اس کی زریا نامی عیسائی بیوی سے تھا۔ زریا ابوالحسن کے دل و دماغ پر پوری طرح چھائی ہوئی تھی۔ اس نے ابوالحسن پر اپنا جادو چلانے کے لیے یہ کہا کہ اسے الہام ہوا ہے کہ اگر اس کا بیٹا ولی عہد مقرر نہ کیا گیا تو یہ سلطنت غرناطہ ختم ہو جائے گی، لیکن عوام کی اکثریت کی سوچ اس کے بالکل برعکس تھی۔ ایک روز ایسا ہوا کہ ابوالحسن سلطنت کے دفاع کی خاطر شہر سے باہر تھا تو ابوعبداللہ نے باپ کے خلاف بغاوت کر کے اپنے آپ کے غرناطہ کا خود مختار سلطان ہونے کا اعلان کر دیا۔ دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ ابوعبداللہ نے سلطان بنتے ہی ریاست کے جرنیل کی بیٹی سے شادی کر کے شاہانہ زندگی گزارنا شروع کر دی۔ اس کو اس طرح زندگی گزارتے دیکھ کر عوام اسے عیاش اور بزدل سمجھنے لگے۔ ابوعبداللہ نے اپنی دلیری، بہادری اور جرنیلی صفات ثابت کرنے کی خاطر قریب کے ایک عیسائی شہر ''لیوسینا'' پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اس کی ایک فاش غلطی تھی۔ چنانچہ اس مہم میں اسے سخت ناکامی ہوئی بلکہ وہ گرفتار بھی ہو گیا۔ تیسرا واقعہ یہ ہوا کہ ابوعبداللہ کے قید ہونے کے باعث ابوالحسن ایک بار پھر بادشاہ بن گیا لیکن حکومت پر اس کی گرفت انتہائی کمزور تھی۔ بیٹے کی بغاوت کے باعث اور اپنے بڑھاپے کی وجہ سے اس نے زمام حکومت اپنے چھوٹے بھائی الزغل کو دے دی۔

چوتھا واقعہ یہ کہ فردی نند اور ازبیلہ نے غرناطہ کے اس داخلی عدم استحکام کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ''مزید پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی اختیار کی۔

پانچواں واقعہ سنہ ۱۴۹۰ء کے آخر میں اس وقت پیش آیا جب عیسائی حکمران غرناطہ شہر کی دیواروں تک آن پہنچے اور ابوعبداللہ سے کہا کہ اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے شہر ان کے حوالے کر دو۔ غرناطہ کے عوام نے ایسے کسی معاہدہ کو نہ مانتے ہوئے بغاوت کے جذبات ظاہر کر دیے۔ جس کے نتیجے میں عیسائی لشکر نے شہر کا محاصرہ کر لیا جو آٹھ ماہ تک جاری رہا۔ اس محاصرے کو انھوں نے مقدس مذہبی محاصرے کا نام دیتے ہوئے غرناطہ کے شہریوں کا سامان رسد مکمل طور پر بند کر دیا۔ طویل عرصے تک یہ صورت حال جاری رہنے کے باعث لوگ بھوکے مرنے لگے تو امن مذاکرات کا دور شروع ہوا۔ ان مذاکرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ فاتح اپنی مفتوح آبادی کا قتل عام نہیں کرے گا اور انھیں پرامن طریق سے شہر سے نکل جانے کی اجازت ہو گی۔ اسی دوران ابوعبداللہ ہتھیار

ڈالتے ہوئے شہر اور قصر الحمرا کی کنجیاں فاتح حکمرانوں کے حوالے کر دے گا۔ یہ ساری کارروائی ۲ر جنوری ۱۴۹۲ء کو ہونا قرار پائی۔ ابوعبداللہ جب پچاس امراء اور شرفاء کے ہمراہ محل کی کنجیاں شاہ فردی نند اور ملکہ ازبیلہ کو دینے کے لیے محل سے باہر آیا تو یہ بڑا ہی دردناک اور رقت آمیز منظر تھا۔ لکھا ہے کہ اس دوران اس کی ماں فاطمہ نے ایک نظر الحمرا پر ڈالی اور ابوعبداللہ سے کہنے لگی کہ دیکھو، یہ وہ جگہ ہے جسے تم چھوڑ کر جا رہے ہو۔ یہاں تمھارے آباء و اجداد بادشاہوں کی حیثیت سے فوت ہوئے اور تم اس کو آج ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہے ہو۔ ابوعبداللہ یہ سارا منظر دیکھ کر زار و قطار رونے لگا تو اس کی ماں نے اس کو بڑا ہی تاریخی نوعیت کا جواب دیا کہ ''اگر تم مردوں کی طرح اپنی سلطنت کی حفاظت نہیں کر سکے تو پھر اب عورتوں کی طرح آنسو بہانے سے کیا فائدہ؟''

بلاشبہ کسی بھی بادشاہ یا جرنیل کے لیے ہتھیار ڈالنا بڑا ہی ذلت آمیز عمل ہوتا ہے۔ یہی صورت حال ابو عبداللہ کے ساتھ بھی تھا۔ محل سے باہر نکلنے پر اسے خوراک اور سواری کے چند جانوروں کے علاوہ اور کسی چیز کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ الحمرا کے اندر صدیوں کی جمع شدہ دولت عیسائیوں کے ہاتھ آئی۔ ابوعبداللہ فاتح کیتھولک جوڑے فردی نند اور ازبیلہ کو دیکھتے ہی اپنے گھوڑے سے نیچے اترنے لگا لیکن فردی نند نے نہ اترنے دیا اور گھوڑے پر ہی سے عبداللہ اسے کنجیاں دے کر کہنے لگا: ''یہ آپ کے الحمرا کی کنجیاں ہیں جو میں نہایت عاجزی سے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔'' ابوعبداللہ یہ کہہ کر جھکا تاکہ فردی نند کا ہاتھ چوم سکے تاہم فردی نند نے اسے حقارت سے پیچھے ہٹا دیا۔ اس کے بعد ابوعبداللہ مراکش چلا گیا جہاں سنہ ۱۵۲۷ء کو اس کا فاس کے مقام پر انتقال ہو گیا۔ افسوس کہ اس مسلمان بادشاہ نے اپنے چچا کے ساتھ جس طرح میر جعفر اور میر صادق جیسا سلوک کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے بھی اس کے اس عمل بد کا اسے خوب سبق سکھایا۔ کاش ایسا ہوتا کہ ابو عبداللہ اپنے جرنیل موسیٰ غسانی کے قول کے مطابق اندلس کا سلطان فتح علی ٹیپو ہوتا تو آج تاریخ میں اس کا نام سنہری حروف میں لکھا جاتا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ابوعبداللہ کے الحمرا سے نکلنے کے بعد شاہ فردی نند اور ملکہ ازبیلہ محل میں داخل ہوئے تو وہاں جمع شدہ ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کی کثرت دیکھ کر ان کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ انھیں یہ اندازہ تو تھا کہ قصر الحمرا میں سابقہ مسلمان حکمرانوں کی صدیوں کی جمع شدہ دولت بہت زیادہ ہو گی تاہم اب جتنی دولت ان کے ہاتھ آئی تھی یہ تو ان کے تصور میں بھی کبھی نہیں آئی تھی۔ کاش یہ مسلمان حکمران اپنی یہ دولت محل میں جمع کرنے کے بجائے اسے عوام کی فلاح و بہبود اور فوجی استحکام اور اسلحہ کی فراہمی پر خرچ کرتے تو انھیں یہ روز بد دیکھنے کی نوبت نہ آتی۔

یہاں یہ بات بھی خاص طور پر ذہن میں رکھنے والی ہے کہ سیکڑوں سال کے شاندار دور کے اختتام اور نئے دور کے آغاز سے عوام کی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوئے، اسے مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ''ان دو ادوار کے ملاپ پر اندلس ایک بار پھر مسلمان سے عیسائی ہو کر اپنے سابقہ آٹھ صدیوں والے مقام پر آ کھڑا

ہوا اور اسی اثنا میں اندلسی عہد کی ساری خوش حالی اور فراوانی ایک قصۂ پارینہ بن گئی۔ بعد کے عیسائی عہد میں مسلمان تو کیا عیسائی اور یہودی عوام پر بھی ظلم وستم کے جو پہاڑ توڑے گئے اور اس کے اثرات صدیوں تک محسوس کیے جاتے رہے۔

اندلس میں مسلمانوں پر مظالم:

اندلس میں مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی لیکن تاریخ کا کوئی رپورٹر یہ نہیں بتاتا کہ کبھی انھوں نے عیسائیوں پر ظلم وستم کیا ہو لیکن ابوعبداللہ سے غرناطہ کا قبضہ لیتے ہی عیسائیوں نے مسلمانوں پر ظلم وستم اور جبر واستبداد کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیے اور مسلمانوں پر ظلم اور سفاکی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ عیسائیوں نے تمام اندلس میں فوراً اپنی مذہبی عدالتیں قائم کر دیں جن میں ہر روز ہزارہا مسلمان گرفتار کر کے لائے جاتے اور محض اس جرم میں کہ ان کا مذہب اسلام ہے، بعض جھوٹے الزام لگا کر آگ میں جلا دیے جاتے تھے۔ تاہم مسلمان اپنے مذہب پر قائم اور اندلس میں موجود پائے جاتے تھے۔ سنہ ۹۰۴ھ میں ایک عام حکم جاری کیا گیا کہ ہر ایک شخص جو مسلمان ہے وہ دین عیسوی قبول کر لے ورنہ اس کو جہاں کہیں پایا جائے گا قتل کر دیا جائے گا۔ مسلمانوں نے اس اعلان پر اپنا دین بچانے کے لیے شہروں اور دیہاتوں کو چھوڑ کر پہاڑوں میں پناہ لی اور ہر قسم کی اذیت اور سختی برداشت کی لیکن دین کو چھوڑنا پسند نہ کیا۔ بعض مسلمانوں کو عیسائیوں نے زبردستی بپتسمہ دیا اور ان کے بچوں کو عیسائی بنایا۔ یہ وہ لوگ تھے جو عربی النسل یا بربری نہ تھے بلکہ ان کے آباء واجداد اسی ملک کے قدیم باشندے تھے اور اپنا عیسوی مذہب چھوڑ کر اپنی خوشی سے مسلمان ہوئے تھے۔ ان نو مسلم خاندانوں میں سے بھی کسی نے اسلام کو چھوڑنا گوارا نہ کیا اور وہ چھپ چھپ کر اپنے گھروں میں نمازیں پڑھتے رہے تھے۔ بعض مسلمانوں پر عیسائیوں نے بظاہر یہ سب سے بڑی مہربانی کی کہ ان کو افریقہ چلے جانے کی اجازت دی۔ ان لوگوں نے ان کو جہاز بھی فراہم کر دیے۔ انھوں نے اپنی بیوی بچوں کے ساتھ جو سب سے زیادہ قیمتی سامان جہازوں میں لادا تھا، وہ نایاب اور قیمتی کتابوں کے ذخائر تھے، لیکن عیسائیوں نے ان جہازوں کو ساحل افریقہ پر پہنچنے سے پہلے ہی سمندر میں غرق کر دیا۔ اس طرح نہ صرف ذی علم مسلمانوں کو بلکہ نایاب کتب کو بھی سمندر کی تہ میں پہنچا کر اپنی شرافت وتہذیب اور علم پروری کا نہایت عجیب وغریب ثبوت بہم پہنچایا۔ بعض کتابوں میں ہے کہ یہ یکم اپریل کی تاریخ تھی اور اسی کی یاد میں "فرسٹ اپریل فول" منایا جاتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس رسم بد میں مسلمان بھی عیسائیوں کا ساتھ دے کر یہ دن مناتے ہیں۔

مختصر یہ کہ مسلمانوں کو جس طرح چن چن کر اندلس میں قتل و برباد کیا گیا اس کی مثال دنیا کے کسی ملک اور قوم میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔

سنہ ۹۳۱ھ/۱۵۲۴ء میں اندلس کے شاہی دربار میں ان مظالم کی شکایت کی گئی تو ان کا معاملہ محکمہ تفتیش مذہبی

کے سپرد کر دیا گیا۔ اس محکمے کے فیصلے کے مطابق ہزاروں مسلمان نذر آتش کر دیے گئے۔ پھر اس محکمے کی پریزیڈنٹ لارڈ بشپ نے یہ تجویز دی کہ مسلمان مذہبی مراسم ادا نہیں کر سکتے، نہ اپنا لباس پہن سکتے ہیں، نہ عربی بول سکتے ہیں اور نہ غسل کر سکتے ہیں، ان کے لیے مغربی رقص میں شریک ہونا لازمی ہے۔ عورتیں برقعہ استعمال نہیں کر سکتیں۔

موسیو لیبان ''تمدن عرب'' میں لکھتا ہے:

''اندلس کے غریب مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں مل سکتی حالانکہ یہی وہ مسلمان تھے جنھوں نے اپنے عہدِ اقتدار اور حکومت کے زمانے میں عیسائیوں پر کبھی اس قسم کے مظالم نہیں کیے تھے۔ اگر وہ ایسا کرنے پر آ جاتے تو آج پورا جزیرہ نمائے اسپین عیسائیوں کے نام ونشان اور ان کے وجود سے یک قلم خالی ہوتا۔'' (تمدن عرب: ص ۱۱۵)

پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں اندلس کے لارڈ بشپ مینڈ ڈرا کے مرنے کے بعد فرانسسکو شمینس اس عہدے پر مقرر ہوا۔ یہ نہایت بدکار شخص تھا۔ تمام نصرانی عمائدین شہر کے گھروں کی لڑکیاں اس کے اردگرد رہتیں، مگر یہ مسلمانوں کا جانی دشمن تھا۔ یہ ایک طرف مسجدوں کو گرجا گھروں میں تبدیل کرواتا تو دوسری طرف مسلمانوں کو ذرا ذرا سی بات پر موت کے گھاٹ اتارتا تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے علمی ذخائر کو تباہ وبرباد کرنا شروع کیا۔ دس لاکھ کتابیں اندلس میں تھیں جو جگہ جگہ جلائی گئیں۔ علوم وفنون کے یہ بے بہا خزانے باب الرملہ کے چوک میں ڈھیر کیے گئے اور ان کو آگ لگا کر راکھ کر دیا گیا۔ مسٹر اسکاٹ اس واقعہ کو یوں نقل کرتا ہے:

''اس وحشیانہ مذہبی جوش سے جو نقصان دنیا کو پہنچا اس کا ادنیٰ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ غالباً دنیا بھر میں ایسا قیمتی ذخیرۂ علوم وفنون اور کہیں نہ ہوگا جس کو شمینس نے اس تاریخی چوک میں خاک سیاہ کر دیا۔'' (اخبار الاندلس: ۳/۲۷۵)

مختصر یہ کہ چند سال کے عرصے میں اللہ وحدہ لاشریک لہ کا نام لینے والا سرزمین اندلس میں کوئی شخص باقی نہ رہا۔ عیسائیوں نے سب ہی کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا، یا سمندر میں ڈبو دیا، یا پھر آگ میں جلا کر راکھ کر دیا۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ سلطنت غرناطہ کے سقوط اور اس کی بربادی اور غرناطہ میں فرڈی نند کی حکومت کے قائم ہو جانے کے بعد بھی جزیرہ نمائے اندلس میں عرصۂ دراز تک مختلف شہروں، قصبوں، دیہاتوں اور پہاڑوں میں جابجا مسلمان پائے جاتے رہے اور ان کی گرفتاری اور قتل کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ کبھی دس بیس مسلمان اکٹھے ہوئے تو انھوں نے حکومتی فوج کا مقابلہ بھی کیا اور لڑ کر شہید ہو گئے۔ بعض اندلس کے شمالی پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے اور وہاں بے سروسامانی کے عالم میں موت کے منہ میں چلے گئے۔ ان میں سے بعض بچ کر ملک شام چلے گئے۔ یہاں مرنے والوں کے بچوں کو عیسائیوں نے اپنے قبضے میں لے کر عیسائی بنا لیا۔ اس طرح فرانس کے جنوبی اور اندلس کے شمالی علاقوں میں عربی النسل خاندانوں کے وجود کا امکان مؤرخین نے تسلیم کیا ہے، اور اسی لیے نپولین بونا پارٹ کو بعض لوگوں نے عربی النسل بیان کیا ہے۔

اندلس کی اسلامی حکومت پر ایک نظر:

خیر القرون کے عرب حکمرانوں کی طرح اندلس میں بھی عربوں کی حکومت اگر چہ بظاہر شخصی نظر آتی تھی لیکن اس میں شوریٰ کا رنگ بہت زیادہ شامل تھا۔ خلیفہ کا حکم اور شریعت کا قانون ہر انسان پر یکساں لاگو ہوتا تھا۔ ان حکمرانوں میں نہ تو موروثی جاگیردار تھے اور نہ موروثی امراء۔ عبدالرحمٰن ثانی اپنے وقت کا ایک بہت بڑا بادشاہ تھا لیکن ایک عیسائی نے اس کے خلاف قاضی کے ہاں دعویٰ دائر کر دیا اور اس عظیم الشان بادشاہ کو قاضی کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔ اس نے آج کل کے بادشاہوں کی طرح قاضی یا قاضی القضاۃ کو معزول نہیں کر دیا کہ تمھیں کیسے جرأت ہوئی کہ تو مجھے اپنی عدالت میں بلائے۔ چنانچہ سلطان نے قاضی کے حکم کی اسی طرح تعمیل کی جس طرح ایک غلام تعمیل کرتا ہے۔ قاضی شریعت کے قانون کے مطابق بادشاہ کو سزا دینے کی قدرت رکھتا تھا۔ کوتوالی (Police) کا انتظام نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا۔ ہر بازار میں ایک محتسب ہوتا تھا جو تجارت پیشہ لوگوں کے کاروبار کی نگرانی کرتا تھا۔ ہر شہر اور قصبے میں ہسپتال اور دواخانے تھے۔ سڑکیں اور نہریں مسلمانوں نے جال کی طرح بچھا دی تھیں۔ خلیفہ ہشام نے دریائے وادیٔ الکبیر کا نہایت شاندار اور خوب صورت پل بنایا۔ اسی طرح جگہ جگہ دریاؤں کے پل بن گئے تھے۔ فنون جنگ اور آئین فوج کشی میں عام طور پر مسلمان ساری دنیا سے زیادہ شائستہ، مہذب اور متمدن تھے۔ اندلس کے مسلمانوں نے قلعہ شکنی کے آلات ایجاد کیے۔ یورپ کے وحشیوں نے جو ہمیشہ فتح مند ہونے پر شہر اور بستیوں کو جلا کر خاک کر دیا کرتے تھے، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں تک کو تہ تیغ کر دیا۔ اپنے طرز عمل سے مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک انھیں شائستگی کی تعلیم دی کہ فتح حاصل کرنے کے بعد بے گناہ رعایا کو کسی قسم کا آزار نہیں پہنچانا چاہیے۔ لیکن آٹھ سو سال میں بھی یورپ کے عیسائیوں میں شائستگی نہ آئی اور آٹھ سو سال کے بعد جب انھوں نے اندلس پر قبضہ کیا تو جس شہر کو بھی وہ فتح کرتے وہاں درندگی کا عفریت ناچنے لگتا اور لوگوں کا قتل عام اس طرح کیا جاتا جیسے فصل کاٹی جاتی ہے اور کھیتوں اور باغات کو تباہ و برباد کر دیا جاتا۔ یورپی تہذیب دراصل رومی تہذیب کا تتمہ ہے۔ رومی علمی پستی کی پیداوار تھے جب کہ یونانی علم و تہذیب کا سرچشمہ تھے۔ رومیوں کی اس علمی پستی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ یہ ہر شعبۂ علم میں یونانیوں سے مرعوب رہے۔ رومی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رومی اپنے مذہب و عقائد میں راسخ الایمان نہ تھے اور درحقیقت وہ اس بارے میں معذور بھی تھے اس لیے جو مشرکانہ اور وہم پرستانہ مذہب روم میں رائج تھا اس کا مقتضاء یہ تھا کہ رومی علم میں جس قدر ترقی کرتے جائیں اور ان کے دماغ منور و روشن ہو جائیں اتنی ہی اس مذہب کی بے توقیری اور اس کی عظمت میں کمی واقع ہو جائے۔ اور یہ تو گویا انھوں نے پہلے ہی دن سے یہ طے کر لیا تھا کہ دیوتاؤں کا سیاست اور امور دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ رومیوں کا ایک بہت بڑا امتیاز اور خصوصیت ان کی شاہنشاہیت پسندی اور استعماری روح اور زندگی کا خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نگاہ تھا۔ یہی وہ

ترکہ ہے جو یورپ کو اپنے رومی مورثوں سے ملا۔ جیسا کہ علامہ اسد (جرمن) نے اپنی مشہور کتاب (Islam at The Cross Roads) کے صفحہ ۳۸۔۳۹ پر لکھا ہے۔ ایک بہت بڑا انقلاب انگیز واقعہ جس کی اہمیت کو کوئی مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا، وہ عیسائیت کا بت پرست روما کے تخت سلطنت پر فائز ہو جانا ہے۔ یہ واقعہ سنہ ۳۰۵ء میں پیش آیا جب شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت کو قبول کیا۔ اس سے مسیحیت نے قدیم بت پرستی پر فتح پائی اور دفعتاً اس کو ایسی وسیع سلطنت اور غیر محدود اختیار و اقتدار حاصل ہو گیا جس کا وہ خواب نہیں دیکھ سکتی تھی۔ چونکہ قسطنطین کو عیسائیوں کی سرفروشی، فداکاری اور زبردست قربانیوں کے تحت تخت ہاتھ آیا تھا اس لیے اس نے عیسائیوں کو اس کا پورا صلہ دیا اور انھیں کاروبار حکومت میں پورے طور پر شریک کیا۔

یہ واقعہ بلکہ سانحہ حقیقت میں مذہب عیسوی کے لیے ایک بہت بڑا نامبارک واقعہ تھا۔ اس نے ایک عظیم الشان سلطنت تو حاصل کر لی لیکن بہت بڑی قیمتی مذہبی متاع کھو دی۔ عیسائی میدان جنگ میں تو فتح یاب ہوئے لیکن مذاہب و ادیان کے معرکے میں انھوں نے زبردست شکست کھائی۔ رومی بت پرستوں اور عیسائیوں نے سیدنا مسیح علیہ السلام کے دین کو مسخ کر کے رکھ دیا، اس میں سب سے بڑا ہاتھ خود مسیحیت کے محافظ ناموس اور علم بردار اعظم قسطنطین کا ہے۔ چنانچہ مشہور مغربی دانشور ڈریپر لکھتا ہے:

''فاتح اور کامیاب جماعت کے ساتھ جو کوئی شریک ہوا اسے بڑے بڑے عہدے اور مرتبے ملنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا دار لوگ جنھیں مذہب کی ذرہ برابر بھی پروا نہ تھی، مسیحیت کے سب سے زیادہ جوشیلے حامی ہو گئے۔ چونکہ وہ بظاہر عیسائی لیکن بباطن مشرک اور بت پرست تھے، لہٰذا ان کے اثر کی وجہ سے عیسائیت میں بت پرستی اور شرکیہ عناصر کی آمیزش شروع ہو گئی۔ قسطنطین کی ساری عمر سیاہ کاریوں میں گزری اور کہیں آخری وقت (۳۳۷ء) میں جا کر اس نے ان مذہبی مراسم کی پابندی کی جن پر عمل کرنے کی کلیسا ہدایت کرتا ہے۔'' (معرکۂ مذہب و سائنس: ص ۵۳۔۵۴)

چند صفحات کے بعد ڈریپر لکھتا ہے:

''اس شہنشاہ کو جو محض دنیا کا بندہ تھا اور جس کے مذہبی اعتقاد خس سے بھی کم وقعت رکھتے تھے، اپنا ذاتی فائدہ، سلطنت کی بہبودی اور دونوں مخالف جماعتوں یعنی عیسائیوں اور بت پرستوں کی بھلائی اس میں نظر آئی کہ جہاں تک ہو سکے ان میں یگانگت اور ارتباط پیدا کیا جائے۔ اور تو اور راسخ الاعتقاد عیسائیوں تک کو اس حکمت عملی سے چنداں اختلاف نہ تھا۔ اس لیے کہ شاید یہ سمجھتے تھے کہ نئی تعلیم کی شاخ میں اگر پرانے عقائد کا پیوند لگا دیا گیا تو جدید مذہب کی بہت جلد ترقی ہو جائے گی اور آخر کار نجاستوں کی آمیزش سے پاک ہو کر سچا مذہب باقی رہ جائے گا۔'' (معرکۂ مذہب و سائنس: ص ۶۳)

قسطنطین کی وجہ سے یہ رومی عیسائیت کا جو مغلوبہ وجود میں آیا، اس نے بیکار فطرت کو تبدیل اور فنا کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ایک ایسا مذہبی نظام پیش کیا جس کی فطرت متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس نے انسان کی طاقت

سے زیادہ انسان پر بوجھ ڈالا۔ روما کی سابقہ انتہائی مادیت کے خلاف ایک ردعمل کے طور پر لوگوں نے طوعاً وکرہاً اس کو برداشت کیا لیکن پھر جلد ہی اس سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور دبی ہوئی مظلوم فطرت نے سخت انتقام لیا۔ اپنی اس غالی رہبانیت، فطرت کے حقائق سے چشم پوشی اور ناعاقبت اندیشی سے مسیحیت لوگوں کے اخلاق و عادات اور ہلاکت کے غار میں گرتے ہوئے تمدن کا ہاتھ نہ پکڑ سکی۔ حالت یہ تھی کہ عیسائی ممالک میں بیک وقت معصیت و آزادی اور زہد و رہبانیت کی دو متقابل تحریکیں دوش بدوش چل رہی تھیں بلکہ شاید زیادہ صحیح یہ ہو گا کہ رہبانیت تو صحراؤں میں گوشہ نشین تھی اور شہری زندگی پر اس کا کوئی اقتدار نہ تھا اور اس کے برعکس فسق و فجور کی تحریک شہروں کے اندر پورے جوش اور تلاطم پر تھی۔ لیکی نے مسیحی دنیا کے اخلاقی انحطاط کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

''اخلاق میں رکاکت و پستی حد درجہ سرایت کر گئی تھی۔ دربار کی عیش پرستیاں، ارکان دربار کی غلام طینتی اور ملبوسات اور زیورات کی تزئین و آرائش اپنے شباب پر تھی۔ دنیا اس وقت انتہائی رہبانیت اور انتہائی بدکاری کے تھپیڑوں کے درمیان ہچکولے کھا رہی تھی، بلکہ بعض شہر جن میں سب سے زیادہ کثیر التعداد زہاد اور راہبین پیدا ہوئے تھے، وہ وہی تھے جن میں عیش پرستی اور بدچلنی کی سب سے زیادہ گرم بازاری تھی۔ غرض بدکاری اور توہم پرستی کا ایسا اجتماع ہو گیا تھا جو انسان کی شرافت و عظمت کا قطعی دشمن ہے۔ رائے جمہور اس قدر کمزور و مضمحل ہو گئی تھی کہ لوگوں کو بدنامی اور رسوائی کا مطلق خوف باقی نہیں رہا تھا۔ البتہ ضمیر کو مذہب کا دھڑکا ہو سکتا تھا، لیکن اسے بھی اس اعتقاد نے مٹا دیا تھا کہ دعاؤں وغیرہ کے ذریعے سے تمام گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔ مکاری، دغابازی، دروغ گوئی کی وہ گرم بازاری تھی جو قیاصرہ کے زمانوں میں بھی نہ تھی۔ البتہ ظلم و تشدد، شقاوت، بے حیائی اتنی نہ تھی، لیکن اس کے ساتھ حریت فکر، آزاد خیالی اور جوش قومیت میں بھی کمی تھی۔''

(تاریخ اخلاق یورپ، لیکی: ۱۰۴/۲)

یہ ایک معمولی سی جھلک یورپ کی اس زمانے کی ناشائستگی کی ہے جس کو مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومتی تعلیم شائستگی میں تبدیل نہ کر سکی۔ چنانچہ اندلس اور دوسرے ممالک بھی جہاں بھی وہ کوئی شہر فتح کرتے تو اس کے بے گناہ عوام کو وہ تہ تیغ کرنے سے کوئی دریغ نہ کرتے تھے، اور مسلمانوں کے ساتھ تو انھیں خصوصی بیر تھا۔

زراعت کو مسلمانوں نے اندلس میں اس قدر ترقی دی تھی کہ یہ ایک مکمل فن بن گیا تھا۔ ہر میوہ دار اور پھل دار درخت اور زمین کی خاصیت و ماہیت سے آشنائی حاصل کی اور اندلس کے ہزاروں لاکھوں مربع میل رقبوں کو جو مدتوں سے بنجر اور ویران پڑے ہوئے تھے مسلمانوں نے پھل دار اور میوہ دار درختوں اور سرسبز و شاداب لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں تبدیل کر دیا۔ چاول، گنا، روئی، زعفران، انار، آڑو، شفتالو وغیرہ جو آج کل اندلس میں کثرت سے پیدا ہوتے ہیں، مسلمانوں ہی کے طفیل اندلس بلکہ تمام یورپ کو نصیب ہوئے۔ اندلوسیہ

اور اشبیلیہ کے صوبوں میں زیتون اور خرما کی کاشت کو بڑی ترقی دی۔ سرلیش، غرناطہ اور مالقہ کے علاقوں میں انگوروں کی بکثرت پیداوار ہوتی تھی۔ (تفصیل آگے آرہی ہے)

زراعت کے ساتھ ساتھ اندلس کی اسلامی حکومتوں نے معدنیات کی تلاش میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ سونا، چاندی، لوہا، فولاد، پارہ، کہربا، تانبا، یاقوت اور نیلم وغیرہ کی کانیں دریافت کیں اور یہ معدنیات کثرت سے نکلنے لگیں۔ غرناطہ کی سلطنت اندلس میں مسلمانوں کی آخری نشانی تھی لیکن اس چھوٹی سی سلطنت نے بھی فن تعمیر اور قدر دانی علوم کے بارے میں بڑی بڑی عظیم الشان یادگاریں چھوڑیں۔ مسلمانوں نے ایسا عجیب وغریب سیمنٹ ایجاد کیا کہ قصر الحمرا جو سلطنت غرناطہ کی نشانی دنیا میں باقی ہے، آج تک اپنے مصالہ کی عمدگی اور پختگی سے سیاحوں کو حیران کر دیتا ہے اور ان سے خراج تحسین بھی وصول کرتا ہے۔ قصر الحمرا کو شاہان غرناطہ نے زر کثیر صرف کر کے شہر کے قریب ایک نہایت بلند ٹیلے پر جبل شلیر کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کے سایہ میں تعمیر کیا تھا۔ اس کی چار دیواری کے اندر ایسے خوش نما سرسبز و شاداب باغات لگائے جن میں نہرہائے شیریں اور درخت ہائے میوہ دار تھے کہ چشم فلک نے اس کی نظیر نہ دیکھی تھی۔ اس قصر کی ہر ایک چیز قابل دید اور اس قدر حیرت زا اور حیرت انگیز ہے کہ دنیا کے مشہور صناع اور دست کار دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ اس کی بلند دیواروں پر استعمال شدہ کی صفائی سنگ مرمر سے زیادہ چمک دار اور لوہے سے زیادہ مضبوط ہے۔ جالی دار دیواروں کی طرح طرح کی نازک گل کاریاں اور اس کی نئی وضع کی محرابیں اور ان پر کی گئی مرصع کاریاں ایک عجوبہ ہونے کے علاوہ یونیسکو کے انسانی ورثے کی فہرست میں اولین مقام رکھتی ہیں۔ اس کی نام کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ تعمیر کے وقت شاہی دربار کی دیواروں میں سرخ رنگ کا پتھر کثرت سے استعمال کیا گیا تھا۔ اور عربی میں سرخ رنگ کو احمر کہتے ہیں اس بنا پر اس کا نام ''الحمرا'' پڑ گیا۔ اس کی دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس خاندان کا بانی جس نے یہ قصر تعمیر کیا تھا ''ابن الاحمر'' کے نام سے مشہور تھا اور اسی نے ۱۲۳۸ء میں الحمرا کی تعمیر شروع کی۔ بہرحال اس کے نام کی وجہ کوئی بھی ہو یہ اپنے فن تعمیر کی خوب صورتی اور روئے زمین پر اپنی مثال آپ ہونے کی وجہ سے ایسا تاریخی شاہکار ہے جس کی کوئی نظیر اور ثانی نہیں۔ احقر راقم سطور نے بھی اس قصر کو اور قرطبہ کی جامع مسجد کو تین دفعہ اپنی آنکھوں سے وہاں جا کر دیکھا ہے۔

الحمرا جس پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے وہ اپنی ساخت کی وجہ سے تین اطراف سے دشمن کی دست رس سے بالکل باہر تھا جب کہ صرف ایک طرف سے تنگ راستے کے ذریعے اس پر دشمن کی رسائی ممکن تھی۔ اس مخصوص جغرافیائی محل وقوع کی بنا پر الحمرا کی دفاعی حیثیت مسلمہ تھی۔ تاہم بدقسمتی سے اس کی یہ مسلمہ دفاعی حیثیت بھی ۱۴۹۲ء میں سسکتی ہوئی آخری اندلسی مسلم ریاست کو دم توڑنے سے نہ بچا سکی۔

الحمرا کی تعمیر دراصل وہاں پہلے سے موجود رومی قلعے کے کھنڈرات کی بنیادوں پر اٹھائی گئی تھی۔ دشمن کے حملوں سے حفاظت کی خاطر اس کی قلعہ نما چار دیواری کی موٹائی بہت زیادہ تھی۔ الحمرا کی چار دیواری کو اگر

دیکھا جائے تو اس کی شکل ایک بحری جہاز سے ملتی جلتی ہے۔ اگر ہوائی جہاز سے اس کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی دیو قامت بحری جہاز کا ڈھانچہ پہاڑ کی چوٹی پر رکھ دیا گیا ہے۔ الحمراء کی لمبائی ایک کلومیٹر جب کہ اس کی چوڑائی چوتھائی کلومیٹر کے قریب ہے۔ اس پر کتنی رقم خرچ ہوئی اس کا تخمینہ لگانا مشکل ہے کیونکہ اڑھائی سو سال کی مدت میں آہستہ آہستہ یہ کام جاری رہا۔ اس کی تعمیر البتہ ۱۲۳۸ء میں شروع ہوئی تھی۔ الحمرا کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان مسلم بادشاہوں نے اس دنیا میں ہی آسمان کی جنت کی تصویر کشی کی کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ الحمرا کے وسط میں اطراف کے کمروں کے دروازے ایک دیدہ زیب مستطیل نما صحن میں کھلتے ہیں۔ اس کے درمیان میں بنے ہوئے تالاب اور اس کے اندر موجود فوارے سے اچھلتا ہوا موتیوں جیسا چمک دار پانی ہر دیکھنے والے کی نظر اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یہاں سنگ مرمر کا استعمال نہایت کثرت سے کیا گیا ہے۔ اسی صحن کے پیچھے دو ہال ایسے ہیں جن کو بادشاہ وقت سرکاری امور کی انجام دہی کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس صحن کے وسط میں تعجب خیز اور حیران کن چیز یہ ہے کہ کسی نایاب قسم کے سنگ مرمر کے بنے ہوئے بارہ شیروں نے دائرے کی صورت میں ایک نہایت ہی عجیب وغریب فوارے کا پاٹ اپنی پشتوں پر اٹھایا ہوا ہے۔ اس کے چاروں اطراف سے شفاف پانی کی چار نالیاں فوارے پر مرتکز ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اندلسی عہد میں ان شیروں پر سونے کا پترا چڑھا ہوتا تھا۔ ان شیروں کی ساخت اور فوارے کی مخصوص بناوٹ ہی عجوبۂ روزگار نہیں ہے بلکہ تعجب خیز امر یہ بھی ہے کہ پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہونے کی وجہ سے نہ جانے پانی کس طریقۂ کار کے تحت یہاں لایا جاتا ہوگا تاکہ یہ فوارا دن رات موتی بکھیرتا رہے۔ اس فوارے کا نظام کچھ یوں ہے کہ اس کے چلتے رہنے کی وجہ سے پاٹ بھرا رہتا ہے۔ اسی پاٹ کو پشت سے سہارا دینے والے ہر شیر کا منہ کھلا ہوا ہے۔ پاٹ کا پانی شیر کے منہ سے ہوتا ہوا اچھل اچھل کر باہر آتا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اس فوارے کی تعمیر میں موسیقی اور علم الطبیعیات کے مشترکہ داؤ د پیچ جغرافیہ کی ہیئت ترکیبی کی آمیزش سے استعمال کیے گئے تھے۔ مسلم ماہرین تعمیرات نے فوارے اور شیروں کے منہ سے پانی گرنے کا انتظام اس انداز سے ترتیب دیا تھا کہ اس سے بڑی ہی مسحور کن اور مختلف انواع کی سریلی آوازیں پیدا ہوتی تھیں۔ مختصر یہ کہ یہ قصر ایک قابل دید چیز ہے۔

مسلمانوں نے اندلس پر قابض ہو کر تمام ملک میں دارالعلوم، جامعات، مدارس، رسد خانے، عظیم الشان کتب خانے وغیرہ کھول دیے تھے جہاں علمی تحقیقات کا ہر ایک سامان موجود رہتا تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں یا دارالعلوم اور چھوٹے قصبوں میں ابتدائی اور درمیانی درجے کے مدارس تھے۔ قرطبہ، اشبیلیہ، مالقہ، سرقسطہ، بشونہ، جیان، طلیطلہ وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں قائم تھیں جہاں اطالیہ، فرانس، جرمنی اور انگلستان وغیرہ ممالک کے طلبہ اور شائقین علوم آتے اور برسوں رہ کر علم حاصل کرتے تھے۔ عربوں نے یونانی، لاطینی اور ہسپانوی زبانوں کو بے حد مشقت اور عرق ریزی سے سیکھا اور ان زبانوں میں عربی زبان کے متعدد لغات لکھ ڈالے۔ خلیفہ حکم ثانی کے عہد خلافت میں صرف قرطبہ کے کتب خانے میں چھ لاکھ کتابیں

مختلف علوم وفنون کی موجود تھیں اور ہر کتاب پر خاص خلیفہ کے ہاتھ کا حاشیہ تحریر تھا۔ مسلمانوں نے فلسفۂ یونان کی تمام کتابوں کا اپنی زبان میں ترجمہ کر ڈالا۔ ابن رشد جو ارسطو پر بھی فضیلت رکھتا تھا، اندلس ہی کا ایک مسلمان تھا۔ مسلمانوں نے علم ہیئت میں وہ ترقی کی اور ایسے رصد گاہیں (Observatories) قائم کیں کہ تمام یورپ کو انھی کے نقش قدم پر چلنا پڑا۔ اصطرلاب جو رصد گاہوں کی روح رواں ہے، اندلس کے مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ طب اور جراحی میں اندلسی مسلمانوں نے اتنی ترقی کی تھی کہ چند گذشتہ سالوں تک تمام یورپ انھی کی کتابوں سے فیض یاب ہوتا رہا۔ علم حیوانات اور نباتات میں اندلسی مسلمانوں کے کارنامے بے حد عظیم الشان ہیں۔ قرطبہ اور غرناطہ میں علم حیوانات ونباتات کی تعلیم کے لیے خاص طور پر باغات اور کارخانے موجود تھے۔ سن اور روئی سے کاغذ تیار کرنا اندلسی مسلمانوں نے ایجاد کیا۔ الفانسو یازدہم کی تاریخ میں لکھا ہے:

''شہر کے مسلمان بہت سی گونجنے والی چیزیں اور لوہے کے گولے بہت بڑے بڑے سیب کے برابر پھینکتے تھے کہ بعض فوج کے اس پار جا کر اور بعض فوج کے اندر گرتے تھے۔''

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان جب توپ اور بارود کو استعمال کرتے تھے، عیسائی اس وقت اس سے قطعاً ناواقف تھے۔ سنین الاسلام کے مصنف نے لکھا ہے کہ سنہ ۴۴۱ھ میں اندلس کے مسلمانوں میں سے بعض نے امریکہ کو دریافت کیا تھا لیکن ان کی شہرت زیادہ نہ ہوئی۔ یہ شہرت کولمبس کے لیے لکھی تھی جو بہت دنوں بعد امریکہ میں پہنچا تھا۔

مسلمانوں کے علمی ذوق وشوق نے تمام یورپ کے لیے علم وادب، منطق وفلسفہ اور صنعت وحرفت بلکہ تمام علوم وفنون کے دروازے کھول دیے تھے۔ آٹھ سو برس تک مسلمان ہر چیز میں اہل یورپ کے استاد بنے رہے۔ عیسائی امراء زبان اور ہر چیز میں مسلمانوں کی تقلید کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے اور عربی نظم ونثر لکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ رابرٹ بریفالٹ نے لکھا ہے کہ اندلس میں اس قسم کے مناظر بھی دیکھنے میں آئے:

''ایک پادری گرجا میں اتوار کے دن خطبہ دے رہا ہے اور اس کی عبا پر قرآنی آیات کاڑھی ہوئی ہیں۔'' (تشکیل انسانیت: ص ۲۶۹)

یہ اندلس کے مسلمانوں کا اثر تھا کہ پادریوں کو ایسا کرنا پڑتا۔ فرانسیسی اور اطالوی زبانوں میں اکثر وہ الفاظ جو جہاز رانی اور بحری انتظامات سے متعلق ہیں، عربی ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان ممالک نے مسلمانوں ہی سے جہاز رانی سیکھی ہے۔ سیر وشکار کے متعلق بھی اکثر الفاظ عربی الاصل ہیں۔ علم ہیئت کی اصطلاحیں اور دواؤں کے نام جو یورپ کی زبانوں میں رائج ہیں، عربی ہیں۔

اندلس کا مشہور جغرافیہ دان ابن جبیر سنہ ۱۱۸۴ء میں سسلی گیا تھا۔ وہاں کے بادشاہ ولیم دوم (۱۱۶۶ء۔ ۱۱۸۹ء) کے متعلق وہ لکھتا ہے:

''ولیم دوم عجیب وغریب آدمی ہے۔ اس کے تمام وزراء، دربان، خواجہ سرا اور دیگر خدام مسلمان

ہیں۔اس کا سرکاری نشان "الحمدللہ حق حمدہ" ہے،اوراس کے والد (ولیم اول) کا "الحمدلله شکراً و نعمه" تھا۔اس کے محل کے زرکار (طلائی کام کرنے والے) نے مجھے بتایا کہ جو عیسائی لڑکیاں شاہی محل میں داخل ہوتی ہیں، وہ مسلمان کنیزوں کی نیکی، پاکیزگی اور عبادت سے متاثر ہو کر مسلمان ہو جاتی ہیں۔'' (رحلۃ ابن جبیر: ص ۳۲۰)

غرضیکہ اندلس کے مسلمان تمام یورپ کے استاذ، تمام یورپ کے محسن اور تمام یورپ کو علم وحکمت اور ترقی وعزت کے طریقے بتانے والے اتالیق تھے۔اس زمانے میں یورپ کی حالت کیا تھی، اس کے بارے میں مختلف یورپی دانشوروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ڈریپر اپنی مشہور کتاب ''معرکۂ مذہب وسائنس'' میں لکھتا ہے:

''اسلامی عروج کا تعلق قرون وسطیٰ سے ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں علم وتہذیب اور اخلاق کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ امراء کا کام عیاشی، بردہ فروشی اور مے نوشی تھا۔ بڑے بڑے شہروں مثلاً لندن، پیرس اور برلن کی سڑکوں پر فضلے اور غلاظت کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔رات کو روشنی کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تھا۔ جو شخص رات کو گھر سے باہر نکلتا وہ عموماً کیچڑ میں لت پت ہو جاتا تھا۔نہانا اتنا بڑا گناہ تھا کہ جب پاپائے روم نے جرمنی کے بادشاہ فریڈرک دوم (۱۲۱۲ء۔۱۲۵۰ء) پر کفر کا فتویٰ لگایا تو فہرست الزامات میں یہ بھی درج تھا کہ وہ ہر روز مسلمانوں کی طرح غسل کرتا ہے۔'' (معرکہ مذہب وسائنس: ص ۳۶۱)

جب اندلس میں اسلامی حکومت کو زوال آیا تو فلپ دوم (۱۵۵۶ء۔۱۵۹۸ء) نے تمام حمام اس لیے بند کر دیے کہ ان سے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ اسی بادشاہ نے ایک گورنر کو اس جرم میں معزول کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی طرح روزانہ ہاتھ پاؤں دھوتا ہے۔

جب کینٹربری کا لاٹ پادری باہر نکلتا تھا تو اس کی قبا پر جوئیں قطار اندر قطار نظر آتی تھیں۔فقر وفاقہ کا یہ عالم تھا کہ لوگ درختوں کی چھال اور پتے ابال کر کھاتے تھے۔سنہ ۱۰۳۰ء کے قحط میں لندن کے بازاروں میں انسانی گوشت بھی فروخت ہوتا تھا۔ (معرکۂ مذہب وسائنس: ص ۳۶۱)

فرانس کے ایک دریا ساؤن کے کنارے انسانی گوشت کی کتنی ہی دکانیں تھیں۔

(تشکیل انسانیت: ص ۲۰۹)

جاگیرداروں کے قلعے ڈاکوؤں کے اڈے تھے جو مسافر کو لوٹتے اور ان کو ذبح کرنے کے لیے پکڑ لاتے تھے۔ یورپ کی یہ حالت مسلسل بارہ تیرہ سو برس رہی۔ درست کہا تھا گبن نے:

''بدی کی یہ کثرت اور نیکی کی یہ قلت اتنی طویل مدت تک کہیں اور نظر نہیں آتی۔''

(ملاحظہ ہو معرکۂ مذہب سائنس اور تاریخ زوال روما)

اندلس کی عورتیں بھی عربی لباس فخر سے پہنتی تھیں جو قرطبہ، اشبیلیہ اور سسلی میں تیار ہوتا تھا۔ اشبیلیہ میں سولہ ہزار کرگھے تھے اور قرطبہ میں ریشم بافوں کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار تھی۔ ان کی تیار کردہ عباؤں اور

قباؤں پر قرآنی آیات بھی ہوتی تھیں جنھیں عیسائی بادشاہ اور پادری فخر سے پہنتے تھے۔

بریفالٹ نے لکھا ہے:

''اگر وہ یورپ کی ترقی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر اسلامی تہذیب کے فیصلہ کن اثرات موجود نہ ہوں، لیکن یہ اثر کہیں بھی اتنا واضح اور اہم نہیں جتنا اس طاقت کے ظہور میں ہے جو دنیائے جدید کی مخصوص اور مستقل قوت اور اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ یعنی ''سائنس اور سائنسی طرز فکر۔'' اس کے بعد بریفالٹ نے لکھا ہے:

It is highly probable that but for the Arabs, modern industrial civilization would never have arisen at all.

(The Making of Humanity, P.202)

یعنی انتہائی اغلب ہے کہ عربوں کے بغیر صنعتی تہذیب سرے سے وجود ہی میں نہ آتی۔

لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ یورپ آج مسلمانوں کے ان احسانات کو یک قلم بھول گیا ہے جو مسلمانوں نے علمی حوالے سے ان پر کیے تھے۔ آج وہ اپنے استادوں کو بھول گیا ہے اور اگر اسے اپنی ناآشنا نظروں سے دکھائی بھی دیتا ہے تو وہ اس کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جہاں اقرار کے سوا بن نہیں پڑتا اور اعتراف کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں رہتا تو وہاں وہ قند کے ساتھ خاکستر بھی ملا دیتا ہے تاکہ حلوہ کھانے کے قابل نہ رہے یعنی اقرار اور اعتراف کے ساتھ کوئی نہ کوئی فقرہ اور کوئی نہ کوئی بات ایسی اضافہ کر دی جاتی ہے جس سے توجہ اسلامی علوم و معارف کی توقیر سے ہٹ کر کسی اور طرف لگ جاتی ہے یا توقیر کے ساتھ تحقیر بھی شامل کر دی جاتی ہے تاکہ توازن ہو جائے۔ بعض انصاف پسند دانش وروں نے اس امر کا احساس کیا ہے اور یہ صاف لکھا ہے کہ یورپ نے اسلامی علوم کے اثرات، منفعت اور وسعت کے بارے میں بہت غلط نظریہ اختیار کر رکھا ہے۔ چنانچہ ایک مغربی محقق ٹاؤنر (Towner) لکھتا ہے:

''مجھے افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ کس منظم طریقہ سے یورپ کے ادبیات نے ان احسانات کو جو مسلمانوں نے سائنس کے میدان میں ہم (یعنی یورپ) پر کیے، نظر انداز کرنے کا طریقہ نکال لیا ہے۔ یقینی طور پر انھیں بہت عرصے تک پردۂ اخفا میں نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ بے انصافی جو مذہبی بغض اور قومی غرور پر مبنی ہو، ہمیشہ کے لیے برقرار نہیں رکھی جا سکتی۔''

(دی فلاسفی آف سویلائزیشن، نیویارک: ۱/۱۲۱)

گویا یورپ والوں کو اب خود خیال آ رہا ہے کہ ان ناقابل اعتبار بیانات کا پردہ اٹھے گا اور صحیح واقعات دنیا کے سامنے آ کر رہیں گے۔

اب ہر شخص کی زبان پر ہے:

"جدید تاریخ آزادی، مساوات اور اخوت کو فرانسیسی انقلاب کا نتیجہ قرار دیتی ہے لیکن پہلے شخص جس نے اس کا اعلان کیا، وہ اسلام کے بانی تھے جو چودہ سو سال قبل پہلے ہوئے تھے۔"

(مضمون ہیرالال چوپڑا، سابق استاد تاریخ کلکتہ، یونیورسٹی، السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا، ۱۵/اپریل ۱۹۷۳ء)

ایک عیسائی مقالہ نگار نے اسلام کے اس انقلاب کے بارے میں لکھا:

"اسلام کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رخ کو موڑ دیا۔" (Man and His gods, P.389)

بہر حال یہ ایک نہایت وسیع موضوع ہے کہ یورپ کی ساری ترقی اور فرانس کا یہ صنعتی انقلاب سب کچھ اندلس کے مسلمانوں کی سائنسی ترقی کی وجہ سے ہے۔ لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہماری نسل نو کو یہ بتایا ہی نہیں گیا۔ انھیں یہی بتایا گیا ہے کہ یہ سب کچھ یورپ کی طفیل حاصل ہوا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم نسل نو کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اسلامی تہذیب کی بربادی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ آج ہمارے بچے ان کتابوں سے بھی ناواقف ہیں جو ہمارے لیے مشعل راہ تھیں۔ ہم نے اپنی خوشی سے وہ کالے ناگ پال لیے جو قدم قدم پر ہمیں ڈستے ہیں اور ان راہ زنوں کو اپنے ہاں بسا لیا جو ڈھول بجا کر ہمارے ہوش و حواس کو لوٹ رہے ہیں۔"

(تاریخ افکار علوم اسلامی: ص ۵)

چند صفحات کے بعد ڈاکٹر قریشی نہایت افسوس آمیز، لہجے میں لکھتے ہیں:

"اگر اپنی ثقافت، دین اور ایمان بیچنے کے بعد ہماری دنیا ہی سنور جاتی تو شاید بعض لوگ اس صورت حال کو گوارا کر لیتے، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ یہ بھی نہ ہوا۔ اگر چست پتلونوں، تنگ قمیصوں اور جسمانی ساخت کی نمائش سے ترقی یافتہ اقوام کی صف میں جگہ مل جاتی تو پھر کیا تھا — نہ کتب خانوں کی ضرورت، نہ دانش گاہوں کی، نہ عمل کی، نہ محنت کی۔ جو کچھ دیگر اقوام نے خون پسینہ ایک کر کے حاصل کیا ہے وہ ہمیں درزیوں کی ساحری سے مل جاتا۔" (تاریخ افکار علوم اسلامی: ص ۱۴۔۱۵)

کوئی مانے یا نہ مانے لیکن بعض مغربی مؤرخین نے بڑے مزے لے لے کر مسلمانوں کی اس عظمت کو بیان کیا ہے۔ چنانچہ مشہور مؤرخ فلپ کے حتی اپنی مشہور کتاب "ہسٹری آف دی عربز" میں لکھتا ہے:

"مسلمانوں کے دور ہسپانیہ میں ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ کی تاریخ میں علم و دانش کے درخشاں ترین ابواب رقم ہوئے۔ آٹھویں سے تیرھویں صدی کے آغاز تک عربی بولنے والے دنیا بھر میں تہذیب و ثقافت کے عظیم مشعل بردار تھے۔ انھی کے توسط سے قدیم علم و حکمت اور فلسفہ دریافت ہوا، اس میں اضافہ ہوا اور اس انداز سے پھیلا کہ مغربی یورپ میں تحریک احیائے علوم ممکن ہوئی۔"

ایک اور جگہ یہی حتی لکھتا ہے:

"قرطبہ کتب خانوں، مساجد اور محلات کا شہر تھا۔ اس کی تہذیبی ترقی بین الاقوامی شہرت اختیار کر

چکی تھی۔ اس کی میلوں لمبی پختہ اور شفاف گلیاں رات کی تاریکی میں بھی روشن رہتی تھیں۔ اس ترقی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے سات سو سال بعد لندن کی گلیوں کو روشن کرنے کے لیے ایک بھی عوامی لیمپ موجود نہیں تھا بلکہ صدیوں بعد کے پیرس کا یہ حال تھا کہ بارش میں اگر کوئی گھر سے باہر قدم رکھتا تو گھٹنوں تک کیچڑ میں لت پت ہو جاتا۔ اسی طرح جب اس عہد میں برطانیہ کی دنیا بھر میں معروف اور شہرہ آفاق آکسفورڈ یونیورسٹی انسانی غسل کے عمل کو ایک کراہت انگیز فعل سمجھتی تھی تو دوسری جانب قرطبہ کے سائنس دان پر تعیش حماموں میں نہانے کے مزے لوٹتے تھے۔''

ایک اور مغربی مؤرخ رابنس، اندلسی مسلمانوں کی ترقی اور یورپ کی جہالت کا تقابلی نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے:

''غروب آفتاب پر یورپ تاریکیوں میں ڈوب گیا لیکن قرطبہ میں چراغ جل اٹھے۔ یورپ غلیظ تھا مگر قرطبہ ہر روز زیر و جامہ تبدیل کرتا تھا۔ یورپ کیچڑ سے لت پت تھا لیکن قرطبہ کی گلیاں پختہ تھیں۔ یورپ کے امراء اپنا نام تک نہ لکھ سکتے تھے جب کہ قرطبہ کے سب بچے سکول جاتے تھے۔ یورپ کے پادری بپتسمہ کے موقع پر جو دعائیں مانگتے تھے وہ لکھی ہوئی صورت میں پڑھ بھی نہیں سکتے تھے جب کہ قرطبہ کے معلموں نے اسکندریہ کے طول و عرض کا کتب خانہ کھڑا کر دیا تھا۔''

اس کے مقابلے میں یورپ کے لوگ نہ صرف علم کے دشمن تھے بلکہ مختلف لائبریروں کو جلا کر انھوں نے دنیا کا جو علمی نقصان کیا اس کا احساس اہل علم ہی کر سکتے ہیں۔ لائبریریوں کی لاکھوں کتابیں انھوں نے جلا کر راکھ کر دیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ

''اندلس کے صرف ایک شہر قرطبہ میں ستر (۷۰) لائبریریاں تھیں جنھیں مسلمانوں کے زوال کے بعد متعصب عیسائیوں نے جلا دیا۔ صرف طلیطلہ وہاں کے بشپ زیمینز (Xmines) (م: ۸۹۷ھ) نے اسی ہزار کتابیں آگ کے سپرد کی تھیں۔'' (تشکیل انسانیت: ص ۲۵۱)

اور ڈریپر نے لکھا ہے:

''مسلمانوں نے طرابلس میں ایک عظیم الشان لائبریری بنائی تھی جس میں کتابوں کی تعداد ۳۰ (تیس) لاکھ کے قریب تھی۔ ایک مرتبہ صلیبیوں کا ایک لشکر وہاں سے گزرا اور اس نے وہ تمام کتابیں جلا کر راکھ کر دیں۔'' (معرکہ مذہب و سائنس: ص ۱۵۰)

صنعت و حرفت کو بھی مسلمانوں کے عہد میں اندلس میں بہت فروغ حاصل ہوا۔ اس کی وجہ سے عوام الناس کی خوش حالی میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا۔ دولت کی اسی ریل پیل کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے یہ خطہ یورپ کا سب سے زیادہ گنجان آبادی والا علاقہ بن گیا۔ بریفالٹ نے تسلیم کیا ہے:

''عربوں کے نفیس سوتی، اونی اور ریشمی لباس بغداد کے حریر و پرنیاں، موصل کی ململ اور طرابلس اور اندلس کے شیفون نے یورپ کی نیم برہنہ آبادی کو عمدہ لباس کا شوقین بنا دیا تھا۔''

(تشکیل انسانیت: ص ۲۶۸)

اندلس اور خصوصی طور پر قرطبہ میں پارچہ باقی، چمڑے کی مصنوعات، کتابوں اور جلد سازی کی صنعت نے بہت تیزی سے فروغ پایا۔ کاغذ کی ایجاد کا سہرا اگرچہ چینیوں کے سر ہے تاہم اسے فروغ دینے اور پوری دنیا میں عام کرنے کا اعزاز عہد وسطیٰ کے مسلمانوں کو جاتا ہے۔ اندلس میں کاغذ سازی کی صنعت نے بہت ترقی کی جس کی بنا پر یہ خطہ کتابوں کی اشاعت وترویج اور علم کے فروغ میں پوری دنیا پر سبقت لے گیا۔ اس سے ملتی جلتی صورت حال آرٹ اور سائنس کے شعبوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جہاں اندلسی مسلمان دنیا کی امامت کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ اس عہد میں فن تعمیر اپنی معراج کو پہنچا ہوا تھا۔ اس دور کی تعمیراتی عظمت کا اندازہ لگانے کے لیے ذرا اس نکتے پر غور فرمائیں کہ جامع قرطبہ کی دوہری محرابوں میں سرخ وسفید رنگ کے پتھر کے بلاکوں کا استعمال نہایت ہی دل فریب انداز میں کیا گیا تھا۔ یہ دوہری محرابیں آج تک دنیا کی کسی اور عمارت میں نہیں دیکھی گئیں۔ اس انوکھے فن تعمیر کی خاص بات یہ تھی کہ جب امام جمعے کا خطبہ دیتا تو اس کی آواز وسیع و عریض مسجد کے ہر کونے میں آسانی کے ساتھ پہنچتی تھی۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ تھا کہ آج کے سائنسی دور میں ایک انوکھا طرز تعمیر ہماری عظمت رفتہ کا ایک منہ بولتا ثبوت پیش کرتا ہے۔ پھر قصر الحمرا کی تعمیر اس کا مزید ایک ثبوت ہے جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں دی جا چکی ہے۔

زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح زرعی ترقی بھی اندلسی معیشت اور تہذیب وتمدن کا ایک اہم ستون ہے۔ مسلمان زرعی ماہرین نے ہر قسم کے بیج بونے کے لیے صحیح وقت اور صحیح جگہ کا تعین کیا۔ انھوں نے پیوند کاری کے مختلف طریقوں کے ذریعے زراعت اور باغبانی کو خوب ترقی دی۔ اس مقصد کی تعلیم و تدریس کے لیے سلطنت کے بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں زرعی مدرسے قائم کیے۔ مختلف خطوں میں واقع نباتاتی تحقیقاتی اداروں اور باغوں کے باب میں متعدد ہونے والے تجربات سے مسلمان سائنس دانوں نے بہت پہلے یہ معلوم کر لیا تھا کہ پودوں کو مضر موسمی اثرات اور کیڑے مکوڑوں سے کس طرح محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اندلسی دور حکومت میں تعلیم و تحقیق اور زرعی توسیع وترقی کا نہایت عمدہ اور مربوط نظام موجود تھا۔

مسلمانوں کی اس زرعی ترقی کا حال بیان کرتے ہوئے جوزف ہیل اپنی کتاب ''عربوں کی تہذیب'' میں یوں رقم طراز ہے:

''مسلمانوں کے دور حکومت میں ملک کو بے بہا معاشی اور اقتصادی فروغ حاصل ہوا۔ آب پاشی کے لیے نہری تعمیرات کی بدولت چاول، گنے، کھجور، ناشپاتی، زیتون اور انار جیسے مشرقی پھل اور اجناس

مغرب میں ہونی لگیں۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں کے مال و دولت میں خوب اضافہ ہوا اور افریقہ اور ایشیا میں ان کی تجارت پروان چڑھی۔''

اسی قسم کے خیالات کا اظہار لین پول نے اپنی کتاب ''ہسپانیہ میں موروں کی تاریخ'' میں بھی کیا ہے جس میں اس نے مسلمانوں کی سائنسی وفنی مہارت اور ملک میں زراعت و کاشتکاری کی ترقی و ترویج کا نہایت احسن انداز میں سے نقشہ کھینچا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ سقوط غرناطہ کے بعد اس کی حالت کس قدر مایوس کن اور قابل رحم ہوگئی تھی۔

اندلس کی مسلم حکومت میں یہ سرگرمیاں اس وقت جاری و ساری تھیں جب پورے کا پورا یورپ جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور درندگی کے جراثیم ان کے رگ و ریشے میں موجود تھے۔ جب کہ اندلس میں مسلمانوں کی تہذیبی، معاشی، معاشرتی، سائنسی اور فنی ترقی کے ضمن میں یہ خصوصیت نمایاں طور پر قابل ذکر ہے کہ اندلسی مسلمانوں کے اس عہد میں غیر مسلموں خصوصی طور پر عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ نہایت ہمدردی اور رواداری کا برتاؤ کیا جاتا تھا جس کی بنا پر انھیں پھلنے پھولنے اور ترقی کے مساوی مواقع میسر تھے۔ اس عہد نے نہ صرف کئی نامور یہودی سائنس دان پیدا کیے بلکہ انھیں اعلیٰ ترین سرکاری اور درباری اعزازات اور ملازمتوں سے بھی نوازا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کو یہودی اپنا سنہری دور سمجھتے ہیں، لیکن بدقسمتی سے ۱۴۹۲ء میں سقوط غرناطہ کے فوراً بعد ہی مسلمانوں کے تمام احسانات کو یک قلم فراموش کر کے ان پر مصائب کے پہاڑ توڑے گئے۔ ابھی مسلمانوں کے انخلاء پر اڑنے والی خاک فضا میں موجود تھی کہ ان کے تمام آثار و علامات کو ختم کر کے انھیں زبردستی عیسائی بنانے کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ یہ سلسلہ آنے والی چار پانچ دہائیوں تک جاری رہا اور کسی عیسائی بادشاہ کے دل میں مسلمانوں کے لیے رحم کے جذبات پیدا نہ ہوئے۔ آخر کار ۱۵۵۲ء میں فلپ دوم نے بچے کھچے مسلمانوں کا مکمل صفایا کرنے کی خاطر ایک حکم جاری کیا جس کی رو سے مسلمانوں پر لازم تھا کہ وہ فوراً اپنے عقائد، زبان، عبادت کے طریقے اور طرز زندگی کو کلی طور پر تبدیل کر لیں۔ علاوہ ازیں اس نے مسلمانوں کے تمام حماموں کو تباہ کرنے کا حکم دیا کیونکہ اس کے خیال میں یہ اسلامی علامت عیسائی عقیدے سے متصادم تھی۔ ۱۶۰۹ء میں فلپ سوم نے یہ حکم نامہ جاری کیا کہ کسی مسلمان کو اسپین (اندلس) میں رہنے کا حق نہیں۔ مؤرخ فلپ حتی کے مطابق اس حکم نامے کے بعد پانچ لاکھ بچے کھچے لوگوں نے شمالی افریقہ میں جب دوسروں نے مشرق وسطی میں پناہ لی۔ سقوط غرناطہ کے بعد کی دو صدیوں کے دوران قریباً تیس لاکھ مسلمانوں کو یا تو زبردستی جلا وطن کیا گیا، یا پھر قتل کر دیا گیا اور یہ سلسلہ عیسائیوں کے ہاتھوں ہنوز جاری ہے۔ عیسائیوں کی تاریخ پر اگر ایک نگاہ ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ دہشت و بربریت کی تاریخ ہے اور اس کے بادشاہ اخلاق اور تہذیب سے عاری اور چنگیز خان اور ہلاکو خان کی طرح ظالم و جابر ہوئے ہیں۔

جرمن دانشور وان کریمر مسلمانوں کے زوال کو ان کے حکمرانوں کی داخلی لڑائیوں اور چپقلشوں کا نتیجہ

قرار دیتا ہے۔ اس کے خیال میں اسلامی مملکت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہوگئی تھی اور اس کے فرمان روا آپس کے لڑائی جھگڑوں میں مصروف رہتے تھے۔ قطع نظر ان حالات اور اسباب کے اندلس کی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کا شروع کا کافی عرصہ تو کوئی اتنا برا نہیں تھا اگرچہ بعض مسلمانوں نے ان کی ٹانگیں کھینچنے کی کوشش کی لیکن حکومت میں توڑ پھوڑ کا کوئی عنصر موجود نہیں تھا۔ ان کی جہد مسلسل کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے انعامات کی بارش کر دی تھی۔ اب ان کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا لیکن انھوں نے بنی اسرائیل کی روش اختیار کر لی۔ دولت کی ریل پیل نے مسلمان حکمرانوں کے دماغوں کو خراب کر دیا اور وہ عیش و عشرت کے چکروں میں پڑ گئے۔ اس سارے سلسلے میں تین مخصوص برائیوں نے مسلمانوں کی تباہی کے لیے ٹھوس بنیادیں فراہم کیں۔ ان میں ایک تو شراب نوشی کا عام ہونا، اور دوسرے شطرنج کے کھیل کا حد سے زیادہ مقبول عام ہو جانا اور تیسرا عنصر عیسائی عورتوں سے شادی کرنا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان تینوں برائیوں کے بڑھنے کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مسلمان ریاستوں کے ارباب اقتدار اور شہزادے ہمسایہ عیسائی ریاستوں کے ارباب اقتدار کو اپنے ہاں شطرنج کی دعوتوں پر مدعو کرنے لگے اور ان ناپاک محفلوں میں غلام اور لونڈیاں اپنے ہاتھوں میں مئے سے بھرے ہوئے جام ہر وقت خدمت کے لیے موجود رہتے تھے۔ اس ساری صورت حال کا نتیجہ واضح تھا۔ عیسائی حکمرانوں اور ان کی عورتوں نے مسلمانوں کی ان خرمستیوں سے خوب فائدہ اٹھایا اور وہ انھیں آپس میں لڑا کر ان کی عسکری طاقت کو کمزور اور ختم کرنے لگے۔ یہ عمل اپنے عروج کو اس انداز میں پہنچا کہ طوائف الملوکی کی وجہ سے ایک عظیم الشان مسلم سلطنت جس کی بنیادوں میں طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر اور عبدالرحمٰن الداخل کا خون شامل تھا، چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو کر رہ گئی۔ پھر یہ علاقائی مسلمان حکمران آپس میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خاطر ہمسایہ عیسائی ریاستوں سے بھاری تاوان کے عوض فوجی مدد لینے لگے۔ آخر کار اس سارے سلسلے کا جو آخری اور افسوس ناک انجام ہوا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔

یہاں اس بات کو ایک مرتبہ پھر یاد کر لینا چاہیے کہ مسلمانوں نے جب پہلی صدی ہجری میں اندلس کو فتح کیا تھا تو کسی عیسائی کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا تھا بلکہ عیسائی لوگ خود بخود اسلام کی خوبیاں دیکھ کر دین اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ اب سقوط غرناطہ کے بعد عیسائیوں نے اقتدار اور طاقت تو حاصل کر لی لیکن اپنی ہزار کوششوں کے باوجود بھی وہ ان کو دین اسلام سے نہ ہٹا سکے چنانچہ ان عیسائیوں نے ان لاکھوں مسلمانوں کو جو اندلس میں موجود تھے قتل کر ڈالا، آگ میں جلا دیا، پانی میں ڈبو کر مار دیا، یا پھر ان کو جلا وطن کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اندلس جو مسلمانوں کے عہد حکومت میں دنیا کا سرسبز و شاداب اور زرخیز ترین ملک تھا اور جس کی زرخیزی دنیا میں ضرب المثل تھی، مسلمانوں کی تباہ حالی اور بربادی کے بعد وہ ایسا ویران، بنجر اور غیر آباد ہوا کہ آج تک ویرانی و نحوست اس پر سایہ فگن ہے اور یورپ میں سب سے زیادہ غریب ملک ہے۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں

اس کے پہاڑوں پر بھی زراعت ہوتی تھی اور اس کی زمین کا ایک چپہ بھی بنجر اور ویران نہیں تھا لیکن آج ہزار ہا مربع میل زمین کے قطعات ویران، غیر آباد اور بنجر پڑے ہوئے۔ وہ ملک جو مسلمانوں کے عہد حکومت میں دنیا کا سب سے زیادہ امیر اور شان دار ملک تھا آج اسے غریب اور بے حقیقت ملک سمجھا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں پرتگال بھی اندلس کا ایک حصہ تھا جو آج الگ ملک ہے اور بہت غریب ہے۔

مسلمانوں پر یہ مصائب وآلام محض اس لیے نازل ہوئے کہ انھوں نے قرآن حکیم کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان میں خودغرضی، اقتدار کی ہوس، نااتفاقی اور انتشار پیدا ہوگیا تھا۔ تعلیمات اسلام کو چھوڑنے کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان سردار اپنے بھائی مسلمان سرداروں کی مخالفت میں عیسائیوں کو تاوان اور رقم دے کر ان سے مدد طلب کرتے تھے۔ مسلمانوں نے خود کو عیسائیوں کے ہاتھوں سے ذبح کرایا اور عیسائیوں کے دلوں سے اسلامی سطوت وعظمت کا رعب ختم کرایا۔ اندلس کے مسلمانوں نے اپنی بداعمالیوں کے باعث اپنے آپ کو مغضوب بنا لیا تھا۔ اسی لیے ان کو دنیا کے کسی حصے سے کوئی امداد نہ پہنچی۔ کفار کے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ نے فجار کو سزا دلوائی۔ مسلمان نے جہاں کہیں بھی دین اسلام کے احکام کو چھوڑا تو ان پر ایسی مصیبتیں نازل ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے انھیں کبھی فردی نند اور فلپ کے ہاتھوں اور کبھی ہلاکو خان اور چنگیز خان کے ہاتھوں پٹوایا۔

یہی حال مسلمانوں کا اس وقت ہوگیا تھا جب سنہ ۱۸۵۷ء میں اللہ تعالیٰ نے انگریزوں کے ہاتھوں سے انھیں سزا دلوائی اور آج بھی وہی حالات پیدا ہو رہے ہیں، لہٰذا بجائے اس کے کہ ہم اندلس کے مسلمانوں کی تباہی اور بربادی پر نوحہ خوانی کریں ہم کو ان تمام حالات سے عبرت حاصل کرنی چاہیے اور اپنی دینی حالت کی اصلاح اور درستی کرنی چاہیے چنانچہ بہ حیثیت مجموعی اراکین امت مسلمہ کو چاہیے کہ وہ سچے پکے مسلمان ہو کر آپس میں بھائی بھائی بن جائیں اور متحد ومتفق ہو کر قرآن حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں کاروبار حکومت چلائیں۔ اسی کا نام زندگی اور اسی کا نام اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے۔ مسلمانانِ پاکستان نے اللہ سے پاکستان بناتے وقت جو وعدے کیے تھے ان کو پورا کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا بھی وہی حال ہو جو بنی اسرائیل کا ہوا تھا۔

یہاں ایک بات اور ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ تاریخ اسلام میں اندلس کی تاریخ ایک نہایت امتیازی شان اور مقام رکھتی ہے۔ اگرچہ دوسرے اسلامی ممالک کی طرح اندلس میں بھی صاحبان شمشیر وسنان موجود تھے جن کی شمشیر خار اشگاف کے بغیر امن وسکون وجود میں آ ہی نہیں سکتا تھا، لیکن مجموعی حیثیت سے سرزمین اندلس میں اسلام کی شان جلالی سے زیادہ شان جمالی کا ظہور نظر آتا ہے۔ تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ اندلس میں زمام حکومت سنبھالے ابھی مسلمانوں کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اندلس مختلف علوم وفنون کی حامل سرزمین بن گیا۔ یہاں علم دوستی، حریت فکر اور رواداری کو بے حد فروغ ملا جس کی وجہ سے ہر قسم کے علوم و فنون کو غایت درجہ ترقی کرنے کا موقع حاصل ہوا۔ علوم القرآن، تفسیر، علم حدیث وعلم فقہ، اصول الحدیث، اصول

فقہ، فلسفہ وکلام، تصوف واحسان، تاریخ اور سیرت نگاری، طبعیات، کیمیا، طب وجراحت، طبقات الارض، اور زراعت وفلاحت غرض کہ ہرفن کے ماہرین پیدا ہوئے جن کے باعث زندگی کے قریباً ہر شعبے نے بھرپور ترقی کی۔ ان لوگوں کے کارناموں اور فروغ علوم وفنون کے باعث اندلس کو تاریخ عالم میں ایک عظیم مقام حاصل ہوا۔ تفسیر میں قرطبی اور ابن العربی، فلسفۂ تصوف میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، تقابل ادیان میں ابن حزم، فلسفے میں ابن رشد، ابوبکر محمد بن یحییٰ ابن باجہ، حدیث میں یحییٰ بن یحییٰ اللیثی، بقی بن مخلد اور ابن عبداللہ، تاریخ میں لسان الدین ابن الخطیب، سیرۃ ومغازی میں قاضی ابن عیاض اور ابن سید الناس، اصول فقہ میں شاطبی، طب وجراحت میں ابن بیطار المالقی، الزہراوی، جغرافیہ اور سیاحت میں شریف ادریسی اور ابن جبیر، غرض کہ اگر اندلس کے ماضی پر نظر ڈالی جائے تو ممتاز اہل علم وفکر کا ایک کارواں رواں دواں نظر آتا ہے۔

اندلس میں مسلمانوں کی حکمرانی کا دور قریباً آٹھ سو برس پر پھیلا ہوا ہے۔ ان آٹھ صدیوں میں مسلمانوں کو زندگی اور تاریخ کے مشکل ترین مراحل سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ انھوں نے ایک اجنبی سرزمین میں مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والوں، مختلف زبانیں بولنے والوں اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو ایک ریاست کے سایے میں متحد اور منظم کیا۔ وہ اس سرزمین میں جس مشکل اور پیچیدہ صورت حال سے دوچار تھے، اس میں ایک مستحکم نظم ونسق قائم کرنا اور لوگوں کی قوتوں کو تعمیری جہت پر لگانا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ ابتدائی صدیوں میں مسلمانوں کو اس بارے میں جو کامیابی نصیب ہوئی وہ قابل فخر بھی ہے اور قابل ستائش بھی، لیکن عروج کا لمحہ بہت کٹھن ہوتا ہے کیونکہ قومیں کامیابی اور کامرانی پر پہنچتے ہی ایک سخت اور کڑے امتحان سے دوچار ہو جاتی ہیں۔ یہ عروج اکثر وبیشتر خود پسندی، عیش کوشی، لذت اندوزی اور تن آسانی کے ایسے رجحانات پیدا کر دیتا ہے جو ان کو زوال اور انحطاط کی راہ پر ڈال دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی قوم ہمیشہ عروج پر نہیں رہ پاتی۔

مسلمانوں نے اپنے اس آٹھ سو سالہ دور حکومت میں اسلامی تہذیب کے نہایت شاندار باب رقم کیے، لیکن جونہی اسلام کا سیاسی اقتدار ختم ہوا، عیسائیوں نے پورے ملک میں مسلمانوں کے وجود ہی کو ختم کر کے رکھ دیا۔ ہزار ہا شاندار اور حسین مساجد کی یہ سرزمین اذان کی آواز ہی سے محروم ہوگئی۔ وہ ملک جس میں اللہ کی عبودیت کا ایک حسین ترین نقش مسجد قرطبہ کی شکل میں آج بھی نظر کو خیرہ کرتا ہے، وہاں پانچ سو سال سے اسلام کے ماننے والوں کو سجدے کی بھی اجازت نہیں۔ خود راقم جتنی بار اس کو دیکھنے کے لیے گیا تو ٹکٹ خریدنے سے قبل انھوں نے اس شرط پر ٹکٹ دیا کہ آپ وہاں دو رکعت نماز نہیں پڑھیں گے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ جواب یہی ہے کہ جس بلند مقصد کے حصول نے ابتدا میں اندلس کے مسلمانوں کے دلوں کو زندگی اور عمل کی حرارت سے معمور کر دیا تھا، اس مقصد اور پیغام کی محبت سے تدریجاً کمی آتی چلی گئی اور یہ آتش عمل وتحرک آہستہ آہستہ ماند پڑتی گئی، اور مسلمانان اندلس زندگی

کے بلند مقصد کی سعی و جستجو اور زندگی کی لذت اندوزی کے مابین توازن برقرار نہ رکھ سکے، اور یہ عدم توازن ان کے زوال اور تباہی و بربادی کا باعث بنا۔ اور اسی وجہ سے بعد کے معاشرے میں شیرازہ بندی کو برقرار نہ رکھا جاسکا جب کہ ابتدا میں اندلسی معاشرے کو جو کہ عدنانی، قحطانی، شامی، عراقی، بربری اور اندلس کے مقامی باشندوں پر مشتمل تھا، مسلمانوں نے ان کو ایک لڑی میں پرو کر دکھا دیا۔

اندلس میں ملوک الطّوائف:

اسلامی اندلس کی وہ عظیم الشان سلطنت جسے عبدالرحمٰن الداخل نے قائم کیا اور عبدالرحمٰن الثالث نے اپنی قوت بازو، جرأت و ہمت اور شبانہ روز علمی کاوشوں سے اس کی آبیاری کر کے پروان چڑھایا تھا، سنہ ۱۰۳۱ء میں بہت سے مختلف ٹکڑوں میں منقسم ہو کر رہ گئی اور قریباً بیس چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ جب بنو امیہ اور بنو حمود کے بعد مرکز کمزور ہو گیا تو ہر طرف سے موالی، وزراء، جرنیل، عرب سردار اور بربر سردار بغاوت کر کے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہر ایک نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کاروبار سلطنت مختلف گروہوں میں بٹ کر رہ گیا اور پھر یہ گروہ آپس میں لڑنے بھڑنے لگے یہاں تک کہ انھوں نے یورپ کے عیسائی بادشاہوں کو خراج ادا کر کے اپنے وجود کو قائم اور دوسری مسلم ریاست کے وجود ختم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ آخر کار مرابطین کا بادشاہ یوسف بن تاشفین مراکش سے اندلس آیا اور اس نے غیر مسلم قوتوں کو اندلس سے دوبارہ باہر کیا۔ چنانچہ پروفیسر حتی نے لکھا ہے:

''۱۰۳۱ء قرطبہ کی اموی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے کھنڈرات سے چھوٹی چھوٹی اسلامی ریاستوں کا ایک جھرمٹ پیدا ہوا جنھوں نے ایک دوسرے سے لڑ بھڑ کر اپنی طاقت کھو دی۔ اس قسم کی بیس چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں۔'' (ہسٹری آف دی عربز: ص ۵۲۷)

ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بعض اتنی کمزور اور بے طاقت تھیں کہ دوسری عیسائی ریاستوں نے انھیں جلد ہی ہڑپ کر لیا۔ یہ زمانہ اندلس کی تاریخ میں ''عصر ملوک الطّوائف'' کہلاتا ہے جس سے ملک میں اضطراب اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ کوئی شخص اپنے کو محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔ مسلم ریاستوں کی باہم خانہ جنگی اور بے اطمینانی کی یہ حالت قریباً ستر سال تک قائم رہی۔ اور نکلسن نے لکھا ہے کہ ''اندلس کی یہ حالت بعینہ پندرھویں صدی عیسوی کے اٹلی کے مشابہ تھی۔ اگر غور کیا جائے تو نکلسن کی یہ تشبیہ اندلس کے اس عہد کی صحیح صورت حال کا مکمل نقشہ پیش کرتی ہے۔ (الادب الاندلسی: ص ۵۵)

اس ملوک الطّوائف کے درمیان مسلمان ریاستوں کے درمیان ملکی اور سیاسی جھگڑے برپا رہے، ان میں اکثر و بیشتر جدال و قتال تک بھی نوبت پہنچ جاتی لیکن یہ لوگ ان تباہ کاریوں اور ہولناکیوں سے بالکل غافل تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شمال کے نصاریٰ نے ان کی اس بدحالی سے اور باہمی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھایا۔ اپنی

کمزوریوں کو دور کیا اور اپنی منتشر اور بکھری ہوئی صفوں کو درست کیا، اپنی عسکری قوت کو جمع کیا اور پھر ان چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں کے شہروں، قلعوں، قصبوں اور سرحدوں پر یلغار کر دی اور پھر حالت یہ ہو گئی:

''ان شہروں میں اسلام کا آفتاب غروب ہونے کو تھا اور شاید اللہ تعالیٰ کو خود بھی یہی منظور تھا، اس لیے چھوٹے چھوٹے بادشاہوں کے دلوں میں کینے اور بغض و حسد کی آگ بھڑک گئی۔ انھوں نے اپنے آپ کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے ہلاک کر ڈلا۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور اس کی حکومت کو تباہ و برباد کرنے کے لیے عیسائیوں سے مدد چاہی یہاں تک کہ طالب و مطلوب یعنی مدد لینے والے اور جن کے مدد لی گئی، دونوں ہی کمزور اور بے طاقت ہو گئے، اور اس طرح وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہوئے۔''

(الادب العربی و تاریخہ: ص ۲۸)

اندلس کے علماء اور فقہاء کے لیے یہ بڑی خطرناک صورت حال تھی۔ وہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ جاہ اور اقتدار پسند لوگ صرف اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ اسلام کو بھی داؤ پر لگا رہے ہیں۔ اگر پورے ملک پر عیسائیوں کا غلبہ ہو گیا تو یہاں نہ اسلام محفوظ رہے گا اور نہ مسلمان، لیکن ان چھوٹی ریاستوں کے صاحبان اقتدار کو یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اب علماء اور فقہاء کے سامنے صرف دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اپنے اس وطن کو چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں چلے جائیں اور عیسائیوں کے اس ملک پر قبضہ کرنے کے لیے راستہ صاف کر دیں۔ اور دوسرے یہ کہ اندلس سے باہر کسی مسلمان طاقتور حکمران سے امداد و اعانت طلب کریں۔ علماء اور فقہاء نے اس دوسرے راستے تو زیادہ صحیح سمجھا اور ارکان حکومت نے بھی اسی راستے کو بہتر سمجھا۔ چنانچہ ایک سفارت قاضی غرناطہ، قاضی بطلیوس، قاضی قرطبہ اور وزیر اشبیلیہ پر مشتمل مراکش کے حکمران یوسف بن تاشفین کی طرف روانہ کی گئی۔ امیر یوسف بن تاشفین اس وقت کے تمام حکمرانوں میں زیادہ ہمت و جرأت والا اور عسکری لحاظ سے زیادہ طاقتور سمجھا جاتا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی۔ اس نے ان حضرات کی آواز پر لبیک کہا اور اندلس کی سرزمین پر حملہ کر کے مسلمانوں اور اسلام کے قدم مزید چار سو سال کے لیے جما دیے وگرنہ اندلس کے حکمرانوں کے جو کرتوت تھے وہ تو مسلمانوں کی شوکت و سطوت کے آفتاب کو بہت جلد غروب کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اگرچہ اندلس کی سیاسی زندگی گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں نہایت پست اور رُو بہ انحطاط تھی لیکن علمی، فکری اور ادبی حالت نہایت قوی سے قوی ہوتی چلی گئی اور علم و ادب کے ارجمندوں کی بزم رونق افروز ہوتی گئی۔ تاریخ میں اس عہد کو عربی ادب کا نہایت سنہری دور کہا گیا ہے۔ چنانچہ سید امیر علی نے لکھا ہے:

''مالا ٹوٹ گئی۔ موتی بکھر گئے۔ چھوٹے چھوٹے بادشاہوں نے اپنی اپنی آزاد اور خود مختار حکومتیں قائم کر لیں، لیکن اس پر بھی علم و حکمت کا چراغ جلتا رہا۔ علوم و فنون پر زوال آنے کے بجائے انھیں اور بھی فروغ اور ترقی حاصل ہوئی۔'' (سپرٹ آف اسلام: ص ۳۷۸)

چنانچہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اندلس کے سیاسی انحطاط کا دور عربی اور اسلامی علوم وفنون کے لیے رحمتِ بے پایاں ثابت ہوا۔ علماء اور فضلاء قرطبہ سے بھاگ کر جو مختلف شہروں میں گئے تو ان کا بھاگنا بھی علم و ادب کے لیے باعث رحمت ثابت ہوا۔ یہ لوگ قرطبہ کے بڑے شہر سے بھاگ کر اندلس کے مختلف چھوٹے بڑے شہروں میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کے قلب و ذہن علم و فضل سے بھرے ہوئے تھے اور ان کے سینوں سے علم وافر کی نہریں اور جدولیں جاری و ساری تھیں۔ انھوں نے جہاں کہیں بھی زرخیز زمین دیکھی وہیں علم و ادب کی تخم ریزی کر دی۔ ان علماء اور اہل علم وفن کی محنت بارآور ہوئی اور عوام علم وفن کی دولت پر ٹوٹ پڑے۔ چنانچہ صاعد الاندلسی نے لکھا ہے:

''جب طوائف الالمملوکی کا دور اندلس میں آیا تو لوگوں نے ان کتابوں کو جو افراتفری اور طوائف المملوکی کے زمانے میں مختلف شہروں میں منتقل کی گئی تھیں، جن میں بے شمار قابل قدر اور گراں بہا خزانے مدفون تھے، انھیں حاصل کیا۔ پھر ہر صاحب علم کے سینے میں جتنا کچھ اور جو کچھ علم موجود تھا، وہ یکا یک ابل پڑا، اور علوم قدیمہ کی جستجو اور طلب میں لوگوں کی روز بروز رغبت بڑھتی چلی گئی۔ الحمدللہ! آج کی حالت اندلس کی گذشتہ حالت سے بدرجہا بہتر ہے۔'' (طبقات الامم: ص ۶۷)

جب یہ اعلیٰ قسم کا سیاسی نظام منتشر ہو کر رہ گیا اور اندلس کی یہ عظیم سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہو گئی تو اس سے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک پوشیدہ نعمت نکلی وہ یہ کہ ارباب علم و دانش کا وجود مختلف شہروں میں بکھر گیا جس سے علوم وفنون کا بازار گرم ہو گیا۔ لوگ علم و ادب اور نظم ونثر اور مختلف علوم وفنون میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے جذبے کے ساتھ سرگرم عمل ہو گئے۔ اس زمانے میں شاعری نے بڑا کمال حاصل کیا اور مختلف امراء و رؤساء کے اتنے پر شکوہ قصائد لکھے گئے کہ اگر اسی خوب صورت انداز اور حسین اسلوب میں تاریک رات اور شب دیجور کی بھی وصف نگاری کی جاتی تو وہ بھی تابناک سورج والے دن سے بھی زیادہ روشن ہو جاتی۔ یہ مدح وتوصیف وہ کسی ریاکاری اور ظاہر پسندی کے جذبے سے نہیں کرتے تھے کیونکہ بے جا مدح وثنا کو وہ ناپسندیدگی بلکہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ اندلس کے ایک ادیب ابو غالب اللغوی نے اپنی ایک کتاب تصنیف کی۔ ملک دانیہ مجاہد العامری نے اسے ایک ہزار دینار کی رقم جو کہ اس زمانے میں بھی گراں مایہ رقم تھی اور موجودہ دور میں بھی ایک بہت بڑی رقم ہے اس شرط پر دینی چاہی کہ یہ کتاب اس کے نام معنون کر دی جائے۔ ابو غالب نے یہ خطیر رقم یہ کہہ کر ٹھکرا دی کہ یہ کتاب جسے میں نے عوام کے نفع اور فائدہ کے لیے لکھا ہے، کسی اور کے نام معنون کر دوں اور اس بات پر فخر کروں کہ ایک بادشاہ کی چشم کرم مجھ پر آن پڑی ہے۔ جب مجاہد عامری کو ابو غالب کی اس بات کا پتہ چلا تو وہ بجائے غصہ کرنے کے ابو غالب کی تعریف وتحسین کرنے لگا، اور بغیر کسی شرط کے اس کو دو ہزار دینار انعام دیا۔ (الادب الاندلسی: ص ۶۲)

اس پر اضطراب اور افراتفری کے دور میں بہت اعلیٰ پائے کے ادیب و شاعر اور علم وفن کے ماہر پیدا

ہوئے جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا، اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ شعر و ادب امراء کے عالی شان محلات اور ادباء کی محفلوں سے باہر نکل کر عوام الناس، مزدوروں، کسانوں تک اور پیشہ ور لوگوں کی دکانوں تک پہنچ گیا۔ چنانچہ قزوینی نے لکھا ہے:

''اہل شلب سب کے سب شعر کو خوب جانچ سکتے تھے اور اس پر اچھی طرح تنقید بھی کر سکتے تھے۔ اگر تم کسی کے کھیت میں چلے جاؤ تو وہاں صاحب کھیت سے کوئی شعر پوچھو یا علم شعر کے بارے میں اس سے کوئی سوال کرو تو فوری اور ارتجالاً ہر موضوع کے متعلق شعر میں جواب دے گا۔''

(نظرات فی تاریخ الادب الاندلسی: ص ۲۴۵)

دولت عبادیہ کے حکام تو علم و فن کی سر پرستی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے لہٰذا ان کے ہاں بہترین صاحب علم و کمال اور اعلیٰ درجہ کے شعراء و ادباء موجود تھے۔ المقتدر اور المؤتمن جن کا تعلق بنی ہود سے تھا، خود فلسفی علماء میں سے تھے۔ المؤمن فنون ریاضیہ میں بڑا ماہر تھا۔ اس فن میں اس کی بہت سی تصانیف بھی ذکر کی گئی ہیں۔ بنو ہود کی سر پرستی میں بہت سے فلاسفہ جیسے ابن جبرون اور ابن باجہ وغیرہ پرورش پا رہے تھے، اور بنو ذی الفنون کے دربار میں بھی علماء، فضلاء اور اہل کمال لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ بطلیوس بھی ادب و ثقافت کا ایک بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں بنو افطس کا دور دورہ تھا۔ مظفر بن افطس خود بھی ادب و فن کا بہت ماہر تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ''جس شاعر کے اشعار متنبی اور المعری کے ہم پلہ نہ ہوں وہ خاموش بیٹھا رہے۔ (الادب الاندلسی: ص ۶۴)

اس زمانے میں سب سے زیادہ قابل فخر شخص ابن حزم قرطبی تھے۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ اہل اندلس میں سب سے زیادہ جامع شخص وہی تھے۔ وہ تمام علوم اسلامیہ کے ماہر تھے۔ ان کی معلومات کا دائرہ اس زمانے کے تمام علماء سے زیادہ وسیع تھا۔ ایک یورپی مؤرخ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ''ابن حزم اپنی تصنیف ''الملل والنحل'' کے باعث یورپ پر کئی صدیوں سے سبقت لے جا چکا ہے کیونکہ یورپ میں تاریخ مذاہب انیسویں صدی عیسوی میں جا کر مرتب ہوئی۔ (ابن حزم کے حالات اگلے صفحات میں آ رہے ہیں)

اشبیلیہ میں معتضد بن عباد نے ایک محل تعمیر کروایا جس میں ہر طبقے کے شاعر اکٹھے ہوتے اور شعر و ادب کی مجلسیں قائم ہوتیں۔ اس زمانے میں علمی اور ادبی شوکت اتنی عام ہو گئی تھی کہ کوئی فقیہ، کوئی نجومی، کوئی متکلم، کوئی فلسفی، کوئی طبیب، کوئی ریاضی دان اور کوئی مؤرخ و عالم ایسا نہ تھا جو شعر نہ کہتا ہو اور شعر کے فن کی رغبت نہ رکھتا ہو۔ (الادب الاندلسی: ص ۹۶)

طوائف الملوکی کے عہد کی شاعری میں ایک قابل ذکر جدت یہ پیدا ہوئی کہ اس میں تصوف اور فلسفہ کے مضامین کی کثرت ہوئی۔ اس صنف شعر میں محی الدین ابن العربی اور ابن سبعین زیادہ مشہور ہوئے۔ اسی زمانے میں رسائل ''اخوان الصفا'' اندلس میں داخل ہوئے۔ چنانچہ اندلسی اشعار اور حکم و امثال میں ان رسائل کی بے شمار تلمیحات پائی جاتی ہیں۔ اس زمانے کے ایک شاعر ابو الحزم کے دو شعر نقل کیے جاتے ہیں جو اس نے

امویوں کی ہجو میں لکھے ؎

قلت یوماً لدار قوم، تفانوا — این سکانك العزاز علینا

فاجابت: ھنا اقاموا قلیلاً — ثم ساروا ولست اعلم ابنا

میں نے ایک روز ایک تباہ شدہ بستی سے پوچھا وہ لوگ کہاں گئے جو تیرے اندر رہتے تھے اور ہم پر اپنی عظمت وسطوت کی دھونس جماتے تھے۔

اس نے جواب دیا کہ وہ تو یہاں تھوڑی دیر ٹھہرے، پھر پتہ نہیں وہ کہاں چلے گئے۔

(المقری: نفح الطیب: ۳۴۵/۱)

عہد اسلامی اور اندلس کی معاشی ترقی

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل اندلس بھی یورپ کے دوسرے ملکوں کی طرح غلیظ ملک تھا۔ اگرچہ قدرتی طور پر یہ یورپ کا ایک خوب صورت خطہ ہے۔ اندلس کے تین اطراف پانی اور ایک طرف خشکی تھی۔ اس لیے اس کو جزیرہ نما بھی کہتے تھے۔ مسلمانوں کے یہاں قدم رکھنے سے پہلے اس کے شہروں میں جگہ جگہ دلدلیں اور غلیظ جوہڑ تھے۔ سڑکوں اور گلیوں میں غلاظت اور فضلے کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ نہانا اتنا بڑا گناہ تھا کہ نہانے پر پاپائے اعظم کی طرف سے کفر کے فتوے لگتے تھے۔ لوگ اپنے مویشیوں سمیت ایک ہی کمرے میں سوتے تھے اور جانوروں کے پیشاب اور گوبر کی کوئی بدبو انھیں نہیں آتی تھی۔ بڑے بڑے پادریوں کے جسم غلیظ اور ان کے لباس پر کثرت سے جوئیں رینگتی ہوتی تھیں۔ چنانچہ برطانیہ کے لاٹ پادری کی قبا پر سیکڑوں جوئیں چلتی پھرتی نظر آتی تھیں۔ یورپ پر صدیوں تک وحشت و بربریت اور جہالت کا دور دورہ رہا تھا۔ گبن نے لکھا ہے کہ ''اتنے طویل تاریخی زمانے میں بدی کی یہ کثرت اور نیکی کی یہ قلت اور کہیں نظر نہیں آتی۔'' گاتھ قوم کا ایک مؤرخ لکھتا ہے کہ ''ان وحشیوں کے ہولناک افعال کے ذکر سے تاریخ کے صفحات کو آلودہ نہیں کرنا چاہتا تا کہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے خلاف انسانیت افعال کی مثال زندہ رکھنے کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہو۔'' (غلام جیلانی برق، یورپ پر مسلمانوں کے احسان: ص ۷۵۔۸۰)

اندلس کے اس قسم کے حالات میں جب طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر اور ان کے بعد عبدالرحمٰن الداخل اندلس میں آئے تو انھوں نے روشنی کی رفتار سے وقت کے صحیفوں میں عزم و ہمت کی داستانیں لکھیں۔ مسلمانوں کی حکومت یورپ کی شب دیجور میں علم و فضل، معاشی اور اقتصادی ترقی کا دمکتا ہوا آفتاب ثابت ہوئی۔ اس ملک سے نہ صرف زمین پر بلکہ خلاؤں کی طرف سائنس کا یہ سفر ایسا ہے جس کی بنیادوں پر آج بھی قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ اور طلیطلہ کی یونیورسٹیوں کا رنگ بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

خلفائے اندلس نے نہ صرف علوم و فنون کو اندلس میں بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور مدارس کے ذریعے فروغ دیا بلکہ عوام الناس کی خوش حالی اور معاشی ترقی کے لیے صنعت و حرفت کی ترقی کی طرف بھی پوری توجہ دی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اندلس میں ریشم کا کیڑا بڑی کثرت سے پالا جاتا تھا اور پھر اس سے حاصل شدہ ریشم

سے اعلیٰ قسم کے کپڑے بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ ایس۔ پی اسکاٹ لکھتا ہے کہ کپڑا بننے میں مسلمانان اندلس کو دنیا میں کمال حاصل تھا اور اس زمانے میں کوئی قوم دنیا میں ان جیسا کپڑا نہیں بنا سکتی تھی۔ وہ نہایت اعلیٰ قسم کے رنگوں سے سوت رنگتے تھے جو خراب نہیں ہونے پاتا تھا۔ ابن حوقل کا بیان ہے کہ میں نے ساری دنیا میں اندلس کے کپڑوں جیسے کپڑے نہیں دیکھے اور نہ ایسے کاریگر ہی کہیں دیکھے۔ (اخبار الاندلس: ص ۲۴۵) اس زمانے میں ریشمی کپڑے بننے والے کارخانوں کی تعداد اندلس میں آٹھ سو تھی اور ان میں سے ہر کارخانے میں ہزاروں مزدور کام کر کے اچھی روزی کما کر اپنی زندگی کو خوش حال بنائے ہوئے تھے۔ اندلس کی چار کروڑ کی آبادی میں سے قریباً ایک کروڑ آدمی ریشمی کپڑا استعمال کرتے تھے جب کہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں یہ کپڑا صرف بادشاہ استعمال کرتے تھے۔ سوتی کپڑے کے کارخانے بھی چار ہزار سے زیادہ تھے۔ کپڑوں پر کڑھائی کا کام بھی بہت ہوتا تھا۔

لوہے کی صنعت بھی اندلس میں اپنے عروج پر تھی۔ آلات جنگ کی صنعت کو بھی بڑا فروغ حاصل ہوا تھا۔ اس زمانے کا سامان جنگ میں تلوار کی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس وجہ سے اندلس میں تلواریں بنانے کے بہت کارخانے تھے جو بڑی قیمتی اور عمدہ قسم کی تلواریں بناتے تھے۔ یہ تلواریں خوب دھاری دار ہوتیں اور ان پر سونے کے نقش ونگار بھی مزین کیے ہوتے۔ امراء کی تلواروں پر جواہرات لٹکتے ہوتے اور قرآنی آیات بھی کندہ ہوتیں۔

چین نے اگرچہ کاغذ ایجاد کیا تھا لیکن کاغذ کی صنعت کو فروغ اندلس نے دیا۔ اندلس کے شہر شاطبہ میں روزانہ کئی ہزار ٹن کاغذ تیار ہوتا تھا۔ شاطبہ کی قریباً نصف آبادی کا ذریعۂ روزگار کاغذ کی صنعت سے وابستہ تھا۔ حکومت اندلس چونکہ علم و ادب کی سرپرستی کرتی تھی اس لیے کاغذ کی سب سے بڑی خریدار خود حکومت تھی۔ مؤرخین کے مطابق شاطبہ کا بنا ہوا کاغذ موجود دور کے کاغذ سے کسی طرح کم نہیں ہوتا تھا۔ ملکی ضروریات کو پورا کر کے جو کاغذ بچ جاتا وہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں برآمد کر دیا جاتا۔ قرطبہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہاں بیس ہزار تاجر صرف کاغذ کی تجارت کرتے تھے۔

اندلس کے لوگوں نے روئی سے کاغذ بنایا اور چمڑے سے کپڑا بنایا۔ چمڑے سے کپڑا بنانے میں قرطبہ کو ایک خاص امتیاز حاصل تھا، کیونکہ یہ کپڑا کتابوں کی جلدوں کے کام آتا تھا اور اندلس میں دنیا کی سب سے بڑی حکومتی لائبریری اور لوگوں کی ذاتی لائبریریاں بھی تھیں۔ سقوط قرطبہ کے بعد یہ صنعت دم توڑ گئی۔ لوہے اور کپڑے کے علاوہ لکڑی کی صنعت کو بھی اندلس میں بڑا فروغ حاصل ہوا تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اندلس کے لوگوں نے اس صنعت کو اوج کمال تک پہنچایا۔ لکڑی سے مساجد اور گھروں کے دروازے، کھڑکیاں، تختے اور باریک جالیاں بنائی جاتی تھیں۔ لکڑی کے علاوہ ہاتھی دانت کی صنعت کو بھی اندلس میں بڑا فروغ ملا تھا۔ ہاتھی دانت پر بادشاہوں کے نام اور تصاویر کندہ کی جاتی تھیں۔ (لین پول، مسلمان اندلس میں: ص ۱۹۵)

جس زمانے میں یورپ کے دوسرے ممالک میں مٹی کے برتن بھی کہیں کہیں استعمال ہوتے تھے اس زمانے میں اندلس میں چینی اور شیشے کے بہت عمدہ قسم کے برتن بنتے تھے جو امیر و غریب دونوں استعمال کرتے تھے اور دوسرے ملکوں کو برآمد بھی کیے جاتے تھے۔ شیشے کے برتنوں کی صنعت کو دانیہ، غرناطہ، بطلہ اور طلیطلہ میں فروغ حاصل ہوا تھا۔ شیشہ اور لوہے کے برتن المیریہ میں بنتے تھے۔ ملاغہ میں ایک سو سے زائد صرف چینی کے برتن بنانے کے کارخانے تھے، برتنوں پر عجیب و غریب قسم کے بیل بوٹے بنائے جاتے تھے۔ بعض برتنوں میں سونے اور چاندی کی پتیاں بنی ہوتی تھیں۔ یہ برتن دنیا بھر کی منڈیوں میں بکتے تھے۔

اندلس کے لوگوں نے لوہے اور چاندی کی بھی دریافت کیں۔ علاوہ ازیں پارہ بھی نکلتا تھا اور وہ اسے مختلف دواؤں میں استعمال کرتے تھے۔ بعض کانوں سے یاقوت اور دوسرے قیمتی پتھر نکلتے اور سواحل اندلس کے قریب موتی اور مرجان بھی نکلتے تھے۔ وہاں کے لوگوں نے سونا، چاندی، لوہا، شیشہ، تانبا اور مختلف قسم کے قیمتی پتھر خوب نکالے جس سے ملکی معیشت کو خوب ترقی حاصل ہوئی۔ عوام کا معیار زندگی بلند ہوا۔ صرف پارے کی کانوں میں ایک ہزار سے زائد لوگ کام کرتے تھے۔ کانوں میں کام کرنے والے لوگوں کی اجرتیں دوسرے لوگوں سے زیادہ ہوتی تھیں۔ البتہ یہ ہے کہ اس وقت مزدوروں کی انجمنیں اور یونینز نہیں ہوتی تھیں اور نہ ہی وہ آج کل کی طرح ہڑتالیں کرتے تھے۔ وہ اپنی ساری توجہ کام پر مرکوز رکھتے تھے جس سے آجر اور اجیر، حکومت اور عوام دونوں کو فائدہ ہوتا تھا۔

لوہے کے بکس اور صندوق بنانے میں اندلس کے مسلمان ساری دنیا سے آگے تھے۔ ان کی صندوق سازی کی صنعت کو کئی سو سال بعد یورپ کے کاریگران صندوق ساز دیکھ کر حیرت زدہ اور انگشت بدنداں ہو گئے، اور اپنی ہزاروں کوششوں کے باوجود صندوق نہ بنا سکے۔ ان صندوقوں کے خانے کچھ اس قسم کے ہوتے تھے کہ چابی ہونے کے باوجود ایک ناواقف انسان انھیں کھول نہیں سکتا تھا۔ اور اگر کسی صندوق کی چابی گم ہو جاتی تو اسی کاریگر کو تلاش کرنا پڑتا جس نے وہ صندوق بنایا ہوتا۔

چٹائیاں ایک خاص قسم کی گھاس سے بنائی جاتی تھیں اور انھیں مساجد وغیرہ میں استعمال کیا جاتا۔ لوگ ان کو گھروں میں بھی استعمال کرتے، لیکن زیادہ تر لوگ قالین استعمال کرتے جن پر رنگ برنگے گل بوٹے ہوتے تھے۔

نمک ٹیکنالوجی کے ذریعے حاصل کیا جاتا لیکن ''سارا گوسہ'' کے پہاڑوں سے بھی سفید رنگ کا بہترین راک سالٹ حاصل کیا جاتا تھا۔

اندلس میں کچھ بڑے کارخانے ایسے تھے جنھیں ''دار الصناعہ'' کہتے تھے۔ ان کارخانوں میں تیر سے لے کر توپ تک ہر چیز بنتی تھی اور ان میں وقت کی جدید ترین ٹیکنالوجی سے کام کیا جاتا تھا۔

(غلام جیلانی برق، یورپ پر اسلام کے احسان: ص ۱۲۷)

اتنے بڑے بڑے کارخانے چلانے کے لیے انرجی کی ضرورت تھی اور بجلی اس زمانے میں ابھی دریافت نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ اندلس کے لوگوں نے بجلی کا کام پانی سے لے لیا۔ وہ دریاؤں پر عجیب قسم کے بند باندھ کر پانی کو اوپر لے جاتے اور پھر بہتے ہوئے پانی کی قوت اور شدت سے اپنے کارخانے چلاتے۔ قرطبہ کے اکثر کارخانے پانی ہی سے چلتے تھے۔ غرناطہ کی شہر پناہ کے اندر اور باہر ایک سو پن چکیاں چلتی تھیں۔

(لسان الدین ابن الخطیب، تاریخ غرناطہ: ص ۵۰)

اندلس کی زرعی ترقی:

مسلمانوں کے اندلس میں آنے سے پہلے اندلس دوسرے یورپی ملکوں کی طرح ایک غیر صنعتی اور غیر زرعی ملک تھا۔ زمین بالکل بنجر تھی اور زراعت کے قابل نہ تھی۔ یہاں کے باشندے وحشی قسم کے لوگ تھے۔ یہاں کے بادشاہ گوتھ لوگوں کو نہ ترقی کرنے دیتے تھے اور نہ ہی ان کی حکومتیں اس قابل تھیں کہ لوگوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے کے لیے ان کی کوئی مدد کریں۔ جس طرح یورپ کے دوسرے ملکوں کے لوگ غلیظ، غیر مہذب اور غیر متمدن تھے۔ نہ انھیں پہننے کا کوئی سلیقہ تھا اور نہ کھانے کا کوئی طریقہ۔ ان میں اور افریقہ کے وحشیوں میں کوئی فرق نہیں تھا بلکہ افریقہ کے وحشی کئی لحاظ سے ان سے بہتر تھے۔ مسلمانوں نے جونہی اندلس پر قبضہ کیا تو جہاں دیگر شعبہ ہائے زندگی میں ترقی کی وہاں زراعت اور باغبانی میں بھی انھوں نے اندلس کو جنت نظیر بنا دیا۔ اور کسی شاعر کا کشمیر کے بارے میں کہا گیا یہ شعر اندلس پر بھی راست آتا تھا ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

عربوں نے اپنی شبانہ روز محنت سے اندلس کی بنجر سرزمین کو جنت ارضی میں تبدیل کر دیا یعنی زمینوں کو سرسبز وشاداب کر دیا۔ جہاں پانی کم تھا وہاں کنویں کھود کر پانی کی کمی کو پورا کر دیا گیا۔ ایک ایک میل کے درمیان کئی کنویں کھودے گئے۔ پانی جمع کرنے اور ضرورت کے وقت اسے استعمال میں لانے کے لیے مناسب فاصلوں پر تالاب بنائے گئے۔ ان میں سے بعض تالاب تین تین میل لمبے اور پچاس فٹ تک گہرے ہوتے تھے۔ دور سے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تالاب نہیں بلکہ قدرتی جھیلیں ہیں۔

مختلف دریاؤں پر جہاں مناسب سمجھا گیا کئی بند باندھے گئے جو بہت اونچے اور نہایت مضبوط رہتے تھے۔ ایک بند کی لمبائی ۲۶۴ فٹ اور اونچائی باون فٹ تھی۔ ایک بند مرسیہ کے قریب دریائے ''صفورہ'' پر باندھا گیا۔ کتابوں میں اس بند کی لمبائی ۷۶۰ اور اونچائی ۳۶ فٹ بتائی جاتی ہے۔ پھر کچھ نہریں زیرزمین کھودی گئیں جنھیں ''آب دوز'' کہا جاتا تھا۔ ''المندورہ'' کے آب دوز کی لمبائی پانچ سو فٹ اور قطر چھ فٹ تھا۔ مرادیلا کا زیرزمین تالاب ایک میل لمبا اور تین فٹ چوڑا تھا۔ ''کری کونٹ'' کے تالاب کی لمبائی ۵۵۹۵ فٹ تھی اور

چوڑائی تیس فٹ۔ ان زیر زمین نہروں کے ذریعے اندلس کے چپے چپے کو سیراب کیا گیا تھا۔

(ملاحظہ ہو رشید اختر ندوی، مسلمان اندلس میں: ص ۶۸۵)

پھر آج کل کی طرح پانی کی تقسیم غیر منصفانہ نہیں ہوتی تھی، آج تو معلوم نہیں پاکستان بننے کے بعد اخلاقی قدریں بالکل ہی بدل گئیں۔ غریب لوگوں کا اب اس پاکستان میں رہنا محال ہو گیا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے کہا تھا کہ پاکستان میں غریب کوئی نہیں رہے گا۔ غریبوں نے سمجھا کہ شاید ہم امیر ہو جائیں گے لیکن اصل بات یہ تھی کہ غریبوں کو بالکل ختم کر دیا جائے گا۔ چنانچہ غریب کا ہر طرف سے ناطقہ بند کیا جا رہا ہے۔ ہر چیز کی قیمت غریب کی قوت خرید سے بہت اونچی ہو گئی ہے لہٰذا غریب کے لیے اب دو کام ہی رہ گئے ہیں یا تو ڈاکے ڈالے اور یا پھر بھوکا مر جائے۔ کھانے پینے کی چیزیں اس کی پہنچ سے اونچی ہو گئی ہیں۔ اب تو غریب آدمی کو بڑا جاگیردار نہری پانی بھی نہیں لینے دیتا، لیکن اس زمانے میں پانی کی تقسیم حکومت کا دیانت دار عملہ کرتا تھا۔ پانی کی تقسیم میں اگر کبھی کوئی تنازعہ پیدا ہوتا تو اس کو کاشتکاروں کی پنچایت حل کرتی اور اس کا اجلاس ہر جمعرات کو مجلس کے دروازے پر ہوتا تھا۔ حکومت ان پنچایتوں کے فیصلوں کا احترام کرتی تھی۔ زمین کی پیداوار کے لیے قدرتی کھاد کا انتظام بھی ہر علاقے میں موجود تھا کیونکہ زمین کی پیداوار بڑھانے کے لیے کھاد کا استعمال نہایت ضروری ہوتا ہے۔ حکومت نے ہر بستی کے باہر بڑے گڑھے کھودے ہوئے تھے جن کی شکل تالابوں جیسی تھی۔ جن میں جانوروں کا گوبر، کوڑا کرکٹ اور ہر وہ چیز جو کھاد کے کام آتی ہے، جمع کی جاتی۔ جب وہ گڑھا بھر جاتا تو وہ پھر کاشت کاروں میں ان کی زمینوں کے حساب سے تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

فصل اگنے پر کیڑے مکوڑے بھی اس گندگی میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کو مارا نہ جائے تو وہ اچھی خاصی فصل کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس جدید دور میں فصلوں پر کیڑے مار دوائیں سپرے کی جاتی ہیں۔ اب تو کیڑوں کی بھی بہت سی قسمیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس زمانے میں اتنے کیڑے مکوڑے نہیں ہوتے تھے، لیکن پھر بھی اندلس کے کاشت کار فصلوں اور پھلوں کو تباہ و برباد کرنے والے کیڑوں کو مارنے کا طریقہ بھی جانتے تھے۔ ان کے ہاں ایسی دوائیں استعمال ہوتی تھیں جو ان نقصان پہنچانے والے کیڑوں کے لیے زہر کا حکم رکھتی تھیں۔

اندلس کے لوگوں کے لیے اس غیر مہذب ماحول اور غیر متمدن دور میں جدید ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے دیہات میں شام کے وقت کلاسیں ہوتی تھیں جہاں کاشت کاروں کو کاشت کاری کے جدید طریقے سکھائے جاتے تھے۔ انھوں پودوں کے خواص، ان کی دیکھ بھال، ان کی گوڈی اور پیداوار کو بڑھانے کے مختلف طریقے سکھائے جاتے تھے۔ ہر کاشت کار ان کلاسوں کے باعث اپنے فن میں بڑا ماہر ہوتا تھا اور پودوں کی اور مختلف کیڑوں کی جان پہچان کے ساتھ ساتھ ان کے مناسب علاج سے بھی بخوبی آشنا ہوتا تھا۔ جس کا نتیجہ پیداوار کا وافر مقدار میں پیدا ہونا تھا۔ اندلس کے ہر بڑے شہر میں زراعتی کالج اپنی وسیع تجربہ گاہوں اور کتب خانے کے

ساتھ موجود تھے جنھوں نے زراعت کو بہت ترقی دی۔ مسلمانوں کے دو سو سالہ دور اندلس میں غلے کے ایسے ذخیرے دریافت ہوئے جہاں غلہ اپنی اصلی اور تازہ حالت میں موجود رہتا تھا، اس گندم کی تیار کی ہوئی روٹی بالکل تازہ گندم سے تیار کی ہوئی روٹی کی مانند ہوتی تھی۔ ان اقدامات سے معلوم ہوتا ہے کہ زرعی ٹیکنالوجی میں وہ لوگ کس قدر آگے نکل چکے تھے۔ (ثروت صولت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ: ۳۲۹/۱)

اسی طرح اندلس کے لوگ کوئی ایسی ٹیکنالوجی استعمال کرتے جس سے وہ گندم کی طرح پھلوں کے ذخیروں کو بھی محفوظ کر لیتے جو غیر موسم میں ان کے کام آتے۔ اور تازہ پھلوں اور ذخیروں میں محفوظ کیے گئے پھلوں میں امتیاز کرنا مشکل ہوتا تھا۔ نہ کوئی ذائقے میں فرق اور نہ شکل وصورت میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی تھی۔

عرب باشندے گرم ملکوں کے رہنے والے تھے اور اندلس ایک ٹھنڈا ملک تھا جہاں برف باری بھی ہوتی تھی۔ لیکن اس ملک میں بھی عربوں نے لیموں، شہتوت، انار، کیلا، پستہ، بادام، کھجور، چاول، پالک، زعفران اور سیاہ مرچ وغیرہ اگائیں۔ رشید اختر ندوی وغیرہ نے لکھا ہے کہ شکر عربوں کی ایجاد ہے۔ اندلس میں انگور کی فصل کو کافی ترقی دی گئی۔ ایک ناشپاتی ڈیڑھ کلووزن کی ہوتی تھی۔ سیب اور خربوزے کا بھی یہی حال تھا۔ زیتون کی پیداوار کا تو کہنا ہی کیا۔ زیتون کے بڑے بڑے باغات تھے اور آج بھی عربوں کی یہ یادگار زیتون اسپین کے ہزاروں مربع میل پر مشتمل رقبے میں ہر سال ہوتی ہے۔ اندلس کی اسی زرعی ترقی کو دیکھ لسان الدین ابن الخطیب نے اپنی تالیف تاریخ غرناطہ میں نہایت خوبصورت الفاظ میں غرناطہ کی خوب صورتی اور دل کشی کو بیان کیا ہے:

''غرناطہ کا شہر بڑے شاہی باغوں اور گھنے درختوں میں گھرا ہوا ہے۔ ہر طرف باغ ہی باغ ہیں۔ گویا وہ کسی حسین کا چہرہ ہے اور باغ اس کے رخسار اور اس کی وادی کسی نازک کلائی کی مانند ہے۔ شہر کے اطراف میں کوئی جگہ انگوروں کی بیلوں سے خالی نہیں۔ شہر کا نشیبی حصہ اس قدر سرسبز ہے کہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ شاہی باغات ایک سو کی تعداد میں ہیں اور اپنے خوب صورت منظر، سرسبزی، سیرابی، زمین کی عمدگی اور درختوں کی کثرت کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ وادی سنجل پر نظر نہیں ٹکتی اور زبان اس کی تعریف سے قاصر ہے۔ اس کی نہریں ہر وقت لہریں پیدا کرتی رہتی ہیں۔ جب ان میں درختوں کا عکس اور بلند مقامات کی روشنی پڑتی ہے تو ان میں باغوں کی تصویر اتر آتی ہے۔ ان باغوں میں ایسے درخت بھی ہیں جو بار بار پھل لاتے ہیں۔ وادیٔ غرناطہ کے پانی کا بہاؤ ایسی ریت پر ہے جو زراعت کے لیے اکسیر ہے۔ اس پر درختوں کی چھاؤں ہمیشہ رہتی ہے۔ اہل شہر ان باغات میں فراغت کے لمحات گزار کر لطف اور لذت حاصل کرتے ہیں۔ جب باد نسیم چلتی ہے تو غرناطہ کے اشتیاق میں سوزش قلب اور شوق دید پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہ خلا ہے جس میں حسن رچ بس گیا ہے۔''

(تاریخ غرناطہ: ص ۳۸)

یہ تو صرف اندلس کے ایک شہر کا نقشہ پیش کیا گیا ہے وگرنہ اندلس کا ہر شہر اس طرح خوبصورت اور حسین تھا جس کے حسن و جمال میں فرماں روایانِ اندلس کا بڑا عمل دخل تھا۔ اس کے مقابلے میں یورپ کے دوسرے ملکوں کا جو نقشہ مؤرخین نے پیش کیا وہ نہایت بدصورت اور قبیح ہے، خصوصی طور پر انگلستان کے گلی کوچوں میں غلاظت کے ڈھیر پڑے ہوتے تھے۔ اندلس میں حکمرانوں کی تاریخ پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جونہی عبدالرحمٰن الداخل نے اندلس کو فتح کیا تو اس کی زندگی کا بیشتر حصہ بغاوتوں کے فرو کرنے اور عیسائیوں کے حملوں کا دفاع کرنے میں گزر گیا۔ اسی طرح بنو امیہ کے دوسرے خلفاء اور ان کے بعد طوائف الملوکی کے دور میں مسلمان حکمران یا تو آپس کی خانہ جنگیوں میں مصروف رہے یا پھر عیسائیوں کا مقابلہ کرتے رہے، لیکن اس تمام عرصے میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی رفاہ عامہ کے کاموں سے غافل نہیں ہوئے کیونکہ عوام کو صرف اس بات سے دل چسپی ہوتی ہے کہ حکمرانوں نے ان کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کیا کام کیے ہیں انھیں کون سی سہولتیں اور آسائشیں بہم پہنچائی ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں سے قبل کے حکمرانوں کو اس قسم کے کام کرتے نہیں دیکھا اور نہ ہی ہمسایہ یورپی ممالک میں عوام کو یہ سہولتیں میسر تھیں جو اندلس کے عوام کو حاصل تھیں۔ اندلسی باشندوں کو زندگی کی بیشتر سہولتیں میسر تھیں۔ اس زمانے میں اندلس میں اسی (۸۰) بڑے شہر تھے اور تین چھوٹے شہر تھے۔ صرف ایک دریا کے کنارے بارہ سو گاؤں آباد تھے۔ بعض مؤرخین کے نزدیک اس وقت دنیا کی دو تہائی دولت اندلس کے ایک ملین افراد کے پاس تھی۔ اندلس کی اس وقت کل آبادی بعض مؤرخین کے نزدیک چار کروڑ تھی۔ خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر اندلس کا بڑے جاہ و جلال کا حامل فرمان روا تھا۔ وہ نہایت ذہین اور مدبر انسان تھا۔ امور سلطنت میں وہ خاص طور پر دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ خود عوام سے ملتا اور ان کے مسائل سنتا تھا۔ اس نے کاشت کاروں کو ہر قسم کے ٹیکس معاف کر دیے۔ آب پاشی اور زمینوں کی زرخیزی کے لیے اس نے سارے ملک میں نہروں کے جال بچھا دیے۔ ہر کاشت کار کو اس کی ضرورت کے مطابق نہر کا پانی ملتا تھا۔ جس جس علاقے سے وہ نہر گزرتی نہر کے اس ٹکڑے کا انتظام بجائے سرکاری کارندوں کے اس نے مقامی لوگوں کے سپرد کر دیا۔ جہاں نہر نہیں جا سکتی تھی وہاں اس نے پانی کے پائپ بچھا دیے تاکہ لوگوں کو آب پاشی میں تکلیف نہ ہو۔ تجارت کے فروغ کے لیے اس نے ایک بحری بیڑہ بنایا جس میں تاجر لوگ پوری دنیا کا سفر کرتے اور اپنے مال کی کھپت کے لیے دوسرے ملکوں کے تاجروں سے تجارتی تعلقات قائم کرتے۔ پورے اندلس میں عبدالرحمٰن الناصر نے میونسپل کمیٹیوں کے نظام کو روشناس (Introduce) کرایا جس کی وجہ سے شہر کے ہر گلی کوچے میں فرش لگے ہوئے تھے۔ نالے ڈھکے ہوئے تھے۔ گلی کوچوں میں صفائی کا معقول انتظام تھا اور رات کو جب گلیوں اور سڑکوں پر بتیاں جلتیں تو تمام شہر بقعہ نور بن جاتا۔ شہروں میں ٹریفک کو کنٹرول کرنے والی پولیس کا بھی انتظام تھا جو ٹریفک کو کنٹرول کرتی۔ ڈاک کے انتظام کے لیے انتہائی تیز رفتار گھوڑے تھے۔ ملک میں کوئی شخصیت بے روزگار اور بیکار نہیں تھا۔ ہر شخص کو اس کی اہلیت کے مطابق روزگار میسر تھا۔ اس کے مقابلے میں

یورپ کے دوسرے ملکوں کی حالت نہایت ابتر تھی۔ سڑکوں پر سوّروں کے ریوڑ دلدلوں میں پھنسے رہتے اور لوگوں کا سڑکوں پر سے گزرنا محال اور مشکل ہوتا۔

اندلس میں لوگوں کو روزگار مہیا کرنے کے لیے عمارتیں بنتی رہتی تھیں۔ نئے نئے پل بنتے، نہریں کھدتیں۔ قرطبہ کا شہر تمام شہروں میں دلہن کا مقام رکھتا تھا۔ ایک لاکھ تیرہ ہزار اعلیٰ درجہ کے پکے مکانات تھے۔ ساری سڑکیں پتھروں کی بنی ہوئی تھیں۔ اسی ہزار چار سو دوکانیں، سات سو مسجدیں، نو سو غسل کرنے کا حمام اور چار ہزار تین سو گودام صرف قرطبہ شہر میں تھے۔ اس زمانے کے مطابق شہر کے گرد ایک مضبوط شہر پناہ تھی۔ اڑھائی فرسنگ سے ایک پائپ لائن شہر میں لائی گئی تھی جو شہر کو پانی مہیا کرتی تھی۔ گھروں اور چوکوں میں فوارے لگے ہوئے تھے اور بڑے چوکوں میں تالاب بھی بنائے گئے۔

شاہی محلات دریائے وادی کبیر کے دوسری طرف تھے۔ ان محلات میں جانے کے لیے دریا کے پل سے گزرنا پڑتا تھا۔ شہر میں کوئی بھکاری نہیں تھا۔ شہر کے گردونواح میں سات کالونیاں تھیں۔ ہر طرف نہریں بہہ رہی تھیں اور نہروں کے کناروں پر پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ نہروں کا بہتا پانی اور پھولوں کی عطر بیز مہک اور چمن زاروں کا حسن آدمی کو فرحت بخشتا۔

ملک میں ہر شہری کے لیے مفت تعلیم کا انتظام تھا۔ کتابوں کی نشر و اشاعت حکومت کے ذمے تھی۔ اہل علم و فضل کو بڑے بڑے انعامات، وظائف اور مشاہرے ملتے تھے۔ علوم وفنون کے ماہرین کو کتب خانوں اور لیبارٹریز کے لیے حکومت کی طرف سے بڑی سہولتیں مہیا تھیں، الحکم کے دور خلافت میں اندلس کا ہر محدث، مفسر، فقیہ، فلسفی، سائنس دان، عالم اور شاعر خزانے سے وظیفہ حاصل کرتا۔ الحکم نے ہر بستی، گاؤں اور قصبے میں درسگاہیں اور مدارس کھول دیے اور مختلف مقاصد کے لیے عمارتیں بنوائیں۔ لیون کی فتح کے بعد المنصور جب قرطبہ واپس آیا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے شہریوں میں مال بانٹا، بہت سی عمارتیں اور مسجدیں بنوائیں، جامع مسجد کی بنیاد رکھی، دریائے وادی کبیر پر ایک نیا پل تعمیر کرایا جس پر ایک لاکھ چالیس ہزار دینار خرچ ہوئے۔ المنصور رات کو بہت کم سوتا تھا۔ زیادہ تر رات وقت قرطبہ کا گشت لگایا کرتا اور مختلف جرائم کی ٹوہ لگانے کے ساتھ ساتھ قرطبہ کے لوگوں کے حالات سے بھی آگاہی حاصل کرتا۔

اندلس یورپ میں واقع تھا۔ وہاں گرمیوں میں بھی اتنی سردی ہوتی تھی کہ آدمی گرمیوں میں بھی ٹھنڈے پانی سے غسل نہیں کر سکتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے یورپ کے لوگ کئی کئی مہینوں بلکہ بعض پادری کئی کئی سال تک غسل نہیں کرتے تھے۔ رہبانیت کے جنون میں ویسے بھی انھیں غلیظ رہنا پسند تھا بلکہ وہ اس کو ایک مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ تاریخ اخلاق یورپ میں لیکی نے اس کی تفصیل دی ہے۔ وہ لوگ جسم کی طہارت کو روح کی پاکیزگی کے منافی سمجھتے تھے اور جو زُہاد اور رہبان مرتبۂ زہد و رہبانیت میں جتنی زیادہ ترقی کرتے جاتے تھے اسی قدر وہ غلاظت اور عفونت کا مجسمہ ہوتے۔ سینٹ اتھینیس نہایت فخر سے بیان کرتا تھا کہ سینٹ انتھونی بایں

کبرسنی پوری زندگی کبھی اپنے پاؤں دھونے کے عصیان کا مرتکب نہیں ہوا۔ سینٹ ابراہام نے اپنی پچاس سالہ مسیحی زندگی میں اپنے چہرے یا پاؤں پر پانی کی چھینٹ نہ پڑنے دی۔ راہب الیگزینڈر بڑے تاسف اور تحیر سے کہتا تھا کہ ایک زمانہ وہ تھا جب ہمارے اسلاف منہ دھونا حرام سمجھتے تھے اور ایک ہم لوگ ہیں کہ حمام جایا کرتے ہیں۔ اسلام میں غلیظ رہنا تو ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ اس لیے پانچ وقتہ نماز میں وضو کو فرض قرار دیا گیا۔ چنانچہ اندلس پر مسلمانوں کے قبضہ کرنے سے پہلے وہاں حمام نہیں تھے۔ مسلمانوں نے قبضہ کرنے کے ساتھ ہی اندلس میں گرم پانی کے حمام تعمیر کیے۔ یہ حمام نہ صرف شہروں میں بلکہ دیہاتوں میں بھی قائم کیے گئے تھے۔ قرطبہ جو ایک ملین آبادی کا شہر تھا یہاں تین سو حمام عبدالرحمٰن الناصر کے وقت اور المنصور کے وقت چھ سو حمام موجود تھے۔

اندلس نے دسویں سے بارھویں صدی عیسوی کے درمیان طب میں بھی قابل قدر ترقی کی۔ اموی دور خلافت میں صرف قرطبہ میں پچاس کے قریب ہسپتال تھے۔ عبدالرحمٰن الثانی کے زمانے میں تربیت یافتہ طبیبوں نے قرطبہ میں ''کلیۃ الطب'' (طبی کالج) کھولا۔ چنانچہ اس طبی کلیہ (Medical College) نے اندلس کو بہت سے سرجن اور فزیشن مہیا کیے۔ (امام الدین، مسلم سپین: ص۱۰۲) اس کے مقابلہ میں یورپ کے دوسرے ممالک میں نہ تو کوئی ہسپتال تھا اور نہ ہی کوئی مستند طبیب اور ڈاکٹر تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی تک مشرق اور مغرب میں اسلامی طب اپنی ترقی کے اتنے مدارج طے کر چکی تھی کہ مسلمان ان فرنگی ڈاکٹروں کی فنی قابلیت کا مضحکہ اڑاتے تھے جو صلیبی جنگوں میں عیسائی فوج کے ساتھ فلسطین جاتے تھے۔ ڈاکٹر ایڈورڈ براؤن نے اپنی کتاب عریبین میڈیسن (Arabian Medicine) میں اس بارے میں کئی لطیفے لکھے ہیں۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۶۸ تا ۷۳) لکھا ہے کہ ایک مسلمان اسامہ لبنان میں فرنگیوں کے قبضے میں ایک قلعہ منیطیرا کے باہر ڈیرا لگائے ہوئے تھا کہ وہاں کے قلعہ دار نے اسامہ کے چچا سے درخواست کی کہ کوئی طبیب قلعے میں بھیجا جائے۔ اس نے ثابت نامی اپنا عیسائی طبیب قلعے میں بھجوا دیا۔ دس روز کے بعد وہ عیسائی طبیب ثابت واپس آ گیا تو اس کو علاج کی جلد کامیابی پر مبارک باد دی گئی۔ ثابت نے کہا کہ مبارک بادی کا کوئی موقع نہیں۔ میں جو قلعہ میں پہنچا تو وہاں دو مریض تھے۔ ایک مرد جس کی ٹانگ میں ناسور تھا اور دوسری عورت تھی جو تپ دق میں مبتلا تھی۔ میں نے مریض کا پولٹس وغیرہ سے اور مریضہ کا مناسب دوا سے علاج شروع کیا۔ دونوں کی حالت روبصحت ہو رہی تھی کہ ایک افرنگی ڈاکٹر بھی وہاں تشریف لے آئے اور کہا کہ اس طبیب کا یہ علاج بالکل بیکار ہے۔ وہ ڈاکٹر مرد سے کہنے لگا: ''تم ایک ٹانگ کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہو یا دونوں ٹانگوں کے ساتھ قبر میں جانا چاہتے ہو؟'' مریض کا جواب یہی ہونا چاہیے تھا کہ میں ایک ٹانگ کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اس انگریز ڈاکٹر نے ایک طاقت ور اور مضبوط سپاہی کو بلوایا جس کے پاس ایک تبر (ٹوکا) تھا۔ اس نے کہا کہ مریض کی ناسور والی ٹانگ کو ایک ضرب سے کاٹ دو۔ اس کی ایک ضرب سے ٹانگ نہ کٹی۔ جب دوسرے ضرب لگائی تو گودا ہڈی میں کچلا گیا اور مریض کی روح بہت جلد ہی ڈاکٹر

صاحب کو دعائیں دیتی ہوئی قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اب ڈاکٹر صاحب مریضہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ اس پر ایک بھوت سوار ہے جو اس کے سر میں رہتا ہے۔ چنانچہ اس کا سر استرے سے رگڑوا دیا گیا اور اس کو وہی معمولی غذا پیاز اور تیل وغیرہ دی جانے لگی۔ اس کی حالت بد سے بدتر ہوگئی تو ڈاکٹر صاحب نے صلیب کی شکل کا ایک گہرا نشان اس کے سر پر بنایا۔ یہ نشان اتنا گہرا تھا کہ سر کی ہڈی نظر آنے لگی۔ پھر اس زخم میں نمک بھر کر خوب رگڑا اور وہ عورت بھی پہلے مریض کے پاس پہنچ گئی۔ اسامہ نے یہ حقیقت سنانے کے بعد قلعہ دار سے پوچھا: ''کیا میری خدمات کی اب بھی ضرورت ہے؟'' اس نے کہا: ''نہیں'' میں اس لیے وہاں سے لوٹ آیا ہوں کہ مجھے فرنگی طبابت کا بہت اچھا علم ہوگیا ہے۔ جس کے بارے میں میں پہلے نہیں جانتا تھا۔

صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں یعنی بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں اسلامی طبابت بہت ترقی کر چکی تھی اور مسلمان طبیبوں نے اس فن پر بہترین کتابیں لکھی تھیں۔ انھوں نے لوگوں کے حیرت انگیز علاج کر کے اپنے فنِ مسیحائی کا ثبوت دیا تھا۔ اس سے بہت پہلے بھی مشرق و مغرب کے اسلامی ممالک میں بہت سے ہسپتال موجود تھے اور سرجن اور فزیشن اعلیٰ پیمانے پر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ چنانچہ ایک مستشرق بولس (Bolus) لکھتا ہے: ''عام طور پر مسلمان اپنے بیماروں کی تیمارداری کے لیے مشہور تھے۔ بہت قدیم زمانے یعنی ۹۸۰ء میں بغداد میں ایک ہسپتال موجود تھا جو ایک عالی شان محل تھا، اس میں کئی وارڈ تھے۔ ہفتے میں دو دفعہ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ خود آ کر مریضوں کا معائنہ کرتا تھا۔ مریضوں کو دوائیں اور کھانے کی اشیاء مفت ملتی تھیں۔ جو میڈیکل کالج اس ہسپتال سے متعلق تھا وہ کئی صدیوں تک سرسبز اور آباد رہا۔

(Bolus: The Influence of Islam, P;169)

اندلس کی سرزمین میں اسلامی حکومت قائم تھی۔ اگرچہ اندلس یورپ کا ایک حصہ ہے لیکن اس اسلامی یورپ اور باقی کے عیسائی یورپ کے تعلقات آپس میں ہمیشہ کشیدہ رہے۔ اندلس کا ذرہ ذرہ یورپ کی تاریک خاک کے لیے اس زمانے میں مہر درخشندہ کی طرح تھا۔ اپنے علم و فن کا زیادہ حصہ یورپ نے یہیں کی یونیورسٹیوں سے حاصل کیا۔ لیکن سقوط غرناطہ کے بعد تو وہ بد بخت ان تمام آثار کو جن میں اسلامی جھلک نظر آتی تھی، برباد اور ناپید کرنے کے درپے ہو گئے۔ حکم یہ دیا گیا کہ تمام مسلمان جزیرہ نمائے اندلس سے جبراً نکال دیے جائیں، اور جو اندلس میں رہنا چاہیں وہ عیسائی ہو جائیں۔ وہ صرف عیسائی ہونے کی حالت میں یہاں رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ سنہ ۱۸۳۳ء میں آخری مرتبہ کوئی دو لاکھ مسلمان اسپین سے نکالے گئے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ ایسا ہی کام ہو چکا تھا۔ ان میں مسلمان بھی تھے جو کسی طرح سے تبدیل مذہب پر راضی نہیں ہوتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جنھوں نے مذہب تبدیل کر لیا لیکن عیسائی حکومت نے اس کو نہ مانا اس لیے انھیں ملک بدر کر دیا گیا۔ (Campbel: Arabian medicine, P.198)

کانسٹنٹائین کو عربی علوم اپنے نام پر شائع کرنے کا بڑا ملکہ حاصل تھا۔ یہ بات بہت عرصے کے بعد جا

کر معلوم ہوئی جب کہ اصل عربی کتابیں یورپی مصنفین کے ہاتھوں میں پہنچیں۔ اگرچہ یورپ کے اطباء زبان سے اقرار نہ کریں لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ یورپ کی طب، اسلامی طب کی کس قدر زیر احسان ہے۔ اندلس میں اس کا پودا لگا۔ بڑھا پھولا اور پھر اس کی خوشبو پورے یورپ میں پھیل گئی۔ سالرنو (Salerno) نے جو کچھ سیکھا وہ اسلامی طب سے سیکھا۔ اس کے مکتب میں بڑے بڑے استاد یکے بعد دیگرے کام کرتے رہے۔ یہ یورپ میں پہلا سکول تھا جس کے فارغ التحصیل طلباء کو سندات دی جاتی تھیں۔ مونٹ پلییئر (Mountpellicr) بھی سالرنو کا حریف تھا۔ یہاں پہلے فلسفہ پڑھایا جاتا تھا اس کے بعد طب پڑھائی جاتی تھی۔ پھر باقاعدہ امتحان لے کر سند دی جاتی تھی۔ کانسٹنٹائین علم سیکھنے کے لیے طیطلہ گیا۔ وہاں رہ کر اس نے عربی سیکھی اور پھر واپس آ کر ریمز (Rheims) میں پروفیسر بن گیا اور جو حکمت اور سائنس کے علوم اس نے اندلس میں سیکھے تھے ان کی اپنے نام سے نشر و اشاعت کرتا رہا۔ فرانس اور جرمنی کے گرجاؤں میں اس کے نشر کردہ علوم احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ شمالی یورپ میں جدید سائنٹیفک علوم حاصل کرنے کی جو تحریک گیارھویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئی تھی اس کے لیے گربرٹ نے راستہ صاف کر دیا۔ گربرٹ طب میں بہت دخل رکھتا تھا اور وہ ریاضی، ہیئت اور حکمت کا بڑا عالم تھا۔ یہ علوم اس نے اندلس سے حاصل کیے تھے۔ گویا اس نے اسلامی علوم کو جرمنی اور فرانس میں رائج کیا۔ عربی علوم کے تراجم کا عہد بارھویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی ابتداء آرچ بشپ رے منڈ (Raymand) نے کی۔ سنہ ۱۰۸۵ء میں اسلام کی یورپ میں سب سے بڑی درس گاہ ٹولیڈو جو اندلس میں ہے، عیسائیوں کے ہاتھ آئی۔ اب یورپ کے لاطینی ممالک سے طلباء یہاں آنے شروع ہوئے۔ وہ اسلامی تمدن کی تعریف میں رطب اللسان تھے اور عربی علوم کی تحصیل ان کا مقصدِ حیات تھا۔ اس دور میں اندلس کے یہودی جو پہلے مسلمانوں کے ماتحت تھے، بہت مفید ثابت ہوئے۔ پہلے تو وہ لاطینی طلباء کے لیے مترجم کا کام دیتے تھے۔ پھر انھوں نے عربی تصانیف کے خود تراجم کیے۔ سب سے پہلا افرنگی جو ٹولیڈو میں آیا اور جس نے بعد میں بڑی شہرت حاصل کی، وہ ایک انگریز فلسفی اور ریاضی دان باتھ (Bath) کا رہنے والا ایڈے لارڈ (Adelard) تھا، اس کے علاوہ اندلس کا ایک یہودی پیٹرس (Petrus) جو عیسائی ہو گیا تھا، انگلستان گیا اور وہاں کے بادشاہ ہنری اول کا شاہی طبیب بن گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ وہاں پر عربی علوم کو رواج دیا۔ ان دونوں فاضلوں نے بارھویں صدی کے نصف آخر میں سائنس کی بہت سی عربی کتابوں کے تراجم لاطینی زبان میں کیے۔

اندلس کے علاوہ سسلی سے بھی اسلامی علوم یورپ میں داخل ہوئے۔ اس جزیرے میں مسلمانوں نے ۱۳۰ سال حکومت کی اور آخر کار سنہ ۱۰۹۱ء میں نارمن لوگوں نے اسے مسلمانوں سے چھین کر لیا۔ اس جزیرے کے لوگ ایک طویل عرصے تک یونانی، عربی اور لاطینی تینوں زبانوں کو بطور مادری زبان استعمال کرتے رہے۔ بعض علماء خاص طور پر یہودی ان زبانوں کی طرز نوشت و خواند سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ جب یہ جزیرہ

عیسائیوں کے قبضے میں آیا تو انھیں اسلامی علوم کو عربی سے ترجمہ کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ مختلف بادشاہوں نے اس کام کی سرپرستی کی اور بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ ٹولیڈو کی طرح یہاں بھی مترجمین کی ایک جماعت بنائی گئی جو عربی اور یونانی سے کتابوں کا ترجمہ لاطینی میں کیا کرتی تھی۔

گیرارڈ اٹلی کے شہر کریمونا میں سنہ ۱۱۱۴ء میں پیدا ہوا۔ وہ اندلس اس لیے آیا تھا کہ یونانی فاضل بطلیموس کی کتاب المجسطی کی تلاش کرے جو عربی ترجمے میں موجود تھی۔ اس تلاش میں وہ ٹولیڈو پہنچا اور اس کتاب کا ترجمہ اس نے ۱۱۷۵ء میں کیا اور جلد ہی وہ عربی سے ترجمہ کرنے والوں میں سب سے زیادہ مشہور ہو گیا۔ اس نے اندلس کے عیسائیوں اور یہودیوں کی امداد سے قریباً اسی (۸۰) عربی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ ان ترجموں سے یورپ کے لیے عربی علوم کا دروازے کھل گئے۔ پھر اس کے کئی جانشین پیدا ہو گئے۔ گیرارڈ حقیقی معنوں میں عربی علوم وفنون پھیلانے میں سب سے بڑا آدمی ہے۔ طب میں اس نے بقراط اور جالینوس کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ جتنی کتابیں حنین نے عربی میں ترجمہ کی تھیں اس نے ان سب کو لاطینی میں منتقل کر دیا۔ کندی کی تصانیف، بوعلی سینا کی کتاب القانون، علم جراحی پر ابوالقاسم کی معروف کتاب التصریف کا ترجمہ کیا۔ اس نے ارسطو کی کتابوں کا بھی عربی سے ترجمہ کیا۔ الفارابی، الکندی، اسحٰق اسرائیلی اور ثابت کی تصانیف کو بھی لاطینی میں منتقل کیا۔

اندلس کے اسلامی ادبیات کا نمایاں اثر یورپ کی مختلف زبانوں کے ادبیات، طب اور سائنس پر ہوا۔ اس اثر کو قبول کرنے کے بعد ہی یورپ تجدید فراست کے قابل ہو سکا۔ اندلس میں مسلمانوں نے بہت سے مراکز قائم کیے تھے۔ اس ملک کو فتح کرنے کے بعد عیسائیوں نے بعض کو یونیورسٹی بنا دیا۔ اندلس کے شہر سول کو یونیورسٹی کی منظوری جولیئس ثانی نے سنہ ۱۵۰۵ء میں دی۔ یہاں پر عربی اور دیگر مشرقی زبانیں خاص طور پر پڑھائی جاتی تھیں۔ گیارہویں صدی کے آغاز میں قرطبہ کی اسلامی خلافت کا خاتمہ ہوا تو المرابطین اور پھر الموحدین کے شاہی خاندان یہاں حکومت کرتے رہے۔ آخر ۱۲۳۸ء میں عیسائیوں نے اسے فتح کرلیا۔ یہاں کے عیسائی باشندوں نے اس عرصے میں عربی رسم ورواج سیکھ لیے اور ان کی مادری زبان عربی ہو چکی تھی۔ اس لیے مجبوراً عیسائی بادشاہوں نے انجیل کا ترجمہ عربی میں کیا۔

یورپ نے جب اندلس، سسلی اور بغداد وغیرہ کی یونیورسٹیوں سے تمام تر اسلامی علوم وفنون کو حاصل کرلیا تو ان میں ایک نئی روح پیدا ہوگئی۔ یورپ کی تجدید فراست یا نہضت علمی (Renaissance) کا سبب بھی بڑی حد تک اسلام ہوا۔ چنانچہ ایک یورپی محقق نے لکھا ہے:

''اگر مغربی دنیا کو چین کی طرح سے بالکل الگ تھلگ رہنے دیا جاتا تو کچھ معلوم نہیں کہ کب تک یہ حالت قائم رہتی، لیکن خوش قسمتی سے یہ بے تعلق نہ رہ سکی۔ تیرھویں صدی عیسوی سے پہلے ہی اندلس میں عربی تمدن کے ترقی پذیر ہونے اور صلیبی جنگوں کی تحریک عظیم سے یورپ کا خمیر بننے کے لیے ایسا

ضامن لگا کہ اس دن سے آج تک اس نے اپنا کام موقوف نہیں کیا۔ پہلے تو عربی تراجم کی وساطت سے پھر اصل کتابوں کے مطالعہ سے یورپ کی مغربی اقوام قدیم فلسفیوں اور شاعروں کی تصنیفات سے اور ہوتے ہوتے عہد قدیم کی تمام وسیع ادبیات سے آشنا ہو گئیں۔''

(Huxly: Scince and Education, P.147)

یورپ کی اس نہضت علمی میں زیادہ حصہ اندلس کا ہے۔ اندلس چونکہ یورپ کا ایک حصہ ہے، اس لیے اسلامی یورپ کا اثر عیسائی یورپ پر بہت زیادہ ہوا۔ قربت، تعلقات، لگ لگاؤ، سہولتیں، ملتی جلتی عادتیں، آب و ہوا ان سب اسباب کی وجہ سے عیسائی مغرب نے بڑی سرعت سے علم حاصل کیا۔ تحصیل علم سے اس کی ذہنیت بدل گئی۔ وہ علم کے متلاشی بن گئے اور تجدید فراست کی ذہنیت ظہور میں آئی چنانچہ ایک مغربی دانشور لکھتا ہے:

''مغرب اسلامی (یعنی اندلس کی اسلامی سلطنت) کی فتوحات، شان و شوکت، سطوت و عظمت، فیروز مندی کو تاراج ہونے کے بعد کسی مرتبے کا نہ سمجھا جاتا اگر وہ یورپ کی زبان، ادب اور سائنس پر قابل قدر اثر پیدا نہ کرتا۔ عربی بولنے والوں نے علوم انسانی کی حدود کو وسیع کرنے کے لیے پر جوش جذبات کا اظہار کیا۔ اس عظیم الشان عہد میں جب کہ عربی مسائل (سائنسی، طبی اور فلسفیانہ) لاطینی مغرب میں داخل ہوئے، یورپ میں عموماً فراست انسانی کے نئے سرے سے پیدائش ہوئی۔ اندلس نے بھی جو اپنے اندرونی جھگڑوں میں مبتلا تھا، بہت سی یونیورسٹیوں کو بام عروج و ترقی پر پہنچایا جن کی بنا ان اسلامی مدارس میں رکھی گئی جو جزیرہ نمائے آئبیریا یعنی اندلس کے اسلامی عہد حکومت میں قائم کیے گئے تھے۔'' (Compbel: Arabian Medicine, P.197)

آخر میں ایک سوال کا جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب تمام علوم و فنون کی ابتدا اندلس (اسپین) سے ہوئی تو جرمنی، انگلستان اور فرانس وغیرہ ترقی کی دوڑ میں کیوں آگے نکل گئے اور اسپین کا ان کے مقابلے میں ہنوز روز اول کیوں معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجوہات تو کئی ہیں لیکن دو تین حسب ذیل ہیں۔ اندلس کے عیسائی فاتحین نے اندلس پر قبضہ کرنے کے بعد اکثر و بیشتر کتب خانے جو لاکھوں کتابوں پر مشتمل تھے، نذر آتش کر دیے اور تمام اسلامی آثار نابود اور ختم کرنے کی کوشش کی۔ اسلام سے نفرت تو پہلے ہی ان کے دلوں میں موجزن تھی، اب اس پر عمل بھی ہونے لگا۔ اندلس میں جو کتابیں جلنے سے بچیں وہ دوسرے ملکوں میں چلی گئیں، ان ممالک کی قوموں نے ان کتابوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ بعد میں اگر طلیطلہ میں دارالترجمہ قائم بھی ہوا تو اس وقت تک دوسری اقوام بہت آگے نکل چکی تھیں۔

اندلس کی حکومت نے اپنے وعدوں اور معاہدوں کے برخلاف مسلمان رعایا پر بہت مظالم کیے جس کے نتیجے میں ملک کی صنعت و حرفت تباہ و برباد ہو گئی کیونکہ تمام صنعتیں مسلمانوں کے ہاتھ میں تھیں۔ اس کے برعکس جب مسلمانوں نے اندلس فتح کیا تھا تو وہ رعایا سے بہت نرمی اور شفقت سے پیش آئے۔ انھوں نے

رعایا کو خوش حال رکھا تھا اسی لیے انھوں نے اندلس کے دشت وصحرا کو چمن وکشت زار بنا دیا تھا۔ عیسائی حکومت نے آخری زیادتی یہ کی کہ کوئی دو لاکھ انسان اسپین سے نکال دیے اور انھیں زبردستی افریقہ میں دھکیل دیا گیا کیونکہ حکومت نے یہ قانون بنایا تھا کہ اندلس میں صرف عیسائی رہ سکتے ہیں، مسلمان نہیں رہ سکتے۔ بعض مسلمان تو کسی صورت بھی تبدیلی مذہب پر تیار نہ تھے۔ بعض نے حالات کی مجبوریوں سے جن میں اکثر کئی کئی پشتوں سے مسلمان شدہ عیسائی تھے، اپنے عیسائی ہونے کا اعلان کر دیا، لیکن حکومت نے ان کے عیسائی ہونے کو تسلیم نہ کیا اور ان میں سے اکثر وبیشتر لوگوں کو ملک بدر کر کے افریقہ یا دوسرے ملکوں میں بھیج دیا۔ یہی لوگ اندلس کی ریڑھ کی ہڈی تھے۔ اعلیٰ کاریگر، فاضل علماء، ماہر سیاست دان ملک سے خارج کر دیے گئے۔ گویا اندلس کے عیسائیوں نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک اعلیٰ دماغوں اور بہترین ہنرمندوں سے یک قلم خالی ہو گیا۔ عیسائیوں کے اندلس پر قابض ہونے کے بعد اندلس میں ایسا دور آیا کہ مذہبی الجھنوں اور سیاسی کش مکشوں کا ہنگامہ گرم ہوا۔ اس وجہ سے کسی کو فرصت ہی نہ ملی کہ وہ علم وفضل کی طرف توجہ کرتا۔ علمی ترقی کے لیے پرسکون ماحول، تسکین ذہن واطمینان قلب، داخلی وخارجی سکون اور سیاسی اطمینان کا میسر آنا نہایت ضروری ہوتا ہے لیکن اندلس کے متعصب عیسائیوں نے ان سب چیزوں کو تباہ کر دیا۔ دنیا کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی قوم کو دوسرے افکار سے فراغت ہوتی تو وہ فرصت وآرام کے اوقات میں علمی ترقی کی طرف توجہ کیا کرتی تھی۔ یہ بات اندلس میں کئی سو سال تک پیدا نہ ہو سکی۔ ہر دماغی رفعت اور فراست کی پرواز کا مدار و انحصار کسی بھی قوم کی فطری اور جبلی صلاحیتوں پر موقوف ہے کہ آیا اس کا دماغ فطرۃً اس قابل ہے اور کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ اپنے حیوانی ارتقاء کی بہت سی منزلیں طے کر چکا ہے۔ اس بات میں تو کوئی شک وشبہ نہیں کہ آب وہوا، ماحول، قومی تاریخ، اجداد کی وراثت اور وقتی سہولتوں کا قومی ترقی پر بڑا اثر ہوتا ہے اور بدقسمتی سے موجودہ اسپین ان تمام شعبوں میں نسبتاً سب مغربی ممالک سے پیچھے ہے۔

اندلس میں علوم وفنون کی سرگرمیاں

اندلس میں اسلامی حکومت سنہ ۹۲ھ/ ۷۱۱ء میں قائم ہوئی۔ اسلامی حکومت قائم ہونے سے پہلے اندلس علمی لحاظ سے بالکل کورا تھا گویا اس کی علمی حیثیت وہی تھی جو یورپ کے دوسرے ملکوں کی تھی۔ وہاں علمی سرگرمیوں کی سرگزشت تاریخ کے اوراق میں کہیں نہیں ملتی بلکہ طبقات الامم کے مصنف نے لکھا ہے کہ ''مسلمانوں کی فتح سے قبل اندلس کی سرزمین علم سے خالی تھی۔ اہل اندلس میں کوئی معروف عالم نہیں ہوا۔'' (ص ۹۷) عبدالرحمٰن الداخل نے جب اندلس میں ایک خودمختار اسلامی حکومت قائم کی تو اس نے لوگوں میں علم وادب کا شوق پیدا کرنے کے لیے مشاعروں اور مناظروں کی مجالس کا اہتمام کیا۔ وہ خود بھی ان علمی مجالس میں شریک ہوتا اور جو لوگ ان مجالس میں اچھی کارکردگی دکھاتے ان کو انعام سے نوازا جاتا، لیکن تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ اندلس کی حقیقی ترقی کا آغاز عبدالرحمٰن الثانی کے عہد حکومت سے ہوا۔ اگرچہ وہ تعمیرات اور آرٹ میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ادبیات اور علوم عقلیہ سے بھی اس کو اچھی خاصی لگن تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے دربار میں مختلف اہل علم اور فضلاء وادباء کو جمع کیا۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے فضلاء، فقہاء، علما اور شعراء تھے جن میں عبدالملک بن خبیب، یحییٰ بن یحییٰ، ابن الماجشون اور محمد بن مزین جیسے محدثین وفقہاء اور تمام بن علقمہ جیسے اہل علم وفضل خاص طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ اندلس میں اس وقت کتابیں موجود نہیں تھیں اس وجہ سے عبدالرحمٰن الثانی نے کچھ ایسے لوگ مقرر کیے ہوئے تھے جو مشرقی ملکوں کا دورہ کرتے رہتے اور وہاں کی نایاب اور اعلیٰ کتب حاصل کر کے اندلس پہنچاتے۔ اس نے سائنس اور فلسفے کی وہ کتابیں جو یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوئی تھیں، عراق سے اندلس میں منگوائیں۔ چنانچہ اس کے عہد حکومت میں قرطبہ کی سرکاری لائبریری میں بے شمار کتابوں کا اضافہ ہوا اور اہل علم ودانش ان کتابوں سے پوری طرح مستفید ہونے لگے۔ اس زمانے میں دینی کتابوں کی طرف لوگوں کا زیادہ رجحان تھا۔ علوم عقلیہ کو اس دور حکومت میں زیادہ قبول عام حاصل نہ ہوا، لیکن عبدالرحمٰن الناصر نے جب زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اس کے دور حکومت میں حریت فکر کو فروغ حاصل ہوا اور لوگوں کی توجہ علوم عقلیہ کی طرف بھی مبذول ہوئی۔ اسی دور میں سائنس کے مختلف شعبوں میں تصنیف وتالیف کا آغاز ہوا۔ علم ہیئت، علم ریاضی، علم طب اور دوسرے کئی ایک علوم وفنون کے فاضل

بڑے بڑے علماء وفضلاء پیدا ہوئے۔ قسطنطنیہ کے حکمران نے سنہ ۳۳۷ھ میں دیسقوریدس کی کتاب الادویۃ المفردۃ کا یونانی متن خلیفۂ اندلس کو تحفے کے طور پر بھیجا اور خلیفہ کی خواہش پر اس کا سنہ ۳۴۰ھ میں عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ ابن القوطیہ نے افتتاح الاندلس کے نام سے عبدالرحمٰن الناصر کے عہد کے اوائل تک اسلامی اندلس کی ایک تاریخ لکھی۔ پھر احمد الرازی نے اندلس کی ایک تاریخ لکھی جس سے بعد میں المقری اور ابن الآبار نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ابن حسان نے اندلس کی دو تاریخیں لکھیں۔ ایک دس جلدوں میں اور دوسری ساٹھ جلدوں میں۔

اندلس کے دارالعلوم میں سب سے مشہور اور قابل طبیب ابوالقاسم تھا جو فن جراحی کا موجد تھا۔ اس نے اس فن میں ایک مبسوط کتاب ''التعریف لمن عجز عن التالیف'' لکھی۔ عبداللہ بن احمد بن علی البیطار اندلسی علم نباتات کا بہترین عالم اور زمرۂ اطباء میں اس خاص کام کا فرد یگانہ ماہر تھا۔ اس نے مشرقی ممالک کی سیاحت کی اور جڑی بوٹیوں کے بارے میں خود تحقیق کی اور ادویات مفردہ پر ایک بڑی جامع کتاب لکھی۔

اندلس میں علوم وفنون کی ترقی پر مزید کچھ لکھنے سے قبل یہ بات ذہن میں رہے کہ کچھ عرصہ قبل کمستن (Cumston) کی ایک کتاب طبع ہوئی ہے۔ یہ شخص جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں تاریخ طب اور فلسفہ کا پروفیسر تھا۔ چنانچہ کمستن لکھتا ہے:

''بہت عرصہ تک یہی بات حقیقت کے طور پر بتائی جاتی تھی کہ عرب تو یونانیوں کے غلامانہ نقال کے تھے بلکہ یہ بھی پروپیگنڈا کیا جاتا کہ انھوں نے علم طب کی ترقی میں روڑے اٹکائے۔ یہ بات غلط ہے۔ جس وقت عرب مشرق میں معرض وجود میں آئے یونانی طب پورے طور پر مٹ چکی تھی اور جادوگری کے عملیات کی چاروں طرف حکمرانی تھی۔ عربوں نے نہ صرف بغداد اور اندلس میں یونانی علوم کے خزانے کو ہمیشہ کی تباہی سے بچالیا جو ان کے بغیر ناپید ہو جاتا بلکہ یہ بھی کہ انھوں نے یونانی تصانیف کو ہر دل عزیز بنانے اور ان پر تنقید وتبصرہ کرنے سے مشرق اور مغرب دونوں (بغداد اور اندلس) میں سائنس کی تعلیم کا مذاق پیدا کیا۔ اگر وہ صرف یونانی سائنس کی کتابوں کو جمع کرنے اور انھیں یورپ کو منتقل کرنے پر ہی اکتفا کرتے تو بھی صرف یہی کام ان کے لیے باعث صد افتخار ہوتا، لیکن انھوں نے اس سے بڑھ کر کام کیا یعنی ادبیات اور سائنس دونوں میں انھوں نے نئی اور تازہ تصانیف کیں۔'' (انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف میڈیسن: ص ۱۸۵)

اندلس میں تصنیف وتالیف اور مختلف علوم وفنون کی کتب کی فراہمی کا انقلابی دور عبدالرحمٰن الناصر کے جانشین الحکم ثانی سے شروع ہوتا ہے۔ یہ شخص عالم اسلام کے خلفاء میں سے سب سے بڑا عالم تھا جیسا کہ اس کی زندگی اور عہد حکومت کے واقعات میں ہم نے بیان کیا ہے۔ الحکم الثانی اور اس کے بھائی عبداللہ نے اپنے باپ عبدالرحمٰن الناصر کی زندگی میں ہی اپنی اپنی لائبریریاں قائم کر لی تھیں۔ الحکم نے ان لائبریریوں کو شاہی کتب

خانے میں مدغم کر کے کتابوں کی تعداد میں بہت بڑا اضافہ کیا۔ (اسلامی اندلس میں کتب خانے: ص ۱۵) الحکم الثانی کتابوں کا بہت شوقین اور دل دادہ تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو دنیا کے مختلف علمی خطوں سے مخطوطات جمع کرنے کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ اس مقصد کے لیے بیرونی فضلاء اور اہل علم کی خدمات بھی حاصل کی گئی تھیں، جن میں مصر کا ابن سابان، بغداد کا ابن یعقوب الکندی اور محمد بن طرحان الحکم الثانی کے کتب خانے کے لیے کتابیں اکٹھی کرتے تھے۔ مشرق میں جو کتابیں تصنیف و تالیف ہوتی تھیں، ان کا پہلا نسخہ حاصل کرنے کے لیے مصنفین کو گراں بہا اور بیش قیمت انعام دیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ابو الفرج اصفہانی اپنی تصنیف ''کتاب الاغانی'' مرتب کر رہا تھا۔ الحکم الثانی کو معلوم ہوا تو اس کی کتاب کا پہلا نسخہ حاصل کرنے کے لیے اس نے اصفہانی کے پاس ایک ہزار دینار بھیجے۔ (المقری، نفح الطیب فی غصن الاندلس الرطیب: ۱/۲۵۰) اس طرح الحکم کے کتب خانے میں چار لاکھ کتابیں جمع ہو گئیں اور یہ کتب خانہ قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا کتب خانہ بن گیا تھا۔ اس کی کتابوں کی فہرست چوالیس جلدوں پر مشتمل تھی۔ کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ دنیا کی اور کسی لائبریری میں موجود نہیں تھا۔ اس کتب خانے کے بارے میں لکھا ہے کہ جس عمارت میں الحکم الثانی کا یہ کتب خانہ تھا وہ کچھ عرصے کے بعد اپنی تنگ دامانی کا شکوہ کرنے لگی۔ چنانچہ الماریوں میں کتابیں ایک دوسرے کے اوپر رکھ دی گئیں لیکن پھر بھی یہ عمارت ناکافی ثابت ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتب خانہ دوسری عمارت میں منتقل کرنا پڑا۔ اس عمارت سے دوسری عمارت میں کتابیں منتقل کرنے میں چھ ماہ لگ گئے جب کہ لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد مسلسل اس کام پر لگی رہی۔

مؤرخین نے یہ بھی لکھا کہ الحکم الثانی نے نہ صرف اتنی بڑی تعداد میں کتابیں جمع کیں بلکہ ان کتابوں میں سے اکثر و بیشتر کا اس نے مطالعہ بھی کیا اور ہر کتاب پر مصنف کے حالات زندگی اس کی تاریخ ولادت و وفات کے علاوہ ان پر حواشی بھی لکھے۔ (نفح الطیب: ۱/۲۵۶) کتاب سے اس قدر رغبت کی وجہ سے الحکم الثانی نے قرطبہ کو ایک علمی مارکیٹ میں تبدیل کر دیا تھا جہاں ہر ملک اور ہر فن کی علمی اور ادبی تصنیفات دستیاب تھیں۔ قرطبہ میں کتب فروشی کی بیس ہزار دکانیں تھیں۔ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں سرکاری خرچ پر پبلک لائبریریاں قائم کی گئیں۔ صرف قرطبہ میں ستر لائبریریاں تھیں۔ کتابوں کی نقل نویسی کا مشغلہ اس قدر عام تھا کہ عورتیں بھی کتابیں نقل کرتی تھیں اور پھر انھیں کتب فروشوں کے ہاں فروخت کر دیتیں۔ قرطبہ کے صرف مشرقی حصہ میں ۱۷۰ خواتین ایسی تھیں جو قرآن حکیم خط کوفی میں لکھا کرتی تھیں۔

مشہور مقولہ ہے کہ ''الناس علیٰ دین ملوکھم'' (کہ لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں یعنی ان کو دیکھ کر اپنا طرز زندگی متعین کرتے ہیں چنانچہ جب بادشاہ کو کتابوں کا اس قدر شوق تھا تو یہ شوق عوام میں بھی منتقل ہوا اور یہ ذوق اس حد تک ترقی کر گیا کہ بے شمار مردوں اور خواتین کی اپنی ذاتی لائبریریاں تھیں۔ سب سے بڑی لائبریری ابن فطیس کی تھی۔ خواتین میں عائشہ بنت احمد، راضیہ نجم، خدیجہ بنت جعفر التمیمی کے اپنے

ذاتی کتب خانے تھے۔ امراء اور رؤساء اپنی بڑی لائبریوں کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے تھے۔ اور وہ اپنی لائبریوں کا حجم بڑھانے کے لیے بڑی بڑی قیمت دے کر کتب فروشوں سے کتابیں خریدتے۔

سقوط قرطبہ کے بعد قرطبہ کی سرکاری اور نجی لائبریروں کی بربادی کے باوجود بھی اندلس کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں قرطبہ میں زیادہ کتابیں موجود تھیں۔ ابن رشد نے قرطبہ اور اشبیلیہ کا تقابل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اشبیلیہ میں اگر کوئی عالم فوت ہو جاتا تھا تو اس کے کتب خانے کی کتابیں قرطبہ کی مارکیٹ میں فروخت کرنے کے لیے لائی جاتی تھیں، اور اگر قرطبہ میں کوئی مغنی مر جاتا تھا تو اس کے آلات موسیقی اشبیلیہ کی مارکیٹوں فروخت ہوتے تھے۔ (نفح الطیب: ۱/۳۰۲)

لائبریریوں اور کتابوں کی اس تعداد سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اندلس میں علم کی روشنی کس طرح گھر گھر پھیلی ہوئی تھی جب کہ ان دنوں یورپ کے دوسرے ممالک میں جہالت کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں۔ یورپ کے کئی بادشاہ لکھی ہوئی تقریر نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اس کے مقابلے میں اندلس میں تعلیم عام تھی۔ اندلس کے ہر قصبہ میں بڑے بڑے مدارس تھے اور بڑے شہروں میں اعلیٰ تعلیم کی یونیورسٹیاں تھیں جن میں نہ صرف اندلس کے بلکہ یورپ کے دوسرے ملکوں کے لوگ بھی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسی طرح آتے تھے جس طرح آج ہم آکسفورڈ، کیمبرج اور ہارورڈ وغیرہ یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ مارٹن لوتھر جو پراٹسٹنٹ مذہب کا بانی تھا، اس نے قرطبہ کی یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی اور مسلمانوں کے عقیدۂ توحید جو غیر شعوری پر اس کے ذہن میں گھر کر گیا تھا، کا یہ اثر تھا کہ اس نے واپس جا کر پاپائے اعظم کی نام نہاد عصمت مآب زندگی کو چیلنج کیا اور نئے مذہب کی بنیاد ڈالی جس نے پوپ اعظم کی شخصیت کو ہلا کر رکھ دیا۔

جو اساتذہ مدارس اور جامعات میں پڑھاتے تھے ان کو حکومت کی طرف سے بھاری مشاہرے ملتے تھے لیکن طالب علموں سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ گویا تعلیم مفت تھی بلکہ نادار طلباء کی ضروریات زندگی کی کفالت بھی حکومت کرتی تھی۔ جو قومیں ترقی کرنا چاہتی ہیں وہ تعلیم کو عام کرتی ہیں اور عام کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ تعلیم مفت دی جائے۔ جامعات میں ہر علم وفن کی تعلیم دی جاتی تھی۔ چنانچہ ان یونیورسٹیوں نے بڑے بڑے عالم و فاضل اور دانش ور پیدا کیے جنہوں نے مختلف علوم پر بڑی گراں قدر تصنیفات چھوڑیں جن سے آج لوگ استفادہ کر رہے۔ ان ارباب علم وحکمت حضرات کا ذکر آئندہ صفحات میں آرہا ہے۔

الحکم الثانی کے عہد خلافت میں جامعہ قرطبہ عبدالرحمٰن الناصر کی بنائی ہوئی مسجد قرطبہ میں قائم کی گئی تھی۔ یہ جامعہ قرطبہ مصر کی جامعہ الازہر اور بغداد کی جامعہ نظامیہ دونوں سے سبقت لے گئی تھی۔ اس میں ہر ملک اور ہر مذہب وملت کے لوگ علم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ (حتی، ہسٹری آف دی عربز: ص ۵۳۰) چنانچہ حکم ثانی کے زمانے میں اندلس کا عام علمی اور ثقافتی معیار اتنا بلند ہو چکا تھا کہ بقول ڈوزی:

''اندلس کے قریباً ہر آدمی کو لکھنا پڑھنا آتا تھا (یعنی قریباً سو فیصد لوگ پڑھے لکھے تھے) اور یہ اس

زمانے کی بات ہے جب مسیحی یورپ صرف علم کی مبادیات ہی جانتا تھا، اور مبادیات بھی بڑی حد تک چند ایک اراکین کلیسا (یعنی پادری حضرات) ہی جانتے تھے۔''

اساتذہ جو ان یونیورسٹیوں اور جامعات میں تعلیم دیتے تھے، وہ خود بہت بڑے جید عالم ہوتے تھے۔ پھر الحکم الثانی اکثر علماء وفضلاء کی کانفرنسیں منعقد کرایا کرتا۔ ان کانفرنسوں کی صدارت وہ خود کرتا تھا۔ وہ علماء کا بڑا قدر دان تھا اگرچہ وہ خود بھی ایک بہت بڑا عالم تھا۔ چنانچہ المقری نے اس کی قدر دانی کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ الحکم نے فقیہ ابوابراہیم کو بلا بھیجا۔ وہ اس وقت جامعہ قرطبہ میں درس حدیث دے رہے تھے۔ خلیفہ کا پیغام لانے والے کو ایک مرتبہ انھوں نے یہ جواب دیا کہ میں اس وقت ایک کار خیر میں مصروف ہوں لہٰذا آنے سے قاصر ہوں۔ خلیفہ نے دوبارہ خادم کو بھیجا اور اسے یہ ہدایت کی کہ فقیہ ابوابراہیم جونہی فارغ ہوں انھیں اپنے ساتھ لیتے آؤ۔ انھوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں اس قدر نحیف اور کمزور ہوں کہ نہ تو باب السدہ تک پیدل آسکتا ہوں اور نہ گھوڑے پر ہی سوار ہوسکتا ہوں۔ خلیفہ نے ان کے اعزاز میں جامع قرطبہ اور اپنے شاہی محل کا دروازہ باب الصناعہ جو اس کے اپنے لیے مختص تھا، کھلوا دیا، اور جب فقیہ ابوابراہیم درس حدیث سے فارغ ہوکر خلیفہ کے پاس دربار میں تشریف لائے تو خود خلیفہ اور اس کے ساتھ تمام اعیان سلطنت انتہائی گرم جوشی کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہوگئے۔'' (نفح الطیب: ۱/۲۴۴۔۲۴۵)

جب خلیفۂ وقت علماء کی اتنی قدر کرتا تھا تو عوام اور خواص بھی علماء کو نہایت عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ قریباً ہر مسجد کے ساتھ مدرسہ ہوتا تھا جہاں علماء کو مشاہرہ پر تعلیم کے لیے مقرر کیا جاتا تھا۔ لوگ علم برائے علم کے مقصد کے پیش نظر حاصل کرتے تھے نہ کہ علم برائے حصول معاش نہیں۔ تعلیمی میدان میں خواتین بھی مردوں سے پیچھے نہیں تھیں۔

بغداد اور اندلس کی اسلامی ریاستوں کے سیاسی اختلافات کے باوجود اندلس میں اسلامی خلافت قائم ہونے پر بہت سے علماء مشرق سے نقل مکانی کر کے اندلس میں آکر آباد ہوگئے تھے جن سے اندلس کے لوگوں نے علم کا حظ وافر حاصل کیا۔ اسی طرح سے بہت سے علم کے متلاشی حضرات ترک وطن کر کے مشرق کے علماء سے مستفیض ہونے کے لیے بلاد مشرق میں پھرتے رہے۔ المقری نے نفح الطیب میں تین سو پچاس افراد کا ذکر کیا ہے جو اندلس سے بلاد مشرق کے سفر پر گئے۔ ان میں سے ہر ایک فرد علم میں حد کمال کو پہنچا ہوا تھا۔

طوائف الملوکی کے عہد میں قرطبہ کے دربار خلافت میں جو علماء جمع تھے وہ مختلف مسلمان ریاستوں میں پھیل گئے اور انھوں نے وہاں اپنے اپنے حلقے میں علمی کام تیز کر دیا۔ الحکم الثانی نے قرطبہ میں جو اپنی لائبریری قائم کی تھی اور اس کے علاوہ عوام کی لائبریریاں تھیں یا مختلف علاقوں میں پبلک لائبریریاں تھیں، ان کی کتابیں فسادات کے زمانے میں اطراف واکناف کی مملکتوں اور ریاستوں میں بکھر گئیں جس کی وجہ سے فکری اور علمی دائرہ پہلے سے زیادہ وسیع ہوگیا اگرچہ مرکزیت ختم ہوگئی۔ طوائف الملوکی کے زمانے میں فقہاء اور علماء کی

گرفت کمزور پڑ گئی اور آزادانہ غور وفکر، سائنس اور فلسفہ اور مباحثات ومناظرات کی حوصلہ افزائی ہوئی لیکن علم کی اشاعت کے راستے میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی ریاست بھی رکاوٹ نہ بنی بلکہ سیاسی انتشار کے باوجود علمی ترقی کی رفتار روز افزوں رہی۔ قرطبہ میں جب بنو جمہور کی حکومت تھی تو ابن حزم القرطبی، الحمیدی، ابن حیان ایسے محققین پیدا ہوئے۔ غرناطہ پر بربر طوائف کا قبضہ تھا جو کہ علمی ذوق میں پھسڈی شمار ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود وہاں بھی مشہور شاعر فلسفی اور ماہر فلکیات ابوالفتوح الجرجانی اور فقیہ ابواسحاق الالبیری نے جنم لیا۔ المیریہ میں احمد بن عباس کی حکومت تھی جو بذات خود عالم اور علماء کا نہایت قدردان تھا۔ اس کے کتب خانے میں بھی اس وقت چار لاکھ کتابیں تھیں۔ احمد بن عباس کے جانشین بھی علم ودانش کے دلدادہ تھے۔ ان کے دربار میں بھی شعراء اور ادباء کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ اندلس کا اولین جغرافیہ نگار ابوعبید البکری، طوائف المملوکی کے زمانہ میں بام عروج تک پہنچا۔ طلیطلہ میں بنو ذوالنون حکمران تھا یہ سائنسی علوم کی ترویج وترقی میں دیگر مراکز علم پر سبقت لے گیا۔ ماہر فلکیات الزرقانی، ماہر فلسفہ اور ریاضی دان سعید بن محمد البغوش، نامور طبیب اور ماہر نباتات ابن الوافد، محمد بن التیمی، ابوالولید الوقشی اور مؤرخین میں سے صاعد الطلیطلی اور الحجازی طلیطلہ کے دربار سے وابستہ تھا اور یہاں کا حاکم ان کی سرپرستی کرتا تھا۔ اشبیلیہ کے حکمران معتضد اور معتمد خود شاعر اور شعراء کے قدردان اور سرپرست تھے۔ سرقسطہ کے بنو ہود فلسفہ، ریاضیات اور فلکیات کے ضمن میں خاص ذوق وشوق کے حامل تھے۔ المقتدر سائنسی علوم کا جید عالم تھا۔ اس کے بیٹے المؤتمن نے فلکیات پر ایک بہت اعلیٰ کتاب لکھی۔ ابن باجہ اور ابن جبیرول اور الکرمانی کی وابستگی سرقسطہ کے دربار سے تھی۔ الکرمانی جب مشرقی رسائل اخوان الصفا لے کر اندلس گیا تو سرقسہ کے دربار میں اس کی حد درجہ پذیرائی ہوئی اور اس کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

اندلس میں بنوامیہ کے علاوہ اور بھی مختلف خاندانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں جیسے المرابطون اور الموحدون وغیرہ لیکن علوم وفنون کی وسعت وترقی میں کسی نے بھی کوتاہی سے کام نہیں کیا۔ ان خاندانوں کے عہد میں بھی قرطبہ، مرسیہ، دانیہ، اشبیلیہ، طرطوشہ، غرناطہ، شاطبہ، سرقسطہ، بلنسیہ وغیرہ میں تعلیمی ادارے اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ قائم رہے۔ تاریخ ابن بشکوال، جغرافیہ میں ابوحامد غرناطی، شریف الادریسی، فلسفے میں ابن باجہ، ریاضیات میں ابن مسعود، طب میں ابوالصلت امیہ بن عبدالعزیز مرابطین کے دور کے نامور علماء و فضلاء میں سے شمار ہوتے ہیں۔

الموحدون کے زمانے میں اندلس کی فکری اور علمی رفتار اور زیادہ تیز ہوگئی کیونکہ موحدین علم وادب کے سرپرست تھے۔ اس دور میں صرف قرطبہ شہر میں آٹھ سو تعلیمی ادارے علم کی نشرواشاعت میں مصروف تھے۔ جامعات میں دس ہزار سے زائد طلباء علوم اسلامیہ، ادبیات، سائنس، طب، فلسفہ اور دوسرے علوم کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس دور میں جغرافیے میں ابن جبیر، تاریخ میں ابن الابار، فلکیات میں البطروجی، نباتات میں ابن البیطار، طب میں بنو زہرہ جیسے نامور علماء وفضلاء ہوگزرے ہیں۔ پھر اسی دور میں فلسفہ کے دو باقاعدہ فکری اور نظری

مدارس وجود میں آئے۔ ایک ارسطوی مدرسہ فکر جس کی نمائندگی ابن رشد، ابن طفیل اور ابن باجہ کرتے تھے اور دوسرا افلاطونی مدرسہ فکر جس کے سب سے بڑے نمائندہ محی الدین ابن العربی تھے جن کو شیخ اکبر بھی کہا جاتا ہے۔

آخر میں جب مسلمانوں کی حکومت سمٹ کر صرف غرناطہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی تو اس زمانے میں بھی حکومت غرناطہ نے انتہائی نامساعد حالات کے باوجود قریباً اڑھائی صدیوں تک اپنے زیر اثر علاقے کی علمی اور فکری ترقی میں خاطر خواہ حصہ لیا اور اسے بہت ترقی دی۔ موحدون خاندان کے ایک بادشاہ یوسف نے غرناطہ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ لسان الدین ابن الخطیب اس بادشاہ کا وزیر تھا۔ غرناطہ کی اس یونیورسٹی میں ہر علم وفن کے بہترین عالم جن میں ادیب، محدث، مفسر، فقیہ، مؤرخ اور سائنس دان شامل تھے، پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتے تھے جن کی وجہ سے یہ یونیورسٹی اپنے دور میں دنیا کی ایک بہترین اور بے نظیر یونیورسٹی سمجھی جاتی تھی۔ اس چھوٹی سی ریاست غرناطہ میں ستر عام کتب خانے، ستر کالج اور دو سو سے زائد ابتدائی مدارس پائے جاتے تھے۔ (ہسٹری آف سارا سنز، امیر علی: ص۵۶۹) مشہور مؤرخ اور ماہر عمرانیات علامہ ابن خلدون، نامور سیاح زریں بن معاویہ العبدری، مشہور ریاضی دان ابن النباء اور ابوبکر محمد بن احمد الرقوطی اس عہد کے مشہور علماء میں سے ہیں۔ بارھویں صدی عیسوی میں مغرب کا ہر وہ شخص جسے علم سے ذرا بھی لگاؤ ہوتا وہ تحصیل علم کے لیے یا تو بغداد کا رخ کرتا یا اسلامی اندلس کا۔ اس زمانے میں عربوں کی کتابوں کے تراجم شروع ہوئے۔ اندلس کے عیسائی حکمرانوں نے عرب فرماں رواؤں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے درباروں کو علماء اور فضلاء سے رونق دینے، کتابیں جمع کرنے اور علمی اور سائنسی اکتشافات کی سرپرستی کرنے کا طریق کار اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسانیت اور یورپ کے معلم جہالت کے اندھیروں میں ڈوب گئے اور علم کا آفتاب مشرق اور اسلامی اندلس کے بجائے کسی اور سرزمین کو منور کرنے لگا۔ اور اس وقت سے لے کر آج تک مسلمان علم سے بے بہرہ ہو کر ذلیل وخوار ہو رہے ہیں اور جو لوگ جاہل تھے وہ آج پوری دنیا کے معلم بنے ہوئے ہیں۔

مسلمان جب تک شریعت اسلامیہ پر عمل پیرا رہے اور علم کے اکتساب کے لیے کوشش کرتے رہے، یہ شریعت اپنا کردار ادا کرتی رہی اور جب قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے احکام کو مضبوطی سے پکڑا، اس کے احکام پر عمل پیرا رہے اور علم سے ان کا لگاؤ رہا تو وہ قلیل و کمزور ہونے کے باوجود قلیل عرصے میں تمام دنیا کی سیادت اور انسانیت کی قیادت کے منصب جلیلہ پر فائز ہو گئے، اور ان کی قوت و شوکت اور سطوت وعظمت کا یہ عالم تھا کہ آج کل کے امریکہ کی طرح دنیا میں صرف انھی کی آواز سنائی دیتی تھی اور انھی کی آواز کی اہمیت اور وقعت سمجھی جاتی تھی اور دوسروں کی آوازیں ان کے مقابلے میں نقار خانے میں طوطی کی آواز ہو کر رہ گئی تھیں۔ جو کلمہ بھی بلند ہوتا وہ انھی کا ہوتا حالانکہ ان اونٹوں کا دودھ پینے والوں اور سوسمار کا گوشت کھانے والوں کی اس سے پہلے دنیا میں کوئی اہمیت نہ تھی۔ ان کی ناداری اور مفلسی اور ان کی بے نظمی اور اکھڑ پن کو دیکھ کر کوئی ان پر حکومت کرنے کو تیار نہیں تھا، لیکن جونہی انھوں نے شریعت اسلامیہ پر عمل کیا تو ان میں ایک معجز نما تبدیلی واقع ہو گئی۔

اسی شریعت اسلامیہ نے انھیں علم سے روشناس کرایا، ادب سے آشنا کیا، دلوں میں نرمی پیدا کی اور معاشرت و افکار کو مہذب اور پاکیزہ بنایا۔ اس نے انھیں ہر قسم کے گناہوں، بداعمالیوں، برے افعال اور زیادتیوں سے باز رکھا۔ ان کی عقلوں کو جہالت کی تاریکیوں اور اس کے جسموں کو شہوات اور حرص و آز کی بندگی سے یک قلم آزاد کر دیا اور انھیں ان کے اصلی مقام سے روشناس کرا کر ان کو بہترین امت کے زمرے میں شامل کر دیا جن کا مقصد وجود ہی یہ ہے کہ وہ نیکیوں کو پھیلائیں اور برائیوں سے روکیں۔

ان کی یہ حالت کب تک رہی؟ تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کی یہ حالت اس وقت تک رہی جب تک وہ شریعت اسلامیہ پر عمل پیرا رہے لیکن جونہی انھوں نے شریعت اسلامیہ کو گلدستہ طاق نسیاں بنا دیا وراس کو نظر انداز کر کے دنیا کے دوسرے قوانین پر عمل کرنا شروع کر دیا تو ہر قسم کی ترقی ان سے روٹھ گئی اور زندگی کے ہر میدان میں پسپائی ان کا مقدر بن گئی، اور تمام دنیا نے دیکھا اور آج ہم بھی دیکھ رہے ہیں کہ وہ الٹے قدموں انھی تاریکیوں میں لوٹ گئے جن میں وہ شریعت پر عمل پیرا ہونے سے قبل بھٹک رہے تھے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دنیا کی انسانیت ناآشنا اور اخلاقی قدروں سے عاری قوموں کے غلام بن گئے اور ان میں یہ قدرت بالکل نہ رہی کہ وہ غلامی کا جوا اپنے گلے سے اتار سکیں یا کسی حاکم ملک کی زیادتی کو روک سکیں۔ کشمیر، فلسطین اور عراق کا معاملہ ہمارے سامنے ہے بلکہ اب تو تھائی لینڈ اور دوسرے کئی ملکوں میں بھی مسلمانوں پر زیادتی ہو رہی ہے جس کو وہ روکنے اور مزاحمت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

آج مسلمان چونکہ ادبار و زوال اور مصائب میں گرفتار ہیں اور مایوسی کے عالم میں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اہل مغرب کی ترقی کا راز ان کے قانون اور ان کے نظام زندگی میں پنہاں ہے اسی لیے وہ بوزے کی طرح ان کی نقل کرتے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن جوں جوں وہ اہل مغرب کی نقل اور تقلید کرتے ہیں، ان کی گمراہی اور ان کے مصائب میں روز بروز اضافہ ہی ہوا ہے۔ ان کی زندگی کا فساد بڑھا ہے بلکہ پوری ملت اسلامیہ تشتت و انتشار اور پراگندگی کا شکار ہو گئی ہے اور پوری ملت ٹولیوں میں منقسم ہو گئی ہے اور ہر ٹولی اپنی اپنی جگہ پر اسی طرح نازاں و فرحاں ہے جس طرح اندلس میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں اپنی جگہ پر خوش تھیں اور اپنے تحفظ کی خواہاں تھیں خواہ اسے وہ تحفظ عیسائیوں کا باج گزار ہونے کے باعث حاصل ہو۔ جس چیز کو ہم نے تریاق سمجھا تھا وہ دراصل زہر تھا جس کو ہم نہایت مسرت و انبساط سے کھا رہے ہیں اور اصل تریاق یعنی شریعت اسلامیہ کو ہم نے یک قلم خیر باد کہہ دیا حالانکہ اسی شریعت نے ہمارے بزرگوں کو وجود بخشا تھا اور دنیا کی تمام قوموں میں ہمارے اسلاف کو سرفراز کیا تھا۔ انھیں عروج اور ترقی کی شاہراہ پر گامزن کیا اور انھیں دنیا کے ایک بہت حصے کا حکمران بنایا۔ دنیا کے بڑے بڑے غیر مسلم لیڈروں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اسلام نے دنیا کو مہذب بنایا اور دنیا میں علم و تہذیب کی شمع روشن کی، لیکن مسلمان ہیں کہ اپنی ترقی اہل مغرب کی اتباع اور تقلید میں سمجھ رہے ہیں۔ مغرب کی ترقی دراصل انسانیت کی ترقی نہیں بلکہ ٹیکنالوجی کی ترقی ہے۔ اسلام نے انسانوں کو

مار کر ترقی نہیں کی بلکہ اس نے دنیا کو زندگانی بخشی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں بہت سی جنگیں لڑیں اور کئی لاکھ مربع میل کے علاقے کو فتح کیا لیکن ان سب غزوات میں جو لوگ مارے گئے ان کی کل تعداد ۱۰۱۸ ہے جن میں ۲۵۹ مسلمان شہید ہوئے اور ۷۵۹ غیر مسلم قتل ہوئے۔ صرف ایک ہزار انسانوں کے قتل سے دنیا میں ایک عظیم ترین انقلاب برپا کر دیا جس کی مثال پوری دنیا میں نہیں ملتی۔ بعد کی صدیوں میں دنیا میں جو فکری انقلاب آیا اس کا آغاز اموی دور (۶۶۱ء۔۷۵۰ء) میں دمشق سے ہوا۔ قدیم یونانی حکماء کے یہاں کیمیا چاندی سے سونا بنانے کے خبط کا نام تھا۔ یزید بن معاویہ کے بیٹے پہلے شخص ہیں جنہوں نے کیمیا کو ایک طبیعی علم کی حیثیت سے متعارف کرانے کی کوشش کی تھی۔ پھر عباسی دور خلافت میں اس شعبہ علم نے بغداد کے بیت الحکمت میں مزید فروغ پایا اور پھر اندلس اور سسلی تک یہ علم پھیلتا گیا۔ اس زمانے میں مسلمان علمی اور تمدنی ترقی میں دنیا کی تمام قوموں سے بڑھے ہوئے تھے۔ دنیا میں کوئی ان کا مماثل نہ تھا۔ اسی دور کو یورپ کے مؤرخین تاریک دور (Dark Ages) کہتے ہیں۔ یہ تاریک دور صرف یورپ کے لیے تاریک دور تھا نہ کہ مسلمان دنیا کے لیے۔ جب انگلستان کے بازاروں میں لوگ دلدل اور کیچڑ میں پھنسے رہتے تھے اس وقت اندلس کی مسلم دنیا میں پکی سڑکوں پر رات کو قمقمے جلا کرتے تھے۔ چنانچہ ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا (World Book Encyclopedia) کا مقالہ نگار Dark Ages کے عنوان کے تحت لکھتا ہے:

> The term "Dark Ages" Cannot be applied to the splendid Arabs culture which spread over North Africa and into Spain." (Page 30)

> یعنی تاریک دور کی اصطلاح شاندار عرب کلچر پر چسپاں نہیں ہوتی جو اس زمانے میں شمالی افریقہ اور اسپین میں پھیلا ہوا تھا۔''

جدید سائنسی ترقی توحید کا بالواسطہ نتیجہ ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اسلام اس لیے نہیں آیا کہ وہ دنیا کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے علوم سکھائے اور نہ پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت ہی کا یہ مقصد تھا، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر اسلام نہ آتا تو سائنسی ترقیوں کا دروازہ انسانیت پر بند رہتا جیسا کہ یہ دروازہ اس سے قبل انسانیت پر بند پڑا تھا۔ کائنات کی تسخیر اور اسے تدبر و تحقیق کا موضوع بنانے کی فکر اولاً اسلام کے اثر سے عربوں میں پیدا ہوئی۔ اس فکری انقلاب کا ایک دھارا وہ تھا جس کا مرکز اندلس اور سسلی بنا۔ چنانچہ رابرٹ بریفالٹ نے لکھا ہے کہ ''اگرچہ یورپ کی ترقی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر اسلامی تہذیب کے فیصلہ کن اثرات موجود نہ ہوں، لیکن یہ اثر کہیں بھی اتنا واضح، عیاں اور اہم نہیں ہے جتنا اس طاقت کے ظہور میں ہے جو جدید دنیا کی مخصوص اور مستقل قوت اور اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے یعنی ''سائنس اور سائنسی طرز فکر'' اس کے بعد بریفالٹ مزید رقم طراز ہیں:

''انتہائی اغلب ہے کہ عربوں کے بغیر جدید صنعتی تہذیب سرے سے وجود ہی میں نہ آتا۔''

(تشکیل انسانیت: ص ۲۰۲)

یہی وجہ ہے کہ آج عیسائی دنیا کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ''اسلام کی آمد نے انسانی تاریخ کا راستہ ہی بدل دیا۔

اس سلسلے میں بعض حضرات نے ہماری بنیادی غلطی کی نشان دہی کی ہے جس کی وجہ سے آج ہم تنزل وانحطاط کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان حضرات نے نہایت واضح اور بین دلائل کے ساتھ یہ مبرہن کیا کہ باوجود اس بات کے کہ ہم نے مغربی علوم سیکھے لیکن پھر بھی ہم ترقی کی شاہ راہ پر گامزن نہ ہو سکے اور ذہنی طور پر اہل مغرب کے غلام ہی رہے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں جب کہ مسلمان سیاسی طاقت، تمدنی ترقی اور علوم وفنون میں دنیا کی تمام قوموں سے بڑھے ہوئے تھے، یورپ نے یہ طے کیا کہ ان کو عربی پڑھنی چاہیے اور مسلمانوں کے علوم سیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے جن کی وجہ سے وہ آج پوری دنیا میں ترقی یافتہ کہلاتے ہیں۔ یہی فیصلہ تھا جو سولھویں صدی عیسوی کے اس عظیم واقعہ کا سبب بنا جس کو دنیا یورپ کی نشأۃ ثانیہ (Renaissance) کے نام سے جانتی ہے۔ مسلمانوں کے علوم سیکھ کر اور پھر ان میں کچھ اضافہ کر کے بالآخر یورپ اس قدر طاقتور ہو گیا کہ نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ پوری دنیا پر چھا گیا۔ جب یورپ کو اسلامی علوم سیکھنے اور اسلام سے تعلق پیدا کرنے کے بعد کچھ ہوش آیا تو انھوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ کچھ ہاتھ آ جائے لیکن وہاں تو کچھ تھا ہی نہیں۔ اس وقت اسلامی علوم ہی زندہ تھے یا جو کچھ از منۂ قدیم کا موجود تھا، وہ اسلامی علوم وفنون قالب میں ڈھال دیا گیا تھا۔ مسلمانوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں یونانی علماء کی کتابوں سے جو کچھ استفادہ کیا تھا، اس کا انھوں نے بہت فراخ دلی سے اعتراف کیا بلکہ اپنی حسب معمول خوش اخلاقی سے کام لیتے ہوئے جتنا ان کا حق تھا، اس سے بہت زیادہ اس کو ظاہر کیا۔ مسلمانوں نے یونانی حکماء کا نام ہمیشہ عزت واحترام سے لیا ہے، اس قدر کہ اس حکمت کا نام جو انھوں نے اپنے عہد میں جاری کی ''طب یونانی'' رکھا۔ فلسفے کا نام ''یونانی فلسفہ'' رکھا۔ اگر کوئی یورپ کے عہد متوسط کا مصنف ہوتا تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتا بلکہ وہ اس کا نام یورپی طب اور یورپی فلسفہ رکھتا۔ چنانچہ کانسٹنٹائن (Constintine) یورپ کی طب کا جد امجد سمجھا جاتا ہے۔ برڈو اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ڈیرم برگ (Daremberg) کی کوششوں سے یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ گیا کہ کانسٹنٹائن کی بہت سی تصانیف جن کو ہم اس سے پہلے اس کی اپنی دماغی کاوش کا نتیجہ سمجھا کرتے تھے، حقیقت میں عربی کتب سے تراجم ہیں جو نہایت چالاکی اور چابک دستی سے بھیس بدل کر پیش کیے گئے۔ طرزِ کلام کو بدل کر اور ایسے ناموں کو عبارت میں سے حذف کرنے سے جن کے سبب اس کی تصانیف کے اصل ہونے کا شبہ ہو۔ اس نے کثیر التعداد علمی کتابوں کا مصنف ہونے کا سہرا اپنے سر باندھ لیا حالانکہ حقیقتاً ان کا اصل ماخذ اور تھا۔ جب اتنا بڑا آدمی ایسا کرنے کو تیار ہے تو پھر دوسروں کا کیا کہنا۔

یورپ کے لوگوں نے مسلمانوں کے علوم سیکھ کر جو ترقی کی، اس واقعے کے چار سو سال بعد یہی صورت

حال برعکس شکل میں مسلمانوں کے سامنے تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ یورپ سیاست وتمدن اور علوم وفنون میں سب سے آگے بڑھ گیا ہے تو ان کے اندر بھی یہ رجحان ابھرا کہ وہ یورپی زبانیں سیکھیں اور یورپ کے علوم حاصل کریں، لیکن یہاں نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا۔ یورپی اور مغربی طرز کی تعلیم نے ہم کو یورپ کا ذہنی غلام بنا دیا۔ ہم اپنے علیحدہ قومی وجود کو بھول کر یورپ کے رنگ میں رنگ گئے۔ ایک ہی نوعیت کے دو واقعات میں انجام کا یہ فرق کیوں؟ اس کا جواب ذہنیت کے اس فرق میں ہے جو دونوں جگہ پایا جاتا ہے۔ یورپ نے ہمارے علوم کو اس جذبے کے تحت سیکھا تھا کہ وہ ہمارے ہتھیاروں سے ہم کو شکست دے سکے۔ اس کے برعکس ہم یورپی علوم کی طرف اس جذبے سے بڑھے کہ ہم ان کے نقال بن کر اس کی نظروں میں باعزت ہو جائیں۔ جہاں ذہنیت میں اس قسم کا فرق پایا جائے وہاں انجام اور نتیجے میں فرق کا پایا جانا لازمی ہے۔

مسلمانوں کو قریباً ایک ہزار سال تک دنیا میں وہی حیثیت حاصل رہی ہے جو آج روس اور امریکہ کو حاصل ہے اور کسی زمانے میں برطانیہ کو حاصل تھی۔ اس وقت جب کہ یورپ میں قرون مظلمہ (Dark Ages) کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، عرب مسلمان ایک شاندار تہذیب کو معرضِ وجود میں لا چکے تھے، اور اپنی تحقیقات اور یونانی اور دوسرے علوم کے ترجموں کی مدد سے سائنس اور فلسفے میں دنیا کی امامت کر رہے تھے، اس وقت مسلمان ساری دنیا میں علم اور تہذیب کے تنہا مالک تھے۔ عربی زبان دنیا کی واحد علمی زبان تھی اور ساری دنیا کے لوگ علوم وفنون کے اکتساب کے لیے مسلم مرکزوں (دمشق، بغداد، قرطبہ، غرناطہ) کا اسی طرح سفر کیا کرتے تھے جیسے آج لوگ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ اور امریکہ کے شہروں میں جاتے ہیں۔

بارہویں اور تیرہویں صدی میں جب کہ مسلمانوں کی طاقت عروج پر تھی اور وہ عرب سے بڑھتے بڑھتے فرانس تک پہنچ گئے تھے، اس وقت یورپ نے مسلمانوں کے خلاف اپنی شدید ترین جنگ چھیڑ دی اور گیارہویں صدی کے آخر (۱۰۹۶ء) سے لے کر تیرہویں صدی کے آخر تک قریباً دو سو برس پورا یورپ مسلمانوں کے خلاف خوفناک جنگ لڑتا رہا۔ یہ جنگ جو صلیبی لڑائیوں (Crusades) کے نام سے مشہور ہے، بالآخر یہ جنگ یورپ کی مکمل ناکامی پر ختم ہوئی، مگر یورپ نے ہمت نہیں ہاری۔ اب اس کے اندر ایک نیا رجحان ابھرا۔ صلیبی جنگوں کے درمیان اہل یورپ کو تجربہ ہو گیا تھا کہ مسلمان علم اور سائنس میں ان سے بہت آگے ہیں۔ اس وقت کا تصور کیجیے جب مصری فوج نے منجنیقوں کے ذریعے فرانسیسی لشکر پر آگ کے بان پھینکنے شروع کیے۔ یہ بان جب منجنیقوں سے نکل کر دشمن کی طرف بڑھتے تو ایسا نظر آتا جیسے بڑے بڑے آتشیں اژدہے ہوا میں اڑ رہے ہوں۔ فرانسیسی جن کے پاس اس وقت پرانے دستی ہتھیاروں کے سوا اور کچھ نہ تھا، ان کے لیے یہ بان ایسے ہی بھیانک تھے جیسے آج کسی پسماندہ اور بے سروسامان ملک پر جدید ترین راکٹوں کے ذریعے حملہ کر دیا جائے۔ اسی طرح مسلمان تہذیب وتمدن کے تمام پہلوؤں میں نمایاں طور پر اہل یورپ سے بڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کے ناکام تجربے کے بعد یورپ نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو شکست دینے کے لیے اب

اس کو دوسرے قسم کی جنگ چھیڑنی چاہیے، اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے ہنر اور ان کے علوم سیکھ کر انھی کے ہتھیاروں سے انھیں شکست دی جائے۔

اب ایک طرف یورپ کے مذہبی طبقے نے روحانی صلیبی جنگ (Spiritual Crusades) کا نعرہ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی علوم کو سیکھا جائے اور مسلمانوں کی تاریخ اور اس کے عقائد کو اس طرح بگاڑ کر پیش کیا جائے کہ مسلمان اپنے دین سے متنفر ہو جائیں اور عیسائیت قبول کر لیں تاکہ وہ قوم جس کو فوجی میدان میں شکست نہیں دی جا سکی، اس کو علمی و نظریاتی حیثیت سے کمزور کر کے مغلوب کیا جا سکے۔ عیسائی مشنری تحریک پہلی بار صلیبی جنگوں کے زمانے میں شروع ہوئی۔ پہلا شخص جس نے ۱۱۵۴ء میں ماؤنٹ کارمل پر مشنری نظام قائم کیا، وہ ایک صلیبی تھا۔ بعد کو فرانسس کن (۱۲۱۹ء) نے اس کی پیروی کی۔ یہ مشنری تحریک آج ساری دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور تبلیغی ادارے کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اس کی کوششیں اس حد تک کامیاب ہوئی ہیں کہ ساری دنیا کا لٹریچر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط قسم کی باتوں سے بھر گیا ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کا فلسفہ، سائنس اور ان کے علوم و فنون سیکھنے کی تحریک زور شور سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ یورپ کی درس گاہوں میں عربی زبان پڑھانے کا اہتمام کیا گیا۔ مسلمانوں کی تصنیفات کے ترجمے یورپ کی زبانوں میں کیے جانے لگے۔ یورپ کے طلبہ مسلم شہروں میں تحصیل علم کے لیے جانا شروع ہو گئے۔

جنگ کی یہ نئی تکنیک اختیار کرنے کی وجہ سے یورپ کو اندرونی طور پر مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت یورپ کے قدامت پسند حلقوں میں عربی زبان کی توسیع کی حوصلہ افزائی کے سلسلہ میں ناراضگی پائی جاتی تھی جس کی وجہ خاص طور پر یہ اندیشہ تھا کہ عربی سیکھنے سے عیسائیوں کے درمیان اسلامی خیالات پھیلنا شروع ہو جائیں گے۔ مثال کے طور پر فرانسس کن راہب راجر بیکن جو اپنے وقت کا مشہور انگلستانی عالم تھا، اس نے جب عربی زبان کی اہمیت پر زور دیا تو آکسفورڈ (Oxford) کے علماء چلا اٹھے کہ ''بیکن مسلمان (Saracen) ہو گیا ہے۔'' مگر اس طرح کی مخالفتوں کے باوجود مسلمانوں کی زبان اور ان کے علوم سیکھنے کا رجحان بڑھتا رہا۔ مسلم محققین سے حاصل کردہ علم کو لے کر یورپ نے اپنی کوشش سے اس میں اضافے کیے اور اتنی ترقی کی کہ تاریخ میں پہلی بار قوت کا معیار بدل دیا اور بالآخر مسلمانوں کو ہر میدان میں شکست دے کر علم و عمل کی پوری دنیا کا مالک بن گیا۔ جدید مؤرخین نے تقریباً متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کا اہم ترین محرک وہ علوم تھے جو مسلمانوں کی معرفت یورپ تک پہنچے۔ (دیکھیے: ویسٹرن سویلزیشن، ایڈورڈ میکنال برن)

اس کے پانچ سو برس بعد تاریخ دوسرا منظر دیکھتی ہے۔ یورپ کی ترقی اور عروج سے متاثر ہو کر مسلمانوں کے اندر یہ رجحان ابھرا کہ وہ یورپ کے علوم و فنون کو سیکھیں، مگر یہاں اس رجحان کا محرک اس سے بالکل مختلف تھا جو یورپ کی تاریخ میں ہمیں نظر آتا ہے۔ سرسید احمد خان جو پروفیسر گب (Gibb) کے الفاظ میں اسلام میں پہلی جدت پسند تنظیم (Modernist Organisation) کے بانی تھے، انھوں نے ۱۸۷۵ء میں علی

گڑھ کالج قائم کیا، اور اسی ادارے کی ترقی وترویج کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی یہاں تک کہ ۱۹۲۰ء میں یہ کالج یونیورسٹی بن گیا۔ سرسید احمد خان یورپی طرز کی تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ ان کا مقصد اس تعلیم سے کیا تھا، اس کی ترجمانی ان کے رفیق خاص مولانا حالی نے ان الفاظ میں کی ہے: ع

حالیؔ اب آؤ پیرویٔ مغربی کریں

''سرسید نے جب انگلستان سے واپس آ کر دسمبر ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق نکالنا شروع کیا تو انھوں نے پہلے پرچے کے شروع میں لکھا: ''اس پرچے کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں، وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز اور مہذب قوم کہلائیں۔''

سرسید جب ترقی کا تصور کرتے تو ان کے ذہن میں ''زرق برق وردیاں پہنے کرنل اور میجر بنے ہوئے مسلمان نوجوان'' ہوتے تھے۔ ان کا منتہائے مقصود ایسی تعلیم تھی جو مسلمانوں کو اعلیٰ عہدوں تک پہنچا سکے۔ سرسید کی مجوزہ تہذیب کو مہدی افادی نے بجا طور پر ''اینگلو محمڈن کلچر'' کا نام دیا ہے۔

کمال اتاترک (۱۸۸۱۔۱۹۳۸) جو اس گروہ کا دوسرا نمایاں ترین نام ہے وہ اس معاملہ میں سرسید سے بھی آگے تھا۔ ترکی میں مغربی تعلیم وتہذیب کی اشاعت سے کمال اتاترک کا مقصد کیا تھا؟ اس کا اندازہ اس عنوان سے ہوتا ہے جو اس مہم کو وہاں دیا گیا۔ کمال اتاترک اور اس کے ساتھیوں کے نزدیک یہ ''غرب دوغرو'' تھا جس کے معنی ترکی زبان میں ''سمت مغرب میں سفر'' کے ہیں۔ سمت مغرب میں سفر کا یہ کام اس قدر اہم تھا کہ صرف رومن رسم الخط جاری کرنے اور ترکی باشندوں کو ہیٹ (Hat) پہنانے کے لیے ہزاروں آدمی اس طرح ہلاک کر دیے گئے گویا وہ ریاست سے بغاوت کے مجرم ہیں۔

اس تقلیدی ذہنیت کا یہ نتیجہ تھا کہ ہمارے ان مصلحین کی ساری توجہ بس یورپ کی تہذیب اور یورپ کی زبان و ادب کے حصول پر لگی رہی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی جو مغربی قوموں کی ترقی کا اصل راز تھا، اس کو مسلمانوں کے اندر رائج کرنے کی زیادہ کوشش نہیں کی گئی۔ سرسید نے تو صراحتاً مسلمانوں کے لیے ٹیکنیکل ایجوکیشن کی مخالفت کی اور اعلیٰ درجے کی دماغی تعلیم کو سب سے مقدم قرار دیا۔ یہی اس زمانے میں تعلیم جدید کے حامیوں کا عام نقطۂ نظر تھا۔ ان حضرات نے ساری توجہ صرف اس پر دی کہ ایسا گروہ پیدا ہو جائے جو مغربی تمدن اور یورپی ادب میں کمال حاصل کیے ہوئے ہو۔ کمال اتاترک کا نام نہاد انقلاب اور روس کے اشتراکی انقلاب میں صرف چند سال کا فرق ہے، مگر حیرت انگیز بات ہے کہ روس آج خلائی دور میں داخل ہو چکا ہے اور ترکی ابھی تک زمین پر بھی مستحکم مقام حاصل نہیں کر سکا۔

یورپ جس ذہن کے ساتھ ہمارے علوم کی طرف بڑھا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں سے ان کے علوم اور ان

کے ہنر کو لے کر اس کے ذریعے سے انھیں شکست دی جائے۔ ان چیزوں کو اس نے وقت کی طاقت سمجھا اور اس کو اپنے دشمن کے مقابلے میں استعمال کیا، چنانچہ اپنی اس مہم کو یورپ نے ''تقلید مشرق'' یا ''تقلید مسلم'' کا نام نہیں دیا بلکہ اس کو روحانی صلیبی جنگ (Spiritual Crusades) کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ صلیبی لڑائیوں کی ہاری ہوئی بازی کو نئی تکنیک سے کامیاب بنایا جائے، اور جب اس کوشش سے وہ اپنے کو ایک نئے انقلاب تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تو اس کو انھوں نے یہ حیثیت دی گویا انھوں نے خود اپنی کھوئی ہوئی حیثیت دوبارہ حاصل کی ہے۔ چنانچہ یورپ نے اس نئے انقلاب کا تاریخی نام نشأۃ ثانیہ (Renaissance) رکھا۔ یہ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے نیا جنم (Rebirth)، گویا یہ کوئی غیر سے حاصل کی ہوئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ یورپ کی اپنی ہی متاع ہے جو اس نے دوبارہ پائی ہے۔ یورپ نے لیتے وقت اگرچہ ان علوم کو مسلمانوں سے لیا تھا مگر اس نے حال کی کڑی کو حذف کر کے اس کا رشتہ ماضی سے ملایا اور اس کو مغرب کے ایک ملک یونان کی چیز قرار دے کر اس کو نشأۃ ثانیہ کہا۔ اس کے برعکس ہم نے ایسا نہیں کیا حالانکہ یورپ جو چیز ہمیں دے رہا تھا وہ اضافہ شدہ حالت میں وہی سرمایہ تھا جو یورپ کو ہم نے عطا کیا تھا۔ مسلمان مغربی علوم کی طرف خاص تقلیدی ذہن کے ساتھ بڑھے۔ ان کا یہ عمل سرسید کے یہاں ''پیروئ مغرب'' اور اتاترک کے یہاں ''غرب دوغرو'' کے ہم معنی تھا۔ ذہنیت کے اس فرق کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ یورپ ہمارے علوم و فنون سیکھ کر ہمیں شکست دے اور اس کے برعکس ہم مغرب کے علوم کو سیکھ کر صرف مغرب کے بھونڈے نقال بن کر رہ جائیں۔

مصطفےٰ کمال کی تحریک کا آخری نشانہ یہ تھا کہ ترک قوم ہیٹ اور پتلون پہننے لگے اور سرسید کا منتہائے نظر یہ تھا کہ مسلم نوجوان مغربی ادبیات میں کمال حاصل کر لیں۔ ظاہر ہے کہ اس سوچ کے تحت مغرب کی طرف بڑھنے کا یہی نتیجہ ہو سکتا تھا جو عملاً برآمد ہوا۔

یہ تاریخ جہاں ایک طرف ہماری غلطی کو بتاتی ہے وہیں اس کے اندر اس کا بھی نشان ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ہمیں وہی کرنا چاہیے جو مغربی قوموں نے ہمارے ساتھ کیا۔ مغربی علوم کو اس لیے سیکھنا تاکہ ان کے ذریعے مغربی تہذیب کو شکست دے کر اسلام کو غالب کیا جائے۔ اگر ہمارے اندر یہ ذہن پیدا ہو جائے تو وہی نتیجہ برعکس شکل میں ظاہر ہوگا جو مغربی قوموں کے لیے ہمارے مقابلے میں ظاہر ہوا تھا۔

(از افادات وحید الدین خان)

یہ سب کچھ جملۂ معترضہ کے طور پر اس لیے بتایا گیا کہ اس وقت ہم پر جو ادبار و زوال چھایا ہوا ہے وہ صرف اس لیے ہے کہ ہم نے شریعت اسلامیہ کو چھوڑ کر مغرب کی تقلید کر لی اور وہ بھی علوم و فنون میں نہیں بلکہ ادب، بے حیائی اور عیش و تنعم میں، حالانکہ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ دنیا کے تمام مروجہ قوانین سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ اسی لیے کسی نے کہا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس نے بالکل صحیح کہا تھا

بچو تقلید مغرب سے سنو اے ایشیا والو!
کہ مغرب کی طرف جاتے ہی سورج ڈوب جاتا ہے

آج بھی ہمارے صاحبان اقتدار یہی کہتے ہیں کہ ملک میں ماڈرن اسلام کو نافذ کیا جائے۔ ان کے نزدیک ماڈرن اسلام یہ ہے کہ باہمی رضامندی سے زنا بھی جائز، شراب بھی جائز، ناچ گانا بھی جائز، رقص و موسیقی بھی جائز اور ہر وہ چیز جائز ہو جو مغرب میں کی جاتی ہے۔ ہمارا منتہائے نظر مغرب ہے، اسلام نہیں ہے۔ کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ہمارا آئیڈیل کمال اتاترک ہونا چاہیے، اور کمال اتاترک گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ یعنی نہ وہ مسلمان رہا اور نہ انگریز بن سکا۔ اپنی قوم کو ہیٹ اور پتلون پہنا کر بھی وہ یورپ کے مقابلے میں کوئی ترقی قابل ذکر اور نظر آنے والی نہیں کر سکا اس نے تو اتنی مادی ترقی بھی نہیں کی جتنی ملائیشیا اور پاکستان نے کی ہے۔ پھر دین کو چھوڑنے کا کیا فائدہ ہوا۔ اقبالؒ نے صحیح کہا تھا ؎

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

ہمارا اسلام تو ایسا ہی ہے جیسا کہ مولانا رومؒ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ قزوین میں رواج تھا کہ بدن کو گدوایا کرتے تھے۔ کسی شخص نے گودنے والے سے کہا کہ میری کمر پر شیر کی تصویر بنا دو۔ اس نے سوئی لے کر جیسے ہی اس کو چبھویا تو اس نے کہا: "آہ غضب کرتا ہے۔ بھئی کیا بناتا ہے؟" اس نے کہا شیر کی دُم بناتا ہوں۔ بولا بھئی دم کا کیا کام؟ کیا بغیر دم کے شیر نہیں ہوتا؟ اس دم نے تو میرا دم نکال دیا۔ اس نے دم بنانا چھوڑ دیا۔ پھر اس نے دوسری طرف سوئی چبھوئی۔ پھر پوچھا: "ارے بھائی کیا بناتا ہے؟" کہا: "پیٹ بناتا ہوں۔" کہا: "ارے یہ کوئی کھانا کھائے گا؟ پیٹ بھی چھوڑ دے۔" اس نے پیٹ بنانا بھی چھوڑ دیا۔ اسی طرح اس نے دوسری طرف سوئی چبھوئی۔ پھر پوچھا: "کیا بناتا ہے؟" کہا: "منہ بناتا ہوں۔" بولا: "ارے بھائی! یہ تو تصویر ہے، اسے بولنا نہیں پڑے گا، اسے بھی چھوڑ۔" اس نے اسے بھی چھوڑ دیا۔ پھر اور طرف سوئی چبھوئی۔ اس نے پھر پوچھا: "بھئی! اب کیا بناتا ہے؟" اس نے کہا: "کان بناتا ہوں۔" کہا: "کیا شیر بغیر کان کے نہیں ہوتے؟" کان بھی چھوڑ۔" اب بنانے والے نے جھلا کر سوئی پھینک دی اور کہا:

شیر بے گوش و سر و اشکم کہ دید
ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید

بغیر کان اور سر اور پیٹ کے کوئی شیر کسی نے کب دیکھا ہے؟ ارے ایسا شیر تو خدا نے بھی پیدا نہیں کیا۔
بالکل یہی حال ہمارا ہے۔ ہمارا ہر شعبۂ زندگی مغرب کی تقلید میں غیر اسلامی ہے لیکن پھر بھی ہم اپنے کو اسلام کا علم بردار کہتے ہیں۔

اندلس کی اہم شخصیات

اندلس نے جب علوم وفنون میں اتنی ترقی کی جس کا تذکرہ گذشتہ صفحات کیا گیا ہے تو مختلف علوم و فنون کی اس ترقی کے باعث اس نے علم وفن کے ہر شعبے میں بڑی اہم شخصیات دنیا کے سامنے پیش کیں جن میں سے چند اہم شخصیات کا اجمالی تذکرہ آئندہ صفحات میں کیا جاتا ہے تاکہ پتہ چلے کہ ان اہم لوگوں نے علمی دنیا میں کیا کیا کارنامے انجام دیے۔

① حافظ ابن حزم الاندلسی رحمہ اللہ:

علامہ ابن حزم اندلسی اس ملک کے رہنے والے تھے جس کو اس زمانے میں تمام بلاد اسلامیہ میں فردوس بریں کی حیثیت حاصل تھی۔ افسوس کہ جب ان کے اس وطن عزیز اندلس کی یاد آتی ہے تو اب بھی دل سے خون کے فوارے ابلنے لگتے ہیں۔ حسرت وندامت اور اس کے ساتھ عبرت پذیری کے جذبات ابھرتے ہیں۔ دل میں غم وغصے اور حزن وملال کا سمندر موجیں مارنے لگتا ہے۔ ابن حزم اپنے زمانے کے ایک عظیم فقیہ، زبردست، جلیل الشان حافظ، وسیع النظر محدث، دقیق النظر عالم دین، بے مثال فاضل، بے نظیر نثر نویس اور اعلیٰ درجے کے شاعر تھے کہ جن کے کلام سے قلبی احساسات اجاگر ہوتے اور نفوس انسانی بہرہ یاب ہوتے۔

ابن حزم کا نام علی بن احمد بن سعید بن حزم اور کنیت ابو محمد تھی۔ آپ نے ابن حزم کے نام سے شہرت پائی لیکن وہ اپنی تصانیف میں اپنا نام نہیں بلکہ اپنی کنیت کا ذکر کرتے ہیں۔ ابن حزم کی پیدائش کا سن وسال تو متعین نہیں لیکن انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں جو انھوں نے اپنے ایک معاصر کو لکھا، اپنی ولادت کا کچھ تذکرہ کیا ہے۔ ابن حزم کے وہ معاصر قاضی صاعد اندلسی صاحب طبقات الامم تھے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ وہ سنہ ۳۸۴ھ ماہ رمضان کی آخری تاریخ کو بعد از فجر اور قبل از طلوع آفتاب پیدا ہوئے۔ ان کی جائے پیدائش قرطبہ کی مشرقی جانب ہے۔ ان کا سن وفات ۴۵۶ھ ہے۔ اس لحاظ سے ان کی عمر ۷۲ سال ہوتی ہے۔

ابن حزم کے آباء واجداد اندلسی حکومت میں وزارت کے عہدے پر فائز رہے۔ وہ خود بھی بعض حکام کے وزیر رہ چکے تھے، لیکن انھوں نے اپنے علم سے نام پایا نہ کہ حسب ونسب اور عہدے سے۔ اس وجہ سے

مؤرخین نے لکھا ہے کہ ابن حزم کے اعزاء و اقرباء علم و ادب اور حسب و نسب دونوں اعتبار سے ممتاز تھے۔ یہ اندلسی اور قرطبی تھے۔

ابن حزم ماں کے پیٹ سے چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے۔ انھیں اپنی خاندانی ثروت پر بڑا ناز تھا۔ بچپن ہی میں قرآن حکیم حفظ کر لیا۔ گھر کی باندیوں اور رشتہ دار خواتین نے حفظ قرآن میں ان کی مدد کی۔ خواتین ہی سے لکھنا پڑھنا سیکھا اور خواتین ہی سے اشعار سیکھے۔ ان کے والد کو بھی ان کی تعلیم و تربیت کی فکر ہر وقت دامنگیر رہتی تھی۔ عنفوان شباب سے قبل ہی انھوں نے ابن حزم کو ایک نیک نہاد اور خوش اخلاق عالم دین کی صحبت میں بٹھا دیا۔ ابن حزم کے استاد شیخ ابوالحسین الفاسی تھے۔ وہ اپنے اس استاد سے بہت متاثر تھے کیونکہ ایک صالح راہ نما کی صحبت صدہا مواعظِ حسنہ اور زبانی جمع خرچ کی نسبت کہیں زیادہ نفس انسانی کو متاثر کرتی ہے۔ اس شیخ کے علاوہ آپ دیگر جہاندیدہ شیوخ کی جانب بھی متوجہ ہو کر ان کے علمی فیوض سے مستفید ہوئے۔ ابن حزم ابھی نوجوان ہی تھے کہ ان کے خاندان کی آرام و راحت کی یہ زندگی پریشانیوں اور کلفتوں میں بدل گئی۔ ان کے والد منصب وزارت پر اس وقت تک رہے جب اموی حکومت اندلس میں رو بزوال تھی اور اقتدار ان کے ہاتھوں سے نکل کر ابو منصور عامری اور اس کے کنبے کی جانب منتقل ہو رہا تھا۔ چنانچہ ابن حزم اور ان کے خاندان کی خوش حالی یکایک عسرت افلاس میں بدل گئی۔ ابن حزم اس بارے میں خود بیان کرتے ہیں کہ جب ہشام المؤید امیر المومنین قرار پائے تو ان کے امراء اور خواص نے ہمیں بہت زیادہ تکلیفیں دیں۔ ہمیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں، ملک بدر ہوئے۔ بڑے بڑے تاوان اور جرمانے ادا کیے اور چھپ چھپ کر اس حیات مستعار کے دن گزارے۔ انھی حالات میں میرے والد جو وزیر تھے، ہفتہ کے روز بعد از نماز عصر ۲۸ر ذی الحجہ سنہ ۴۰۲ھ کو ہمیں تنہا چھوڑ کر ملک عدم کو انتقال فرما گئے۔ (طوق الحمامہ: ص ۱۱۰) سنہ ۴۰۴ھ میں غربی قرطبہ میں ہمارے مکانات کو لوٹ لیا گیا اور ہم انھیں خیر باد کہہ کر مریہ نامی شہر جانے کے لیے مجبور ہو گئے۔ (ایضاً)

ابن حزم نے بچپن ہی میں علوم و فنون کی تحصیل شروع کر دی اور ان کے والد نے عالم طفولیت ہی میں ان کو علم کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ ابن حزم سیاست کی وادی میں قدم رکھنے سے قبل تحصیل علم کی جانب متوجہ ہوئے۔ ازاں بعد آپ سیاسی امور میں شریک کار رہے اور مختلف اوقات میں مختلف مناصب پر حکومتی ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ اگرچہ ان دنوں آپ کو آرام سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا، لیکن آپ کو جب بھی فرصت ملتی آپ وہ وقت درس، مطالعہ اور بحث و تحقیق میں صرف کرتے۔ بہرحال آپ فقہ کے ساتھ ساتھ حدیث، ادب، اخبار، علوم عقلیہ اور فلسفہ وغیرہ بھی پڑھتے پڑھاتے رہے۔ ذہبی نے ابن حزم کے بعض معاصرین سے نقل کیا ہے کہ ہم مقام بلنسیہ میں مالکی فقہ کا مطالعہ کر رہے تھے، ابن حزم سنتے جاتے اور حیران ہوتے جاتے۔ پھر ابن حزم نے فقہ کا کوئی مسئلہ پوچھا۔ حاضرین نے جواب دیا۔ ابن حزم نے اس جواب پر اعتراض کیا تو حاضرین میں سے ایک صاحب بولے: ''یہ آپ کے بس کا روگ نہیں ہے۔'' چنانچہ آپ نے فقہ مالکی اور فقہ شافعی دونوں کا خوب مطالعہ کیا۔ علاوہ ازیں ابن حزم کو جو کتاب

دستیاب ہوتی اس کا مطالعہ کرتے اور ہر قسم کے شیوخ واساتذہ سے مستفید ہوتے۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ آپ سیاست سے الگ ہوکر یہود ونصاریٰ کے خلاف میدان جدل ومناظرہ میں کود پڑے اور اسلام کی مدافعت کے لیے اپنی بہترین قوتیں وقف کر دیں۔ علماء میں سے جو آپ کے نظریات کی مخالفت کرتے آپ ان سے مناظرہ کرتے اور اپنے نظریات کا دفاع کرتے۔ ابن حزم نے میورقہ میں علامہ باجی سے کئی مرتبہ مناظرہ کیا۔ میورقہ میں آپ کے احباب اور تلامذہ کا ایک خاصا وسیع حلقہ تھا اور وہ آپ کے مسلک کے پیرو تھے۔

ابن حزم مختلف اور متنوع علوم وفنون کے ماہر اور جامع تھے۔ وہ ایک عظیم انشا پرداز وادیب ہونے کے ساتھ ساتھ منطق وفلسفہ میں بھی ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے اور منطق میں ارسطو تک کی غلطیاں نکالتے تھے۔ وہ بڑے دقیق النظر مؤرخ بھی تھے اور تاریخ کے نازک ترین جزو یعنی علم الانساب پر بڑی عالمانہ گفتگو کرتے تھے۔ ان تمام علوم وفنون میں ان کا اشہب قلم اپنی جولانی کے جوہر دکھاتا اور آپ ایک محقق عالم کی حیثیت سے علم الانساب میں کامیاب رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک عظیم محدث بھی تھے اور جملہ اصناف حدیث کے حافظ بھی۔ ابن حزم نے ظاہری فقہ کو جنم دیا اور کتاب وسنت کے علوم کو حیات نو بخشی اور یہ ثابت کیا کہ تغیر زمانہ سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل کتاب وسنت میں موجود ہے۔ چنانچہ قیاس کا سہارا لیے بغیر کتاب وسنت کی طلب وتحقیق کے لیے فقہ ظاہری کی متعین کردہ راہ پر چلنا ابن حزم کے لیے ناگزیر تھا۔

ابن حزم اسلام کے علاوہ دیگر ادیان وملل سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔ غیر مسلم مذاہب وادیان کی تردید ابن حزم کا خاص موضوع تھا۔ فرقوں کے باہمی فرق وامتیاز پر وہ بڑی عمیق نگاہ رکھتے تھے اور ان کے خلاف جدل وبحث میں حریت فکر ونظر کی راہ پر گامزن تھے۔ کتاب وسنت کے مخالف قول کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہ تھی خواہ اس کا قائل کوئی بڑے سے بڑا عالم ہی کیوں نہ ہو۔ آپ تردید فلاسفہ کے میدان میں امام غزالی سے سبقت لے گئے اور ان کے دلائل کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ فلسفیوں کی تردید میں آپ انھی کا انداز بیان اختیار کرتے۔ مختصر یہ کہ ابن حزم علوم اسلامیہ کے بحر عمیق کے غواص وشناور تھے اور اس میں ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے۔ باطل کی تردید میں ان کا لہجہ بڑی شدت اختیار کر جاتا تھا۔ آپ مسببات کے اسباب بتاتے، نتائج کے مقدمات کی نشان دہی کرتے اور اقوال کی غایات ومقاصد زیر بحث لاتے۔ ابن حیان ان کا شدید مخالف ہونے کے باوجود کہتا ہے کہ ''جب سائل کوئی سوال پوچھ کر گفتگو کا سلسلہ کر چھیڑ دیتا تو گویا علم کا ایک ایسا سمندر امنڈ آتا جس کو ڈولوں کی آمد ورفت گدلا نہ کرتی۔'' (معجم الادباء: ۲۴۹/۱۲)

اسی طرح علامہ ذہبی نے ابن حزم کے بارے میں کہا کہ ''قاضی صاعد اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ ابن حزم تمام اندلسی علماء کی نسبت زیادہ جامع العلوم اور وسیع المعرفت تھے۔ آپ لسانیات، بلاغت، شعر اور سیّر واخبار میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ان کے بیٹے فضل نے مجھے بتایا کہ ان کے والد ابن حزم نے اپنے ہاتھ سے

قریباً چار سو کتابیں تحریر کی تھیں۔ امام ذہبی کا قول ہے کہ ابن حزم پر ذکاوت و فطانت، علوم کتاب و سنت، علوم ادیان و ملل، عربیت و آداب، منطق و شعر، صدق و دیانت، دولت و ثروت، کثرت کتب اور جاہ و حشمت کا خاتمہ ہوگیا۔ (معجم الادباء: ۱۲/ ۲۵۶، نفح الطیب: ۶/ ۲۰۴)

ابن حزم کی قوت حافظہ بھی بے مثل تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ان تمام صلاحیتوں سے نوازا تھا جو حصول علم کے لیے درکار ہوتی ہیں۔ زبردست قوت حافظہ آپ کی اولین خصوصیت تھی۔ کسی عالم کی قوت حافظہ ہی وہ عظیم خصوصیت ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ جو چیز پڑھتا ہے اس پر قابو پالیتا ہے۔ ابن حزم کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی قوت حافظہ عطا کی تھی۔ اسی کی وجہ سے آپ نے احادیث نبویہ ﷺ کو یاد کیا اور ان کے مصادر و مآخذ کو ترتیب دیا اور علم حدیث میں بڑے بڑے حفاظ کے مساوی درجہ پایا۔

آپ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے اقوال و آثار کا بیشتر حصہ یاد تھا جس کی بنا پر آپ فقہ صحابہ و تابعین کے یگانۂ روزگار عالم تھے۔

ان تمام خوبیوں اور صلاحیتوں سے بہرہ ور ہو کر بھی آپ ان پر نازاں نہ تھے، بلکہ ان کا اس بات پر قوی ایمان تھا کہ یہ سب خدا کی ودیعت کردہ ہیں اور اس پر انھیں شکر خداوندی بجالانا چاہیے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ان پر مفتخر و نازاں ہونے کی صورت میں وہ کفران نعمت کے مرتکب ہوں گے۔ جو لوگ اپنی فکری اور دماغی صلاحیتوں پر اتراتے اور نازاں ہوتے تھے، وہ انھیں شدید ملامت کرتے تھے۔ چنانچہ ابن حزم لکھتے ہیں:

”اگر تم اپنے علم و فضل پر نازاں ہو تو تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی دین ہے اور تمھاری ذاتی قابلیت کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ناراض مت کیجیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم آزمائش خداوندی میں مبتلا ہو جاؤ۔ تمہارا سب علم ہاتھ سے جاتا رہے اور تم اسے مطلقاً بھول جاؤ۔ مجھے عبدالملک بن طریف نے بتایا جو بڑے ذہین و فطین اور معتدل مزاج عالم دین تھے کہ ان کا حافظہ پہلے بڑا قوی ہوتا تھا۔ جو بات سنتے یاد ہو جاتی اور اس کے اعادہ ضرورت نہ ہوتی۔ ایک مرتبہ وہ بحری جہاز میں سوار ہوئے اور بڑے خطرناک واقعہ سے دوچار ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی قوت حافظہ جاتی رہی اور وہ ذکاوت و فطانت بعد میں انھیں کبھی حاصل نہ ہوئی۔ ذاتی طور پر مجھے (ابن حزم کو) بھی ایسی بیماری سے سابقہ پڑا تھا جس سے میں نے شفا پائی۔ اس مرض کے دوران میری قوت حافظہ جاتی رہی۔ چند سالوں کے بعد مجھ میں وہ قوت حافظہ پھر عود کر آئی۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بہت سے اہل علم انتہائی جدوجہد اور طلب علم میں ذوق و شوق کے باوجود کوئی علمی مقام پیدا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لہٰذا صاحب علم کو یہ بات بخوبی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اگر علم کا انحصار سعی و جہد پر ہوتا تو دوسرے لوگ اس پر فائق ہوتے، لہٰذا صحیح بات یہ ہے کہ علم خدا کا ودیعت کردہ ہے۔ اس پر کبر و عجب کا اظہار درست نہیں بلکہ یہ مقام اس امر کا مقتضی ہے کہ سجدۂ شکر بجا لایا

جائے اور عجز و انکسار کا اظہار کیا جائے۔ اس کے مزید انعامات کی دعا کی جائے اور علم کے نسیان و ضیاع سے خدا کی پناہ مانگی جائے۔ (مداوۃ النفوس: ص ۵۰)

ان سب خوبیوں کے باوصف ابن حزم کے مزاج میں شدت اور حدت تھی۔ آپ علانیہ حق بات کہتے تھے یہاں تک کہ آپ کے معاصرین کو یہ کہنا پڑا کہ "ابن حزم عالم ہیں لیکن علم کی سیاست سے نا آشنا ہیں۔ آپ حق بات کہنے میں صراحت و وضاحت اور بیان دلیل پر ہی اکتفاء نہ کرتے تھے بلکہ آپ کی زبان قلم پر بعض ایسے الفاظ بھی آ جاتے تھے جن میں شدت پائی جاتی تھی۔ تیزیٔ طبع کا عیب علماء میں بڑا معیوب سمجھا جاتا ہے، تاہم آپ دو وجوہات کی بنا پر شدت اور حدت کے حامل تھے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ ان کے مخالفین کے عزائم بڑے قبیح تھے۔ کسی عالم کے لیے اس سے بڑی اذیت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی سعی و جہد کے ثمرات و نتائج کو نذر آتش کر دیا جائے۔ بڑے سے بڑا بردبار شخص بھی ایسے منظر کو دیکھ کر اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ اگرچہ یہ ایک بہت بڑا سبب ہے ابن حزم کی طبیعت کی شدت کا لیکن ہمیں اس عالم نابغہ اور فطری حکیم و فلسفی سے یہ توقع تھی کہ ان حالات میں بھی ان کا دامن غیظ و غضب کے اظہار سے پاک ہوتا۔ ابن حزم کی حدت طبع کا دوسرا سبب ایک بیماری تھی جس نے آپ کی طبیعت میں چڑچڑا پن پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ ایک مرتبہ میں سخت بیمار پڑا جس میں میری تلی بڑھ گئی۔ اس کی وجہ سے مجھ میں چڑچڑا پن، تنگ ظرفی، قلت صبر اور سبک سری کے عوارض پیدا ہو گئے۔ جب مجھے اپنے اخلاق کی تبدیلی کا احساس ہوا تو میں سخت بے قرار ہوا۔ مجھے صحیح طور پر معلوم ہے کہ جسم انسانی میں تلی وہ مقام ہے جہاں سے فرحت و انبساط کے چشمے پھوٹتے ہیں، لیکن تلی میں جب فساد پیدا ہو جاتا ہے تو انسان کا مزاج مغلوب الغضب اور چڑچڑا ہو جاتا ہے۔

(مداوۃ النفوس: ص ۵۴)

ابن حزم پر ایک وقت ایسا بھی آیا جب اندلس کا ماحول نہایت پر سکون تھا۔ چنانچہ صاحب نفح الطیب نے لکھا ہے کہ:

"جب عرب مغربی ممالک پر حملہ آور ہوئے تو فرنگی بادشاہ قارلہ نے کہا کہ میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ ابھی عربوں سے کچھ تعرض نہ کیا جائے۔ ان کی حالت ابھی اس طوفان جیسی ہے جو ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ ابھی یہ نئے نئے اٹھے ہیں اور ان میں وہ خلوص نیت پایا جاتا ہے جس کی موجودگی میں یہ کثرت افراد سے بے نیاز ہیں۔ ان کے جسم اتنے مضبوط ہیں کہ انھیں ظاہری حفاظت کے لیے زرہ کی ضرورت نہیں۔ ابھی انھیں اتنی مہلت دو کہ ان کے ہاتھ زر و دولت سے بھر جائیں۔ مکانات تعمیر کر لیں۔ حکومت و سلطنت سے دل چسپی لینے لگیں اور ایک دوسرے کے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ جب یہ سارے باتیں ان میں آ جائیں تو پھر تم بڑی آسانی سے ان پر قابو پا لو گے۔ بخدا! جو کچھ فرنگی بادشاہ نے کہا تھا وہ بالکل درست نکلا۔ مسلمانوں کی یہ حالت ہوئی کہ وہ اپنے مسلمان

بھائیوں کے خلاف اپنے پڑوسی عیسائیوں سے مدد کے درخواست گار ہوئے۔'' (نفح الطیب: ۲/۲۲۷)

فرنگی بادشاہ کی طرف سے قول کی نسبت صحیح ہو یا غلط لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے۔ عرب جونہی اندلس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوئے اور نسیم صبح گاہی کے جھونکوں نے مشام جان کو معطر کیا تو وہ آرام کی نیند سو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے اور ان میں شدید اختلافات رونما ہو گئے۔

اندلس میں بربر اور مختلف عرب قبائل آباد تھے۔ کوئی صاحب ثروت و شوکت حاکم موجود نہ تھا۔ طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ والیانِ حکومت کمزور و ناتواں تھے۔ بعض سے سلطنت کے عوام راضی نہ ہوتے تھے جس کی وجہ سے اس کی کمزوری میں اضافہ ہو جایا کرتا تھا۔ کسی والی سے اگر حکومت راضی ہوتی تو اس کی امداد کرنے سے قاصر رہتی تھی۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ سلطان مغرب اپنی طرف سے اندلس کا والی مقرر کیا کرتا تھا۔ جب والی کی سیاسی قوت کمزور پڑ جاتی تو پھر بڑی شدت سے اختلافات ظاہر ہونے لگے۔ پہلے بربر اور عربوں میں فتنہ بپا ہوا۔ پھر عربوں میں باہم خانہ جنگی شروع ہوئی اور بڑی شدت اختیار کر گئی۔ یمنی اور مضری عربوں میں خاص طور پر زیادہ فسادات پھیلے۔ وہ کبھی آپس میں لڑنے لگتے اور کبھی لڑائی بند کر دیتے لیکن دلوں میں حسد و عناد کی آگ شعلہ زن رہتی جو تھوڑی دیر کے بعد شدید فسادات کی صورت اختیار کر لیتی۔ اور اس سے اسلامی سلطنت کو بھی بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

طوائف الملوکی کے اس دور میں عبدالرحمٰن الداخل جو ''صقر قریش'' (قریش کا عقاب) کے لقب سے مشہور تھا، وارد اندلس ہو کر یہاں کا حکمران ہو گیا۔ اس نے اندلسی حکومت میں نظم و ضبط پیدا کیا اور سب کو ایک جھنڈے تلے اکٹھا کیا۔ اندلس کی سرسبز و شاداب وادی میں مروانی سلطنت اور اندلسی حضارت و تہذیب باہم مل جل گئیں۔ ابن حزم رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ اندلس میں مروانی حکومت سب حکومتوں سے زیادہ پر شوکت تھی اور دشمن اس سے لرزاں و ترساں رہا کرتے تھے۔ وہ عزت و شوکت کے اس مقام پر پہنچ گئی تھی جس میں اضافہ ممکن نہیں۔ (نفح الطیب: ۳/۷۱)

مروانی سلطنت کے زمانے میں مسلمانوں کو بڑی فتوحات حاصل ہوئیں۔ یہ سلطنت اعدائے دین کے مقابلے کے لیے جم کر کھڑی ہو گئی۔ دشمنان اسلام کے دماغوں سے ابھی عربوں کے پہلے حملہ کا خوف بھی دور نہ ہو سکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اموی حکومت کے قیام سے قبل مسلمانوں کے اختلافات کے درمیان بھی وہ ان پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہ کر سکے۔ جب سرزمین اندلس میں تشتت و افتراق کے بعد وحدت پیدا ہوئی تو یورپ کے اس حصہ میں دین اسلام کو مزید استحکام نصیب ہوا۔ ملک کی سرحدیں مضبوط اور مستحکم ہو گئیں۔ مسلسل اور پیہم لڑائیوں سے فرنگی مضطرب ہو گئے یہاں تک کہ یورپ کے بادشاہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر امن و سلامتی کے خواست گار ہوتے تھے۔ ان کے وفود قرطبہ کے دارالسلطنت میں حاضر ہوا کرتے تھے جو اس وقت نہایت

بارونق شہر تھا۔قرطبہ کی نفاست کا یہ عالم تھا کہ بلند پہاڑوں سے پانی چھوٹی چھوٹی نالیوں میں آتا اور محلات تک پہنچتا تھا۔ (نفح الطیب: ۲/۱۲۵)

تمام اموی سلاطین یکساں نہ تھے۔ ان میں بعض کمزور بھی تھے، اور ان کے سیاسی ضعف کے باعث فتنے رونما ہوتے رہتے تھے، اور مسلمان بھی ان کی بنا پر اپنے دشمنوں کے مقابلے میں کمزور پڑ جایا کرتے تھے۔ تاہم اموی دور حکومت میں اسلام کا بول بالا رہا۔ اموی حکمران بادشاہ تھے خلفاء نہ تھے۔ انھوں نے خلافت کا دعویٰ کبھی نہ کیا۔ جب چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں عبدالرحمٰن الناصر الاموی سربر آرائے سلطنت ہوا اس وقت بغداد میں عباسی خلافت روبزوال تھی۔ امراء اور وزراء اقتدار پر قابض تھے اور خلافت کا صرف نام باقی رہ گیا تھا۔ اس دور میں عبدالرحمٰن الناصر نے خلافت کا دعویٰ کیا اور امیر المؤمنین کہلانے لگا۔ بعد میں آنے والوں نے پھر یہی لقب اختیار کر لیا۔

عبدالرحمٰن الناصر کے عہد حکومت میں اندلس کی اسلامی حکومت رفعت وشوکت کی معراج پر پہنچ چکی تھی۔ فرنگی لرزاں و ترساں تھے۔ اسلامی ممالک میں الناصر کی حکومت بلاد مغرب تک پہنچ گئی تھی، لیکن آفتاب حکومت کے وسط آسمان پر پہنچتے ہی زوال کے آثار نمودار ہونے لگے۔ الناصر کے بعد اس کا بیٹا تخت خلافت پر بیٹھا وہ بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلا لیکن اس کی سلطنت دیرپا ثابت نہ ہوسکی۔ اس نے صرف ۱۶ سال حکومت کی جب کہ اس کا والد عبدالرحمٰن الناصر پچاس برس تک تخت حکومت پر متمکن رہا تھا۔ جب ہشام المؤید تخت خلافت پر متمکن ہوا تو اقتدار پر المنصور بن ابی عامر مکمل طور پر قابض تھا۔ ابن حزم رحمہ اللہ کے والد احمد بن سعید اسی کے وزیر تھے۔ المنصور کی ذاتی قوت وشوکت کی وجہ سے حکومت کا نظام بدستور چلتا رہا۔ جب سنہ ۳۹۲ھ میں نے وفات پائی تو فسادات رونما ہوگئے۔ قرطبہ ان کی اولین آماجگاہ بنا اور ابن حزم رحمہ اللہ پہلے تھے جو فسادات کی آگ میں جھونکے گئے۔

جب مسلمانوں نے اندلس کی سرزمین کو فتح کیا تو عیسائیوں کو اندلس کے ایک مضبوط قلعہ میں جگہ دی تھی۔ اسلامی حکومت کی ضرر رسانی کے لیے یہ قلعہ ایک کانٹے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی سلطنت کے جسم میں یہ ایک رستا ہوا ناسور تھا۔ مسلمانوں نے اپنے دور اقتدار میں اس مرض کا استیصال نہ کیا کیونکہ جسم انسانی جب طاقتور ہو تو وہ مرض کو محسوس نہیں کرتا بلکہ قدرتی طور پر اس کا دفاع کرتا رہتا ہے۔ کمزور ہونے پر مرض بڑے زور سے حملہ آور ہوتا ہے اور جسم پر غلبہ کر کے اسے موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ اندلس کے ایک قلعہ میں پناہ لینے والے عیسائیوں کی حالت بھی یہی تھی کہ وہ گھات میں لگے رہتے تھے۔ جب فرصت کا وقت پاتے تو اسے غنیمت تصور کرتے۔ ابومنصور عامر کی موت کے بعد یہ موقع انھیں مل گیا۔ مسلمانوں کی باہمی مخالفت عیسائیوں کی مزید معاون ثابت ہوئی۔ وہ ایک دوسرے کی مخالفت کے لیے عیسائیوں سے مدد کے خواستگار ہوئے۔

ان دنوں ہشام المؤید برائے نام خلیفہ تھا۔ منصور عامری کا بیٹا اپنے باپ کی طرح مسند اقتدار پر قابض تھا۔ بیٹا باپ جیسے اوصاف کا مالک نہ تھا۔ منصور عامری بذات خود بڑا ماہر سیاست دان، دانش ور اور دانش مند، عادل اور جنگ جو تھا۔ بیٹے پر خواہشات نفسانی اور حرص و آز کا غلبہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس بات کی جرأت کر بیٹھا جس کے بارے میں اس کا باپ بایں ہمہ عقل و دانش سوچ بھی نہ سکا تھا، اور وہ یہ کہ اس نے ''امیر المؤمنین'' ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اس نے ہشام سے بھی یہ عہد لے لیا کیونکہ وہ کمزور اور ناتوانی کے باعث ابن منصور کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بربر بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے خلیفہ ہشام کو خلافت سے معزول کر دیا اور مہدی کے نام سے ایک شخص کو تخت خلافت پر بٹھا دیا، لیکن بربر نے اسے بھی مہلت نہ دی اور بڑے فسادات رونما ہوئے جس کی وجہ سے قرطبہ برباد ہو کر رہ گیا۔ اہل قرطبہ عموماً ان سے متاثر ہوئے۔ ابن حزم رحمہ اللہ کا خاندان ان کی خصوصی آماجگاہ بنا۔ ابن حزم رحمہ اللہ نے یہ سب واقعات اپنے قلم سے لکھے ہیں۔

فسادات اندلس کے اثرات ابن حزم رحمہ اللہ پر بھی بہت پڑے۔ ان فسادات کا ابن حزم پر پہلا اثر یہ ہوا کہ وہ فردوس اندلس یعنی قرطبہ کی بربادی سے شدید رنج والم کا شکار ہوئے۔ آپ نے اپنے ایک رسالہ میں ان آلام و محن کی تصویر کھینچی ہے۔ جب انھوں نے قرطبہ میں اپنے آبائی مکانات کی بربادی کا حال سنا تو کہا:

> ''جب قرطبہ سے آنے والے ایک شخص سے میں نے اپنے مکانات کا حال پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس نے قرطبہ کی مغربی جانب ہمارے مکانات ملاحظہ کیے۔ اب ان کا نام و نشان تک باقی نہیں۔ اب تو یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں واقع تھے۔ فرسودگی ان پر اثر انداز ہو چکی ہے اور آبادی کے بعد وہ ایک سنسان ویرانہ میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ پہلے مانوس تھے اور اب وحشت ناک ہیں۔ کسی زمانے میں نہایت خوبصورت تھے اور اب کھنڈر ہیں۔ اب وہ مہیب گھاٹیوں کی صورت اختیار کر چکے ہیں حالانکہ پہلے وہ جائے سکون و اطمینان تھے اب وہاں بھیڑیئے رہتے ہیں، اور جن و غول صحرائی وہاں ہنستے کھیلتے ہیں۔ پہلے وہاں شیروں جیسے بہادر انسان اقامت پذیر تھے اور اب وحشی جانوروں کا بسیرا ہے۔'' (طوق الحمامہ: ص۹۴)

دوسرا اثر ابن حزم رحمہ اللہ نے بچشم خود دیکھا کہ نصاریٰ غالب ہوتے جا رہے ہیں اور مسلمان روز بروز کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ ابن حزم ایک مومن، متقی، عالم اور محدث شخص تھا۔ ان کا ایمان تھا کہ غلبہ اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کے لیے ہونا چاہیے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ اس کمزوری کا راز مسلمانوں کے تشتت و افتراق اور وحدت ملی کے فقدان ان میں مضمر ہے اور اس کا واحد علاج ایک ایسی شخصیت کا وجود ہے جو مسلمانوں کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو مجتمع کر دے۔ وہ جانتے تھے کہ اہل اندلس بنو امیہ کے سوا بحیثیت مجموعی کسی اور کی اطاعت قبول نہیں کر سکتے۔ بربر نے پہلے اور اب ملک کو صرف برباد کیا ہے اسے فائدہ نہیں پہنچایا، لہٰذا وہ اس کوشش میں لگ گئے۔ بنو امیہ سے ان کے مراسم اور تعلقات پہلے بھی خوش گوار تھے۔

ابن حزم رحمہ اللہ ایک معزز سیاسی گھرانے سے وابستہ تھے، لہٰذا انھوں نے محسوس کیا کہ ایک قومی اور دینی فریضہ ان کے ذمہ واجب الادا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ کے لیے درس و مطالعہ سے الگ تھلگ ہو کر اس قومی ذمہ داری کو اپنے نازک کندھوں پر لے لیں، چنانچہ وہ اس کے لیے تیار ہو گئے۔ جب قریباً سنہ ۴۰۸ھ میں ایک صالح اموی شخص بلنسیہ میں اس کام کے لیے تیار ہو گیا تو آپ اس کی حمایت اور نصرت کے لیے تیار اور کمربستہ ہو گئے۔ حکومت کی بہتری سے ناامید ہو کر آپ سیاست کو خیر باد کہہ کر علم کی طرف لوٹ آئے اور اس کے چشمہ سے اپنی علمی پیاس بجھاتے رہے۔

سنہ ۴۲۲ھ میں اموی خلافت بھی اندلس سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی اور مسلمانوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ سرزمین اندلس جسے فردوس ارضی کہا جاتا تھا، پارہ پارہ ہو گئی۔ چنانچہ علامہ مقری نے اس کے بارے میں یوں لکھا ہے:

''کرۂ ارضی سے اموی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ مغرب میں بھی خلافت کا شیرازہ بکھر گیا۔ طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ بربر، عرب اور موالی میں سے جو لوگ امارت و سیادت سے بہرہ ور تھے، ادھر ادھر پھیل گئے اور اندلس کو آپس میں بانٹ لیا۔ ان امراء کو ہر وقت ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ آخر کار بعض امراء سیاسی غلبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ عیسائیوں کے زیر سایہ رہتے تھے اور انھیں خراج ادا کرتے تھے، مبادا وہ ان پر غالب ہو کر ان کا ملک چھین لیں۔ کچھ عرصہ تک ان کی یہی حالت رہی یہاں تک کہ والیٔ مراکش یوسف بن تاشفین سمندر عبور کر کے آئے اور ان سے حکومت و سلطنت چھین کر خود قابض ہو گئے۔'' (نفح الطیب: ۵۹/۴)

ابن حزم رحمہ اللہ نے ملکی حالات کے خراب ہونے اور مسلمان امراء کی غلط پالیسیوں کے باعث سیاست کو خیر باد کہہ کر علم کا رخ کیا اور پھر ۳۶ سال تک لگاتار علم کی خدمت میں لگے رہے۔ یہاں دو امور اور بھی قابل غور ہیں۔

ایک یہ کہ اندلس میں مسلمانوں کے عیسائیوں سے اختلاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن حزم رحمہ اللہ نے بنظر غائر مختلف ادیان و مذاہب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ کامل غور و خوض سے یہ سوچنے لگے کہ عیسائیوں کے مذہب میں تحریف کی وجوہات کیا ہیں۔ عیسائیوں سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنے کے بعد آپ ان سے مصروف جدل و مناظرہ ہوئے۔ ان کے مصادر و موارد سے آشنائی پیدا کی۔ ان کے افکار و معتقدات سے آگاہ ہوئے اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی اولین دعوت سے روشناس ہوئے۔

دوسری بات یہ کہ یہ طبعی بات تھی کہ ابن حزم رحمہ اللہ ان امراء کو احترام کی نگاہ سے نہ دیکھتے جو نصاریٰ سے مدد کے خواستگار ہوتے، ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے یا ان کو خراج ادا کرتے تھے۔ بخلاف ازیں ابن حزم رحمہ اللہ ان کو حقیر تصور کرتے تھے کیونکہ انھوں نے دنیا کو آخرت، ذلت کو عزت اور گھٹیا چیزوں کو دین کے مقابلے میں ترجیح دی۔ یہی وجہ تھی کہ امراء آپ کے دشمن بن گئے اور آپ کی کتابیں تک جلا دیں۔ وطن عزیز آپ

کے لیے سازگار نہ رہا اور آپ اپنی آبائی زمین میں آ کر سکونت پذیر ہو گئے۔ وہاں رہتے ہوئے آپ درس و مطالعہ، تصنیف و تالیف اور علماء سے مراسلت کرنے میں مصروف رہے یہاں تک کہ آپ اپنے رب سے جا ملے۔

ابن حزم رحمہ اللہ مختلف علوم کے جامع تھے۔ ابن حبان ابن حزم کے علم و فضل کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ابو محمد ابن حزم رحمہ اللہ گوناگوں اور بوقلموں علوم کے ماہر تھے، مثلاً حدیث و فقہ، جدل و نسب اور متعلقات ادب اس کے پہلو بہ پہلو علوم قدیمہ مثلاً منطق اور فلسفہ سے بھی پوری طرح بہرہ ور تھے۔ انھوں نے ان فنون میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ اگر چہ وہ اغلاط سے مبرا نہیں جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ بڑی جرأت سے علوم و فنون پر حملہ آور ہوتے تھے۔'' (معجم الادباء، یاقوت حموی: ۱۲/۲۴۷)

ابن حبان کی ابن حزم کے بارے میں اس رائے سے عیاں ہوتا ہے کہ ابن حزم رحمہ اللہ کا علمی دائرہ خاصا وسیع تھا۔ وہ صرف حدیث و فقہ کی تنگنائے میں محدود نہ تھے بلکہ سبھی علوم و فنون میں مہارت رکھتے تھے خواہ وہ علوم عقلی ہوں یا نقلی۔ اس پر آپ نے علوم ادبیہ کے فلسفہ کا بیش بہا اضافہ کیا۔ آپ منطق میں اجتہاد کے درجہ تک پہنچ گئے تھے۔ آپ نے اپنے عقلی معیار پر اس کے قیاسات وضع کیے اور منطق کے دائرے میں محصور اور مقید نہ رہے بلکہ اس کا موازنہ کیا اور اسے آزمایا۔ آپ صرف نقلی علوم ہی کے عالم بے بدل نہ تھے بلکہ اس سے بڑھ کر عقلیات میں بھی کماحقہ بصیرت رکھتے تھے۔ بایں ہمہ وہ اعلیٰ درجہ کے تاریخ دان بھی تھے۔

ابن حزم رحمہ اللہ کا علم و فضل صرف قلب و لسان تک محدود نہ تھا بلکہ انھوں نے اپنے علوم و فنون صفحات قرطاس پر بھی بکھیر دیے تھے۔ یہ بیش قیمت علمی ذخیرہ اخلاف کے یہاں محفوظ رہا جو دلائل و آثار، فقہ و جدل اور اخلاق و فلسفہ کے رنگ میں ان کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔ ابن حزم رحمہ اللہ کی تصانیف سے ان کی علمی وسعت اور جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے ہمیں کسی سنسان ویرانہ میں نہیں چھوڑا کہ ہم ان کے افکار و آراء کی قدر و قیمت کرنے میں حیران اور ششدر ہوں اور ہمیں پتہ نہ چل سکے کہ ان کے پیش رو علماء کے مقابلے میں ان کے علمی نظریات کس درجہ کے ہیں۔ اس کے برعکس انھوں نے اپنے افکار کو بیش قیمت کتابوں کے اوراق میں مدون کر دیا ہے تاکہ ہم علیٰ وجہ البصیرت ان کا مطالعہ کر سکیں۔

ابن حزم اپنے مجادلات میں چند ایک عقلی قیاسات کے پابند تھے جن سے باہر نکلنا آپ کو گوارا نہ تھا۔ ابن حزم بیان کرتے ہیں کہ انسان بحیثیت انسان بدیہیات سے آگاہ ہے۔ وہ بدیہیات کو ''علم النفس'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ابن حزم بدیہات کی مثال دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں مثلاً یہ کہ جز وکل کی نسبت چھوٹا ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صغیر السن بچہ بھی اس کا ادراک کر سکتا ہے یہاں تک کہ سن تمیز کو پہنچنے سے قبل ہی وہ اس سے آشنا ہوتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ بچے کو ایک کھجور دیں تو وہ دوسری طلب کرتا ہے اور جب تیسری دے دیں تو وہ مزید خوش ہوتا ہے۔

ابن حزم رحمہ اللہ کا علمی اسلوب تحریر عمدگی اور نفاست کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کے الفاظ مربوط اور طرز

نگارش علمی انداز تحریر کا آئینہ دار ہے۔ آپ کے طرز تحریر کی بڑی خوبی سلاست بیان ہے جس کی وجہ طوالت تحریر نہیں بلکہ اس کی ذاتی وضاحت وصراحت ہے۔ اس کی تین وجوہات ہیں:

① اسلوب ابن حزم رحمہ اللہ کی وضاحت کی پہلی وجہ اس کی طوالت ہے۔ طوالت کی بنا پر قاری عبارت کا مطلب بڑی آسانی سے سمجھ جاتا ہے اور اس کے فہم وشعور میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

② دوسری وجہ یہ ہے کہ ابن حزم رحمہ اللہ جن موضوعات پر لکھتے ہیں ان پر انھیں انتہائی عبور حاصل ہے اور وہ ان پر اس شخص کی طرح اظہار خیال کرتے ہیں جس نے ان مسائل کو سمجھا ہو اور اس میں وہ رچ بس گئے ہوں۔ طرز تحریر میں الجھاؤ اور پیچیدگی کے دو اسباب ہوتے ہیں:

-1 پہلا یہ کہ کاتب عجمیت کی بنا پر وضاحت پر قادر نہیں ہوتا۔

-2 دوسرا یہ کہ موضوع زیر بحث پر چنداں دست رس نہیں ہوتی یا اس کا صحیح فہم وشعور نہیں ہوتا، لیکن ابن حزم رحمہ اللہ میں یہ دونوں باتیں نہ تھیں۔ نہ وہ لسان وقلم کے اعتبار سے عجمی تھے اور نہ ہی موضوع زیر بحث سے بے گانہ، بلکہ وہ زیر قلم عنوانات اور موضوعات میں ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے اور اس کے تمام پہلوؤں سے آگاہ ہوتے تھے۔

③ وضاحت کی تیسری وجہ ابن حزم رحمہ اللہ کی حسن تقسیم، حصر موضوعات اور ان کا تجزیہ وتحلیل ہے۔ وہ موضوع زیر بحث میں نہ کسی بیرونی مسئلہ کو داخل کرتے ہیں اور نہ اس میں کوئی ایسا ذکر چھیڑتے ہیں جو دوسرے موضوع کا جزو ہو اور موضوع کلام سے اسے کوئی واسطہ نہ ہو۔ جب کسی مسئلہ کا تعلق دو مختلف موضوعات سے ہو تو اسے دونوں جگہ ذکر کر دیتے ہیں۔ پہلے میں تفصیلاً اور دوسرے میں اجمالاً تاکہ ہر موضوع قائم بالذات اور اپنی جگہ پر بلا کسی اجمال وابہام کے واضح ہو۔ خلاصہ کلام یہ کہ ابن حزم رحمہ اللہ کا علمی اسلوب ان کی ذات اور ان کے طرز فکر ونظر کی طرح تاباں ودرخشاں ہے۔

ایک بات جو عام طور پر ابن حزم رحمہ اللہ کے بارے میں مشہور ہے، وہ اختلافی مسائل میں ان کی تلخ بیانی ہے۔ بلاشبہ دوسروں کے افکار بیان کرنے میں آپ کا لب ولہجہ نہایت تند وتیز ہے یا ان کے اپنے الفاظ میں سبک سری اور خفت کا مظہر ہے، مثلاً جہاں تکفیر کا موقع نہیں ہوتا وہاں وہ دوسروں کی تکفیر سے بھی گریز نہیں کرتے۔ جو سبک سر نہیں ہوتا اسے وہ اس عیب سے داغ دار کرتے ہیں، اور دوسرے فقہاء کی نسبت ایسی تعبیرات سے احتراز نہیں کرتے۔

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ابن حزم کی تلخ کلامی بعض اوقات درست اور اپنے محل پر ہوتی ہے، لیکن اکثر وبیشتر یہ بے موقع ہوتی ہے اور معقول حدود سے تجاوز کر جاتی ہے۔ یہاں پہنچ کر قاری کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اس حدت وشدت کے اسباب کیا تھے۔ ہمارے خیال میں اس کی تین وجوہات تھیں:

① پہلی وجہ ان کا مرض تھا۔ آپ ایک شدید بیماری میں مبتلا تھے جس کی بنا پر ان کے مزاج میں چڑچڑا پن

اور قلت برداشت کے عوارض پیدا ہو گئے تھے۔ اس بیماری کے بعد انہوں نے اپنی طبیعت میں یہ تغیر محسوس کیا تھا۔ (مداوۃ النفوس: ص ۵۵)

بے شک ابن حزم رحمہ اللہ نے جو بات اپنے بارے میں کہی ہے وہ درست ہے کیونکہ ہر شخص اپنی حالت دوسروں سے بہتر جانتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا سب تندی و تیزی صرف اسی ایک بات پر مبنی تھی؟ بے شک بیماری کا پیدا ہو جانا تغیر مزاج کا ایک جوہری سبب ہے مگر تنگ ظرفی کا عارضہ جب کسی شخص کو لاحق ہوتا ہے تو اس کے آثار محرکات کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہوتے۔ جب محرکات ظاہر نہ ہوں تو نفس پرسکون رہتا ہے، لہٰذا اس کے ساتھ کسی دوسرے سبب کا پایا جانا ضروری ہے۔

(۲) ابن حزم رحمہ اللہ کی تیزیٔ طبع کا دوسرا سبب ان کے معاصرین کی بدسلوکی ہے۔ آپ کو متہم کیا گیا۔ قوم نے آپ سے تعلقات منقطع کر لیے۔ آپ پر مظالم کے پہاڑ ڈھائے گئے۔ آپ کی ناقدری کی گئی۔ آپ کو گوشۂ خمولت میں ڈالنے کی کوشش کی گئی بلکہ حد سے تجاوز کر کے آپ کے ثمرات فکر (تصانیف) کو اعلانیہ اشبیلیہ کے شہر میں نذر آتش کر دیا گیا۔ بڑے سے بڑا بردبار آدمی بھی اس کی تاب نہیں لا سکتا چہ جائیکہ ایک ایسا شخص اسے برداشت کر سکتا جو مبتلائے مرض ہونے کے باعث اپنے حلم اور قوت برداشت کو کھو چکا تھا اور اس میں تنگ ظرفی اور قلت برداشت کے عوارض پیدا ہو گئے ہوں اور وہ اپنے حلم کو کھو چکا ہو، اور اس میں تنگ ظرفی اور قلت صبر کے عوارض پیدا ہو گئے تھے یا پھر بقول ابن حزم رحمہ اللہ کے اس میں خفت عقل نے جنم لے لیا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حافظ ابن حزم رحمہ اللہ بڑے قوی اور مضبوط ادراک کے مالک تھے۔ آپ دوسروں سے الفت اور محبت کرتے۔ دوسرے آپ کو چاہتے۔ جب آپ سے سنگ دلانہ سلوک کیا گیا تو یہ ایک ایسی نفسانی علت تھی جو آپ کی جسمانی بیماری سے بھی بڑھ کر تھی۔ اگر ایک طرف آپ مرض کا شکار تھے تو دوسری جانب لوگوں کی قساوت قلبی سے بھی دوچار تھے، اور اس پر مزید یہ کہ آپ خداداد علمی صلاحیتوں کی بنا پر بڑے غیور و نفور بھی تھے۔ ان امور کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ آپ بھی مخالفین کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے اور ان کی غلطیوں کی نشان دہی بڑی بے باکی سے کرتے۔ بعض اوقات اعداء کی پیدا کردہ درشتی حد سے تجاوز کر جاتی اور آپ ان ائمہ کو جن کی تقلید کا وہ دم بھرتے تھے، بڑی جسارت سے غلط کار قرار دیتے حالانکہ ان ائمہ کو غلط کار کہنے کا انھیں کوئی حق نہیں تھا۔

درشتی طبع کا لازمی نتیجہ سخت گوئی کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ جب اعداء نے آپ کو دینی شذوذ کی تہمت لگا کر ایذا دی تھی تو آپ نے بھی ان کے ائمہ کو جن کی وہ تقلید کرتے تھے، خطا کار اور سبک سر قرار دیا اور اس میں کسی گناہ یا ملامت کی پروا نہ کی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملامت میں ابتدا کرنے والے ابن حزم رحمہ اللہ کے مخالفین تھے۔ پھر ان پر کیا عتاب ہو سکتا۔ شذوذ کا جو بہتان بلا دلیل لگایا گیا آخر اس کے سوا

اس کا کیا علاج؟

③ خلاقیات پر مشتمل ابن حزم رحمہ اللہ کی تصانیف میں شدت کی تیسری وجہ یہ ہے کہ آپ کی تصانیف دراصل ان اعداء کی اشتعال انگیزی کا نتیجہ ہیں جو آپ کے خلاف ہر وقت صف آراء تھے۔ گویا یوں کہیے کہ ان کتب کا خمیر ہی تیزی طبع سے اٹھایا گیا تھا اور ان کی آبیاری شدت وحدت ہی سے کی گئی تھی، لہٰذا اس میں تیز کلامی اور تلخ نوائی کا ہونا ناگزیر تھا کیونکہ پھل درخت کے تابع ہوتا ہے۔ جس قسم کا پودا بویا جاتا ہے پھل بھی اسی قسم کا آتا ہے۔ پھل بھی اسی پانی سے غذا پاتا ہے جس سے درخت اپنی غذا لیتا ہے۔ ابن حزم رحمہ اللہ نے خود اس کی صراحت کر دی ہے کہ جہلاء کی تنقید نے انھیں بڑا فائدہ پہنچایا۔ مخالفین کی نقد وجرح کا ابن حزم پر یہ اثر ہوا کہ آپ کا ذہن روشن ہو گیا۔ طبیعت نے جلا پائی اور آپ کی ذہنی صلاحیتیں جاگ اٹھیں۔ اس ذہنی بیداری کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن حزم نے یہ کتابیں تصنیف کیں۔ اگر مخالفین آپ کی خوابیدہ صلاحیتوں کو نہ جگاتے تو ابن حزم اس قدر گراں بہا کتابیں تصنیف نہ کر سکتے۔

خلاصہ کلام اختلافی مسائل پر مشتمل ابن حزم کی تصانیف ان مجادلات وتنازعات کا نتیجہ تھیں جو ان کے اور ان کے مخالفین کے درمیان بپا ہوئے، لہٰذا ان کی عبارتوں میں جو شدت اور حدت پائی جاتی ہے وہ نقد وجرح کے ان مظاہر کی آئینہ دار ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ ابن حزم رحمہ اللہ کا علم قابل اعتماد نہیں۔ اس میں وسعت کے باوجود پختگی کی شان نہیں اور نہ باقاعدہ طور پر اس نے ائمہ فن سے علم حاصل کیا تھا۔ جب تک اساتذہ سے باقاعدہ طور پر علم کی معرفت حاصل نہ ہو ثقاہت فی العلم کا درجہ حاصل نہیں ہوتا، چہ جائیکہ اس کے قول سے کسی دوسرے کی ثقاہت ثابت کی جائے۔ ابن حزم ہی کے ہم وطن غرناطہ کے جلیل القدر عالم و عارف علامہ شاطبی اپنی کتاب ''الموافقات فی اصول الشریعہ'' میں ارشاد فرماتے ہیں:

''اور اس اصول کے درست اور صحیح ہونے پر تجھ سے یہی دلیل کافی ہے کہ تو کوئی ایسا علم نہ پائے گا کہ لوگوں کو اس کے علم پر اعتماد ہو مگر یہ کہ کوئی اس کا رہبر اور استاذ ضرور ہوگا جو اپنے وقت میں اسی کی طرح مشہور ہوا ہو۔ اور بہت کم کوئی ایسا گمراہ فرقہ یا مخالف سنت شخص دیکھا جائے گا کہ وہ اس اصول سے ہٹا ہوا نہ ہو، اور اسی وجہ سے ابن حزم ظاہری کے علم کو معیوب گردانا گیا ہے کہ اس نے اساتذہ کو لازم نہیں پکڑا، اور نہ ہی ان کے آداب کی پروا کی ہے۔'' (الموافقات: ۱/۱۵، مصر)

اسی وجہ سے بعض علماء نے لکھا ہے کہ حجاج بن یوسف کی تلوار اور ابن حزم کا قلم دونوں بے لگام چلتے ہیں۔ پس ابن حزم کا کسی ثقہ کو مجہول قرار دے دینا اور مجہول کو ثقہ کہہ دینا کوئی امر بعید نہیں۔ وہ چاہتے تو علم حدیث کے مسلم ثقہ امام ترمذی کو جن کی کتاب جامع ترمذی صحاح ستہ میں خاص درجہ رکھتی ہے، مجہول قرار دے

دے اور چاہے تو نافع بن محمود جیسے مجہول الحال راوی کو ثقہ کہہ دے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ابن حزم کہتا ہے:

محمد بن عیسیٰ بن سورہ مجھول۔ (تہذیب التہذیب: ۹/۳۸۸، میزان الاعتدال: ۳/۶۷)

''محمد بن عیسیٰ بن سورہ مجہول ہے۔''

چنانچہ ابن حزم رحمہ اللہ پر اعتماد کر کے اگر امام ترمذی جیسے ثقہ امام کو مجہول نہیں مانا جا سکتا تو پھر نافع بن محمود جیسے مجہول الحال کو ثقہ بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اکثر و بیشتر علماء نے ابن حزم رحمہ اللہ کے تقلید کے مسئلہ کے بارے میں بھی اختلاف کیا ہے۔ ابن حزم نے ظاہری فقہ کو اس لیے گلے لگایا کہ آپ حرمت تقلید کے قائل تھے۔ وہ دین کے کسی گوشہ میں بھی تقلید کی اجازت نہیں دیتے بلکہ تقلید سے منع کرتے ہیں۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ

''تقلید حرام ہے۔ کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کی بات بلا دلیل تسلیم کرے۔''

(النبذ: ص۵۴)

یہ بات تو کچھ سمجھ میں آتی ہے کہ جس شخص میں اجتہاد کے شرائط پائے جاتے ہوں یا وہ تہذیب و ثقافت کی بنا پر دلائل کا موازنہ کرنے پر قادر ہو اور کوئی بات بلا دلیل تسلیم نہ کرتا ہو، اس کے بارے میں تو شاید ابن حزم کا نقطۂ نظر درست سمجھا جا سکتا ہے کہ اسے کسی کی تقلید نہیں کرنا چاہیے لیکن ابن حزم رحمہ اللہ یہ کہنا کہ ایک عامی شخص کے لیے بھی کسی کی تقلید جائز نہیں، سمجھ سے بالاتر ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''عامی کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی معین امام کی پیروی کرے بلکہ جب وہ کسی پیش آمدہ حادثہ میں شرعی حکم معلوم کرنا چاہتا ہو تو اسے چاہیے کہ کسی ایک عالم کی تخصیص کیے بغیر علماء سے اس کا حکم دریافت کرے جب تک اس عالم کی دلیل اسے معلوم نہ ہو تب تک اس کا اتباع نہ کرے تاکہ وہ دلیل کی پیروی کرے نہ کہ کسی شخص کی۔''

ابن حزم رحمہ اللہ کی یہ دلیل کہاں تک معقول ہے؟ غور کرنے کی بات ہے کہ جو شخص عامی کو تقلید کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہم اس سے دریافت کریں گے کہ وہ کس کی تقلید کرے؟ اگر وہ یہ کہتے کہ اپنے شہر کے عالم کی تقلید کرے تو ہم دریافت کریں گے کہ اگر اس کے شہر میں دو مختلف الخیال عالم ہوں تو پھر کیا کرے؟ آیا دونوں میں جس کی چاہے تقلید کرے؟ یہ تو ایک نیا دین ہوا۔ آخر ایک ہی دین میں اور ایک ہی مسئلہ میں دو مختلف حکم کیسے ہو سکتے ہیں؟ ایک حرام اور ایک حلال، اور لطف یہ ہے کہ دونوں خدا کی طرف سے ہوں۔

ابن حزم رحمہ اللہ کی انہی باتوں کے باعث اکثر و بیشتر علماء نے ان سے اختلاف کیا ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

﴿۲﴾ ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابو بکر فرح الانصاری:

اسلام کے دو بنیادی مصادر و مآخذ ہیں۔ ایک قرآن اور دوسری سنت نبوی ﷺ یا حدیث۔ قرآن حکیم میں ایک معجزانہ شان پائی جاتی ہے۔ مفردات الفاظ، ترکیب کلمات، اسلوب بیان، خلوص مقاصد، جامعیت مضامین، ربط آیات، انتہائے بلاغت وغیرہ کے لحاظ سے دانشوران عالم اور دنیا کے فصحاء و بلغاء اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ کسی کلام کی وقعت اور عظمت کے لحاظ سے چند چیزوں کا ہونا ضروری اور لازمی ہے۔ جس کلام میں یہ چیزیں ہوں گی وہ ایک عظیم کلام ہوگا۔

﴿۱﴾ ان میں سب سے پہلی چیز علم و فضل ہے۔ اگر متکلم عالم و فاضل ہوگا تو اس کا کلام بھی بلند و برتر ہوگا۔ فصیح و بلیغ ہوگا اور اگر متکلم جاہل اور احمق ہوگا تو اس کے کلام سے جہالت اور حماقت ٹپکے گی، اور آدمی اس کے کلام کو سن کر ہی یہ کہہ دے گا کہ یہ کسی جاہل اور احمق کا کلام ہے۔ معلوم ہوا کہ کسی کلام کے عظیم اور فصیح و بلیغ ہونے کے لیے سب سے پہلی چیز علم اور خبر ہے۔

﴿۲﴾ دوسری چیز دانش و فہم ہے کیونکہ عالم کے لیے عاقل ہونا بھی ضروری ہے تاکہ اس کا کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو۔ اگر عقل و دانش اور فہم و فراست نہ ہوگی تو کلام بھدا اور غیر مؤثر ہوگا۔

﴿۳﴾ تیسری چیز اس سلسلے میں منصب اور مقام ہے۔ کلام کرنے والا اگر کسی عظیم منصب پر فائز ہے، صاحب حیثیت و منصب ہے تو اس کا کلام بھی بلند اور برتر ہوگا۔ چنانچہ جب کسی ملک کا صدر یا وزیر اعظم کوئی کلام کرتا ہے تو اس کے کلام کا ایک ایک لفظ نپا تلا ہوگا، مقتضائے حال کے مطابق ہوگا، اور سننے والوں کے دل پر اثر بھی کرے گا اور دلوں میں اس کی وقعت بھی پیدا ہوگی کیونکہ کلام کسی شخص کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ چنانچہ شیخ سعدی نے بالکل صحیح فرمایا

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد   عیب و ہنرش نہفتہ باشد

جب یہ بات مسلم ہے کہ جس شخص کا جتنا بڑا علم ہوگا اتنا ہی اس کا کلام بھی بڑا ہوگا، اور جس قدر کسی کا منصب بلند ہوگا اس کا کلام بھی اتنا ہی بلند ہوگا۔ اس نظریہ سے حق تعالیٰ شانہ کی ذات ہر لحاظ سے بلند و برتر ہے، علم اس کا لامحدود ہے اور وہ ہر غیب و حاضر کا جاننے والا۔ جس طرح وہ بادل کی گرج کو سنتا ہے اسی طرح زمین کی تہہ میں چکنے پتھر پر رینگنے والی چیونٹی کی آواز کو بھی سنتا ہے۔ وہ سمیع و بصیر ہے، علیم بذات الصدور ہے یعنی دلوں کے مخفی رازوں کو بھی جاننے والا ہے۔ اس لیے اس کا کلام ظاہر و باطن پر حکمران ہوگا اور جامع ترین اور عظیم ترین ہوگا۔ اس میں ہر لحاظ سے جامعیت ہوگی۔ فصاحت بھی اعلیٰ، بلاغت بھی اعلیٰ اور بداعت بھی اعلیٰ ترین ہو گی۔ اللہ تعالیٰ جو کلام فرمائے گا اس کلام سے بہتر یوں ممکن نہیں کہ نہ خدا کی کوئی نظیر ہے اور نہ ہی اس کے کلام کی کوئی نظیر ہو سکتی ہے۔ نہ اس کا کوئی مثل ہے اور نہ اس کے کلام کا کوئی مثل ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا: ”لا یأتون

بمثلہ" یعنی اس کے کلام کا کوئی مثل نہیں لاسکتا اس لیے اس کی ذات وصفات کا مثل کوئی موجود نہیں۔

قرآن حکیم صرف معجزانہ شان ہی نہیں رکھتا بلکہ یہ منبع علوم وفنون اور سرچشمۂ ہدایت بھی ہے۔ اس میں انسانیت کے روحانی، مادی، انفرادی، اجتماعی، سیاسی، قومی اور ملی ہر طرح اور ہر قسم کے مسائل کے حل کی راہ نمائی فراہم کرتا ہے۔ اسی وجہ سے دنیا کے ہر خطے اور ہر ملک کے انسان نے قرآن حکیم سے استفادہ کیا۔ اور اس کے پیغام ہدایت کو عام کرنے اور اسے اگلی نسلوں تک پہنچانے کے لیے بہت محنت کی۔ قرآن حکیم مسلمانوں کے لیے ایک نسخہ کیمیا ہے۔ چنانچہ مسلمان دنیا کے جس خطے میں بھی گئے انھوں نے قرآن حکیم کے مفاہیم اور احکام کو کھول کر آسان زبان میں بیان کیا تاکہ عوام الناس ان کو آسانی سے سمجھ کر اور اپنی زندگی میں ان کو سمو کر ان پر عمل پیرا ہو سکیں۔ پھر مسلمانوں نے قرآن حکیم کی صرف تفسیر پر ہی توجہ نہیں دی بلکہ اس کی قرأت، رموز و اوقاف، محکمات ومتشابہات، غرائب القرآن، مشکلات القرآن، بدیع ومعانی، علم البیان، لغوی امور، صرف ونحو کے قواعد، حکمت وفلسفہ، اصول تاریخ، قصص القرآن، سیاسی، سماجی، اقتصادی اور سائنسی علوم وفنون کے اصول و قواعد کو مختلف طریقوں سے دنیا میں متعارف کرایا۔

دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح جب مسلمان اندلس میں وارد ہوئے تو اہل علم مسلمانوں نے مختلف انداز اور مختلف پہلوؤں سے اس کا مطالعہ کیا اور قرآن سے متعلق مختلف کتابیں تصنیف کیں جو اندلس کے علمی ورثے کا ایک شاندار باب ہے۔ اندلس کے بے شمار علماء نے قرآن حکیم کی تفسیر اور علوم قرآنیہ پر بڑی شاندار اور اعلیٰ قسم کی تصانیف یادگار چھوڑیں جن پر تفصیلی بحث کرنا بہت مشکل اور وقت طلب کام ہے لیکن اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ علمائے اندلس نے قرآنی علوم اور تفسیری ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ اس تفسیری مجموعے میں چند ایک کتابیں آج بھی دنیا کے اہل علم خراج تحسین وصول کر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" ہے جو قرطبہ کے ایک جید اور ثقہ عالم دین نے یادگار کے طور پر چھوڑی۔ اس یگانہ روزگار تفسیر کے مصنف ابو عبداللہ محمد بن احمد شہر قرطبہ کے مشہور عالم تھے جو آج بھی "امام قرطبی" کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ یہ نہایت متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ یہ تصنیف وتالیف کے علاوہ اپنا زیادہ تر وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف کیا کرتے تھے۔ انھوں نے قرطبہ کے بڑے جید علماء سے علم حاصل کیا اور ابو العباس بن عمر القرطبی سے سند حدیث حاصل کی۔ شیخ ابو العباس نے صحیح مسلم کی ایک شرح "المفہم" کے نام سے تالیف کی ہے۔ امام قرطبی نے اپنی بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں جن میں چند ایک حسب ذیل ہیں:

① تفسیر الجامع لاحکام القرآن

② کتاب التذکار فی افضل الاذکار

③ التذکرہ بامور الآخرہ

④ شرح اسماء اللہ الحسنیٰ

آپ کی تفسیر قرطبی ایک نہایت مفید اور مقبول کتاب ہے جو احکام القرآن کے موضوع پر دنیائے علم کی چند اہم کتابوں میں سے ایک ہے۔ بعض بلاد اسلامیہ کی جامعات میں یہ شامل نصاب ہے۔ اس تفسیر کی خوبیوں کے بارے میں ابن فرحون نے ان الفاظ میں اسے خراج تحسین پیش کیا:

”هو من اجل التفاسير واعظمها نفعًا، واسقطه منه القصص والتواريخ، واثبت عوضها احكام القرآن واستنباط الادله، وذكر القراء ات والاعراب و الناسخ والمنسوخ“ (ابن فرحون: الدیباج المذہب فی معرفۃ اعیان علماء المذاہب: ص ۳۱۷)

یعنی یہ تفسیر اپنے فوائد کے لحاظ سے بڑی تفسیروں میں سے ایک ہے۔ اس سے قصے اور تاریخی واقعات حذف کر دیے گئے ہیں اور ان کی جگہ احکام قرآنی اور آیات سے احکام کے استنباط کے دلائل، اختلاف قرأت اور اعراب نیز ناسخ و منسوخ وغیرہ امور کو شامل کیا گیا ہے۔

امام قرطبی اس اپنی تفسیر کے مقدمہ میں اس کا سبب تالیف اور اپنا طریقۂ تفسیر نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے اور جن شرائط کو انھوں نے تفسیر بیان کرتے وقت اپنے پیش نظر رکھا ہے، ان کی بھی تفصیل بیان کر دی ہے۔ (تفسیر قرطبی: ص ۲۔۳)

امام قرطبی سب سے پہلے زیر تفسیر قرآنی آیت کا شان نزول بیان کرتے ہیں۔ پھر اختلاف قرأت اور وجوہ اعراب بیان کرتے ہیں اور قرآن حکیم کے غریب اور نادر الفاظ کے معانی اور مفہوم کو متعین کرتے ہیں اور معانی بیان کرنے میں وہ لغت کی کتابوں سے استشہاد کرتے ہیں۔ تفسیر بیان کرتے وقت باطل عقائد اور باطل فرقوں کا بھی بھرپور انداز میں دلائل کے ساتھ رد کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اسلاف سے بھی اس تفسیر میں بہت کچھ نقل کیا ہے۔ تفسیر اور احکام القرآن کے سلسلے میں انھوں نے اسلاف کی مرویات کو اپنی تفسیر میں خاص جگہ دی ہے۔ چنانچہ انھوں نے جگہ جگہ طبری، ابن العربی، ابن عطیہ اور ابوبکر جصاص رازی کے حوالے کثرت سے دیے ہیں۔ انھوں نے اپنی تفسیر میں تعصب سے کام نہیں لیا بلکہ ہر مسلک کے دلائل و براہین پوری دیانت داری سے بیان کر کے فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا ہے۔ ویسے وہ فقہی مسلک کے لحاظ سے مالکی ہیں لیکن جب وہ قرآنی احکام بیان کرتے ہیں تو پھر ہرگز جانب داری سے کام نہیں لیتے، اور جو فقہی مسلک قرآن و حدیث کے مطالب کے قریب تر ہو اس کی نشان دہی کرتے ہیں۔ چنانچہ فقہ مالکی میں بچے کی امامت کو جائز نہیں کہا گیا لیکن امام قرطبی اپنے مالکی مشرب و مسلک کے خلاف بچے کی امامت کے جواز کے قائل ہیں۔ (تفسیر قرطبی: ۳۵۴/۱) اسی طرح کئی مسائل ہیں جن میں امام قرطبی نے مالکی ہونے کے باوجود امام مالک رحمہ اللہ کے مسلک کی مخالفت کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام قرطبی اپنی تفسیر میں آزادانہ رائے قائم کرتے ہیں، تاہم آپ دوسروں پر بے جا تنقید بھی نہیں کرتے جس سے دوسروں کی تنقیص ہو جیسا کہ آج کل کے مفسرین کا طریقہ ہے۔ انھوں نے تمام احکام اور مسائل کو مسلکی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر بیان کیا ہے۔ چنانچہ احکام القرآن اور منقول تفسیری

ادب میں امام قرطبی کی تفسیر کو نمائندہ تفسیر ہونے کا درجہ حاصل ہے۔

کافی عرصے تک یہ تفسیر ایک مخطوطے کی شکل میں رہی لیکن اب کافی طویل عرصے سے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے۔ چنانچہ احکام القرآن اور تفسیری علوم پر تحقیقی کام کرنے والے دانش ور اور اسکالر اس سے بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ امام قرطبی کی وفات ۶۷۱ھ میں ہوئی۔

﴿۳﴾ اثیر الدین ابوعبداللہ محمد بن یوسف بن ابی حیان:

اندلس کے مفسرین میں ایک اہم نام ابوحیان کا بھی ہے۔ ان کی پیدائش ۶۵۴ھ میں اندلس کے شہر غرناطہ میں ہوئی۔ انھوں نے قرآن حکیم خطیب عبدالحق بن علی اور اندلس کے دوسرے نامور قراء سے پڑھا اور قرأت قرآن میں یدطولیٰ حاصل کیا۔ اندلس اور افریقہ کے بہت سے محدثین سے حدیث نبوی ﷺ کا سماع کیا۔ چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ ''ان کو جب بھی دیکھا گیا تو وہ کسی سے سماع ہی کر رہے ہوتے تھے، یا پھر مطالعہ میں مشغول ہوتے تھے یا کتاب دیکھ رہے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کو اور کسی اور حالت میں نہیں دیکھا گیا۔''

(ابن العربی، احکام القرآن: ۱/۱۳۱)

ابن حیان نے یہ ایک ضخیم تفسیر لکھنے کے علاوہ بہت سے اشعار یادگار چھوڑے ہیں۔ وہ علم اللغۃ اور صرف ونحو کے بھی امام تھے۔ ان علوم میں ان کا قول حجت سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ان علوم میں جب بھی کسی کو مشکل پیش آئی تو وہ ابوحیان کی طرف رجوع کر کے اپنی مشکل کا حل دریافت کرتا۔ ان علوم کے علاوہ وہ علم الرجال، حدیث اور طبقات الرجال کے بھی بڑے ماہر مانے جاتے تھے۔ ابن حیان کی مندرجہ ذیل تصانیف متداول ہیں:

① تفسیر البحر المحیط
② غریب القرآن
③ نہایۃ الاعراب وخلاصۃ البیان
④ الشاطبیہ کے وزن پر علم القرأت میں ایک قصیدہ

ابوحیان کا فقہی مسلک شافعی تھا۔ وہ سلف کے عقیدے پر کاربند تھے، فلسفے اور اعتزال سے انھیں قطعاً کوئی رغبت نہیں تھی۔

ان کی تفسیر البحر المحیط آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے، یہ اہل علم میں متداول ہے اور قرآن فہمی کے لیے اساسی مأخذ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ قرآن حکیم کے وجوہ اعراب پر اس میں خصوصی بحثیں موجود ہیں جس سے اہل علم مستفید ہوتے ہیں۔ قرآنی آیات کے بارے میں جو جو نحوی بحثیں مفسرین نے اپنی کتابوں میں کی ہیں، ان میں ابن حیان کی تفسیر ''البحر المحیط'' سب سے اوپر کا درجہ رکھتی ہے کیونکہ ابن حیان صرف ونحو کے امام مانے جاتے تھے۔ انھوں نے بصریوں اور کوفیوں کے نحوی امور پر اختلافات پر نہایت دیانت داری اور

وضاحت سے بحث کی ہے۔ چنانچہ بعض اہل علم البحرالمحیط کو تفسیر کے بجائے نحو کی کتاب خیال کرتے ہیں۔ ابو حیان نے اپنی تفسیر میں یہ منہج اختیار کیا ہے کہ قرآنی آیت تحریر کرنے کے بعد وہ مفرد الفاظ کے لغوی معنی بیان کرتے ہیں۔ شان نزول اور ناسخ و منسوخ کے مسائل بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ کہیں کہیں اختلاف قرأت کی بحث بھی کرتے ہیں کیونکہ فنِ قرأت میں بھی ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ آیات احکام میں وہ فقہی مسائل بھی تفصیل سے بیان کرتے ہیں اور آیت کے سمجھانے میں وہ متقدمین اور متاخرین کی آراء بھی ذکر کرتے ہیں اور قرآنی آیات کا باہمی ربط بھی ان کی تفسیر کا ایک خاص موضوع ہے۔ قرآن حکیم میں جو الفاظ ایک سے زیادہ مرتبہ آئے ہیں، ایسے الفاظ کے بارے میں ابوحیان نے دوسرے اہم مفسرین کی طرح یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جب کوئی لفظ پہلی بار آیت میں آتا ہے تو وہ اس کی نہایت تفصیل سے تفسیر بیان کرتے ہیں اور اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتے لیکن جب وہی لفظ دوسری بار آتا ہے تو وہ اس کی تفسیر بیان نہیں کرتے۔ اس طریقے سے وہ قاری کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس لفظ کی تفسیر اس جگہ تلاش کرے جہاں یہ لفظ قرآن حکیم میں پہلی بار آیا تھا۔ ایسا کرنے سے ابوحیان نے اپنی تفسیر کو بے جا طوالت اور غیر ضروری تکرار سے محفوظ کر لیا ہے۔

ابوحیان نے اپنی تفسیر کے مقدمے میں یہ بات وضاحت سے بیان کر دی ہے کہ جب میں نے ایسی آیات کی تفسیر بیان کی جن کا تعلق فقہی احکام سے ہے تو وہاں میں نے چاروں فقہی مکاتب فکر کے ائمہ کرام کے اقوال نقل کیے ہیں، ایسا کرتے وقت میں نے فقہی دلائل بیان نہیں کیے۔ جن آیات کا تعلق تصوف اور سلوک سے ہے، ان آیات کی تفسیر کے ضمن میں اہل تصوف کے اقوال میں نے نہایت اختصار سے بیان کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوحیان کے زمانے میں تصوف کو علمی درجہ حاصل ہو چکا تھا۔

ابوحیان نے اپنی تفسیر میں باطنی ملحدوں کے ایسے اقوال نقل نہیں کیے جن کے ذریعے وہ عربی الفاظ کو ان کے لغوی مفہوم سے باہر نکال دیتے ہیں اور اس یاوہ گوئی کے ذریعے وہ لوگ اللہ تعالیٰ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد پر بہتان تراشی کرتے ہیں اور ایسا کرنے کو وہ علم التاویل کا نام دیتے ہیں۔

ابوحیان نے اگرچہ علامہ زمخشری کی الکشاف اور ابن عطیہ کی الوجیز سے بہت سے اقوال نقل کیے ہیں لیکن بعض مسائل میں ان دونوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ ابوحیان نے زمخشری سے بہت استفادہ کیا اور زمخشری نے قرآن حکیم کے جن لغوی پہلوؤں کو اجاگر کیا ابوحیان نے اپنی تفسیر میں ان کی جگہ جگہ دل کھول کر تعریف بھی کی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ کہا: ''انھیں علوم قرآن میں حظ وافر عطا ہوا تھا اور انھوں نے معانی آفرینی اور لفظی مہارت کو یک جا اکٹھا کر دیا۔''

ابوحیان عقیدے کے اعتبار سے چونکہ اہل السنّت والجماعت تھے اس لیے وہ زمخشری پر ان تمام مقامات پر تنقید کرنے سے نہیں چوکتے جہاں زمخشری نے اعتزال کے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

ابوحیان کی تفسیر زیادہ تر نحوی طرز کی تفسیر ہے اس لیے بظاہر تفسیر پر نحوی پہلو غالب نظر آتا ہے اور اسی

امتیاز اور زمخشری کے برعکس اعتزال سے پاک ہونے کی وجہ سے یہ تفسیر اہل علم میں آج بھی مقبول اور متداول ہے اور قرآنی علوم کا مختلف پہلوؤں سے دقیق مطالعہ کرنے والوں کی توجہ کا مرکز ہے۔

ابوحیان کی وفات سنہ ۷۴۵ھ میں مصر میں ہوئی۔ (الذہبی محمد حسین، التفسیر والمفسرون: ۱/ ۳۰۱)

④ ابوبکر محمد بن عبداللہ المعافری الاشبیلی:

ابوبکر محمد بن عبداللہ اندلس کے انتہائی بلند پایہ علماء میں سے ہیں۔ یہ سنہ ۴۶۸ھ میں اشبیلیہ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی۔ پھر اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے مصر، بغداد، شام اور مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور ان شہروں کے اہل علم و فضل سے اکتساب فیض کیا یہاں تک کہ انھیں قرآن و حدیث، فقہ اور اصول فقہ وغیرہ میں کمال حاصل ہوگیا۔ حدیثی روایات کا ایک وسیع ذخیرہ ان کے پاس جمع ہو گیا اور فقہی اور کلامی مسائل پر انھیں پوری دست رس حاصل ہوگئی، اور ادب و شعر کے ساتھ انھیں تفسیر میں ایک خصوصی مقام اور مہارت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ اس طرح ابوبکر ابن العربی علوم و فنون اور حدیث و روایت کا ایک بہت بڑا ذخیرہ مختلف اساتذہ سے حاصل کر کے اشبیلیہ واپس آئے۔ ان علوم کو انھوں نے کتابی شکل دی اور مختلف علوم و فنون پر بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

① احکام القرآن
② المسالک فی شرح موطا امام مالک
③ کتاب القبس علیٰ شرح موطا امام مالک بن انس
④ عارضۃ الاحوذی علی کتاب الترمذی
⑤ العواصم من القواصم
⑥ کتاب القانون فی تفسیر القرآن العزیز
⑦ کتاب انوار الفجر فی تفسیر القرآن العزیز

غرض کہ ابوبکر ابن العربی نے بہت سی گراں قیمت اور بلند پایہ علمی تصانیف یادگار چھوڑیں جن سے اہل علم آج تک مستفید ہو رہے ہیں۔ ان گراں قیمت کتابوں میں ابن العربی کی تفسیر احکام القرآن بھی ہے۔ ابن العربی نے دنیا کو تفسیر کے ایک نئے منہج سے روشناس کرایا۔ اور وہ نیا منہج احکام القرآن ہے۔ آپ نے فقہ اسلامی کی رو سے قرآن حکیم کی ان آیات سے فقہی احکام کا استنباط کیا جن کا تعلق حلال و حرام اور اوامر و نواہی سے تھا۔ ہمارے خیال میں یہ احکام القرآن کے موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے جو تفسیر کی شکل میں ابن العربی نے تصنیف کی۔ اس کتاب میں انھوں نے قرآن حکیم کی صرف انھی آیات کی تفسیر بیان کی ہے جن میں احکام موجود ہیں۔

⑤ ابو محمد عبدالحق بن غالب بن عطیہ:

مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ اور بھی بے شمار علماء نے تفاسیر لکھیں جن میں ایک نام ابو محمد عبدالحق بن غالب بن عطیہ کا ہے۔ یہ بھی غرناطہ کے رہنے والے تھے اور سنہ ۴۸۱ھ میں ان کی پیدائش ہوئی۔ علم حاصل کرنے کے بعد یہ اندلس کے شہر مرسیہ میں قاضی مقرر ہوئے، اس لیے یہ ''قاضی'' کے نام سے مشہور ہیں۔ قاضی ابن عطیہ کی پرورش اور تربیت ایک علمی گھرانے میں ہوئی اور ان کے دادا عطیہ کا شمار اپنے وقت کے نامور علماء میں ہوتا تھا۔ ابن عطیہ نہایت ذہین، فطین اور نہایت معاملہ فہم انسان تھے۔ انھیں مطالعے کا بے حد شوق تھا اور اسی شوق مطالعہ نے انھیں بلند پایہ فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ تفسیر، حدیث، نحو، صرف، لغت اور ادب و انشاء کے اعلیٰ مرتبے پر فائز کر دیا۔ ابن حیان نے اپنی تفسیر ''البحر المحیط'' کے مقدمہ میں ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے: ''جن اہل علم نے تفسیر میں کتابیں لکھیں اور ان میں بلند پایہ اور جن اصحاب نے اس علم میں طبع آزمائی کی ان میں تحریر اور تشریح کے اعتبار سے سب سے بہتر ہیں۔ ابن فرحون نے ان کو فقہ مالکی کے بلند پایہ اور نامور لوگوں میں شمار کیا ہے۔ ان کی شہرت نہ صرف غرناطہ میں بلکہ مختلف شہروں میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان کی تفسیر ''المحرر الوجیز'' ایک بلند پایہ تفسیر ہے۔ یہ تفسیر ماثور انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس میں تفسیر ابن کثیر کی طرح مرویات پر زیادہ انحصار کیا گیا ہے۔ اس تفسیر کی وجہ سے ابن عطیہ کو دنیا میں بہت شہرت حاصل ہوئی، لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ تفسیر ابھی تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی بلکہ ایک مخطوطے کی شکل میں دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ ابن عطیہ نے مرویات پر جرح بھی کی ہے جس کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ اکثر مفسرین ہر قسم کی روایات اپنی تفاسیر میں درج کر دیتے ہیں جن سے قاری بعض مرتبہ پریشان ہو جاتا ہے۔ الفاظ کے معانی کی تفہیم کے لیے وہ عربی اشعار سے بھی استشہاد کرتے ہیں۔ اس تفسیر میں نحوی مسائل اور اختلاف قراءت کو اہمیت دی گئی ہے۔ اسی وجہ سے ابو حیان نے اپنی تفسیر میں زمخشری اور ابن عطیہ کی تفسیروں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ابن عطیہ کی تفسیر زیادہ وسیع، زیادہ جامع اور زیادہ خالص ہے جبکہ زمخشری کی تفسیر زیادہ مختصر اور عمیق ہے۔'' شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بھی ابن عطیہ اور زمخشری کی تفاسیر کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ابن عطیہ کی تفسیر زمخشری کی تفسیر سے بہتر اور نقل و تعبیر کے لحاظ سے زیادہ صحیح ہے، اگرچہ اس میں بعض بدعات شامل ہیں تاہم وہ بدعتی امور سے زیادہ دور ہے بلکہ وہ ان سب تفاسیر سے زیادہ ترجیح کے قابل ہے۔'' ابن تیمیہ کا خیال ہے ابن عطیہ کچھ اعتزال کی طرف مائل تھے جیسا کہ ان کی کلامی بحثوں سے اجاگر ہوتا ہے۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں بھی اس تفسیر کا اچھے لفظوں میں ذکر کیا ہے کہ یہ تفسیر اہل مغرب اور اہل اندلس میں متداول رہی اور اہل علم میں بہت پسند کی جاتی تھی۔ ابن عطیہ نے خود اس ضخیم تفسیر کا خلاصہ بھی تیار کیا تھا۔ ابن عطیہ کی وفات ۵۴۶ھ میں رقہ میں ہوئی۔

(٦) محی الدین ابن عربی:

معروف عارف وصوفی ابوبکر محی الدین محمد بن علی بن محمد بن احمد بن عبداللہ تصوف کے شہسواروں میں شمار ہوتے ہیں، آپ نے بھی ایک تفسیر لکھی ہے۔ یہ اندلس کے شہر مرسیہ میں سنہ ۵٦۰ھ میں پیدا ہوئے اور ابھی ان کی عمر آٹھ سال کی تھی کہ ۵٦۸ھ میں یہ اشبیلیہ میں منتقل ہو گئے، اور یہاں قریباً تیس سال قیام پذیر رہے۔ اشبیلیہ میں اس وقت بڑے بڑے نامور علماء موجود تھے کیونکہ اشبیلیہ اس زمانے میں ایک بہت بڑا علمی مرکز تھا۔ چنانچہ محی الدین ابن عربی نے اس زمانے کے نامور علماء اور فضلاء سے علمی استفادہ کیا یہاں تک کہ وہ خود بھی علم کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہو گئے۔ بعد ازاں وہ ۵۹۸ھ میں شام، مصر، موصل، ایشیائے کوچک اور مکہ مکرمہ سے ہوتے ہوئے دمشق میں مستقل طور پر قیام پذیر ہو گئے۔ اور یہیں ٦۳۸ھ میں ۷۸ سال کی عمر میں اپنے خالق حقیقی سے ملے۔

ابن عربی کو تصوف میں بھی نہایت اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ ان کو شیخ اکبر کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے مشہور صوفی نظریے ''وحدت الوجود'' کے باعث اہل علم کے نزدیک ایک متنازعہ شخصیت رہے۔ بعض اہل علم نے (جن میں ابن تیمیہ بھی ہیں) ان کے خلاف کفر کے فتوے صادر کیے۔'' ان کی سب سے زیادہ مشہور کتاب ''فتوحات مکیہ'' اہل تصوف کے نزدیک نہایت اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ وہ حدیث وتفسیر کے علاوہ دوسرے علوم وفنون میں بھی ایک بلند پایہ عالم تھے۔ انھوں نے قریباً ڈیڑھ سو تصانیف اہل علم وتحقیق کے لیے یادگار چھوڑیں جو عالمی کتب خانوں کی زینت ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک ابن عربی کو فقہی اور علمی مسائل کے حل میں مجتہد کا درجہ حاصل تھا اور انھوں نے اس بارے میں اصول وضوابط بھی متعین کیے جو علمی حلقوں میں مقبول ہیں۔

ابن عربی کی یہ تفسیر صوفیانہ تفسیر کی نمائندگی کرتی ہے۔ چنانچہ اس تفسیر میں تصوف کے مشہور نظریے ''وحدۃ الوجود'' کو قرآن حکیم کی مختلف آیات سے ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ اس وجہ سے کئی اہل علم ابن عربی کے سخت خلاف ہیں۔ مجدد الف ثانی نے اپنے مکتوبات میں بڑے لطیف انداز میں ابن عربی کی مخالفت کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''مارا فتوحات مدینۃ از فتوحات مکیہ مستغنی ساختہ اند''

جن لوگوں نے ابن عربی کی مخالفت کی ہے، مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ان کی مخالفت کی اور وجوہات کا اپنی ایک کتاب میں جواب دیا ہے جس کا نام ہے ''التنبیہ الطربی فی تنزیہ ابن العربی۔'' یہ تفسیر چونکہ صوفیانہ انداز کی نمائندگی کرتی ہے اس لیے صوفی حضرات کے ہاں بہت مقبول ہے، لیکن یہ کتاب بعض اہل علم کے نزدیک بہت دقیق ہے اس لیے اس کی افادیت مخصوص حلقوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

ان علماء کے علاوہ اندلس کے بے شمار علماء نے تفسیر القرآن پر کام کیا لیکن عیسائیوں کے تعصب کے باعث ان کی وہ کتابیں نذر آتش ہو گئیں اور بعض کتابوں کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

سرزمین اندلس میں جن لوگوں نے تفسیر قرآن پر کام کیا، ان کی تعداد ہزاروں نہیں تو سیکڑوں میں ضرور ہے جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

① ابراہیم بن حسین بن خالد بن مرتیل القرطبی (م:۲۴۹ھ)

② احمد بن ابراہیم بن الزبیری بن محمد غرناطی (م:۷۰۸ھ)

③ احمد بن عبدالرحمٰن بن محمد القرطبی (م:۵۹۲ھ)

④ احمد بن محمد بن احمد (م:۵۶۳ھ)

⑤ احمد بن محمد بن احمد بن ابی عرفہ اللخمی (م:۶۴۳ھ)

⑥ احمد بن محمود السیواسی (م:۸۶۰ھ)

⑦ اسماعیل بن خلف بن سعید الانصاری الرقسطی (م:۴۵۵ھ)

⑧ بقی بن مخلد بن یزید القرطبی (م:۲۷۶ھ)

⑨ بکر بن سہل بن اسماعیل الاحیاطی (م:۲۸۹ھ)

⑩ عبدالکریم بن علی بن عمر الانصاری (م:۷۰۴ھ)

انھوں نے اپنی تفسیر میں الکشاف زمخشری کے ان مقامات کی نشاندہی کی ہے جہاں اعتزال کی ترویج کی گئی ہے۔

⑪ عبداللہ بن سعد بن سعید بن ابی حمزہ (م:۶۹۵ھ)

⑫ عبداللہ بن فرج بن غزلون الطلیطلی الغرناطی (م:۴۸۷ھ)

⑬ عبدالملک بن حبیب بن سلمان بن ہارون القرطبی (م:۲۳۸ھ)

⑭ محمد بن ابراہیم بن احمد بن اسود الغسانی (م:۵۳۶ھ)

⑮ محمد بن احمد بن سلیمان بن احمد بن ابراہیم (م:۶۱۷ھ)

⑯ محمد بن سلیمان بن محمد بن سلیمان بن عبدالملک الشاطبی (م:۶۷۳ھ)

⑰ یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر النمری القرطبی (م:۴۶۳ھ)

⑱ مکی بن ابی طالب حموش بن محمد بن مختار الاندلسی (م:۴۳۷ھ)

⑲ منذر بن سعید بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن القرطبی (م:۳۵۵ھ)

ان حضرات کے علاوہ اور بہت سے مفسرین قرآن ہیں جنھوں نے تفسیر قرآن کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا کر پوری زندگی قرآن حکیم کی خدمت میں صرف کر دی۔

علمائے اندلس اور حدیث:

قرآن حکیم کے بعد دین کا دوسرا اصول اور مأخذ حدیث رسول ﷺ ہے۔ مسلمانوں نے جہاں قرآن حکیم کے علوم کو دنیا میں پھیلایا اسی طرح حدیث رسول ﷺ کو بھی ہر ملک میں ترویج واشاعت کی۔ اندلس میں بھی علم حدیث کے بڑے بڑے ماہر پیدا ہوئے۔ اندلس کے ان محدثین کی تصنیفات آج تک دنیا میں پڑھی جاتی ہیں اور ماہرین علم حدیث ان سے مستفید و مستفیض ہو رہے ہیں جیسے بقی بن مخلد، قاضی عیاض اور حافظ ابن عبدالبر وغیرہ کی تصانیف وتالیفات۔ اندلس میں حدیث نبوی ﷺ کا ورود وتدوین حدیث کے زمانے ہی میں ہو گیا تھا۔ اندلس میں سب سے پہلے جس شخص نے علم الحدیث کو متعارف کروایا، وہ صعصعہ بن سلام الشامی (م: ۱۹۲ھ) تھے۔ عبدالرحمٰن بن معاویہ (م: ۱۳۸ھ) کے عہد حکومت میں غازی بن قیس القرطبی (م: ۱۹۹ھ) موطا امام مالک رحمہ اللہ کو اندلس میں لے کر آئے۔ انھوں نے یہ کتاب براہ راست امام مالک رحمہ اللہ سے مدینہ طیبہ میں جا کر حاصل کی تھی۔ دوسری کتاب صحیح بخاری اندلس میں مشہور اندلسی محدث ابو محمد عبداللہ بن ابراہیم الاصیلی (م: ۳۹۲ھ) لے کر آئے۔ اندلس کے مشہور مؤرخ ابن الفرضی کے مطابق صباشہ بن حسن القیروانی (م: ۳۴۷ھ) نے صحیح بخاری اس کے راوی ابو زید المروزی سے سنی اور اندلس میں آکر یہ کتاب پڑھائی۔ اس طرح حدیث کی دوسری کتابیں بھی اندلس میں مختلف محدثین کے ذریعے پہنچیں اور یہاں کے علماء اس کی تعلیم وتدریس میں مصروف ہو گئے۔ اس کے علاوہ اندلس کے علماء نے مشرق کے مختلف ممالک میں جا کر وہاں کے علماء سے علم حدیث حاصل کیا۔ بعض علماء نے حج کے موقع پر مکہ مکرمہ کے علماء سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ بعض نے مدینہ منورہ، دمشق، بغداد اور مصر کے علماء سے اکتساب فیض کیا۔ اندلس کے علماء کی تاریخ کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہاں کے قریباً ہر عالم نے مشرق کے ملکوں میں سفر کر کے وہاں کے علماء سے مختلف علوم اور حدیث رسول ﷺ میں اکتساب کیا۔ مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اندلس کے نظام حکومت کی عمدگی و برتری کو دیکھ کر مشرق کے بہت سے ملکوں کے علماء اندلس میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔ انھوں نے قرطبہ اور اندلس کے مختلف شہروں اپنی علمی مجالس قائم کیں اور اندلس میں علم حدیث کی نشر واشاعت ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ علماء نہ صرف علم حدیث میں ماہر تھے بلکہ فقیہ بھی تھے، لہٰذا یہ کئی شہروں میں قاضی کے منصب پر بھی فائز ہوئے۔ اس طرح اندلس کے چھوٹے بڑے تمام شہروں میں حدیث وفقہ کی درس وتدریس ہونے لگی۔ ابتداء میں اندلس میں اہم علمی مراکز قرطبہ، اشبیلیہ اور طلیطلہ وغیرہ تھے۔ قرطبہ تو اندلس کی اسلامی حکومت کا دارالخلافہ تھا۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل یہ شہر کوئی اتنا بڑا نہیں تھا۔ مسلمانوں نے اس کو بڑی وسعت دی اور قرطبہ میں تعمیرات کا ایک جال بچھا دیا۔ اکثر علمائے حدیث نے قرطبہ سے بھی اکتساب علم کیا اور یہیں پر اپنی علمی مجالس قائم کیں۔ ان میں بقی بن مخلد اور قاسم بن اصبغ جیسے بے شمار محدثین کے نام تاریخوں میں ملتے ہیں۔

دوسرا علمی مرکز اشبیلیہ تھا۔ یہ شہر بحری اہمیت کا حامل تھا۔ اسلامی دورِ حکومت میں اس شہر کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ بنو عباد کا دارالحکومت تھا۔ اندلس میں مسلمانوں کا عظیم الشان مسلم تہذیب اور اسلامی روایات کی تشکیل و ترویج میں ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ اشبیلیہ میں بہت بڑے بڑے محدثین پیدا ہوئے جیسے ابو عمر احمد بن محمد بن احمد الاشبیلی (م:۳۷۳ھ) ابن الباجی احمد بن عبداللہ اللخمی (م:۳۹۶ھ)۔

اسی طرح طلیطلہ میں بھی علمی مرکز ہونے کے ناطے بڑے بڑے محدثین پیدا ہوئے جیسے وہب بن عیسیٰ الانصاری اور عبداللہ بن محمد بن امیہ الانصاری۔ یہ شہر ایک پہاڑی پر آباد تھا اور عیسائیوں کا مذہبی مرکز تھا۔ اندلس کا لاٹ پادری یہیں رہتا تھا۔ پھر مسلمانوں نے اس شہر پر قبضہ کر کے اس کو علم و فن کا مرکز بنایا۔ بنی ذوالنون کے زمانہ میں عیسائیوں نے پھر اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد یہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں نہیں آیا کیونکہ اندلس میں مسلمانوں کی حکومت روز بروز کمزور ہوتی گئی اور عیسائی مضبوط تر ہوتے گئے۔ لیکن مسلمانوں کے عہد حکومت کے کھنڈرات آج بھی یہاں ملتے ہیں۔ یہ شہر دریائے تاجہ کے کنارے آباد ہے اور آج کل یہ وسطی اسپین کا صوبہ ہے اور اسے ٹولیدو (Toledo) کہتے ہیں۔

البیرہ میں بھی محدثین کرام کی علمی مجالس قائم تھیں۔ یہ علمی مجالس دراصل علم الحدیث کی فیکٹریاں تھیں جہاں محدثین تیار ہوتے تھے۔ یہ شہر قرطبہ سے ۹۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ سنہ ۴۰۰ھ میں بنو امیہ کی حکومت کے زوال کے بعد یہاں کی علمی روایت غرناطہ منتقل ہو گئی تھی۔ ان شہروں کے علاوہ اندلس کے دوسرے شہروں میں بھی مختلف محدثین علم حدیث کے درس و تدریس میں مشغول تھے۔ جیسے بطلیوس، طرطوشہ، وشقہ، بجانہ، سرقسطہ وغیرہ میں مختلف بڑے بڑے محدثین اپنا دارالحدیث کھولے علم حدیث کی خدمت میں مصروف تھے۔ گویا کہ اندلس کے ہر چھوٹے بڑے شہر اور تمام قصبوں میں محدثین کرام حدیث رسول ﷺ کے علم کو لوگوں میں پھیلا رہے تھے۔ صعصعہ بن سلام الشامی (م:۱۹۲ھ) جو سب سے پہلے علم الحدیث کو اندلس میں لے کر آئے تھے یہ امام اوزاعی اور سعید بن عبدالعزیز کے شاگرد تھے۔ یہ خلیفہ عبدالرحمٰن بن معاویہ اور ہشام بن عبدالرحمٰن کے عہد خلافت میں اندلس کے مفتی رہے اور جامع قرطبہ کے امام بھی۔ اندلس میں ان سے روایت کرنے والے عبدالملک بن حبیب اور عثمان بن ایوب ہیں۔ صعصعہ حکم بن ہشام کے زمانے میں یعنی سنہ ۱۹۲ھ میں انتقال کر گئے۔ الغازی بن قیس القرطبی امیر عبدالرحمٰن بن معاویہ کے زمانہ میں مشرق کے سفر پر چلے گئے۔ وہاں مدینہ منورہ میں امام مالک بن انس رحمہ اللہ سے ان کی کتاب مؤطا پڑھی۔ علاوہ ازیں امام اوزاعی، عبدالملک بن جریج اور عبدالرحمٰن بن ابی ذئب سے علم الحدیث حاصل کیا قرآن حکیم کی تعلیم مدینہ کے قاری نافع بن ابراہیم سے حاصل کی اور پھر اندلس آ کر قرآن و حدیث کی نشر و اشاعت میں مصروف ہو گئے اور اسی کو اپنی ساری زندگی کا مشن بنا لیا۔ اندلس میں آپ کے شاگردوں میں عبدالملک بن حبیب، اصبغ بن خلیل اور عثمان بن ایوب وغیرہ ہیں۔ الغازی بن قیس کا حکم بن ہشام کے عہد میں سنہ ۱۹۹ھ میں انتقال ہو گیا۔

زیاد بن عبدالرحمٰن بن زیاد اللخمی اندلس کے مشہور فقیہ اور مفتی تھے۔ انھوں نے مؤطا کی تعلیم امام مالک رحمہ اللہ سے حاصل کی اور امام مالک کی فقہی آراء کو اندلس میں رائج کرنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے ان کا انتقال بھی سنہ ۱۹۹ھ میں ہوا۔

ایک اور محدث جنھوں نے اندلس میں حدیث کے علم کو پھیلانے میں بڑا حصہ لیا یحییٰ بن یحییٰ کثیر اللیثی ہیں۔ انھوں نے مؤطا کی تعلیم امام مالک سے حاصل کی اور اندلس میں آ کر اس کی درس وتدریس شروع کی اور پھر عیسیٰ بن دینار کے بعد اندلس کے مفتی مشہور ہوئے۔ محمد بن عمر لبابہ کا قول ہے کہ اندلس کے فقیہ عیسیٰ بن دینار، عالم عبدالملک بن حبیب اور عاقل یحییٰ بن یحییٰ ہیں۔ یحییٰ کی وفات سنہ ۲۳۴ھ میں ہوئی۔

(ذہبی، سیر اعلام النبلاء: ۱۰/۵۱۹)

اندلس کے ایک اور مشہور محدث اور مفسر بقی بن مخلد القرطبی ہیں۔ انھوں نے ۲۸۴ شیوخ سے ملاقات کی اور ان سے حدیث کا سماع کیا۔ ان کی علمی خدمات کے باعث اندلسی علماء ان کے خلاف ہو گئے اور انھوں نے حاکم وقت کے کان بھی بھرے، تاہم مخالفین اپنی سازشوں میں ناکام رہے۔ معروف کتاب ''المصنف ابن ابی شیبہ'' انھی کے ذریعے اندلس میں متعارف ہوئی۔ بقی بن مخلد نے قرآن حکیم کی تفسیر بھی لکھی جس کو جید علماء نے بہت سراہا۔ الحمیدی نے اس تفسیر کے بارے میں لکھا ہے کہ میں یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس جیسی تفسیر نہیں لکھی گئی یہاں تک کہ طبری کی تفسیر بھی اس کے ہم پلہ نہیں ہے۔

تفسیر القرآن کے علاوہ ان کی دوسری اہم تصنیف مسند بقی بن مخلد ہے جس میں انھوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی پر اس مسند کو مرتب کیا ہے۔ اس میں انھوں نے قریباً تیرہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اسانید جمع کی ہیں اور ہر صحابی کی احادیث کو فقہی ابواب اور احکام کے مطابق تقسیم کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب مسند بھی ہے اور مصنف بھی۔ یہ سب کچھ ان کی علم الحدیث اور علم الفقہ دونوں میں مہارت کا بین ثبوت ہے اور شاید اس سے پہلے کسی اور عالم کو یہ شرف نصیب نہیں ہوا۔ ان کی تیسری تصنیف وہ کتاب ہے جس میں انھوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے فتاویٰ جمع کیے ہیں۔ اس میں وہ بعض علماء کے مطابق ابن ابی شیبہ اور عبدالرزاق اور سعید بن منصور کے مصنف سے بھی بڑھ گئے ہیں۔

بقی بن مخلد اندلس میں ایک اہم علمی شخصیت کے مالک تھے۔ یہ قرطبہ میں ۱۲رمضان المبارک سنہ ۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں سرزمین اندلس خلافت عباسی سے آزاد تھی اور اس کے چپے چپے سے علم و فن کے چشمے پھوٹے ہوئے تھے (تاریخ علمائے اندلس: ۲/۹۲) بقی بن مخلد ابھی عالم طفولیت ہی میں تھے کہ بغداد اور اندلس کے درمیان علمی، ثقافتی اور تجارتی رابطے شروع ہو گئے تھے۔ بغداد کے تاجر اپنا سامان اندلس لے کر آتے۔ وہ اپنے سامان تجارت کے ساتھ اپنے اطوار و عادات اور تہذیب وثقافت بھی لے جاتے تھے۔ اور دوسری طرف بلادِ مشرق کے تشنگانِ علوم کے لیے حصولِ علم کے دروازے کھل گئے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی علمی پیاس

بجھانے کے لیے بغداد، بصرہ، کوفہ، ہمدان، مکہ اور مدینہ کا رخ کرتے تھے۔ بقی نے اپنی ابتدائی تعلیم تو قرطبہ ہی میں حاصل کی اور وہاں کے مشہور محدث محمد بن عیسیٰ المعافری کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہہ کیے۔ یہ قرطبہ کے سب سے بڑے عالم تھے۔ انھوں نے طلب علم کے لیے مشرق کے شہروں اور حجاز وعراق کا سفر کیا تھا۔ بقی اندلس کے علماء سے اپنی استطاعت کے مطابق علم حاصل کر کے مشرق کے سفر پر نکلے اور مکہ، مدینہ، مصر، شام، بصرہ، کوفہ، واسط، حلوان اور دوسرے بڑے بڑے مراکز علمیہ سے استفادہ کیا اور مختلف علماء سے روایات حدیث کا سماع کیا۔ بعض بڑے بڑے مشائخ سے ان کی تالیفات کی اجازت براہ راست حاصل کی۔ چنانچہ کوفہ سے ابوبکر بن ابی شیبہ رحمہ اللہ سے ان کی کتاب ''المصنف'' کی براہ راست اجازت حاصل کی۔ ان اسفار میں وہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ اس زمانے میں امام احمد بن حنبل سخت ابتلا میں مبتلا تھے۔ بقی بن مخلد روزانہ چھڑی لے کر امام احمد کے دروازے پر آ کر چیختے ''الا جر رحمک اللہ'' جو اس وقت کے سائلوں کا ایک نعرہ ہوتا تھا۔ فرماتے ہیں کہ میری یہ آواز سن کر امام احمد گھر سے باہر نکلتے اور مجھے دو تین احادیث یا اس سے زیادہ سناتے۔ میں نے اس طریقے کو جاری رکھا یہاں تک کہ امام صاحب پر پابندی لگانے والے شخص کا انتقال ہو گیا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۳/۲۹۳) یہ روایت امام ذہبی رحمہ اللہ نے نقل کر کے اس کو بے اصل قرار دیا ہے لیکن اس کے بے اصل ہونے کے جو دلائل دیے ہیں وہ مشہور محدث الدکتور اکرم ضیاء عمری نے ان کو نا قابل اعتبار قرار دیا ہے۔ اس سفر کے دوران آپ مشہور محدث یحییٰ بن معین سے بھی ملے۔

حجاز، بغداد اور کوفہ کے علمی چشموں سے خوب سیراب ہو کر سنہ ۲۴۴ھ میں بقی واپس اندلس آئے۔ اس سفر میں انھوں نے مختلف محدثین سے روایت ودرایت کے نایاب ذخیرے اکٹھے کر لیے اور ان کی اجازت انھوں بھی نے مصنفین سے براہ راست حاصل کی۔ بقی بن مخلد جب اندلس واپس تشریف لائے اس زمانے میں اندلس میں مالکی مسلک امام مالک کے چند شاگردوں کے ذریعے پھیل گیا تھا۔ بقی نے اپنی خداداد صلاحیت اور اپنے قابل اعتماد علم کی روشنی میں مختلف روایات کے مطابق فتویٰ دینا شروع کر دیا۔ وہ حدیث کی ایسی نئی کتابیں اپنے ساتھ اندلس میں لائے جن سے اب تک علمائے اندلس متعارف نہ تھے۔ لہٰذا علمائے اندلس کے درمیان ایک ہنگامہ برپا ہو گیا یہاں تک کہ یہ بات حاکم وقت امیر محمد بن عبدالرحمٰن بن الحکم تک پہنچ گئی۔ انھوں نے بقی بن مخلد اور ہنگامہ برپا کرنے والے علماء کو بلا کر بقی سے ان کے فتاویٰ کے دلائل طلب کیے۔ حاکم وقت نے ان دلائل کے لیے بقی بن مخلد کے پاس موجود تالیفات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور اطمینان حاصل کرنے کے بعد نہ صرف یہ کہ انھیں سراہا بلکہ ان کی افادیت کے پیش نظر حکم دیا کہ ان تالیفات کی نقول شاہی کتب خانے میں رکھی جائیں تاکہ دوسرے علماء بھی ان سے مستفید ہوں اور بقی سے بھی کہا کہ ''اپنے علم کو پھیلاؤ اور لوگوں کو اپنے اس علم سے مستفید کرتے رہو۔'' (تذکرۃ الحفاظ: ۲/۶۳۰)

بقی بن مخلد جہاں اتنے بڑے عالم تھے وہاں زہد واتقا کے اعتبار سے بھی نہایت بلند مقام پر فائز تھے۔

وہ کثیر الصیام اور گوشہ نشین بزرگوں میں سے تھے۔ وہ علم اور زہد وتقویٰ میں اپنے زمانے میں بے نظیر اور اپنے شہر میں منفرد تھے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۲۸۹/۱۳)

ان کے زہدوتقویٰ کا یہ حال تھا کہ انھوں نے پوری زندگی ''عہدۂ قضا'' کو قبول نہیں کیا حالانکہ امرائے اندلس نے ان کو اس کی کئی بار پیش کش کی تھی۔ جب آخر میں ان کے ایک نہایت قدر دان امیر منذر بن عبدالرحمٰن نے اس عہدے کے قبول کرنے کے لیے بے حد اصرار کیا تو انھوں نے ایک دوسرے عالم عامر بن معاویہ کا نام بتا دیا اور اپنا دامن بچا گئے۔

بقی بن مخلد کی وفات بروز سہ شنبہ ۲ یا ۲۸ / جمادی الآخر سنہ ۲۷۶ھ میں قرطبہ میں ہوئی اور ان کی نماز جنازہ ان کے داماد محمد بن یزید نے پڑھائی اور مقبرہ بنی عباس میں انھیں دفن کیا گیا۔ (تاریخ علماء الاندلس: ۹۳/۲)

بقی نے اساتذہ کی ایک کثیر تعداد سے علم حاصل کیا اور اپنے انتقال کے بعد تلامذہ کی ایک کثیر تعداد یادگار کے طور پر چھوڑی۔ ان کے تبحر علمی کا چرچا پورے اندلس میں تھا۔ تشنگان علوم جوق در جوق ان کی خدمت میں اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے آتے تھے۔ ان کے ایک ساتھی احمد بن ابی خیثمہ کا بیان ہے کہ ہم نے بقی کا نام علکنسہ (جھاڑو) رکھا ہوا تھا۔ بقی جہاں پر ہوتے تشنگان علوم کو اپنی طرف کھینچ لیتے۔ کوئی کسی دوسرے درس میں جانے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتا۔ بقی کے انتقال کے بعد ان کی اولاد کئی صدیوں تک روایت ودرایت اور فقہ اور فتویٰ میں اہل اندلس کے لیے مرجع رہی۔ آپ کے صاحبزادے احمد بن بقی ایک نہایت متقی اور پرہیز گار عالم دین تھے۔ وہ قرطبہ میں قضا کے منصب پر بھی فائز تھے۔ احمد کے بیٹے عبدالرحمٰن بھی اپنے زمانے کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے۔ عبدالرحمٰن کے بیٹے مخلد بھی اندلس کے معروف علماء میں تھے۔ پھر مخلد کے بیٹے عبدالرحمٰن بھی اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم تھے۔ وہ قرطبہ کے منصب قضا پر دو مرتبہ فائز رہ چکے تھے۔ ان کی اولاد میں نویں پشت ابو القاسم احمد بن یزد اپنے دور کے واحد مشہور محدث تھے۔ وہ سنہ ۶۲۰ھ میں قرطبہ میں موطا امام مالک کا درس دیا کرتے تھے، وہ اپنے دادا بقی بن مخلد کے حجرے میں بیٹھ کر درس وتدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ علماء کی تاریخ میں علم وفضل اور زہد وتقویٰ کا ایسا تسلسل کم ہی نظر آتا ہے۔

کتابوں میں اندلس کے ایک اور بہت بڑے محدث کا نام ملتا ہے جنھوں نے اندلس میں حدیث رسول ﷺ کو عام کیا۔ انھوں نے مشرق کا سفر کیا اور امام احمد بن حنبل اور ان کے علاوہ دوسرے محدثین سے بھی علم حاصل کیا۔ ۲۵ سال تک طلب حدیث میں مختلف شہروں میں گھومتے رہے۔ پھر تکمیل تحصیل علم کے بعد اندلس واپس آکر حدیث کو عام کرنے کے لیے درس کا سلسلہ شروع کیا۔ انھیں علم فقہ میں کوئی خاص درک حاصل نہیں تھا۔ البتہ ادب اور جاہلی شاعری میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ان محدث کا نام ابو الحسن محمد بن عبدالسلام بن ثعلبہ القرطبی تھا اور انھوں نے ۲۷۶ھ میں وفات پائی۔

اندلس کے شہر البیرہ کے مشہور محدث محمد بن قطیس بن واصل الالبیری سے اندلس کے بڑے بڑے

شہروں کے طلباء علم حدیث حاصل کرتے ہیں۔ انھوں نے اندلس کے مشہور علماء بقی بن مخلد، یوسف بن یحییٰ اور محمد بن وضاح سے علم حاصل کیا۔ ان کا سن ۳۱۹ھ میں انتقال ہوا۔

ان کے علاوہ ابن القوطیہ، محمد بن عمر بن عبدالعزیز (م ۴۶۰ھ)، ابومحمد عبداللہ بن ابراہیم بن محمد الاصیلی (م ۳۹۲ھ)، ابوالقاسم ابن الاباغ (م ۳۹۳ھ) وغیرہ نے اپنے زمانہ کے رجال حدیث کے ماہر، مشرق کے قریباً تین سو علماء سے علم حاصل کیا۔ اندلس کے کئی مشہور علماء نے ان سے حدیث پڑھی جن میں حافظ ابن عبدالبر خاص طور پر قابل ذکر ہیں وہ ابن الاباغ پر کسی اور کو ترجیح نہیں دیتے۔ حدیث کے ساتھ قرآنی علوم کے بھی ماہر تھے۔

مختصر یہ کہ اندلس میں جو حضرات علم حدیث کی ترویج اور خدمت و اشاعت میں دن رات مصروف رہے ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان محدثین میں سے جس شخص کو سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور جن کی کتابوں سے امت مسلمہ آج تک مستفید ہو رہی ہے ان کا نام شیخ الاسلام حافظ ابن عبدالبر القرطبی ہے۔ ان کا پورا نام یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر بن عاصم النخری القرطبی ہے۔

ان کا نسب نمبر بن قاسط بن ھنب بن افضی سے ملتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ کا تعلق بنو عدنان سے ہے۔ اور آپ خالص عربی النسل ہیں۔ مورخین نے لکھا ہے کہ بنو ربیعہ کے چار خاندان اندلس کی مشہور وادی ''آش'' میں آکر آباد ہو گئے تھے اور پھر یہاں ان کی آبادی پھیل گئی۔ حافظ بن عبدالبر کا تعلق انھی چار خاندانوں میں سے ایک سے تھا۔ ان کی ولادت ۲۵ ربیع الثانی ۳۶۸ھ میں ہوئی۔ آپ کے والد عبداللہ بہت اچھے شاعر اور ادیب تھے لیکن یہ ابن عبدالبر کے سن بلوغ تک پہنچنے سے قبل ہی انتقال فرما گئے تھے۔ لہٰذا انھیں ان سے استفادے کا موقع نہیں ملا۔ ان کے والد کی وفات سن ۳۸۰ھ میں ہوئی۔ حافظ ابن عبدالبر کی نشو ونما اور تعلیم و تربیت قرطبہ میں ہوئی جو اس زمانے میں اندلس کا سب سے بڑا علمی مرکز تھا اور اندلسی حکومت کا دارالخلافہ بھی تھا۔ یہاں ہر ایک علم وفن کے ماہر اور باکمال حضرات وہاں موجود تھے۔ انفرادی علمی حلقوں کے علاوہ یہاں اجتماعی مراکز بھی علم وفن کی خدمت میں مصروف تھے اور کئی علماء یہاں مسلسل تحقیق و تصنیف کا کام بھی کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے دوسرے علاقوں سے بھی طلباء یہاں تحصیل علم کے لیے آنے شروع ہو گئے اور یہاں کے علماء کا قول پورے مغرب میں سند و حجت سمجھا جانے لگا۔ علاوہ ازیں قرطبہ میں انفرادی اور حکومتی کتب خانوں اور لائبریریوں کی بھی کثرت اور بہتات تھی۔ ہر شخص خواہ چھوٹا ہو یا بڑا علماء کی قدر کرنے لگا اور ان کی مجلس میں بیٹھنے کو اپنے لیے باعث فخر و افتخار سمجھنے لگا۔ اس قسم کے خوش گوار علمی ماحول میں حافظ ابن عبدالبر کو پھلنے پھولنے اور تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا اور انھوں نے قرطبہ کے بڑے بڑے جید علماء کی صحبت میں رہ کر علمی استفادہ کیا۔ اپنی اسی علمی جستجو، محنت اور کاوش اور خداداد صلاحیت کے باعث علماء اندلس میں ایک امتیازی مقام حاصل کر لیا۔ یہاں تک کہ لوگ آپ کو ''حافظ المغرب'' کے نام سے پکارنے لگے۔ یہ نام علماء کے

طبقوں میں بھی مشہور ہو گیا۔ دیگر علوم وفنون کے ساتھ ساتھ آپ کی خصوصی توجہ حدیث اور فقہ کی طرف تھی۔ چنانچہ آپ نے فقہ اور حدیث پر نہایت مفید اور جامع کتابیں تصنیف کیں جن سے آج تک علماء، محدثین اور فقہاء مستفید ہو رہے ہیں اور عصر حاضر میں ان کی کتابیں نہایت خوبصورت انداز کے ساتھ پوری تحقیق سے طبع ہوئی ہیں۔

فقہ میں آپ کا مسلک مالکی تھا لیکن آپ تقلید جامد کے قائل نہ تھے بلکہ براہین و دلائل کو دیکھ کر کسی مجتہد کا قول اختیار کرتے۔ اکثر دفعہ آپ امام مالک رحمہ اللہ کے قول کو دوسرے ائمہ کے اقوال پر ترجیح دیتے۔ بعض مسائل میں وہ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے اقوال کو ترجیح دیتے تھے، آپ کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ائمہ اسلاف کا بہت احترام کرتے تھے۔ آپ کی اس وسعت قلبی کے نتیجے میں ہر مسلک کے علماء میں آپ کی مقبولیت تھی۔ ابن رشد جیسا فلسفی اور فقیہہ اپنی فقہ کی مشہور کتاب ''بدایۃ المجتہد'' میں آپ کی کتاب ''الاستذکار'' پر اعتماد کرتا ہے اور اس سے پوری طرح استفادہ کرتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ جیسا عظیم محدث اپنی کتاب ''الاصابہ'' میں ''حافظ ابن عبدالبر کی کتاب'' ''الاستیعاب'' سے خوشہ چینی کرتا ہے اور اسے اپنے لیے باعث سند سمجھتا ہے۔ قاضی ابو الولید الباجی کہتے ہیں کہ اندلس میں حافظ ابن عبدالبر جیسا عالم حدیث پیدا نہیں ہوا۔ آپ اکثر یہ فرماتے تھے کہ ابو عمر (حافظ عبدالبر) مغرب کے حفاظ میں سب سے بڑے حافظ ہیں۔ (احفظ اہل المغرب) (تذکرۃ الحفاظ، ذہبی) ابو الولید باجی حافظ ابن عبدالبر کے اساتذہ میں سے ہوتے ہوئے ان کے مرتبۂ حفظ وعلم کا اعتراف کرتے ہیں۔

غسانی کہتے ہیں کہ حافظ ابن عبدالبر قاسم بن محمد اور احمد بن خالد کے بارے میں فرماتے تھے کہ ہمارے شہر قرطبہ میں ان جیسا کوئی عالم نہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ حافظ ابن عبدالبر خود بہت بڑے عالم تھے اور مذکورہ بالا دونوں حضرات سے کسی طرح بھی کم نہیں تھے۔ حافظ ذہبی کا قول ہے کہ حافظ ابن عبدالبر کو علم حدیث میں تقدم اور علم فقہ اور معانی میں بصیرت حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ علم الانساب اور علم الاخبار میں بھی مکمل طور پر مہارت حاصل تھی۔ اس کا اندازہ ان کی تالیفات سے لگایا جا سکتا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ابو عمر ابن عبدالبر کو کتاب الزعفرانی اور سنن ابی داؤد نہایت اعلیٰ سندوں سے حاصل ہوئیں۔ اس لحاظ سے آپ علوسند کے بھی حامل ہیں۔

حافظ ابن عبدالبر نے اپنی پوری زندگی اندلس ہی میں گزار دی۔ اندلس سے باہر جانے کا آپ کو موقع نہیں ملا۔ ابتدائی زندگی آپ نے قرطبہ میں گزاری اور یہیں مختلف علماء سے کسب فیض کیا، لیکن بعد میں قرطبہ کو خیرباد کہہ کر اشبیلیہ تشریف لے گئے البتہ اشبیلیہ میں آپ کو آرام وسکون حاصل نہ ہوا بلکہ مشکلات اور مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر آپ نے اشبیلیہ کو بھی چھوڑ کر مشرقی اندلس کی طرف کوچ فرمایا اور مختلف اوقات مختلف شہروں جیسے دانیہ، بلنسیہ اور شاطبہ میں سکونت اختیار فرمائی۔ یہاں آپ کی زندگی ہر لحاظ سے خوش گوار

رہی۔ مظفر بن الافطس کے دور میں آپ اشبونہ اور شنترین کے قاضی بھی رہے۔

حافظ عبدالبر کی زندگی کا آخری حصہ مشرقی اندلس میں گزرا۔ آپ آخر تک شاطبہ میں رہے اور یہیں انتقال فرمایا۔ آپ نے پچانوے سال پانچ ماہ عمر پائی۔ بالآخر بروز جمعرات آخر ربیع الثانی ۴۶۳ھ میں اس عدم ہستی نما سے ہستی عدم نما کو انتقال فرمایا۔

جس طرح حافظ ابن عبدالبر کے شیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے اسی طرح آپ کے تلانذہ کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ ان تلانذہ میں سے بعض کو بہت شہرت حاصل ہوئی جیسے حافظ حمیدی اندلسی (م: ۴۲۰ھ)، امام غسانی جیانی اندلسی (م: ۴۲۷ھ) آپ نے بہت تصانیف کیں اور اپنے علم کے ذریعے حدیث، فقہ اور ادب کی خدمت کی، تاہم آپ کی زیادہ توجہ علم الحدیث اور علم الفقہ ہی کی طرف رہی۔ آپ کی مشہور کتابیں حسب ذیل ہیں:

① آداب العلم
② الاجوبۃ الموعبۃ علی المسائل المستغربۃ من صحیح البخاری
③ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب
④ الانتہاء فی فضائل الثلاثۃ الفقہاء
⑤ الانصاف فیما بین العلماء من الاختلاف
⑥ البیان فی تاویلات القرآن
⑦ التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید
⑧ جامع بیان العلم وفضلہ وماینبغی فی روایۃ وحملہ
⑨ الدرر فی اختصار المغازی والسیر
⑩ الکافی فی فقہ اہل المدینۃ
⑪ کتاب الشواہد فی اثبات خبر الواحد

ان کے علاوہ آپ کی کچھ اور کتابیں بھی ہیں، لیکن آپ کی جن کتابوں نے بڑی شہرت حاصل کی ان میں سے چند اہم حسب ذیل ہیں:

① التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید

یہ مؤطا امام مالک رحمہ اللہ کی سب سے عمدہ شرح ہے۔ اس میں حافظ ابن عبدالبر نے امام مالک کے شیوخ کے ناموں کی ترتیب کے مطابق ان کی روایات کو مرتب کیا ہے۔ اور ہر روایت کی سند کے رجال پر بھی محدثانہ بحث کی ہے۔ ان سے قبل کسی اور محدث نے اس طرز پر حدیث کی شرح نہیں کی۔ ابن حزم جیسے فاضل شخص نے لکھا ہے کہ ”فقہ الحدیث کے موضوع پر اس جیسی کوئی اور کتاب میرے علم میں نہیں آئی۔ اس سے بہتر کا

تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (وفیات الاعیان: ۶۸/۷) حافظ ابن عبدالبر اپنی اس کتاب کو بہت چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے فرمایا ؎

سمیر فوادی من ثلاثین حجة و صاقل ذهنی والمفرج عن همی

یعنی یہ کتاب گذشتہ تین سال سے میرے دل کا مونس و غم خوار ہے، میرے ذہن کی صفائی کا ذریعہ اور میرے غموں کو دور کرنے کا وسیلہ ہے۔ کتاب کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ مؤلف نے کتاب کی تالیف میں کس قدر انہاک، ذہنی کاوش اور تحقیقی کوشش کی ہے۔ پہلے یہ کتاب نایاب تھی لیکن اب عام ملتی ہے اور اہل علم حضرات اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

(۲) الاستذکار فی شرح مذاہب علماء الامصار

حافظ ابن عبدالبر نے مؤطا کی ایک اور شرح بھی لکھی جس کا نام الاستذکار ہے۔ بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ یہ کتاب التمہید کا اختصار ہے، لیکن بعض حضرات اس کو مؤطا کی ایک مستقل شرح تصور کرتے ہیں جو حافظ ابن عبدالبر نے ایک خاص طرز پر لکھی ہے۔ آپ نے اس کے ابواب پر بھی کام کیا ہے۔ ابن رشد نے اپنی فقہی کتاب بدایۃ المجتہد میں اس کتاب سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ کتاب بھی اب چھپ کر بازار میں آ گئی ہے۔ آپ نے مؤطا امام مالک کی ایک اور شرح بھی لکھی ہے جس کا نام ہے ''التقصی لحدیث المؤطا۔''

(۳) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب

ابن عبدالبر رحمہ اللہ کی ایک اور اہم ترین اور مایہ ناز کتاب ''الاستیعاب'' ہے۔ اس کتاب میں آپ نے وہ روایات اکٹھی کر دی ہیں جن کا تعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسماء اور ان کی حیات کے اہم کارناموں سے ہے۔ آپ سے قبل جن حضرات نے اس موضوع پر کام کیا، ابن عبدالبر نے ان سب حضرات کے کام کو نگاہ میں رکھ کر یہ کتاب مرتب کی ہے بلکہ ان تمام کتابوں کا مواد اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اس کا نام ''الاستیعاب'' رکھا، لیکن بقول ابن حجر اس میں بہت کچھ چھوٹ گیا ہے۔ (الاصابہ: ۲/۱) مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک مفید اور مستند کتاب ہے۔ خود ابن حجر نے اپنی کتاب الاصابہ کی ترتیب میں اس کتاب کو اپنے مدنظر رکھا ہے، اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ الاستیعاب کی ترتیب نہایت عمدہ اور خوب صورت ہے۔ ابن خلکان نے بھی اس کتاب کی بڑی تعریف کی ہے۔

(وفیات الاعیان: ۷۰/۷)

(۴) جامع بیان العلم وفضلہ

حافظ ابن عبدالبر نے یہ کتاب علماء اور علم کی فضیلت پر نیز علماء کے فرائض کے موضوع پر لکھی ہے۔ کتاب نہایت دل چسپ اور مفید ہے۔ اس میں ارشادات نبوت، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور جلیل القدر علماء کے اقوال علم اور حصول علم کی فضیلت کے موضوع پر نقل کیے گئے ہیں اور کتاب کو بڑے خوبصورت انداز میں ترتیب دیا گیا

ہے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اس کتاب کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے اس کا اردو زبان میں ترجمہ بھی کر دیا ہے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ علم اور فضیلت علم پر اس سے بہتر اور جامع کتاب نہیں دیکھی گئی۔ اسلامی نقطۂ نظر سے علم، اہل علم اور طالبان علم کے بارے میں ایک شخص کو جو کچھ جاننا چاہیے وہ سب کچھ اس کتاب میں موجود ہے۔ موضوع خشک ہونے کے باوجود کتاب نہایت دلچسپ اور محدثین کے دل نشین طریقہ پر مرتب ہوئی ہے۔

(الحدیث والمحدثون، استاذ ابوزہرہ: ص ۲۵۰)

کتاب کے آخر میں امام شافعی رحمہ اللہ کا سفر نامہ مختصراً ذکر کیا گیا ہے۔

⑤ بہجۃ المجالس وانس المجالس

حافظ ابن عبدالبر نہ صرف اعلیٰ درجے کے محدث، فقیہ، مفسر اور مؤرخ تھے بلکہ شعر وادب میں بھی ایک بلند مقام کے حامل تھے۔ آپ کی یہ کتاب بہجۃ المجالس ادباء اور شعراء کے ہاں بہت مقبول اور متداول ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ شعر وادب میں آپ کا کتنا بڑا مقام تھا۔ یہ کتاب ایک سو چوبیں ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب مختلف مکتبوں سے چھپی ہے۔ حافظ ابن عبدالبر نے ایک موقع پر اپنے بیٹے کو جو وصیت کی تھی اس کا ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

① دنیا سے دور رہنا اور اس کو کوئی اہمیت نہ دینا اور دین کے راستے کو نہایت مضبوطی سے تھامے رکھنا۔

② اللہ تعالیٰ سے ہر حال میں ڈرتے رہنا، ظاہر میں بھی باطن میں بھی، اس لیے کہ تقویٰ سب سے بڑا سہارا ہے اور اس کے مقابلے میں اور کوئی سہارا نہیں۔

③ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کا شکر ادا کرنا نہ بھولنا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے سے مزید نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔ شکر نعمتوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔

④ وہ تمام کام چھوڑ دے جن کے کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ صحیح راستے پر چل، حق کا راستہ چھپا ہوا نہیں بلکہ نمایاں اور ظاہر ہے۔

⑤ زندگی کے جو تھوڑے سے دن باقی ہیں انھیں بہت احتیاط اور غور وفکر سے گزار، کیونکہ یہ مختصر سی زندگی نہ ہمیشہ رہنے والی ہے اور نہ باقی رہنے والی۔

⑥ دیکھ عمر کس طرح مسلسل گزر رہی ہے۔ اس کی جدت بوسیدہ ہو رہی ہے اور اس کی مدت فنا ہو رہی ہے۔ (مقدمہ علی التمہید: ۱/۱۶)

ابواسحاق شاطبی:

ابواسحاق ابراہیم بن موسیٰ بن محمد اللخمی الشاطبی اندلس کے مالکی فقیہ تھے اور اسلامی قانون کے جدید تصور کی تشکیل کے موجد اور قائم کرنے والے تھے۔ شاید شاطبہ میں پیدا ہونے کے باعث شاطبی کہلائے ہوں،

لیکن آپ نے اپنی شعوری زندگی کا تمام عرصہ غرناطہ ہی میں گزارا۔ یہ اس وقت کا غرناطہ تھا جب مسلمانوں کے عروج کا سورج اندلس میں اپنی آخری ضیا پاشیاں کر رہا تھا۔ یہ سلطان محمد الغنی باللہ کا دور حکومت تھا جو غرناطہ کی تاریخ کا نہایت شاندار دور ہے۔ الحمرا کے محلات میں سے مشہور زمانہ محل جو شیروں کے محل کے نام سے شہرت رکھتا تھا، اسی دور میں تعمیر ہوا۔ سلطان ایک نہایت کامیاب حکمران اور سیاست دان تھا۔ ان کے عہد زریں میں جہاں ایک طرف عیسائیوں کی جانب سے بغاوت اور حملہ آوری کا خطرہ کم ہو چکا تھا، وہاں اندرونی طور پر بھی خانہ جنگیوں، سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں نہ صرف کمی آ گئی تھی بلکہ نجات مل گئی تھی۔ سلطان ایک علم دوست شخص تھا اور اس زمانے کے بادشاہ آج کل کے بادشاہوں کی طرح جاہل نہیں ہوتے تھے جو سوائے انگریزی بولنے کے اور کچھ نہیں جانتے، بلکہ وہ خود بھی نہایت عالم اور فاضل ہوتے تھے۔ اس وجہ سے سلطان کی علم دوستی کے باعث تمام اسلامی دنیا اور خصوصاً افریقہ اور اندلس کے دوسرے علاقوں کے علماء اور فضلاء غرناطہ کھنچے چلے آ رہے تھے۔ ان میں علامہ ابن خلدون جیسی شخصیتوں کے نام بھی آتے ہیں۔ علامہ ابن خلدون علامہ شاطبی کے ہم عصر تھے اور غرناطہ میں قریباً دو سال تک سلطان محمد الغنی باللہ کے دربار سے وابستہ رہے۔

شاطبی نے اس زمانے کے بڑے بڑے جید اور ثقہ علماء سے استفادہ کیا۔ ان کے اساتذہ میں سے شیخ النحاۃ علامہ ابن الفخار الالبیری اور ابو القاسم شریف البستی تھے جو امام البلاغت تھے۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی علماء سے ان کا رشتۂ تلمذ قائم ہوا۔ (احمد بابا، نیل الابتہاج: ص ۴۶ تا ۵۰)

اندلس میں مالکی فقہ کا دور دورہ تھا اور فقہ اور حدیث ہی کو ہر لحاظ سے ایک نفع بخش علم سمجھا جاتا تھا۔ جبکہ علم اصول فقہ میں بڑے بڑے علماء کو بھی بہت کم دلچسپی تھی۔ امام شاطبی نے اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے اصول فقہ میں اپنا شغف ظاہر کیا۔ اس کی وجہ ان کے اپنے بیان کے مطابق یہ تھی کہ ان کے زمانے میں بہت سی معاشرتی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ مالکی فقہ جس کو بعض ظاہری علماء نے جامد بنا رکھا تھا، ان حالات میں ظہور پذیر ہونے والی معاشرتی تبدیلیوں کے جوابات اور ان کی راہ نمائی سے قاصر تھی۔ فقہاء کی فلسفے اور اصول فقہ میں دلچسپی نہ ہونے کا باعث کوئی ایسا طریق کار اور اصول سامنے نہیں آ رہا تھا جو اسلامی قانون کی بنیادوں کو نقصان پہنچائے بغیر اور اس کی وحدت پر اثر انداز ہوئے بغیر ان نئے حالات اور معاشرے کی ان تبدیلیوں کا مقابلہ کر سکتا۔ فقہاء معمولی معمولی اختلافات کو اصولی حیثیت دے کر اس سے فقہی جواز مہیا کرتے تھے۔ شاطبی ان سب باتوں سے ازحد پریشان تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے اور بالکل درست سمجھتے تھے کہ اسلامی قانون جس کی اصل ایک ہے کیسے ممکن ہے کہ وہ تضادات کا شکار ہو جائے اور ان تمام متضاد بیانات کو شرعی جواز بھی حاصل ہو جائے۔ ان تمام اشکالات اور مشکلات کا حل صرف اصول فقہ ہی میں مل سکتا تھا۔ کیونکہ اسلامی قانون اس وقت تک اپنی روح سے محروم اور بے جان رہتا ہے جب تک اسے اس کی فلسفیانہ اور نظریاتی بنیادیں فراہم نہ کی جائیں۔

امام شاطبی نے فقہ اسلامی کا از سر نو مطالعہ کیا اور فقہ کے مآخذ و مصادر یعنی قرآن اور سنت نبوی ﷺ

کے مصادر اور اصولوں پر غور و خوض کیا۔ اس طرح وہ شریعت اسلامیہ کے مقاصد اور اسرار معلوم کرنے میں کامیاب و کامران ہوئے۔ یوں قانون اسلامی کے نظریے میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ ان تمام مباحث کو انھوں نے اپنی دو کتابوں میں یک جا کر کے مدون کیا۔ ان میں ایک کتاب کا نام ''الموافقات'' ہے جو چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں مقاصد شریعہ پوری تفصیل اور شرح سے بیان کیے گئے ہیں۔ اور دوسری کتاب ''الاعتصام'' ہے جس میں بدعت کو پوری شرح و سبط سے بیان کیا گیا ہے۔ اور یقین جانیے کہ مسئلہ بدعت پر اس سے اعلیٰ کتاب شاید اور کوئی نہیں۔ یہ دونوں کتابیں اپنے فن میں کامل ترین کتابیں ہیں۔

ان کتابوں کی تصنیف میں امام شاطبی نے صرف سابقہ کتابوں کے مطالعے اور ان کے تجزیے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ حالات کے مطالعے اور اپنے تجربے سے بھی کام لیا۔ علاوہ ازیں اپنے ہم عصر علماء اور فقہاء سے اہم مسائل پر خط و کتابت بھی کی۔ ان علماء میں اندلس اور شمالی افریقہ کے نامور علماء اور فقہاء بھی شامل تھے۔ امام شاطبی قرآن و سنت اور مقاصد شریعہ سے راہ نمائی حاصل کرتے تھے لیکن فقہاء عموماً متداول روایات کا سہارا لیتے تھے۔

امام شاطبی نے یہ دو کتابیں لکھ تو دیں لیکن انھیں ان کتابوں کی تصنیف پر شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے خلاف تفتیش اور محکمانہ کارروائیاں بھی ہوئیں کیونکہ ان کے مشتملات بالخصوص بدعات وغیرہ کے کچھ مسائل کا تعلق سیاست سے تھا۔ اس ابتلاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کچھ شعر بھی کہے جن کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

اے قوم! تو نے مجھے امتحان میں ڈالا، اور استعمار بڑے بڑے لوگوں کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔

تو نے مجھے ایسے ایسے گرداب میں ڈالا جس میں میں نہایت بری طرح چکرا گیا۔

یوں لگتا تھا کہ میرا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔

تو نے مجھے اس لیے مصائب کا نشانہ بنایا کہ میں مفاسد اور نقائص کو دور کرنا چاہتا تھا اور مصالح کو عام کرنا چاہتا تھا۔

بہرحال اللہ تعالیٰ ہر حال میں میرے لیے کافی ہے، اس نے میرے فکر اور نظریے کی بھی حفاظت کی اور میرے دین کی بھی۔ (نیل الابتہاج: ص۴۹)

یہ بھی دنیا کا ایک عجیب دستور ہے کہ جس شخص نے جس چیز کی مخالفت کی اسی چیز کا اس پر الزام لگا دیا گیا۔ امام شاطبی نے بدعت کے رد میں ایک نہایت مدلل اور بہترین کتاب لکھی لیکن خود انھی پر بدعت کے ارتکاب کا الزام لگا دیا گیا۔ اس وجہ سے انھوں نے ضروری سمجھا کہ بدعت کے تصور کی تعریف کچھ ایسے انداز میں کی جائے کہ یہ ابہام دور ہو جائے جس سے بدعت نواز اور موقع پرست حضرات فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ ''الاعتصام'' میں انھوں نے یہی فریضہ انجام دیا۔

امام شاطبی نے اپنی دوسری کتاب ''الموافقات'' میں مقاصد شریعت کے فلسفے کو نہایت تفصیل اور اعلیٰ طریقے سے پیش کیا ہے۔ وہ کچھ یوں ہے کہ انسان کو اپنی زندگی میں ہر جگہ راہ نمائی کی ضرورت ہے۔ انسانی ضروریات میں سے بعض ایسی ہیں جو انسان کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان ضروریات کے بارے میں راہ نمائی انسان کی جبلت و فطرت اور اس کے بدنی تقاضوں کی صورت میں رکھ دی گئی ہے، لیکن انسان انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی زندگی گزارنے کو پسند کرتا ہے، لہٰذا اس کی اس اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے لیے بھی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔ یہ راہ نمائی کچھ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اکثر انفرادی مفادات آپس میں متصادم ہوتے ہیں جن سے اجتماعی اور معاشرتی مفادات کے مجروح ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ اس تصادم اور ٹکراؤ سے بچنے کے لیے انسانی معاشرے اپنے تجربات کی بنیاد پر رسم و رواج بناتے ہیں۔ جو یہ طے کرتے ہیں کہ کون سی چیز اچھی ہے اور کون سی بری، لیکن اس بارے میں یہ مسئلہ درپیش آتا ہے کہ دنیا میں کوئی چیز بھی نہ تو مطلقاً اچھی ہے اور نہ ہی مطلقاً بری ہے۔ لہٰذا جس چیز میں اچھائی کے پہلو اور عنصر زیادہ ہوتے ہیں اسے اچھا کہا جاتا ہے، اور جس چیز میں برائی کے پہلو زیادہ ہوتے ہیں اسے معاشرے میں برا کہا جاتا ہے۔ امام شاطبی کے نزدیک یہ معاشرتی تجربہ اور سماجی رسوم و رواج کا علم بھی درحقیقت اس علم پر مبنی ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے عطا فرمایا ہے۔ چونکہ دنیا میں ہر چیز انسان کے فائدہ کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اس لیے فطرت کے قانون اور معاشرتی قانون میں ہم آہنگی ہے۔ مختلف شرائع جو انسانی راہ نمائی کے لیے حق تعالیٰ شانہ نے نازل کی ہیں، ان سب کا مقصد مصالح کا حصول اور ان کی حفاظت ہے۔ انسانی مصالح جو شریعت خداوندی کے پیش نظر ہیں، ان میں دنیا کے مصالح بھی ہیں اور آخرت کے بھی۔ آخرت کے بارے میں چونکہ انسان کا معاشرتی تجربہ کسی صورت بھی راہ نمائی نہیں کرتا، اس لیے اس کی بنیاد تجربہ پر نہیں بلکہ کلیۃً وحی ربانی پر ہے۔

مصالح دو قسم کی ہیں: ایک وہ جو انسانی مفادات کی براہ راست حفاظت کرتی ہیں یا ان کی نشو و نما میں مدد دیتی ہیں۔ دوسری وہ جو ان مفادات کے حصول میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرتی ہیں۔ دوسری قسم کی مثال قانونی سزائیں ہیں جو اپنی ذات میں تو مصالح نہیں ہیں لیکن چونکہ وہ ان اسباب و عوامل کو ختم کرتی ہیں جن سے مصالح کی حفاظت اور استحکام پر اثر پڑتا ہے، اس لیے بالواسطہ وہ بھی مصالح میں شمار ہوتی ہیں۔ امام شاطبی نے پانچ چیزوں کی حفاظت کو بنیادی مصلحتوں میں شمار کیا ہے۔ وہ چیزیں یہ ہیں: ① دین ② نفس ③ عقل ④ مال ⑤ نسل۔ باقی چیزیں یا تو ان کو مکمل کرتی ہیں یا ان کی حفاظت کو بہتر بناتی ہیں۔

اسی طرح ''بدعت'' کے تصور کی تشریح کرتے ہوئے امام شاطبی فرماتے ہیں کہ ہر تبدیلی اور ہر نئی چیز کو بدعت نہیں کہا جا سکتا بلکہ بدعت لغوی اور دینی طور پر قابل مذمت شے کو کہتے ہیں۔ بہت سی ایسی نئی اشیاء ہیں جو سرکار دو عالم ﷺ کے زمانے کے بعد پیش آئیں مگر انھیں کسی طرح قابل مذمت نہیں کہا جا سکتا۔ امام شاطبی نے بدعت کی دو قسموں کی مخالفت کی ہے۔ دو قسموں سے مراد بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ ہے۔ شاطبی کے خیال

میں بدعت کبھی اچھی نہیں ہوسکتی۔ ان کے نزدیک بدعت صرف ان نئی چیزوں، اضافتوں یا نئے طور طریقوں کو کہا جا سکتا ہے جو دین میں داخل کیے جائیں اور انھیں دین کا جزو سمجھا جائے۔ ان کے علاوہ کسی نئی چیز کو بدعت نہیں کہا جا سکتا۔

امام شاطبی کی تاریخ ولادت اور دوسرے حالات زندگی کے بارے میں تفصیلی معلومات نہیں ملتیں، البتہ ان کی تاریخ وفات ۸/ شعبان ۷۹۰ھ ہے۔ آپ کی وفات غرناطہ میں ہوئی اور وہیں آپ کی تدفین ہوئی۔

آپ کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے لیکن دو شاگرد نہایت اہم ہیں۔ ایک ابن زمرک جو سلطان الغنی باللہ کے ملک الشعراء تھے۔ لسان الدین ابن الخطیب کے بعد ابن زمرک سلطان الغنی باللہ کے وزیر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ شاطبی کے دوسرے شاگرد ابوبکر بن عاصم ہیں جو غرناطہ کے چیف جسٹس تھے۔ ان کی کتاب تحفۃ الحکام غرناطہ کی عدالتوں میں ضابطے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔

ابن خلدون:

ابوزید ولی الدین عبدالرحمٰن بن محمد بن محمد بن الحسن بن محمد بن جابر بن محمد بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن خلدون جو عام طور پر ابن خلدون کے سادہ اور مختصر نام سے مشہور ہے، ایک عربی خاندان کی طرف منسوب ہے، جو پہلی صدی ہجری کے اخیر میں جب مسلمانوں نے اندلس کو فتح کیا اسپین میں آیا۔

اس خاندان کا پہلا شخص ''خلدون'' جو اسپین میں آیا، خالد بن عثمان بن الخطاب بن کریب بن معدی کرب بن الحارث بن وائل بن حجر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اور اگر یہ نسب نامہ صحیح ہے تو ابن خلدون کندہ کے مشہور قبیلہ کے ایک امیر کی اولاد سے ہے، یہ امیر یعنی وائل بن حجر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کے ہاتھ پر اسلام لایا اور روایت ہے کہ آپ نے اس کے اور اس کی اولاد کے لیے دعا فرمائی۔

لیکن خود ابن خلدون کو اس نسب نامہ کی صحت میں کسی قدر شک ہے، کیونکہ اس کے اور اس کے خاندان کے پہلے شخص خلدون کے درمیان دس پشتیں ہیں، حالانکہ اس نے اپنے مقدمۂ تاریخ میں جو اصول قائم کیا ہے، اس کے مطابق ان دونوں کے درمیان بیس یا زیادہ موزوں طریقہ پر اکیس پشتیں ہونی چاہئیں، کیونکہ اس اصول کے موافق ہر صدی میں تین پشتوں کا ہونا ضروری ہے اور ابن خلدون اور اس خاندان کے پہلے شخص ''خلدون'' کے درمیان سات صدیوں کا فاصلہ ہے۔

چونکہ خود ابن خلدون کو اس نسب نامہ کی صحت میں شک ہے، اس لیے پہلے خلدون کے وائل کی طرف منسوب ہونے میں ہم اس سے زیادہ شک کرنے کا استحقاق رکھتے ہیں، اس لیے کہ عہد رسالت سے فتح اسپین تک اہل عرب نے تحریر و کتابت سے بہت کم کام لیا ہے، اور ہمارے پاس کوئی ایسی سند نہیں ہے جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہو کہ یہ نسب نامہ تحریری صورت میں خلدون کے خاندان یا ماہر نسب ابن حزم تک جس نے

سب سے پہلے اس پر بحث کی ہے پہنچا ہو، علم الانساب کی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے ہم اس کی تصدیق بھی نہیں کر سکتے، اولاً تو یہ کتابیں زمانہ مابعد میں لکھی گئی ہیں، دوسرے یہ کہ وہ کسی تاریخی بنیاد پر مبنی نہیں ہیں، سب سے اخیر بات یہ ہے کہ سیاسی اسباب یا بڑے بڑے دولت مندوں کے تملق و خوشامد کے لیے عربوں کے اور رسوم و عادات کی طرح ان کے نسب نامے بھی دوسری اور تیسری صدی ہجری میں لکھے گئے ہیں اور تاریخ میں سب سے پہلے ابن خلدون کے خاندان کا ذکر تیسری صدی میں ملتا ہے، اس وقت یہ خاندان اشبیلیہ میں رہتا تھا اور اس جذبۂ عصبیت کی بنا پر جو یمنی قبائل کے سینوں میں قریش اور حکمران خاندان امویہ کے خلاف موجزن تھے، نہایت اقتدار و اثر رکھتا تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ اس خاندان کے ایک شخص کریب نامی نے ۲۸۰ھ میں حاکم اشبیلیہ کے خلاف بغاوت کی اور شہر پر غلبہ حاصل کر کے اپنے زور قوت اور سیاسی چالوں سے ایک ریاست قائم کر لی، جو چوتھی صدی کے درمیان اور امویوں کی حکومت کے خاتمہ تک نہایت شان و شوکت سے قائم رہی اور اس کی اولاد بنو عباد کی سلطنت میں منصب وزارت پر ممتاز ہوئی، جو پانچویں صدی تک اشبیلیہ کے فرمانروا تھے، لیکن جب ساتویں صدی میں عیسائیوں نے اس شہر پر اقتدار حاصل کرنا چاہا، تو خلدون کا خاندان افریقہ کی طرف ہجرت کر گیا اور تونس میں بنو حفص کے دامن دولت سے وابستہ ہو گیا اور وہاں بہت سے عہدوں پر کام کرتا رہا، لیکن اس خاندان کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہمیشہ سلطنت کا خواب دیکھتا رہتا تھا، اس لیے اگر ہم اس خاندان کے اس نسب نامہ کو صحیح تسلیم کر لیں جو اس کو قبیلۂ کندہ سے ملا دیتا ہے تو ہمیں یہ مان لینے میں تامل نہ ہو گا کہ وراثت کو سیاسی معاملات میں بڑا دخل ہے اور اسی لیے ابن خلدون ہمیشہ اس دریا میں غوطے لگاتا رہا ہے۔

ابن خلدون یکم رمضان ۷۳۲ھ میں تونس میں پیدا ہوا اور اس نے خود اپنے جو حالات لکھے ہیں، اس میں اپنی حقیقی تربیت کے متعلق ایک حرف بھی نہیں لکھا ہے بلکہ اپنے بچپن اور خانگی زندگی کے متعلق بالکل خاموشی اختیار کی ہے، البتہ اپنی تعلیم کا حال نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے اور اس وقت تونس میں جو مختلف علوم پڑھائے جاتے تھے، ان کی جو کتابیں اس نے پڑھی تھیں ان کے نام تفصیل کے ساتھ بتائے ہیں، اس کا باپ سیاسی زندگی سے الگ ہو کر عبادت، علم دین اور علم لغت کے درس و تدریس میں ہمہ تن مشغول ہو گیا تھا اور مشرق کے طرزِ قدیم کے مطابق وہی ابن خلدون کا پہلا استاد قرار پایا، لیکن ابن خلدون نے اپنے باپ سے جن علوم کی تحصیل کی ان کے متعلق خود اس نے کچھ نہیں لکھا ہے، البتہ جن علماء نے اپنے باپوں سے تعلیم حاصل کی ہے، ان پر قیاس کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن خلدون نے اپنے لڑکے کو قرأت، کتابت، نحو کے اصول، ادب اور فقہ کی تعلیم دی ہو گی۔

ابن خلدون نے اپنے اساتذہ کے ذکر میں جب سے وہ مدرسہ میں جانے کے قابل ہوا کوتاہ قلمی نہیں کی ہے، بلکہ ان کی زندگی، مشاغل اور ان علوم میں جن کی وہ تعلیم دیتے تھے، ان کے تبحر کا مختصر سا حال لکھا ہے اور اس میں کسی قدر تعلّی کی شان پائی جاتی ہے، کیونکہ ابن خلدون ہمیں یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ جن لوگوں کا ساختہ و پرداختہ ہے، وہ قابل اعتماد قابلیت کے لوگ تھے، بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ وہ نہایت اصرار کے ساتھ

اپنے اندر ایک ایسے استاد کے اوصاف پیدا کرنا چاہتا ہے، جو علم وفن میں کامل دستگاہ رکھتا ہو۔

اس نے اپنے مقدمہ میں بیان کیا ہے کہ اس نے اپنے بچپن میں جو کتابیں پڑھیں وہ تونس میں نایاب تھیں، یہی وجہ ہے کہ اس نے تفصیل کے ساتھ ان کے نام گنوائے ہیں، اس کا ایک خاص سبب یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے سوانح زندگی قاہرہ میں لکھے ہیں، جہاں اس کا یہ فرض تھا کہ اپنے حریف اساتذہ ازہر سے اپنے آپ کو پست درجہ ظاہر نہ ہونے دے، لیکن ہم ان تفصیلات میں کسی قدر شک ضرور کر سکتے ہیں اور اس شک کی وجہ خود ابن خلدون نے پیدا کر دی ہے، مثلاً وہ یہ بیان کرتا ہے کہ تونس میں اس نے جو کتابیں پڑھیں ان میں مختصر ابن حاجب بھی تھی اور اپنے سوانح زندگی میں اور اپنے مقدمہ میں اس کا شمار فقہ مالکی کی کتابوں کے ضمن میں کرتا ہے، حالانکہ مختصر ابن حاجب فقہ کی کتاب نہیں ہے، بلکہ وہ اصولِ فقہ کی ایک کتاب ہے جو عام طور پر شائع ہے، اور ازہر میں مدتوں سے آج تک پڑھائی جاتی ہے، اگرچہ اس کا مؤلف مذہباً مالکی تھا، لیکن اس نے صرف فقہ مالکی پر اکتفاء نہیں کیا ہے، بلکہ تمام مذاہب کے اصولِ تشریع کی تفصیل کی ہے اور یہ ایک خاص علم ہے۔

ابن خلدون نے مشہور کتاب ''اغانی'' کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، ہم اس میں بھی شک کر سکتے ہیں، کیونکہ اس نے اپنے سوانح میں تو یہ بیان کیا ہے کہ اس نے اس کی ایک جلد کو ازبر یاد کر لیا تھا اور مقدمہ میں اس کے کسی نسخہ کے ناممکن الحصول ہونے پر ماتم کرتا ہے، اس بنا پر ہمارا اعتقاد ہے کہ ابن خلدون صرف اس کتاب کے نام ہی سے واقف تھا۔

بہر حال ابن خلدون نے بچپن میں جس قسم کی تربیت پائی وہ غیر معمولی اور مجموعی طور پر اس تربیت سے بہتر نہ تھی جو اس وقت ازہر کے طلبہ حاصل کر رہے ہیں، البتہ اس کے وطن میں تربیت کی جو سطح تھی اس کے لحاظ سے اس کی تربیت کا معیار بلند تھا۔

اس نے قرآن مجید حفظ کیا اور ساتوں قرأتوں کے موافق اس کی روایت کی، اس نے حدیث کی مشہور کتابوں موطائے امام مالک، صحیح مسلم اور صحیح بخاری کے بعض اجزاء کے ذریعہ سے علم حدیث کی تعلیم حاصل کی اور اپنے مقدمہ میں اس نے مہدی اور دنیا کے اختتام کے متعلق جو دو فصلیں لکھی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے علم حدیث کو نہایت عمدہ طریقہ پر پڑھا تھا، اس نے فقہ مالکی کی مشہور کتاب ''مدونہ'' کے متعدد مختصرات کے ذریعہ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی تھی، نحو اور لغت کے متعلق اس کا بیان ہے کہ اس نے ان دونوں علوم میں نہایت مشہور کتاب ''تسہیل'' کو پڑھا تھا اور جاہلیت کے بہت سے اشعار، دیوان حماسہ اور دورِ عباسی کی بہت سی نظمیں ازبر یاد کی تھیں، علوم کے متعلق اس نے اپنے سوانح میں کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے، صرف اس قدر لکھا ہے کہ اس نے علم منطق اور علم کلام کو پڑھا، لیکن ہمارے خیال میں اس کی فلسفیانہ معلومات زمانہ مابعد میں پختہ ہوئیں، بالخصوص اس بارہ سال کی مدت میں جس کو اس نے قاہرہ میں بسر کیا، مقدمہ ابن خلدون اور اس کی دوسری تاریخی تصنیفات کی شہادت سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے علم میں جو وسعت و استحکام بعد کو پیدا

ہوا وہ اس کی ابتدائی تحصیل میں پیدا نہیں ہوا تھا اور یہ اس کے سفر اور ان متعدد کتب خانوں کا فیض ہے جن کے لیے وہ مراکش، غرناطہ، قاہرہ اور دمشق کی خاک چھانتا رہا۔

ابن خلدون اپنے سوانح زندگی میں بیان کرتا ہے کہ اس نے اپنی تعلیم ۲۰ سال کی عمر میں پوری کر لی اور اپنے اکثر اساتذہ سے اجازت یعنی سند حاصل کر لی، جس کو استاد اپنے شاگرد کو اس وقت عطا کرتا ہے جب اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ جس علم کی اس نے تعلیم دی ہے، شاگرد اس کے درس و تدریس کے قابل ہو گیا ہے، اس سند میں استاد اس کے تمام اساتذہ کے ناموں اور ان اسناد کی جو اس نے حاصل کی ہیں، تفصیلی تعداد بتاتا ہے، یہاں تک کہ درجہ بدرجہ اس پہلے عالم تک پہنچ جاتا ہے جس نے اس خاص علم کی اس کو تعلیم دی ہے، پھر اپنے شاگرد کو اجازت دیتا ہے کہ وہ مدرسوں میں اپنی ذمہ داری پر تعلیم دے، ازہر میں قرآن و حدیث کی تعلیم کے متعلق اس سند کا ہمیشہ سے رواج ہے۔ ۷۴۹ھ کی وبائے عام میں جب اس کے باپ اور ماں کی وفات نے اس کو عملی دنیا میں آنے پر مجبور کیا تو اس نے بہت سے اجازت نامے حاصل کیے، جن کا مقصد یا تو کسب معاش یا اس منصب کا تحفظ تھا جس پر اس کا خاندان ہمیشہ سے دربارِ شاہی میں ممتاز تھا، اس طرح وہ علامت کا منشی مقرر ہوا، یعنی اس کا فرض منصبی یہ تھا کہ فرمانوں پر بادشاہ کا طغراء درج کرتا تھا اور اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ اس کا خاندان یمن کے قبیلہ کندہ سے نسبی تعلق رکھتا تھا تو اسی زمانہ سے ابن خلدون کے دل میں اس مقاومت اور کشمکش کی ہوس پیدا ہوئی جس میں مدتوں سے اس کا خاندان مشہور تھا، وہ مدتوں اس منصب کے فرائض ادا کرتا رہا، یہاں تک کہ بادشاہ ایک فوجی حملہ کی وجہ سے شہر چھوڑنے پر مجبور ہوا اور ابن خلدون کو بھی ساتھ لیتا گیا اور ابن خلدون نے بھاگنے کے ارادے سے اس کی رفاقت اختیار کی، کیونکہ خود اس کا بیان ہے کہ وہ مراکش کی حدود تک پہنچنے کے ساتھ ہی اس کو چھوڑ کر فاس چلا گیا۔ لیکن وہ خود یہ کہتا ہے کہ اس نے علمی ضرورت کے پورا کرنے کے لیے یہ سفر اختیار کیا کیونکہ تونس پر سلطان مراکش کے حملہ کے بعد علماء اور بڑے بڑے اساتذہ تونس کو چھوڑ کر فاس میں چلے آئے تھے۔ لیکن ہم اس توجیہ میں شک کر سکتے ہیں۔ بالکل صاف صاف بات تو یہ ہے کہ جب اس نے تونس کی حکومت کا ضعف اور سلطان مراکش کی طاقت کو دیکھا تو تونس کو چھوڑ کر فاس کی طرف جانے کا ارادہ کر لیا جب سلطان ابو اسحاق کا حملہ ہوا تو حدودِ مراکش کے عبور کرنے کے لیے اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، کچھ دنوں کی گردشِ تقدیر کے بعد وہ سلطان ابو عنان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے اس کو علماء کی سوسائٹی یا اس سوسائٹی میں شامل کر لیا جو سلطان کے سامنے دینی اور نحوی مسائل کے متعلق بحث کرتی تھی، اس کے بعد سلطان نے اس کو اپنا معتمد یعنی سیکرٹری مقرر کیا اور ابن خلدون نے اس منصب کو بادلِ نخواستہ قبول کیا کیونکہ اس کے آباء واجداد میں کسی نے اس عہدے کو قبول نہیں کیا تھا اور وہ جس وقت فاس کی طرف روانہ ہوا تھا باوجود اپنی کمسنی کے سلطنت کے کسی اعلیٰ ترین عہدہ کے حاصل کرنے کی توقع رکھتا تھا، اس عہدہ کی ناپسندیدگی اور اپنی ناکامی کی بنا پر اس نے امیر محمد مہدی حاکم بجایہ سے جو اس وقت فاس میں مقید (قید) تھا، خط

وکتابت شروع کی اور دونوں نے مل کر شورش انگیزی کے اسباب پر غور کرنا شروع کیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ امیر موصوف بادشاہ اور ابن خلدون اس کا وزیر ہو، لیکن اس سازش کا راز طشت از بام ہو گیا اور ابن خلدون جیل کی تاریک کوٹھری میں قید کر دیا گیا، جہاں اس نے تین سال کی قید کاٹی، لیکن یہ مدت سلطان کی وفات یعنی ۷۵۹ھ میں ختم ہوگئی اور حسن بن عمر نے جو اس کے بعد فرمانروا ہوا تھا اس کو رہا کر دیا اور اس کو عطیہ و مال دیا، لیکن ابن خلدون نے اپنے محسن کے اس احسان کی ناشکری کی اور اس کے کامیاب حریف منصور بن سلیمان کا بہت جلد معتمد ہو گیا۔ یہاں تک کہ اپنے جدید آقا کے ساتھ فاس میں اس کا محاصرہ کر لیا، بلکہ ایک مدت کے بعد ایک مراکشی لامیری کی حمایت میں اس نے خود منصور کے خلاف اکابر سلطنت کو شورش انگیزی پر آمادہ کیا، یہ امیر اندلس میں جلاوطن کر دیا گیا تھا، اس کے بعد تخت و تاج کا مدعی ہوا اور ابن خلدون کی حمایت بہت سامال دے کر خریدی اور سلطنت کے ایک اعلیٰ ترین منصب کے دینے کا وعدہ کیا، جب اس کا یہ مقصد حاصل ہو گیا اور ابن خلدون سلطان کا معتمد اور اس کے خزانے کا مہتمم مقرر ہو گیا تو ارکانِ سلطنت میں اس کے دوسرے حریفوں کو یہ ناگوار ہوا اور انھوں نے سلطان سے اس کی شکایت کی، ابن خلدون نے سلطان کی بے التفاتی دیکھی تو خود اس سے گفتگو نہیں کی، بلکہ عمر بن عبداللہ سے جو اس کا اور حاکم بجایہ کا مخلص دوست تھا سازوباز کی اور جب وہ تخت و تاج حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس پر بڑی بڑی مہربانیاں کیں، لیکن ابن خلدون کو اس سے تسکین نہیں ہوئی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ عمر اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرے گا جو ایک ہمسر دوسرے ہمسر کے ساتھ کرتا ہے۔

جب ابن خلدون نے دیکھا کہ فاس میں اس کے لیے کوئی میدان باقی نہیں رہا اور اس کے دل میں یہ خوف پیدا ہوا کہ اس کی سیاسی چالوں کا انجام برا ہوگا، تو اپنے وطن کو لوٹنے کی کوشش کی، لیکن ارادہ تلمسان کے سفر کو ظاہر کیا تاکہ وہاں پہنچ کر مراکش کی حکومت پر عمر کا اقتدار قائم کر سکے، لیکن عمر کو اس کے معاملہ میں شک پیدا ہوا اور اس نے تلمسان کے سوا اس کو ہر جگہ سفر کرنے کی اجازت دی، اب وہ بحری راستے سے اندلس میں آیا۔ (۷۶۴ھ)

ابن خلدون جس زمانے میں فاس کے دربارِ شاہی سے وابستہ ہوا تھا، اس زمانے میں محمد خامس سلطان غرناطہ اور اس کے وزیر لسان الدین خطیب کی سرکار میں بڑی بڑی خدمات انجام دی تھیں اس لیے ان دونوں نے نہایت گرم جوشی اور اعزاز کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا اور اس پر سلطان کا اس قدر اعتماد قائم ہو گیا کہ اس کو قشتالہ کے بادشاہ بطرس (بیدرد) کی خدمت میں سفیر بنا کر اشبیلیہ میں بھیجا اور ابن خلدون نے اس شہر کو دیکھا جس میں اس کے خاندان کا اخترِ اقبال چمکا تھا، لیکن چونکہ وہ ایک باوقار شخص تھا اس لیے اس سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوا، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے اس کا خیر مقدم بہت اچھی طرح کیا اور اس معاملہ میں ایک یہودی طبیب نے جس نے اس کا خاندانی حال بتایا اس کی مساعدت کی بلکہ ابن خلدون کا بیان ہے کہ بادشاہ نے اس کے قیام کرنے کی خواہش کی اور اس سے یہ وعدہ کیا کہ خلدون کے خاندان کا ترکہ اس کو واپس دے دے گا، ہمیں اس کا یقین کرنا چاہیے کہ وہ اس سفارت میں کامیاب ہوا کیونکہ جب وہ غرناطہ کو واپس آیا تو

سلطان نے اس کو بڑے بڑے صلے اور عطیے دیے اور ایک جائیداد اس کو جاگیر میں دی، اب اس نے اپنے اہل و عیال کو بھی بلا لیا اور دربارِ شاہی کے ساتھ وابستہ ہو گیا اور تقریبات کے زمانہ میں سلطان کے مدحیہ قصائد پڑھنے لگا، لیکن چند ہی دنوں کے بعد اس کے پرانے دوست وزیر ابن خطیب کے دل میں رشک و حسد پیدا ہوا اور وہ اس کی دشمنی پر آمادہ ہو گیا۔

اس زمانہ میں حاکم بجایہ کی جانب سے جس نے اپنا تخت و تاج دوبارہ واپس لے لیا تھا، اس کو ایک خط موصول ہوا جس میں اس نے اس سے اپنی ملازمت کی خواہش کی تھی، اس لیے ابن خلدون نے سلطان سے اجازت حاصل کی اور ۷۶۶ھ میں افریقہ میں واپس آیا۔

اس نے بجایہ میں حاجب یا رئیس الوزارت کا عہدہ حاصل کیا اور بعض اوقات تعلیم و معاملاتِ سلطنت کی تنظیم کا کام بھی انجام دیا، لیکن سلطان بجایہ چند ہی دنوں میں ایک لڑائی میں جو اس کے اور اس کے بھائی شاہ قسطنطنیہ کے درمیان ہوئی تھی، مقتول ہوا اور اس کے دوست اور اس کے وزیر ابن خلدون نے اس سے بہتر کوئی صورت نہیں دیکھی کہ شہر کو فاتح کے سپرد کر دیا جائے، لیکن چند ہی دنوں کے بعد وہ اس سے ناراض ہو گیا اور اب وہ بسکرہ میں واپس آنے پر مجبور ہوا اور یہاں سے سلطان تلمسان اور سلطان تونس سے خط و کتابت شروع کر دی اور دونوں کو سلطان قسطنطنیہ کی جنگ پر آمادہ کرنے لگا۔ ابن خلدون نے بسکرہ میں جو سیاسی چالیں اختیار کیں وہ چونکہ سخت پیچیدہ اور طویل الذیل ہیں، اس لیے ہم ان کی تفصیل کرنا نہیں چاہتے۔ صرف یہ بیان کر دینا کافی ہو گا کہ سلطان تلمسان کے معتمد ملازم ہونے کے بعد جب سلطان مراکش نے اس پر حملہ کیا تو ابن خلدون نے سلطان تلمسان کے خلاف بغاوت کی اور متعدد حوادثات کے بعد فاس میں واپس آیا اور دربار شاہی میں دوبارہ اپنی جگہ لینی چاہی، لیکن وہ اس میں ناکام رہا اور مراکش کے چھوڑنے اور اسپین کے سفر پر مجبور ہوا۔ (۷۷۶ھ)

لیکن اس مرتبہ سلطان غرناطہ کی متوقع اعانت اس کو حاصل نہ ہو سکی، کیونکہ سلطان اس سے اس لیے رنجیدہ تھا کہ جب وہ فاس میں تھا تو اس نے اس کے جلاوطن وزیر کی حمایت میں کوشش کی تھی، اس کے علاوہ فاس کی حکومت نے بھی اس کو ابن خلدون کی سیاسی چالوں سے ہوشیار کر دیا تھا۔ اس لیے اس نے اس کو افریقہ واپس جانے پر مجبور کیا، ابن خلدون نے اپنے آپ کو سلطان تلمسان کے حوالے کر دیا۔ جس کے ساتھ اس نے پہلے دغا کی تھی، لیکن سلطان نے اس کے ایک دوست کی سفارش سے اس کو معاف کر دیا اور اس نے کچھ دنوں آرام حاصل کیا، اس کے بعد سلطان کو اس کی اعانت کی ضرورت پڑی اور اس کو ایک بدوی قبیلہ کی طرف ایک مہم پر بھیجا۔ لیکن ابن خلدون نے سیاسی زندگی کو ناپسند کیا اور اس مہم کو اوپری دل سے قبول کیا اور شہر سے نکلنے کے ساتھ ہی دوسری راہ اختیار کی اور عریف کی اولاد کے یہاں اترا، وہاں سے اس نے سلطان کی خدمت میں معذرت نامہ بھیج دیا اور اپنے خاندان کو بلا لیا اور ایک محل میں جو قلعہ ابن اسلامہ کے نام سے موسوم تھا اقامت اختیار کی۔ (۷۷۶ھ)

ابن خلدون نے یہاں پورے چار سال بسر کیے، اور اس مدت میں مصروف رہا اور اس کا بیان ہے کہ

اس نے مقدمہ کو یہیں لکھا، لیکن ہمارے خیال میں اس نے متعدد بار بالخصوص مشرق کے سفر اور اخیر میں مصر کے قیام کے بعد اس کی تہذیب و اصلاح کی۔ ابن خلدون فاس کی حکومت میں آخری ناکامیابی کے بعد سیاسی زندگی میں مستقل کامیابی نہ حاصل کرسکا، اس نے کوششیں تو بہت کیں، لیکن اس کا کوئی مقصد حاصل نہ ہوسکا اور درحقیقت ان سیاسی چالوں کے بعد شمالی افریقہ کے بادشاہوں کے لیے یہی مناسب تھا کہ ابن خلدون جیسے خطرناک اور خودغرض شخص کو مشکوک نگاہ سے دیکھیں، لیکن خود ابن خلدون کا بیان ہے کہ اپنی کتاب کی تکمیل کے لیے اس کو بہت سی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت تھی جو صرف بڑے بڑے شہروں کے کتب خانوں میں مل سکتی تھیں اور نیز اس نے ایک طویل مرض کے خیال سے اپنے جنم بھوم کی طرف واپس آنے کا خیال کیا۔ لیکن وسطی افریقہ، اسپین اور مراکش کے دروازے اس کے سامنے بند تھے اور وہ تونس کے سوا اور کسی شہر میں جا ہی نہیں سکتا تھا، اس لیے وہ تونس میں آیا اور وہاں کے بادشاہ نے اس کا خیر مقدم بہت اچھی طرح کیا اور ابن خلدون کے قول کے مطابق ملکی معاملات میں اس سے مشورہ لے کر اس کی عزت افزائی کی، لیکن اس زمانہ میں اس نے سیاسیات میں دخل نہیں دیا۔ یہ پتہ تو نہیں چلتا کہ اس نے سیاسیات میں خود علیحدگی اختیار کرلی یا سلطان کو اس کی خدمات کی ضرورت ہی نہیں ہوئی، لیکن بہرحال وہ بڑی بڑی مسجدوں میں درس دینے لگا اور اپنی تاریخ کی تصنیف میں مشغول ہوگیا، اگرچہ اس حالت میں بھی رشک و حسد کے مخفی جذبات فوراً ہی ابھر آئے، لیکن وہ سیاسی نہ تھے، بلکہ علمی جنگ کی صورت میں ظاہر ہوئے تھے، اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ابن خلدون کی شہرت کی وجہ سے محمد بن عرفہ کے دل میں جو تونس کے مفتی اور مدرسہ میں ابن خلدون کے رفیق تھے، بغض و حسد پیدا ہوا۔ بالخصوص یہ غم و غصہ اس وقت اور زیادہ بڑھ گیا جب ان کے طلبہ ان کے حریف سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے ان سے الگ ہوگئے۔ اس لیے انھوں نے اس کے خلاف حکومت کے دربار اور شہر دونوں میں ایک ساتھ پروپیگنڈا شروع کیا اور اس کو ایک خطرناک شخص کی صورت میں پیش کیا اور اس پر بہت سے اتہامات لگائے۔ وہ ابن خلدون کو جلاوطن کرانا چاہتے تھے لیکن سلطان نے اس کو مناسب نہیں خیال کیا، بلکہ اس کو صرف شہر سے الگ کردینا چاہا، اس کے بعد اس کو ایک جنگ میں اپنے ساتھ لے گیا اور جب دوبارہ ایسا کرنے کا ارادہ کیا تو ابن خلدون نے خیال کیا کہ اب یہاں قیام کرنے کی کوئی توقع نہیں، اس لیے فریضہ حج ادا کرنے کے لیے سفر مکہ کے حیلہ سے مشرق کا سفر اختیار کیا اور ۷۸۴ھ میں اسکندریہ کے قصد سے جہاز پر سوار ہوا اور چالیس دن کے بعد ٹھیک اس وقت پہنچا جب ملک ظاہر (برقوق) کے ہاتھ میں وہاں کی حکومت آچکی تھی، اسکندریہ میں اس نے ایک مہینہ تک قیام کیا اور اس اثنا میں اپنا ارادہ بدل کر مکہ کے بجائے قاہرہ کا رخ کیا اور اس کے خیال کے مطابق حالات کا اقتضاء یہی تھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پہنچنے سے پیشتر ہی مصر میں اس کی شہرت پہنچ گئی تھی کیونکہ وہاں پہنچنے کے ساتھ ہی ازہر کے طلبہ درس لینے کے لیے اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس نے ازہر میں درس دینا شروع کیا۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہاں اس نے کن کتابوں اور کن علوم کا درس دیا۔

وہ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا اور اس نے جیسا کہ اس زمانہ میں علماء کے وظیفہ مقرر کرنے کا دستور تھا اس کا بھی وظیفہ مقرر کر دیا، پھر مدرسہ کاملیہ میں جس کو سلطان صلاح الدین نے قائم کیا تھا، اس کو فقہ مالکی کا مدرس مقرر کر دیا، ابن خلدون نے مصر کی حکومت میں کوئی سیاسی کھیل کھیلنا نہیں چاہا، کیونکہ یہ اس کی استطاعت سے باہر تھا، اس نے افریقہ میں بہت سے سال بسر کیے تھے اور ان سالوں میں متعدد نیم مہذب سلطنتوں میں بڑے بڑے سیاسی کام انجام دیے تھے، لیکن اس نے قاہرہ میں ایک نیا عالم دیکھا اور جب وہاں داخل ہوا تو شہر کی عظمت و جلال سے مبہوت ہو گیا اور سچائی کے ساتھ پکار اٹھا کہ ''قاہرہ اسلام کا دارالسلطنت ہے'' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں بربر کے قبائل کی طرح مصری حکومت اور مصری دربار کی بنیاد تشدد اور سیاسی چالوں پر قائم نہ تھی، بلکہ دونوں مضبوط ستونوں پر قائم تھے اور ان کے جو قانون اور قاعدے تھے وہ اس کو ایک متحد اور منتظم راستہ پر لے جا رہے تھے۔ قومیت کے لحاظ سے دربار اور فوج ترکی اور تربیت اور خصائل کے لحاظ سے مصری تھے، باقی خالص مصری قومیت تو وہ تمدن اور مذہب دونوں پر حکمرانی کرتی تھی۔ ۷۸۶ھ میں ابن خلدون مالکیوں کا قاضی مقرر کیا گیا اور اس کا بیان ہے کہ اس نے یہ عہدہ صرف بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے قبول کیا۔

اگرچہ قاضی القضاء کا لقب جو اس عہدہ کے بعد حاصل ہوتا ہے، بہت بڑا لقب تھا، لیکن اس زمانہ میں مصر میں اس کی قدیم عظمت باقی نہیں رہی تھی اور خلافت راشدہ، خلافت امویہ اور خلافت عباسیہ کے زمانہ میں، مصر میں صرف ایک قاضی القضاۃ رہتا تھا جو تمام اطرافِ ملک کے دیوانی، فوجداری اور مذہبی مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا اور اس کے لیے اپنے فیصلوں میں چار مشہور مذاہب میں سے کسی مذہب کی پابندی ضروری نہ تھی، بلکہ اپنی رائے کے مطابق جس مذہب کے احکام کو چاہتا تھا اختیار کر لیتا تھا، بلکہ اپنے شخصی اجتہاد کے موافق بھی فیصلہ کر سکتا تھا، وہ تمام ملک میں اپنے نمائندے بھیجتا تھا اور وہ وقف اور یتیموں کے کاموں کا انتظام کرتے تھے۔ فاطمین کے زمانہ میں بھی اس حالت میں کوئی تغیر نہیں ہوا اور چونکہ اس زمانہ میں خلیفہ کی طرح قضاۃ بھی شیعہ ہوتے تھے، اس لیے وہ شیعوں کے احکام کے موافق فیصلہ کرتے تھے۔ لیکن جب سلطان صلاح الدین نے اس خاندان کو مغلوب کر لیا تو شافعی قاضی مقرر کیا اور مصر میں شافعی مذہب کی حیثیت کو نمایاں کیا اور مصر و شام میں اس مذہب کے احکام اور اشعری عقائد کو جاری کیا جن کے وہ لوگ پابند ہو گئے، جو صرف ملکی طاقت سے کسی چیز کی حفاظت کرتے ہیں، ممالیک نے بھی انہی تعلیمات کے اقتدار کو قائم رکھا۔ لیکن وہ چاروں مذاہب کے احکام کو جاری کرتے تھے کیونکہ مصر و شام میں ان چاروں مذاہب کے پیرو موجود تھے۔ اس بنا پر قاضی القضاۃ کے چار عہدے پیدا ہو گئے۔ البتہ شافعیوں کے قاضی کی حیثیت زیادہ نمایاں رہی۔

ابن خلدون بھی اس وقت انہی چاروں قاضیوں میں سے ایک قاضی تھا لیکن اس نے شافعی قاضی کے اقتدار اور اہمیت کو ناپسند کیا اور اس کے مقابلہ پر آمادہ ہوا۔ لیکن اس کو اس مقصد میں ناکامی ہوئی کیونکہ وہ بے لاگ فیصلہ کرتا تھا اور جو اعیانِ سلطنت اس کے یہاں سفارش کرتے تھے، ان کی سفارشوں کو قبول نہیں کرتا تھا، یا

تو اس لیے کہ وہ نہایت انصاف پسند تھا یا یہ کہ وہ اپنے آپ کو ایک انوکھے انداز میں نمایاں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خود بیان ہے کہ وہ محض خدا کی خوشنودی کا خواستگار تھا۔ بہر حال وہ چند ہی روز اس عہدہ پر رہ سکا اور اس کے دشمنوں نے قوم اور دربار میں اس کے خلاف جو پروپیگنڈا شروع کیا تھا اس کا خاتمہ اس کی معزولی پر ہوا۔ البتہ اس نے اپنا وظیفہ اور منصب ایک مدرس کی حیثیت میں قائم رکھا اور اب اس کو یقین ہو گیا کہ وہ مصری دربار میں کوئی سیاسی چال نہیں چل سکتا۔ اس لیے اس نے بادشاہ کے زیر سایہ اپنی علمی پوزیشن کے بھروسے پر امن وسکون کی زندگی بسر کرنے پر قناعت کر لی، اسی زمانہ میں اس پر ایک سخت مصیبت آئی یعنی اس کا جو خاندان اس کے ساتھ قیام کرنے کے لیے آ رہا تھا سمندر میں ڈوب گیا اور اس واقعے کی وجہ سے جیسا کہ وہ خود کہتا ہے ''اس کے مال، اولاد اور خوش نصیبی'' سب کچھ جاتے رہے اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مصیبت کی وجہ سے اس کو حج کا خیال پیدا ہوا اور ۷۸۹ھ میں مکہ کا اور مکہ سے مدینہ کا سفر اختیار کیا۔ اس کے بعد وہ مصر میں واپس آیا اور سلطان کے یہاں آخری کوشش کی اور دورانِ ملاقات اس سے کہا کہ مقاماتِ مقدسہ میں اس نے اس کے لیے دعا کی ہے۔ جس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کی وہم پرستانہ ذہنیت پر اثر ڈالے، لیکن سلطان نے تھوڑا بہت صلہ دے کر واپس کر دیا۔ اب ابن خلدون نے اپنی کوشش کی ناکامی کو دیکھ کر گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ جس میں درس وتدریس کے سوا اس کا کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا۔ (۷۹۷ھ۔۱۳۹۴م)

اس کی سوانح زندگی کے تمام نسخے (التعریف) اسی سال تک پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ (۷۹۷ھ) اور ''وہ سلان'' نے اس کی جو سوانح عمری لکھی ہے وہ بھی اس سے آگے نہیں بڑھتی، لیکن قاہرہ کے شاہی کتب خانہ میں ایک مکمل نسخہ پایا جاتا ہے۔ جو ابن خلدون کے نسخہ سے منقول ہے۔ اس میں ابن خلدون نے نئے سرے سے اپنے حالات لکھے ہیں اور مدتوں میں اس کو مکمل کیا ہے اور یہ نسخہ ۸۰۷ھ تک یعنی اس کی وفات سے ایک سال پیشتر تک کے حالات پر مشتمل ہے۔

ابن خلدون نے اپنی زندگی کا جو درمیانی زمانہ مصر میں بسر کیا اس میں خاص طور پر مستعدی اور سرگرمی پائی جاتی ہے کیونکہ اپنی تصنیفات کی تنقیح وتہذیب اور متصل درس وتدریس کے علاوہ اس نے ایک اہم سیاسی دور میں حصہ لیا۔ چنانچہ اپنے سوانح زندگی کے اخیر میں جہاں اس نے ممالیک کی تاریخ کا مفصل تذکرہ کیا ہے وہاں سلطان مصر اور امرائے افریقہ کے سیاسی تعلقات کے متعلق ہمارے سامنے نہایت اہم معلومات پیش کیے ہیں، اس نے ایک طرف تو سلطانِ مصر کو نصیحتیں کر کے اور دوسری طرف سلاطین افریقہ سے خط وکتابت کر کے ان تعلقات کو مستحکم کرنے میں کامیابی حاصل کی اور ان سلاطین کو اس پر آمادہ کیا کہ مصر میں بہت سے ہدیے بالخصوص عمدہ گھوڑے بھیجیں اور اس نے مصر کی دوستی کی اہمیت ظاہر کی جو مکہ کے مسافروں کا قدرتی راستہ تھا۔ اس لیے انھوں نے اس کی نصیحت کو سنا، اس نے ان ہدایا کا جو فریقین نے ایک دوسرے کو بھیجے کچھ ایسے عجیب طریقہ سے ذکر کیا ہے جس سے اس زمانہ کے تمدن کا حال نہایت واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔

۸۰۱ھ میں وہ فیوم سے جہاں وہ اپنی زراعت کے کاروبار میں مصروف تھا۔ اس غرض سے طلب کیا گیا کہ وہ منصب قضاء کو دوبارہ حاصل کرے۔ اس کے چند دنوں کے بعد سلطان برقوق نے وفات پائی اور اس کی وفات سے نظام حکومت کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا اور اس کا بیٹا اور اس کا خلیفہ ملک ناصر فرج اس قدر کمزور تھا کہ ممالیک کے ہاتھ کا کھلونا بن گیا۔ ابن خلدون نے دوبارہ اپنا منصب حاصل کیا تھا کہ نئے سرے سے رشک وحسد کا آغاز ہوا اور وہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد معزول کر دیا گیا۔ لیکن ایک سیاسی واقعہ نے اس کے دل میں سیاسی چالوں کی پھر خواہش پیدا کی اور وہ یہ کہ اس زمانہ میں تیمور لنگ شام میں جنگ کر رہا تھا اور ۸۰۳ھ میں حلب پر فاتحانہ غلبہ حاصل کر چکا تھا۔ سلطان مصر بھی اس کے مقابلہ کو روانہ ہوا اور قضاۃ مصر اور اعیانِ مصر کو ساتھ لے کر وہ بھی اس سے ملے۔ ابن خلدون نے پہلے تو مزاحمت کرنی چاہیے، لیکن اخیر میں اس کی اطاعت کر لی۔ سلاطین تونس جس طرح ابن خلدون سے خائف تھے، سلطان مصر کو اس قسم کا خوف نہ تھا کیونکہ وہ مصر کے امن وامان میں خلل ڈالنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا، اس معاملہ میں صرف دو چیزیں سلطان کے لیے محرک تھیں ایک تو غرور اور دوسرا وہم، کیونکہ سلاطین مصر اپنی تمام لڑائیوں میں علماء وصوفیا کو ساتھ لے جاتے تھے تاکہ ایک طرف تو ان کے ذریعہ سے دشمن پر غالب ہوں اور دوسری طرف ان کی ذات سے توفیق الٰہی کو حاصل کریں۔

جب یہ لوگ دمشق میں پہنچے تو ابن خلدون کو مدرسہ کاملیہ میں ٹھہرا دیا اور تیمور لنگ کے مقابلہ کا انتظار کرنے لگے۔ روایت ہے کہ مصری فوج نے دو لڑائیوں میں تیمور لنگ سے مڈبھیڑ کی اور اگر مصر کی ایک سازش نے سلطان کو اس پر مجبور نہ کر دیا ہوتا کہ وہ دمشق کو دشمن کے محاصرہ میں تنہا چھوڑ کر فوراً واپس آئے تو تیمور کو بھاگنے کی فکر کرنی پڑتی۔ دمشق سے اس کے مصری حاکم کی مرضی کے خلاف علماء وقضاۃ کا ایک وفد نکل کر تیمور کی ملاقات کے لیے روانہ ہوا اور اس سے ایک بڑے فدیہ کے وعدہ کے مقابل میں صلح نامہ کے ذریعے سے معافی مانگی۔ ابن خلدون اگرچہ اس کام کی تدبیر میں شریک تھا، تاہم چونکہ ہوشیار تھا اس لیے خود جنبش نہیں کی لیکن یہ وفد جو حاکم کی رائے کے خلاف اور باشندگانِ شہر کے مشورہ کے بغیر مرتب ہوا تھا، اپنے وعدہ کو پورا نہ کر سکا اور اہل دمشق نے شورش کی اور اس کے ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اب ابن خلدون کے دل میں خوف پیدا ہوا کہ مبادا کوئی بڑی مصیبت نہ آ جائے۔ اس لیے اس نے قاضیوں کے ساتھ اس پر اتفاق کیا کہ کتنی ہی زحمتیں برداشت کرنی پڑیں لیکن اس کو دمشق سے نکل جانا چاہیے۔ ان لوگوں نے اس کو قلعے سے ایک پہاڑ پر اتار دیا اور شہر کے چھوڑنے کے ساتھ ہی وہ تیمور کے لشکر گاہ کی طرف روانہ ہوا اور دونوں میں جو گفتگو ہوئی اس میں سمرقند کے ایک فقیہ عبدالجبار بن نعمان نامی ترجمان تھے۔ ابن خلدون نے اپنی تاریخی اور جغرافیانہ وسعت علمی سے تیمور کے یہاں اہمیت حاصل کر لی اور چونکہ مغربی افریقہ سے اس نے اس کے چند سوالوں کا جو جواب بھیجا تھا وہ اس کو بہت پسند آئے تھے، اس لیے تیمور نے اس سے ان اطراف کے جغرافیانہ حالات لکھنے کی فرمائش کی اور ابن خلدون نے اس پر ایک رسالہ لکھا اور ایک مہینے پانچ دن تک اس کا مہمان رہا اور تیمور نے اس کے ترجمہ

کرنے کا حکم دیا۔ لیکن ان متعدد گفتگوؤں سے جو ابن خلدون اور تیمور میں ہوئیں، وہ کیا توقع رکھتا تھا؟ کیا وہ مصر کی جنگ پر اس کو آمادہ کرنا چاہتا تھا؟ یا اس کے ساتھ اس کے ملک میں جانا اور صرف اپنے اور چند علماء مصر کے لیے جو گرفتار تھے معافی حاصل کرنا چاہتا تھا؟

ابن خلدون کا بیان ہے کہ تیمور جب دمشق میں داخل ہوا۔ اس کی فوجیں جب اس کو لوٹ چکیں، اس کو جلا دیا اور اس کے باشندوں کو ذبح کر چکیں تو ان سب کے بعد اس نے تیمور کی خدمت میں ایک بدیع الخط، قیمتی جلد کا قرآن، قصیدہ بردہ جو رسول اللہ ﷺ کی مدح میں کہا گیا تھا، ایک سجادہ اور مصری حلوا کی دو پٹاریاں ہدیۃً پیش کیں اور جب ان کو پیش کرنا چاہا تو اس کی خدمت میں گیا اور سلام کرنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ گیا، پھر کھڑے ہو کر تخت شاہی کی طرف بڑھا اور الگ الگ تمام تحفے پیش کیے، تیمور کو ان دونوں کتابوں کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ اس لیے اس نے ان کے متعلق استفسار کیا اور جب اس کو معلوم ہوا کہ ان میں ایک قرآن ہے تو اس کی تعظیم کے اظہار کے لیے اس کو اٹھا کر سر پر رکھا اور قصیدہ بردہ کو بوسہ دیا، حلوا کے متعلق ابن خلدون کا بیان ہے کہ اس نے پہلے رسم کے موافق خود اس کو چکھا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اس کو کھایا اور باقی کو اپنے گردو پیش کے لوگوں پر تقسیم کر دیا اور ابن خلدون کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اس کی خواہشیں دریافت کیں۔ ابن خلدون نے اپنی غربت کا واقعہ بیان کیا اور کہا کہ اس نے اپنے خاندان کو افریقہ میں چھوڑ دیا ہے اور وہ تنہا دمشق میں مقیم ہے اور وہ اور اس کے مصری رفقاء بادشاہ کی حمایت کرتے ہیں، تیمور نے اس کی یہ خواہش پوری کی۔

اس کے چند دنوں کے بعد ابن خلدون تیمور کے دربار میں حاضر ہوا تو تیمور نے کہا کہ ''معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے پاس ایک اصیل خچر ہے'' ابن خلدون نے جواب دیا کہ ''ہاں اے میرے آقا'' تیمور نے کہا کہ ''اس کو میرے ہاتھ فروخت کرتے ہو؟'' ابن خلدون نے جواب دیا کہ ''اے میرے آقا میں بھاؤ تاؤ نہیں کرنا چاہتا، بلکہ آپ کو ہدیۃً (تحفہ) دیتا ہوں۔'' تیمور نے کہا کہ ''ہرگز نہیں، میں اس کو اس لیے خریدنا چاہتا ہوں کہ تمھارے ہدیہ کا صلہ دوں۔'' ابن خلدون نے اس کو اپنا خچر دے دیا اور اس نے اس کو قبول کر لیا۔

اس نے تیمور سے جو آخری ملاقات کی اس میں اس نے دریافت کیا کہ تم مصر میں واپس جانا چاہتے ہو؟ ابن خلدون نے جواب دیا کہ میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ اپنے آقا کی خدمت کروں۔ لیکن تیمور نے اس کو منظور نہیں کیا۔ بلکہ اس کے اور اس کے تمام رفقا کے لیے واپسی کا اجازت نامہ دینے کا حکم دیا اور جب تیمور اور سلطان مصر میں مصالحت ہو گئی تو تیمور نے مصری سفراء کے ذریعہ سے ابن خلدون کے لیے اس کے آخری ہدیہ (خچر) کے صلہ میں کچھ روپے بھیجے، اس پر ابن خلدون نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے تیمور کے پنجے سے اس کو نجات اور اس کے خچر کی قیمت دلائی۔

جب ابن خلدون قاہرہ میں واپس آیا تو اس نے سلطان مراکش کی خدمت میں ایک طویل خط بھیجا، جس میں اپنی سرگزشت تفصیل کے ساتھ لکھی، تیمور کی نسبت یہ فقرہ لکھا کہ ''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ بڑا عالم ہے وہ

غلطی کرتے ہیں، وہ ایک بڑا ذہین آدمی ہے اور معلوم اور غیر معلوم سب کے متعلق بحث کرنے کا شائق ہے۔''

۸۰۳ھ میں ابن خلدون اور دوسرے مالکی فقہاء میں دوبارہ جنگ چھڑ گئی اور اس میں اور ایک فقیہ بساطی نامی میں ایک بڑا معرکہ ہوا۔ یہاں تک کہ دونوں میں سے ہر ایک صرف چند مہینے قاضی کے فرائض انجام دیتا تھا، پھر دوسرے کے لیے اس کو چھوڑ دیتا تھا اور وہ بھی چند روز کے بعد اس عہدے سے دست بردار ہو جاتا تھا، اس طریقہ پر ابن خلدون چھ مرتبہ قاضی مقرر کیا گیا، لیکن سب سے آخری بار وہ اس منصب کو حاصل کرنا چاہتا تھا کہ ۲۵ر رمضان ۸۰۸ھ کو اس کا انتقال ہو گیا۔

کرامر اور فریرو کا خیال ہے کہ ابن خلدون بہت زیادہ قنوطیت پسند تھا۔ کرامر اس کو ابوالعلاء معری کے مثل سمجھتا ہے اور یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ابن خلدون کی قنوطیت ایک عالم کی قنوطیت اور ابوالعلاء معری کی قنوطیت ایک شاعر کی قنوطیت ہے اور دونوں کے نزدیک اس جذبہ کا سبب عربی سلطنت کا عام انحطاط ہے۔

فریرو ابن خلدون کو مکیاویلی کے مثل سمجھتا ہے اور اس کے خیال میں، اس کی مضطربانہ سیاسی زندگی اس کی قنوطیت کا سبب ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابن خلدون کی اخلاقی حالت نہ تو عربی سلطنت کے انحطاط سے متاثر ہوئی اور نہ اس پر اس اضطراب کا کچھ اثر ہوا، جو اس کی زندگی میں پیش آتا رہا، وہ ابتدائے عمر سے اخیر تک سرور اور خود اعتمادی کی زندگی بسر کرتا رہا اور باوجود اپنی ناکامیوں کے اس کو ہمیشہ یہ توقع رہی کہ اس کی کوششوں کے سر پر کامیابی کا تاج رکھا جائے گا۔ کیا ہمیں یہ نظر نہیں آتا کہ اپنی وفات سے پانچ سال پیشتر ۶۶ سال کی عمر میں وہ تیمور کے دربار میں کامیابی حاصل کرنے کا عزم رکھتا ہے؟ لیکن جب اس کو کامیابی نہیں ہوئی تو قاہرہ میں تیمور اور تمام تاتاریوں کی ہنسی اڑاتا ہوا واپس آیا۔

میرا خیال ہے کہ ابن خلدون ہر چیز سے پہلے ایک سیاست دان، حکیم اور ذہین شخص تھا۔ لیکن اس نے اپنی سیاسی ذہانت سے کسی سلطنت یا خاندان کی تائید میں ویسا کام نہیں لیا، جیسا کہ اپنی ذاتی منفعت میں لیا۔ اس پر ذاتی تفوق کا جذبہ غالب رہا اور یہ جس طرح اس کی تصنیفات میں نمایاں ہے اسی طرح اس کے سوانح زندگی میں بھی نمایاں ہے اور یہ بہت ممکن ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے حالات صرف اس غرض سے لکھے ہوں کہ اس کا چرچا اور اس کی شہرت ہو۔ وہ پہلا عربی مصنف ہے جس نے اپنی ''تاریخ زندگی'' پر ایک مستقل کتاب لکھی جس کا نام اس نے ''رحلۃ ابن خلدون'' رکھا ہے اور اس میں ان تمام سفروں کے حالات لکھے ہیں، جو اس نے افریقہ، سپین، مصر اور مغرب کے شہروں میں کیے ہیں۔ اس نام سے اس سے پہلے بھی متعدد مصنفوں بالخصوص افریقہ اور اندلس کے مصنفین نے کتابیں لکھی ہیں، مثلاً رحلۃ ابن بطوطہ مراکشی اور رحلۃ ابن جبیر وغیرہ۔ لیکن ان کتابوں کے مصنفین کی شخصیت ان میں ثانوی درجہ رکھتی ہے وہ اپنے سوانح زندگی لکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ جن شہروں کو انھوں نے دیکھا ہے، ان کے حالات لکھیں اور ان کے اخلاقی انتظامی حالات

بیان کریں، اس لیے وہ بعض حیثیتوں سے جغرافیانہ کتابیں ہیں لیکن ''رحلۃ ابن خلدون'' کا حقیقی مقصد ان واقعات کی تفصیل کرنا ہے جو ابن خلدون کو زندگی میں پیش آتے رہے، ہمیں اس کتاب میں جغرافیانہ بیان کا بالکل پتہ نہیں چلتا اور اگر وہ ان لڑائیوں کی تاریخ بیان کرتا ہے جو تونس، جزائر اور مراکش کے بادشاہوں کے درمیان ہوئیں، تو اس کا مقصد ان کے متعلق اپنے کارناموں کا بیان کرنا ہوتا ہے۔

اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ ابن خلدون نے اپنے سوانح زندگی میں دوسرے مصنفین کی طرح اپنے عیوب کے چھپانے میں احتیاط سے کام نہیں لیا ہے کیونکہ اس نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ پبلک مفاد کی خدمت کے لیے اقتدار حاصل کرنا چاہتا تھا اور شریفانہ محرکات کی بنا پر کسی غلط کام کا جواز ثابت کرنے کا بھی اس نے ارادہ نہیں کیا، بلکہ اس کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ اس نے کبھی کوئی غلطی کی ہے، ان دونوں اسباب یعنی شہرت طلبی کے ذوق اور اس ذوق کی علانیہ تصریح سے ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ اس کے سوانح زندگی قریب قریب اس کے اخلاق اور سیرت کی تصویر ہیں۔ ہم نے قریب قریب کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ خود بینی اور خود نمائی نے بعض اوقات اس کو اندھا کر دیا ہے اور وہ اپنا صحیح اندازہ نہیں کر سکا ہے، اس لیے تمام چیزوں کے متعلق اس نے بے غل وغش فیصلہ نہیں کیا ہے۔

ابن خلدون نے ایک ایسے ماحول میں نشو ونما پائی، جس میں آٹھویں صدی تک بگڑے ہوئے محلاتِ شاہی سے لے کر شمالی افریقہ کے پراگندہ قبائل تک میں ایک ایسی سخت محدود انفرادیت قائم ہوگئی تھی جس نے ہر قسم کی دینی روح اور وطنی تخیل کو فنا کر دیا تھا اور ان میں وراثتاً اقتدار اور خود اعتمادی پیدا کر دی تھی۔ اس لیے ابن خلدون کے دل میں غیر محدود خواہشیں پیدا ہوئیں جن کے حاصل کرنے کے تمام ذرائع اس کی نگاہ میں جائز تھے۔ خواہ اخلاقاً وہ صحیح ہوں یا نہ ہوں، اس لیے اس نے متعدد بار کسی قسم کے روک ٹوک کے بغیر اپنے آقاؤں سے خیانت کی۔ فاس میں جہاں تک ہو سکا سازشوں کا جال بچھاتا رہا۔ ابو سالم کے ہاتھ اپنے آپ کو فروخت کر دیا اور اپنے دوست حاکم بجایہ کے ساتھ ناپسندیدہ سلوک کیا وغیرہ وغیرہ۔

پروفیسر ولنٹ کا یہ خیال سخت غلط ہے کہ ابن خلدون نہایت پرہیزگار آدمی تھا، کیونکہ اس کی نگاہ میں دین نام ہے اصولِ اسلام کے قبول کرنے اور فرائض کے بجا لانے کا، اس سے غرض نہیں کہ اس کے اعمال یا کم از کم اس کی سیاسی زندگی کو بھی اس سے متاثر ہونا چاہیے، اس لیے جب کبھی اس کو یہ نظر آیا کہ خیانت جس کو قرآن مجید نے حرام کر دیا ہے۔ اس کے لیے حصول اقتدار کا ذریعہ بن سکتی ہے تو اس نے بے دریغ اس کا ارتکاب کیا۔

ہم کہہ آئے ہیں کہ وہ نہایت خود بین واقع ہوا تھا اور اس خود بینی کے مظاہر اس کی کتابوں کے متعدد مقامات میں نہایت واضح طور پر نمایاں ہوتے ہیں، وہ اس لیے خود بینی کرتا ہے کہ اس کو یہ ناگوار تھا کہ اس کے معاصرین نے اس کے ساتھ کافی دلچسپی نہیں لی، اس کے علم وفضل کے متعلق جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ اس کی تفصیل کے بیان کرنے سے نہیں تھکتا۔ بہت سے بادشاہوں نے اس کا جو پُر تپاک خیر مقدم کیا ہے، اس کے

ساتھ جو مہربانیاں اور فیاضیاں کی ہیں اور اس کو جو تملق آمیز خطوط لکھے ہیں، ان کا ذکر اس نے نہایت تفصیل سے کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے بادشاہ کے خطوط کے جو جوابات دیے ہیں اور ان کی شان میں جو قصائد لکھے ہیں، ان کے ذکر سے بھی وہ نہیں چوکتا اور ان پر بہت زیادہ فخر کرتا ہے۔

چونکہ ابن خلدون اپنی ذات سے بہت محبت رکھتا تھا، اس لیے بظاہر وہ وطن اور خاندان کا قدر شناس نہ تھا، اس کی نگاہ میں وہی مقام وطن تھا، جہاں وہ عیش و عشرت کے ساتھ باعزت زندگی بسر کر سکے، وہ اپنے باپ دادا کے وطن اشبیلیہ میں جا کر بالکل متاثر نہ ہوا، اپنے جنم بھوم تونس میں وہ اپنے گوشۂ عزلت کو چھوڑ کر صرف اس لیے گیا تھا کہ وہاں کے کتب خانوں کو دیکھے، تونس کو چھوڑ کر وہ مصر میں آیا تو اس کو اس کا کچھ افسوس نہیں ہوا۔

اس نے شادی کی تھی لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی زندگی میں اس نے بیوی اور اولاد کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس کا بیان ہے کہ ان کی افسوسناک موت سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوا لیکن اس نے کسی گہرے رنج کا اظہار نہیں کیا بلکہ پہلے اپنے مال کے ضائع ہونے کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ''مجھ پر صرف ایک مصیبت آئی جس نے میرے مال و اولاد کو قیامت تک کے لیے ضائع کر دیا۔''

اگر ہم ابن خلدون کے مشہور ہم وطن وزیر ابوالقاسم مغربی کو جو ابن خلدون سے تین صدی پہلے گزرا ہے اور جس نے قاہرہ میں فاطمین کے سلطنت میں، بغداد میں عباسیوں کی حکومت میں اور شام و عراق کے دوسرے متعدد بادشاہوں کے دربار میں متصل سیاسی ریشہ دوانیاں کی ہیں، مستثنیٰ کر لیں تو اسلامی تاریخ میں ابن خلدون سے زیادہ اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والا، اپنی قدر و قیمت کا احساس رکھنے والا، اپنی بڑی بڑی خواہشوں پر مذہب اور اخلاق کا قربان کرنے والا کوئی مصنف نہیں مل سکتا۔ لیکن ہمارے لیے اس کی جو چیز خاص طور پر قابل توجہ ہے وہ اس کی ذہانت، بلند خیالی اس کے علم کی وسعت، پختگی، اس کی رائے کی جدت اور اس کی کتابوں کی نفاست ہے، اس دنیا میں بہت سے لوگ موجود ہیں جن کی روک ٹوک کرنے والی کوئی چیز نہیں، بہت سے لوگ سیاسی تدبر اور مہارت رکھنے والے بھی ہیں، لیکن نایاب اور شاداب قابلیت کے لوگ بہت کم ہیں اور ابن خلدون انہی میں سے ایک ہے، عربی علوم و فنون اسی کی بدولت یہ فخر کر سکتے ہیں کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے فلسفۂ اجتماعیات کو علمی قالب میں ڈھالا، یہ ایک خفیف الحرکتی ہوگی کہ ہم انسانی کمزوری کی آڑ پکڑ کر ایک ایسی شخصیت کی تنقیص کریں جس کی بڑائی میں کوئی شبہ نہیں۔

ابن خلدون نے مختلف موضوع پر کتابیں لکھی ہیں، اس نے منطق میں مزاولت پیدا کی اور ابن رشد کے فلسفہ کا اختصار کیا۔ فقہ، ریاضی اور ادب میں بھی اس نے کتابیں تصنیف کیں، لیکن ہمارے پاس بجز ان ناموں کے جن کا ذکر لسان الدین ابن الخطیب (۱۳۱۳ء-۱۳۷۴ء) نے اپنی کتاب ''الاحاطہ فی اخبار غرناطہ'' میں کیا ہے۔ ان کتابوں میں سے کوئی کتاب موجود نہیں ہے، جس کتاب سے زمانۂ مابعد میں ابن خلدون کی شہرت ہوئی وہ اس کی تاریخ عام ہے۔ جس میں اس نے آغاز آفرینش سے لے کر آٹھویں صدی

کے اخیر تک دنیا کی تاریخ بیان کی ہے، اس کتاب میں دو جدتیں ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے اپنے پیشروؤں کے طرز کے خلاف سن وار ترتیب کو کلیتاً چھوڑ دیا ہے اور اپنی تاریخ کو متعدد فصلوں میں تقسیم کر کے ہر فصل میں کسی سلطنت یا کسی خاندان کی پوری تاریخ بیان کر دی ہے، دوسرے یہ کہ بربری یعنی شمالی افریقہ کے باشندوں کے متعلق اس نے جو معلومات جمع کی ہیں بالخصوص اس زمانہ کے حالات جب عربوں سے ان کا تعلق قائم ہوا ہے وہ موجودہ زمانہ تک سب سے زیادہ صحیح اور مستند ہیں کیونکہ ابن خلدون نے انہی قبائل میں زندگی بسر کی ہے، اس لیے کسی اور عربی مورخ سے زیادہ وہ ان کے حالات سے واقف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تاریخ کے اس حصہ میں ہمیں وہ مبتذل خرافات نہیں ملتے جن کا ذکر مسعودی کی ''مروج الذہب'' اور ابن اثیر کی ''کامل'' وغیرہ کتابوں میں بکثرت کیا گیا ہے۔

"کتاب العبر ودیوان المبتداء والخبر ومن عاصر هم من ذوی السلطان الاکبر۔"

ابن خلدون کی کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ مطالعۂ تاریخ کی ایک تمہید اور تمدن کے متعلق ایک مقدمہ پر مشتمل ہے، دوسرا حصہ آغازِ آفرینش سے آٹھویں صدی تک عرب اور دوسری قوموں کی تاریخ پر مشتمل ہے، تیسرے حصہ میں بربر کی تاریخ ہے اور یہ حصہ معمولاً ابن خلدون کے سوانح زندگی پر ختم ہوتا ہے، جو ایک مستقل کتاب کی صورت میں ہے اور اس کا ایک نسخہ قاہرہ میں دار الکتب المصریہ میں موجود ہے، جس کا نام "رحلة ابن خلدون فی المغرب والمشرق" ہے۔

''وہ سلان'' کے ترجمہ میں اس کی تاریخ عام کے ساتوں حصوں کی مفصل تشریح ہے، اور ''جرابربرج دی ہمسہ'' نے ان اجزاء کی تشریح کی ہے جو اس کو ملے ہیں، اور مقدمہ یعنی ابن خلدون کی تصنیفات کا وہ فلسفیانہ حصہ ان چار سالوں میں لکھا گیا ہے جن کو مصنف نے ۷۷۵۔۸۷۷ھ میں تونس میں واپس آنے سے پہلے گوشۂ تنہائی میں بسر کیے ہیں۔ لیکن کتاب کے اور حصوں کی طرح مختلف اوقات میں اس کی تہذیب و اصلاح کی گئی ہے۔ یہ خود ابن خلدون کا بیان ہے، لیکن اس کی بہت سی فصلوں کے متعلق یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر مصر ہی میں لکھی گئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مقدمہ کے نسخوں میں بعض اوقات اختلاف پایا جاتا ہے، کیونکہ اس کے بعض نسخوں میں چند ایسی فصلیں ہیں جو اور نسخوں میں نہیں ہیں، اگر ہم اس مقدمہ کی تہذیب و اصلاح کی تاریخ بیان کر سکیں تو یہ ایک نہایت مفید بات ہو گی، کیونکہ اس سے ابن خلدون کے فلسفیانہ خیالات کے تغیرات کا حال معلوم ہو سکے گا، لیکن یہ ناممکن ہے، کیونکہ ہمارے پاس تمام اصلی نسخے موجود نہیں ہیں، با ایں ہمہ مختلف نسخوں کے موازنہ سے اس تغیر کے چند لمحوں کا ضرور پتہ لگا سکتے ہیں، ہمیں یہ معلوم ہے کہ ابن خلدون نے پہلی عبارت میں مقدمہ کا ایک نسخہ دربار فاس میں اور تہذیب و اصلاح کے بعد ایک نسخہ دربار تونس میں بھیجا تھا، پھر جب ابن خلدون مصر میں آیا تو سلطان برقوق کی خدمت میں ایک نسخہ ہدیتاً پیش کیا، جو یقیناً تہذیب و اصلاح کی آخری حد تک پہنچا ہوا تھا، اور اگر ''جرابرج دی ہمسہ'' کا قول صحیح ہے تو ابن خلدون کی اصلی عبارت کا نسخہ فاس کی ایک

مسجد میں پایا جاتا ہے لیکن ہمیں اس طویل بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا مقصود صرف ابن خلدون کی فلسفیانہ آراء ہیں، پروفیسر کازنوافا نے اس بحث کا مطالعہ کیا ہے، اور اس کے ساتھ ایک مستقل کتاب میں جو اب تک چھپی نہیں ہے۔ ابن خلدون کی عبارت سے متعلق ایک لغوی بحث بھی کی ہے۔

طرزِ تحریر کے اعتبار سے ابن خلدون کا کوئی خاص انشا پردازانہ اسلوب نہیں ہے، جیسا کہ اخیر صدی میں مصر اور شام میں اس کی اس قدر شہرت ہوئی کہ ''پروفیسر ہویار'' نے اس کی تاریخ کو بہترین اسلوب کا نمونہ قرار دے دیا۔ بلکہ اس کا اسلوب اس کے اور معاصرین کی طرح نہایت غیر شگفتہ ہے، مقفیٰ عبارتوں کی کثرت، استعارات، فقروں کا کثیر التکلف توازن، الفاظ کے استعمال میں غلطیاں، صحیح اور عامی الفاظ کی باہم آمیزش بلکہ کبھی کبھی نحوی غلطیاں تک اس کے اسلوب تحریر میں شامل ہیں۔ ابن خلدون میں قوتِ فکریہ کے مطابق قوتِ بیانیہ نہ تھی۔ اس نے ایک مکمل فلسفیانہ مذہب کے بیان کرنے میں تو کامیابی حاصل کر لی۔ لیکن وہ اپنے فلسفہ کے لیے ایسی زبان نہ ایجاد کر سکا جو اس کے ساتھ مخصوص ہو، بلکہ ہمیں اس کی کتاب میں فقہاء، نحاۃ اور علماء منطق کی زبان ملتی ہے، اس سے ایک ایسا اسلوب ضرور پیدا ہو گیا جس میں عجیب قسم کا تنوع پایا جاتا ہے، لیکن اس میں توازن و تناسب نہیں ہے، اکثر وہ ایک خیال کو تکلیف دہ طوالت کے ساتھ یا ایسے اختصار کے ساتھ جو پیچیدگی کی طرف مائل ہے، ظاہر کرتا ہے۔

اگر مصر و شام میں اس کا اسلوب تحریر ایک نمونہ خیال کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اس کی کتاب چھپی ہے اس وقت عربی علوم نہایت انحطاط کی حالت میں تھے، اس کے مقدمہ کو ایک زمانہ تک ایک نمایاں ادبی کامیابی ضرور حاصل ہو گئی، کیونکہ اس میں نہایت جدید خیالات پائے جاتے تھے، جن کی تعبیر ایسی زبان میں کی گئی تھی جو اس زمانہ کی زبان کے بالکل مخالف تھی، لیکن اس حیثیت سے تقریباً ۲۰ سال سے مقدمہ کا وقار زائل ہونے لگا ہے، کیونکہ قدیم علوم کی اشاعت و ترقی اور فرنچ اور انگریزی علوم کے اثر نے ادبی ذوق کا رخ دوسری طرف پھیر دیا ہے، اس وقت اسلوب تحریر کی ایک ایسی اعلیٰ مثال کی تلاش کی جاتی ہے، جو قدیم علوم کے مکمل اور کسی قدر سادگی آمیز حسن اور جدید علوم کی شگفتگی اور خیال کی جامع ہو۔

اب ابن خلدون اس زمانہ کے انشا پردازوں کا استاد نہیں رہ گیا ہے کیونکہ اس کی اور اس کے معاصرین کی جگہ جاحظ (المتوفی ۸۷۹ء) اور چوتھی صدی ہجری کے انشاء پردازوں نے لی ہے، با ایں ہمہ ایک دوسری حیثیت سے اس کی شہرت ہمیشہ قائم رہی کیونکہ اجتماع انسانی کے متعلق اس نے اپنے بہت سے نادر اور بیشتر صحیح خیالات کی بنا پر ایک ایسا شرف حاصل کیا جس کی بنیاد نہایت مضبوط ہے اور جدید دور کا مطالعہ کرنے والا اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے معاصرین سے جنہوں نے اس عظیم الشان روش کی اہمیت کا اندازہ نہیں کیا۔ جو اس نے فلسفہ کی ترقی کے متعلق قائم کی تھی، بہت زیادہ کرتا ہے۔ اس حیثیت سے مقدمہ ایک عمیق مطالعہ کا مستحق ہے اور اس کو یہ استحقاق حاصل ہے کہ دورِ جدید کے فلاسفہ اور علمائے اجتماع میں اس کو روشناسی حاصل ہو۔

ابن رشد:

اندلس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان تاریخ عالم کا ایک نہایت عبرت ناک اور انوکھا باب ہے۔ جہاں ان کے سیاسی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی اور دیگر اسباب وعلل پر کماحقہ بحث اور تحقیق نہیں کہ ان کے زوال کا یہ اتنا بڑا المیہ کیسے وجود میں آگیا، وہاں اس زمانے میں مسلمانوں کے تہذیبی، اخلاقی، ادبی اور دینی کارناموں کو بھی صحیح طور پر اجاگر نہیں کیا گیا۔ مسلم اندلس نے بعض مایہ ناز اور نامور ہستیاں پیدا کیں جن کے نام ان کے علمی، ادبی اور دینی سرمایہ کے باعث انسانی تہذیب کی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف میں لکھے جائیں گے۔ جن میں امام شاطبی، امام قرطبی، ابن خلدون، محی الدین ابن عربی، ابن حزم، ابن بیطار اور ابن رشد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مسلمان فلسفیوں نے مشرقی مسلمان فلاسفہ ابن سینا اور فارابی کی طرح فلسفۂ یونان خاص طور پر ارسطو اور افلاطون کے فلسفہ پر خاص توجہ مبذول کی اور اس میں کلیتاً منہمک ہو گئے۔ اس کو پہلے تو اپنی زبان میں منتقل کیا اور پھر عربی میں اس کی شرح لکھی۔ اس پر تعلیقات کا اضافہ کیا اور اس کے پیچیدہ اور مبہم مسائل کی توضیح کی۔ (تاریخ فلاسفۃ الاسلام، محمد لطفی جمعۃ، اردو ترجمہ ڈاکٹر میر ولی الدین: ص ۱۵۷) انھوں نے مذہب اور فلسفہ میں تطبیق کی آخری بار کوشش کی۔ اس میں ابن باجہ اور ابن رشد کے نام سرفہرست ہیں۔

ابوالولید محمد بن احمد بن محمد بن رشد جو یورپ میں (Averroes) کے نام سے مشہور ہے، سرزمین اندلس کا سب سے بڑا عرب فلسفی تھا۔ وہ سنہ ۵۲۰ھ/ ۱۱۲۶ء میں قرطبہ میں پیدا ہوا۔ اس کا دادا قرطبہ کا قاضی رہا تھا اور اس نے بعض اہم تصانیف چھوڑی تھیں۔ اس کا باپ بھی قاضی (جسٹس) کے عہدے پر فائز رہا۔ قانون اور طب کی تعلیم ابن رشد نے قرطبہ میں حاصل کی۔ اس کے اساتذہ میں ایک ابوجعفر ہارون ترجالوی بھی تھا۔ ۵۴۸ھ/ ۱۱۵۳ء میں وہ مراکش میں مقیم تھا جہاں وہ غالباً ابن طفیل کی ترغیب سے گیا تھا۔ ابن طفیل نے اسے ابو یعقوب یوسف الموحد سے متعارف بھی کروایا جس نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ خلیفہ نے اس سے عالم (Universe) کے بارے میں فلاسفہ کا نظریہ دریافت کیا یعنی یہ کہ آیا وہ ایک جوہر ازلی ہے یا اس کی کوئی ابتدا تھی۔ ابن رشد کہتا ہے کہ مجھ پر اس قدر ہیبت طاری ہوئی کہ میں اس کا کوئی جواب نہ دے سکا، لیکن خلیفہ نے اس کے حجاب و تکلیف کو دور کیا اور خود مختلف علماء کے نظریے بیان کر کے اتنی گہری واقفیت اور قابلیت سے بحث شروع کر دی جتنی کہ بادشاہوں کے ہاں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس کے بعد خلیفہ نے اسے بیش قیمت تحائف دے کر رخصت کیا۔

یہ ابن طفیل ہی تھا جس نے ابن رشد کو ارسطو کی شرح لکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس نے کہا کہ امیر المومنین کئی بار اس امر پر اظہار افسوس کر چکے ہیں کہ یونانی فلاسفہ کی زبان بلکہ ان ترجموں کی زبان بھی جو عموماً دستیاب

ہوتے ہیں، بڑی مغلق اور دقیق ہے لہٰذا ابن رشد کو چاہیے کہ اس کی تشریح وتوضیح کا کام اپنے ذمے لے۔

۵۶۵ھ/ ۱۱۶۹ء میں ابن رشد اشبیلیہ کا قاضی مقرر ہوا اور اس کے دو سال بعد قرطبہ کا۔ اس عہدے کی گراں بار مصروفیتوں کے باوجود یہی زمانہ ہے جب ابن رشد نے اپنی اہم ترین تصانیف مرتب کیں۔ ۵۷۸ھ/ ۱۱۹۲ء ابن یوسف نے اسے اپنے طبیب کی حیثیت سے مراکش بلایا تاکہ وہ معمر اور سن رسیدہ ابن طفیل کی جگہ لے سکے، لیکن تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ اسے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا عہدہ دے کر قرطبہ واپس بھیج دیا۔

یوسف کے جانشین یعقوب المنصور کے آغاز حکومت میں بھی ابن رشد کو بدستور خلیفہ کا قرب اور التفات حاصل رہا، لیکن علمائے دین کی مخالفت کی بنا پر وہ معتوب ہو گیا اور اس پر ملحدانہ عقائد کا الزام لگا کر اسے قرطبہ کے نزدیک لوسینہ میں جلا وطن کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں خلیفہ نے حکم دیا کہ فلاسفہ کی سب کتابیں جلا دی جائیں، ماسوا ان کے جو طب، حساب اور ابتدائی علم ہیئت پر ہوں۔ ڈنکن میکڈانلڈ کا خیال ہے کہ اس موحد فرماں روا کے یہ احکام جس نے اب تک فلسفہ کے مطالعات کی ہمت افزائی کی تھی، غالباً اندلس کے مسلمانوں کے پاس خاطر کی بنا پر صادر ہوئے تھے جو بربروں کی بہ نسبت بہت زیادہ راسخ العقیدہ تھے۔ چنانچہ یہ امرِ واقعہ ہے کہ اس وقت خلیفہ نے اندلس میں عیسائیوں کے خلاف جہاد شروع کر رکھا تھا۔ مراکش لوٹ آنے پر اس نے فلسفہ کی تعلیم وتدریس پر عائد کردہ پابندی ہٹا دی اور ابن رشد کو اپنے دربار میں واپس بلا لیا، لیکن ابن رشد اپنے جاہ وثروت کی بحالی سے زیادہ دیر تک لطف اندوز نہ ہو سکا کیونکہ واپس آ کر تھوڑی ہی مدت بعد ۹ صفر المظفر ۵۹۵ھ/ ۱۰ دسمبر ۱۱۹۸ء کو اس کا انتقال ہو گیا اور شہر کے قریب ہی باب تغزوت کے باہر مدفون ہوا۔

ابن رشد کی اصل عربی تصنیفات کا بڑا حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ ابن رشد نے ارسطو کی جو مشہور ومعروف شرحیں لکھی ہیں، ان کی تین قسمیں ہیں۔ یا یوں کہیے کہ ایک ہی شرح تین مختلف نسخوں میں پیش کی گئی ہے یعنی مطول، اوسط اور مختصر نسخہ۔ یہ سہ گانہ ترتیب اسلامی یونیورسٹیوں کے تین مدارج تعلیم کے مطابق رکھی گئی ہے، اس طرح کہ مختصر شرح پہلے سال کے لیے ہے، اوسط دوسرے سال کے لیے اور مطول تیسرے سال کے لیے۔ عقائد کی توضیح میں بھی یہی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے۔

ابن رشد صرف فلسفے ہی میں ماہر نہ تھے بلکہ دوسرے علوم وفنون میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ابن رشد نے باپ دادا کی طرح ابتداء میں اشعری اور مالکی فقہاء کی کتابیں پڑھیں۔ (تاریخ فلاسفۃ الاسلام: ص ۱۶۲) ابن الآبار اس کے سوانح نگار ہونے کی حیثیت سے طب اور فلسفے کے مقابلے میں، فقہی علوم میں اس کے تبحر اور کارہائے نمایاں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ (ابن رشد وفلسفہ ابن رشد: ص ۱۳)

ابن رشد نے علوم حدیث اپنے والد ابو القاسم بن بشکوال (جو یہودی سے مسلمان ہوا تھا) ابو مروان بن مسیرہ، ابوبکر بن سمحون اور ابو جعفر بن عبدالعزیز وغیرہ سے حاصل کیے۔ علم طب ابو مروان بن جریول اور ابن جعفر بن درون الترجالی سے جو اشبیلیہ کا باشندہ اور وہاں کے اعیان میں تھا، حاصل کیا۔ الترجالی، ارسطو اور دیگر

حکمائے متقدمین کی تصنیفات کا بڑا ماہر تھا اور علوم نظری کے علاوہ علاج معالجے میں بھی بہت کمال حاصل تھا، اور یوسف بن عبدالعزیز کا شاہی طبیب تھا۔ ابن باجہ کا انتقال صرف ۲۳ سال کی عمر میں سنہ ۵۳۲ھ میں ہو گیا تھا، مشہور فلسفی تھا اور ارسطو کے شارح کی حیثیت سے ابن سینا اور الفارابی کے بعد مغرب میں علوم عقلیہ کا سب سے بڑا ماہر مانا جاتا ہے۔ ابن رشد نے نہ صرف ابن باجہ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے بلکہ اکثر جگہ اس کی فلسفیانہ آراء سے اتفاق بھی کیا ہے جب کہ ابن رشد ابن سینا اور فارابی کے اقوال پر تنقید کرتا ہے۔ ابن طفیل کی صحبت کا بھی ابن رشد پر گہرا اثر تھا اور ابن زہر کے عظیم یہودی الاصل مسلمان خاندان سے بھی اس کے گہرے مراسم تھے۔

ابن رشد نے جب آنکھ کھولی تو مرابطین کے آخری ایام تھے۔ اسی زمانے میں ابن تومرت نے آخری سلاطین مرابطین کی آزاد روی کے پیش نظر ان پر ''فاسق و فاجر'' ہونے کے الزام لگایا اور پھر ان کے خلاف بغاوت کر دی۔ اگر چہ اس کو ابتداء میں کامیابی نہ ہوئی لیکن اس کے مرید عبدالمومن نے ملک کے بعض حصوں کو اپنے قبضے میں لا کر آخر کار ۵۴۲ھ میں مراکش پر بھی قبضہ کر لیا اور پوری مرابط حکومت کا مالک بن گیا۔ اس نے ''الموحدین'' خاندان کی حکومت کی بنیاد ڈالی جو ۵۶۷ھ تک قائم رہی۔

عبدالمومن کی حکومت ۵۵۶ھ تک رہی۔ پھر اس کا انتقال ہو گیا۔ موحدین کا دور حکومت مذہبی تشدد کا دور تھا۔ اس زمانے میں بہت سے یہودی ملک چھوڑ کر افریقہ اور دوسرے علاقوں میں چلے گئے، اسی طرح عیسائی بھی ملک چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور دشمن کی فوج سے جا ملے، لیکن فلسفے کی ترقی کے لحاظ سے یہ زمانہ اندلس کی تاریخ کا ''عہد زریں'' تھا کیونکہ اس زمانے میں ابن طفیل، ابن زہر اور ابن رشد جیسے اعاظم فلاسفہ پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں ایک طرف فلاسفہ ارسطو کے خیالات کے شارح ہونے کے ناطے ارسطو کی شدت سے حمایت کر رہے تھے، اور دوسری طرف حکمران طبقہ اپنی رعایا پر سخت ترین راسخ عقیدگی کے نہایت رجعت آمیز فقہی نظام کو عائد کر رہا تھا جن کو ایشیا میں بھی مذہبی طبقے نے لوگوں پر عائد نہیں کیا تھا۔ ابن رشد کی عمر جب اٹھارہ سال کی تھی تو اس نے مراکش جا کر عبدالمومن کے دربار کا قصد کیا۔ عبدالمومن اور اس کے جانشین یوسف کے ذریعے علم و حکمت کے سبب ان کا دربار اطراف و اکناف کے جید علماء کا مرکز بن گیا تھا۔ ان درباری علماء میں ایک ابن رشد کا مربی اور دوست ابن طفیل بھی تھا جس کے ذریعے ابن رشد کو شاہی دربار میں رسائی ملی۔ یوسف بڑا فاضل اور علم دوست حاکم تھا۔ اسے علوم عقلیہ اور فلسفے سے بڑی دلچسپی تھی۔ ابن طفیل اس کا ندیم خاص اور علمی صیغے کا افسر مقرر تھا۔ اسی یوسف کی خواہش پر ابن رشد نے ارسطو کی تصنیفات کی شرحیں لکھنا شروع کیں۔ ابن طفیل نے یہ وصیت کی کہ اس کی وفات کے بعد ابن رشد کو اس کی جگہ شاہی طبیب مقرر کیا جائے۔ چنانچہ اس کی اس وصیت کی تعمیل میں یوسف نے ابن طفیل کی موت کے بعد ابن رشد کو اپنا طبیب مقرر کر لیا۔ اور ۶۳۱ھ میں اس کے باپ کی موت کے بعد قرطبہ میں قضا کا عہدہ خالی ہونے پر ابن رشد کو اس کی جگہ قرطبہ کا قاضی بنا دیا گیا۔ اس سے قبل ابن رشد ۵۶۵ھ میں اشبیلیہ کا قاضی رہا جہاں اس نے کتاب الحیوان اور فلسفۂ ارسطو کے

حصہ چہارم کی شرح اسی سال لکھی۔ بعد میں ۵۶۷ھ میں وہ دوبارہ اپنے وطن قرطبہ واپس آیا جہاں اس نے فلسفۂ ارسطو کی عظیم الشان شرح کی بنیاد ڈالی۔ اپنی ملازمت کے سلسلے میں اسے کبھی جبل الطارق، کبھی مراکش، کبھی اشبیلیہ، کبھی قرطبہ اور دیگر مختلف مقامات پر جانا پڑتا لیکن ان مصروف ایام میں بھی وہ اپنی اس شرح کی تکمیل میں مصروف رہا۔ چنانچہ ۱۱۷۸ء میں مراکش کی سرزمین میں اس نے ''جوہر الکون'' کا ایک حصہ لکھا اور ۱۱۷۹ء میں اشبیلیہ میں مذہب پر اپنے رسائل کو ختم کیا۔ ۱۱۸۹ء میں امیر یوسف نے اس کو پھر مراکش بلا کر ابن طفیل کی جگہ اپنا شاہی طبیب مقرر کیا اور اس کے بعد قرطبہ شہر میں اسے عہدۂ قضا عطا کیا جس پر اس کے دادا اور باپ کام کر چکے تھے۔ یوسف کے بعد یعقوب المنصور باللہ نے اس کو اپنا مقرب خاص بنایا۔ ان دونوں کے مابین اس قدر بے تکلفی ہوگئی کہ دوران گفتگو ابن رشد منصور کو کہہ دیتا! ''اسمع یا اخی'' (اے میرے بھائی! سن) اس مراعات خسروانہ کے باعث حاسدوں کی آتش حسد تیز ہوئی اور ان کی بادشاہ کے حضور ابن رشد کی بدگوئی کے نتیجے میں المنصور نے ابن رشد کو قرطبہ کے نزدیک ''لوسینہ'' میں جلا وطن کر دیا۔ بعد میں اشبیلیہ کی ایک معتبر جماعت نے منصور کو یہ یقین دلایا کہ ابن رشد پر عائد کردہ الزامات بالکل لغو اور بے بنیاد ہیں۔ چنانچہ اس نے مراکش سے واپسی پر فلسفہ اور اہل فلسفہ کے لیے جو احکام جاری کیے تھے یک قلم منسوخ کر دیے اور ابن رشد اور دوسرے علماء کو جو اس کے ساتھ جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے واپس بلا لیا۔ من جملہ ان کے ابوجعفر ذہبی کو طلبہ اور علماء کا نقیب مقرر کیا۔ ابن رشد اس معافی کے ایک سال بعد تک بمشکل زندہ رہا اور جمعرات ۹ رصفر المظفر کو یعقوب کے انتقال کے قریباً ایک ماہ قبل مراکش میں وفات پائی۔ اسے اول مراکش کے قبرستان میں بیرون دروازہ تاغزوت میں دفن کیا گیا۔ پھر اس کی لاش کو قرطبہ لے جا کر بنوعباس کے قبرستان میں اس کے خاندانی گنبد میں دفن کیا گیا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ابن رشد کی موت سے اندلس میں حکمت کا خاتمہ ہوگیا۔ ابن بیطار، عبدالملک بن زہر اور ابن رشد ان تینوں کی وفات ایک سال میں ہوئی۔ ابن باجہ، ابن طفیل اور ابومروان بن زہر پہلے ہی راہی ملک عدم ہو چکے تھے۔ چنانچہ ان حضرات کی وفات سے سرزمین اندلس بلکہ پوری اسلامی دنیا فلسفے اور حکمت کے فضلاء اور دانش وروں سے یک قلم خالی ہوگئی۔ اگرچہ علوم فلسفہ اور حکمت کے گلستان کے یہ پھول موت کے بے رحم ہاتھوں سے ابدی نیند سلا دیے گئے تھے لیکن ان کے عطر آگین افکار اور باقی ماندہ آثار عالم انسانیت کے مشام جان کو رہتی دنیا تک معطر کرتے رہیں گے۔ ان کی حکمت کا وہ مقدس سرمایہ جو انھوں نے تمام انسانوں کے لیے چھوڑا، اسی پر جدید فلسفہ وحکمت کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔

ابن رشد کئی سال تک قرطبہ اور اشبیلیہ کا قاضی رہا۔ قاضی کی حیثیت سے اس کا کارنامہ نہایت قابل تعریف رہا۔ بادشاہوں کی نظر میں اس کی ایک خاص عزت اور وجاہت تھی۔ شاہی عنایات خاصہ کو اس نے اپنی شان کے اضافے اور دولت کے جمع کرنے میں صرف نہیں کیا بلکہ اہل اندلس کے فائدے اور ان کے رفاہ عام

کے لیے مخصوص کر دیا۔ اس نے اپنی قضاءت کے دوران درایت کو روایت پر ترجیح دی۔ اندلس کی سرزمین میں وہ اس لحاظ سے علم و فضل و کمال کے میدان میں اپنی مثال آپ ہے۔ (تاریخ فلاسفہ الاسلام: ص ۱۶۷)

اتنا بڑا عالم ہونے کے باوجود اس میں کبر و عجب کی کوئی رمق نہ تھی بلکہ وہ نہایت متواضع اور خوش اخلاق انسان تھا۔ جو اسے دیکھتا یا اس سے کلام کرتا تو اسی کا ہو جاتا۔ وہ بچپن سے عمر کے آخری برسوں تک ہمیشہ مطالعہ اور علمی مشاغل میں مصروف رہا۔ اس نے اپنی عمر میں دو راتوں کے علاوہ کبھی مطالعہ ترک نہیں کیا۔ ایک اس کی والدہ کی وفات کی رات اور دوسری اس کی شادی کی رات۔ وہ قدماء کے علوم کا شیدائی تھا اور اس بارے میں وہ اپنے معاصرین پر گوئے سبقت لے گیا۔ وہ ایک ماہر طبیب بھی تھا۔ لوگ اس کے پاس نسخوں کے لیے اس طرح بھاگتے چلے آتے تھے جیسے کہ فقہی فتوؤں کے لیے۔ فنون شعر و ادب میں بھی اس کو خاص شغف تھا۔ چنانچہ حبیب اور متنبّی کے اشعار اس کو کثرت سے یاد تھے بلکہ ان دونوں شعراء کے دیوان حفظ تھے۔ ابو مروان الباجی نے لکھا ہے کہ قاضی ابوالولید ابن رشد نہایت صائب الرائے، ذکی الطبع، لاغر اندام اور قوی النفس تھا۔ وہ قدماء کے علوم میں ضرب المثل بن گیا تھا۔

۳۶ سال کی عمر تک ابن رشد نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ گویا جب تک اس کی فکر اور علم پختہ نہیں ہو گئے اس نے قلم نہیں اٹھایا۔ اس نے اپنی عمر کے باقی ۳۶ سال درس و تدریس، مباحثہ اور تصنیف و تالیف میں گزارے۔ رینان نے اپنی کتاب کی ایک عربی فہرست میں ابن رشد کے رسائل اور کتابوں کی تعداد کا ذکر کیا ہے چنانچہ اس نے اس کی تالیفات کی تعداد ۷۸ بتائی ہے۔ اگر چہ علمائے اسلام میں فن طب میں جالینوس، فلسفے میں ارسطو اور علم ہیئت میں المجسطی سے سب ہی واقف تھے اور ابن رشد بھی ان سب علوم کا ماہر تھا لیکن ابن رشد کی امتیازی خصوصیت اس کی قوت تنقید ہے جو دوسرے مسلمان علماء میں بہت کم نظر آتی ہے۔ وہ فقہ میں بھی کامل مہارت رکھتا تھا اور فقہ پر اس کی کتاب بدایۃ المجتہد اپنی مثال آپ ہے جس میں چاروں فقہی مسالک کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ اور موطا امام مالک تو پوری اسے حفظ تھی۔

ابن رشد کو مسلمانوں میں بہت کم شہرت حاصل ہوئی۔ اس کی وفات کے بعد فلسفہ و حکمت کی تعلیم کے انحطاط کے ساتھ ان علوم کی کتابیں بھی قریباً ناپید ہو گئیں۔ ابن رشد کی عربی کتابیں صرف اندلس تک ہی محدود رہیں اور دوسرے ممالک میں بہت کم گئیں۔ سقوط غرناطہ کے بعد شاہ فردی نند (Ferdinand) کی مدد سے کارڈینل زمی نیز (Cardinal Xamenes) نے عربی مخطوطات کو نذر آتش کر دیا تھا۔ صرف غرناطہ میں شارع عام پر جو کتابیں جلائی گئیں ان کی تعداد اسی ہزار بتائی جاتی ہے۔ اس آگ میں ابن رشد کی عربی کتب جل کر راکھ ہو گئیں۔ جہاں تک ان کی تصنیفات کا تعلق ہے رینان (Eenan) نے جو فہرست ابن رشد کی کتابوں کی دی ہے اس میں ۲۸ کتابیں فلسفے پر، ۵ علم کلام اور مذہب پر، آٹھ فقہ اور اصول فقہ پر، چار علم ہیئت، دو صرف و نحو پر اور بیس طب پر ہیں۔ (تاریخ فلاسفہ الاسلام: ص ۲۲۱، ابن رشد: ص ۸۶)

یورپ نے ابن رشد سے کافی فائدہ اٹھایا، اس لیے کہ دسویں صدی عیسوی سے اندلس میں عربی زبان مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ سب کی مشترکہ زبان تھی، وہی اس علمی سرمائے کے وارث ہوئے اور اس طرح یہ سرمایہ بہ آسانی یورپی زبانوں میں منتقل ہوا۔ اندلس کی تباہی کے بعد ابن رشد کے یہودی تلامذہ ان کی تصنیفات کا بیشتر حصہ اپنے خاندانوں کے ساتھ ہجرت کے وقت اپنے ساتھ یورپ کے دوسرے ملکوں میں لیتے گئے۔ چنانچہ اندلس کی ابتری کا نقشہ کھینچتے ہوئے ابن خلدون نے اسی وقت نشان دہی کی تھی: ''سنا ہے کہ فرنگستان میں علوم عقلیہ کا چرچا زوروں پر ہے۔ وہاں متعدد علمی سوسائٹیاں قائم ہیں اور لوگ علوم عقلیہ کی تحصیل میں بہت جدو جہد کرتے ہیں۔'' (مقدمہ ابن خلدون: ص ۲۳۲)

یورپ نے ابن رشد کے نقش قدم پر نشأۃ ثانیہ کی ایسی عظیم الشان عمارت تعمیر کی جو عقل و مشاہدہ کے مضبوط اور استوار ستون پر قائم ہے۔ یورپ میں ابن رشد کی کتابوں کو بار بار شائع کیا گیا اور ان پر مسلسل تحقیق جاری رہی۔ ابن رشد کے کامل یا ناقص لاطینی ترجمے جو ۱۴۸۰ء اور ۱۵۴۰ء کے مابین ساٹھ سال میں شائع ہوئے ہیں، بے شمار ہیں۔ ہر سال ان تراجم کا کوئی نہ کوئی ایڈیشن شائع ہوتا ہے۔ چنانچہ چودھویں صدی سے لے کر سترھویں صدی تک یورپ میں عربی فلسفے کا بول بالا رہا اور پندرھویں صدی میں یورپ کی یونیورسٹیوں میں ابن رشد ہی کا دور دورہ تھا جبکہ کوئی دوسرا مفکر قابل توجہ نہیں رہا تھا۔ اہل یورپ نے مسلمانوں کے علوم اور ابن رشد کے فلسفے سے اکتساب فیض کر کے اس کی روشنی میں جو ترقی کی، اسے اس طرح اپنا بنا لیا کہ بعد میں اپنی تاریخ فلسفہ سے عربی فلسفہ کی تاریخ اور اس کے اثرات کے ذکر کو یک قلم محو کر دیا۔ یہی حال انھوں نے طب اور دوسرے علوم کے معاملے میں کیا۔

مسلمانوں میں ابن رشد کی جانب سے غفلت کی بڑی وجہ تو ان کی تصنیفات تک نارسائی تھی لیکن دوسری اہم وجہ تقلیدی جمود اور علمی وفکری زوال تھا جیسا کہ ابن خلدون نے بیان کیا ہے۔ ابن رشد سے قبل چار پانچ سو سال تک اسلامی ممالک میں علمی ترقی نہایت سرعت کے ساتھ ہوتی رہی تھی۔ تمام دنیا کے افکار عربی میں منتقل ہو چکے تھے۔ مختلف اکیڈیمیاں اور لائبریریاں سرگرم عمل تھیں۔ چنانچہ ابن رشد سے قبل وہ تمام باکمال حضرات اہل علم اپنا کام کر چکے تھے، تاریخ افکار و علوم میں جن کا ذکر آتا ہے، مثلاً کندی، بوعلی سینا، فارابی، ابن باجہ، ابن طفیل۔ اور بعض ان کے معاصر تھے جیسے ابن طفیل اور محی الدین ابن عربی وغیرہ۔ فلسفہ اور طب کے ائمہ فن کے علاوہ شریعت، طریقت اور سائنس کے علوم وفنون کی ترقی کا عہد زریں ابن رشد تک جاری تھا۔ تمام مشہور شاعر، ادیب، صرفی اور نحوی، نقاد، ائمہ فقہ اور اصول فقہ، محدثین اور متکلمین، مفتی اور مقنن اپنے علم سے دنیا کو فیض یاب کر چکے تھے۔ ابن رشد نے ان تمام علوم وفنون میں تصانیف چھوڑیں اور ہر ایک میں اپنی اجتہادی فکر، بالغ نظری اور تبحر علمی کے باعث کمال کا اظہار کیا۔ اسی وجہ سے ابن رشد کو جدید علم کلام کا بانی اور ایک ماہر فقیہ سمجھا جاتا ہے۔ ابن رشد نے جس طرح فلسفہ اور حکمت میں بوعلی سینا کو پیچھے چھوڑ دیا اسی طرح شریعت میں مالکی فقہ کی تہذیب و تدوین میں سب سے اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ علم کلام اور فلسفے میں ابن رشد کے

بعد کوئی اس پایہ کا شخص پیدا نہیں ہوا، لیکن ابن رشد یورپ یعنی مغرب کے حصے میں آئے اور غزالی مشرق کے حصے میں، عربوں کے علوم سے مغرب نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ تجربے اور مشاہدے کو اپنا راہ نما بنایا، لہٰذا وہ ہمارے ہیرو بن گئے، لیکن ہم نے صرف کوٹ پتلون اور نکٹائی لگانے کو ترقی سمجھا اور تا حال کوئی قابل ذکر ترقی نہ کر سکے۔ اس سے زیادہ کے نہ ہمارے راہ نما سرسید اور مصطفےٰ کمال خواہاں تھے اور نہ ہم اس سے زیادہ کے خواہش مند ہیں، حالانکہ مغرب کی ساری ترقی ہمارے ہی علوم وفنون کے باعث ہے۔ چنانچہ اقبال بھی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب کے بعض پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔'' گذشتہ متعدد صدیوں میں جب عالم اسلام پر ذہنی غفلت اور بے ہوشی کی نیند طاری تھی، یورپ نے ان مسائل میں نہایت گہرے غور وفکر سے کام لیا جن سے کبھی مسلمان فلسفیوں اور سائنس دانوں کو دلی شغف رہا ہے۔ قرون وسطیٰ سے لے کر اب تک جب مذاہب الٰہیات کی تکمیل ہوئی، انسانی فکر اور تجربے کی دنیا میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو چکی ہے۔ فطرت کی تسخیر اور اس پر غلبے نے انسان کے اندر ایک تازہ یقین اور ان قوتوں پر جن سے اس کے ماحول نے ترکیب پائی، فضیلت کا ایک نیا احساس پیدا کر دیا ہے۔ نئے نئے نقطہ ہائے نظر ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ قدیم مسائل کو جدید تجربات کی روشنی میں حل کیا جا رہا ہے۔ نیز کئی ایک اور نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عقل انسانی زمان ومکان اور عقلیت ایسے بنیادی معقولات کی دنیا سے بھی آگے نکل جائے گی، پھر جوں جوں سائنسی افکار ترقی کر رہے ہیں، انسانی علم وادراک کے متعلق بھی ہمارے تصورات تبدیلی ہو رہے ہیں۔'' (اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ: ص ۱۱)

ابن رشد کے حالات زندگی ختم کرنے سے قبل ان کے وہ خیالات بھی سن لیں جن پر انھوں نے اپنی کتاب ''فصل المقال'' کو ختم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''قرآن سب کے لیے ہے لہٰذا جن کی عقل ظاہر تک محدود ہے انھیں وہیں تک رہنا چاہیے، لیکن جو اہل حکمت ہیں وہ باطن سے واقفیت حاصل کریں، لیکن تقویٰ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ اختلاف کو مٹائیں، محبت کو بڑھائیں اور فرقوں کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا اور اپنے فضل سے ہدایت فرمانے والا ہے۔'' (ابن رشد، کتاب فصل المقال)

اندلس کی یہ صرف چند شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے وگرنہ اندلس کی تاریخ سیاسی، ثقافتی، علمی روایات انسانی تاریخ کا ایک قابل فخر کارنامہ ہے۔ مسلمانوں نے جتنا عرصہ اندلس میں حکومت کی اس میں زیادہ عرصہ ان کی سلطنت سیاسی ہیبت اور فوجی قوت و برتری سے ایک عالم لرزہ براندام تھا اور ان لوگوں کی اندرونی خوش حالی کا یہ عالم تھا کہ مؤرخ ڈوزی کے بقول اسلامی اندلس کی خوش حال قوم کا ہر ہر فرد پڑھا لکھا تھا۔ اسی ایک

بات سے اسلامی اندلس کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بات کا انتہائی تعجب ہے کہ اتنی عظیم قوم اس خطۂ اراضی سے یوں محو ہوگئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ اور آج اگر اس خطے میں اس کی عظمت رفتہ کے شواہد و آثار موجود نہ ہوتے تو دنیا اسے ایک من گھڑت افسانہ سمجھتی۔ اسلام کی پوری تاریخ میں دنیا میں کوئی ایسا خطہ نظر نہیں آتا جہاں مسلمانوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہا ہو۔ جہاں جہاں مسلمان گئے وہاں انھوں نے اپنی سلطنتیں قائم کیں۔ وہاں آج تک مسلمان موجود ہیں بلکہ ان کی زبان عربی بھی پورے ملکوں میں آج تک ملکی زبان کے طور پر رائج ہے، لیکن اسلامی اندلس کی مثال ایک منفرد مثال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی اندلس کی تاریخ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی عبرت آموز بھی ہے۔ اندلس کے مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کرنے کے باوجود، وہاں علوم و معارف کے ذخائر جمع کرنے کے باوجود اور وہاں کی غیر مسلم اقوام کو دنیا میں عزت سے جینے کے آداب سکھانے کے باوجود وہاں کے متعصب عیسائیوں نے انھیں اور ان کے علوم و معارف کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ البتہ ان متعصب عیسائیوں کی دست برد سے جو کچھ بچ گیا وہ بھی ایک قابل فخر سرمایہ ہے اور یورپ کی ساری ترقی اسی سرمائے کے باعث ہے۔

اگرچہ اندلس کو سب سے پہلے طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر نے فتح کیا تھا لیکن وہاں انھوں نے مستقل حکومت قائم نہیں کی تھی بلکہ یہ سلطنت اموی کا ایک صوبہ تصور ہوتا تھا جو افریقہ کے ماتحت تھا۔ مسلمانوں کی اصل اور مستقل حکومت عبدالرحمٰن بن معاویہ الداخل کے زمانے میں قائم ہوئی جو عباسیوں سے اپنی جان بچا کر چھپتے چھپاتے اندلس پہنچ گیا اور جسے عباسی خلیفہ المنصور نے ''صقر قریش'' (یعنی قریش کا شاہین) کا لقب دیا تھا، جب یہ سرزمین اندلس کا حکمران بن گیا تو ایک روز کھجور کے ایک الگ تھلگ اور تنہا پودے کو نہایت حسرت بھری نگاہ سے دیکھا اور کہا: ''اندلس میں یہ پودا بھی میری طرح غریب الدیار (اجنبی) ہے جو عرب سے یہاں لایا گیا ہے۔ اس موقع پر عبدالرحمٰن الداخل نے کچھ اشعار کہے جن میں ایک شعر یہ ہے ۔

یا نخل! انت غریبة مثلی ۔۔۔ من الغرب نائیة عن الاصل

یعنی اے کھجور کے درخت! تو بھی میری طرح اجنبی ہے اور دیار مغرب میں اپنے اصلی وطن سے دور ہے۔

اندلس کی عمارتیں

مسلمانوں نے جہاں بھی حکومت کی وہاں انھوں نے مساجد، مدارس، خانقاہیں، قلعے، محلات، حمام، سرائے اور پل وغیرہ بنائے، ان میں انھوں نے سادگی کو ترجیح دی۔ مساجد میں خصوصی طور پر سادگی کو اپنایا کیونکہ ان میں حق تعالیٰ شانہ کی وحدانیت اور بندوں کی طرف سے بارگاہ الوہیت میں عاجزی و انکسار اور اطاعت و فرمان برداری کا اظہار بنیادی اور مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی سادگی تعمیر کعبہ میں بھی تھی اور مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر میں بھی ملحوظ خاطر رکھی گئی۔ بعد میں مساجد کی تعمیر میں کمال سادگی کے باوجود آرائش میں حسن آفرینی اپنی انتہا کو چھوتی نظر آتی ہے۔ مساجد میں زیادہ تر تعمیراتی اور آرائشی خوبیوں کے لیے محراب و منبر، گنبد اور میناروں کو آرائشی خوبیوں کے لیے توجہ کا مرکز بنایا جاتا رہا ہے۔

مسلمانوں کے فن تعمیر کے ابتدائی ادوار کی عمارتیں کلیتاً ارضی ہیں۔ ان کی تعمیر عمودی نہیں بلکہ افقی ہے یعنی اونچائی سے زیادہ ان میں پھیلاؤ پایا جاتا ہے۔ مسجد ہو یا محل اس میں اونچائی کے بجائے وسعت اور کشادگی کا زیادہ خیال رکھا جاتا تھا۔ برج، مینار اور گنبد بھی اونچے نہیں ہوتے تھے۔ گنبد کے اندر تہ در تہ طاقچے بنا کر سپاٹ بلندی کو شکستہ کر دیا جاتا تھا۔

مسلم عمارتوں کی تعمیر میں تعمیری آرائش کا مقصد یہ تھا کہ عمارت کے سادہ اور مزین حصوں کا فرق نمایاں نہ ہو۔ نقش و نگار واضح ہوں۔ ستونوں اور محرابوں سے عمارت کو پر کر دیا جاتا تھا کہ مجموعی اثر خوش گوار ہو۔ عمارت کا ہر حصہ ایک خاص مقصد سے بنایا جاتا تھا۔ خصوصی طور پر مسجد کے ہر حصے کی آرائش سے کوئی نہ کوئی غرض وابستہ ہوتی تھی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اسلامی تعمیرات کی قریباً ہر عمارت میں چند خصوصیات نظر آتی ہیں۔ ترتیب، کشادگی، ڈھانچہ، ساخت، نقش و نگار، روشنی اور نقل و حرکت میں سہولت۔

اسلام میں دانش ور طبقے کی زبان ریاضی کی بنیادوں پر استوار رہی ہے۔ جو الٰہیاتی ترتیب کا نمائندہ ہے۔ ترتیب کے حصول کے لیے دانستہ یا دانستہ طور پر مسلم فن کاروں نے جیومیٹری کے بنیادوں اصولوں کو اپنے مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا اور یہ چیز ہمیں ان کی ہر تعمیر میں نظر آتی ہے۔

ایک سچے مسلمان کے نزدیک وسعت و کشادگی بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے کیونکہ کائنات لامحدود

وسعتوں کی حامل ہے۔ کشادگی ایک مسلمان کے لیے صرف ایک علامتی عامل نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے مادی اور غیر مادی دونوں طرح کے افکار کارفرما ہیں۔ اس وجہ سے کشادگی اسلامی تعمیرات میں ایک اہم حیثیت رکھتی ہے۔ اسلامی تعمیرات کے فن کاروں کی ہر تعمیر کے ڈھانچے اور شکل وصورت میں مقامی تہذیب وثقافت کا اثر نمایاں طور پر پایا جاتا ہے اور اس کی بناوٹ پر وہاں کی آب و ہوا، زمین کی ساخت کے اہم اثرات بھی مرتب ہوتے نظر آتے ہیں۔

اسلامی تعمیرات کی ساخت میں اس بات کا بھی پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے کہ اس میں ایک خاص ترتیب ہو جو اقلیدس اور جیومیٹری کے اصولوں پر پوری اترتی ہو۔ اس میں بعض اوقات ایسی ترتیب رکھی جاتی ہے کہ اس میں روحانی خصوصیات اجاگر ہوتی نظر آتی ہیں۔

مسلمانوں کے نزدیک اس دنیا کی خوب صورتی ایک بالکل عارضی چیز ہے۔ چونکہ لوگوں اور جانوروں کی حقیقی تصویرکشی مسلمانوں کے لیے شرعی طور پر ممنوع ٹھہرائی گئی ہے لہٰذا فن کارانہ صلاحیتوں نے خطاطی کی شکل میں نئے اُفق اور جدید زاویے قائم کیے اور یوں خطاطی کا فن اپنے عروج کو پہنچا۔ عربوں کی ریاضیاتی صلاحیتوں نے نقش ونگار میں نئی جہتوں کی تلاش میں بڑی مدد دی اور یوں نقش ونگار کے ایسے نمونے وجود میں آئے جو ہمہ پہلو اور ہمہ جہت خوبیوں کے حامل تھے۔

مسلمانوں کے نزدیک روشنی کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ایمان وہدایت اس روشنی کی مرہون منت ہیں بلکہ حق تعالیٰ خود بھی ''نور السموات والارض'' ہے۔ اس کے برعکس تاریکی اور ظلمت ان کے ہاں گناہ اور برائی کی علامت ہیں۔ لہٰذا تمام اسلامی تعمیرات میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ روشنی کا حصول آسان اور سہل ہو۔ لہٰذا اسلامی تعمیرات میں کوئی گوشہ ایسا نہیں ہوتا جہاں قدرتی روشنی نہ پہنچتی ہو۔ چنانچہ اس کے لیے اکثر وبیشتر جابجا جالی دار دیواریں تعمیر کی جاتیں جن سے روشنی چھن چھن کر عمارت کے ہر حصے کو روشن کرتی البتہ دھوپ کا گزر نہ ہوتا۔ یہ جالیاں سنگ مرمر کی بھی ہوتیں اور بعض دفعہ اینٹوں کی بھی بنائی جاتیں۔ پھر اسلامی عمارتوں میں اس بات کا بھی خاص طور پر خیال رکھا جاتا کہ باہر سے آنے والے لوگوں یا گھر والوں کی آمدورفت میں کوئی دقت نہ ہو۔ ہر گوشہ میں آسانی کے ساتھ پہنچا جاسکے۔

اسلام میں بت تراشی اور تصویرکشی کی ممانعت کے باعث مسلمان ماہرین فن تعمیر نے ہندسی اشکال، خطاطی یا زیادہ سے زیادہ بیل بوٹوں کی تصویرکشی پر اکتفا کیا۔ ہندسی اشکال وہ چند شکلیں ہیں جنہیں ہم مربع، مستطیل، دائرہ، تکون یا مثلث اور کثیر الاضلاع کا نام دیتے ہیں۔ ہندسی اشکال کی اساس پر بنائے گئے یہ نقش و نگار اپنی لامحدودیت میں اسلام کے اس بنیادی عقیدے کو اجاگر کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ واحد اور ناقابل تقسیم ذات ہے۔ یہ نقش ونگار باوجودیکہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن نہ تو کہیں مرتکز ہوتے ہیں اور نہ وہ کسی شخصیت کے روپ میں ڈھلتے ہی نظر آتے ہیں۔ ایک مسلمان فن کار کی یہی خوبی ہے کہ وہ اپنے فن میں

عاجزی کے اظہار کے باوجود ایک نہایت ہی اعلیٰ پائے کا خوب صورت فن پارہ تخلیق کر دیتا ہے۔

تعمیراتی ذرائع میں مسلمانوں نے ہر دور میں کسی علاقے میں دستیاب ہر اس شے کو استعمال کیا جو استعمال ہو سکتی تھی اور وہاں دستیاب تھی۔ پتھر، اینٹیں، لکڑی، مصنوعی مسالہ غرض کہ ہر ذریعۂ تعمیر سے استفادہ کیا گیا۔ آرائش کے سلسلے میں بھی ان ذرائع کا بھرپور استعمال کیا گیا۔ جہاں پتھر دستیاب تھے وہاں پتھروں کو تراش کر گل کاری کی گئی، جہاں پتھروں کی کمیابی تھی وہاں گچ کے استر سے نقاشی کی گئی۔ اس کے علاوہ سفال گری بھی تعمیر و آرائش کا ایک اہم ذریعہ رہا ہے۔ اسی طرح رنگین پتھروں یا شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بھی آرائش و زیبائش کا کام لیا جاتا تھا۔ ان تمام ذرائع کے علاوہ ایک اہم ذریعہ لکڑی تھا جس میں کندہ کاری یا لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو باہم جوڑ کر نہایت اعلیٰ قسم کے نمونے تخلیق کیے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں مختلف رنگوں کے استعمال سے بھی مختلف نقش و نگار ترتیب دیے جاتے تھے۔

اندلس میں اسلامی فن تعمیر:

سنہ ۷۱۱ء میں مسلمانوں نے اندلس کو فتح کیا، یہاں سے لے کر سنہ ۷۵۶ء میں اموی حکومت کے قیام تک کے حالات ایسے نہ تھے کہ یہاں مسلمانوں کو فن کارانہ تعمیرات کے لیے سازگار ماحول میسر آتا۔ کیونکہ یہ تو افراتفری کا ماحول تھا۔ عیسائی یہ سمجھ رہے تھے کہ ہمارے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ دوسرے یہ دور ایک نئے معاشرے کی تشکیل کے لیے ابھی ابتدائی مراحل میں تھا۔ یہاں پر آنے والے مسلمان عموماً فوجی تھے جن کے ساتھ ان کی بیویاں نہیں تھیں، لہٰذا انھوں نے اندلس کی عورتوں سے شادیاں کیں۔ دوسری بات یہ کہ مسلمانوں کے حسن اخلاق اور غیر مسلموں کے ساتھ عدل و انصاف کرنے کی وجہ سے عیسائیوں کا ایک بہت بڑا طبقہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اندلس میں ایک نئے مسلم معاشرے کی تشکیل کے ضروری اجزاء اور عناصر فراہم ہو گئے۔ ان حالات میں عبدالرحمٰن الداخل نے اندلس کی سرزمین پر قدم رکھا۔ وہ ۷۵۵ء میں اشبیلیہ پہنچا اور ایک سال کے عرصے میں اسے قرطبہ میں اندلس کے مسلمانوں کا حکمران تسلیم کر لیا گیا۔

عبدالرحمٰن الداخل اس ملک میں ایک اجنبی تھا۔ اس کی حکمرانی کے ابتدائی ایام میں یمنی عربوں، بربروں اور خود اپنے فوجیوں کی بغاوتوں کے باعث اس کے لیے نئی تعمیرات کی طرف توجہ مبذول کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ چنانچہ ایک مستحکم اور مضبوط حکومت قائم کرنے کے لیے اسے بہت زیادہ تگ و دو کرنا پڑی اور اپنی حکومت کے آخری ایام میں کہیں اسے اس طرف توجہ کرنے کی فرصت ملی۔ اس مقصد کے لیے اس نے سب سے پہلے مسجد قرطبہ کی بنیاد رکھی اور خود اپنی نگرانی میں اس کی تعمیر کا کام شروع کرایا۔

اندلس کے حکمرانوں نے اندلس میں جتنی بھی تعمیرات کیں وہ انھوں نے پرانی ثقافت کی کورانہ تقلید میں نہیں کی تھیں بلکہ انھوں نے وہ سب تعمیرات نئے معاشرے اور نئی تہذیب کے نتیجے میں کیں۔ چنانچہ ان

تعمیرات میں نئی تہذیب کے نئے انداز ہر پہلو سے جھلکتے نظر آتے ہیں۔ سندھ سے لے کر مراکش تک عربوں کی یہ خصوصیت نظر آتی ہے کہ انھوں نے اسلامی تعمیرات میں اس علاقے کے تعمیراتی اصولوں اور خدوخال کو شامل کیا، لیکن سرزمین اندلس میں انھوں نے ایک نیا انداز تعمیر اختیار کیا۔ وہ یہاں ایک ایسی تعمیر کے موجد بنے جس میں عرب، اندلسی، صیہونی اور اندلس کی دیگر اقوام کی خصوصیات یک جا نظر آتی ہیں۔ مسجد قرطبہ کی مثال سامنے ہے جس میں قدیم اسلامی طرز تعمیر صیہونی اور عیسائی طرز تعمیر کے ساتھ ساتھ ایک نئے امتزاج کے ساتھ ملتا ہے۔ اندلس میں مسلمانوں کے فن تعمیر کا عرصے مسجد قرطبہ کی تعمیر سے لے کر قصر الحمرا کی تکمیل کے زمانہ تک محیط ہے جو کہ سات سو سال کا عرصہ بنتا ہے۔ اس عرصہ میں جو عمارتیں بنائی گئیں ان کی تفصیل کے لیے تو کافی اوراق درکار ہیں البتہ آئندہ صفحات میں ان میں سے چند ایک اہم عمارات کا ذکر کیا جائے گا۔

اندلس میں جو عمارتیں بنائی گئیں وہ نہایت مستحکم اور پختہ تھیں۔ ان کو پختہ اور مضبوط بنانے کے لیے چونے، مٹی اور پتھر کے مرکب مسالے سے کام لیا جاتا تھا۔ اس مسالے کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ جس قدر پرانا ہوتا جاتا اتنا ہی مضبوط اور پختہ ہوتا جاتا تھا۔ چنانچہ ان عمارتوں کی مضبوطی آج بھی اپنے عہد رفتہ کی داستان یوں سناتی ہے کہ انھی بنیادوں پر اتنے سو سال گزرنے کے بعد آج بھی قائم ہوں جن بنیادوں پر مجھے عرب حکمرانوں نے اٹھایا تھا۔ ان عمارتوں کی تعمیر میں بڑی بڑی اینٹیں استعمال کی گئیں جن کے ایک طرف کشتی سی بنی ہوئی ہوتی تھی جس میں مسالہ پھنس جاتا تھا اور اس طرح ایک اینٹ دوسری اینٹ کو نہایت مضبوطی سے پکڑ لیتی تھی۔ بعض اوقات تمام دیوار پختہ پتھر سے بنائی جاتی تھی۔ قرطبہ اور اشبیلیہ کی مسجدوں کے میناروں کے سب سے اوپر والے حصوں کو شعلہ نما بنایا گیا تھا جو کسی حد تک مجوسی طرز تعمیر کے مشابہ ہے۔ الحمرا کی پچی کاری اور طلائی کاموں میں یہی طرز تزئین و تعمیر سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اندلس کی عمارتوں کی تعمیر میں مختلف قسم کی محرابیں ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں، ان میں سے کچھ تو اندلس کے مسلمانوں کی اپنی اختراع ہیں۔ بنو امیہ کے عہد حکومت کے ابتدائی ایام میں جو محرابیں بنائی گئی تھیں وہ نعلی شکل کی تھیں لیکن بعد میں محرابوں کا طرز بدلتا گیا یہاں تک کہ قصر الحمرا کی خوب صورت محرابوں کی نزاکت اور اس میں مسالے کی کم مقدار استعمال میں لائے جانے کی خصوصیت نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کہ اس قدر بڑے بڑے پایوں اور چھجوں کا بوجھ ان نازک محرابوں نے کیوں کر اٹھا رکھا ہے۔ نعلی محرابوں کے ساتھ ساتھ اندلس میں نوکیلی محرابوں کا بھی عام رواج تھا۔ کھڑکیوں اور جالیوں کے اردگرد چھوٹی چھوٹی آرائشی محرابیں بنا کر ان کی خوب صورتی میں اضافہ کیا جاتا تھا۔

اندلس میں اسلامی تعمیرات سے قبل بھی دنیا میں ستون عمارت کا اہم جز تصور ہوتے تھے لیکن اندلس کے عمارتی فن کاروں نے ان میں بہت اصلاح کی اور انھیں نازک سے نازک تر بنانے کی کوشش کی اور ان میں اپنی ہنرمندی کے جوہر دکھا کر ان میں نہایت خوب صورتی اور ہر طرح کی موزونیت پیدا کی جو آج بھی دیکھنے والوں سے داد تحسین وصول کیے بغیر انھیں آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ چنانچہ قصر الحمرا کے بیت الاسود کے ستونوں کو

دیکھ کر موجودہ زمانے کے ماہرین تعمیرات بھی انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں اور وہ بہ آوازِ بلند یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ایسے ستون فقط مسلمانان اندلس کی ہی ایجاد ہیں۔

دیواروں کی سجاوٹ اور آرائش میں مسلمانان اندلس نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اندلس کی عمارتوں کا بیرونی حصہ اکثر سادہ ہوتا تھا جب کہ اندرونی حصے میں یگانہ روزگار کاریگروں نے اپنا کمال دکھایا ہوتا تھا۔ مسجد قرطبہ کی تزئین و آرائش کا کام پہلے تو عرب کے معروف صناعوں کی طرز پر کیا گیا۔ اس کے علاوہ سنگ مرمر کی جالیوں سے بھی اس مقصد کو حاصل کیا جاتا تھا۔ ان جالیوں سے روشنی اور ہوا بخوبی گزر کر اندر آتی تھی، لیکن دھوپ کا گزر نہ ہوتا تھا۔ اشبیلیہ کا مینارہ جو کسی زمانے میں مینارۂ مسجد نیز رصدگاہ کے طور پر بھی کام آتا رہا تھا، دیواری نقش و نگار کا نہایت ہی اعلیٰ نمونہ ہے۔

اندلس کے تعمیراتی ماہرین ٹائل بنانے اور لگانے کے فن میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔ اس بات کی شہادت وہ عمارتیں دیتی ہیں جن میں ان ہنرمندوں نے وہ ٹائلیں لگائی تھیں۔ قصر الحمرا میں یہ کام اپنی خوبی کی انتہائی حدوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اشبیلیہ اور جامع قرطبہ کے میناروں میں ایسی ٹائلیں استعمال کی گئی تھیں جو دھوپ میں آئینے کی طرح چمکتی تھیں۔ دیواروں کی سجاوٹ اور آرائش میں سب سے نمایاں کام گچ کے کام کو حاصل ہے۔ دیواروں پر جو مسالہ لگایا گیا ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا ہے یہ مسالہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ شاید اس کے بنانے کی ترکیب یہ تھی کہ پہلے سنگ مرمر کو پیس کر سرمے کی طرح باریک کرتے تھے۔ پھر اس میں چونا اور جپسم ملا کر ایک خاص مقدار میں انڈوں کی سفیدی میں اسے گوندھا جاتا تھا۔ پھر اس میں کوئی ایسی چیز بھی ڈالتے تھے جس سے حشرات الارض بھاگتے تھے کیونکہ اس مسالے کی دیوار پر کبھی کوئی مکھی اور دیگر کیڑے نہیں دیکھے گئے۔ پھر اس مسالے کو جو ابھی سیال حالت میں ہوتا تھا، مختلف سانچوں میں ڈھال کر اس سے مختلف شکل وصورت کے پھول اور بیل بوٹے بنائے جاتے تھے۔ صرف قصر الحمرا میں ۱۵۲ وضع کے ایسے پھول اور بیل بوٹے پائے گئے ہیں جو شکل وصورت اور سائز کے لحاظ سے باہم مختلف ہیں۔

مساجد اور شاہی محلات کے علاوہ اندلس میں جو عمارتیں سب سے زیادہ بنائی جاتی تھیں وہ فوجی طرز تعمیر کی طرح ہوتی تھیں۔ کیونکہ اس زمانے میں اکثر و بیشتر لڑائیوں کی وجہ سے یہ دفاعی عمارتیں عام طور پر وسیع و عریض رقبے پر بنائی جاتی تھیں۔ مسقف راستے اور مورچے فوجی راستوں کی حفاظت کرتے تھے۔ قلعے کی فصیل کے اندر بہت بڑا رقبہ ہوتا تھا جو بجائے خود ایک شہر کی صورت اختیار کر جاتا تھا۔ مخصوص حالات میں قلعے میں داخل ہونے اور باہر جانے کے لیے چور راستے بنائے جاتے تھے۔ قلعے میں پانی کے حصول اور فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے بڑے بڑے حوض بنائے جاتے تھے جن کو بھرنے کے لیے کسی پہاڑی چشمے سے وہاں تک پانی پہنچانے کا بندوبست پختہ نالیوں کے ذریعے جس انداز سے کیا جاتا تھا وہ اس دور کے کاریگروں کی صناعی اور

کمال مہارت کا ایک بین ثبوت ہے۔

اندلس کو فتح کرنے کے بعد مسلمانوں نے جو عمارات وہاں تعمیر کیں ان کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ ان میں دو قسم کی عمارتیں تھیں۔ سرکاری اور عوامی۔ اس زمانے میں عوامی عمارتوں کا طرز تعمیر سرکاری عمارات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ سرکاری عمارات سے مراد وہ عمارتیں ہیں جن کی تعمیر اگرچہ عوامی فلاح و بہبود کے لیے ہی ہوتی تھی لیکن ان کی تعمیر میں امراء وسلاطین چونکہ بطور خاص حصہ لیتے تھے جیسے مسجد قرطبہ اور دریائے وادی الکبیر کا پل۔ مختصر یہ کہ اندلس کی عمارتیں اپنی مضبوطی، پائیداری، آن بان، شان وشکوہ اور خوبصورتی میں دنیا بھر میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ اموی بادشاہوں کو محل اور عمارتیں بنانے کا بڑا شوق تھا۔ الزہرا اور الزاہرہ جیسے محل جن کی خوبصورتی پر خود خوبصورتی ناز کرتی تھی، اموی بادشاہوں کے اس شوق کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اسی طرح ان حکمرانوں کے دینی ذوق وشوق نے جامع قرطبہ، الزہرا اور الزاہرہ کی مسجدوں کی تزئین اور آرائش پر جو کام کرایا، اس نے ان مسجدوں کو حسن و جمال اور خوبصورتی کا ایک مکمل نمونہ بنا دیا۔ اندلس کی یادگار عمارتوں کے ضمن میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ اپنی پائیداری، مضبوطی، حسن و جمال، جدت فکر اور ندرت خیال میں یکتائے زمانہ تھیں۔ اس زمانے میں بھی ان عمارتوں کو دیکھ کر ان کی دل کشی اور جاذبیت اور دوسری خوبیوں کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ ان میں سے چند ایک عمارتیں آج بھی اپنے اس شاندار ماضی کی غمازی کر رہی ہیں۔

(۱) جامع مسجد قرطبہ:

سرزمین اندلس میں مسلمانوں نے یوں تو بہت سی دل فریب اور دل کش عمارتیں تعمیر کیں جو اپنی نفاست، دل کشی، مضبوطی اور پائیداری میں بے مثال ہیں لیکن جو دل کشی، پاکیزگی اور نفاست مسجد قرطبہ کے حصے میں آئی، اس کا اظہار ناقابل بیان ہے۔ اس کا حسن و جمال، تزئین و آرائش، گل کاریاں اور پچی کاریوں کی تفصیل الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ اگرچہ عیسائی حکمرانوں نے اشبیلیہ کی مسجد کے مینار کی طرح مسجد قرطبہ کے مینار کا حلیہ بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انھوں نے اس مینار کا بالائی حصہ از سر نو تعمیر کر کے بس یوں سمجھیے کہ مسلمان کو زبردستی عیسائی بنا لیا ہے۔ مینار کی چوٹی پر پیتل کے ہلال کے بجائے پتھر کا بت جڑا ہوا ہے۔ اس کے نچلے حصے میں کلیسا کی ایک بہت بڑی دھاتی گھنٹی نے موذن کو اٹھا کر سمندر کے دوسری طرف شمالی افریقہ میں پھینک دیا ہے۔

مسجد قرطبہ کی تعمیر کا آغاز سب سے پہلے عبدالرحمٰن الداخل نے کیا۔ اس نے قرطبہ کے مقام رصافہ پر کھجور کے ایک تنہا درخت کو دیکھ کر کہا تھا ''کہ اے کھجور کے درخت اس دیس میں تو بھی میری طرح اجنبی ہے اور یہاں دیار مغرب میں اپنے اصلی وطن سے دور ہے۔'' کھجور کا درخت اندلس کی سرزمین کی چیز نہیں تھی۔ یہ درخت اسے اس کے وطن، سرزمین شام اور وہاں امویوں کی عظمت رفتہ کی یاد دلاتا رہتا تھا۔ شاید اسی لیے اس

نے مسجد قرطبہ کے ستون اور ان کی درمیانی قوسیں اس وضع پر رکھوائیں جو کہ ایک نخلستان کا نمونہ پیش کریں۔
علامہ اقبال نے بھی شاید اسی کیفیت کو محسوس کر کے کہا تھا۔

تیری بنا پائدار، تیرے ستون بے شمار شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل

علامہ اقبال کو مسجد قرطبہ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں لندن جاتے ہوئے اور جنوری ۱۹۳۳ء میں ہسپانیہ روانہ ہونے سے پہلے اقبال نے پیرس میں کچھ دنوں کے لیے قیام کیا۔ یہاں کسی ایک موقع پر انھوں نے یہ اشعار لکھے جن کا عنوان ''فرانس میں لکھے گئے'' ہے۔

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام
پیر حرم نے کہا سن کے میری روئداد
پختہ ہے تیری فغاں، اب نہ اسے دل میں تھام
تھا اَرِنی گو کلیم، میں اَرِنی گو نہیں
اس کو تقاضا روا، مجھ پر تقاضا حرام
گرچہ ہے افشائے راز، اہل نظر کی فغاں
ہو نہیں سکتا کبھی شیوہ رندانہ عام
حلقۂ صوفی میں ذکر، بے نم و بے سوز و ساز
میں بھی رہا تشنہ کام، تو بھی رہا تشنہ کام
عشق تیری انتہا، عشق میری انتہا
تو بھی ابھی ناتمام، میں بھی ابھی ناتمام
آہ کہ کھویا گیا تجھ سے فقیری کا راز
ورنہ ہے مالِ فقیر، سلطنت روم و شام

(کلیات اقبال (بال جبریل: ص ۳۵۴)

بہر حال جیسا کہ کہاں گیا ہے کہ اقبال کو قرطبہ جانے کا اتفاق سنہ ۱۹۳۳ء میں ہوا تھا۔ تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے اقبال ۱۹۳۲ء میں لندن گئے تھے۔ وہیں سے پیرس ہوتے ہوئے ہسپانیہ تشریف لے گئے۔ پیرس میں انھوں نے وہ شعر کہے جو اوپر نقل کیے گئے ہیں۔ یہ اشعار گویا قرطبہ اور مسجد قرطبہ میں جانے کی ایک تمہید تھے۔ انھوں نے قرطبہ جا کر اسلامی دور اقتدار اور عبدالرحمٰن الداخل کی تعمیر کردہ مسجد قرطبہ اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ مشہور ہے اور فوٹو میں بھی دیکھا گیا ہے کہ انھوں نے کئی سو سال بعد پہلی دفعہ مسجد قرطبہ میں اذان بھی دی تھی اور نماز بھی پڑھی تھی۔ اذان دینے اور نماز پڑھنے میں فقیر سید وحید الدین اور مولانا

عبدالمجید سالک کے بیانات کچھ متضاد ہیں، لیکن امتیاز محمد خان کا بیان ہمیں اس بارے میں زیادہ درست اور صحیح معلوم ہوتا ہے اور تصاویر سے بھی اس کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ امتیاز محمد خان نہایت پڑھے لکھے شخص تھے۔ یہ ریلوے ہائی اسکول داناپور (بہار) کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ تقسیم ہند کے بعد یہ قائداعظم کی خصوصی ہدایت پر پاکستان آ گئے تھے اور کراچی اور بلوچستان میں سیکرٹری تعلیم کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ ان سے علامہ اقبال نے خود مسجد قرطبہ میں اپنی اذان دینے اور نماز پڑھنے کا تذکرہ فرمایا تھا۔ خان صاحب کا بیان ہے کہ ''علامہ فرمانے لگے کہ جب میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن گیا تو اس سفر کے دوران جی چاہا کہ اسلامی دور کی قدیم نشانی ہسپانیہ کو بھی جا کر دیکھیں، خصوصاً الحمرا اور مسجد قرطبہ کی پرشکوہ اور عظیم الشان عمارات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ بھی کریں۔ یہ خیال آتے ہی دل میں ایک ہوک سی اٹھی کہ مسجد قرطبہ کو دیکھنے کا موقع تو مل جائے گا لیکن وہاں نماز کس طرح ادا کر سکوں گا، اس لیے جب ہسپانیہ میں غیر مسلم حکومت ہوئی اور ایک دوسرا آئین نافذ ہوا تو وہاں کا پہلا قانون یہ تھا کہ مسجد قرطبہ میں نہ تو اذان دی جائے گی اور نہ نماز ہی ادا کی جائے گی، اور اس قانون کے نفاذ کے ساتھ ساتھ اس عظیم الشان مسجد کو گرجا بنا دیا گیا۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ اس قانون کا خیال آتے ہی دل رونے لگا بلکہ آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے ابلنے لگے کہ کیا میں مسجد میں داخل ہو کر بھی دو رکعت نماز ادا نہیں کر سکوں گا؟ اس سلسلے میں، میں نے اپنے ایک انگریز دوست کی مدد حاصل کی۔ اس نے حکومت ہند کے ہوم سیکرٹری کو خط لکھا اور اس سے درخواست کی کہ وہ حکومت ہسپانیہ کے ہوم سیکرٹری کو خط لکھ کر اس امر کی اجازت حاصل کر لے کہ ڈاکٹر محمد اقبال سفر قرطبہ کے دوران مسجد قرطبہ میں باقاعدہ نماز ادا کر سکیں۔ چنانچہ یہ کوشش بارآور ثابت ہوئی اور مجھے باقاعدہ دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مل گئی، مگر ایک شرط کے ساتھ، قانون قانون ہوتا ہے، اس کو توڑنا بھی آسان نہیں، لہٰذا یہ طے پایا کہ جب میں مسجد قرطبہ کے اندر داخل ہو جاؤں تو دروازہ بند کر دیا جائے اور اس پر قفل لگا دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مسجد کے اندر پہنچ کر میں نے اپنی آواز کی پوری شدت کے ساتھ اذان دی۔ میں اس جذبے، اس سرور اور اس کیفیت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ سالہا سال کے بعد مسجد کے اندر پہلی مرتبہ ''اللہ اکبر'' کی آواز محراب و منبر سے ٹکرا ٹکرا کر گونج رہی تھی۔ اذان سے فارغ ہونے کے بعد میں نے مصلے بچھایا اور نماز ادا کرنے لگا۔ دوران نماز مجھ پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ میں گریہ و زاری برداشت نہ کر سکا، اور جب سجدے میں گر گیا تو بے ہوش ہو گیا۔ اسی دوران میں نے عالم رؤیا میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے ہیں اور مجھے مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں:

''اقبال! تم نے میری مثنوی کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ اسے مسلسل پڑھتے رہو اور میرا پیغام دوسروں تک پہنچاتے رہو۔''

جب میں ہوش میں آیا تو دل کو سکون و اطمینان حاصل ہو چکا تھا۔ علامہ اقبال کی زندگی کا یہ اہم واقعہ بیان کر کے امتیاز محمد خان مرحوم یک لخت خاموش ہو گئے۔ اس وقت ان کی آنکھیں آنسوؤں سے پر تھیں۔''

اس موقع پر علامہ اقبال نے مسجد قرطبہ پر ایک نہایت پر شکوہ اور دلآویز نظم کہی۔ دنیائے ادب میں یہ نظم ایک بے نظیر اور عدیم المثال شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس عظیم شاہپارے کے دو شعر حسب ذیل ہیں: ؎

اے حرم قرطبہ! عشق سے تیرا وجود — عشق سراپا دوام، جس میں نہیں رفت بود

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل — وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل

بہر حال سرزمین اندلس میں جہاں مسلمانوں کی اور دل فریب اور شاندار عمارتیں تھیں، ان میں سب سے پہلی بہترین عمارت مسجد قرطبہ ہے۔ اگرچہ گردش ایام نے اب اس میں بہت کچھ تبدیلی کر دی ہے اور اسے کچھ سے کچھ بنا دیا ہے پھر بھی زمانے کی دست بروسے اس کی ندرت کاری، آرائش و زیبائش اور جدت تعمیر کے جو آثار بچ گئے وہ اپنے شاندار ماضی کی داستان سنا رہے ہیں اور علامہ اقبال نے غلط نہیں کہا تھا: ''وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل''، یہ عظیم الشان مسجد امیر عبدالرحمٰن الداخل کے ذوق تعمیر اور قوت متخیلہ کی کارفرمائی کا نتیجہ ہے۔ امیر عبدالرحمٰن نے جب ایک طرف اندرونی شورشوں پر قابو پالیا اور دوسری طرف بیرونی خطرات اور حملوں کا سد باب کر لیا تو اپنی وفات سے دو سال قبل اس مسجد کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ امیر عبدالرحمٰن کی یہ خواہش تھی کہ اس مسجد کو دمشق کی مسجد ''جامع الاموی'' کا مثیل بنا کر اہل اندلس کو ایک مرکز عطا کریں۔ چنانچہ انھوں نے مسجد کی تعمیر کی نگرانی خود کی اور اسے جلد از جلد مکمل کرانے کی غرض سے ہر قسم کے وسائل مہیا کیے۔

یہ عظیم الشان مسجد دریائے وادیٔ الکبیر پر بنائے گئے، قدیم ترین پل کے قریب واقع ہے۔ اس جگہ پہلے سینٹ ونسنٹ کی یاد میں ایک گرجا واقع تھا۔ اسمح بن مالک خولانی کے عہد امارت میں شہر قرطبہ دارالحکومت بنا تو مسلمانوں نے مسجد کے لیے اس گرجا کو عیسائیوں سے خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا کیونکہ پہلے اس کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد بنائی گئی تھی، اور دریا وادی الکبیر کے قریب ہونے کے باعث مسجد کے لیے یہ جگہ نہایت موزوں تھی، مسلمان اس پر زبردستی بھی قبضہ کر سکتے تھے جیسے عیسائیوں نے کئی سو سال سے کر رکھا ہے لیکن مسلمانوں کا مذہب اور قانون زبردستی قبضے کی اجازت نہیں دیتا، لہٰذا انھوں نے عیسائیوں سے یہ جگہ خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن وہ مسلمانوں کی تمام تر رواداری کے باوجود اسے فروخت کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ مگر جب امیر عبدالرحمٰن الداخل کا عہد حکومت آیا تو اس نے بہت بھاری قیمت ادا کر کے پورا گرجا خرید لیا۔ قبضہ حاصل کرنے کے بعد سنہ ۷۸۶ء میں امیر الداخل نے اسے گرا کر اس کی جگہ ایک نہایت خوبصورت، دیدہ زیب، دل کش اور پائیدار مسجد کی دیواریں کھڑی کیں۔ اس مسجد کی تعمیر میں امیر نے جس ذوق وشوق کا اظہار کیا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ امیر نے دو سال کی قلیل مدت میں اس پر اسی (۸۰) ہزار دینار خرچ کیے۔ مسجد کی چھت کو بے شمار ستونوں پر قائم کیا گیا جن کی ترتیب کچھ اس طرز پر ہے کہ ان کے تقاطع سے دونوں طرف کثرت سے متوازی راستے بن گئے ہیں۔ ان ستونوں پر نہایت ہی پر تکلف نعلی محرابیں قائم کی گئی ہیں۔ یہ نعلی محرابیں اس مسجد کا حسن اور امتیاز ہونے کے ساتھ ساتھ اندلسی طرز تعمیر کی پہچان بن چکی ہیں۔ مسجد

کے ان ستونوں پر دہری محرابیں بنی ہوئی ہیں۔ ان محرابوں پر کہیں کہیں قبے بنائے گئے تھے جن میں سے چند ایک ابھی تک باقی ہیں۔ مسجد کی چھت تیس فٹ کے قریب بلند ہے جس کی وجہ سے مسجد میں صاف ہوا اور روشنی کا حصول نہایت آسان ہو گیا ہے۔ چھت پر دو سو اسی (۲۸۰) جگمگاتے ستارے بنائے گئے تھے۔ علاوہ ازیں چھت مختلف چوبی پٹیوں سے آراستہ تھی اور ہر پٹی پر نقش و نگار کا انداز مختلف تھا۔ مسجد کے وسط میں فیصل مسجد (اسلام آباد) کی طرح ایک بہت بڑا سا جھاڑ معلق تھا جس میں بیک وقت ایک ہزار چراغ جلتے تھے۔ محراب اور اس سے متصل دیوار پر خالص سونے کا کام کیا گیا تھا۔

امیر عبدالرحمٰن الداخل کے انتقال کے بعد ہشام مسند امارت پر متمکن ہوا، اس نے بھی مسجد کی تعمیر کا کام جاری رکھا۔ اس نے اپنے سات سالہ دور حکومت میں تمام مال غنیمت کا خمس مسجد کی تعمیر پر صرف کر دیا۔ اس مسجد کا عظیم مینار جو چہار پہلو تھا، اسی کے زمانے میں تعمیر ہوا۔ اس مینار کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہوتا تھا۔ اس یکتائے روزگار مسجد کی تعمیر پر سال نہیں صدیاں خرچ ہوئیں۔ ہر حکمران نے اپنی اپنی بساط اور ذوق کے مطابق اس پر بے دریغ روپیہ صرف کیا۔ ہزاروں مزدوروں اور سیکڑوں ماہرین فن تعمیر نے اس شاندار مسجد کی تزئین و آرائش کے ضمن میں اپنی کوشش اور جدوجہد کے مطابق حصہ لیا۔ تب کہیں جا کر اس کو وہ مقام حاصل ہوا جو بہت کم عمارتوں کو حاصل ہوتا ہے۔

مسجد میں داخل ہونے کے بعد آدمی کی نظر کا مرکز محراب و منبر ہوتے ہیں۔ مسجد قرطبہ کی محراب سنگ مرمر سے تیار کی گئی تھی۔ وہ سنگ مرمر دودھ سے زیادہ سفید، اجلا اور برف سے زیادہ چمکیلا تھا۔ صناعوں اور ماہرین تعمیر نے اسے ہفت پہلو کمرہ بنا دیا تھا جس کے اندر نہایت خوبصورت گل کاری کی گئی تھی۔ اس محراب پر قوس کی شکل میں پچی کاری کے ذریعے خوبصورت رنگین نقش و نگار بنائے گئے تھے جس کے گرداگرد کوفی رسم الخط میں قرآنی آیات لکھی گئی تھیں۔ محراب کے قریب قبلہ کی دیوار نے تین عظیم قبوں کو تھام رکھا ہے۔ قبلہ کی دیوار کے ساتھ جو دروازہ ''ساباط'' پر بنایا گیا ہے، اس کی جانب وہ منبر تھا جو خوشبودار اور نہایت قیمتی لکڑی کے ۳۶ ہزار ٹکڑوں سے بنایا گیا تھا۔ ٹکڑوں کو باہم جوڑنے کے لیے سونے اور چاندی کے کیل لگائے گئے تھے۔ ابن بشکوال کے بقول لکڑی کے ہر ٹکڑے پر سات درہم نقرئی خرچ آئے تھے۔ یہ منبر آٹھ ماہرین نے سات سال کی طویل مدت میں مکمل کیا تھا۔ منبر کو جواہرات سے بھی مرصع کیا گیا تھا۔ زمانے کے انقلابات اور گردش کی دست برد سے اگر مسجد قرطبہ کا کوئی حصہ صحیح حالت میں محفوظ رہ سکا ہے تو وہ یہی محراب ہے جس کی چمک اور تابانی آج بھی دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔

امیر عبدالرحمٰن الداخل اور امیر ہشام کے عہد حکومت میں جو ستون مسجد قرطبہ میں استعمال کیے گئے وہ یا تو قرطاجنہ سے لائے گئے تھے یا اربونہ اور اشبیلیہ سے لیکن یہ ستون تعداد میں اس قدر زیادہ نہ تھے کہ آئندہ کی تمام ضروریات کو پورا کر سکتے۔ لہٰذا خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے اندلسی سنگ مرمر سے مختلف رنگوں کے ستون

ترشوائے۔ سنگ مرمر کے یہ ستون مختلف رنگوں کے ہیں۔ مجموعی طور پر ان کی تعداد چودہ سو ہے۔ ان ستونوں پر نعلی محرابیں اس طرح بنائی گئی ہیں کہ یہ ستون کھجور کے تنے اور ان پر بنے ہوئے چھوٹے بڑے محراب کھجور کی شاخیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ کام کچھ اس طرح کیا گیا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دیکھنے والا کسی دل فریب نخلستان میں کھڑا ہے اور اس کے سامنے ہزار ہا کھجور کے درخت صف بستہ کھڑے ہیں۔ اسی چیز کو دیکھ کر علامہ اقبال نے کہا تھا:

تیری بنا پائدار، تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل

مسجد کے دروازوں کی تعداد پہلے نو تھی پھر مسجد کی وسعت کے سبب سے اکیس (۲۱) ہو گئی۔ نو دروازے جانب مشرق اور نو بجانب مغرب تھے۔ ان میں سے آٹھ دروازے مردوں کے لیے اور ایک ایک دروازہ ہر دو طرف عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ شمال کی جانب تین دروازے تھے۔ جنوب کی طرف سونے کے کواڑوں والا ایک بڑا دروازہ بھی تھا جو قصر خلافت سے ملانے والی ''ساباط'' نامی مسقّف گزرگاہ پر بنا ہوا تھا۔ اسی راستے سے گزر کر اندلس کے امراء مقصورہ میں داخل ہوتے تھے۔ ساباط کے دروازے کی محراب پر نہایت خوبصورت پچی کاری کا کام کیا گیا تھا۔

مسجد میں فانوسوں کی روشنی کے باعث رات کو بھی دن کا گمان گزرتا تھا۔ اگرچہ اس میں جلنے والے چراغوں کی صحیح تعداد تو کتابوں میں نہیں آئی، پھر بھی وہ ساڑھے سات ہزار سے کم نہ تھے۔ ایک سال میں ساڑھے تین سو من موم کے علاوہ تین سو من تیل جلایا جاتا تھا۔ ابتداء میں وضو کرنے کے لیے پانی باہر کے ایک کنویں سے پکھالوں کے ذریعے لا کر بھرا جاتا تھا۔ بعد میں الحکم نے چار وضو خانے بنوائے جن میں دو بڑے اور دو چھوٹے تھے۔ ان میں پانی بھرنے کے لیے جبل قرطبہ سے ایک پختہ نہر مسجد تک لائی گئی۔ اس کا پانی نہایت عمدہ اور شیریں تھا۔ مسجد کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بعد میں یہ پانی تین زمین دوز نالیوں کے ذریعے مسجد سے باہر نکل جاتا تھا۔

مسجد قرطبہ میں ایک مینار بھی ہشام اول نے بنایا تھا۔ یہ مینار چہار پہلو تھا اس کی بلندی عمارت کی مناسبت سے رکھی گئی تھی۔ عبدالرحمٰن الناصر نے اپنے عہد خلافت میں اس پرانے مینار کی جگہ دوسرا مینار بنوایا کیونکہ پہلے مینار کو زلزلے سے شدید نقصان پہنچا تھا۔ یہ نیا مینار کہیں زیادہ رفیع الشان تھا۔ اس مینار کی بلندی بہتر (۷۲) ہاتھ تھی۔ زمین سے چوّن (۵۴) ہاتھ کی بلندی پر اذان دینے کے لیے ایک جگہ (مُـئذِنَـه) بنایا گیا تھا جہاں مؤذن اذان دیتا تھا۔ اس مینار کے اوپر جانے کے لیے دو زینے بنائے گئے تھے۔ اذان دینے والے برج کے اوپر ایک کلس تھا جو سیب کی شکل کے تین گولوں پر مشتمل تھا جو ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے درمیان کا گولا چاندی کا اور دوسرے دونوں سونے کے تھے۔ ان گولوں کے اوپر چھ پنکھڑیوں والا

سوسن کا پھول تھا جس پر ایک نہایت خوبصورت سونے کا انار بنا دیا گیا تھا۔ اسی مینارے کے بارے میں اقبال مرحوم نے فرمایا ہے ؎

تیرے درو بام پر وادیٔ ایمن کا نور
تیرا منار بلند جلوہ گہ جبرئیل

دیوار قبلہ سے متصل دالان کے گیارہ دروں میں سے درمیان کے پانچ دروں کو گھیر کر الحکم نے ایک مقصورہ بنایا تھا۔ اس مقصورے کا فرش مسجد کے فرش سے کسی قدر اونچا تھا۔ اس میں داخل ہونے کے تین دروازے تھے۔ ایک دروازہ دیوار قبلہ میں جبکہ ایک ایک دروازہ مشرق اور مغرب میں تھا۔ اس مقصورے کا فرش چاندی کا تھا جبکہ دیواروں پر بلور کے ٹکڑوں اور قیمتی رنگین نگینوں سے جڑاؤ کا کام کیا گیا تھا۔ مقصورے میں ایک ستون کی جگہ چار ستون کھڑے کر کے ان پر متعدد جہتوں والے محراب بنائے گئے تھے۔ ان ستونوں پر اوپر سے نیچے تک فیروزے جڑ کر سونے کے پھول بوٹے بنائے گئے تھے۔

وادیٔ الکبیر کا پل:

قرطبہ کے آثار قدیمہ میں ایک دریائے وادیٔ الکبیر کا پل بھی ہے۔ جو اگرچہ رومیوں کے عہد میں تعمیر کیا گیا تھا، لیکن بعد میں اس اسمح بن مالک الخولانی نے اسے از سر نو مضبوط بنیادوں پر تعمیر کیا۔ عبدالرحمٰن الداخل نے اس پل پر خاص توجہ دی اور زر کثیر خرچ کر کے اسے نہایت مضبوط کیا۔ بعد میں الحکم الثانی نے اس پر سب سے زیادہ رقم خرچ کی اور اس کی مضبوطی کے ساتھ ساتھ اس کی تزئین اور آرائش بھی کی۔ یہ پل مسجد قرطبہ کے قریب ہی واقع ہے۔

مینار اور قصر اشبیلیہ:

اشبیلیہ میں دو عمارتیں خصوصاً مسلمانوں کے طرز تعمیر کی یادگار ہیں۔ ایک تو ''قصر اشبیلیہ'' ہے جو موحدین کے دور حکومت میں تعمیر ہوا۔ یہ قصر طرز تعمیر میں الحمرا کے مشابہ ہے لیکن خوبصورتی اور نفاست میں الحمرا اس سے بہت بڑھ کر ہے۔

اشبیلیہ میں دوسری یادگار عمارت اس کا مینار ہے جو شاید کسی مسجد کا حصہ تھا۔ مسجد کا وجود تو عیسائیوں نے ختم کر دیا ہوا ہے البتہ مینار کے آثار موجود ہیں۔ اس مینار کی وجہ شہرت اس کی دیواروں کی وہ تزئین و آرائش ہے جس پر اندلس کے ماہرین تعمیرات نے اپنی صناعی کے جوہر اور کمالات دکھائے تھے۔

قصر الزہرا:

قرطبہ کی نادرۂ روزگار عمارتوں میں ایک ''قصر الزہرا'' تھا جو خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے ۹۳۶ء میں اپنی

چہیتی نومسلم بیوی الزہرا کی فرمائش پر تعمیر کرانا شروع کیا تھا۔ اس کی تعمیر خلیفہ الحکم ثانی کے عہد میں بھی جاری رہی اور اس طرح چالیس برس کے اندر اس کی تکمیل ہوئی۔ یہ قرطبہ سے چار میل کے فاصلے پر تعمیر کرایا گیا تھا۔ یہ قصر نہیں تھا بلکہ ایک چھوٹا سا شہر تھا جو قریباً سات فرلانگ طویل اور پانچ فرلانگ عریض رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ اس وجہ سے یہ محل کے بجائے ایک شہر تھا۔ چنانچہ بعض حضرات اسے ''قصر الزہرا'' کے بجائے ''مدینۃ الزہرا'' کے نام سے پکارتے ہیں۔

اس مدینۃ الزہرا میں شاہی محل کی عمارت سب سے زیادہ پرتکلف اور وسیع تھی۔ اس محل کے دو حصے تھے۔ ایک کا نام مجلس مونس تھا اور دوسرا قصر الخلفاء کہلاتا تھا۔ قصر الخلفاء کی چھت اور دیواریں سونے اور شفاف سرمر کی تھیں۔ چھت کے اوپر کی پوشش خالص سونے اور چاندی کے کھپروں کی تھی۔ اس ایوان کے وسط میں پارے سے بھرا ہوا ایک حوض تھا۔ ایوان کے ہر ضلع میں آٹھ آٹھ محرابوں والے در تھے جن میں کواڑ لگے ہوئے تھے۔ کواڑ آبنوس اور ہاتھی دانت کے تھے جن کو جواہرات سے مرصع کیا گیا تھا۔ جس وقت ایوان میں دھوپ آتی تو حوض میں بھرے پارے سے منعکس ہو کر چھت اور دیواروں کو اس قدر روشن کر دیتی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔

مدینۃ الزھرا میں اس شاہی محل کے علاوہ ایک جامع مسجد بھی تھی جو قصر شاہی سے کسی طرح کم نہ تھی۔ یہ مسجد صرف اڑتالیس (۴۸) دنوں میں تیار ہوئی تھی۔ مسجد کا ہر حصہ نہایت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ مسجد کے صحن میں ایک حوض اور فوارہ نصب تھا۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا چہار پہلو مینار بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ ان اہم عمارتوں کے علاوہ مدینۃ الزھرا میں حمام،، سرائیں، مدرسے، بازار اور دیگر عمارتیں بھی لاجواب اور بے مثال تھیں۔ مورخین نے لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن ناصر کے عہد حکومت کے ۲۵ برسوں میں اس کی تعمیر پر ملک کی سالانہ آمدنی کا ایک تہائی خرچ کیا جاتا رہا جب کہ الحکم ثانی کے دور حکومت میں بھی ۱۵ سال تک اس میں زر کثیر سے اضافے کیے جاتے رہے۔

یہ شہر واقعی جنت نظیر تھا۔ اس کو خوابوں کا شہر کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ دنیا جہاں کی خوب صورتی اس شہر میں موجود تھی۔ صاف ستھری نہریں، سرسبز و پرفضا باغات، کشادہ سڑکیں غرض شہر کیا تھا جنت کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھا لیکن یہ شہر جس کی تعمیر پر ۴۰ سال لگے، اس کی بربادی پر بہت ہی کم وقت صرف ہوا۔ اسے صرف چالیس سال قصر خلافت کی حیثیت حاصل رہی۔ پہلے تو الحاجب المنصور نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد اس کے بجائے ایک نیا ''قصر الزاھرہ'' کے نام سے تعمیر کرا کر اسے قصر خلافت قرار دے دیا۔ بعد ازاں بربروں کی بغاوتوں کے نتیجے میں پھیلنے والی طوائف الملوکی نے اس کو تباہ و برباد کیا۔ اور سب سے آخر میں عیسائیوں کی بربریت اور تمدن دشمنی نے اس کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا۔

قصر الحمرا:

مسلمانوں نے اپنے آٹھ سو سالہ دور حکومت میں سرزمین اندلس میں جو یادگاریں چھوڑیں ان میں قصر الحمرا کو مسلمانوں کے اس پورے دور حکومت کا نچوڑ کہا جائے تو جھوٹ اور مبالغہ نہیں ہوگا۔ الحمرا کی عمارتیں اپنے عہد کے فن تعمیر کا انتہائی ترقی یافتہ نمونہ ہیں اگرچہ غرناطہ کے قریب سبیکہ نامی پہاڑی پر الحمرا نامی قلعے کا ذکر نویں صدی عیسوی میں بھی ملتا ہے لیکن شاہی رہائش گاہ کے طور پر یہ ناصری خاندان کے بانی محمد الاحمر کے برسر اقتدار آنے کے بعد تیرھویں صدی عیسوی میں جا کر کہیں منصۂ شہود پر آیا۔

دائرۃ المعارف الاسلامیہ، لاہور کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ اندلس کے شہر غرناطہ کا مشہور قلعہ جس کا ذکر سب سے پہلے چھٹے اموی فرماں روا امیر عبداللہ کے عہد میں ملتا ہے (۲۷۷ھ/۱۶۸۹ء) اسی جگہ بنو الاحمر کے پہلے بادشاہ محمد بن الاحمر نے ایک قصر تعمیر کرانا شروع کیا (۶۲۹ھ/۱۲۳۲ء) اور اس کے تیار ہونے پر اس کی اولاد نے اسی میں سکونت رکھی۔ اس کے اخلاف میں سے ابو عبداللہ محمد ثالث (۷۰۱ھ/۱۳۰۲ء تا ۷۰۸ھ/۲۳۰۹ء) ابوالحجاج یوسف (اول ۷۳۳ھ/۱۳۳۰ء تا ۷۵۰ھ/۱۳۵۴ء) اور محمد خامس (۷۵۵ھ/۱۳۵۴ء تا ۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء) نے اس قصر کو وسیع و عریض کیا اور عمارتوں میں طرح طرح کے تکلفات پیدا کیے۔ یہ قصر نویں صدی ہجری/ پندرھویں صدی عیسوی کے آخر تک ان بادشاہوں کے عروج و زوال کا شاہد رہا اور پھر ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء میں عیسائیوں کے قبضے میں آ گیا۔

سنہ ۱۲۳۸ء میں محمد الاحمر نے سلطنت غرناطہ کے تخت پر متمکن ہوتے ہی اس قلعے کو اپنی رہائش کے لیے منتخب کیا اور اسے مرمت کرانے کے ساتھ ساتھ کچھ جدید عمارتوں کی تعمیر بھی شروع کر دی جن کی تکمیل اس کے بیٹے محمد الثانی کے دور حکومت میں ہوئی۔ البتہ الحمرا کے شاہی محلات کی تعمیر کی ابتداء کا سہرا اسی خاندان کے یوسف الاول کے سر ہے جس نے چودھویں صدی عیسوی کی چوتھی دہائی میں یہاں پر ''ایوان ہائے قمارش'' اور ''باب العدل'' کے علاوہ چند مینار اور حمام تعمیر کرائے تھے۔ الحمرا کی زیادہ تر عمارتیں محمد الخامس کے عہد کی یادگار ہیں جس نے نہ صرف پہلے ہی تعمیر شدہ ایوانوں کی تزئین و آرائش کا کام مکمل کرایا بلکہ ''ساحۃ السباع'' اور اس سے ملحق عمارتیں بھی اسی نے تعمیر کرائی تھیں۔

الحمرا سے چند شاہی محلات پر مشتمل قصر مراد لینا ہی درست نہ ہوگا بلکہ حقیقت میں یہ ایک وسیع و عریض باغات پر مشتمل ایک بیرون شہر اقامت گاہ تھی جس کی تعمیر پر بے انتہا رقم خرچ ہوئی تھی۔ اس میں عظمت و شوکت اور تخیل کا ایک نہایت عجیب و غریب امتیاز پایا جاتا ہے۔ الحمرا کی عمارتیں اسلامی فن تعمیر کے دیگر نمونوں کے برعکس بظاہر فرسودگی پذیر مسالے سے بنی ہوئی نظر آتی ہیں اور اپنی تمام تر تزئین و آرائش کے باوجود غیر مستحکم تعمیراتی سامان سے تعمیر ہونے والی عمارتوں کی عمدہ مثال قرار دی جاتی ہیں، لیکن الحمرا کا صدیوں سے حوادث

زمانہ کا مقابلہ کرتے چلے آنا اور بعض دیگر عمارتوں کی طرح صفحہ ہستی سے ناپید نہ ہونا اس خیال کی تردید کے لیے کافی ہے، لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی تعمیر میں ٹھوس اور پائیدار عمارتی سامان کا استعمال بہت ہی کم ہوا ہے۔ اس کی تعمیر میں اینٹیں، لکڑی، گچ اور پانی کے سوا کسی اور چیز کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ عمارت مسلمانان اندلس کے دور انحطاط کی یادگار ہے جب مسلمانوں کی حکومت سارے اندلس سے سمٹ سمٹا کر صرف غرناطہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسی صورت میں ان کے لیے تعمیراتی پتھر، سنگ مرمر یا اس طرح کی دوسری اعلیٰ قسم کی تعمیراتی اشیاء باہر سے منگوانا اگرچہ ناممکن نہیں تھا لیکن مشکل ضرور تھا۔ اس لیے وہاں کے ماہرین تعمیرات نے وہاں پر دستیاب اشیاء ہی کو اپنی فنی صلاحیتوں کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور دنیا کے لیے ایک ایسا شاہکار چھوڑ گئے جو عجائبات عالم میں شمار ہوتا ہے اور ہر سال لاکھوں سیاح اس کو دیکھ کر اور اس کی پائنداری اور تزئین و آرائش کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔

الحمرا جو ۲۲۰۰ (بائیس سو) میٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے، اپنی فصیل اور بائیس برجوں کی وجہ سے ایک قلعہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ قصر دو تین مقامات پر شہر غرناطہ سے ملا ہوا ہونے کے باوجود اس سے جداگانہ حیثیت کا حامل ہے کیونکہ بیرونی دنیا سے اس کا براہ راست رابطہ موجود تھا۔ اس میں داخل ہونے کے لیے چار بڑے بڑے گیٹ تھے جن میں سے سب سے قدیم اور اہم دروازہ باب الشریعۃ کہلاتا ہے جو جنوب مغرب کی جانب واقع ہے۔

غرناطہ کے قصر جو ایک پہاڑ پر واقع ہے جس کے گرد مدور اندی شنیل سے جا ملنے سے ذرا قوس بناتی ہوئی بہتی ہے۔ اس قوس کا کھلا ہوا رخ جنوب مشرقی سمت میں ہے۔ اس کے عربی نام الحمرا (سرخ چیز) کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کی تعمیر میں زیادہ تر چکنی مٹی، چونے اور بجری سے مرکب قسم کی گچ استعمال ہوئی ہے۔

بدقسمتی سے موروں کے اس بالاحصار کی تاریخ کے بارے میں بہت ہی تھوڑی معلومات کتابوں میں ملتی ہیں۔ قصر غرناطہ کی عمارات پہاڑی پر پہلی بار کب تعمیر ہوئیں اور کس نے تعمیر کرائیں، اس کے بارے میں کوئی روایت کتابوں میں نہیں ملتی۔ یہ نام پہلی مرتبہ ایک واقعۂ جنگ کے سلسلے میں سننے میں آتا ہے اور وہ یوں کہ ۲۷۷ھ/ ۸۹۰ء میں اموی فرمان روا عبداللہ کے عہد حکومت میں اندلس کے باغی مرتدوں نے عرب سردار سوّار کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے بنوقیس کے عربوں کے ساتھ الحمرا سے پسپا ہو جائے۔ پھر ان عربوں نے نکل کر بہادرانہ اور جرأت مندانہ حملہ کیا اور اس کے ساتھ ایسی جنگی چال کی کہ وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ۶۲۹ھ/ ۱۲۳۲ء میں بنونصر یا بنوالاحمر کے ظہور کے ساتھ الحمرا کی تاریخ اتنی غیر واضح نہیں رہتی۔ بنونصر نے ایک خود مختار امارت قائم کی اور غرناطہ کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ اسی حکومت کے مؤسس محمد الاول بن الاحمر نے پہاڑی پر یہ شہرہ آفاق قصر تعمیر کرایا جس کی بیرونی دیوار اور قلعہ ممکن ہے کہ پہلے سے موجود ہو۔ وہ اور اس کے جانشین اسی قصر میں سکونت پذیر رہے۔ قصر اور دیگر عمارات کی توسیع اور تزئین کے لیے اس کے جانشینوں نے بہت کام کیا جو اس بارے میں خاص طور پر تعریف کے مستحق ہیں۔

بنونصر کے خاندانی تنازعات کے سلسلے میں اس قلعے نے بارہا حصہ لیا۔ ۷۵۹ھ/۱۳۶۰ء میں اسماعیل ثانی کے ایک رشتہ دار ابوعبداللہ محمد نے اسے الحمرا میں محصور کیا۔ قلعہ فتح کیا، اسماعیل کو موت کے گھاٹ اتارا اور محمد السادس کا لقب اختیار کر کے تخت پر خود متمکن ہوگیا۔ سچی بات یہ ہے کہ خاندان بنی نصر کے عروج و زوال کا سارا کھیل الحمرا ہی میں کھیلا گیا۔ ۲/جنوری ۱۴۹۲ء کی صبح کو ڈون پیڈرو ڈی مینڈوزا نامی لاٹ پادری نے القصبہ کے دیدبان پر جو اس کا سب سے بلند برج تھا، نقرئی صلیب نصب کی جو سرزمین اندلس میں مسلمانوں کی آخری حکومت کے خاتمے کا نشان تھی۔ معزول سلطان ابوعبداللہ محمد الحادی عشر (یازدہم) نے جلاوطنی اختیار کی اور رخصت ہوتے وقت بادول کی پہاڑی سے آباء واجداد کے اس قصر پر ایک حسرت ناک نظر ڈالی۔ ''یہ مقام آج تک مور کی آخری آہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ الحمرا کے بعد کی تاریخ کے بارے میں اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ چارلس پنجم نے ''قاعۃ الریحان'' سے ملحقہ چھوٹی مسجد کو گرجے میں تبدیل کر دیا اور جنوبی بازو کو جس میں غالباً بڑا کمانچہ بھی شامل تھا، منہدم کر کے قدیم قصر شاہی کی صورت کو اور بھی مسخ کر ڈالا۔ اس نے اس سے بھی بڑا ستم یہ کیا کہ اس کی جگہ دور احیاء (Renaissance) کے طرز کی ایک عمارت تعمیر کر دی جو پرانی عمارتوں کے مقابلے میں بالکل بے محل نظر آتی تھی۔ اگرچہ عمارت کی بے حرمتی کا یہ عمل پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا اور اسی طرح مسلمانوں کے قصر کے دیگر حصوں کی بحالی کے لیے بعد میں اہل اندلس نے جو اقدام کیے وہ بھی پوری طرح عمل میں نہ آئے۔ تاہم مذہب کے نام پر بربریت کا ایک اور کارنامہ کامیابی سے انجام پا گیا اور وہ یہ کہ محمد الثالث کی بڑی مسجد زمین بوس کر کے اس کی جگہ سینٹ ماریہ کا کلیسا تعمیر کر دیا گیا۔ یہ کام ۱۵۸۱ء میں جوان ڈی ویجا (Juan de Vega) نے کیا۔

الحمرا کی تزئین و آرائش کے کام کے منصوبہ سازوں نے کوئی نئی راہ ایجاد نہیں کی تھی۔ اس کی آرائش کا کام کثیر الاضلاع اشکال، طغرائی شکل کے گل بوٹوں اور کتبات سے لیا گیا ہے۔ ٹائلوں کے کام میں اصول ہندسہ کے زاویوں کا محیر العقول استعمال کاریگروں کے حسن تخیل کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ الحمرا کے ہر حصے میں یہ ہندسی اشکال اس حصے کے مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتی ہے جو علامتی طور پر اختیار کیے گئے ہیں۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھیں کہ قاعۃ العدل میں جو ہندسی اشکال ہیں ان کے مرکز میں ایک آفتاب نما دائرہ ہے جس سے پھوٹنے والی عدل و انصاف کی کرنیں اردگرد کو اپنے احاطہ میں لیتی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح ہر حصہ میں تحریر آیات و احادیث، دعائیں، اشعار اور دیگر عربی عبارتیں مکمل طور پر اس حصہ کے مقاصد کی ترجمانی کرتی ہیں۔ البتہ بنوالاحمر کا خاندانی شعار ''ولا غالب الا اللہ'' ہر حصے میں تحریر کیا گیا ہے۔ گنبدوں میں لاجوردی، سنہرا اور ارغوانی کام اس مہارت، نفاست اور خوبصورتی سے کیا گیا ہے کہ ہیرے جواہرات کا دھوکہ ہوتا ہے۔ الحمرا کے نازک ستون کہیں پر اکہرے ہیں اور کہیں پر دوہرے۔ کسی پر نقش و نگار ہیں تو کوئی سادہ۔ ستونوں کے تاج جن قاعدوں پر استوار ہیں وہ مدور ہیں اور انھیں لہردار نقش و نگار سے مزین کیا گیا ہے۔

آرائشی کام کی کثرت اور خوبصورت نقاشی اور گل کاری کے لحاظ سے الحمرا کا سب سے مشہور اور عدیم المثال حصہ ''دیوان الاسد'' یا ''بیت الاسود'' ہے۔ اس کے وسط میں ایک حوض ہے جس کے اطراف میں بارہ شیر بنے ہوئے ہیں جن کے منہ سے پانی کی دھاریں گرتی ہیں۔ شیروں کے اس حوض کے اردگرد کی تزئین و آرائش کا مقابلہ الحمرا کا اگر کوئی اور حصہ کر سکتا ہے تو وہ اس سے ملحق ''قاعۃ العدل'' ہے۔ یہ دونوں حصے آرائش کے اعتبار سے ایک نہایت ممتاز مقام کے حامل ہیں۔

الحمرا اور اس سے ملحق حماموں اور باغوں کے لیے پانی کا حصول اس طریق کار کی مرہون منت تھا جسے پختہ نالیوں کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے جو پختہ نالیاں تعمیر کی جاتی تھیں انھیں ضرورت کے مطابق پلوں پر سے گزارا جاتا تھا تاکہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک آب رواں کی رسائی اور روانی میں نشیبی علاقے، وادیاں اور کھائیوں کی پستیاں رکاوٹ نہ بنیں۔ اس طرح سبیکہ کی پہاڑی سے ان نہروں کے ذریعے الحمرا کو وافر پانی کی ترسیل ہمہ وقت جاری رہتی تھی۔ الحمرا کی عمارتوں کو ان کی بناوٹ اور خصوصیات کی بنیاد پر تین ایسے بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جن کی حد بندی ممکن ہے۔

ان میں پہلا حصہ وہ ہے جو دار الشوریٰ یا دار العوام کہلاتا تھا۔ جس میں ہر شخص کو جانے کی اجازت تھی۔ یہیں پر بیٹھ کر سلطان لوگوں کی دادرسی کیا کرتا تھا۔ اس حصے میں ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی تھی جس کی محراب کے آثار اب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس پر یہ الفاظ تحریر ہیں ''اہل غفلت میں شامل نہ رہ اور نماز پڑھ۔''

دوسرا حصہ دیوان خاص ہے جہاں معزز مہمانوں اور حکمرانوں کا استقبال کیا جاتا تھا، اور یہی حصہ بادشاہ کی تخت گاہ تھا۔ یہ حصہ فناء الریحان اور اس سے ملحق عمارتوں پر مشتمل ہے جو تقریباً ۳۷ میٹر لمبا اور ۲۴ میٹر چوڑا ایک مستطیل احاطہ ہے۔ اس کے وسط میں تقریباً ۲۴ میٹر طویل اور سات میٹر چوڑا تالاب ہے جس کے گردا گرد مہندی کے پودے لگائے گئے ہیں۔ اسی تالاب کے باعث یہ حصہ ''ساحۃ البرکہ'' کہلاتا ہے جب کہ مہندی کے پودوں کی مناسبت سے اسے ''فناء الریحان'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے شمال میں الحمرا کا سب سے بڑا اور بلند ترین ''برج قمارش'' واقع ہے جس کی بلندی ۴۵ میٹر ہے۔ اس برج میں ''قاعۃ السفراء'' واقع ہے جس میں داخل ہونے کے لیے ''البرکہ'' نامی ہال میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس حصے کی سب سے مزین اور منقش عمارت یہی ''قاعۃ السفراء'' ہے جس کا گنبد سیاہ دیودار کی لکڑی کا بنا ہوا خوب صورت چوب کاری کا شاہکار ہے۔

تیسرا حصہ ''فناء الاسود'' یا ''ساحۃ السباع'' ہے جس کے وسط میں شیروں والا فوارہ نصب ہے جس کا ذکر گذشتہ سطور میں بھی کیا گیا ہے۔ یہ محمد الخامس کا تعمیر کردہ شاہی حرم سرا ہے۔ یہ حصہ پورے غرناطہ میں مسلم فن تعمیر اور آرائش کا سب سے خوبصورت شاہکار ہے۔

سنگ مرمر کا مرکزی فوارہ ۱۲ شیروں پر ایستادہ ہے جن کے منہ سے پانی کی دھاریں تالاب میں گرتی ہیں۔ فوارے کے حوض کے بالائی کنارے کے چاروں طرف ابن زمرک کا ایک خوب صورت قصیدہ تحریر ہے۔

فوارے کے صحن کے اردگرد ۱۲۴ ستونوں کا نخلستان واقع ہے جن کے عقب میں چار بڑے بڑے ہال ہیں۔ یہ تو تھا شاہی محلات اور ملحقہ عمارتوں کا ایک اجمالی تذکرہ۔ الحمرا میں کچھ باغات بھی تھے جو الحمرا کے لیے بمنزلہ روح کے تھے۔ یوں تو الحمرا کے ہر حصے میں مختلف قسم کے پودے، درخت اور پھول لگائے گئے تھے لیکن ان باغات میں سب سے زیادہ خوبصورت باغ ''جنت العریف'' تھا جو الحمرا کی حدود سے باہر ہونے کے باوجود اس کا حصہ شمار ہوتا تھا۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

الحمرا کی علیحدہ علیحدہ عمارات کی تاریخ کے بارے میں ہماری معلومات اور بھی کم ہیں۔ ایسے کتبات موجود ہیں جن پر اسماء اور تاریخیں درج ہیں، لیکن ان میں سے بیشتر کا تعلق عمارات کی تزئین سے معلوم ہوتا ہے نہ کی اصل تعمیر سے۔ ۷۴۹ھ میں یوسف الاول نے بیرونی دیوار کو جس کا محیط دو میل اور اس میں متعدد برج نکلے ہوئے تھے، توڑ کر ایک دروازہ ''باب العدل'' بنایا۔ اس کی وجہ تسمیہ غالباً یہ ہے کہ یہاں قدیم مشرقی دستور کے مطابق خود بادشاہ دادرسی کیا کرتے تھے۔ اس سے آگے ''مکان الصهاريج'' (حوضوں کا مقام) میں ایک اور چھوٹا دروازہ قائم ہے جسے آج کل ''باب السنبيذ'' کے نام سے پکارتے تھے۔ اس کے پتھر پر محمد الخامس کا نام کندہ ہے۔ اگر ہم اس دروازے میں کھڑے ہو کر نظر ڈالیں تو بائیں ہاتھ پر القصبہ کا منظر دکھائی دیتا ہے اور دائیں طرف قصر کا۔ اول الذکر یعنی القصبہ سطح مرتفع کے انتہائی مغربی کونے پر واقع ہے، اور یہاں کی موجودہ عمارات میں غالباً قدیم ترین یہی ہے۔ آخر الذکر یعنی القصر متعدد عمارتوں پر مشتمل ہے اور چارلس پنجم کی بنائی ہوئی عمارتوں کے سوا یہ سب حسب ذیل دو وسیع صحنوں کے گرد جمع ہو گئی ہیں۔ قاعة البركہ، قاعة الريحان، قاعة السباع اور اس کے قریب ''ساحة الاختين'' (دو بہنوں کا ایوان) اور ''ساحة بنی سراج'' (یعنی بن سراج کا دالان) یعنی شاہان غرناطہ کے مقبرے (جو اب بالکل تباہ و برباد ہو چکے ہیں) اور ''ساحة القضا'' وغیرہ واقع ہیں۔ کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ عمارتوں کے اول الذکر مجموعے کی تزئین و آرائش یوسف الاول نے کی تھی اور آگے کی مشرقی عمارتوں کی، جو قاعة السباع کے گرد واقع ہیں محمد الخامس نے کی تھی۔ قصر الحمرا کے جنوب میں جہاں اب سینٹ ماریہ کا کنیسہ ہے وہاں اس سے پہلے ایک بڑی مسجد واقع تھی جسے لسان الدین ابن الخطیب کے قول کے مطابق محمد الثالث نے اپنے عہد کے آخری ایام میں تعمیر کرایا تھا اور اسے نہایت دریا دلی سے مزین کرنے کے لیے اس نے جزیے کی ساری رقم اس پر صرف کر دی تھی۔ علاوہ ازیں اس نے حمام بھی تیار کروائے اور مسجد کے لیے وقف کر دیے۔

الحمرا کی عمارت فرسودگی پذیر مسالے سے بنی نظر آتی ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ یہ عمارت آج تک سلامت کیسے رہ گئی۔ قاہرہ کی مسجد حسن جو ۱۳۵۶ء اور ۱۳۵۹ء کے درمیان بنائی گئی تھی، یہ ایک ایسے طرز تعمیر کا نمونہ ہے جس کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں لیکن الحمرا کی عمارت بالکل بے مثال ہے۔ الحمرا کا ذکر کرتے ہوئے بالعموم اسے ایک عمارت بتایا جاتا ہے لیکن یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ ایک بیرون شہر اقامت گاہ تھی جو وسیع

باغات اور چمن زاروں کے درمیان تعمیر کی گئی تھی۔ اس مقام سے لے کر جہاں اب چارلس پنجم کا محل ان عمارات کے اصل نقشے میں دخل در معقولات بنا کھڑا ہے، مغرب میں القصبہ تک نیز قلعے کی چار دیواری کے اندر مشرقی سطح مرتفع تک، جہاں سے اب سینٹ فرانسیس کی خانقاہ شروع ہوتی ہے، یہ سارا وسیع و عریض رقبہ اپنے پودوں، فواروں اور حیوانات کے باعث ارضی بہشت تصور کیا جانا چاہیے۔ اس کے بعد یہ بات ہماری سمجھ میں آ سکے گی کہ شمالی ڈھلان کی دیواروں پر جو برج بنے ہوئے ہیں، ان کے اندرونی حصے تک میں اسی تکلف سے نقش و نگار کیوں بنائے گئے تھے جو کہ خود محل کی زیب و زینت کا باعث ہیں؟

محل میں جو دالان ہیں جن کا ذکر ہم نے گذشتہ سطور میں کیا ہے، ان کے روایتی ناموں سے ان کے اصل مقصد پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ الحمرا معیاری نمونے کی ایک عمارت تھی اور چارلس پنجم کے ہاتھوں شہید شدہ اس مسجد کے علاوہ بقیہ عمارتوں اور صحنوں کے ضائع ہو جانے پر کف افسوس ملنے کی ضرورت نہیں۔ بدقسمتی سے الحمرا کے علاوہ اس طرز کا کوئی اور نمونہ ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا، اس لیے مسلمانوں کے فن تعمیر کی تحقیق کرنے والوں کو بے شمار محلوں اور قصروں کی کامل بربادی پر سخت قلق ہوتا ہے جنہیں دیکھ کر شعراء وجد میں آ جاتے تھے۔ اب ان عمارتوں کے بارے میں منتشر معلومات کو جمع کرنا اہل علم اور ماہرین لسانیات کا کام رہ گیا ہے۔ ہم صرف اُن آثار کا حال بیان کر سکتے ہیں جو ہمارے زمانے تک باقی رہ گئے ہیں۔ اموی محلات اور قصور جو سلامت ہیں، وہ الحمرا سے مشابہ نہیں۔

الحمرا کے آرائشی کام کا نقشہ بنانے والوں نے کوئی نئی راہ ایجاد نہیں کی تھی۔ ان میں حسب ذیل نقوش کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ عام کثیر الاضلاع اشکال جو دیواروں کے زیریں حصوں پر کثرت سے نظر آتی ہیں، اس کے اوپر کے حصوں پر طغرائی شکل کے گل بوٹے ہیں جو طاقچوں کی قطار تک جاتے ہیں، اور سب سے اوپر کتبات بھی ایسے ہیں جن میں آرائشی اور تزئینی کام کیا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں الحمرا کے کتبات بالخصوص اہمیت رکھتے ہیں، کیونکہ اس میں جابجا ناظرین کو بتایا گیا ہے کہ یہ آرائش کس مقصد کے لیے تھی۔ یہ بات بالخصوص قابل ذکر ہے کہ تاریخی کتبات اور قرآنی آیات کے مقابلے میں جن کے لکھنے کا معمول ہے، اس قسم کے کتبات الحمرا کے باہر شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ آثار قدیمہ اور فنون لطیفہ کے مؤرخ کے لیے یہ امر باعث دلچسپی ہوگا اگر اس نوع کے کتبات کی ابتداء کا صحیح تعین ہو جائے۔

جنت العریف:

جنت العریف غرناطہ کے بادشاہوں کی گرمائی رہائش گاہ اور نزہت گاہ تھی، جنہیں بنونصر کے بادشاہوں نے حقیقتاً جنت نظیر بنا دیا تھا۔ یہاں پر خوشبودار پودوں، خوب صورت اور خوش نما پھولوں، قسم قسم کے پھل دار درختوں اور سبز اور سدا بہار پودوں نے بے شمار تالابوں اور حوضوں کو گھیر رکھا تھا۔ اس شاہی باغ میں

داخل ہو کر تصنع اور بناوٹ کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوتا تھا، بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ انسان فطرت کی گود میں چلا آیا ہے، اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے قلب و دماغ میں پہاڑوں کی بلندیاں اور سمندروں کی وسعتیں لیے ہوئے ہے۔ وہ ہواؤں کی مانند لوگوں سے ٹکرائے بغیر ان کے درمیان سے گزر جانے والے ہیں، جو ستاروں اور سیاروں کی طرح خاموش سفر کرنا جانتے ہیں، جو سورج کی طرح اپنوں اور غیروں کے اوپر یکساں چمکنے والے ہیں، جو پھول کی طرح شہرت اور عزت سے بے نیاز ہو کر کھلنا جانتے ہیں، جو دریا کی مانند حسد اور نفرت سے یک قلم خالی ہو کر زمین کے سینے پر بہہ رہے ہیں، جو درخت کی طرح ساری کائنات کو اپنا غذائی دستر خوان بنا چکے ہیں، جو زمین پر پڑے ہوئے سایہ کی طرح کبر و غرور سے خالی ہو کر اپنے آپ کو اللہ رب العزت کے سامنے ڈال دینے والے ہیں۔ یہ اس باغ کی خوبی تھی اور ایسے ہی خوبیوں والے باغات بلکہ اس سے بہت بڑھ کر انسان کو جنت میں حاصل ہوں گے۔

جنت العریف کی روشیں اس قدر تنگ تھیں کہ ان پر سے بیک وقت دو آدمی مشکل ہی سے گزر سکتے تھے۔ اسی طرح وہ کمرے یا سائبان جہاں سے اردگرد کا نظارہ کیا جاتا تھا، بہت ہی چھوٹے چھوٹے اور مختصر سے رقبے پر پھیلے ہوئے تھے۔ گویا ہر شے کو اس کی فطری سادگی کے مطابق رہنے دیا گیا تھا۔

ماسینون کے قول کے مطابق یورپی باغات میں فطرت کی سادگی کو مٹا کر حسن و دل کشی پیدا کی جاتی ہے جب کہ اندلس میں عربوں کے باغات میں فطرت کی سادگی کو برقرار رکھنے پر زور دیا جاتا ہے۔ جنت العریف سے قصر الحمرا، شہر غرناطہ، اردگرد کے سرسبز و شاداب قطعات اور مضافات کا بھرپور نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ سلاطین غرناطہ اسی جگہ بیٹھ کر اپنی روزمرہ کی زندگی کی روانی کا مشاہدہ کرتے تھے۔ جگہ جگہ رواں دواں پانی کی جدولوں، آبشاروں اور حوضوں اور تالابوں نے اس شاہی باغ کو نہایت دل کش اور دل آویز نزہت گاہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ یہاں پر باغ کے مختلف حصے اوپر نیچے بنے ہوئے تھے۔ اوپر کے باغات سے پانی سیڑھیوں کے ساتھ آبشار کی صورت میں بہتا ہوا نیچے کے باغوں کو سیراب کرتا تھا یہاں تک کہ مرکزی تالاب کی لمبائی کے رخ پر دونوں طرف سفید سائبان تھے جب کہ شمالی اور جنوبی کناروں پر گچ کاری کے کام سے آراستہ دو خوبصورت پویلین بنائے گئے تھے۔ یہاں کے قریباً ہر کمرے میں سے پانی گزرتا تھا جس سے موسم گرما میں یہ کمرے ٹھنڈے رہتے تھے۔ تالاب کے گرداگرد مہندی اور گلاب کے پودے اور سرو اور مالٹے کے درخت آج بھی ایستادہ اپنے ماضی کی یاد دلا رہے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ غرناطہ کا وہ باغ جسے ابن زمرک نے غرناطہ کا تخت یا عرش قرار دیا تھا، اس کے حسن و جمال اور خوبصورتی اور تزئین و آرائش کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔ قرآن حکیم میں جنت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے، یہ باغ ہو بہو اس کی تفسیر نظر آتا تھا۔ وہی سرسبز و گنجان درخت، خوشبودار پھولوں سے لدے ہوئے پودے، ہر طرف صاف و شفاف پانی کی بے شمار نہریں اور جدولیں، لاتعداد حوض اور فوارے، دل کش روشیں

اور اردگرد خوبصورت عمارتیں ایسا منظر پیش کرتی تھیں کہ ایک انسان ان میں کھو کر فکر و غم سے یک قلم آزاد ہو جاتا تھا، اور سوائے سرخوشی اور شادمانی کے کیف آور لمحات کے اسے اور کچھ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔

مختصر یہ کہ ان محدود صفحات میں اندلس کے اسلامی فن تعمیر کی تفصیل کو سمونا ایک ناممکن سی بات ہے۔ ان چند صفحات میں ان کی صرف ایک جھلک دکھلانی مقصود تھی۔ ان عمارتوں میں سے اکثر و بیشتر کو عیسائی درندوں نے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہے۔ غارت گروں نے نہ صرف ان کا حسن لوٹا بلکہ ان کی اینٹیں اور بنیادیں بھی اکھاڑ کر لے گئے۔ جو چند عمارتیں باقی رہ گئی ہیں، وہ ان ظالموں اور غارت گروں کی ظالمانہ تاخت و تاراج کی المناک داستان سناتی نظر آتی ہیں۔ نفح الطیب میں مرقوم ہے کہ بنوامیہ کے زوال و انحطاط کے بعد اموی حکمرانوں کی بنائی ہوئی عمارتیں منہدم ہو چکی تھیں اب ان میں بجائے انسانوں کے جنگل کے درندے اور چرند و پرند رہتے تھے۔ ابوالحرم بن محمد بن جمہور، جو اموی دور حکومت کے آخری ایام میں حکومت قرطبہ کے منتظم رہے تھے، کا گزر ایک روز ان برباد شدہ عمارتوں کے پاس سے ہوا تو انھوں نے بڑی حسرت کے ساتھ یہ اشعار پڑھے:

قلت یوماً لدار قوم تفانوا این سکانك العزاز علینا

فاجابت هنا اقاموا قلیلاً ثم ساروا ولست اعلم اینا

(المقری، نفح الطیب: ۳۴۵/۱)

یعنی جو قوم آپس میں لڑ کر فنا ہو گئی تھی، میں نے ایک روز ان کے مسکن سے پوچھا:

”تیرے وہ مکین کہاں گئے جو ہمیں بہت ہی عزیز تھے؟ اس نے جواب دیا کہ چندے انھوں نے یہاں قیام کیا تھا، پھر وہ چلے گئے، میں نہیں جانتا کہ وہ کدھر گئے اور کہاں گئے۔“

ان اشعار میں ایک انسان کے لیے بڑی عبرت ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: ”یارسول اللہ ﷺ! سب سے بہتر مومن کون ہے؟“ فرمایا: ”جو اخلاق کے لحاظ سے سب سے بہتر ہو۔“ اس نے پھر پوچھا: ”سب سے عقل مند مومن کون ہے؟“ فرمایا: ”جو موت کو اکثر یاد کرے اور اس کے لیے پوری پوری تیاری کرے۔“ (ابن ماجہ، باب ۱۳، رقم ۴۲۵۹، حلیۃ الاولیاء: ۳۱۳/۱) ذہبی نے طبقات التہذیب میں اسے حدیث حسن کہا ہے۔

ایک اور حدیث آقائے نامدار ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد پیش آنے والے واقعات کے لیے تیاری کرے، اور عاجز اور کم عقل انسان وہ ہے جو اپنے نفس کا اتباع کرے اور اللہ تعالیٰ پر بڑی بڑی امیدیں باندھتا پھرے۔“ (ترمذی، رقم: ۲۴۹۵، ابن ماجہ، رقم: ۴۲۶۰، مسند احمد: ۱۲۴/۴)

امیدیں وہی شخص باندھتا ہے جس کی کتاب زندگی عمل سے یک قلم خالی ہو۔ اور پوری زندگی فسق و فجور اور طلب اقتدار میں گزری ہو۔ انھی لوگوں کے بارے میں امام حسن بصری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

''وہ لوگ جنہوں نے مغفرت کی خالی امیدیں باندھی ہوں گی اور عقل میں پسپا ہوں گے، وہ جب اس دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے دامن میں کوئی نیکی نہیں ہوگی (ومالھم حسنة) ایسے لوگوں میں سے ایک شخص یہ کہتا ہے کہ میرا حق تعالیٰ شانہ کے بارے میں بڑا حسن ظن ہے۔ وہ اپنے اس قول میں سراسر جھوٹا ہے کیونکہ اگر وہ اپنے رب کے بارے میں حسن ظن رکھتا تو اسے اپنے اعمال میں بھی حسن پیدا کرنا چاہیے تھا کیونکہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾

(فصلت ۴۱:۲۳)

''اور تمھارے اس گمان نے جو کہ تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا، تم کو برباد کیا پھر تم ابدی خسارے میں پڑ گئے۔''

موت کی یاد انسان میں اس دار فانی سے جانے کا شعور پیدا کرتی ہے اور دار آخرت اور دار باقی کی طرف اس کی توجہ منعطف کرتی ہے۔ کیونکہ انسان کی زندگی دو حالتوں سے خالی نہیں۔ یا تو وہ نہایت فارغ البال اور ہر قسم کی نعمتوں سے مالا مال ہونے کی حالت میں ہوگا، یا پھر نہایت تنگ دستی اور دنیوی نعمتوں سے محرومی کی حالت میں ہوگا۔ اگر ضیق اور تنگ دستی کی حالت میں ہوگا تو موت کی یاد اس کی تنگ دستی، محرومی اور فقر و فاقہ میں آسانی پیدا کرے گی کیونکہ موت کی تنگی اس دنیا کی تنگی سے نہایت سخت ہے۔ اور اگر وہ ناز و نعمت کی گود میں پرورش پا رہا ہوگا تو موت کی یاد اسے ضرور فخر و مباہات اور غرور و تکبر سے روکے رکھے گی۔ لہٰذا اقتدار حاصل کرنے والے مسلمان حکمرانوں اور اقتدار کی تمنا کرنے والوں یعنی دونوں گروہوں کو اگر موت کی یاد ہو تو مسلمان نکبت و ادبار کی پستی سے ابھر کر عروج و کمال کی رفعت پر متمکن ہو سکتے ہیں۔

اندلس کے عروج وزوال کی تاریخ

چودھویں صدی میں ایک عجیب انقلاب آ رہا تھا۔ یہ ایک انقلابی دور تھا۔ عالم عربی تنزل وانحطاط کی طرف جا رہا تھا اور عالم غربی عروج و بلندی کی طرف چڑھ رہا تھا (اے ہسٹری آف اسلامک اسپین، منٹگمری واٹ، انگریزی: ص ۱۴۱) اندلس کے اکثر و بیشتر شہر عربوں کے اقتدار سے نکل چکے تھے اور اندلس سے عربوں کی ایک بہت بڑی تعداد مراکش اور افریقہ کی طرف جلا وطن کر دی گئی تھی۔ اب عربوں کے زیر نگیں ایک مختصر سا رقبہ تھا اور اس پر بنو الاحمر کی حکومت تھی۔ یہ لوگ بھی آئے روز اقتدار طلبی کے لیے باہم دست وگریبان رہتے تھے۔ حالانکہ ایک وقت وہ تھا کہ تمام یورپ ان سے ڈرتا اور خوف کھاتا تھا۔ عرب باشندے سرسبز وشاداب اور زرخیز علاقوں یعنی عراق وشام اور مصر وغیرہ سے یہاں وارد ہوئے تھے، اندلس کی سرزمین ان کو بے حد راس آئی۔ انھوں نے یہاں کی فضا میں تہذیب وتمدن کے چراغ روشن کیے اور یہاں کے غیر مہذب اور غیر متمدن معاشرے کو ایک نہایت اعلیٰ معیار پر پہنچایا۔ وہ یہاں ایک نہایت حسین اور بے مثال فضا اور معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے اس خطے کو ایک نہایت متمدن اور ترقی یافتہ ملک میں تبدیل کر دیا۔ زراعت کو فروغ دیا، معدنیات کے سراغ لگا کر ملک کو قدرتی وسائل اور معدنی ذرائع سے مالا مال کر دیا جس کا اجمالی تذکرہ گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ عربوں نے نہ صرف تہذیب وتمدن بلکہ صنعت وحرفت اور تجارت کو خاص طور پر شہروں اور قصبوں میں فروغ دیا بلکہ بارش کے پانی سے انھوں نے زمین کی آبیاری کا کام لیا۔ طلیطلہ، قرطبہ، مرسیہ، سنترا، بلنسیہ اور غرناطہ کی آبادیاں ایسی عمدہ اور بے نظیر طرز پر بسائی گئی تھیں کہ ان کا حسن آج بھی دنیا میں مشہور ہے۔

ملک کی انتظامیہ کسی ملک کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ انتظامیہ اچھی ہو تو ملک نہایت اچھے طریقے سے چلتا ہے لیکن اگر انتظامیہ خراب اور کرپٹ ہو تو ملک میں ایک انارکی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں نے شروع کے پچاس سال ملک کی انتظامیہ کو جدید طرز پر قائم کرنے میں صرف کیے اور ملک کی اقتصادی، معاشی اور سماجی ومعاشرتی ترقی کے لیے قوانین بنائے۔ (الاحاطۃ فی اخبار: ۱/۱۴۷) عبدالرحمن الداخل نے حکومت قائم کرنے کے بعد سڑکیں تعمیر کرائیں اور مواصلات ومراسلات کے محکمے قائم کیے۔ اس اولین

خلیفہ نے دارالحکومت قرطبہ کو شاندار محلوں، خوبصورت عمارتوں اور پرعظمت اور پرشکوہ مسجدوں سے مزین اور آراستہ کیا۔ نویں صدی میں نظام حکومت کو مضبوط اور مستحکم کیا۔ سرحدی حملوں اور اندرونی شورشوں کے باوجود تینتیس سال تک نہایت کامیاب حکومت چلائی۔ عبدالرحمٰن الداخل نے اپنے دور حکومت میں ملک کو متمدن اور مہذب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھا اور یورپ کے مختلف ملکوں کے سفیر اور عوام جب اندلس میں آتے تو قرطبہ کی خوبصورتی اور اقتصادی ترقی کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے۔ قرطبہ کی مختلف سمتوں اور اطراف میں پائپ لائنوں کے ذریعے پانی پہنچایا گیا اور پبلک حمام میں بھی پانی پہنچانے کا نہایت اعلیٰ انتظام کیا گیا جن کو بیرونی ملکوں کے سفراء اور عوام دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ غرض کہ نظام حکومت کو اس طرح منظّم اور مستحکم بنایا گیا کہ زندگی کے ہر شعبے نے عروج اور ترقی حاصل کی، دوا خانے، ہسپتال اور ہیلتھ کا پورا محکمہ وجود میں آیا جو لوگوں کی صحت کی حفاظت ونگرانی میں اپنے سارے وسائل استعمال کرتا تھا۔ لوگوں کے لباس اور بودوباش کے مروجہ طریقوں میں اصلاح کی گئی۔

عبدالرحمٰن الثالث کے عہد میں اندلس کی تہذیب کا ستارہ چمکا۔ اس کی حکومت کا عہد نہایت کامیاب رہا۔ اس کے عہد میں حکومت اندلس کا کلچر جو اس قدر بام عروج پر تھا وہ اس کے دانش مند اور باصلاحیت وزیروں کی شب وروز کی مساعی جمیلہ کا ثمرہ تھا۔ قرطبہ کے اعلیٰ تمدن اور تہذیب کو دیکھ کر اس زمانے کے نام نہاد متمدن ملکوں کے سفیر اندلس اور خصوصی طور پر قرطبہ کی عظمت وشان کو دیکھنے کے لیے جوق در جوق آتے۔ عبدالرحمٰن الثالث کا دربار علماء اور فضلاء کا مرکز بن گیا۔ مختلف ملکوں کے ادیب وشعراء اور اسکالر اس کے دربار کی زینت بنے۔ جرمنی کے سفیر اور دانشور قرطبہ آتے اور اس کی ترقی کو دیکھ کر ششدر رہ جاتے۔ فاطمی عہد حکومت کا جغرافیہ دان ابن حوقل قرطبہ کے تمدن اور اس کی ترقی کو دیکھنے کے لیے آیا اور یہاں سے واپسی پر اس نے یہاں کی اقتصادی، معاشی اور سماجی ترقی کے بارے میں ایک رسالہ لکھا۔ یہودی طبیب اور معالج یورپ سے قرطبہ آکر یہاں کے طبیہ کالجوں میں تعلیم دینے اور تعلیم حاصل کرنے لگے۔ حکم ثانی کے عہد حکومت میں اندلس نے نمایاں ترقی کی، اور اگر اس عہد کو ''عہد زریں'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کے عہد حکومت میں قرطبہ علم وحکمت کا گہوارا کہلایا اور اس کو سرزمین یورپ میں ایک لائٹ ہاؤس کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس نے قرطبہ کی یونیورسٹی کو اتنی ترقی دی کہ بغداد کی نظامیہ یونیورسٹی اور مصر کی الازہر اس کے سامنے ہیچ ہوگئیں۔ ایشیا، یورپ اور افریقہ سے طلباء تعلیم حاصل کرنے کے لیے یہاں اس طرح آنے لگے جیسے آج ہم یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے نہایت ذوق وشوق سے جاتے ہیں۔ حکم ثانی کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا اس کا جانشین ہوا لیکن وہ اپنے باپ کا بدل نہ ہوسکا، لیکن اس کا وزیر المنصور اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے نہایت بلند انسان تھا۔ اس نے علم وفضل کی تشہیر میں وہی کام کیا جو حکم الثانی نے کیا تھا۔ اس نے آرٹ، فن تعمیر اور ادب کی ترقی کے لیے بہت کام کیا۔ اس نے عبدالرحمٰن الناصر کے بنوائے ''الزہرا'' کے مقابلے میں

ایک دوسرا حسین وجمیل شہر "الزہرہ" تعمیر کرایا۔(منٹگمری واٹ، اے ہسٹری آف اسلامک اسپین: ص۸۲)

مسلمانوں کی بدقسمتی کہ حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ اسی خطۂ ارض میں عروج وزوال کی داستان شروع ہوگئی۔ شورشوں اور بغاوتوں کے سیاہ بادل امنڈ آئے۔ مقامی گورنروں اور امیروں کو خودمختار ریاستیں قائم کرنے کا خبط شروع ہوگیا۔ مرکز کو کمزور کر دیا گیا۔ بنوھود نے مختلف علاقوں پر قبضہ کر کے امیر المؤمنین ہونے کا اعلان کر دیا لیکن شاہ غرناطہ نے گیارھویں صدی میں ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اور خود غرناطہ پر قابض و متصرف ہوگیا۔ مغربی اضلاع کے علاقے بنوعباد کے تصرف میں آگئے جن کا آخری بادشاہ معتمد تھا اسے یوسف بن تاشفین نے افریقہ کی طرف بھگا دیا اور سارا گوسا پر بنوھود بارھویں صدی تک حکمران رہے۔ ان بادشاہوں کو جیسا کہ بتایا گیا ہے "ملوک الطوّائف" کہا جاتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ سیاسی نقطۂ نگاہ سے یہ سارے بادشاہ کشمکش کا شکار تھے اور ایک دوسرے سے برسر پیکار بھی تھے، لیکن ان میں ہر ایک علم وہنر کا مربی اور علماء وفضلاء کا حامی تھا۔ اشاعت علم میں یہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں تھے۔ ان میں سے اکثر حکمران تو خود عالم، ادیب اور شاعر تھے، اور آخری حکمران معتمد نے تو شاعری میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیا تھا اور وہ صاحب دیوان شاعر تھا۔ قاہرہ میں اس کا یہ دیوان ۱۹۵۱ء میں زیور طباعت سے آراستہ بھی ہوا تھا۔

یوسف بن تاشفین معتمد کے کہنے پر اس کی مدد کے لیے اندلس آیا۔ معتمد کے خیر خواہوں نے اسے اس اقدام سے روکا بھی لیکن اس کا جواب نہایت معقول تھا کہ:

"رَعُی الجمال خیر من رَعی الخنازیر"

اونٹوں کا چرواہا بننا (یعنی یوسف بن تاشفین) کی غلامی سؤروں کا چرواہا بننے سے بہتر ہے یعنی عیسائیوں کی غلامی سے بہتر ہے۔ بہرحال یوسف بن تاشفین اندلس آیا اور زلاقہ کی جنگ میں الفانسو (Alfonso) کو عبرت ناک شکست دے کر اس نے اندلس پر عیسائی تسلط کے امکانات کو کئی صدیاں پیچھے دھکیل دیا۔ اس بار وہ اندلس کی بارہ بارہ حکومتیں ان کے حکمرانوں کو جوں کی توں سونپ کر چلا گیا لیکن افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں کے مقابلے میں اندلس کے شاداب علاقوں کی کشش کے باعث اس نے دوسری بار اس عزم کے ساتھ اندلس کا رخ کیا کہ وہ ان سب چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حکمرانوں کو اندلس کی بساط سے ہٹا کر خود وہاں ایک مضبوط حکومت قائم کرے۔ چنانچہ اس بار وہ ایک فاتح کی حیثیت سے اندلس میں وارد ہوا اور خود معتمد کو اس سے جنگ کرنا پڑی۔ اس جنگ میں معتمد کی بہادری اور بے جگری تاریخ کے صفحات پر اپنے نقش ثبت کیے ہوئے ہے، لیکن وہ بجائے فاتح ہونے کے گرفتار ہوگیا۔ یوسف بن تاشفین نے اس کی جان بخشی تو کر دی لیکن اسے پابجولاں طنجہ لے گیا۔ جب اسے اور اس کے اہل خانہ کو جہاز میں سوار کیا جا رہا تھا تو اس کے محبّ کنارے پر کھڑے رو رہے تھے۔ آخر کار اسے اغمات کے قید خانے میں ڈال دیا گیا جہاں سے نکلنا اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ سیاسی کشمکش کے دوران میں تین بیٹوں کا داغ معتمد

کے سینے پر پہلے ہی تھا۔ اب اس کا بیٹا ابو ہاشم، اور اس کی چہیتی ملکہ اعتماد اور اس کی بچیاں در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے رہ گئیں۔ ناز ونعمت میں پلی ہوئی یہ شہزادیاں اب اجرت پر دوسروں کے لیے سوت کاتی تھیں۔ قید خانے میں معتمد نے جو شاعری کی وہ فنی اعتبار سے اس کی بلند ترین تخلیقات سے عبارت ہے کیونکہ ذاتی احساس کی وہ کسک اس شاعری کی جان ہے جس کے فقدان کا شکوہ اندلسی شاعری کے بعض ناقدین کو رہا ہے۔ ماضی کی بہار اور حال کے خارزار کا موازنہ اس کے نازک دل پر کیا کیا قیامت برپا نہ کرتا ہوگا۔ ایک موقع پر اس نے کہا ؎

تبدلت من عزظل النبود بذل الحديد ونقل القيود
وكان حديدی سناناً ذليقاً وعضباً رفيقاً صقيل الحدود
فقد سار ذالك وذا ادهما بعض بساني عض الاسود

''یعنی پرچموں کے سایے کی عزت کے عوض مجھے لوہے کی ذلت اور بیڑیوں کی گرانی نصیب ہوئی۔ لوہا میرے لیے نیزے کی تیزانی اور باریک، صیقل شدہ دھاروں والی شمشیر براں سے عبارت ہوا کرتا ہے۔'' اب وہ اور یہ دونوں ایک بیڑی میں ڈھل گئے ہیں جو میری پنڈلیوں کو شیروں کی طرح چباتی ہے۔''

معتمد کے انھی خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے علامہ اقبال نے بھی ''قید خانہ سے معتمد کی فریاد'' کے عنوان سے یوں اشعار کہے ہیں ؎

اک فغان بے شرر سینے میں باقی رہ گئی
سوز بھی رخصت ہوا، جاتی رہی تاثیر بھی
مرد حر زنداں میں ہے بے نیزہ و شمشیر آج
میں پشیماں ہوں، پشیماں ہے میری تدبیر بھی
خود بخود زنجیر کی جانب کھنچا جاتا ہے دل
تھی اسی فولاد سے شاید میری شمشیر بھی
جو میری تیغ دو دم تھی اب میری زنجیر ہے
شوخ و بے پروا ہے کتنا خالق تقدیر بھی

اسی طرح قید و بند کی انھی صعوبتوں میں وہ لمحۂ جانگداز بھی آیا کہ عید کے روز اس کی بیٹیاں سلام کی غرض سے باپ کے پاس قید خانے میں آئیں، اور ان کی زبوں حالی اور بوسیدہ لباس دیکھ کر معتمد کا دل پھٹ کر رہ گیا اور اس نے اپنے تاثرات کا اظہار قلب وجگر کو پاش پاش کر دینے والے شعروں میں کیا۔

معتمد اگرچہ عالم و فاضل اور ادیب و شاعر تھا، لیکن چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حکمرانوں کی باہمی

رسہ کشی اور تنازعات نے ان کی ہوا اڑا دی اور عیسائیوں کو ان کے علاقوں پر حملہ کرنے بلکہ قبضہ کرنے کا اچھا موقع مل گیا۔ اسی طرح کچھ احمق اور ناعاقبت اندیش حکمرانوں نے عیسائی حکمرانوں سے گٹھ جوڑ کر کے ان کے حملے کے لیے مزید راہ ہموار کر دی۔ اس کا نتیجہ وہی ہونا تھا جو بالآخر ہوا۔

ان طوائف الملوک بادشاہوں اور ان خود سر امیروں میں محمد الاحمر سب سے زیادہ خوش نصیب حکمران ثابت ہوا جس نے ایک ایسی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو ۱۲۳۸ء سے لے کر ۱۴۰۲ء تک عربوں کی تہذیب وتمدن کا مرکز بنی رہی۔ یہ غرناطہ کے حکمرانوں کا آخری خاندان تھا جو دولت نصریہ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

محمد بن احمر صرف ایک جرنیل ہی نہیں تھا بلکہ ماہر سیاسیات اور منتظم مملکت بھی تھا۔ اس نے قسطالیہ کے عیسائی حکمرانوں پر کبھی اعتماد نہیں کیا اور ہمیشہ ان سے ہوشیار رہا۔ اس نے اپنے مختصر عہد حکومت میں اپنے ملک کے سرحدی علاقوں میں فوجی چھاؤنیاں اور مضبوط قلعے بنوائے اور بہت سے بوسیدہ اور مسمار شدہ قلعوں کی دوبارہ مرمت کرا کر ان کو فوجی اڈے بنایا۔

۲۴ رستمبر ۱۲۷۲ء میں محمد بن احمر جو عیسائیوں سے مردانہ وار مقابلے میں ہمہ تن مصروف تھا، یہ کام اپنے بعد میں آنے والوں کے لیے چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ یہ بنو نصر خاندان کا پہلا حکمران تھا جس نے اس پر آشوب دور میں بڑی کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ وہ ایک عالم اور ادیب بھی تھا۔ اس کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ علماء، فضلاء اور ادباء کا بے حد احترام کرتا تھا۔ علوم وفنون کی ترقی میں اس نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

غرناطہ میں ماہرین فن اور علماء کو حکومت کی طرف سے گراں قدر وظائف ملتے تھے اور یہ ایک اسلامی حکومت کا فرض بھی ہے کہ وہ علماء کی روزی کا بندوبست کرے۔ وہ حکومتیں آج کل کی حکومتوں کی طرح نہیں تھیں کہ سارے پرائڈ آف پرفارمنس گویوں، رقاصوں اور بھانڈوں کو مل جائیں اور جو لوگ سالہا سال سے دین وملت کی خدمت کرتے چلے آ رہے ہیں، ان کو کوئی تمغہ امتیاز نہ ملے اور نہ ان کی بیماری کے علاج کے لیے ان کی کوئی مالی مدد کی جائے۔ یہ کیسی بدذوقی ہے کہ ایک خانہ بدوش عورت کو ۲۵ لاکھ مکان کی خرید کے لیے دیا جائے اور ۱۰ ہزار ماہوار اس کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے لیکن ملک کے بڑے بڑے علماء حکومت کی فیاضی سے یک قلم محروم رہیں جن کی برکت، محنت اور دعاؤں سے یہ پاکستان وجود میں آیا تھا۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا اور ارض پاک کے حکمرانوں کے اسلوب سیاست کی ایک ادنیٰ سی جھلک تھی جب کہ غرناطہ میں علماء اور فضلاء کی بڑی پذیرائی ہوتی تھی اور نابغۂ روزگار علماء کو بڑے بڑے عہدے بھی عطا کیے جاتے تھے۔

مسلمانوں کے اندلس پر قبضہ کے بعد مشرق ومغرب کے مختلف النسل قبائل کے لیے باہمی ربط وارتباط کا موقع آیا اور تہذیب وتمدن اور صنعت وحرفت کے نئے در وبام آراستہ ہو گئے۔ قرطبہ، اشبیلیہ اور غرناطہ جیسی بستیاں گہوارہ علم وادب اور مرکز تہذیب وتمدن بن گئیں۔ غرناطہ بعد میں اندلس کا دارالسلطنت بنا اور اندلس کے

شہروں میں یہ دلہن کی طرح ہے۔ حسن و جمال اور خوبصورتی میں اس کی نظیر ملنا محال ہے۔ اس کا رقبہ چالیس میل ہے۔ مشہور دریائے شنیل اس کے پاس سے گزرتا ہے۔ علاوہ ازیں اور بہت سے دریا اور ندیاں ہیں بڑے بڑے باغات، سبزہ زار اور محلات یہاں موجود ہیں۔ انگوروں کی بیلیں دور دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ علامہ شقندی اسے اندلس کا دمشق کہتا ہے، اور ابو جعفر الغرناطی کہتا ہے ؎

هي الفردوس في الدنيا جمالاً　　لساكنها، كارهها البعوض

(اخبار الاندلس: ۱/۱/۲۳)

یعنی یہ خطۂ ساکنان شہر کے حسن و جمال کے باعث فردوس بریں ہے اور اس سے نفرت کرنے ولا حقیر مچھر ہے۔

عالمی تہذیب وتمدن کی ترقی کی تشکیل کے سلسلہ میں بعض مقامات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اندلس کی سرزمین پر جب مسلمانوں نے قبضہ کیا تو موسیٰ بن نصیر کے لڑکے عبدالاعلیٰ نے اندلس کے اس خطہ کو جس کا ''البیرہ'' تھا ۹۳ھ/ ۷۱۱ء میں فتح کیا۔ یہ شہر رومیوں کا آباد کردہ تھا۔ اس میں ایک علاقہ غرناطہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ پرانا شہر امتداد زمانہ کے ہاتھوں آہستہ آہستہ ختم ہو گیا اور اس کی جگہ غرناطہ کے نام نے لے لی۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ۵ھ/ ۱۲ء میں یہ ایک صوبہ بن گیا جس کی آبادی تیرھویں صدی عیسوی میں ۴ لاکھ ۴۴ ہزار نفوس تک پہنچ گئی تھی۔ (الاحاطہ فی اخبار غرناطہ: ۱/ ۲۹) لسان الدین ابن الخطیب کے بقول اس شہر کا نام غرناطہ اور بعض کے نزدیک غرناطہ جو اصلاً اندلس کے ایک صوبہ ''البیرۃ'' کا ایک قدیمی شہر تھا جو اندلس کے صوبوں میں سب سے بڑا صوبہ تھا۔ رومیوں کے زمانہ میں بلکہ اس سے بھی قبل یہ علاقہ ''سنام الاندلس'' کے نام سے بھی موسوم تھا۔ شہر غرناطہ البیرہ کی اصل آبادی سے آٹھ میل دور آباد تھا۔ قرطبہ اس کے جنوب مشرق میں ۴۸ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ غرض کہ ساحل کی قربت کی وجہ سے یہ علاقہ نہایت سرسبز و شاداب تھا اور خوش رنگ تازہ پھلوں کا خرمن اور بحری قافلوں کی گزرگاہ تھا۔ دنیا کے مشہور برفستانی پہاڑوں میں ایک کوہ ''شیلر'' بھی ہے جس پر گرما اور سرما دونوں موسموں میں برابر برف جمی رہتی ہے۔ یہ پہاڑ غرناطہ سے چھ میل جنوب میں واقع ہے۔ دامن کوہ میں جابجا چشمے نکلتے ہیں اور اس کی آبشاروں سے ۳۶ دریا نکلتے ہیں۔ اس وجہ سے غرناطہ کی آب و ہوا صحت بخش ہے، مرغزاروں اور باغوں کی کثرت کے باعث ہر طرف سرسبزی و شادابی لہلہاتی ہے۔ یہاں کے باشندے خوب رو، تنومند، جفاکش اور جرأت مند اور دلیر ہوتے ہیں۔ قاضی ابوبکر بن شیریں نے ایک مرتبہ اپنے چند اشعار میں غرناطہ کے بارے کہا تھا جس کا ترجمہ ہے:

''اللہ تعالیٰ غرناطہ کو محفوظ رکھے۔ یہ ایسی جگہ ہے کہ یہاں غمگین کو خوشی اور مسرت اور جلاوطن کو پناہ ملتی ہے۔''

کاشت کاری اور زرخیزی میں سوائے دمشق کے کوئی اس کے برابر نہیں۔ غلہ کے علاوہ گنا بڑی کثرت

سے پیدا ہوتا۔ معدنیات میں بھی یہ علاقہ نہایت بارآور تھا۔ سونے، چاندی، سیسہ، اور لوہے کی بہت سی کانیں یہاں موجود تھیں یہاں ایک خاص قسم کی لکڑی پیدا ہوتی تھی جس کی خوشبو عود ہندی سے بھی بہت زیادہ ہوتی تھی۔ جڑی بوٹیاں، معدنی اور نباتاتی دوائیں بکثرت ہوتیں۔ زرعی اور معدنی اشیاء کی فراوانی کے باعث غرناطہ کے باشندے دولت اور ثروت سے مال مال تھے۔ اندلس کا ایک مؤرخ ابو مروان بن خلف حیان غرناطہ کی کثرت دولت کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

''شہر کی جامع مسجد کے دروازے کے قریب ہر وقت ایسے پچاس گھوڑے کھڑے رہتے تھے جن کی لگاموں کے دہانے تمام تر چاندی کے ہوتے تھے، کیونکہ وہاں رؤساء کی کثرت تھی، ان کی عالی شان عمارات اور محلات، جامعہ مسجد کی عالی شان عمارت ان کے تمول کی مظہر تھی۔'' (تاریخ رجال اندلس)

غرناطہ کی ساری فضا نغمہ پرور اور دل کش منظر سے معمور ہوتی تھی۔ شاعروں کے الفاظ میں یہ جگہ ''جنت ارضی'' سے کم نہ تھی۔

اندلس اور سائنس

قرآن حکیم نے اپنی مختلف آیات میں فطرت کی جو قوتیں کارفرما ہیں، انسان کو ان سے روشناس کرایا اور انسان کو اصول فطرت سے آشنائی بخشی۔ قرآن حکیم نے تفقہ، تدبر، تفکر اور تعقل کی دعوت دی۔ اس طریقہ سے قرآن نے انسان کے ہاتھ میں قدرت کے خزانے کی چابی سونپ دی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک یورپی مفکر لکھتا ہے:

''ساتویں صدی عیسوی میں دنیا ایک نہایت مصیبت سے دوچار تھی، بلکہ بادشاہوں کے جبر وستم سے کراہ رہی تھی۔ عربوں کی فتوحات نے ان میں ایک نیا ولولہ اور نیا خون داخل کیا۔ محمد (ﷺ) نے عربوں کو قرآن دیا جو نئے کلچر اور تہذیب وتمدن کا نقطۂ آغاز تھا۔''

انسانی ترقی کا نقطۂ آغاز فطرت کی قوتوں کو انسان کی ضروریات کے تحت کرنا ہے، اور اسلام سب سے پہلا مذہب ہے جس نے سائنسی علوم کا انکشاف کیا۔ اسلام کے اس مسئلہ توحید نے فطرت کے ان تمام مظاہر کو مسخر کیا کیونکہ شرک عالم فطرت پر تحقیق کرنے میں مانع تھا۔ شرک کے عقیدہ کے تحت مظاہر فطرت پوجنے کی چیز بنے ہوئے تھے نہ کہ تحقیق کی چیز۔ مشرک انسان آفتاب و ماہتاب کو دیوتا سمجھتا تھا۔ اس وجہ سے وہ کسی صورت بھی اس کو اپنی تحقیق کا ہدف نہیں بنانا چاہتا تھا۔ لیکن جب دنیا میں توحید کا غلبہ ہوا تو مسلمانوں نے ان مظاہر فطرت پر تحقیق شروع کر دی اور سائنس وجود میں آئی۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اسلام اس لیے نہیں آیا کہ دنیا کو سائنس دے، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر اسلام نہ آتا تو سائنسی ترقیوں کا دروازہ انسان پر نہ کھلتا۔

موجودہ سائنس خواہ اس کا تعلق حیوانات سے ہو یا نباتات سے، کیمسٹری سے ہو یا فزکس سے، اس کی اصل اور بنیاد قرآن حکیم ہے، اور قرآن حکیم نے اس کے مبادیات اور اصول وضوابط اپنی مختلف آیات میں ذکر کیے ہیں جن کو ایک ماہر فن بخوبی جان سکتا ہے۔ ویسے بھی اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو سائنس اس فکری انقلاب کے نتیجہ میں پیدا ہوئی جو اسلام کی توحید کی بنیاد پر واقع ہوا۔ اس ذہن کا آغاز اموی دور خلافت میں دمشق میں ہوا، اور اسلام میں سب سے پہلے سائنس دان خالد بن یزید بن معاویہ اموی ہے جس نے کیمسٹری کو ایک طبعی علم کی حیثیت سے ترقی دینے کی کوشش کی۔ پھر عباسی دور میں اس شعبہ نے بغداد میں اور اموی دور میں

اندلس میں عروج حاصل کیا۔ چنانچہ عباسی خلیفہ المامون کے زمانے میں بغداد میں بیت الحکمت قائم ہوا جس نے سائنس کے مختلف شعبوں میں تحقیق کے فرائض انجام دیے۔ المامون خود بھی ایک بہت بڑا عالم تھا۔ اس زمانہ اس وقت کے ہیئت اور جغرافیہ کے عالموں نے زمین کا گول ہونا ثابت کیا اور زمین کے محیط کو معلوم کیا جو کہ ۲۰۴۰۱ میل تھا جب کہ موجودہ زمانہ میں اس کی صحیح ترین پیمائش ۲۵ ہزار میل ہے۔ مسلمانوں نے قرون وسطیٰ میں سائنس کے کن کن شعبوں میں ترقی کی اس کے لیے ملاحظہ ہو پروفیسر ھٹی کی کتاب تاریخ عرب اور احقر کی کتاب اسلام اینڈ سائنس۔

اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سائنس کا یہ علم بغداد سے منتقل ہو کر اندلس گیا یا اندلس والوں کی اپنی تحقیق تھی کہ اندلس کے حکمرانوں کی سرپرستی میں اس علم نے دن دگنی رات چوگنی ترقی کی یہاں تک کہ سولھویں صدی عیسوی تک مسلمان اس میدان میں استادی کے مقام پر رہے، لیکن اس کے بعد یورپ نے سائنس میں جو ترقیاں حاصل کیں انھوں نے مسلمانوں کو شاگردی کے مقام پر پہنچا دیا۔ خود مغربی مفکرین اور دانشوروں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ جس وقت یورپ غفلت کی نیند سو رہا تھا، اسلامی ممالک اس وقت جاگ رہے تھے۔ چنانچہ یورپ کا ایک مصنف ہرن شا (Hernshah) نے لکھا ہے:

''دسویں صدی عیسوی اور اس کے مابعد زمانہ میں یورپ کے لوگوں کا تعلق مشرق کی فراست سے ہو جاتا ہے۔ ان صدیوں میں جو نسبت آج مشرق اور مغرب کی ہے ہم اس کے برخلاف پاتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں اکثر مشرقی اقوام مغربی تمدن کی قدر و قیمت کا اعتراف کرتی ہیں اور اس کا اظہار تہ دل سے نہایت خوشامدانہ طریقہ سے کرتی ہیں۔ مشرق کا باشندہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ سائنس، علم و حکمت، تنظیم اور پبلک اسپرٹ مغرب میں پائی جاتی ہے۔ دسویں، گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی کے یورپ میں صورت حال اس سے بالکل مختلف تھی۔ مغرب کے باشندے کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اسلام کے پاس معارف اور عہد قدیم کی سائنس ہے۔ اسلام کے اسلحہ اور نظم و نسق کی فضیلت و عظمت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی تھی۔''

مسلمانوں سے تعلق پیدا ہونے سے قبل یورپ کی حالت:

مسلمانوں سے ربط اور تعلق پیدا ہونے سے قبل یورپ کی حالت کیا تھی؟ اس کا جواب یہی ہے کہ نہایت ناگفتہ بہ تھی۔ وہی وحشیانہ زندگی، وہی جنگلی طریق رہائش، نہ تمدن کا نام اور نہ تہذیب کا اثر۔ چنانچہ ڈریپر نے اس حالت کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

''یورپ کے وحشی باشندے اپنی وحشیانہ حالت سے ذرا بھی بلند نہ ہوئے تھے۔ ان کے بدن غلیظ، ان کے ضمیر غیر متمدن۔ وہ ایسی جھونپڑیوں میں رہتے تھے کہ اگر ان کے فرش پر گھاس اگ رہی ہو اور

دیواروں پر پھوس کی چٹائیاں لگی ہوئی ہوں تو یہ بات ثروت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ ان کی خوراک حقیر سی تھی، مثلاً سیم، آڑو، جڑیں اور درختوں کی چھالیں بھی وہ کھانے میں استعمال کرتے تھے۔ ان کا لباس کیا تھا؟ جانوروں کا کچا چمڑا، بہت ہوا تو پکائی ہوئی (Tanned) کھالیں پہن لیں۔ پائداری میں ہوسکتا ہے کہ کھالوں کو دوامی حیثیت حاصل ہو مگر ذاتی پاکیزگی میں یہ کسی طرح بھی ممدومعاون نہیں ہوسکتیں۔ شاہی شان وشوکت کے لحاظ کے اظہار کے لیے یہ کافی سمجھا جاتا تھا کہ بادشاہ کی سواری ایک بیل گاڑی پر مشتمل ہو جس کے سامنے بیلوں کی کم از کم دو جوڑیاں لگی ہوں۔ ان بیلوں کی رفتار تیز کرنے کے لیے غلام آنکس لیے پیادہ یا ساتھ چلتے تھے جن کی ٹانگوں پر پرال کے پولے بندھے ہوئے ہوتے تھے۔ ان لوگوں کا ایمان درگاہوں کے معجزوں کی بے سروپا داستانوں اور لغو تبرکات میں بہت پختہ تھا۔ مذہب میں ابتذال پیدا ہو چکا تھا۔ ہوس پرست مذہبی راہ نما حب جاہ کی تلاش میں بحث مباحثوں میں مصروف رہتے تھے۔"

یہ تو ان کی تمدنی اور تہذیبی گراوٹ تھی جس کو ڈریپر نے بیان کیا ہے۔ پھر اس زمانہ میں رہبانیت نے ان پر اتنا غلبہ حاصل کیا ہوا تھا کہ آج اس کا تصور کرتے ہوئے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کی رہبانیت کا کچھ نقشہ لیکی (Lecky) کے حوالہ سے ہم نے گذشتہ صفحات میں نقل کیا ہے۔ ایک طرف تو زہد اور رہبانیت تھی جو صحراؤں میں گوشہ نشین تھی اور شہری زندگی میں ان کا کوئی اقتدار نہ تھا، اس کے برعکس فسق و فجور کی تحریک شہروں میں اپنے پورے جوش وتلاطم پر تھی۔ لیکی اس اخلاقی انحطاط کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے:

"اخلاق میں انحطاط، رکاکت اور پستی حد درجہ سرایت کر گئی تھی۔ دربار کی عیش پرستیاں، ارکان دربار کی غلام طینتی اور ملبوسات اور زیورات کی تزئین و آرائش اپنے شباب پر تھی۔ دنیا اس وقت انتہائی رہبانیت اور انتہائی بدکاری کے تھپیڑوں کے درمیان جھونکے کھا رہی تھی بلکہ بعض شہروں میں جن میں سب سے زیادہ کثیر تعداد میں زہاد اور راہبین پیدا ہوئے تھے، وہ وہی تھے جن میں عیش پرستی اور بدچلنی کی سب سے زیادہ گرم بازاری تھی۔ غرض بدکاری اور توہم پرستی کا ایسا اجتماع ہو گیا تھا جو انسان کی شرافت وعظمت کا قطعی دشمن ہے۔ جمہور کی رائے اس قدر ضعیف اور کمزور ہو گئی تھی کہ لوگوں کو بدنامی اور رسوائی کا مطلق خوف نہیں رہا تھا۔ البتہ ضمیر کو مذہب کا دھڑکا ہوسکتا تھا، لیکن اسے بھی اس اعتقاد نے مٹا دیا تھا کہ دعاؤں وغیرہ کے ذریعہ سے سارے گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔ مکاری، دغابازی اور دروغ گوئی کی وہ گرم بازاری تھی جو قیاصرہ کے زمانہ میں بھی نہ تھی۔ البتہ ظلم وتشدد، شقاوت اور بے حیائی اتنی نہ تھی، لیکن اس کے ساتھ حریت فکر، آزاد خیالی اور جوش قومیت میں بھی کمی تھی۔" (تاریخ اخلاق یورپ: ۲/۱۰۴)

ان تمام خرابیوں کے ساتھ ساتھ گیارہویں صدی عیسوی میں حکومت اور کلیسا کی کشمکش شروع ہو گئی اور

اس نے دیکھتے ہی دیکھتے بڑی شدت اختیار کر لی۔ شروع میں تو پوپ کو ایک جنگ میں فتح ہوئی اور پوپ کا اعزاز واقتدار اس قدر بڑھ گیا کہ بادشاہ ہنری چہارم سنہ ۱۰۷۷ء میں اس بات پر مجبور ہو گیا کہ کانوسا کے قلعہ میں پوپ کے حضور میں حاضر ہو۔ چنانچہ وہ نہایت ذلت کے ساتھ حاضر ہوا۔ پوپ نے بڑی مشکل سے لوگوں کی سفارش پر اس کو اپنے سامنے کھڑے ہونے کی اجازت دی اور شہنشاہ ننگے پاؤں اون پہنے ہوئے آیا اور پوپ کے ہاتھ پر توبہ کی اور پوپ نے نہایت مشکل اس کی غلطی معاف کی۔ اس کے بعد حکومت اور کلیسا کی آویزش میں کبھی پوپ کی فتح اور کبھی شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ انجام کار حکومت سے مقابلہ میں کلیسا کو دینا پڑا۔ کشمکش کی اس پوری مدت میں عوام مذہب وسیاست اور کلیسا وریاست کی دہری غلامی میں گرفتار تھے۔

تمام علوم کی بنیاد مسلمان تھے:

عیسائی دنیا اور یورپ کی حالت کا یہ مختصر نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسری طرف اسلامی شوکت وتہذیب کی حالت دیدنی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر چودھویں صدی تک مسلمانوں نے اندلس میں مختلف علوم ومعارف کے میدان میں بہت آگے قدم بڑھائے۔ قدیم علوم کو پڑھا، سیکھا اور سمجھا اور تصنیف کیا، تجربات کیے اور پھر ان سے نئی اختراعات پیدا کیں۔ اس کے بعد تازہ ایجادات کا زمانہ آیا۔ اندلس کے دماغوں نے علوم وفنون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر خدانخواستہ عہد قدیم اور عہد جدید کے درمیان عہد اسلامی کی کڑی نہ آ جاتی تو دور حاضر میں اس ترقی کا موجود ہونا جو آج ہم دیکھ رہے ہیں، ناممکن تھا۔ مسلمانوں نے نہ صرف قدیم علوم ہی کو پروان چڑھایا اور انھیں فنا ہونے سے بچالیا بلکہ ان کو صیقل کیا۔ ان میں نئی نئی اختراعیں کیں اور آنے والی نسلوں کے سپرد اس تمام علم کے ذخیرے کو کر دیا جس کے سبب سے موجودہ نسلیں اس ترقی کی معراج تک پہنچ سکیں۔

اہل یورپ کا مسلم یونیورسٹیوں کا رخ:

پیشتر اس کے کہ ہم یہ بتائیں کہ یورپ میں یہ اسلامی علوم وفنون کیسے پہنچے، ہم یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسپین اور یورپ کے دوسرے ممالک کے مابین جب لوگوں کی آمدورفت کا تبادلہ ہوا، اور یورپ کے لوگ اندلس کے مسلمانوں کی حریت فکر اور ان کے علوم وفنون سے آشنا ہوئے تو ان میں بھی حریت فکر کا جنون پیدا ہوا، بلکہ جس طرح آج ہم یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں، اس زمانہ میں یورپ کے لوگوں نے غرناطہ، قرطبہ اور اشبیلیہ وغیرہ کی یونیورسٹیوں میں چوری چھپے تعلیم حاصل کرنے کے لیے جانا شروع کیا۔ چوری چھپے اس لیے کہ پادری صاحبان اور ارباب کلیسا آج کل کے جاگیرداروں کی طرح نہیں چاہتے تھے کہ یہ لوگ علم وفن کی وادیوں میں گامزن ہوں اور عقل وشعور اور حریت فکر کے جذبات ان

میں ابھریں، لیکن انسانی جذبات کو بزور کب تک دبایا جا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند سالوں میں یورپ میں عقلیت وشعور کا کوہ آتش فشاں پھٹ گیا۔ علمائے طبیعات اور محققین تقلید کی زنجیریں توڑ چکے تھے اور ارباب کلیسا کے بے اصل نظریات کی تردید کرنی شروع کر دی۔ مارٹن لوتھر (Martin Luther) کی پروٹسٹنٹ کی تحریک بھی اندلس سے حاصل کردہ توحید اور حریت فکر کی وجہ سے تھی کیونکہ یہ بھی قرطبہ یونیورسٹی سے پڑھ کر آیا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں کو اندلس کی مسلم دنیا کے علم وفن کی ہوا لگی انھوں نے اہل کلیسا کے بے اصل اور بے بنیاد بلکہ بے شعور نظریات کی تردید کرنا شروع کر دی، جو جغرافیہ اور تاریخ اور طبیعات سے متعلق ان کی مذہبی کتابوں میں پائے جاتے تھے، اور بڑی جرأت، جسارت اور بہادری اور آزادی کے ساتھ ان کی علمی تنقید اور بے سمجھے ان پر ایمان لانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے ساتھ انھوں نے اپنے علمی انکشافات اور تجربوں کا بھی اعلان کر دیا۔ ان کا یہ اعلان کرنا تھا کہ مذہبی حلقوں اور ارباب کلیسا نے جو اس وقت اقتدار اور طاقت کے مالک تھے، ان کی تکفیر کی اور دین مسیحی کے لیے ان کے خون بہانے اور ان کے مال ومتاع کو ضبط کر لینے کی اجازت دی۔ پورے یورپ میں احتساب کی عدالتیں قائم ہو گئیں جو پوپ کے بقول ان ملحدوں اور مرتدوں کو سزا دیں جو شہروں، گھروں، تہہ خانوں، جنگلوں، غاروں اور کھیتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان عدالتوں نے اپنا فریضہ پوری سرگرمی اور مستعدی سے انجام دیا۔ اس کے جاسوس براعظم کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے تھے اور اس بارے میں محکمہ احتساب نے تفتیش وتحقیق میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ایک عیسائی عالم کہتا ہے کہ "ناممکن ہے کہ کوئی شخص عیسائی بھی ہو اور وہ بستر پر جان دے۔" اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس محکمہ نے جن لوگوں کو سزا دی ان کی تعداد تین لاکھ سے کم نہیں جن میں سے ۳۲ ہزار افراد کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان زندہ جلائے جانے والوں میں ہیئت وطبیعات مشہور عالم برونو (Brunoe) بھی تھا جس کا سب سے بڑا جرم کلیسا کے نزدیک یہ تھا کہ وہ اس کرۂ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل تھا۔ محکمۂ احتساب کے حکام نے اسے اس سفارش کے ساتھ دنیوی حکام کے سپرد کر دیا کہ اسے نہایت نرمی سے سزا دی جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ اس کے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہ گرنے پائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کو زندہ جلا دیا جائے۔ اس طرح مشہور طبعی عالم گلیلیو (Gailileo) کو بھی اس بنا پر موت کی سزا دی گئی کہ وہ سورج کے گرد زمین کے گھومنے کا قائل تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ اہل کلیسا نے پہلے اسے مجبور کیا کہ وہ اپنے اس عقیدے سے توبہ کر لے چنانچہ اس نے ان الفاظ میں توبہ کی:

> I, Galileo, being in my seventieth year, being a prisoner before my eiyes the Holy Gospel, abjura, curse and datest the error and the heresy of the movement of the earth.

لیکن اس توبہ نامہ کے باوجود بھی اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

گلیلیو کو گردش زمین کے اس عقیدہ پر کیوں سزا دی گئی؟ وجہ یہ تھی کہ اس کا یہ عقیدہ مسیحیت کے خلاف تھا۔ قدیم یونان میں زمین اور سورج کی گردش کے بارے میں دو نظریے پیش کیے گئے تھے۔ ایک نظریہ یہ ارسٹارکس کا نظریہ تھا جس میں زمین کو سورج کے گرد گھومتا ہوا بتایا گیا تھا۔ دوسرا نظریہ ٹالمی کا نظریہ تھا جس کے مطابق زمین سورج کے گرد گھوم رہی تھی۔ ارسٹارکس کے نظریہ کے مطابق زمین بظاہر گول تھی اور دوسرے نظریہ کے مطابق زمین چپٹی تصور کی گئی تھی۔ تیسری صدی عیسوی میں جب قسطنطین نے عیسائیت قبول کی اور عیسائیوں کو یورپ میں غلبہ حاصل ہوا تو اس نے ٹالمی کے نظریہ کی سرپرستی کی جس میں سورج زمین کے گرد گھومتا تھا اور ارسٹارکس کے نظریہ کو بزور دبایا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ عیسائیت نے سیدنا عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدا فرض کر لیا تھا، اور اس عقیدہ کے مطابق زمین کو یہ تقدس حاصل تھا کہ وہ خدا کی جنم بھومی ہے۔ اور جو کرہ خدا کی جنم بھومی میں ہو وہ کسی دوسرے کرہ کا تابع (Satellite) کس طرح ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ٹالمی کے اس نظریہ کو مذہب کا ایک حصہ بنا دیا گیا۔ گلیلیو نے چونکہ اس کے خلاف نظریہ پیش کیا تھا، لہٰذا مذہب کا مخالف اور ملحد سمجھتے ہوئے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ مذہب اور سائنس کے درمیان ٹکراؤ کے لیے ملاحظہ ہوڈر یپر کی کتاب ''مذہب اور سائنس کا تصادم۔''

اہل کلیسا کے اس ظلم و تشدد نے ان دانشوروں اور روشن خیال لوگوں کے پیمانہ صبر کو لبریز کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے نہ صرف اہل کلیسا بلکہ مذہب کے خلاف ہی علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس جذبۂ بغاوت نے بعد میں علم و دین کی باہمی جنگ کی صورت اختیار کر لی اور علوم و عقلیت کے علم برداروں نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا کہ علم و مذہب ایک دوسرے کی ضد اور حریف ہیں جو کبھی بھی جمع نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ان لوگوں کے سامنے جب بھی مذہب کا نام آتا تو وہ دفعتاً اہل کلیسا اور مذہب کے علم برداروں کے لرزہ خیز مظالم کی یاد تازہ ہو جاتی اور ان بے گناہ علماء اور روشن خیال لوگوں کی صورتیں ان کی آنکھوں میں پھر جاتیں جنہوں نے انتہائی مظلومیت کی حالت میں مذہب کے ان جلادوں کے ہاتھوں پر اذیت ناک موت پائی۔ مذہبی گروہ اور کلیسا کے نام سے ان نگاہوں کے سامنے پر غضب چہرے، چڑھی ہوئی تیوریاں، شعلے برساتی ہوئی آنکھیں، تنگ ذہن اور پادریوں کے بھدے دماغ آتے۔ چنانچہ مذہب سے نفرت اور بیزاری کو انھوں نے اپنی زندگی کا ایک اصول بنا لیا اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی نفرت و حقارت اور کراہیت و ناپسندیدگی کا یہی ترکہ اور سرمایہ چھوڑا۔ اہل کلیسا اور روشن خیال لوگوں کے اس باہمی تصادم نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جس میں ان کے ذہنی نظام میں خدا کے لیے کوئی جگہ نہ رہی۔ چنانچہ ایک نو مسلم محمد اسد نے اس بارے میں لکھا ہے کہ

''مغربی تہذیب صاف لفظوں میں اور پر زور طریقہ پر تو خدا کا انکار نہیں کرتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے ذہنی نظام میں خدا کے لیے کوئی جگہ نہیں اور اس کے ماننے میں وہ کوئی فائدہ محسوس کرتی ہے اور نہ اس کی ضرورت سمجھتی ہے۔''

یورپ میں اسلامی علوم کیسے پہنچے؟

اب آخر میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی علوم یورپ میں کیسے پہنچے؟ اور وہ کیا ذرائع تھے جن سے یہ علوم سرزمین یورپ میں داخل ہوئے۔ اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ جب یورپ کے ایک حصہ اندلس میں اسلامی علوم کا بحر بیکراں بہہ رہا تھا تو یورپ کے تشنہ کام کیسے اس آب زلال سے محروم رہ سکتے تھے۔ اسلامی علوم کا مسلم دنیا سے یورپ میں پہنچنے کا صرف ایک ہی ذریعہ نہ تھا بلکہ اس کے حسب ذیل ذرائع تھے:

(۱) اس کا پہلا ذریعہ تو یہ تھا کہ بعض علم کے شوقین حضرات نے جب اندلس کی علمی اور فنی ترقی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو ان کے دل میں بھی علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا کیونکہ وہ یہ سمجھنے لگ گئے تھے کہ ترقی کا پہلا زینہ علم کا حصول ہے۔ اور چونکہ ان کے ہاں علم کی جگہ جہالت کی فرماں روائی تھی اور اہل کلیسا جدید نظریات اور علم کے حصول کے سخت مخالف تھے لہٰذا ان لوگوں نے علم حاصل کرنے کی خاطر اپنے شہروں سے نقل مکانی کر کے مسلم ممالک میں رہائش اختیار کر لی اور مسلم یونیورسٹیوں میں علم حاصل کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ گیارہویں صدی عیسوی میں کانسٹاٹن (Constantione) شمالی افریقہ میں حصول علم میں مصروف تھا۔ ایڈلارڈ (Adelard) جو انگلستان کے شہر باتھ کا باشندہ تھا، اور وہ سوریا میں تحصیل علم کر رہا تھا۔ اٹلی کے شہر پیزا (Pisa) کا رہنے والا ایک شخص لیونارڈ (Leonard) جس نے یورپ نے موجودہ طریق حساب کی بنیاد رکھی (کیونکہ ایک سے دس تک ہندسے اور حساب کرنے کا طریقہ جو آج یورپ میں مروج ہے وہ یورپ نے عربوں ہی سے سیکھا) اس نے اس طریقہ کو شمالی افریقہ کے علماء سے سیکھا تھا۔ قسطنطنیہ اس زمانہ میں مشرقی رومی سلطنت بازنطینی (Byzantine) کا دارالسلطنت تھا، یہ اسلامی ممالک کے ساتھ ملتا تھا، اس وجہ سے یہاں دونوں طرف سے لوگوں کی آمدورفت تھی اس وجہ سے بھی کچھ عربی علوم عیسائی دنیا میں داخل ہو گئے۔ سسلی کا جزیرہ اٹلی کے نیچے اور شمالی انجیریا او رٹریپولی کے اوپر بحر روم میں واقع ہے۔ یہاں مسلمانوں کی حکومت سنہ ۹۰۲ء سے ۱۰۹۱ء تک رہی۔ اس جزیرہ کو اگرچہ نارمن لوگوں نے فتح کیا لیکن پھر بھی یہاں مسلمان باشندوں کی کافی تعداد باقی رہ گئی۔ یہ باقی ماندہ مسلمان گردونواح کے عیسائیوں کے استاذ بنے اور ان کے ذریعے بہت سا علم یورپ میں پہنچا۔ ہاسکن (Haskin) کے الفاظ ہیں:

”تاہم وسیع نظر سے دیکھتے ہوئے یہ امر ظاہر ہے کہ اندلس کے عرب نئے علوم کو مغربی یورپ میں پہنچانے کا سب سے بڑا ذریعہ تھے۔“

(۲) اسلامی علوم کا یورپ میں داخل ہونے کا سب سے بڑا ذریعہ صلیبی جنگیں تھیں جو قریباً دو سو سال تک جاری رہیں۔ ان لڑائیوں کا اثر یورپ کی ذہنی ترقی پر بہت زیادہ ہوا۔ چنانچہ مشہور مستشرق ولیم میور (W.Muir) نے لکھا ہے:

"یہ صلیبی جنگیں ہی تھیں جن کی وجہ سے مغربی دنیا اپنی طویل خواب غفلت سے بیدار ہوئی۔ انھی کی وجہ سے تمام یورپ کے سلاطین ایک نقطہ پر اکٹھے ہوئے جن کا مدعا اگرچہ شاندار تھا، لیکن غلط تھا۔ اس طرح سے ان کے دلوں میں تازہ سیاسی روح پیدا ہوگئی۔ اس کا باعث براہ راست یا بالواسطہ اسلام ہی تھا۔ تجارت اور بحری کاروبار میں ان کے سبب سے ترقی ہوئی اس طرح سے ان لڑائیوں نے یورپ کی دولت اور ثروت میں اضافہ کیا۔ فنون لطیفہ میں تازہ روح پھونکنے کا سبب بنیں اور سائنس کے ایسے شعبوں مثلاً ہیئت، ریاضی، طب اور تاریخ قدرت کی علمی تحصیل کا باعث بنیں۔"

بارکر (Barker) نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ

"یورپ کے فنون اور ادبیات پر صلیبی جنگوں کے سبب اسلامی تمدن کا گہرا اثر پڑا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب نے اسلامی زبانوں کی تحصیل شروع کر دی اور مسلمانوں کے علوم کو ایک نئے لباس میں دنیا کے سامنے پیش کرنا شروع کیا۔ (The Legacy of Islam, P.64)

ایسا ہی برڈو (Berdoe) نے بھی لکھا ہے۔ اس طرح سے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ رابطہ اور تعلق پیدا کرنے کے بعد یورپ نے براہ راست یا بالواسطہ اپنی فضا میں وہ کیفیت پیدا کی جسے تہذیب وتمدن کہتے ہیں۔ ان کی روح بیدار ہوگئی۔ تجسس وجستجو اور تفتیش وتلاش کا جذبہ پیدا ہوا۔ نگاہ میں وسعت، دل میں ہمت اور دماغ میں علم پیدا ہوگیا۔ چنانچہ یورپ کے باشندے ان جذبات کے ساتھ گھر سے نکلے اور ہر تکلیف اور اذیت برداشت کر کے سائنس کا علم حاصل کیا اور دنیا میں صنعتی انقلاب پیدا کر کے نہ صرف ساری دنیا پر حاوی ہوگئے بلکہ صلیبی جنگوں کا مسلمانوں سے انتقام بھی لیا۔

مختصر یہ کہ اسلامی علوم کو یورپ نے جب قریباً تمام تر حاصل کر لیا تو ان میں ایک نئی روح پیدا ہوگئی۔ یورپ کی نشأۃ ثانیہ (Renaissance) کا سبب بھی بڑی حد تک اسلام ہی ہوا۔ اسے "نہضت علمی" بھی کہتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ دنیا کی ایک عظیم الشان ذہنی تبدیلی کے اسباب اور اس کی اہمیت کو آپ ایک مغربی دانشور اور محقق کی زبانی سنیں۔ ہکسلے (Huxley) اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

"اگر مغربی دنیا کو چین کی طرح الگ تھلگ رہنے دیا جاتا تو کچھ معلوم نہیں کہ کب تک یہ حالت قائم رہتی، مگر خوش قسمتی سے یہ بے تعلق نہ رہ سکی۔ تیرھویں صدی عیسوی سے پہلے ہی اسپین میں عربی تمدن کے ترقی پذیر ہونے اور صلیبی جنگوں کی تحریک عظیم سے یورپ کا خمیر بننے کے لیے ایسا جامن لگا کہ اس دن سے آج تک اس نے اپنا کام موقوف نہیں کیا۔ پہلے تو عربی تراجم کی وساطت سے پھر اصل کتابوں کے مطالعہ سے یورپ کی مغربی اقوام قدیم فلسفیوں اور شاعروں کی تصنیفات سے ہوتے ہوتے عہد قدیم کے تمام وسیع ادبیات سے آشنا ہوگئیں۔"

(Haskin: Studies in the History of Mediaeval Scicencc, P.5)

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ فطرت کے خزانے اول روز ہی سے زمین کے اوپر موجود تھے۔ انسان کی ذہنی صلاحیت بھی قدیم ترین زمانہ سے پائی جاتی تھی۔ اسی ذہنی صلاحیت سے اس نے بڑے بڑے پتھر تراش کر اہرام مصر بنائے، بڑی بلند و بالا اور وسیع و عریض عمارتیں تعمیر کیں، لیکن فطرت کے خزانہ کو جس کو آج سائنس کا نام دیا جاتا ہے، انسانی تمدن کے لیے استعمال کرنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی؟ پانی لاکھوں برس سے کرۂ ارض پر موجود ہے۔ ہر زمانے کے انسان نے اس کو استعمال کیا، لیکن چند سو برس پہلے سے انسان پر یہ بات منکشف ہوئی کہ یہ H2o کا مجموعہ ہے یعنی دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن کو اگر ملایا جائے تو پانی بن جاتا ہے۔ گویا کہ پانی کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ یہ سائنس کی ایجاد سرکار دو عالم ﷺ کے وجود کی برکت اور قرآن حکیم کے نزول کے نتیجہ میں ہے۔ وجہ اس کی ایک مسلمان سے نہیں بلکہ ایک غیر مسلم مغربی دانشور آرنلڈ ٹائن بی (1889-1975ء) سے سنئے، اور جو کچھ اس نے کہا ہے وہ بالکل درست اور صحیح کہا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"قدیم زمانے کا انسان زمین کو دیوتا سمجھتا تھا یہاں تک کہ ہر چیز اس کے لیے معبود اور خدا کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ ان کو دیکھتا تو ان کے بارے میں اس کے لیے تقدیس اور پرستش کے جذبات پیدا ہوتے تھے۔ اس نفسیاتی فضا میں زمینی ذرائع کو انسانی خدمت کے لیے استعمال کرنے کے جذبات نہیں پیدا ہو سکتے تھے۔"

ٹائن بی کے الفاظ میں یہ توحید کا عقیدہ ہے جس نے کائنات کے تقدس کو ختم کیا اور ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق بنایا۔ اس طرح سے وہ نفسیاتی فضا پیدا ہوئی جس میں انسان اس کرۂ ارض اور اس پر موجود ہر شے کو دیوتا اور قابل پرستش سمجھنے کے بجائے اپنا خادم سمجھنے لگا اور اس میں تصرف کا عمل کرنے لگا۔"

(رڈرز ڈائجسٹ مارچ ۱۹۷۴ء)

کائنات کو تسخیر کرنے اور اس میں چھپے ہوئے رازوں کو منکشف کرنا کا داعیہ سب سے پہلے اسلام کے مسئلہ توحید کے اثر سے مسلمانوں میں پیدا ہوا۔ اس فکری انقلاب کا ایک دھارا وہ تھا جس کا مرکز اندلس اور سسلی بنا۔ ان ملکوں میں مسئلہ توحید کے نتیجہ کے طور پر سائنسی انکشافات اور زمینی خزانوں کے استعمال کرنے کا ذہن ابھرا اور آخر کار ایک عظیم الشان تہذیب وجود میں آئی جس نے نہ صرف یورپ میں بلکہ پوری دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور موجودہ سائنس اسی انقلاب کا نتیجہ اور اس کا برگ و بار ہے۔

سائنس ہے کیا؟

یہاں پر یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ سائنس کسی چیز کے پیدا کرنے کا نام نہیں بلکہ قدرت کے پوشیدہ رازوں کو جاننے کا نام ہے۔ اس کو ایک مثال سے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب سے پانی پیدا ہوا ہے اسی وقت سے اس کے اجزائے ترکیبی دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن ہیں۔ انسان ہزاروں سال

اس پانی کو استعمال کرتا رہا لیکن اس نے اس کے اجزائے ترکیبی کی کھوج لگانے کی کوشش نہ کی۔ دو تین سو سال قبل جب انسان نے اس کے اجزائے ترکیبی کی کھوج لگائی تو اس پر یہ منکشف ہوا کہ پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن سے مرکب ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کی کارگزاری ہے۔ اگر اور زیادہ گہرائی میں غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سائنس اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا یہ نتیجہ ہے۔ اندازہ فرمائیں کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے زمین کے گول ہونے کے باوجود اس کی دو قسم کی گردشوں کے ہوتے ہوئے ہمیں اس کی پیٹھ پر رہنے سہنے اور چلنے پھرنے کے مواقع فراہم کیے۔ گویا کہ وہ ہمارے حق میں وہ ایک فرش کی طرح ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم میں اس کو ''مہاد'' کہا گیا۔ پھر اس ربانی صفت کا کمال یہ ہے کہ باوجود اپنے محور (Axis) کے گرد ایک ہزار میل فی گھنٹہ اور سورج کے گرد اپنے مدار (Orlait) میں فی گھنٹہ 66,600 میل کی تیز رفتار گردشوں کے ہمیں معمولی سا بھی جھٹکا نہیں لگتا۔ پھر یہ گول سواری اور یہ عظیم الشان کرہ بغیر کسی ایندھن یا گیس یا پٹرول کے محض اجرام سماوی کی باہمی کشش اور رفتار کے اصولوں کے تحت ہمیشہ ایک ہی رفتار سے رواں دواں ہے۔ جن میں تو کوئی خرابی واقع ہوتی ہے اور نہ ہی ہمارے معمولات زندگی میں کوئی خلل واقع ہوتا ہے۔ اسی طرح ربوبیت خداوندی کا ایک اور شاندار نظارہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تمام قوتوں کو ہماری رزق رسانی کے لیے اپنے اپنے کام پر لگایا۔ چنانچہ سورج کی گرم گرم کرنوں کے ذریعہ سمندر کے پانی کو بھاپ بنا کر اس کی نمکینی زائل کر دی۔ پھر اس بھاپ کو بادلوں میں تبدیل کیا۔ پھر بادلوں کو ہوا کے دوش پر سوار کر کے دور دراز علاقوں تک پہنچایا۔ پھر ان بادلوں کو بارش کی شکل میں زمین پر برسا کر خشک اور مردہ زمین کو سیراب کر کے لہلہاتی کھیتیوں اور سبزہ زاروں میں تبدیل کر دیا۔ بارش کے اس پانی کو ہماری زندگی کا سامان بنا دیا۔

قرآن حکیم نے چودہ سو سال قبل انسان کو مسئلہ توحید کے ضمن میں اس بات سے آگاہ کیا کہ تم اپنے رب کا رزق کھاپی کر کسی اور کو اللہ تعالیٰ کے برابر نہ ٹھہراؤ اس حال میں کہ تم بخوبی جانتے ہو کہ تم کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا اس حیرت انگیز طریقہ سے کھلا پلا نہیں سکتا۔ قرآن کی اس بات کو سائنسی دور میں بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ ہر قسم کے غلبہ، پھل اور ترکاری وغیرہ کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں چار قسم کے غذائی اجزاء پائے جاتے ہیں۔

① مواد لحمیہ (Proteins) انھیں اجزاء سے انسانی جسم نشوونما پاتا ہے۔
② مواد انشائیہ (Corbohydrates) یہ اجزاء جسم انسانی میں گرمی اور حرارت پیدا کرتے ہیں۔
③ مواد شحمیہ (Fats) یہ جسم کو موٹا کرتے ہیں۔
④ نمکیات (Salts) یہ اجزاء جسم کی صحت کو برقرار رکھتے ہیں۔

ان کے علاوہ کچھ اور اجزاء بھی قلیل مقدار میں جسم میں پائے جاتے ہیں جو جسم کو قوی، توانا، تندرست اور صحت مند رکھتے ہیں۔ ان اجزاء کو حیاتین (Vitamins) کہتے ہیں۔ ایک جسم انسانی کو یہ ساری چیزیں

فراہم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی مشینوں والی فیکٹریاں نہیں لگائیں بلکہ زمین کے اندر یہ تمام اجزاء رکھ دیے اور پھر غلہ، پھل اور ترکاریوں کے ذریعہ ان اجزاء کو زمین کے سینہ سے کھینچ کر جسم انسانی کو غذا کے ذریعہ پہنچایا۔ چنانچہ کاربوہائیڈریٹ (شکر و نشاستہ) کلوروفل کے ذریعے بنتا ہے۔ کسی بھی پیڑ اور پودے کی پتیوں میں جو سبز رنگ کے ذرات ہیں جن کی وجہ سے کسی بھی پودے اور درخت کی پتیاں ہری نظر آتی ہیں۔ اب انسان اور دوسرے حیوانات سانس کے ذریعہ جو کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں ان کو مذکورہ بالا ہرے رنگ کے ذرات پتیوں کے سوراخوں کے ذریعہ حاصل کر کے ان کو سورج کی روشنی میں دن کے وقت پانی میں آمیزہ کرتے ہیں۔ یہ پانی پتیوں تک جڑوں اور شاخوں کی مدد سے برابر پہنچتا رہتا ہے۔ اب ان چار چیزوں کلوروفل، کاربن ڈائی آکسائیڈ، پانی اور سورج کی روشنی کے باہمی تعامل سے ایک عجیب وغریب مگر میٹھی اور لذیذ چیز وجود میں آجاتی ہے جو خوش رنگ اور خوش ذائقہ غلوں اور پھلوں کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ اس میٹھی چیز کو کاربوہائیڈریٹ کہا جاتا ہے۔ غلوں اور پھلوں کا اکثر حصہ کاربوہائیڈریٹ پر مشتمل ہوتا ہے۔ مثلاً گیہوں میں ۲ء۷۱ فیصد، چاول میں ۷ء۷۸ فیصد، کیلے میں ۴ء۳۶ فیصد اور کھجور میں ۳ء۶۷ فیصد کاربوہائیڈریٹ پایا جاتا ہے۔ اس طرح دوسرے غلوں اور پھلوں میں اس کا تناسب مختلف ہے۔ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک حیرت انگیز کارخانہ ہر ایک پتی میں نظر آتا ہے جس میں ہر روز چند سادہ چیزوں سے شکر تیار ہوتی ہے۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفترے است معرفت کردگار

جب سے یہ کائنات کا کارخانہ معرض وجود میں آیا ہے، مواد لحمیہ، مواد انشائیہ، مواد شحمیہ اور مختلف قسم کے نمکیات اور حیاتین اسی وقت سے قدرت کے کارخانہ میں تیار ہو رہے ہیں، لیکن لوگوں پر قدرت کے ان اسرار و رموز کے انکشافات سب سے پہلے اندلس کے سائنس دانوں اور اطباء نے ظاہر کیے لیکن ابھی وہ سارے اسرار و رموز منکشف نہیں ہوئے۔ چنانچہ ابھی تک تمام سائنس دان انگشت بدندان ہیں کہ چند بے جان عناصر اور ساکن چیزوں میں حرکت اور زندگی کیسے پیدا ہو جاتی ہے، اور یہ کس قسم کے کیمیائی تغیرات کی بدولت جلوہ گر ہوتی ہے۔ چنانچہ نیوٹن (Newton) جیسا مشہور اور نامور سائنس دان کہتا ہے کہ سائنس دان کی مثال اس بچے کی سی ہے جو سمندر کے کنارے چند گھونگوں اور سیپیوں سے کھیل رہا ہے اور اس کے سامنے ابھی لامتناہی اسرار سربستہ کا وسیع اور ناقابل عبور سمندر کھڑا ہو۔''

بات صرف غذا کی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور سائنس دان دنیا میں کسی بھی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے اور نہ ہی عدم سے وجود میں لا سکتے ہیں بلکہ وہ صرف اس کارخانہ قدرت کے کچھ حقائق اور مادہ اور انرجی کے کچھ رازوں سے آشنا ہو کر اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں کا استعمال سیکھ سکتے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں قوت وتوانائی کے اصولوں سے واقف ہو کر مادہ (Matter) کو استعمال کر لیتے ہیں۔ کسی چیز کی حقیقتاً تخلیق نہیں کر

سکتے۔ مادہ اور توانائی کے یہ تمام اصول ہزاروں لاکھوں برسوں سے عالم رنگ و بو میں برابر ودیعت رہے ہیں۔ لیکن سائنس کی ترقی کی بنا پر انسان ان سے فائدہ اب اٹھا رہا ہے۔

قرآن حکیم نے پندرہ سو سال پہلے یہ چیلنج کر دیا تھا کہ

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ﴾ (حج:۷۳)

''اور جن لوگوں کو تم اللہ کے سوا پکارتے رہے ہو وہ ایک مکھی تک بھی پیدا نہیں کر سکتے خواہ وہ سب کے سب اکٹھے ہو جائیں۔''

یہ چیلنج آج بھی برقرار ہے اور پورا عالم انسانی مل کر بھی ایک مکھی تک پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کی ایک اور مثال آج ہر شخص کے سامنے ہے کہ گلاب کی پیوند کاری سے بے شمار رنگوں کے گلاب پیدا کیے گئے لیکن مٹی کا ایک ذرہ بھی جس میں وہ سب مرکبات ہوں جو ایک اصلی ذرے میں ہوتے ہیں، آج تک کوئی شخص پیدا نہیں کر سکا۔ ان ابدی اور آفاقی صداقتوں کے سامنے انسان آج بھی سر جھکائے کھڑا نظر آ رہا ہے۔ اس طرح نہ تو ہواؤں کے رخ موڑنے کی کچھ قدرت حاصل ہے اور نہ پانی سے لدے ہوئے بادلوں ہی پر کچھ زور اس کا چل سکتا ہے کہ انھیں جہاں چاہیں روک کر بارش برسا لے۔

قرآن حکیم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اس وقت کی دنیا میں رائج مختلف نظریات کی تردید کی اور دنیا کے سامنے اس بارے میں صحیح اور درست نظریات پیش کیے۔ اس نے بتایا کہ

① یہ تمام سیارے اور ستارے آسمان میں جڑے ہوئے نہیں بلکہ فضائے آسمانی میں تیر رہے ہیں۔ ہر ایک کرہ اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔

﴿كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ﴾ (یٰس:۴۰)

یعنی ''ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔''

② تمام اجرام سماوی بغیر کسی ستون یا سہارے کے خلاؤں میں معلق ہیں۔

﴿اللَّهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمَاوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا﴾ (الرعد:۲)

یعنی ''ہر ایک کرہ فلکی اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے۔''

③ ﴿كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى﴾ (الرعد:۲)

''ہر ایک وقت مقررہ کے مطابق چلتا ہے۔''

④ اپنے اپنے دائرے میں اس مسلسل اور پیہم گردش سے نہ تو سورج چاند سے ٹکراتا ہے اور نہ ہی دوسرے سیاروں سے نہ آفتاب کے لیے یہ بات روا ہے کہ وہ چاند کو پا لے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے بلکہ ہر ایک اپنے اپنے دائرے اور مدار میں تیر رہے ہیں۔

⑤ اللہ تعالیٰ نے تمام سیاروں اور ستاروں کو ایک حیرت ناک نظام میں جکڑا ہوا ہے۔ جس میں نہ تو کوئی ردو بدل ہوسکتا ہے اور نہ ہی کوئی ایک دوسرے پر تجاوز کر سکتا ہے۔ اس وجہ سے کبھی کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی۔ اس نے آسمان کو اونچا کیا اور اس میں میزان رکھ دی کہ تم اس میزان سے تجاوز نہ کرو۔

(الرحمٰن: ۷۔۸)

قرآن حکیم نے یہ سارے دعویٰ اس وقت کیے جب دنیا جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی۔ قرآن حکیم نے جب اپنے یہ نظریات دنیا کے سامنے پیش کیے تو دنیا میں انقلاب آ گیا اور لوگوں کو اس کائنات کے بارے میں نئے سرے سے غور وفکر کرنے کی تحریک ہوئی۔ مسلمانوں کی توحید کی بنا پر جو فکری انقلاب آیا اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ انسان عالم فطرت کو اس نگاہ سے دیکھنے لگے کہ وہ معبود نہیں بلکہ ایک بے بس مخلوق ہے، اور انسان کو یہ حق ہے کہ وہ اس کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کرے اور اس کو اپنے کام میں لائے۔ کیونکہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ (البقرہ:۲۹)

''زمین میں جو کچھ بھی پیدا کیا گیا ہے وہ تمھارے لیے ہے (تم اس کے لیے نہیں ہو)''

اب تک انسان ان کے لیے تھا۔ ان کی پوجا کرتا تھا۔ ان کو اپنا معبود سمجھتا تھا لیکن فکری انقلاب نے تمام مظاہر کائنات کو ایک بے بس مخلوق بنا دیا۔ اس ذہن کا آغاز اموی دور (۶۶۱ء۔۷۵۰ء) میں دمشق میں ہوا جہاں خالد بن یزید بن معاویہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے علم کیمیا کو ایک طبعی علم کے طور پر ترقی دی۔ عباسی خلافت کے زمانہ میں علم کے اس شعبہ میں مزید ترقی اور فروغ حاصل کیا اور یہ علم اندلس اور سسلی تک پھیلتا چلا گیا۔ عباسی خلافت کے زمانے میں اس کا مرکز بغداد تھا لیکن بعد میں اندلس ہو گیا۔ اس زمانہ میں اندلس کے مسلمان علمی اور تمدنی ترقی میں دنیا کی تمام قوموں سے آگے تھے جیسا کہ اجمالی طور پر گذشتہ صفحات میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ تاریخ کے اس دور کو یورپ کے مؤرخین تاریک دور (Dark Ages) کہتے ہیں، مگر وہ صرف یورپ کے لیے تاریک دور تھا نہ کہ مسلم دنیا کے لیے۔ چنانچہ ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار ''ڈارک ایجز'' کے عنوان سے لکھتا ہے:

''تاریک دور کی اصطلاحات شاندار عرب کلچر پر چسپاں نہیں ہوتیں جو اس زمانہ میں شمالی افریقہ اور اندلس میں پھیلا ہوا تھا۔''

کھوج لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ سائنسی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ شرک تھا جس نے مظاہر قدرت کو معبودوں کا درجہ دے دیا ہوا تھا، اور وہ ان پر تحقیق وتفتیش کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ مسلمانوں نے اعتقاد کی پیچیدگی سے آزاد ہو کر دونوں نظریات کو جانچا تو انھوں نے مظاہر قدرت پر تحقیق کی جس کے نتیجہ میں یہ سائنس وجود میں آئی۔ اور سائنس میں انھوں نے خصوصی طور پر اندلسی مسلمانوں نے اس قدر ترقی کی کہ ان کے کارناموں کو پڑھ، سن اور دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ چنانچہ تاریخ کے صفحات سے معلوم ہوتا ہے کہ سولھویں

عیسوی میں مسلمان پوری دنیا میں استادی کے مقام پر تھے، لیکن افسوس کا مقام ہے کہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات کے نتیجہ میں نظام خلافت ٹوٹ گیا اور اسلام کا علم عربوں کے بجائے عثمانی ترکوں کے ہاتھوں میں چلا گیا یعنی اسلام کی سیاسی نمائندگی کا مرکز عرب سے نکل کر عثمانی ترکوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ ترکوں نے اسلام کے علم کو اس وقت سنبھالا دیا جب کمزور ہاتھوں میں پہنچ کر اس کے گرنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اسلام کی مداخلت اور یورپ کے مقابلہ میں ان کی خدمات نا قابل فراموش ہیں، لیکن یہی ترک ہیں جو مسلم دنیا میں سائنسی تحقیقات میں رکاوٹ بنے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سائنسی تحقیقات کا مرکز مسلم دنیا کے بجائے یورپ بن گیا۔

اسلام میں سائنس کی اہمیت:

اسلام میں سائنس کی بہت اہمیت ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ سائنس دراصل نام ہے عالم حقائق کے مطالعہ کا اور قرآن حکیم کی متعدد آیات میں اہل ایمان کے بارہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ زمین و آسمان کی خلقت میں غور وخوض کرتے ہیں:

﴿يَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (آل عمران:۱۹۱)

اس اعتبار سے ایک سائنس دان وہی کام کرتا ہے جو ایک مومن کرتا ہے لیکن مومن اور سائنس دان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ سائنس دان زمین و آسمان کی خلقت میں صرف تحقیق کے لیے غور وخوض کرتا ہے جبکہ مومن عبرت کے لیے یہ کام کرتا ہے۔ اس تفکر و تدبر سے سائنس دان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے جب کہ اس سے ایک مومن کے ایمان میں اضافہ اور ترقی ہوتی ہے۔ ایک سائنس دان اپنے آپ کو اشیاء کے خواص تک محدود رکھتا ہے لیکن ایک مومن خواص اشیاء سے گزر کر حقائق اشیاء تک اپنا مطالعہ لے جاتا ہے، اور وہ مخلوق کو اپنے خالق کے ساتھ شامل کر کے دیکھتا ہے۔ وہ کائنات کو پاتے ہی خالق کائنات کو بھی پالیتا ہے۔ جس پر وہ نبی اور رسول کے ذریعے ایمان لایا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم میں کائنات کے واقعات کو قرآنی پیغام کے حق میں بطور استدلال پیش کیا گیا ہے۔ گویا قرآن حکیم میں جو بات فطری طور پر کہی گئی ہے کائنات اس کے حق میں واقعاتی دلیل ہے۔ اس اعتبار سے پوری سائنس قرآن حکیم کا ''علم الکلام'' ہے کیونکہ سائنس کسی سائنس دان کے خود ساختہ علم کا نام نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کائنات میں کام کرنے والے قوانین کی تلاش کا نام ہے۔ ان قوانین کا جو حصہ بھی سائنس دریافت کرتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کارفرمائیوں کی ایک جھلک ہوتی ہے۔

سائنس کا علم حاصل کرنے کی تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ موجودہ زمانہ میں قوت و طاقت کی حیثیت رکھتی ہے۔ سائنسی علوم میں ماہر قومیں دنیا میں سرفراز اور طاقتور ہیں، اور جو قومیں سائنسی علوم سے عار ہیں وہ کمزور اور مغلوب ہیں۔ اسلام مسلمانوں کو دنیا میں سربلند دیکھنا چاہتا ہے لہٰذا اسلام کی رو سے مسلمانوں کے لیے ضروری

ہے کہ وہ سائنسی علوم میں مہارت حاصل کر کے دنیائے اسلام کو غالب کریں اور خود بھی سرفراز اور سربلند ہوں۔

ہمارے اس زمانے میں بھی بعض لوگوں نے انگریزی زبان سیکھ کر انگریزوں کی طرح ترقی کرنے کا خواب دیکھنے شروع کیے جن میں ایک سرسید احمد خان تھے۔ سرسید کے ہاں ترقی صرف نہ تھی کہ زرق برق وردیاں پہنے کرنل اور میجر بنے ہوئے مسلمان نوجوان ہوتے تھے۔ ان کا منتہائے مقصود ایسی تعلیم تھی جو مسلمانوں کو حکومت کے اعلیٰ عہدوں تک پہنچا سکے۔ سرسید کی تہذیب کو ''مہدی افادی'' نے بجا طور پر ''اینگلو محمڈن کلچر'' کا نام دیا ہے۔ دوسرا اس سلسلہ میں نمایاں ترین نام کمال اتاترک کا ہے۔ یہ یہودی النسل تھا۔ مغربی تعلیم وتہذیب کی اشاعت سے اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ترکی زبان کو رومن رسم الخط میں لکھا جائے اور ترکی باشندوں کو پتلون اور ہیٹ پہنایا جائے۔ یہ شخص (کمال اتاترک) یہودی النسل تھا اور اس کی زندگی کا مقصد بھی یہودی تحریک کو کامیاب کرانا اور ملک کو سیکولر بنانا تھا۔ اس لحاظ سے اتاترک سرسید احمد خان سے دس قدم آگے تھا۔ اتاترک نے اس ترکی کو سیکولر بنا دیا جس ترکی کے آخر خلیفہ سلطان عبدالحمید کے دور میں یہودیوں کی عالمی تنظیم کی طرف سے خلیفہ کو یہ پیش کش کی گئی تھی کہ اگر وہ فلسطین میں یہودی ریاست قائم کرنے کی اجازت دے دیں تو اس کے بدلہ میں اس تنظیم کی طرف سے قرضوں کی ادائیگی اور نظام حکومت چلانے کے لیے ایک گراں قدر اور خطیر رقم دینے کے ساتھ ساتھ سلطان کو ذاتی طور پر بھی منہ مانگی رقم پیش کی جائے گی، لیکن سلطان عبدالحمید نے اس پیش کش کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ فلسطین پوری مسلم امہ کی امانت ہے اس میں کسی صورت بھی یہودی ریاست قائم کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اس سے بھی اہم بات یہ کہ فلسطین میں مسلمانوں کا قبلہ اول بھی ہے جس کے حصول کے لیے مسلمانوں نے اپنی جانوں کا گراں قدر نذرانہ پیش کیا ہے، اور اب بھی وہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے اپنے قبلۂ اول کا دفاع کریں گے۔ سلطان عبدالحمید کے اس ایمان افروز جواب کے نتیجہ میں یہودیوں کا وفد مایوس ہو کر لوٹ گیا لیکن جاتے ہوئے انھوں نے سلطان کو دھمکی دی کہ اب اسے اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ چنانچہ اس دھمکی کے مطابق عالمی صیہونی لابی نے اس وقت کی عالمی استعماری طاقت برطانیہ کے ساتھ مل کر سلطنت عثمانیہ کے خلاف ایک خوف ناک سازش تیار کی جس کے مطابق ۱۹۲۴ء میں ترک میں مقیم یہودی قبیلہ دونمہ سے تعلق رکھنے والے ایک فرد مصطفیٰ کمال کے ذریعہ عثمانی خلافت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ مصطفیٰ کمال نے برسر اقتدار آنے کے بعد نہ صرف یہ کہ خلافت اسلامیہ کا خاتمہ کر دیا گیا بلکہ ترکوں کا تعلق اپنے اسلامی ماضی، اسلام اور مسلم امہ سے منقطع کرنے کے لیے ظلم اور سفاکی کا ایسا بازار گرم کیا کہ اس کی نظیر مشکل ملے گی۔ سیکولرزم کے نفاذ کے نام پر اتاترک نے ترکی کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے اسلام کے ہر نشان کو مٹا دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں خلافت کے خاتمے کے اعلان کے ساتھ ہی شریعت اسلامیہ کو بھی منسوخ کر دیا گیا۔ عربی زبان پر پابندی عائد کر دی گئی یہاں تک کہ عربی زبان میں اذان اور نماز پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ مساجد مقفل کر دی گئیں۔ پردے کو ممنوع قرار دیا گیا اور اسلام کے ساتھ کسی بھی قسم کے تعلق کو ممنوع

قرار دے دیا گیا۔ اسی پر علامہ اقبال نے فرمایا تھا ؎

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی دیکھ غیروں کی عیاری بھی دیکھ

سرسید اور مصطفےٰ کمال کی تقلیدی ذہنیت کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہمارے مصلحین کی ساری توجہ بس یورپ کی تہذیب اور یورپ کی زبان و ادب کے حصول پر لگی رہی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی جو مغربی قوموں کی ترقی کا اصل راز تھا اس کو مسلمانوں کے اندر رائج کرنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ سرسید نے تو صراحتاً مسلمانوں کے لیے ٹیکنیکل ایجوکیشن کی مخالفت اور اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم کو سب سے مقدم قرار دیا۔ یہی اس زمانہ میں تعلیم جدید کے حامیوں کا نقطۂ نظر تھا اور آج بھی قریباً یہی ہے۔ ان حضرات نے ساری توجہ اس پر دی کہ ایسا گروہ پیدا ہو جائے جو مغربی تمدن اور یورپی ادب میں کمال حاصل کیے ہوئے ہو۔ کمال اتاترک کا نام نہاد انقلاب اور روس کے اشتراکی انقلاب میں صرف چند سال کا فرق ہے۔ (وہ سنہ ۱۹۱۷ء میں آیا اور یہ ۱۹۲۴ء میں) مگر حیرت انگریز بات یہ ہے کہ روس آج خلائی دور میں داخل ہو چکا ہے جب کہ ترکی ابھی تک زمین پر بھی مستحکم اور مضبوط مقام حاصل نہیں کر سکا۔ اصل بات یہ ہے کہ قوموں کی ترکی علوم وفنون حاصل کرنے سے ہوتی ہے نہ کہ کوٹ پتلون پہننے اور عورتوں کے میک اپ کرنے اور بال کٹوانے سے۔ اقبال مرحوم نے بالکل صحیح فرمایا ؎

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقص دختران بے حجاب
نے ز سحر ساحران لالہ روست
نے ز عریاں ساق، نے از قطع موست
محکمی او را نہ از لادینی است
نے فروغش از خط لاطینی است
قوت افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

یورپ جس ذہن کے ساتھ ہمارے علوم کی طرف بڑھا، وہ یہ تھا کہ مسلمانوں سے ان کے علوم اور ان کے ہنر کو لے کر اس کے ذریعہ سے ان کو شکست دی جائے۔ ان چیزوں کو اس نے وقت کی طاقت سمجھا اور اس کو اپنے دشمن کے مقابلہ میں استعمال سمجھا۔ چنانچہ اپنی اس مہم کو یورپ نے ''تقلید مشرق'' یا ''تقلید مسلم'' کا نام نہیں دیا بلکہ اس کو روحانی صلیبی جنگ (Spritual Crusade) کہا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ صلیبی لڑائیوں کی ہاری ہوئی بازی کو نئی تکنیک سے کامیاب بنایا جائے، اور جب اس کوشش سے وہ اپنے کو ایک نئے انقلاب تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تو اس کو انھوں نے یہ حیثیت دی گویا انھوں نے خود اپنی کھوئی ہوئی حیثیت دوبارہ

حاصل کی ہے۔ چنانچہ یورپ نے اس نئے انقلاب کا تاریخی نام نشأۃ ثانیہ (Renaissance) رکھا۔ یہ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے۔ جس کا مطلب ہے نیا جنم (Rebirth) گویا یہ کوئی غیر (مسلمانوں سے) حاصل کی ہوئی چیز نہیں بلکہ یہ یورپ کی اپنی ہی متاع گم گشتہ ہے جو اس نے دوبارہ پائی ہے۔ یہ کس قدر جھوٹ اور ناشکر گزاری ہے۔ یورپ نے یہ سب علوم مسلمانوں سے حاصل کیے لیکن ناشکرگزاری کے جذبہ کے تحت اس کو مسلمانوں کی طرف منسوب نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو درمیان سے حذف کر کے اس کا رشتہ ماضی سے ملایا اور اس کو مغرب کے ایک ملک یونان کی چیز قرار دے کر اس کو نشأۃ ثانیہ کہا۔ اصل میں ہمیں وہی کرنا چاہیے جو مغربی قوموں نے ہمارے ساتھ کیا۔ مغربی علوم کو انھوں نے اس لیے سیکھا تاکہ ان کے ذریعے مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کا انتقام لیا جائے۔ ہمیں بھی ان علوم کو اس لیے سیکھنا چاہیے تاکہ مغربی تہذیب کو شکست دے کر اسلام کو غالب کیا جائے۔ اگر ہمارے اندر یہ ذہن پیدا ہو جائے تو پھر نتیجہ برعکس شکل میں ظاہر ہوگا۔

قرآن حکیم کی آفاقیت:

قرآن حکیم اگرچہ سائنس یا کسی مخصوص دنیوی فن کی کتاب نہیں ہے بلکہ اس کا اصل موضوع نوع انسانی کی انفرادی اور اجتماعی ہر حیثیت سے ہدایت اور راہ نمائی ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں اصول وکلیات کے روپ میں اس قدر آفاقی حقائق اور ابدی و سرمدی صداقتیں مذکور ہیں جو جدید سے جدید تر علوم وفنون اور ایجادات و اکتشافات کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم میں احکام شریعت کے پہلو بہ پہلو نظام کائنات کا تذکرہ ضروری تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ قرآن حکیم نے فطرت اور شریعت یا تکوین وتشریع کی آمیزش سے ایک حسین وجمیل اور انمول ولافانی گل دستہ حیات بنا دیا ہے، جو اپنی عطر بیزیوں سے قیامت تک مہکتا اور اس کا شانہ آب وگل کو معطر کرتا رہے گا، اور یہ وہ عظیم اور ناقابل فراموش خصوصیت ہے جو قرآن حکیم کے سوا کسی اور الہامی کتاب میں نہیں ہے۔

سنہ ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے چوبیس سالہ عمر میں بازنطینی سلطنت کے ناقابل تسخیر دارالسلطنت قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) کو فتح کیا تو اس فتح نے مسلمانوں میں ایک نئی امنگ اور ایک نیا جوش و جذبہ پیدا کیا۔ قسطنطنیہ کو فتح کرنا جس کو مسلمان آٹھ سو برس تک بار بار کی کوششوں کے باوجود فتح نہ کر سکے، ان کی قابلیت، قوت اور فنون جنگ میں مرتبۂ اجتہاد میں پہنچ جانے کی دلیل تھی، اور یہ ظاہر ہوتا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ جنگی سامان اور جنگی طاقت میں اپنی تمام معاصر قوتوں سے فائق تھا۔ چنانچہ ایک مغربی دانشور Baron Corra de Vaux اپنی کتاب مفکرین اسلام کے پہلے حصہ میں سلطان محمد فاتح کے تذکرہ میں لکھتا ہے:

''یہ فتح محمد فاتح کو محض بخت واتفاق سے حاصل نہیں ہوئی تھی اور نہ اس کا سبب بازنطینی حکومت کی کمزوری تھی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ سلطان بہت پہلے ضروری اقدامات کر رہا تھا۔ اس کے زمانہ میں علم کی

جتنی طاقت تھی، اس سے کام لے رہا تھا۔ توپیں اس وقت نئی نئی ایجاد ہوئی تھیں۔ اس نے کوشش کی کہ جتنی زبردست اور بڑی توپ اس زمانہ میں بن سکتی ہو، بنائی جائے۔ اس نے اس کے لیے ہنگری کے ایک انجینئر کی خدمات حاصل کیں جس نے اس کے لیے ایک ایسی توپ بنائی جو تین سوکلوگرام کے وزن کا گولہ پھینکتی تھی اور اس کی مار ایک میل سے زیادہ کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس توپ کو کھینچنے کے لیے سات سو آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی اور اس کو بھرنے کے لیے دو گھنٹے درکار ہوتے تھے۔ جب سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لیے چلا تو اس کی قیادت میں تین لاکھ سپاہی تھے اور زبردست توپ خانہ، اس کا بیڑہ جو قسطنطنیہ کے سمندر کی جانب سے محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ ایک سو بیس جنگی کشتیاں بھی اس کے پاس تھیں۔ اس نے اپنی عقل و اجتہاد اور جنگی مہارت سے یہ تجویز کیا کہ جنگی بیڑہ کا ایک حصہ خشکی سے خلیج تک پہنچایا جائے۔ اس نے لکڑیوں پر چربی مل کر ستر (۷۰) جہاز قاسم پاشا کی سمت سے سمندر میں اتار دیے۔''

سلطان محمد فاتح سے یورپ اس قدر مرعوب اور خوف زدہ تھا کہ اس کے انتقال پر پاپائے اعظم (پوپ) نے جشن مسرت منانے کا حکم دیا اور فرمان صادر کیا کہ تین روز تک مسلسل شکرانہ کی عبادت کی جائے۔
(فلسفہ تاریخ العثمانی، محمد جلیل: ص ۲۷۴)

ایک زمانہ تھا جب ترکی قوم بلند حوصلہ، پرجوش اور ایک زندہ قوم تھی جس میں جہاد کی روا ٹھکیلیاں پھر رہی تھی۔ اس کے پاس جنگی طاقت تھی جس سے وہ اسلام کے مادی اور روحانی تسلط کو پھیلا سکے اور حریف قوموں کی دست درازیوں کو روک سکے۔ عثمانی سلاطین تین براعظموں یورپ، ایشیا اور افریقہ میں حکومت کرتے تھے۔ ترکوں کے بحری بیڑے کا مقابلہ سارا یورپ مل کر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ۱۵۴۷ء میں پاپائے اعظم وینس، اسپین، پرتگال اور مالٹہ کی متحدہ بحری طاقت نے اس بیڑہ کو شکست دینا چاہی لیکن شکست کھائی۔ سلطنت عثمانیہ کا بحری بیڑہ تین ہزار فوجی جہازوں پر مشتمل تھا اور روم کے علاوہ ہر مشہور شہر حکومت عثمانیہ کے زیر فرمان تھا۔ (فلسفۃ التاریخ العثمانی: ص ۲۸۰)

ترکوں کی بدقسمتی سے زیادہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ عین ترقی و عروج کے زمانہ میں ترکوں میں تنزل و انحطاط شروع ہوگیا۔ آپس میں بغض وحسد پیدا ہوگیا۔ بادشاہ ظالم اور جابر ہونے لگے۔ گویا تنزل شدہ قوموں کے پرانے امراض ان میں پیدا ہوگئے۔ سب سے بڑا مرض جو ترکوں میں پیدا ہوا اور یہ مرض آج تک تمام دوسرے اسلامی حکمرانوں میں بھی موجود ہے، وہ جمود کا مرض ہے یعنی علم و تعلیم میں بھی جمود اور فنون جنگ اور عسکری تنظیم و ترقی میں جمود۔ یہ جمود ان میں اس وجہ سے پیدا ہوا کہ انھوں نے قرآن حکیم کی اس آیت کو باطل فراموش کر دیا:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ﴾ (الانفال: ۶۰)

''(مسلمانو!) جہاں تک تمھارے بس میں ہے قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر

دشمنوں کے مقابلہ کے لیے اپنا ساز وسامان مہیا کیے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے۔ نیز ان لوگوں کے سوا اوروں پر بھی جن کی تمھیں خبر نہیں۔''

اس جمود کی وجہ سے ترک مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ اپنی جگہ رہے اور یورپی قومیں کہیں سے کہیں پہنچ گئیں۔ یہ علمی جمود اور ذہنی اضمحلال اس وقت صرف ترکی ہی میں نہ تھا بلکہ پورا عالم اسلام مشرق سے مغرب تک اس علمی انحطاط کا شکار تھا۔ عالم اسلام پر ایک عالم گیر جمود اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ یہ علمی اضمحلال نہ صرف سائنسی علوم میں تھا بلکہ علم دین، ادب وشاعری بھی اپنی زندگی کی تازگی کھو چکی تھی اور ان پر تقلید وتتبع کا غلبہ تھا۔ نثر وانشا پردازی کا تکلف اور تصنع قافیہ پیمائی، لفظی صنائع اور عبارت آرائی سے بے رونق اور بے روح بنا رکھا تھا۔

یہ وہ دور تھا جس میں قوموں کی تاریخ نئے سرے سے ڈھل رہی تھی۔ اس زمانہ کا ایک ایک لمحہ کئی کئی دن اور ایک ایک دن کئی کئی سالوں کے برابر تھا۔ مسلمانوں نے اس زندگی کے وہ لمحات ضائع کیے جنھوں نے ان کو صدیوں پیچھے دھکیل دیا تھا، اور ان کے برعکس یورپی قومیں صدیوں کی مسافت برسوں میں طے کر گئیں۔

صنعت وحرفت کے میدان میں ترکوں کی پس ماندگی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جہاز سازی کی صنعت ترکی میں سولھویں صدی کے بعد شروع ہوئی۔ اٹھارویں صدی میں ترکی پریس، حفظان صحت کے مراکز اور کیڈٹ کالجوں سے روشناس ہوا تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک ترکی ایجادات اور صنعتی ترقیوں سے اس قدر بیگانہ تھا کہ ایک روز قسطنطنیہ کے باشندوں نے ایک غبارے کو پرواز کرتے دیکھا تو اس کو سحر یا کیمیا کی کرشمہ سازی سمجھے۔ جب ترکی کا حال یہ تھا جو تمام عالم اسلام کا مرکز اور قائد تھا تو دوسرے عرب اور اسلامی ممالک کا کا حال ہوگا'؟ وہ تو ترکی کے دست نگر تھے۔

پھر مسلمانوں کا انحطاط اور تنزل صرف حکمت اور علوم نظری اور صنعت وحرفت ہی میں نہ تھا بلکہ ایک ہمہ گیر انحطاط طاری تھا یہاں تک کہ وہ اپنے جنگی فنون میں بھی یورپ سے پیچھے رہ گئے جن میں ترکوں کو درجۂ امامت اور اجتہاد حاصل تھا۔ اس کے برعکس یورپ اپنی ایجاد واجتہاد اور تنظیم کی بدولت فنون حربیہ میں بھی ترکوں سے بہت آگے نکل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی فوجوں نے ۱۷۷۴ء میں عثمانی افواج کو شرمناک شکست دی اور دنیا کو یہ بتا دیا کہ ترک جنگی طاقت میں بھی یورپ کی عیسائی قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس شرمناک شکست نے اگرچہ عثمانی حکومت کی آنکھیں کھولیں اور انھوں نے چند یورپی ماہرین کی خدمات حاصل کر کے اپنی فوج کی از سر نو تنظیم وتربیت کا کام شروع کیا لیکن اب بہت وقت گزر چکا تھا اور ان پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ گیا تھا۔ ترکی کی اصلاح وترقی کا اصل قدم سلطان سلیم ثالث نے انیسویں صدی کے آغاز میں اٹھایا کیونکہ اس کی تعلیم وتربیت قصر شاہی کے بجائے باہر کے ملکوں میں ہوئی تھی۔ اس نے نئے طرز کے مدارس اور یونیورسٹیاں قائم کیں۔ انجینئرنگ کالج میں وہ خود جا کر تعلیم دیتا تھا۔ نظام جدید کے نام سے اس نے ایک نئی فوج

کی بنیاد بھی رکھی اور ملک کے سیاسی نظام میں بھی کچھ تبدیلیاں کیں لیکن قوم اور سلطنت کے جمود کا یہ عالم تھا کہ پرانی فوج نے بلوہ کر کے سلطان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس اصلاحی مہم میں محمود ثانی (۱۸۰۷ء۔۱۸۳۹ء) اور اس کے بعد سلطان عبدالمجید (۱۸۳۹ء ۱۸۵۱ء) نے ترکی کی ترقی میں کچھ حصہ لیا۔ ترکی کے اس علمی جمود اور فنی انحطاط کے نتیجہ میں مغربی اقوام اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مراکش، الجزائر، مصر، ہندوستان اور ترکستان وغیرہ پر قابض ہو گئیں، اور ترکی کا رہا سہا بھرم کمال اتاترک نے ۱۹۲۴ء میں خلافت ختم کر کے ختم کر دیا۔

سائنس کے یورپ پر اثرات:

سائنس نے اندلس اور بغداد میں جنم لیا تھا۔ انھوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کی لیکن سائنس نے ان کے معاشرہ اور اخلاق کو تباہ و برباد نہیں کیا تھا۔ لیکن سائنس کے یورپ پر اثرات اس کے بالکل برعکس ہوئے۔ سائنس کے یورپ میں پہنچنے سے قبلیہ ہی یورپ کی اخلاقی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی کیونکہ مغربی تہذیب کا شجرہ نسب یونانی تہذیب سے ملتا ہے۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ یونانی تہذیب کے کھنڈر پر رومی تہذیب کی عمارت قائم ہوئی تھی جس میں ایک ہی مغربی روح کام کر رہی تھی۔ مغربی قومیں صدیوں تک ان کی دونوں تہذیبوں کی خصوصیات اور مزاج، ان کے فلسفہ، علوم و ادب اور افکار و نظریات دونوں تہذیبوں کی خصوصیات اور مزاج، ان کے فلسفہ، علوم و ادب اور افکار و نظریات کو سینہ سے لگائے رہے۔ انیسویں صدی میں انھیں خصوصیات کے ساتھ انھوں نے ایک نئے لباس میں ظہور کیا۔ اس لباس کی چمک دمک سے یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ نیا ہے، لیکن دراصل اس کا تانا بانا یونانیوں اور رومیوں کے ہاتھ کا کاتا ہوا ہے۔

یورپ میں سائنسی علوم جانے سے پہلے لوگوں میں رہبانیت کا بہت زور تھا۔ راہب لوگ نہایت غلیظ اور گندے رہتے تھے۔ برسوں غسل نہ کرتے اور نہ ہی منہ دھوتے۔ اس زمانے میں رہبانیت کا ایک جنون تھا جو لوگوں پر سوار تھا جس کا تفصیلی تذکرہ تاریخ اخلاق یورپ میں لیکی نے کیا ہے۔ رہبانیت تو صحراؤں میں تھی، لیکن شہروں میں فسق و فجور کا دور دورہ تھا۔ گویا اس زمانہ میں عیسائی دنیا کی اخلاقی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی رہبانیت تو سراسر خلاف فطرت تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی عیسائی ممالک میں ایک اور تحریک معصیت و آزادی کی بھی چل رہی تھی۔ اس دوسری تحریک کی وجہ سے مذہبی مرکزوں اور دینی حلقوں میں عیش پرستی کے وہ تمام عیوب آ گھسے جن سے بچنے کے لیے رہبانیت کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ مذہبی مراکز اور ارباب کلیسا اخلاقی انحطاط اور عیش و تنعم میں دنیا دار حلقوں سے بھی دو قدم آگے نکل گئے۔ بڑی بڑی مذہبی تقریبات بھی فسق و بے حیائی اور عیش و عشرت کا اڈا بن گیا۔ چنانچہ سینٹ جروم کا مشہور قول ہے: ''اہل کلیسا کے تعیش کے سامنے امراء اور اہل دولت کی عیش و عشرت ایک پرکاہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔''

سائنس کے یورپ میں داخل ہونے کے ساتھ ساتھ یورپ میں عقلیت کا کوہ آتش فشاں پھٹ چکا

تھا۔ علمائے طبیعات اور محققین تقلید کی زنجیریں توڑ چکے تھے۔ انھوں نے اہل کلیسا کے خلاف عقل عقائد کو اپنی علمی تنقید کا نشانہ بنایا اور ان پر بے سمجھے ایمان لانے سے یک قلم انکار کر دیا۔ اس چیز نے مذہبی حلقوں میں قیامت برپا کر دی۔ ارباب کلیسا اس زمانہ میں اقتدار اور طاقت کے اصل مالک تھے۔ انھوں نے ان لوگوں کی تکفیر کا فتویٰ دیا اور ان کو سخت سے سخت سزائیں دیں۔ ظلم جب حد سے بڑھ جائے تو وہ بغاوت پر منتج ہوتا ہے۔ اہل کلیسا کے ظلم کو دیکھ کر روشن خیالوں اور ترقی پسندوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور انھوں نے ارباب مذہب کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ انھیں اب مذہبی گروہ کے عقائد، علم، اخلاق اور آداب سے سخت نفرت ہو گئی بلکہ ہر اس چیز سے نفرت ہو گئی جس کی نسبت اس گروہ کی طرف کی جاتی تھی۔ اہل کلیسا کے ظلم و بربریت اور جبر و تشدد نے روشن خیال طبقہ کو اس قدر عجلت پسند بنا دیا کہ وہ یہ سوچ سکیں کہ اس ظلم و تشدد کا باعث اہل کلیسا ہیں یا مذہب۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کا رخ مذہب کو خیر باد کہہ کر ایک وسیع اور مکمل مادیت کی طرف چلا گیا۔ ان کی زندگی کے تمام شعبوں میں مادیت غالب آگئی۔

علماء فلسفہ اور علوم طبیعات نے کائنات میں اس طرز پر غور اور بحث کرنی شروع کی کہ گویا نہ اس کا کوئی خالق ہے، نہ منتظم اور حاکم، اور مادہ کے ماوراء کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو اس عالم میں تصرف اور اس کا نظم و نسق کرتی ہے۔ وہ عالم طبعی اور اس کے ظواہر و آثار کی تشریح و توجیہ خالص میکانکی طریقہ پر کرنے لگے اور اس کا نام علمی اور تحقیقی طرز قرار پایا۔ اس کا طبعی اور منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کا وجود اور تمام حقائق مابعد الطبیعات ایسے مفروضات بن گئے جن کی گویا علم و عقل سے کوئی تائید نہیں ہوتی۔

ان لوگوں نے ایک زمانہ دراز تک خدا کا انکار نہیں کیا اور مذہب سے اعلان جنگ بھی نہیں کیا۔ لیکن یورپ نشأۃ ثانیہ کے بعد لوگ مدت دراز تک مادی نقطۂ نگاہ، مادی زندگی اور مسیحی اعمال و رسوم کو جمع کرنے کی کوشش کرتے رہے، اسی زمانہ میں یورپ کے ہر گوشہ میں بہت بڑی تعداد میں ایسے مصنف، ادیب، اجتماعی اور سیاسی معلم پیدا ہوئے۔ جنھوں نے لوگوں کے ذہنوں میں مادیت کا صور پھونکا اور اہل ملک کے دل و دماغ میں مادہ پرستی کی تخم ریزی کی۔ میکاولی جیسے اہل سیاست نے دین و سیاست کی تفریق کی دعوت پہلے ہی دے دی تھی، اور اخلاق کی دو قسمیں قرار دی تھیں۔ پبلک اور پرائیویٹ اور مذہب کو انسان کا ایک پرائیویٹ معاملہ قرار دے دیا گیا۔ اس کو امور سیاست میں کوئی دخل نہیں دینا چاہیے۔ حکومت ہر چیز پر مقدم ہے اور ہر چیز سے بیش قیمت ہے۔ مذہب کا تعلق دوسری زندگی سے ہے۔ ہماری دنیوی زندگی سے اس کو کوئی سروکار نہیں۔ مذہبی اور نیکوکار لوگوں کا وجود حکومت کے لیے چنداں مفید نہیں، اس لیے کہ وہ دین کے احکام کے پابند ہوتے ہیں اور ضرورت کے وقت اخلاقی اصولوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے جب کہ بادشاہوں کے لیے کوئی اخلاقی اصول نہیں ہوتے۔ وہ سیاسی مصلحت کے لیے دروغ گوئی، فریب دہی، خیانت، نفاق اور دوسرے تمام اخلاقی جرائم کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔ اس نظریہ کو مصنفین اہل قلم، اہل دماغ اور اپنی جادو بیانی، سحر طرازی اور خطابت و شاعری نے خوش نما اور

دل فریب انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کیا اور اس کے ساتھ مطلق آزادی، زندگی سے پورے پورے تمتع اور مطالبات نفس کی پوری تکمیل اور لذت پرستی کی اعلانیہ دعوت دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے یورپ اور امریکہ میں مادیت پرستی، لذت طلبی پھیل گئی۔

اب یورپ کے موجودہ مذہب جس کی دلوں اور روح پر حکومت ہے وہ مسیحیت نہیں بلکہ مادہ پرستی ہے۔ چنانچہ اس بارے میں محمد اسد نے بالکل درست لکھا ہے:

''اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ یورپ میں اس وقت بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو مذہبی طریق پر سوچتے ہیں اور دل میں مذہبی احساس رکھتے ہیں۔ اور اپنے عقائد کو اپنی تہذیب کی روح کے ساتھ منطبق کرنے میں امکانی کوشش کرتے ہیں، لیکن یہ مستثنیٰ مثالیں ہیں۔ یورپ کا عام اور متوسط آدمی، وہ جمہوری ہو یا فاشستی، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی، ہاتھ سے کام کرنے والا ہو یا دماغی محنت کرنے والا، وہ ایک ہی مذہب جانتا ہے۔ وہ کیا؟ مادی ترقی کی پرستش اور یہ عقیدہ کہ اس زندگی کی غرض وغایت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ آسان، پر راحت، آزاد اور بے قید بنایا جائے۔ اس مذہب کے گرجے اور عبادت گاہیں زبردست اور بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ تھیٹر اور تفریح گاہیں، کیمیاوی دارالصنعت، ناچ گھر اور بجلی کے مرکز، اس مذہب کے پروہت بنکوں کے افسران ہیں، انجینئر، اداکار عورتیں، فلم اسٹارز اور تجار تو صنعت کی بڑی مرکزی شخصیتیں اور رکارڈ قائم کرنے والے ہوا باز ہیں۔ طاقت ولذت کی اس ہوس اور چٹور پن کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ حریف گروہ سامان سے لیس اور جنگی تیاریوں سے مکمل تیار کھڑے ہیں اور ایک دوسرے کو تباہ کر دینے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ اگر ان کی خواہشات اور مصالح میں تصادم ہو گیا، اور جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے انسانوں کا ایک ایسا ٹائپ پیدا ہوا ہے جس کا عقیدہ ہے کہ نیکی اور اخلاق نام ہے عملی فائدہ کا۔ اس کے نزدیک معیار محض مادی کامیابی ہے۔'' (Islam at the Crossroads, P.60)

جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور یوم آخرت پر سے ایمان اٹھ جائے اور زندگی کا مقصد وحید صرف دنیوی آسائش اور آسودگی ہو تو پھر انسان مال وزر کی پرستش کرنے لگتا ہے، اور اللہ کی پرستش میں اسے کوئی دنیوی فائدہ نظر نہیں آتا۔ چنانچہ پروفیسر جوڈ (Joad) نے جو لندن یونیورسٹی میں شعبہ فلسفہ اور علم النفس کے صدر رہیں، انھوں نے صاف لفظوں میں لکھا ہے:

صدیوں سے انگلستان کے تخیل پر زر اندوزی کا اصول غالب ہے۔ حصول دولت کی خواہش گذشتہ دو سو سال سے دوسرے تمام محرکات سے زیادہ کام کرتی رہی ہے کیونکہ دولت حصول ملکیت کا ذریعہ ہے اور ذاتی ملکیت کی بہتات اور شان وعظمت ہی سے انسان کی قابلیت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ سیاسیات، ادب، سینما، ریڈیو اور کبھی کبھی کلیساؤں کے منبروں پر ہر سال اپنے پڑھنے سننے والوں کو

یہی تعلیم دی جاتی رہی ہے کہ دنیا میں مہذب قوم وہی ہے جس میں جذبہ حصول زر انتہائی طور پر ترقی کر چکا ہے۔“ (Joad: Philosophy of our times, P.114)

ممتاز امریکی اخبار نویس جان گنتھر نے اپنی کتاب Inside Europe میں اس زر پرستی کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے:

”انگریز ہفتہ میں چھ روز بنک آف انگلینڈ کی پرستش کرتا رہتا ہے۔ صرف ساتویں روز کلیسائے انگلستان کا رخ کرتا ہے۔“

موجودہ مغربی تہذیب نے علم وصنعت اور اخلاق وانسانیت کے مابین جو عظیم فاصلہ پیدا کر دیا ہے اور یہ تہذیب انسانیت کی صحیح خدمت کرنے میں جس بری طرح ناکام ہو رہی ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے نوبل انعام یافتہ دانشور ڈاکٹر الیکس کیرل نے اپنی کتاب Man TheUarnoun کے صفحہ ۶۲ پر نہایت تفصیلی بحث کی ہے۔

سائنس نے یہ ایجادات کر کے آج مادی طور پر یورپ اور امریکہ کو تمام دنیا پر غلبہ دیا ہوا ہے۔ یہ مصنوعات اور ایجادات انسان کی عقل اور اس کے اخلاق کے تابع ہیں۔ انسان ہی اس کو خیر اور شر بناتا ہے۔ مثال کے طور پر ہوائی جہاز جو فضائے آسمانی میں منڈلا رہا ہے، اس کے موجد نے اس کو سفر کی آسانی اور سرعت کے لیے بنایا تھا لیکن اب انسان نے اپنے ذہنی شر کی بنیاد پر بمباری کے لیے استعمال کیا۔ اس نے فضا سے بمباری کر کے انسانوں کے جسموں کے ٹکرے اڑائے۔ زندوں کا گلا گھونٹا، انسانی جسموں کو جلا دیا، زہریلی گیسوں کو کمزور انسانوں پر پھینکا۔ ہوائی جہاز کا یہ مقصد یا تو احمقوں کا ہوسکتا ہے یا پھر شیاطین کا۔ اندلس کے مسلمانوں نے جو سائنس کے اصل موجد تھے انھوں نے نہ تو سائنس کو احمقوں کی طرح استعمال کیا اور نہ ہی شیاطین کی طرح بلکہ مسلمان ہونے کے ناطے ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف تھا۔ انھوں نے سائنس کو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا کیونکہ وہ انسانیت کے بہی خواہ تھے۔ وہ تمام لوگوں کو اللہ کا کنبہ (عیال اللہ) سمجھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے سائنس کو انسانیت کے فائدے کے لیے استعمال کیا لیکن یہی سائنس جب یورپ کے شیاطین کے پاس آئی تو انھوں نے اخلاق وتمدن کے صحیح اصول ومبادی کا سرشتہ توڑ کر اس کو انسانیت کی تباہی و بربادی کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ان لوگوں کا انسانی ذوق فاسد ہو گیا تھا۔ جس طرح وبائی امراض میں اچھی اور صالح غذا مریض کے معدہ میں پہنچ کر مسموم اور فاسد ہو جاتی ہے، اسی طرح علوم وفنون، صنعتیں، ایجادات ،انکشافات اور علمی ترقیاں یورپ میں خود اہل یورپ کے لیے اور عام انسانیت کے لیے وبال جان بن گئی ہیں۔ مثال کے طور پر کئی سال کی جدوجہد اور کروڑوں ڈالر خرچ کر کے امریکہ نے ایٹم بم ایجاد کیا۔ یہ بم انسانیت کی ترقی کے لیے نہیں بلکہ اس کی تباہی کے لیے بنایا گیا تھا۔ ۱۶/ جولائی ۱۹۴۵ء کو اس بم کا تجربہ کیا گیا۔ پھر اس کا دوسرا تجربہ ۱۶/ اگست ۱۹۴۵ء کو جاپان کے بدقسمت شہر ہیروشیما

پر کیا گیا۔ اس بم کے گرتے ہی پورا شہر تودۂ خس و خاشاک بن گیا، اور دنیا نے دیکھ لیا کہ آن کی آن میں انسان، حیوان، عمارتیں سب صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔ گرد و غبار کا جھلتا، ابلتا اور کھولتا ہوا میلوں اونچا ایک پہاڑ تھا اور اس پہاڑ کے نیچے جہنم کی سی آگ تھی جس نے ہر چیز کو خاکستر بنا دیا۔ دھماکہ اتنا مہیب اور شدید تھا کہ بم گرانے والوں کا پتہ پانی ہو گیا تھا۔ ہیروشیما کی میونسپلٹی کے صدر نے ۲۰/اگست ۱۹۴۹ء کو اعلان کیا تھا کہ ۱۶/اگست ۱۹۴۵ء کو ایٹم بم سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۲ لاکھ ۱۰ ہزار اور ۲ لاکھ ۴۰ ہزار کے درمیان تھی۔ اس ایٹم بم کے پھینکنے میں جو ہوا باز شریک تھے، ان کا بیان ہے کہ اس بم کے گرنے کے بعد غبار اور دھواں ۹ میل تک ہوا میں پھیل گیا۔ پروفیسر Pleseh کی رائے ہے کہ جس جگہ بم پھٹے اس کے قرب و جوار میں سو میل کے علاقہ کے رہنے والے لوگوں کی سائنٹفک طریقہ پر جانچ پڑتال کرنی چاہیے اور ان کی جسمانی حالت کو نہایت غور سے دیکھنا چاہیے کہ کہیں ان پر اس کا اثر تو نہیں ہو گیا۔

اس تہذیب نے کچھ دانشور ایسے بھی پیدا کیے جنھوں نے انسان کو ایک جانور ثابت کیا حالانکہ انسان محض ایک حیوانی وجود یا ڈارون کے نظریہ کے مطابق ایک بڑھیا جانور (Higher Aminel) ہی نہیں بلکہ وہ نطق و گویائی سے بھی متصف ہے۔ وہ محض گوشت پوست اور خون اور ہڈیوں ہی سے مرکب نہیں بلکہ عقل و شعور اور فہم و ادراک کی قوتوں سے بھی مالا مال ہے۔ وہ محض ایک جانور ہی نہیں بلکہ ایک ایسے حیرت انگیز ذہن و دماغ کا بھی مالک ہے جس کی وجہ سے وہ کسی بھی چیز کے متعلق مختلف خیالات و نظریات قائم کرتا اور منطق و استدلال سے کام لیتا اور خیر و شر میں تمیز کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ انسان کا ظاہری اور جسمانی نظام اگر ایک حقیقت ہے تو اس کا باطنی اور اندرونی نظام بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ اگر ظاہری نظام کو ہم ''جسم'' سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے باطنی نظام کو ہم ''روح'' سے موسوم کرتے ہیں۔ کھانا، پینا، سونا، جاگنا، شادی بیاہ کرنا اور جسمانی راحت اور آرام وغیرہ جسم کے مظاہر ہیں تو سوچنا، غور و فکر کرنا، نطق و گویائی، عقل و شعور اور دلیل و استدلال وغیرہ سے کام لینا روح کے خواص ہیں۔ اول الذکر سے جسم نشو و نما پاتا ہے تو دوسرے سے روح کی آبیاری ہوتی ہے۔ روح کے خواص و اثرات ہی انسان کے عمل و کردار کو جنم دیتے ہیں اور اس کے لیے راہ عمل متعین کرتے ہیں۔ روح کا یہ عمل جب اپنی صحیح سمت اور صحیح رخ میں رواں ہوتا ہے تو اس سے حسن اخلاق اور تہذیب و شائستگی کے چشمے پھوٹتے ہیں، لیکن جب اس کا رخ اور بہاؤ غلط سمت کی طرف ہو جاتا ہے تو پھر بداخلاقی اور حیوانیت کو عروج ہونے لگتا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے حیوانیت اور انسانیت کی راہیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ اس دوآبے پر پہنچ کر ''ڈارونیت'' اور ''آدمیت'' کی منزلیں الگ الگ نظر آنے لگتی ہیں، اور یہی وہ مرکزی مقام ہے جہاں پر انسان باقی تمام انواع حیات سے نمایاں اور ممتاز نظر آنے لگتا ہے، اور لاکھوں انواع حیات میں یہ مرتبہ اور مقام سوائے انسان کے اور کسی کو حاصل نہیں ہو سکا۔

یہ ایک المیہ ہے کہ مغربی تہذیب میں جسم کی نشو و نما اور اس کی آسائش و زیبائش پر تو بہت زور دیا جاتا

ہے۔ چنانچہ سائنس کی قریباً تمام ترقیاں، ایجادات و اکتشافات جسم انسانی کو زیادہ سے زیادہ آرام و آسائش پہنچانے ہی کے لیے ہو رہی ہیں لیکن ارواح اور اس کی غذا کو یک قلم نظر انداز کر دیا گیا ہے حالانکہ سب سے زیادہ زور اسی بات پر دینا چاہیے تھا۔ اس کوتاہی کے باعث جسم اور روح کا توازن بگڑ گیا ہے جس کی وجہ سے انسان قعر مذلت میں گر گیا ہے۔

مغربی تہذیب یا تہذیب جدید کے علم برداروں نے مذہب سے بغاوت کر کے اور مادیت میں منہمک ہو کر روح اور اس کے مظاہر کو سمجھنے میں دانستہ یا نادانستہ طور پر سخت ٹھوکر کھائی ہے اور مادہ اور اس کے مظاہر کو سب کچھ قرار دے کر انسان کو اخلاقی حدود و قیود سے یکسر آزاد کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی معاشرہ میں ایک خوفناک قسم کی بے یقینی پھیل گئی۔ انسانیت دکھی ہو گئی اور پورے معاشرہ میں مایوسی اور بے چینی کے جراثیم سرایت کر گئے۔ ان سب اسباب و محرکات نے مل کر خود غرضیوں اور تن آسانیوں کو جنم دیا۔ جب کوئی مقصد حیات ہی نہ رہا اور زندگی کے مصائب و آلام میں سہارا دینے والی ہستی کا مرکزی تصور ہی سرے سے مفقود ہو گیا تو پھر غم غلط کرنے اور سموم و افکار سے پیچھا چھڑانے کے لیے عیاشیوں اور خرمستیوں کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے گئے، اور عشرت کدوں کو نئے سرے سے اس طرح آراستہ کیا گیا کہ حیوانیت اور بہیمیت کے سابقہ تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے یہاں تک کہ حیوانیت کو بھی انسانیت سے شرم آنے لگی۔ چنانچہ شاعر مشرق نے فرمایا ؎

حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا　　اقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوس ناکی

انسان نے تمام علوم پڑھ لیے اور قدرت کے بہت سے مخفی رازوں کو بے نقاب کر دیا لیکن خود اپنے آپ سے غافل رہا۔ نہ اپنی ہستی کو سمجھ سکا اور نہ ہی اپنے نفس کا عرفان حاصل کر سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج انسان کا خود اپنا وجود اس کی نظروں میں ایک راز بنا ہوا ہے۔ قدرت کا ایک ایسا مخفی بھید بنا ہوا ہے جو کسی طرح کھلتا نظر نہیں آتا۔ علم کی ترقی جس نسبت سے ہو رہی ہے اسی نسبت سے اس کا وجود مزید پراسرار بنتا جا رہا ہے ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا　　اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا　　آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

آج انسانی تمدن بے انتہا ترقی کر گیا ہے اور اس کا ظاہری اور مادی علم انتہائی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ چنانچہ وہ مادی قوتوں کو زیر کر کے اجرام سماوی پر کمندیں ڈال رہا ہے اور کہکشاؤں میں تانک جھانک کر رہا ہے، لیکن اس کے برعکس اس کی روحانی ترقیاں ختم ہو گئیں بلکہ تنزل پذیر ہیں۔ ان کی روح کی غذا مفقود ہو گئی ہے نتیجہ یہ ہوا کہ روح اور جسم کے مابین فاصلہ بڑھتا گیا اور بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے اور انسانیت کی منزل نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا انسان ایک دوراہے پر کھڑا ہے اور اس کو اپنی منزل کی کچھ خبر

نہیں اور نہ وہ یہ جانتا ہے کہ وہ کدھر جا رہا ہے؟ عقلاء اور دانشور حیران اور سرگرداں ہیں کہ ان کی اصل منزل کیا ہے اور کیا ہونی چاہیے۔ ہر طرف بے یقینی، ظن وتخمین، تشکیک وارتیاب اور تخیلات ومفروضات کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ بے چینی، عدم طمانیت، ذہنی پراگندگی، غیر اطمینانی اور انتشار واضطراب کی ایک عجیب وغریب کیفیت ہے جو پورے عالم انسانی پر طاری ہوتی جا رہی ہے۔ تہذیب جدید کے یہ لادینی اور عالم گیر سوغات ہیں جنہوں نے ذہنوں کو مفلوج اور ماؤف کر کے رکھ دیا ہے اور پورا ماحول مسموم وزہر آلود ہو چکا ہے۔ تہذیب مغرب جس نے نمود ونمائش، عیش کوشی، مادیت، نظریہ بقائے اصلح اور علاقہ پرستی کے سوا دنیا کو اور کچھ نہیں دیا۔ اس تہذیب نے خدا، آخرت، جزا وسزا اور نیکی وبدی کی تمام اقدار کو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے معدوم کر دیا اور مادہ پرستی، خود غرضی، نفع اندوزی کو انسان پر ایسا مستولی کیا کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا بنیادی اصول اس تہذیب کا بنیادی نشان بن گیا۔ ذاتی فائدے کے لیے دھوکہ، جھوٹ، فریب، ظلم وستم اور انسانیت کی بربادی یہ سب چیزیں جائز قرار پائیں۔ روح کے تقاضے دم توڑ گئے اور جسمانی عیش وعشرت اور تفریح پسندی انسانوں کی تگ ودو کا محور ومرکز بن گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ انسانی احترام، عورت کا تقدس، بچوں کی معصومیت، جوانی کی عصمت، بڑھاپے کا وقار یہاں تک کہ خاندانی زندگی کا حسن وسکون اس کے علم برداروں کی نفس پرستی، تنگ نظری اور خود غرضی کی بھینٹ چڑھ گئے۔

اس تہذیب کا سب سے زیادہ خراب پہلو مادیت پرستی (Meterialism) ہے جس سے پھر آگے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس میں غایت حیات صرف یہی ہے کہ وہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ آسان اور پر راحت بنا سکے۔ اسی مقصد کے لیے سائنسی ایجادات کی گئیں۔ اس کے معابد بڑے بڑے کارخانے، کیمیاوی فیکٹریاں اور ڈانسنگ کلب ہیں، اور اس تہذیب کے پیشوا بینکوں کے آفیسر، انجینئرز، اداکار اور بڑی بڑی صنعتوں کے ناظمین اور ریکارڈ قائم کرنے والے ہواباز ہیں۔ اس تہذیب کا یہ بھی ایک نتیجہ ہے کہ حریف گروہ سامان جنگ سے لیس اور جنگی تیاریوں سے مکمل تیار کھڑے ہیں تاکہ جب کبھی ان کے مصالح میں تصادم ہو تو بغیر کسی تاخیر کے ایک دوسرے کو تباہ وبرباد کر دیں۔ اس تہذیب وتمدن میں انسان کے نزدیک نیکی اور اخلاق کا اصل پیمانہ صرف ذاتی مفاد ہے۔ اس تہذیب میں معاشی معاملات دوسرے تمام معاملات کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہیں اور ایک چینی مفکر لن یوٹانگ (Lenyutong) کے مطابق ہماری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ایک اچھا کاروبار ہے اور اس دور میں اخلاقی اور روحانی قدروں کا دیوالہ نکل چکا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں جنت کا تخیل بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ یہ ایک ایسا گودام ہے جس میں مال ہی مال بھرا ہوا ہے۔ اس وقت پوری دنیا ایک کاروبار ہے۔ سیاسی کاروبار، ایک قوم ایک کارخانہ اور ایک حکومت وہ میز ہے جس پر لین دین کیا جاتا ہے، اور اس کے سیاست دان اس کارخانے کے سیلز مین ہیں جو ہر وقت اس ٹوہ میں رہتے ہیں کہ اپنے مال کو دوسری منڈیوں میں اوروں کی نسبت زیادہ فروخت کریں۔

یورپ جب قرون مظلمہ (Dark Ages) سے نکلا اور اسلامی اندلس کی عظیم درسگاہوں اور مسلمان سائنس دانوں کی وجہ سے وہاں علوم وفنون کو ترقی حاصل ہوئی تو مذہب اور اخلاق کی موت اور تباہی کی وجہ سے یورپ کی اس روشنی نے دنیا کو اندھیروں کے سوا اور کچھ نہ دیا جب کہ اندلس نے اندھیروں کے بجائے یورپ کو روشنی اور اجالا دیا۔ یہ یورپی قومیں جب اپنے ملکوں سے باہر نکلیں تو یہ دنیا والوں اور ان کی تہذیبی، تمدنی، مذہبی اور اخلاقی اقدار کے لیے تاتاریوں سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوئیں، اور دنیا کے لوگوں پر وہ وہ مظالم توڑے کہ چنگیز خان اور ہلاکو خان کی روحیں بھی کانپ اٹھیں۔ مغربی تہذیب کے شجر خبیثہ نے وقت کے ساتھ ساتھ دنیائے انسانیت کو جو برگ و بار دیے وہ بڑے خوفناک اور بھیانک تھے اور تاریخ انسانی کے سیاہ ترین ادوار میں بھی اس کی مثالیں نہیں ملتیں۔

یورپ کا انسان تمام تر مادی سہولتوں کے باوجود آج بے حد دکھی اور پریشان حال ہے۔ بوڑھے بوڑھے لوگ خاندانی زندگی برہم ہونے کے باعث بڈھے خانوں میں ذہنی مریض بن کر زندہ درگور ہو جاتے ہیں، اور ایک سال میں ایک دفعہ بھی ان کا کوئی بیٹا، بیٹی یا پوتا، پوتی ان سے ملنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ نوجوان مرد اپنی بیویوں کو چھوڑ کر دوسری نوعمر لڑکیوں کو پھانستے رہتے ہیں جس کے نتیجہ میں ان کی بیویاں نفسیاتی اور جسمانی مریض ہو جاتی ہیں۔ اسی ذہنی پریشانی کی وجہ سے صرف امریکہ میں ہر سال ۷۵ ہزار سے زائد عورتیں حرکت قلب بند ہونے یا دماغی شریانیں پھٹنے سے موت کے منہ میں چلی جاتی ہیں۔ اسی مغربی تہذیب کے یہ برگ و بار ہیں کہ امریکہ کے باپ اپنے بچوں کو ۲۴ گھنٹوں میں سے صرف سات منٹ جب کہ امریکی مائیں صرف تیس منٹ دیتی ہیں۔

اقبال پہلے شخص ہیں جنھوں نے مغرب کی سیاسی، تمدنی اور تہذیبی تغلب کے خلاف حق کی آواز اٹھائی اور انھوں نے نہایت جرأت اور بے باکی سے اس کو ہدف تنقید بنایا۔

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب ۔۔۔ کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ۔۔۔ ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

ایک اور جگہ اقبال نے فرمایا ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی ۔۔۔ یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خرد مندان مغرب کو ۔۔۔ ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کار زاری ہے

ایک اور مقام پر اقبال فرماتے ہیں ؎

من درون شیشہ ہائے عصر حاضر دیدم ام ۔۔۔ آں چناں زہرے کہ ازدے مارہا در پیچ و تاب

علاوہ ازیں اقبال کی کتابیں تہذیب حاضر کو نہایت سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

چند مسلمان سائنس دانوں کے حالات زندگی

ذیل میں ہم ان چند سائنس دانوں کے مختصر حالات زندگی مختلف کتابوں سے نقل کر رہے ہیں۔ ان سائنس دانوں کا تعلق اندلس اور بغداد دونوں سے ہے کیونکہ یہی اس زمانے میں سائنسی علوم کے مرکز تھے۔ انھی کے ذریعے یورپ میں سائنس کے علوم پہنچے جنھوں نے ان کو انسانیت کی فلاح و بہبود کے بجائے زیادہ تر انسانیت کی تباہی اور بربادی کے لیے استعمال کیا اور اب بھی کر رہے ہیں جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

ابوعلی محمد الحسن ابن الہیثم (۹۶۵ء ـــــ ۱۰۳۹ء)

پورا نام ابوعلی الحسن یا محمد ابن الحسن یا الحسین بن الہیثم ہے، ازمنۂ متوسطہ کے یورپی ماخذ میں اسے بالعموم ال ہیزن Al hazen لکھا گیا ہے۔ (اسلامی دنیا اور ازمنہ متوسطہ کا سب سے بڑا طبیعیات دان، جس کا شمار ہمیشہ بڑے بڑے ماہرین بصریات میں ہوتا رہے گا۔ وہ ہیئت دان بھی تھا، عالم ریاضیات بھی اور طبیب بھی۔) اسے طب اور فلاسفۂ متقدمین کے ارسطا طالیسی فلسفے پر پوری پوری دسترس حاصل تھی۔ مزید برآں اس نے ارسطو اور جالینوس کی تصانیف کی شرح بھی کی۔ وہ ۳۵۴ھ/ ۹۶۵ء کے قریب بصرے میں پیدا ہوا، اسی وجہ سے بعض اوقات اسے ابوعلی البصری بھی کہا جاتا ہے۔ وہ اچھی خاصی عمر میں مصر آیا، جہاں اس نے چند سال فاطمی خلیفہ الحاکم کی ملازمت میں گزارے۔ معلوم ہوتا ہے خلیفہ نے خود اسے مصر آنے کی دعوت دی تھی۔ مصر آ کر اس نے خلیفہ سے اس امر کی پیشکش کی کہ وہ نیل کے بہاؤ کو قابو میں لا سکتا ہے، لیکن اسوان کے قریب دریا کا معائنہ کرنے کے بعد اسے جلد ہی یہ منصوبہ ترک کرنا پڑا۔ اس پر اسے بے حد خجالت ہوئی۔ بایں ہمہ خلیفہ نے بعض دواوین (محکمے) اس کے سپرد کر دیے، جن میں وہ ارادۃً نہیں، بلکہ خلیفہ کے ڈر سے مجبوراً کام کرتا رہا۔ اس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ اس کے دماغ میں فتور ہے، تا آنکہ الحاکم کا انتقال ہو گیا جس کے بعد وہ ریاضی اور بعض دوسرے علوم میں اپنی تصنیفات کی بدولت گزر اوقات کرتا رہا۔ اس نے ۴۳۰ھ/ ۱۰۳۹ء کے آخر یا اس کے فوراً بعد وفات پائی، جیسا کہ اس کے تراجم میں مذکور ہے۔ علم ہیئت میں اپنی مہارت کے باعث اسے بطلیموس ثانی

بھی کہتے ہیں) ابن ابی اصیبعہ نے ابن الہیثم کی کوئی دو سو کتابوں اور رسالوں کا ذکر کیا ہے، جو اس نے ریاضیات، ہیئت، طبیعیات، فلسفہ اور طب میں تصنیف کیں اور جن کے لیے قارئین کو مآخذ ذیل سے رجوع کرنا چاہیے، بالخصوص (ابن ابی اصیبعہ کے علاوہ) F.Woepcke اور E.Wiedmann کی تصانیف سے۔ طبیعیات میں اس کی اہم ترین تصنیف Optics یعنی کتاب المناظر (یا تنقیح الناظر) ہے، جس کا لاطینی ترجمہ ۱۵۷۲ء میں F.Risncs نے Basle سے ''شفق'' پر مصنف کے ایک رسالے کے ساتھ بعنوان Opticae thesaurus Alhazeni Arabis bibriseptem nune premin edite. Eiusdem lober dc crepusculis et nubium ascensionibus, etc., a Fred. Risnero شائع کیا۔

لاطینی میں مؤخر الذکر مقالے کا ترجمہ Gerhard of Cremona نے کیا تھا اور غالباً المناظر کا بھی ۱۵۷۲ء میں کیا تھا جس کے متعلق یقین سے ابھی تک کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ قرون وسطیٰ میں راجر بیکن Roger Bacon سے لے کر کیپلر تک یورپ نے علم مناظر کے مطالعے میں ابن الہیثم کی کتاب المناظر سے نہایت گہرا اثر قبول کیا۔ اس میں آنکھ کا مکمل بیان موجود ہے اور رؤیت کی نہایت عمدہ تشریح کی گئی ہے۔ عربی میں کمال الدین ابوالحسن الفارسی (م: ۱۳۲۰ء) نے المناظر کی جو ضخیم شرح لکھی تھی وہ بھی اب تک موجود ہے۔ شرح مذکور اور ابن الہیثم کی المناظر کے لیے دیکھئے ویڈمان (Wiedmann) کے مصنفات۔

(ابن الہیثم نے عکسیات (catoptrics)، کروی اور شلجمی (parabolic) آئینوں، کروی انحرافات (aberrations) اور انعطافات (dioptrics) میں بھی تحقیقات کیں۔ وہ کہتا ہے کہ زاویۂ وقوع (incidence) اور زاویۂ انحراف کی نسبت یکساں نہیں رہتی۔ عدسہ میں یہ قوت ہے کہ ہر چیز کی جسامت کو بڑھا دے۔ اس نے فضائی انعطاف کا مطالعہ کیا۔ اس کے نزدیک شفق کی ابتدا یا انتہاء اس وقت ہوتی ہے جب آفتاب افق سے ۱۹ درجے نیچے ہو اور اس بناء پر فضا کا ارتفاع معلوم کرنے کی کوشش بھی کی۔ وہ دو چشمی رؤیت (vision binocular) کی توجیہہ کرتا ہے اور اس نے افق کے قریب چاند اور سورج کی جسامتوں میں اضافے کی نہایت صحیح تشریح کی ہے۔ ابن الہیثم پہلا شخص ہے جس نے حجلۂ تاریک (camera obscura) کا استعمال کیا۔

ابن الہیثم کے رسائل، جن میں سے بعض عربی میں شائع ہوئے (حیدر آباد 1357ھ) صرف ترجموں کی شکل میں دستیاب ہوتے ہیں۔

ابن العبری، تاریخ مختصر الدول: ۳۱۶، البیہقی، تاریخ حکماء الاسلام: ۸۵، جمیل بک، عقود الجوہر: ۱/۵۴، وبعدہ، مصطفیٰ نظیف، الحسن بن الہیثم، کشف الظنون: ۱/۱۳۸، جارج سارٹن G.Sarton: Introduction to the Hostory of Science، ج۱)(بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۱/۷۳۰)

الفارابی ابونصر محمد بن محمد بن طرخان بن اوزبلغ (۸۷۰ء ___ ۹۵۰ء)

الفارابی کا پورا نام ابونصر محمد بن محمد بن طرخان بن اوزبلغ ہے۔ لاطینی میں اس کے نام کی بہت سی صورتیں ہیں، لیکن عام طور پر اسے Alpharabius اور Abunazar کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ ترکی النسل تھا۔ علاقہ فاراب کے ایک شہر وسیج میں 870ء کے لگ بھگ پیدا ہوا اور وہ تقریباً اسی سال کی عمر میں بمقام دمشق ۹۵۰ء میں انتقال کر گیا۔ الفارابی کی فاراب کے جس علاقے میں ولادت ہوئی، یہ جگہ سیر دریا کے وسطی حصے میں اس کے معاون دریا اریس (Aris) کے دہانے کے قریب دریا کے دونوں جانب واقع ہے۔ یہ علاقہ ۸۳۹۔۴۰ میں سامانیوں نے فتح کیا اور اسے اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ اسی زمانے میں غالباً الفارابی کے دادا نے اسلام قبول کیا۔ اس کا والد فوجی افسر تھا اور اسے ایرانی النسل اُمراء میں شمار کیا جاتا تھا۔ بظاہر وہ ان سامانی امیروں کی ملازمت میں تھا جو ایران کے قدیم ساسانی بادشاہوں کی اولاد میں سے ہونے کے دعویدار تھے اور جدید فارسی ادب کی نشوونما کی بڑی سرپرستی کرتے تھے۔ ایران سے اپنے ان دیرینہ روابط کے باوجود الفارابی کے گھرانے میں سُغدی یا کوئی ترکی بولی رائج تھی اور آداب مجلس اور ملبوسات میں بھی وہ ترکوں ہی کا تتبع کرتے تھے۔ الفارابی نے اپنی تعلیم کا آغاز علوم متداولہ سے کیا اور اس دوران میں اس نے اسلامی فقہ پر خصوصی توجہ دی۔ جس علاقے میں الفارابی پیدا ہوا تھا، وہاں شافعی فقہ مروج تھی۔ اس لیے اس نے اسی فقہی مسلک میں کامل دستگاہ حاصل کی۔ بعد میں الفارابی نے بخارا میں علم موسیقی کا مطالعہ شروع کیا اور اس فن میں مہارت تامہ حاصل کر لی۔ یہاں سے اپنی تعلیم مکمل کر کے وہ مرو چلا گیا اور وہاں اس نے سریانی بولنے والے ایک نسطوری عیسائی یوحنا بن حیلان سے منطق پڑھنا شروع کیا یہی شخص بغداد میں اور شاید حران میں بھی اس کا استاذ رہا۔ الفارابی اپنے اس غیر مسلم استاد کا بڑا احترام کرتا تھا اور اس نے اپنی کتابوں میں جا بجا اسے اپنے استاد الاستاذہ قرار دیا ہے۔

معتضد کے دور خلافت (۸۹۲ء۔ ۹۰۲ء) میں الفارابی اور اس کا استاد دونوں بغداد چلے گئے۔ وہاں استاد نے اپنے مذہبی فرائض سنبھالے اور نسطوری خانقاہوں کے انتظام میں مصروف ہو گیا۔ یہاں اس کے شاگردوں کی تعداد بہت تھی، لیکن ان میں الفارابی وہ واحد مسلمان شاگرد تھا جو اس سے فلسفہ اور منطق کے علوم سیکھ رہا تھا۔ الفارابی نے اپنی تعلیم سریانی یا یونانی یا ان دونوں زبانوں میں حاصل کی۔ عربی مآخذ میں اس بات کا بالکل ذکر نہیں کیا گیا کہ الفارابی کا استاد عربی زبان سے واقف تھا یا نہیں۔ ان کتابوں میں اس کا ذکر صرف الفارابی کے استاد کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ابن حیلان کا بغداد کے فلاسفہ سے بھی کوئی رابطہ نہیں تھا کیونکہ اُن کی تعلیم اور تصنیف و تالیف کی زبان عربی ہی تھی۔ مزید برآں جب الفارابی بغداد پہنچا تو وہ ترکی زبان اور بعض دوسری زبانیں تو جانتا تھا لیکن عربی سے نابلد تھا۔ اس لیے وہ فلسفے کی تعلیم اس زبان میں حاصل نہیں کر

سکتا تھا۔ اس بات کا امکان بھی نہیں کہ اس نے ترکستانی یا سغدی یا جدید فارسی زبانوں کی مدد سے مختلف اسلامی علوم سیکھے ہوں۔ بعد میں الفارابی نے عربی زبان سیکھی اور یہ زبان سیکھانے میں معروف زبان دان ابن السراج نے اس کی بڑی مدد کی۔ الفارابی اس سے عربی زبان کی باریکیاں سمجھتا تھا اور اس کے بدلے میں وہ اس کو منطق اور موسیقی کی تعلیم دیتا تھا۔ چند ہی سالوں میں الفارابی نے عربی میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ اس کی تحریریں سادہ اور غیر مبہم عربی میں فلسفیانہ نثر کا عمدہ نمونہ قرار پائیں۔ عربی پر عبور حاصل کرنے کے بعد الفارابی بغداد کے فلسفیوں کے حلقوں میں حصہ لینے لگا اور وہ عربی زبان میں موجود ذخیرۂ علوم سے استفادہ کرنے کے قابل ہو گیا۔

المکتفی کے دورِ خلافت (۹۰۲ء-۹۰۸ء) میں یا المقتدر کے دور خلافت (۹۰۸ء-۹۳۲ء) کے آغاز میں الفارابی بغداد چھوڑ کر بغرض تحصیل علم قسطنطنیہ چلا گیا۔ پہلے اس نے ابن حیلان کے ہمراہ حران تک کا سفر کیا۔ الخطابی (۹۳۷ء-۹۹۸ء) نے الفارابی کے اپنے بیان کے حوالے سے کہا ہے کہ اس کے بعد الفارابی نے یونان کا رخ کیا اور وہاں آٹھ سال رہا۔ اس عرصے میں اس نے علوم کی تکمیل کی اور فلسفے میں اپنی تعلیم کو مکمل کر لیا۔

زبان دانی میں الفارابی کی دلچسپی، بغداد میں قیام کے دوران سریانی اور یونانی اساتذہ سے اس کے رابطے اور اس عہد میں اس بات کی آسانی کہ کوئی بھی مسلمان عالم اپنی علمی پیاس بجھانے قسطنطنیہ جا سکتا تھا، ایسے شواہد ہیں جن کی بنا پر الخطابی کی فراہم کردہ معلومات کے معتبر ہونے میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ ان تفصیلات سے الفارابی کی فکر اور تصانیف کے کئی نئے پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس نے اپنی افلاطونیت کی خصوصیات، روایات اور مآخذ تک رسائی حاصل کی۔ اسی طرح الفارابی کی تصانیف سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ پلوٹینس (Plotinus) اور مائیکل سیلس (Michael Psellus) کے ادوارِ حیات کی درمیانی مدت میں قسطنطنیہ کی یونیورسٹی میں فلسفے کی تعلیم کا کون سا کورس رائج تھا۔

۹۱۰ء اور ۹۲۰ء کے درمیان کسی وقت الفارابی قسطنطنیہ واپس لوٹ آیا اور یہاں بیس برس سے زائد عرصہ تصنیف و تالیف اور تدریس میں گزارا۔ اسی زمانے میں چار دانگ عالم میں اس کی شہرت بطور ایک فلسفی کے پھیل گئی اور یہ کہا جانے لگا کہ ارسطو کے بعد اگر اس پائے کا کوئی فلسفی اس دنیا میں آیا ہے تو وہ الفارابی ہی ہے۔ اس کے استاد ابن حیلان کا انتقال ۹۳۲ء سے قبل بغداد میں ہو چکا تھا۔ اس کے شاگردوں میں یوں تو بڑی معروف ہستیوں کے نام ملتے ہیں، لیکن ان میں دو شاگردوں کا نام قابل ذکر ہے۔ ایک معروف یعقوبی عیسائی عالم دین اور فلسفی یحییٰ بن عدی ہے جو بغداد میں اپنی وفات (۹۷۵ء) تک اپنے فلسفیانہ مدرسۂ فکر کا سربراہ رہا اور دوسرا اس کا بھائی ابراہیم جو الفارابی کی وفات سے ذرا پہلے تک حلب میں اس کے ساتھ تھا۔ ان ہم درس (Class fellows) اصحاب کے علاوہ فلسفیانہ افکار کے حقیقی وارث ابن سینا، ابن رشد اور ابن میمون جیسی قدر آور شخصیتیں ہیں۔ الفارابی کا اثر ارسطو اور افلاطون کے مطالعات اور ان شروح سے عیاں ہے، جو عربی، عبرانی اور لاطینی میں لکھی گئیں۔

فلسفہ اور فلسفیانہ طرزِ زندگی کا دفاع کرتے ہوئے الفارابی نے اپنے آپ کو ان مذہبی، فرقہ وارانہ اور سیاسی مناقشات سے دور رکھا، جو اس وقت بغداد میں زوروں پر تھے۔ وہ کسی مخصوص مذہبی فرقے یا مسلک سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ اس کے آبائی وطن کے کئی افسر اس کے دوست رہے ہوں گے اور ان کا تعلق فوج کے سرکردہ عہدیداروں اور خلیفہ کے دستۂ محافظین سے رہا ہوگا۔ غالباً ان کے ذریعے اس کا رابطہ ان سربرآوردہ سیکرٹریوں اور وزیروں سے ہوا ہوگا، جو علوم فلسفہ کی سرپرستی کرتے تھے۔ ان میں ابن الفرات، علی بن عیسیٰ اور ابن مقلہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ الفارابی نے موسیقی پر اپنی اہم ترین کتاب ابوجعفر الکرخی کے ایماء پر لکھی، جس نے ۹۳۶ء میں قلمدانِ وزارت سنبھالا۔ یہ کتاب موسیقی کی تاریخ اور فن میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

(معروف مسلم سائنسدان: ص ۲۹۷)

ابوعلی حسین ابن عبداللہ المعروف بہ ابنِ سینا (۹۸۰ء ___ ۱۰۳۷ھ)

ابوعلی الحسین ابن عبداللہ کو لاطینی میں Avicenna اور عبرانی میں Aven Sina کے نام سے جانا جاتا ہے۔ گو یورپ میں اب ابن سینا کا استعمال عام ہو رہا ہے۔ جامع العلوم فلسفی، طبیب، ریاضی دان اور فلکی، دنیائے اسلام کا شہرۂ آفاق سائنس دان جس کو مشرق نے بجا طور پر "الشیخ الرئیس" یعنی تاجدار علم وحکمت کے لقب سے یاد رکھا اور دنیا کی ہر نسل، ہر ملک اور ہر زمانے کے اشہر شہیر ارباب علم وفضل میں سے ایک ہے۔

(طبقات الاطباء، طبع مُلر A. Muller، ۲:۲ومابعد)

ابن سینا کا باپ عبداللہ ماوراء النہر کے سامانی امیر نوح ثانی (۹۷۶ تا ۹۹۷ء) کے عہد میں اپنے وطن مالوف بلخ سے بخارا آیا اور ارباب حکومت میں رسوخ کی بدولت ایک اعلیٰ عہدے پر مامور ہو گیا، لیکن کچھ دنوں کے بعد جب محکمۂ مالیات میں ایک دوسرا عہدہ ملنے پر اسے بخارا کے نواح میں خرمشین (خرمیطا) بھیجا گیا تو اس نے پاس ہی کے ایک قریے افشنہ میں شادی کر لی اور وہیں صفر، ۳۷۰ھ/ اگست ۹۸۰ء میں ابن سینا کی ولادت ہوئی۔ چھے برس کی عمر میں وہ اپنے باپ کے ساتھ بخارا پہنچا، جہاں اس کی تعلیم وتربیت کا آغاز ہوا۔ دس سال کی عمر میں اس نے قرآن مجید حفظ کیا اور پھر مختلف اساتذہ کے ہاں حساب، فقہ اور علم کلام کے علوم تحصیل کی۔ ادب کا مطالعہ وہ اس سے پہلے کر چکا تھا۔ علوم سے رغبت کی وجہ تھی کہ اسماعیلی دعاۃ کی صحبت نصیب ہوئی، جو اس کے باپ کے ہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے، یہ دوسری بات ہے کہ نفس اور عقل کے بارے میں وہ ان کی گفتگو سے کوئی اثر قبول نہ کرتا۔ منطق، فلسفہ، ہندسہ اور ہیئت (کتاب المجسطی کے آخری اسباق تک) کی تعلیم اس نے ابوعبداللہ الناتلی سے حاصل کی، جو اتفاقاً بخارا آیا اور اس کے باپ کے یہاں ٹھہرا تھا، تاہم شاگرد کے ذہنی نشوونما کی رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ تھوڑے ہی دنوں میں استاد سے سبقت لے گیا۔ اس دوران میں وہ خود بھی طبیعیات، مابعد الطبیعیات اور طب کا مطالعہ کر رہا تھا، چنانچہ طب میں تو اس نے جلد ہی مہارت پیدا کر لی، بلکہ علاج معالجے اور براہِ راست

تجربوں اور مشاہدوں کی مدد سے اپنی معلومات کی تکمیل بھی کرتا رہا۔

کہتے ہیں کہ علم طب جب معدوم تھا تو اسے بقراط نے پیدا کیا، جب وہ مر چکا تھا تو جالینوس نے اسے زندگی بخشی، جب وہ متفرق اور پراگندہ تھا تو الرازی نے اسے سمیٹا اور جب وہ ناقص تھا تو ابن سینا نے اسے مکمل کیا۔ چنانچہ ۱۸ سال کی عمر تک وہ دن رات پڑھنے لکھنے میں مشغول رہتا۔ نیند کا غلبہ ہوتا تو کوئی چیز پی لیتا تاکہ مطالعے میں فرق نہ آئے۔ سوتے وقت بھی اس کا ذہن مسائل میں الجھا رہتا، بلکہ بعض مسئلے تو نیند ہی کی حالت میں حل ہوتے۔ مابعد الطبیعیات کو البتہ وہ باوجود کوشش کے سمجھ نہیں سکا، چنانچہ یہ موضوع ارسطو کے بار بار مطالعے کے باوجود اس کی سمجھ میں نہیں آیا، تا آنکہ ایک روز کسی دلاّل کے مشورے سے اس نے فارابی کی ایک کتاب (الابانۃ) نیلام میں خریدی، جس سے یہ موضوع تمام و کمال اس کی سمجھ میں آ گیا۔ ابن سینا کو اس پر اتنی مسرت ہوئی کہ وہ اللہ کے حضور گر گیا اور سجدۂ شکر بجا لایا۔

اس اثناء میں ایک بڑا اہم واقعہ پیش آیا۔ ابن سینا کی عمر ۱۶۔۱۷ برس کی ہوگی جب نوح بن منصور تاجدار بخارا کا علاج اس نے نہایت کامیابی سے کیا اور اس کے صلے میں اسے کتب خانہ شاہی کا مہتمم مقرر کر دیا گیا۔ یہاں اپنی عدیم النظیر قوت حافظہ، ذہانت اور فطانت کی بدولت ابن سینا اپنے مشاغل علم میں تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا کہ اس کے اطمینان اور فارغ البالی کا یہ زمانہ دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔ وہ بیس برس کا تھا جب اس کے باپ نے وفات پائی اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد بخارا کے سامانی امیر کا بھی انتقال ہو گیا، چنانچہ اب ابن سینا نے اپنی زندگی کے اس دور میں قدم رکھا جس میں پریشانیاں ہی پریشانیاں تھیں۔ فرماں روا بخارا کی موت اس سیاسی اختلال کی تمہید تھی جو دولت سامانیہ میں رونما ہوا اور جس کے پیش نظر ابن سینا نے بخارا کو خیرباد کہا۔

۱۰۰۱ء میں وہ خوارزم پہنچا، جہاں علی ابن مامون کے دربار میں اسے ابوریحان البیرونی، ابونصر العراقی اور ابوسعید ابوالخیر ایسے علماء و صوفیہ سے ملنے کا موقع ملا۔ خوارزم میں چند دن گزارنے کے بعد اس نے عراق عجم کا رخ کیا، لیکن یہاں بھی بسبب اختلاف عقائد وہ سلطان محمود غزنوی کے خوف سے زیادہ دن نہیں ٹھہرا، بلکہ جان بچا کر جرجان پہنچا (۱۰۰۹ء) جہاں وہ بہت جلد ایک نئے مخمصے میں گرفتار ہو گیا۔

۱۰۱۵ء میں جرجان سے رے جاتے ہوئے اس نے ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں جو دیالمہ (آل بویہ) کے انتزاع سلطنت پر جابجا اٹھ کھڑی ہوئی تھیں بڑی پریشانی سے زندگی بسر کی۔ اس پرآشوب زمانے میں وہ کبھی وزیر، کبھی فلسفی، کبھی طبیب اور کبھی مشیر اور ناصح کے فرائض سرانجام دیتا اور کبھی اسے سیاسی مجرم قرار دیا جاتا۔

۱۰۲۲ء کا آغاز ہوا تو اسے امیر علاء الدولہ ابوجعفر کی صحبت میسر آ گئی، جو خود ایک آزاد خیال اور عالم فاضل انسان تھا۔ امیر موصوف ہمیشہ ابن سینا کو اپنے ساتھ رکھتا، چنانچہ ابن فارس سے مقابلہ پیش آیا تو ابن سینا بھی علاء الدولہ کے ہمراہ تھا۔ اسی دوران میں ابن سینا بیمار پڑ گیا اور پھر جوں جوں مہم نے طول کھینچا اس کی بیماری میں اضافہ ہوتا گیا، جو نتیجہ تھا دراصل ایک بے احتیاط، حد درجہ غیر معتدل اور مسرفانہ زندگی کا اور جس نے

اس کی صحبت کو مدت سے خراب کر رکھا تھا۔ بیماری ہی کی حالت میں وہ نحیف و ناتواں اصفہان لوٹا، جہاں بظاہر اس کی حالت سنبھل گئی، لیکن کچھ دنوں بعد جب وہ پھر علاء الدولہ کے ساتھ ہمدان روانہ ہوا تو مرض قولنج نے، جس کی شکایت اسے ایک عرصے سے تھی، پوری شدت سے اس پر حملہ کیا، حتیٰ کہ ۴ر رمضان ۴۲۸ھ/ ۲۱ر جون ۱۰۳۷ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ ہمدان میں اس کا مدفن اب تک موجود ہے۔

ابن سینا کے تحریری مشاغل کا آغاز اگرچہ بہت جلد ہو گیا تھا لیکن یہ جرجان، ہمدان اور اصفہان کے شاہی دربار تھے جہاں اس نے اپنی عظیم الشان تصنیفات کی تکمیل کی۔ پھر جب اس کی پر آشوب زندگی کا آغاز ہوا تو باوجود سیر و سفر وہ اپنی ضخیم کتابوں کے خلاصے اور کئی ایک متفرق رسالے تیار کرتا رہا۔ اس کی نظر اس قدر جامع، اس کا ذہن اتنا ہمہ گیر اور جملہ علوم و فنون پر اس کی دسترس اس حد تک مکمل اور گہری تھی کہ آئندہ کئی صدیوں تک علم و حکمت کا سارا نظام اسی کے قائم کردہ راستے پر چلتا رہا۔

ابن سینا کی کتب:

ابن سینا کی تصنیفات بہت ہیں اور نظم و نثر دونوں میں ہیں لیکن بیشتر عربی میں اور کچھ فارسی میں ہیں جن کی تفصیل اس مختصر رسالے میں ممکن نہیں ہے تاہم علم کے شوقین کتب مطولہ کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ چند ایک مطبوعہ کتب درج ذیل ہیں:

1. الارجوزة السينائية، جس کا دوسرا نام الارجوزة فی الطب بھی ہے، لکھنؤ ۱۲۶۱ھ۔
2. اسباب حدوث الحروف، مصر ۱۹۱۴ء۔
3. الاشارة إلى علم فساد احكام المنجمين، اسے رسالة فی ردالمنجمین بھی کہتے ہیں، طبع مہران۔ لوفان، ۱۸۸۵ء۔
4. رفع المضار الكلية عن الابدان الانسانية، ابن ابوبکر الرازی کی کتاب "منافع الاغذیۃ" کے حاشیے پر طبع ہوئی، ۱۳۰۵ھ۔
5. شفاء الاسقام فی علوم الحروف والارقام، مصر ۱۳۲۸ھ۔
6. القصيدة العينية، تیس ابیات کا قصیدہ، جو القصیدة الغراء کے نام سے بھی مشہور ہے، چاپ سنگی ۱۶۳۵ء، بمبئی ۱۳۰۶ھ۔
7. القصيدة المزدوجة فی المنطق، بون ۱۸۳۶ھ۔
8. منطق المشرقين، المزدوجة فی المنطق، بون ۱۸۳۶ھ۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۱/۲/۵۷۲)

ابن البیطار المالقی ابو محمد عبداللہ بن احمد ضیاء الدین (۱۱۹۰ء ـــ ۱۲۴۸ء)

ابن البیطار المالقی کا پورا نام ابو محمد عبداللہ بن احمد ضیاء الدین ہے اور وہ ۱۱۹۰ء میں سپین کے ایک شہر

مالقہ میں پیدا ہوا۔ اس کا تعلق غالباً اس شہر کے بیطار خاندان سے تھا۔ اس دور کی سوانحی کتب میں اس خاندان کے بارے میں تفصیلی معلومات درج ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ہسپانوی رومی نسل سے تعلق رکھتا تھا لیکن فی الحال اس تعلق کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا۔ ابن البیطار نے ۱۲۴۸ء میں دمشق میں وفات پائی۔ وہ جڑی بوٹیوں اور نباتات کے علوم پر گہری نظر رکھتا تھا اور یہی اس کی شہرت کا باعث ہے۔

ابن البیطار نے ابتدائی تعلیم سپین کے شہر اشبیلیہ میں حاصل کی۔ یہاں وہ اپنے اساتذہ ابوالعباس النباتی، عبداللہ ابن صالح اور ابوالحجاج کے ہمراہ شہر کے گردونواح سے پودے جمع کیا کرتا تھا۔ وہ الغافقی، الزہراوی، الادریسی، دسقوروسس اور جالینوس کی تحریروں کا مطالعہ بڑے شوق سے کیا کرتا تھا۔

۱۲۲۰ء کے لگ بھگ ابن البیطار نے بلاد شرقیہ کی طرف ہجرت کی اور شمالی افریقہ سے ہوتے ہوئے ۱۲۲۴ء میں ایشیائے کوچک اور شام کا بحری سفر کیا۔ آخر کار وہ قاہرہ میں سکونت پذیر ہوا۔ مصر میں اس وقت ایوبی خاندان کے بادشاہ الکامل کی حکومت تھی۔ ابن البیطار نے اس کی ملازمت اختیار کر لی۔ وہ اس ایوبی سلطان کے دربار میں ماہرین نباتیات کا افسر اعلیٰ مقرر ہوا اور الکامل کے بیٹے اور جانشین الصالح کے عہد میں بھی وہ اسی عہدے پر کام کرتا رہا۔ ابن البیطار اپنے شاگردوں اور ساتھیوں کے ہمراہ کبھی کبھی عرب، فلسطین، شام اور عراق کا سفر بھی کیا کرتا تھا۔ اس کے جانے پہچانے شاگردوں میں ایک نام ابن ابی اصیبعہ کا ہے، جس نے اپنی کتاب ''عیون الانباء'' میں اپنے استاد کے متعلق تعریفی کلمات لکھے ہیں، لیکن ابن البیطار کے تفصیلی حالات زندگی جاننے کے لیے یہ کتاب کچھ زیادہ مدد نہیں کرتی۔

ابن البیطار نے دو کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ یہ کتابیں اس کی تمام عمر کی تحقیقات اور مشاہدات کا نچوڑ ہیں اور یہی اس کی عالمگیر شہرت کا باعث ہیں۔ ان دو کتابوں کے عنوانات ''المغنی فی الادویۃ المفردہ'' اور ''الجامع المفردات الادویۃ والاغذیۃ'' ہیں۔

پہلی کتاب ''المغنی'' سلطان الصالح کے نام منسوب ہے اور اس میں مختلف امراض کے لیے موزوں سادہ دواؤں اور ان کے خواص سے بحث کی گئی ہے۔ اسے اعضائے ماؤفہ کے اعتبار سے ایک سہل شکل میں طبیبوں کے استعمال کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ دوسری کتاب یعنی ''الجامع'' میں حیوانات، نباتات اور معدنیات کے ذریعے معالجے کے تقریباً ۱۴۰۰ سہل نسخوں کو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب میں ابن البیطار نے اپنے تجربات کے علاوہ اندازاً ۱۵۰ یونانی اور عرب ماہرین موضوع سے بھی استفادہ کیا۔ ان ماہروں میں الرازی اور ابن سینا کے نام بھی شامل ہیں۔

ابن البیطار کا سب سے اہم کارنامہ ان دریافتوں کو ایک باقاعدہ شکل میں ترتیب دینا تھا جو قرون وسطیٰ میں عربوں نے کی تھیں۔ اس طرح متقدمین کی ہزاروں دوائیوں کی فہرست میں مزید ۳۰۰ سے ۴۰۰ ناموں کا اضافہ ہوا۔

اس نے عربی، فارسی، بربری، یونانی، لاطینی، رومانی اور عرب کی علاقائی زبانوں کے درمیان فنی مترادفات قائم کرنے کی طرف بھی خاصی توجہ دی۔ اس مقصد کے لیے اس نے ابن میمون کی ''شرح اسماء العقار'' سے بہت مدد لی کیونکہ وہ خود اس کا ترجمہ بھی کر چکا تھا۔ میئر ہوف (Meyerhof) اور سوبھی (Sobhy) ''الجامع'' کے بارے میں اس خدشے کا اظہار کرتے ہیں کہ اس کی معلومات میں کوئی نیا پن نہیں ہے، بلکہ یہ الغافقی کی ''کتاب الادویہ'' کا چربہ ہے۔ الغافقی کی اس کتاب کا ابن البیطار نے ۲۰۰ سے زیادہ جگہوں پر حوالہ دیا ہے۔ متذکرہ مستشرقین نے اپنے جس شبے کا اظہار کیا ہے، اس پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کا علمی دیانتداری کا تصور موجودہ دور کے مقابلے میں مختلف تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ الغافقی کی تحریر صرف ابن العبری (Barhebracus) کی ملخص شدہ صورت میں محفوظ ہے۔

مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک کے اندر اور باہر ادویہ کے موضوع پر جتنی کتابیں لکھی گئیں، ان پر ''الجامع'' کے گہرے اثرات پڑے ہیں۔ اس کے برعکس مغرب میں اس کا اثر بہت کم ہوا کیونکہ عربی سے لاطینی میں تراجم کا دور تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں ختم ہو گیا تھا۔ تاہم Andrea Alpago نے ابن سینا پر اپنی تحریروں میں ''الجامع'' سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ عہد متاخرین میں یہ کتاب ولیم پورٹل (William Portel) اور گالاں (Antoine Galland) جیسے عربی دانوں کی توجہ کا مرکز رہی اور انھوں نے اس کا خلاصہ اور فرانس میں محفوظ اس کا قلمی نسخہ شائع کیا۔

ان دو مشہور کتابوں کے علاوہ ابن البیطار نے کچھ اور کتابیں بھی لکھی تھیں، لیکن وہ زیادہ مقبول نہیں ہو سکیں۔ ایسی کم معروف کتابوں میں ''میزان الطبیب''، ''رسالۃ فی الاغذیۃ والادویۃ''، ''مقالۃ فی الیمون'' (اسے ابن الجمع کے نام سے منسوب کیا گیا اور Alpago کے لاطینی ترجمہ کی صورت میں موجود ہے) اور دسقوریدس (Dioscorides) کی کتاب کی ایک شرح جس کا ایک خطی نسخہ حال ہی میں دستیاب ہوا ہے۔ اس کتاب میں ابن البیطار نے نہ صرف ۵۵۰ دوائیوں کی فہرست درج کی ہے جو دسقوری دس کی پہلی چار کتابوں میں ملتی ہیں بلکہ اکثر و بیشتر ان کے مترادفات بھی دیے ہیں۔ (معروف مسلم سائنسدان: ص ۸۳۱)

ابوبکر محمد ابن یحییٰ ابن باجہ (۱۰۸۰ء ___ ۱۱۳۸ھ)

ابوبکر محمد بن یحییٰ المعروف بہ الصائغ (زرگر)، ابن ابی اصیبعۃ (عیون الانباء) ۲: ۶۲، مصر ۱۲۹۹ھ)، ابن خاقان (قلائد، ۳۴۶)، براکلمان (تکملۃ، ۱: ۸۳۰ و راہلوارٹ (فہرست کتب خانۂ برلن، ج ۴: شمارۃ ۵۰۶۰) نے اس کے نام و نسب کے بیان میں اسے ابن الصائغ لکھا ہے۔ اس کے سب سے پہلے مجموعہ تالیفات میں، جو اس کے شاگرد ابن الامام نے مرتب کیا، کہیں اسے ابن الصائغ نہیں لکھا گیا۔ اسے عام طور پر ابن باجۃ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ ابن خلکان (وفیات، طبع وستنفلٹ، عدد ۶۸۱) اور المقری (نفح الطیب، ۴: ۲۰۱) کے نزدیک باجۃ لغت فرنگ میں چاندی کو کہتے

ہیں۔ ابن خلکان اور المقری نے ابن باجہ کے القاب میں التجیبی کا اضافہ بھی کیا ہے۔ یہ نسبت آل تجیب کی طرف ہے جو پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی میلادی میں سرقسطہ پر حکمران رہے۔ ابن باجہ کے نام کی لاطینی شکل Avenpace ہے۔ ابن باجہ پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی میلادی کے اواخر میں سرقسطہ میں پیدا ہوا۔

ابن باجہ کی ابتدائی زندگی اور زمانۂ طالب علمی کے حالات معلوم نہیں۔ حصول علم کے بعد وہ کئی سال سرقسطہ کے مرابطی حاکم ابوبکر بن ابراہیم کا وزیر رہا۔ ابن القفطی اور ابن خاقان نے لکھا ہے کہ ابن باجہ اس منصب پر بیس برس تک مامور رہا، لیکن بعض تاریخی حقائق کے پیش نظر وزارت کا اتنا لمبا عرصہ مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ فاس میں وہ ابوبکر یحییٰ بن یوسف تاشفین کی وزارت کے منصب پر بھی رہا۔

ابن باجہ بہت بڑا فلسفی، قابل سائنس دان، عالم ادب ونحو، حاذق طبیب، ممتاز موشح نویس اور آتش نفس نے نوازا تھا۔ موسیقی میں اسے مغرب میں وہی مقام حاصل تھا جو مشرق میں فارابی کو حاصل ہے۔ سیوطی نے اسے فلسفے میں مغرب کا ابن سینا کہا ہے۔ اس کے علم وفضل کا تمام مؤرخین کو اعتراف ہے۔ خود ابن خاقان، جس نے قلائد العقیان میں اس کی طرف کفر وزندقہ کی نسبت کی ہے اور اخلاقی لحاظ سے اسے مورد طعن بنایا ہے، اپنی دوسری کتاب مطمح الانفس میں اس کے علم وفضل کی تعریف کرتا ہے۔

(بحوالۂ یاقوت: ارشاد الاریب، طبع مرجیوث، ۶: ۱۲۴ و مابعد)

ابن باجہ نے طب، ہندسہ، ہیئت، طبیعیات، الکیمیا اور فلسفے پر متعدد رسائل لکھے ہیں۔ ان کا مکمل ترین اور سب سے قدیم مجموعہ اوکسفورڈ میں ایک مخطوطے کی شکل میں محفوظ ہے۔ اس مخطوطے کے بیچ میں سے چند اوراق غائب ہیں۔ یہ مخطوطہ ۲۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ خط نسخ میں قاضی حسن بن محمد کا ربیع الثانی 547ھ میں لکھا ہوا یہ مخطوطہ اوکسفورڈ کے پروفیسر ایڈورڈ پوکک Edward Pocock نے علاقۂ شام وموصل سے سترہویں صدی میلادی میں حاصل کیا تھا۔ یہ نسخہ ابن الامام کے نسخے سے منقول ہے۔ اس میں بتیس رسالے شامل ہیں۔

(بوڈلین، پوکک، شمارہ ۲۰۶)

ابن باجہ کی تالیفات کا ایک مجموعہ سپین میں بھی محفوظ ہے، لیکن وہ صرف اس کے منطق کے رسائل پر مشتمل ہے۔ اس نسخے کا ایک حصہ ذوالحجہ ۶۶۷ھ اور دوسرا ۶۸۱ھ میں لکھا گیا۔ (اسکوریال، شمارہ ۶۱۲)

ابن باجہ کی تالیفات میں سے تدبیر المتوحد، الاتصال اور الوداع کے متن ان کے ہسپانوی تراجم کے ساتھ پروفیسر اسین پلاکیوس (Asin Palacios) نے اور کتاب النفس کا متن مع انگریزی ترجمہ وتعلیقات صغیر حسن نے شائع کیا ہے۔ تدبیر کا ایک متن کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے۔ اسے ڈاکٹر عمر فرخ نے اپنی مختصر کتاب ابن باجة والفلسفة المغربية کے آخر میں شائع کر دیا ہے، لیکن درحقیقت یہ ابن باجہ کی اصل کتاب تدبیر کا اختصار ہے، جو غالباً کسی شخص نے اکثر جگہ عبارتوں کو حذف کر کے اور بعض جگہ عبارت تبدیل کر کے تیار کیا تھا۔ چودھویں صدی کے وسط میں تدبیر کا موسیٰ نے عبرانی میں ترجمہ کیا تھا، بعد میں اس کا لاطینی میں

بھی ترجمہ ہوا۔ لاطینی میں اس کے بعض اور رسالے بھی محفوظ ہیں۔ تدبیر کا ایک اور ترجمہ عبرانی میں ہو رہا ہے۔ ابن باجہ کی تالیفات کا ایک مجموعہ برلن کے کتب خانے میں بھی محفوظ تھا، لیکن گذشتہ عالمی جنگ میں ناپید ہو گیا۔

ابن باجہ نے اپنی تصنیفات میں قرآن مجید اور احادیث نبویہ ﷺ کی طرف برابر رجوع کیا ہے اور ان کی تعلیم کے مطابق مشاہدات پر توجہ دی ہے اور اس طرح یونانی طرزِ فکر کی بنیادوں پر اسلامی طرز فکر کی عمارت کھڑی کی ہے۔ اس نے بطلیموس کی مجسطی کی اصلاح بھی کی ہے۔ اس کے نظریوں نے ابن طفیل (م: ۵۸۱ھ/ ۱۱۸۵ء) اور ابن بطروجی کے آگے بڑھنے کے راستے کو اور زیادہ صاف کر دیا اور علم ہیئت کی ترقی کی نئی راہیں وا کر دیں۔ اس کی تعلیقات نے ابن رشد کے لیے ارسطو کی کتابوں کی تشریح و تلخیص کا دروازہ کھول دیا۔ اسی طرح اس نے جو رسالہ علم ادویہ (Materia medica) پر لکھا تھا اس سے ابن البیطار (تیرھویں صدی) نے استفادہ کیا ہے۔ قرون وسطیٰ کے لاطینی مضمون پر بھی اس کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ اس کے رسائل تدبیر المتوحد، الاتصال اور الوداع اس وقت یورپ میں جگہ جگہ پڑھے جاتے تھے۔

فلسفے میں ابن باجہ کا زیادہ تر انحصار فارابی اور ارسطو پر ہے، لیکن وہ مجتہدانہ حیثیت بھی رکھتا ہے اور ان کی کئی باتوں پر اس نے اضافہ کیا ہے۔ اس نے مابعد الطبیعیات اور نفسیاتی فلسفے کی بنیاد طبیعیات (فزکس) پر رکھی ہے۔

ابن باجہ نے نفسیات اور عقل پر بھی لطیف بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اخلاق اور عقل کا باہمی تعلق کیا ہے اور عقل اور قوت متخیلہ کے درمیان کیا واسطہ ہے؟ اس نے علم انسانی کی حقیقت اور اس کے مراتب پر بھی روشنی ڈالی ہے اور انسانی حافظے کو حس مشترک کی طرف منسوب کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح قوت متخیلہ آخر میں جا کر قوت ناطقہ اور تعلیم و تعلم کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ فلسفۂ تدبیر منزل و سیاست پر بھی ابن باجہ نے بحث کی تھی، لیکن وہ رسائل ضائع ہو چکے ہیں۔ ان کا حوالہ ابن باجہ نے اپنی کتاب النفس اور کتاب تدبیر المتوحد میں دیا ہے۔ ہر چند کہ مونک (Munk) اور ڈی بوئر (De Boer) کے بیانات پر اعتماد کرتے ہوئے عمر فرخ نے رینان کے اس بیان کو کہ ابن باجہ تصوف کی طرف مائل تھا ''خطاء بے ریب'' لکھا ہے۔ (عمر فرخ: ابن باجہ ۴۳)

مگر خود ابن باجہ کی تحریروں میں اور خصوصاً تدبیر المتوحد کے اندر اس کے خلاف شہادتیں ملتی ہیں۔

ابن باجہ نے منطق پر جو رسائل لکھے ہیں ان میں اس نے الفارابی کے متن پر تنقید کی ہے اور کتاب النفس میں وہ بدیہی طور پر ان اہم دلائل کے ساتھ اتفاق کرتا ہے جن پر ارسطو نے اپنی تصنیف De Anima کی دوسری اور تیسری کتاب میں بحث کی تھی۔ ابن باجہ نے الکندی، الفارابی اور ابن سینا کی طرح، جو وحی والہام اور عقل کے درمیان نہایت قریبی رشتہ ہونے کی تشریح عقلی دلائل کی بنیاد پر کرنے کے لیے کوشاں ہیں، اس مشکل کو اپنے اسلامی طریقے سے حل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں اس نے وحی والہام کے متعلق اپنا وہ نظریہ پیش کیا ہے جو رسالۃ الاتصال میں نیز ان رسائل میں جو اس نے اشتہاء اور عقل فعال پر لکھے ہیں موجود ہے۔

ابن باجہ کا جوانی ہی میں انتقال ہوگیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اسے ابن زُہر طبیب کے ایماء سے کھانے میں زہر دیا گیا تھا۔ اس کا سال وفات ۵۲۵ھ/ ۱۱۳۲۔۱۱۳۱ء بھی بیان ہوا ہے، لیکن زیادہ صحیح ۵۳۳ھ/ ۱۱۳۸ء ہے کیونکہ ابن باجہ کی تصنیفات کے مجموعے پر، جو اس کے شاگرد ابن الامام نے خود ابن باجہ کے سامنے پڑھا تھا، تاریخ کتابت ۱۵؍ رمضان ۵۳۰ھ مرقوم تھی۔ اس مخطوطے کی ایک نقل، جو ۵۴۷ھ میں تیار ہوئی، اوکسفورڈ میں محفوظ ہے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۴۲۸/۱)

ابوبکر محمد عبدالملک ابن طفیل القیسی (۱۱۰۰۔۱۱۰۱ء ___ ۱۱۸۵ء)

ابوبکر (و ابوجعفر) محمد بن عبدالملک بن محمد بن محمد بن طفیل القیسی، اسلامی اندلس کا نامور فلسفی، جو ابوجعفر الاندلسی القرطبی الاشبیلی کے نام سے بھی مشہور ہے۔ مسیحی متکلمین نے اسے Ababacer لکھا ہے، جو ابوبکر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ وہ قبیلۂ قیس میں سے تھا اور ۴۹۴ھ/ ۱۱۰۰۔۱۱۰۱ء کے لگ بھگ وادیٔ آش میں پیدا ہوا، جو غرناطہ سے چالیس میل شمال مشرق میں واقع ہے۔ ابن طفیل کے خاندان اور تعلیم و تربیت کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں۔ پھر یہ خیال بھی کہ وہ ابن باجہ کا شاگرد تھا غلط ہے، اس لیے کہ اپنی تصنیف حی ابن یقظان (مطبع الوطن، ۱۲۹۹ھ، مطبع وادی النیل، ۱۲۹۹، مصر ۱۳۲۲ھ، مطبع السعادۃ ۱۴۲۷ھ، الجزائر ۱۹۰۰ء اردو ترجمہ، ظفر احمد صدیقی، علی گڑھ ۱۹۵۵ء) میں اس نے ابن باجہ سے عدم واقفیت کا اظہار کیا ہے۔

(ترجمہ حی ابن یقظان از S. Ockley لنڈن ۱۷۰۸ء ص ۱۵)

وہ طبیب بھی تھا اور غرناطہ میں طبابت کرتا رہا۔ پھر وہ والی صوبہ کا کاتب بنا اور ۵۴۹ھ/ ۱۱۵۴ء میں اس نے یہی خدمت والی طنجہ اور سبتہ کے یہاں سرانجام دی، آخر الامر الموحد تاجدار ابو یعقوب یوسف اول (۵۵۸۔۵۸۰ھ/ ۱۱۶۳۔۱۱۸۴ء) کا طبیب مقرر ہوا۔ یہی منصب ہے جو اس کے بعد اس کے دوست ابن رشد کو ملا۔ رہا یہ کہ وہ تاجدار مذکور کا وزیر بھی تھا تو یہ مشکوک ہے کیونکہ اس کا ذکر، جیسا کہ لیون گوتیے (L. Gauthier) نے بتایا ہے، صرف ایک کتاب میں آیا ہے، چنانچہ اس کے شاگرد البطروجی نے بھی اسے محض قاضی ہی لکھا ہے (Ibn Thofail: L. Gauthier) بہرحال ابن طفیل کو ابو یعقوب کے یہاں بڑا اثر اور رسوخ حاصل تھا۔ اس نے متعدد علماء کو دربار میں بلایا۔ نوجوان ابن رشد بھی اسی کی وساطت سے ابو یعقوب کی خدمت میں پہنچا۔ عبدالواحد المراکشی نے اس ملاقات کا حال بھی بیان کیا ہے (المعجب، طبع ڈوزی Dozy، 174 ومابعد، ترجمہ از فایناں Fagnan، 201 تا 210) جس میں امیر المؤمنین نے مسائل فلسفہ سے اپنی گہری واقفیت کا اظہار کیا۔ ابن طفیل ہی نے ابو یعقوب کی تحریک پر ابن رشد کو مشورہ دیا کہ ارسطو کی تصنیفات پر حواشی لکھے۔ جس کا ابن طفیل کے ایک شاگرد ابوبکر بندود نے ذکر بھی کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''امیر المؤمنین کو ابن طفیل سے بے حد لگاؤ تھا۔ مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ وہ محل شاہی میں امیر

المومنین کے حضور کئی کئی دن اور راتیں گزارتا اور اس اثناء میں کبھی باہر نہ آتا۔"

۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء میں، جب ابن طفیل پیرانہ سالی میں قدم رکھ چکا تھا، ابن رشد کو اس کی جگہ طبیب مقرر کیا گیا، بایں ہمہ ابن طفیل کو ابو یعقوب کی سرپرستی حاصل رہی۔ ابو یعقوب کا انتقال ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء میں ہوا، مگر اس کے بیٹے اور جانشین ابو یوسف یعقوب نے بھی ابن طفیل سے دوستانہ مراسم قائم رکھے۔ ابن طفیل نے مراکش میں وفات پائی اور تاجدار مذکور اس کے جنازے میں شریک تھا۔

ابن طفیل کی ایک ہی تصنیف دستیاب ہوئی ہے اور وہ اس کا مشہور و معروف رسالہ حی بن یقظان ہے، جس میں گویا اس نے اپنے فلسفیانہ خیالات کی وضاحت ایک داستان کی شکل میں کر دی ہے۔ علاوہ ازیں دو رسالے طب میں بھی اس سے منسوب ہیں۔

ابن رشد نے ارسطو کی شروح اور الکلیات کی تصنیف میں اس سے مشورہ لیا۔ کہا جاتا ہے اس نے ارسطو کی جویات (Meteorologica) کا ترجمہ بھی کیا۔ بہر حال یہ ابن طفیل ہی تھا جس کے اشارے پر اس کے شاگرد البطروجی نے ہم مرکز دائروں کے بطلیموسی نظریے کی ترمیم کی۔

حی بن یقظان کا، جسے لاطینی میں ایک ترجمے کے ساتھ سب سے پہلے Edward Pococke Jr. (۱۶۰۴ـ۱۶۹۱ء) نے شائع کیا، ایک ذیلی عنوان "اسرار الحکمۃ المشرقیۃ بھی ہے۔ الزرکلی نے سہواً انھیں دو الگ الگ تصنیفات قرار دیا ہے۔ (الاعلام: ۳: ۲۳۷)

اس تصنیف میں فلسفیانہ رومان کا تصور پیش کیا گیا ہے، جس میں اسلامی، اشراقی فلسفہ گویا اپنی انتہاء کو پہنچ گیا ہے، اگرچہ سب سے پہلے یہ خیال ابن طفیل کے دل میں پیدا نہیں ہوا، لیکن یہ ابن طفیل ہی کی ذہانت و فطانت ہے جس کی بدولت اس کا چرچا دنیا میں پھیلا۔ اس سے ابن طفیل کا مقصد ایک طرح سے یہ ظاہر کرنا تھا کہ فلسفے کا فہم و ادراک چونکہ عام لوگوں کے ذہن سے بالاتر ہے، لہٰذا اسے قصے کی شکل میں بیان کیا جائے۔ بالفاظ دیگر اس میں اس نظریے کی حمایت کی گئی ہے کہ حق دوگونہ ہے: ایک وہ جس کا تعلق حکمت سے ہے، دوسرا وہ جس کا تعلق شریعت سے ہے۔ حکمائے اسلام کا بالعموم یہی خیال تھا اور آگے چل کر ابن رشد نے اس پر بالخصوص زور دیا۔ ابن سینا اسی عنوان سے ایک فلسفیانہ رسالہ تصنیف کر چکا تھا، جس کی شہرت ازمنۂ متوسطہ میں عام تھی اور جس کی ابن عذرا (Ebn Ezra) نے ایک نقل بھی تیار کی تھی، چنانچہ ابن طفیل نے یہ عنوان ابن سینا ہی سے مستعار لیا۔ اسی طرح آگے چل کر جامی نے انھی ناموں کو استعمال کرتے ہوئے ایک مثنوی اور نصیر الدین طوسی نے ایک افسانہ تصنیف کیا۔ کہا جاتا ہے کہ حنین ابن اسحاق اسی قسم کے ایک رسالے کا ترجمہ یونانی سے عربی میں کر چکا تھا، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اس کا سراغ کہیں نوفلاطونی روایات میں مل جائے۔ اس کے افسانوی قالب کی شکل بہر حال اسکندری ہے۔ بایں ہمہ ابن طفیل پہلا فلسفی ہے جس نے اس افسانے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اس کے فلسفیانہ پہلو کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ بقول جارج سارٹن (Sarton) اس سلسلے میں کوئی مسئلہ ہے تو یہ کہ بالآخر اس افسانے

نے کیا شکل اختیار کی؟ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو درحقیقت ابن طفیل ہی اس افسانے کا خالق ہے اور اسی نے دنیا کی توجہ اس طرف مبذول کی۔ (Introduction to the History of Science) ج ۲، باب ۱۸: ۳۴۵)

حی بن یقظان کی زبان سرتاسر رمزی ہے اور اس سے مقصود ہے اس امر کی تشریح کہ فلسفے کی غرض و غایت ہے ذات الٰہی سے اتحاد و اتصال۔ انسان کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ صفائے خاطر اور نور بصیرت سے اس مقام پر جا پہنچے جہاں ادراک حق کے لیے قیاس و استدلال غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ابن طفیل نے اس سلسلے میں اپنے پیشرووں ابن سینا، ابن باجہ اور غزالی کی بڑی تعریف کی ہے۔

قصہ یہ ہے کہ ایک بن باپ کا بچہ کسی سنسان جزیرے میں پیدا ہوتا ہے، یا قریب کے جزیرے کی کوئی شہزادی اسے سمندر میں ڈال دیتی ہے اور پانی کی ایک رو اُسے اس جزیرے میں پہنچا دیتی ہے۔ یہاں اس موضوع پر کہ معتدل حرارت کے اثر سے زمین میں جو خمیر اٹھتا ہے اس سے خود بخود تولید ممکن ہے یا نہیں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ایک ہرنی اس بچے کو دودھ پلاتی ہے اور اس کی پہلی معلمہ بنتی ہے۔ جب بچہ کچھ بڑا ہو جاتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ جن حیوانوں سے اسے سابقہ پڑتا ہے ان کے برخلاف وہ برہنہ بھی ہے اور غیر مسلح بھی۔ وہ پتوں سے اپنا تن ڈھانکتا ہے اور ایک چھڑی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہے اور اس طرح اسے اپنے ہاتھوں کی اہمیت کا علم ہوتا ہے۔ اب وہ شکاری بن جاتا ہے اور ہنرمندی میں مزید ترقی کر لیتا ہے، مثلاً پتوں کے ادھورے لباس کی جگہ اب وہ عقاب کی کھال سے کام لیتا ہے۔ اس دوران میں وہ ہرنی جس نے اسے پالا تھا بوڑھی اور بیمار ہو جاتی ہے، جس سے اسے بڑی تکلیف پہنچتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اس خرابی کی علت معلوم کرے۔ اس مقصد کے پیش نظر وہ خود اپنی ذات کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے اور یوں اسے اپنے حواس کا شعور ہوتا ہے۔ اس خیال سے کہ خرابی کی جڑ سینے میں ہے، وہ سوچتا ہے کہ کسی نوکدار پتھر سے اس ہرنی کے پہلو کو چیر دیا جائے۔ اس تجربے کی بدولت اسے دل اور پھیپھڑوں سے واقفیت ہو جاتی ہے، مگر ساتھ ہی پہلی مرتبہ اس غیر مرئی شے (روح) کا تصور بھی اس کے ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے جو نکل چکی ہے اور جس پر بہ نسبت جسم کے شخصیت کا زیادہ دارومدار ہے۔ جب ہرنی کی لاش سڑنے لگتی ہے تو وہ پہاڑی کووں سے اسے دفن کرنے کا طریقہ سیکھتا ہے۔

اتفاقاً اسے آگ کا پتا چل جاتا ہے اور وہ یوں کہ اس نے ٹہنیوں کی رگڑ سے سوکھے ہوئے درختوں میں آگ لگتے دیکھی تھی۔ وہ اسے اپنے مسکن میں لے آتا ہے اور برابر جلائے رکھتا ہے۔ اس دریافت کی بدولت اس کو مرئی آتش اور اس حیوانی حرارت پر غور کرنے کی تحریک ہوتی ہے جس کا مشاہدہ وہ زندہ جانوروں میں کرتا رہا ہے، لہٰذا وہ دوسرے حیوانوں کی چیر پھاڑ شروع کر دیتا ہے۔ اس کی ہنرمندی اب اور ترقی کرتی ہے۔ وہ کھالوں کا لباس پہننے لگتا ہے، اون اور سن کو کاتنا اور سوئیاں بنانا سیکھ لیتا ہے۔ ابابیلیں اسے سکھاتی ہیں کہ مکان کیسے بنایا جاتا ہے۔ وہ شکاری پرندوں کو سدھاتا ہے کہ اس کے لیے شکار کریں۔ اسے یہ بھی معلوم ہو

جاتا ہے کہ پرندوں کے انڈوں اور مویشیوں کے سینگوں وغیرہ کو کیسے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ داستان کا یہ حصہ ایک ایسا پر لطف دائرۃ المعارف ہے جسے بڑے سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے۔

حی بن یقظان کا علم روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے اور بالآخر فلسفے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جب وہ تمام نباتات و معدنیات اور ان کے خواص کا اور حیوانات کے اعضائے جسمانی کے استعمال کا مطالعہ کر چکتا ہے تو انھیں اصناف و انواع میں مرتب کرتا ہے۔ چنانچہ اجسام کو وہ ثقیل اور خفیف میں تقسیم کرتا ہے، پھر روح حیات کی طرف لوٹ آتا ہے، جس کا مقام اس نے قلب میں معین کر لیا تھا۔ وہ نفس حیوانی اور نفس نباتی کا تصور قائم کرتا ہے اور اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اجسام ہی وہ صورتیں ہیں جن سے صفات کا ظہور ہوتا ہے۔ اب وہ ابتدائی جواہر کی جستجو کرتا اور عناصر اربعہ کو شناخت کر لیتا ہے۔ زمین کا معائنہ کرتے ہوئے مادے کا تصور اس کے ذہن میں ابھرتا ہے اور جملہ اجسام کا تصوریوں کرنے لگتا ہے کہ وہ مادے ہی کی مختلف مقداریں ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ پانی بھاپ بن جاتا ہے، اس پر تحول صورت کا انکشاف ہو جاتا ہے اور وہ تسلیم کر لیتا ہے کہ ہر نئی تخلیق کے لیے کوئی ایسی علت ضروری ہے جو اسے پیدا کرے۔ اس طرح اس کے ذہن میں صورتوں کے خالق مطلق کا خیال آ جاتا ہے، اس کی جستجو وہ پہلے مخلوقات میں کرتا ہے، لیکن چونکہ سب عناصر متغیر اور فانی ہیں، اس لیے وہ اپنی توجہ اجرام سماوی کی طرف منعطف کر دیتا ہے۔

حی کی عمر اب اٹھائیس برس کی ہوگئی ہے، یعنی وہ ہفت سالگی کے چوتھے دور کی تکمیل کر چکا ہے۔ اس کے بعد وہ آسمان کے بارے میں غور و فکر کرنے لگتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کیا یہ لامتناہی ہے، جو اس کے نزدیک ایک امر محال ہے۔ وہ اسے کروی تصور کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ چاند اور سیاروں کے لیے مخصوص افلاک کی ضرورت ہے اور عالم سماوی کا تصور کچھ اس طرح کرتا ہے جیسے وہ ایک طویل اور عریض حیوان ہو۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ خالق کل کے لیے ضروری ہے کہ وہ جسم نہ ہو، کیونکہ اگر وہ ابدی ہے تو عالم کی قوت محرکہ اس کے اندر نہیں آ سکتی۔ تصور باری تعالیٰ کے ارتقاء کو جاری رکھتے ہوئے وہ صفات خداوندی کو موجودات عالم کے مطالعے سے اخذ کرتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ارادے میں مختار ہے، دانا ہے، عالم ہے، رحیم ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب اس کی توجہ خود اپنے نفس کی طرف منعطف ہو جاتی ہے اور وہ فیصلہ کرتا ہے کہ نفس غیر فانی ہے اور اس سے نتیجہ نکالتا ہے کہ حصول سعادت کے لیے اسے چاہیے کہ اس ہستی کے بارے میں غور و فکر کرے جو کامل و مکمل ہے۔ یہ سعادت صفات سماویہ کی اقتداء سے حاصل ہوگئی، یعنی زاہدانہ اخلاق پر عامل ہونے سے۔ اس کے بعد حی اپنے آپ کو غور و فکر کے لیے وقف کر دیتا ہے، حتی کہ وہ اپنی عمر کے ساتویں دورۂ ہفت سالگی کو پورا کر لیتا ہے۔

پھر اَسال، جو الہامی مذہب کا سچا پیرو ہے، قریب کے ایک جزیرے سے یہاں آ پہنچتا ہے۔ جب یہ دونوں ایک دوسرے کی بات سمجھنے لگتے ہیں تو ثابت ہو جاتا ہے کہ درحقیقت الہامی مذہب بھی وہی فلسفیانہ عقیدہ ہے جس تک حی پہنچ چکا ہے۔ اَسال کو اس عقیدے میں، جس کی تعلیم یہ تارک دنیا اسے دیتا ہے، نہ صرف اپنے

مذہب کی بلکہ تمام الہامی مذاہب کی ایک وجدانی تعبیر نظر آتی ہے۔

وہ حی کو ترغیب دیتا ہے کہ اس کے ساتھ قریب ہی کے ایک جزیرے میں چلے، جہاں سلامان نامی ایک بادشاہ حکمران ہے اور جس کا اَسال دوست اور وزیر ہے تا کہ حی اس کے سامنے اپنا فلسفہ پیش کرے۔ مگر یہ فلسفہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا اور کئی ناکام کوششوں کے بعد حی اور اَسال اسی غیر آباد جزیرے میں واپس چلے آتے ہیں تا کہ اپنی باقی زندگی خالص غور و فکر کے لیے وقف کر دیں۔ رہے دیگر لوگ سو وہ بدستور خیالی صورتوں اور رموز و علامات کے سہارے زندگی بسر کرتے رہتے ہیں۔

یوں گویا جہاں یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حق کی حیثیت ''دوگونہ'' ہے وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شریعت سے مقصود ہے عوام کو سہارا دینا۔ وہ گویا ایک اجتماعی ضرورت ہے۔ لیکن یوں شریعت سیاست اور فرد کی ذاتی سیرت و کردار کے بارے میں جو بڑے اہم سوالات پیدا ہو جاتے ہیں ان کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی گئی، نہ ان نتائج سے اعتناء کیا گیا ہے جو اس موقف کو صحیح مان کر مترتب ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ حی اور اَسال تو پھر اس غیر آباد جزیرے کا رخ کرتے ہیں جہاں سے آئے تھے، مگر لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیتے ہیں کہ بدستور رموز و علائم کے سہارے زندگی بسر کرتے رہیں۔ اندریں صورت حکمت اور شریعت میں عملاً جو خلا باقی رہ جاتا ہے اس کو پر کرنے کی کیا صورت ہے؟ اس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ بہر حال حی بن یقظان سے ابن طفیل اور اس کے ہم خیال فلاسفہ متصوفہ کا موقف تمام و کمال ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۱/ ۵۸۲-۸۳)

ابن النفیس علاؤ الدین ابوالحسن علی بن ابی الحزم القرشی الدمشقی (۱۲۱۰ء ___ ۱۲۸۸ء)

علاؤ الدین ابوالحسن علی بن ابی الحزم القرشی الدمشقی ۱۲۱۰ء میں دمشق میں پیدا ہوا۔ اس کے نام کے ساتھ القرشی غالباً اس کے مقام پیدائش قرش کی وجہ سے ہے، جو دریائے جیحوں کے پاس ایک قصبے کا نام ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی اپنی ولادت یہاں نہ ہوئی ہو بلکہ اس کے خاندان کے لوگ وہاں سے ہجرت کر کے آئے ہوں۔ ابن النفیس کو بلاشبہ تیرھویں صدی عیسوی کا ایک ماہر اور حاذق طبیب کہا جاسکتا ہے۔ بدقسمتی سے اس کی تاریخ رحلت (۱۲۸۸ء بمقام قاہرہ) کے سوا اس کی زندگی کے بہت کم واقعات تحریری صورت میں ملتے ہیں۔ حتیٰ کہ ابن ابی اصیبعہ نے ابن النفیس کا ہمعصر ہونے کے باوجود اپنی تصنیف ''تاریخ الاطباء'' میں اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

ابن النفیس نے طب کی ابتدائی تعلیم دمشق ہی میں ''البیمارستان النوری الکبیر'' میں حاصل کی۔ اس ہسپتال کی بنیاد بارہویں صدی عیسوی کے ترک حکمران نور الدین محمود ابن زنگی نے رکھی تھی۔ ابن النفیس کے اساتذہ میں مہذب الدین عبدالرحیم ابن علی الدخوار (متوفی: ۱۲۳۹ء) کا نام نمایاں ہے۔ جس نے دمشق میں دخواریہ طبی سکول کی بنیاد رکھی تھی اور وہ خود ابن التلمیذ کے مدرسے کا فارغ التحصیل تھا۔ یہ مدرسہ بغداد سے شام

میں منتقل ہوا تھا اور بہت سے طالبعلم اس میں تعلیم و تربیت حاصل کر چکے تھے۔ ابن النفیس کے معروف ترین تلامذہ میں ابوالفرج ابن یعقوب ابن اسحاق المسیحی ابن القف امین الدولہ الکرکی (۱۲۳۳ء۔۱۲۸۶ء) شامل ہے، جو ابن ابی اصیبعہ کا شاگرد رہا تھا اور اس نے فن جراحی پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

طب کے علاوہ ابن النفیس نے صرف ونحو، منطق اور اصول فقہ کا مطالعہ بھی کیا تھا اور اس طرح اسے فقہ شافعی میں ایک مستند عالم کا مرتبہ حاصل ہو گیا تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ قاہرہ چلا گیا، جہاں اسے مملوک حکمران الظاہر بیبرس البندقداری کی طرف سے رئیس الاطباء مصر کا عہدہ دیا گیا۔ وہ اس حکمران کا ذاتی معالج بھی تھا۔ یہ عہدہ محض اعزازی حیثیت نہیں رکھتا تھا، بلکہ اس سے ابن النفیس کو ایک طرح سے تمام اطباء پر انتظامی اختیارات حاصل ہو گئے تھے۔ غالباً وہاں اس نے ناصری شفاخانے میں کام کیا، جس کی بنیاد سلطان صلاح الدین ایوبی (دور حکومت ۱۱۶۹ء تا ۱۱۹۳ء) نے ۱۱۷۱ء میں رکھی تھی۔ اس شفاخانے میں ابن ابی اصیبعہ نے بھی مصر میں اپنے ایک سالہ (۱۲۳۶ء۔۱۲۳۷ء) قیام کے دوران ماہر امراض چشم کے طور پر کام کیا تھا۔ عمر کے آخری حصے میں ابن النفیس نے اپنا گھر اور کتاب خانہ نئے تعمیر کردہ ''دارالشفاء'' کو بطور تحفہ دے دیا۔ یہ شفاخانہ مملوک حکمران المنصور سیف الدین قلاوون الالفی (دور حکومت ۱۲۷۹ء۔۱۲۹۰ء) نے ۱۲۸۴ء میں تعمیر کرایا۔ اسی بادشاہ کے زمانے میں ابن النفیس نے تقریباً اسی برس کی عمر میں (۱۷ دسمبر ۱۲۸۸ء) انتقال کیا۔

ابن النفیس قاہرہ کے مدرسے مسرویہ میں فقہ بھی پڑھاتا رہا۔ تاج الدین السبکی (متوفی: ۱۳۷۰ء) کی کتاب ''طبقات الشافعیۃ الکبریٰ'' میں اس کا نام فقہاء میں اس کی علمی برتری کا کھلا ثبوت ہے۔ وہ عربی زبان کا بھی ممتاز عالم تھا۔

ابن النفیس کے ادبی کارنامے بھی نہایت اہم ہیں۔ وہ ایک آزاد خیال اور وسیع النظر شرح نگار تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تصانیف میں سے بیشتر طبع زاد تھیں اور ان کی تیاری میں اس نے کتابوں سے کوئی مدد نہیں لی تھی۔ اس کی سب سے بڑی طبی تصنیف ''کتاب الشامل فی الصناعۃ الطبیۃ'' ہے، جو اس نے اپنی عمر کے چوتھے عشرے میں لکھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی ۳۰۰ جلدیں تھیں، لیکن وہ صرف اسی جلدیں ہی ترتیب دے سکا۔ ۱۹۵۲ء تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ ضخیم کتاب مکمل طور پر گم ہو گئی ہے، لیکن اسی سال کیمبرج یونیورسٹی کی لائبریری کے اسلامی مخطوطات کے شعبے میں اس کی ایک بڑی لیکن نامکمل جلد دستیاب ہو گئی۔ اس کے علاوہ بوڈلین لائبریری نے بھی بہت عرصہ پہلے اس کتاب کے چار قلمی نسخے جمع کیے تھے، جن پر مصنف کا نام نہیں تھا۔ ۱۹۶۰ء میں لین میڈیکل لائبریری سٹیفورڈ یونیورسٹی میں مصنف کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے، اس کتاب کے تین قلمی نسخے دریافت ہوئے۔ ان میں سے ایک پر خود مصنف کے قلم سے تینتیسویں جلد کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ دوسرے دو مخطوطات اس کتاب کی تینتالیسویں اور چوالیسویں جلد خیال کیے جاتے ہیں۔ بعد والے قلمی نسخوں پر ۶۴۱ھ (۱۲۴۲ء۔۱۲۴۳ء) کا سنہ درج ہے۔ اسی کتاب کا ایک اور مخطوطہ المتحف العراقی (بغداد) میں

موجود ہے۔اس کے علاوہ الزرکلی نے بھی دمشق میں اس کے ایک ضخیم قلمی نسخے کی موجودگی کا حوالہ دیا ہے، لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ یہ کون سی لائبریری میں ہے۔

''کتاب الشامل''، جو بدقسمتی سے ابھی تک چھپ نہیں سکی، میں ایک دلچسپ حصہ جراحت پر بھی ہے۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن النفیس ایک ماہر جراح بھی تھا۔اس نے ہر جراحی عمل کے تین مرحلے بتائے ہیں۔ پہلا مرحلہ ''العطاء'' ہے، جس میں مریض کے مرض کی تشخیص ہوتی ہے۔ یہ مرحلہ انتہائی نازک اور اہم ہے، کیونکہ اس میں مریض اپنے جسم اور جان کے معاملے میں جراح پر اعتماد کرتا ہے۔ دوسرا مرحلہ ''العمل'' ہے، جس میں اصل کام یعنی تشخیص کے مطابق متعلقہ عضو کی چیر پھاڑ کی جاتی ہے۔تیسرا اور آخری مرحلہ ''الحفظ'' ہے، جس کا مطلب تحفظ ہے یعنی چیر پھاڑ کے بعد زخم کے بھرنے تک اس کی حفاظت کرنا۔ یہ مرحلہ بھی نزاکت کے لحاظ سے پہلے دونوں مراحل سے کم نہیں۔ابن النفیس نے ان تینوں مراحل پر تفصیلی بحث کی ہے۔اس نے طبیب اور جراح کے فرائض بھی وضاحت سے بیان کیے ہیں۔اس کے علاوہ مریض، جراح اور نرس کے درمیان تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران جراح کو اپنے آلات کس طرح استعمال کرنے چاہئیں اور یہ کہ آپریشن کے وقت مریض کو کیسے لٹایا یا بٹھایا جائے۔مریض کی جسمانی حرکات پر تفصیلی بحث بھی اس کتاب کے مضمون میں شامل ہے۔ابن النفیس اپنے نکات کی وضاحت کے لیے جراحی کے کچھ واقعات کی مثالیں بھی بیان کرتا ہے۔(معروف مسلم سائنسدان: ص ۸۸۹)

جبش الحاسب، احمد بن عبداللہ المروزی (۸۶۴ء ــــ ۸۷۴ء)

جبش الحاسب، احمد بن عبداللہ المروزی ترکستان کے علاقے مرو میں پیدا ہوا اور ۸۶۴ء میں (بعض کے نزدیک ۸۷۴ء میں) انتقال کر گیا۔اس کی زندگی اور خاندان کے بارے میں بہت کم معلوم ہے۔ وہ عباسی خلفاء المامون اور المعتصم کے عہد میں بغداد میں بطور ہیئت دان کام کرتا تھا لیکن شاید اس حلقے کا رکن نہیں تھا جس نے ممتحن مشاہدات کے فراہم کرنے میں مدد دی۔ بغداد میں اس کے کام کا زمانہ ۸۲۵ء تا ۸۳۵ء ہے۔اس کا بیٹا ابوجعفر بن جبش بھی ایک ممتاز ہیئت دان اور آلات کا صناع تھا۔تین سوانح نگاروں ابن الندیم، ابن القفطی اور حاجی خلیفہ نے جبش سے حسب ذیل تصانیف بھی منسوب کی ہیں:

① سند ہند کی ترتیب نو۔

② ممتحن زیج۔ یہ اس کی تمام کتابوں میں سب سے زیادہ معروف ہے۔اس میں بطلیموس پر اعتماد کیا گیا ہے لیکن یہ اس کے اپنے مشاہدات پر مبنی ہے۔ابن یونس اس کو ''القانون'' کا نام دیتا ہے۔

③ شاہ زیج۔ یہ تمام زیجوں میں سے مختصر ترین ہے۔

④ دمشقی زیج۔

⑤ مامونی زیج (یا عربی زیج) یہ زیج اور دمشقی زیج دونوں یزدگرد یا سلوکس کی تقویم کے بجائے ہجری تقویم پر مبنی ہیں۔

⑥ رخامات اور پیمائشوں کے بارے میں رسالہ۔

⑦ فلکی کروں پر رسالہ۔

⑧ اصطرلاب پر رسالہ۔

⑨ عمودی اور ترچھے مستوی پر رسالہ۔

⑩ ستاروں کے فاصلے پر رسالہ۔

چونکہ یہ تمام کتابیں اس وقت موجود نہیں، اس لیے یہ جاننا تقریباً ناممکن ہے کہ حبش نے خود کتنی زیجیں لکھیں اور ان کے عنوانات کیا ہیں۔ حبش کی جدولوں کے دو قلمی نسخے محفوظ ہیں۔ ایک استنبول میں اور دوسرا برلن میں۔ یہ اصل کتابوں کی نقول نہیں ہیں۔ نسخۂ استنبول کی نقل پر تنقید ہوئی ہے جس میں یہ خدشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ حبش کی زیج کا نظر ثانی شدہ نسخہ ہے اور نظر ثانی کوشیار بن لبان نے کی تھی۔ کسی طرح تمہید اور بعض اقتباسات ہم تک اصل حالت میں بھی پہنچ گئے ہیں اور برلن کے نسخے کی طرح اس نسخے کو بھی حبش کے مآخذ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ (معروف مسلم سائنسدان: ص ۹۱)

ابوالولید محمد بن احمد بن محمد بن رشد (۱۱۲۶ء ___ ۱۱۹۸ء)

ابوالولید محمد بن احمد بن محمد بن رشد جو یورپ میں Averroes کے نام سے مشہور ہوا، اندلس کا سب سے بڑا عرب فلسفی۔ وہ ۵۲۰ھ/۱۱۲۶ء میں قرطبہ میں پیدا ہوا۔ اس کا دادا قرطبہ کا قاضی رہا تھا اور اس نے بعض اہم تصانیف چھوڑی تھیں۔ اس کا باپ بھی قاضی کے عہدے پر فائز رہا۔ قانون اور طب کی تعلیم ابن رشد نے اپنے پیدائشی شہر میں حاصل کی، اس کے اساتذہ میں ایک ابوجعفر ہارون ساکن ترجالہ (Truxillo) بھی تھا۔ ۵۴۸ھ/۱۱۵۳ء میں وہ مراکش میں مقیم تھا، جہاں وہ غالباً ابن طفیل کی ترغیب سے گیا تھا۔ ابن طفیل نے اسے ابو یعقوب یوسف الموحد سے متعارف بھی کرا دیا تھا، جس نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ ابو یعقوب سے اس کی اس ملاقات کا حال محفوظ ہے (دیکھیے Hist. des Almohades des Marrakeche ترجمہ از فانیان Fagnan)۔ خلفیہ نے اس سے عالم (Universe) کے بارے میں فلاسفہ کا نظریہ دریافت کیا، یعنی یہ کہ آیا وہ ایک جوہر ازلی ہے یا اس کی کوئی ابتدا تھی۔ ابن رشد کہتا ہے کہ ''مجھ پر اس قدر ہیبت طاری ہوئی کہ میں اس کا کوئی جواب نہ دے سکا'' لیکن خلیفہ نے اس کے حجاب و تکلف کو دور کیا اور خود مختلف علماء کے نظریے بیان کر کے اس موضوع پر اتنی گہری واقفیت اور قابلیت سے بحث شروع کر دی جتنی کہ بادشاہوں کے ہاں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس کے بعد خلیفہ نے اسے بیش قیمت تحائف دے کر رخصت کر دیا۔

یہ ابن طفیل ہی تھا جس نے ابن رشد کو ارسطو کی شرح لکھنے کا مشورہ بھی دیا۔ اس نے کہا کہ امیر المؤمنین کئی بار اس امر پر اظہار افسوس کر چکے ہیں کہ یونانی فلاسفہ کی زبان، بلکہ ان ترجموں کی زبان بھی جو عموماً دستیاب ہوتے ہیں، بڑی مغلق ہے لہٰذا اسے (یعنی ابن رشد کو) چاہیے کہ ان کی تشریح و توضیح کا کام اپنے ذمے لے۔

۵۶۵ھ/۱۱۶۹ء میں ابن رشد اشبیلیہ کا قاضی مقرر ہوا اور اس کے دو سال بعد قرطبہ کا۔ اس عہدے کی گرانبار مصروفیتوں کے باوجود یہی زمانہ ہے جب ابن رشد نے اپنی اہم ترین تصانیف مرتب کیں۔ ۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء میں ابن یوسف نے اسے اپنے طبیب کی حیثیت سے مراکش بلایا تا کہ وہ سن رسیدہ ابن طفیل کی جگہ لے سکے، لیکن تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ اسے قاضی القضاۃ کا عہدہ دے کر قرطبہ واپس بھیج دیا۔

یوسف کے جانشین یعقوب المنصور کے آغاز حکومت میں بھی ابن رشد کو بدستور خلیفہ کا قرب و التفات حاصل رہا، لیکن علمائے دین کی مخالفت کی بناء پر وہ معتوب ہو گیا اور اس پر مختلف ملحدانہ عقائد کا الزام لگا کر اسے قرطبہ کے نزدیک لوسینا (Lucena) میں جلا وطن کر دیا گیا۔ اسی زمانے (تقریباً ۱۱۹۵ء) میں خلیفہ نے حکم دیا کہ فلاسفہ کی سب کتابیں جلا دی جائیں، ماسوا ان کے جو طب، حساب اور ابتدائی علم ہیئت پر ہوں۔ ڈنکن میکڈ ونلڈ کا خیال ہے کہ اس موحد فرمانروا کے، جس نے اب تک مطالعات فلسفہ کی ہمت افزائی کی تھی، یہ احکام غالباً اندلس کے مسلمانوں کے پاس خاطر کی بناء پر صادر ہوئے تھے جو بربروں کی بہ نسبت بہت زیادہ راسخ العقیدہ تھے، چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اس وقت خلیفہ نے اندلس میں عیسائیوں کے خلاف جہاد شروع کر رکھا تھا۔ مراکش لوٹ کر اس نے (فلسفے کی تعلیم پر عائد کردہ) پابندی ہٹا دی اور ابن رشد کو اپنے دربار میں واپس بلا لیا۔

(D. MacDonald: Development of Muslim Theology، نیویارک 1903ء، ص ۲۵۵)

لیکن ابن رشد اپنی جاہ و ثروت کی بحالی سے زیادہ دیر تک لطف اندوز نہ ہو سکا، کیونکہ مراکش واپس آ کر تھوڑی ہی مدت بعد ۹ رصفر ۵۹۵ھ/۱۰ر دسمبر ۱۱۹۸ء کو اس کا انتقال ہو گیا اور شہر کے قریب ہی باب تغزوت کے باہر مدفون ہوا۔

ابن رشد کی اصل عربی تصانیف کا بڑا حصہ ضائع ہو چکا ہے اور عربی کی جو کتابیں بچ رہی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) تہافت التہافت، جو الغزالی کی مشہور تصنیف تہافت الفلاسفۃ کے جواب میں لکھی گئی تھی۔

(۲) میڈرڈ میں کتاب الجوامع، جس میں مختصر شرحیں ہیں۔

مذہب اور فلسفے کے باہمی روابط کے بارے میں دو دلچسپ رسالے (جن پر Leon Gauthier اور Miguel Asin نے بحث کی ہے)۔ ان میں سے ایک رسالے کا عنوان کتاب فصل المقال ہے، جس میں مذہب اور فلسفے کی تطبیق کی پر زور حمایت کی گئی ہے اور دوسرا کشف المناہج وغیرہ کے نام سے مشہور ہے۔

ابن رشد کی جو کتابیں اصل عربی یا تراجم کی صورت میں موجود ہیں ان کی تفصیل کے لیے دیکھئے، محمد یونس: ابن رشد، ص ۱۱۷ تا ۱۳۶ ان کتابوں کے مخطوطے زیادہ تر اسکوریال میں محفوظ ہیں، جن کی تعداد اکتالیس ہے۔ دیگر کتب خانوں میں جو مخطوطے محفوظ ہیں انھیں ملا کر اس وقت دنیا میں ابن رشد کی باون تالیفات اصل یا تراجم کی شکل میں موجود ہیں۔ ابن رشد کے عبرانی تراجم کی اشاعت کا یہ عالم ہے کہ بائبل کے بعد انھیں کا درجہ ہے۔

ابن رشد کے فلسفے کو ایک نیا فلسفہ نہیں مانا جا سکتا بلکہ یہ مسلمان فلاسفہ کے یونان پرست دبستان (دیکھئے مادۂ فیلسوف) کا وہی فلسفہ ہے جس کی تعلیم مشرق میں الکندی، الفارابی اور ابن سینا اور مغرب میں ابن باجہ اس سے پہلے دے چکے تھے، تاہم بعض مسائل میں وہ اپنے ان جلیل القدر پیش رووں کے نظریات سے اختلاف کرتا ہے لیکن یہ مسائل محض ثانوی حیثیت کے ہیں اور مجموعی اعتبار سے اس کا فلسفہ اسی قدیم روش کا پابند ہے۔

ابن رشد کی شہرت کا انحصار زیادہ تر اس کے ناقدانہ تجزیے اور شرح نویسی کی فطری صلاحیتوں پر ہے۔ یہ ایسی صفتیں ہیں جن کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہم آج کل نہیں کر سکتے، کیونکہ ہمارے اور اس زمانے کے آہنگ فکر، طریق کار اور وسائل علمی میں بہت زیادہ فرق ہے، لیکن اسی لیے قرون وسطیٰ کے علماء کے نزدیک، بالخصوص یہودی اور عیسائی حلقوں میں، انھیں بہت قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، یہاں تک کہ اس کی شرحوں سے علمائے دین میں بھی تحسین و آفرین کی لہر دوڑ گئی، اس کے باوجود کہ وہ اس کے نظام فلسفہ کو مذہب کے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔

مشرق کے اسلامی ملکوں میں علمائے دین پہلے ہی سے دبستان فلسفہ پر حملے کر چکے تھے، چنانچہ الغزالی کی تہافتہ الفلاسفہ، زیادہ تر الفارابی اور ابن سینا کے خلاف لکھی گئی تھی۔ مشرق میں اس باہمی کشمکش پر سب سے پہلے اندلس کے مسلم علمائے دین نے حملہ کیا اور جب بعد میں وہ ابن رشد کی شرحوں سے ترجموں کے ذریعے متعارف ہوئے تو مسیحی علمائے دین نے بھی، تیرھویں صدی میں پیرس، اوکسفورڈ اور کنٹربری کے لاٹ پادریوں (اساقفہ) نے انھی وجوہ کی بناء پر ابن رشد کی مذمت کی جن کے باعث وہ اندلس کے راسخ العقیدہ مسلمانوں کا ہدف ملامت بن چکا تھا۔

فلسفۂ ابن رشد کے وہ خاص معتقدات جن کی بناء پر اسے ملحد ٹھہرایا گیا ابدیت عالم، اللہ کے علم کی ماہیت، اس کے علم غیب، نفس اور عقل کی کلیت اور معاد سے متعلق ہیں۔ ان معتقدات کی بنا پر ابن رشد کو بہ آسانی ملحد قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ وہ مسلمہ عقائد کا منکر تو نہیں تھا لیکن انھیں اس طرح پیش کرتا تھا کہ فلسفے سے ان کی تطبیق ہو جائے۔

مثال کے طور پر ابدیت عالم کے مسئلے میں وہ خلق کائنات سے انکار تو نہیں کرتا لیکن اس کی تشریح دینی

نقطۂ نظر سے الگ اور مختلف کرتا ہے۔ اس کے نزدیک کوئی چیز عدم سے ایک ہی بار ہمیشہ کے لیے پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اس کی لحہ بہ لحہ تجدید ہوتی رہتی ہے، جس کی بدولت دنیا برقرار ہے اور ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے، دوسرے لفظوں میں ایک تخلیقی قوت اس دنیا میں لگا تار کام کر رہی ہے جو اسے قائم رکھتی اور حرکت دیتی ہے۔ اشکال فلکی (صور الکواکب Constellations) بالخصوص حرکت ہی سے قائم ہیں اور اس حرکت کا سرچشمہ وہ قوت محرکہ ہے جو روزِ ازل سے ان پر عمل کر رہی ہے۔ عالم ابدی ہے لیکن اس کی یہ ابدیت ایک تخلیقی اور محرک علت کا نتیجہ ہے، برخلاف اس کے اللہ بغیر کسی علت کے ابدی ہے۔

علم الٰہی کے باب میں ابن رشد فلاسفہ کے اسی اصول کا اعادہ کرتا ہے کہ ''اصل اول کو محض اپنی ہستی کا ادراک ہوتا ہے۔'' فلسفیوں کے نزدیک یہ ابتدائی مفروضہ لازمی ہے تاکہ اصل اول اپنی وحدت کو برقرار رکھ سکے، کیونکہ اگر اسے کثرت وجود کا علم ہو تو وہ خود بھی کثیر ہو جائے گا۔ اس اصل کی بالکل صحیح تعبیر کے مطابق موجود اول کے لیے اپنی ہی ذات کے اندر رہنا ضروری ہے اور اسے صرف اپنے ہی وجود کا علم ہونا چاہیے۔ اس طرح علم غیب کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ علمائے دین کی یہ کوشش تھی کہ فلاسفہ کو اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے مجبور کیا جائے (تاکہ انھیں منکر غیب اور ملحد قرار دیا جا سکے)۔

لیکن ابن رشد کے نظام میں زیادہ لچک ہے۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ اللہ خود اپنی ذات میں تمام اشیائے عالم کا علم رکھتا ہے، لیکن اس کے علم کو نہ تو کلی کہا جا سکتا ہے اور نہ جزئی۔ لہٰذا وہ علم انسانی کے مانند نہیں بلکہ ایک برتر نوعیت کا علم ہے، جس کا ہم کوئی تصور نہیں کر سکتے، اللہ کا علم علم انسانی کے مانند نہیں ہو سکتا، کیونکہ اگر ایسا ہو تو اس کے علم میں اور لوگ بھی شریک ہو جائیں گے اور پھر خدا ایک خدا نہیں رہے گا۔ مزید برآں خدا کا علم انسان کے علم کی طرح اشیاء سے ماخوذ یا ان کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس یہ جملہ اشیاء کی علت ہے، لہٰذا (بعض) علمائے دین کا یہ الزام کہ ابن رشد کا فلسفہ علم غیب کا منکر ہے، صحیح نہیں ہے۔

جہاں تک روح انسانی کے بارے میں ابن رشد کی تعلیم کا تعلق ہے اس کی اس بناء پر مذمت کی گئی ہے کہ اس کے نزدیک ہر انفرادی روح موت کے بعد روح کلی میں چلی جاتی ہے۔ لہٰذا وہ روح انسانی کی بقا بالذات کا منکر ہے، مگر یہ خیال درست نہیں کیونکہ دوسرے فلاسفہ کی طرح ابن رشد کے نظام میں بھی روح اور عقل کے درمیان امتیاز کرنا ضروری ہے۔ عقل بالکل مجرد اور غیر مادی ہے اور اس کا وجود درحقیقت اسی وقت ہوتا ہے جب اس کا ربط عقل کل اور عقل فعال سے قائم ہو جائے۔ وہ چیز جسے ہم فرد کی عقل کہتے ہیں دراصل ان معانی کے ادراک کی قوت کا نام ہے جن کا سرچشمہ عقل فعال ہے۔ اس قوت کو عقل انفعالی کہا جاتا ہے اور یہ دائم بالذات نہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے اور ''عقل اکتسابی'' (Intellectus adaptus) بن جائے۔ تب جا کر وہ عقل فعال سے وابستہ ہو جاتی ہے، جو ابدی معانی کا گہوارہ ہے اور اس میں ضم ہو کر یہ قوت (عقل) خود بھی ابدی ہو جاتی ہے۔

نفس یا روح کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ فلاسفہ کے نزدیک یہ وہ قوت محرکہ ہے جو اشیائے نامیہ کی زندگی اور بالیدگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ گویا وہ ایک ایسی توانائی ہے جس سے مادہ زندگی حاصل کرتا ہے اور جو عقل کی طرح صفات مادہ سے بالکل مبرا نہیں، اور اس کے برعکس مادے سے اس کا بہت قریبی تعلق ہے، بلکہ ممکن ہے کہ یہ نیم مادی یا مادے کی انتہائی لطیف شکل پر مشتمل ہو۔ ارواح اجسام کی صورت رکھتی ہیں اور اس لیے جسم کی قید سے آزاد ہیں۔ وہ جسم کی موت پر بھی موجود رہتی ہیں اور اپنی انفرادیت برقرار رکھ سکتی ہیں، لیکن ابن رشد کی رائے میں یہ آخری چیز محض امکانی ہے۔ وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ جس روح کا تخیل یہ ہو اس کی بقائے دوام کا کوئی اطمینان بخش ثبوت خالص فلسفیانہ ذرائع سے مل سکتا ہے۔ لہٰذا اس سوال کو حل کرنے کا کام وحی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ (دیکھیے تہافت التہافت: ص ۱۳۷)

بعض علماء نے ابن رشد پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ اسے حشر اجساد سے انکار تھا، لیکن یہاں بھی اس کی تعلیم میں اس عقیدے کا انکار نہیں بلکہ اس کی توضیح ہے۔ اس کے نزدیک ہمارا جو جسم عالم عاقبت میں ہوگا وہ یہ جسم نہیں ہوگا جو اس دنیا میں ہے، کیونکہ جو شے فنا ہوگئی پھر جوں کی توں پیدا نہیں ہوسکتی، بلکہ زیادہ سے زیادہ کسی اور مماثل صورت میں دوبارہ ظہور کرسکتی ہے۔ مزید برآں ابن رشد یہ بھی کہتا ہے کہ ہماری آئندہ زندگی حیات ارضی کی بہ نسبت کہیں زیادہ برتر قسم کی ہوگی، لہٰذا اس دنیا کے مقابلے میں وہاں کے اجسام بھی زیادہ کامل اور مکمل ہوں گے۔ باقی وہ ان فرضی قصوں اور روایتوں کو غیر مستحسن سمجھتا ہے جو آخرت کی زندگی کے بارے میں مشہور ہیں۔

چونکہ اس فلسفی کو اپنے پیش رووں کی بہ نسبت راسخ العقیدہ مذہبی لوگوں کا کہیں زیادہ ہدف ملامت بننا پڑا، لہٰذا اس نے فلسفیانہ تحقیق اور مذہب کے باہمی تعلقات پر زیادہ معین طریقے پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس موضوع پر اس نے اپنے نظریات مذکورہ بالا کتابوں یعنی فصل المقال اور کشف المناہج میں پیش کیے ہیں۔ اس نے پہلا اصول یہ قائم کیا کہ فلسفے کو لازمی طور پر مذہب سے اتفاق کرنا چاہیے اور یہی پورے عربی علم کلام کا مسلمہ اصول ہے۔ ایک طرح سے حق دو قسم کے ہیں یا یوں کہیے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں، یعنی حق فیلسوفی اور حق مذہبی اور ان دونوں کا باہم متفق ہونا ضروری ہے۔ فلاسفہ بھی اپنی نوعیت کے انبیاء ہیں، جن کا خطاب بالخصوص علماء سے ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی تعلیم صحیح معنی میں انبیاء کی تعلیم کے خلاف نہ ہو، جو بالخصوص عوام سے مخاطب ہوتے ہیں، بلکہ فلسفے کے لیے لازم ہے کہ اسی حق کو ایک بلند تر اور نسبتاً کم مادی شکل میں پیش کرے۔

مذہب میں لفظی مفہوم اور تشریح کے درمیان تمیز کرنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر اگر قرآن پاک میں کوئی ایسی عبارت ہے تو ہمیں لامحالہ یقین کرلینا چاہیے کہ ظاہری معنی کے بجائے اس کا کوئی اور مفہوم ہے اور اس حقیقی مفہوم کو تلاش کرنا چاہیے۔ عام لوگوں کا فرض ہے کہ لفظی مفہوم کے پابند رہیں۔ اس کی صحیح تعبیر کا معلوم کرنا صرف علماء کا کام ہے۔

عوام الناس کو چاہیے کہ قصص اور تمثیلات کا وہی مفہوم لیں جس طرح انھیں وحی نے پیش کیا ہے لیکن فلسفی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ ان کے اندر جو زیادہ گہرے اور پاکیزہ تر معانی مضمر ہیں انھیں تلاش کرے اور آخر میں اہل علم ہمیشہ اس بات کا خیال رکھیں کہ انھوں نے جو نتائج اخذ کیے ہیں انھیں عوام تک نہ پہنچائیں۔

ابن رشد نے اس امر کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ مذہب کی تعلیم کو ہمیں کس طرح سامع کے معیار ذہنی کے مطابق رکھنا چاہیے۔ ذہنی صلاحیتوں کا اعتبار سے وہ انسانوں کو تین جماعتوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پہلی اور سب سے بڑی جماعت ان لوگوں کی ہے جو تبلیغ کے نتیجے میں کلام ربانی پر ایمان لاتے ہیں اور تقریباً محض زور خطابت ہی سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ دوسری جماعت میں وہ لوگ شامل ہیں جن کے عقائد کا دارومدار استدلال پر ہے، لیکن محض ایسے استدلال پر جو بدیہی مقدمات پر مبنی ہوتا ہے، جنھیں بلا جرح وتنقید فرض کر لیا جاتا ہے۔ تیسری اور سب سے زیادہ قلیل التعداد جماعت ان لوگوں کی ہے جن کے عقائد کی اساس وہ دلائل ہیں جو بجائے خود ثابت شدہ مقامات کے ایک سلسلے پر قائم ہیں۔ مذہبی تعلیم کو سامع کی ذہنی صلاحیتوں کے مطابق ربط دینے کا یہ طریق ابن رشد کی گہری نفسیاتی بصیرت کا ثبوت ہے، البتہ اس میں یہ اندیشہ ہے کہ وہ شاید مخلصانہ نہ معلوم ہو اور اس لیے یہ ایک قدرتی بات تھی کہ اس سے پیشہ ور علمائے دین میں بے اعتمادی پیدا ہو جائے۔

آخر میں ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ابن رشد ایک ایسا کافر یا ملحد تھا جو راسخ العقیدہ مسلمانوں کے حملوں سے بچنے کے لیے کم وبیش ہنرمندانہ تاویلوں سے کام لے رہا ہو، بلکہ ہمارا میلان خیال اس طرف ہے کہ مشرق کے متعدد ارباب علم کے رویئے کی عام مطابقت کرتے ہوئے اس نے یہ روش اختیار کر رکھی تھی، ابن رشد بھی تطبیقی (Syncretic) عقیدہ رکھتا تھا۔ وہ اس بات پر سچے دل سے یقین رکھتا تھا کہ ایک ہی حقیقت کو مختلف صورتوں میں پیش کیا جا سکتا ہے اور اپنی بے نظیر فلسفیانہ سوچ سمجھ کی بدولت وہ ایسے معتقدات کو ایک دوسرے کو مطابق بنانے میں کامیاب ہو گیا جو ان انسانوں کو جن کے ذہن میں نسبتاً کم لچک پائی جاتی ہے صریحاً متضاد نظر آتے ہیں۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۱/۲۸۔۲۷۔۲۶ھ)

ابن حوقل ابن القاسم محمد ابن حوقل (۹۷۳ء میں بقید حیات)

ابو القاسم محمد ابن حوقل کے حالات زندگی تفصیل سے نہیں ملتے۔ بعض سوانحی کتب سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترکی کے موجودہ شہر نصیبین میں پیدا ہوا اس کی زندگی کا بیشتر حصہ دسویں صدی کے نصف دوم میں گزرا۔ وہ اپنے دور میں ایک جغرافیہ دان اور سیاح کی حیثیت سے مشہور ہوا۔

ابن حوقل سوداگر تھا اور مختلف چیزوں کی خرید وفروخت کے لیے شہر شہر اور نگر نگر گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ بعض مؤرخین کے خیال میں وہ فاطمیوں کا مبلغ دین تھا اور تبلیغ کے لیے دور دراز کے علاقوں کا سفر کرتا رہتا تھا۔ اس نے ۹۴۳ء میں سیاحت کا باقاعدہ آغاز کیا اور سب سے پہلے اسلامی دنیا کا تفصیلی دورہ کیا۔ ۹۴۷ء اور ۹۵۱ء

کے درمیانی عرصے میں وہ شمالی افریقی ممالک میں تھا۔ اس دوران میں اس نے سپین اور صحارہ کے جنوبی حصے کا دورہ کیا۔ سپین میں اس کی ملاقات ایک یہودی طبیب حسدائی ابن شپروت سے ہوئی، جو عبدالرحمٰن سوم کا وزیر تھا۔ اس نے ابن حوقل کو شمالی یورپ کے ملکوں کے متعلق معلومات فراہم کیں اور اس کے عوض ابن حوقل سے مشرق میں بسنے والے یہودیوں اور خزروں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ۹۵۵ء میں اس نے مصر، آرمینیا اور آذربائیجان اور پھر ۹۶۱ء۔۹۶۹ء کی درمیانی مدت میں عراق اور ایران کا سفر کیا۔ اس کے بعد اس نے ماوراء النہر اور خوارزم کی سیاحت کی۔ ۹۷۳ء میں وہ جزیرۂ سسلی میں تھا۔

ابن حوقل نے جغرافیے پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ''کتاب المالک والمسالک'' ہے۔ اس کو ''کتاب صورۃ الارض'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کی شکل وصورت ''اسلامی اٹلس'' جیسی ہے اور یہ اس کے پیشرو اصطخری کی کتاب (تقریباً ۹۳۰ء) سے بہت مشابہ ہے۔ غالباً اسی تصنیف نے ابن حوقل کو اس طرف مائل کیا کہ وہ اپنے آپ کو جغرافیائی تحقیقات کے لیے وقف کرے۔ اصل میں اس کا ارادہ محض اصطخری کی تصنیف کی نظر ثانی تھا۔ ''کتاب المسالک'' کے تین نظر ثانی شدہ ایڈیشن ملتے ہیں۔ پہلا ۹۶۷ء میں حمدانی حکمران سیف الدولہ سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ ۹۶۷ء سے پہلے تیار ہوا کیونکہ یہ حکمران اسی سال فوت ہوا۔ دوسرا تقریباً ۹۷۷ء میں تیار ہوا جس میں وہ حمدانیوں پر تنقید کرتا ہے اور تیسرا اکمل اور جامع نسخہ ۹۸۸ء کے لگ بھگ تیار ہوا۔

اس کتاب کا خصوصاً بیانیہ حصہ پہلے کے مصنفین سے بہت بہتر ہے۔ ابن حوقل نے سوڈان، ترکی، نوبیہ اور جنوبی اٹلی کے غیر مسلم علاقوں کے متعلق تفصیلات بھی شامل کی ہیں۔ واقعات کے تسلسل اور ان کی تاریخوں کے ضمن میں اس نے بعض غلطیوں کی درستی بھی کی ہے اور خام اشیاء کے معاشی مفاد کے متعلق بہت سی معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو اس نوعیت کی سابقہ تصانیف میں نہیں ملتا۔ تاہم کتاب میں شامل کردہ نقشوں کو ترتیب دیتے وقت ابن حوقل نے اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا کہ ان کی مدد سے قاری کتاب میں مذکور علاقوں اور سمندروں کے محل وقوع کی صحیح نشاندہی کس طرح سے کر سکے گا۔ (معروف مسلم سائنسدان: ص ۲۹۱)

عباس ابن فرناس (م: ۸۸۷ء)

عباس ابن فرناس کے نام کو بعض اوقات ایک دوسرے ہسپانوی شاعر عباس بن ناصح (متوفی: ۸۴۴ء) کے نام کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا ہے کیونکہ اس کا تعلق بھی ہسپانیہ سے تھا۔ وہ رندہ (Ronda) کے علاقے میں پیدا ہوا۔ وہ نسلاً بربر تھا۔ اس کا انتقال ۸۸۷ء میں ہوا۔

ابن فرناس بڑے اختراعی ذہن کا مالک تھا اور اس کی جستجو کا دائرہ شاعری اور انسانیات سے لے کر فلکیات اور ٹیکنالوجی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی شخصیت باکمال تھی۔ وہ اپنی قصیدہ گوئی اور علم وفضل کی بدولت

متواتر تین بادشاہوں یعنی الحکم اول، عبدالرحمٰن ثانی اور محمد اول کے دربار سے وابستہ رہا۔

ابن فرناس نے اپنی اختراعات اور ایجادات کی بدولت بہت شہرت حاصل کی۔ اہل مغرب کو مشرقی علوم سے روشناس کرانے میں بھی اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ پورے ہسپانیہ میں واحد شخص تھا، جو الخلیل ابن احمد کی علم عروض سے متعلقہ تصنیف کو سمجھ سکتا تھا اور سمجھا سکتا تھا۔

ابن فرناس نے عراق کا سفر بھی کیا اور وہاں کے علمی و ادبی حلقوں اور اداروں کو بغور دیکھا۔ واپسی پر وہ اپنے ساتھ فلکیات کی مشہور کتاب ''سند ہند'' بھی ہسپانیہ لے آیا، جس نے یورپی فلکیات پر گراں قدر اثرات مرتب کیے اور اس کی مزید نشو و نما میں اہم کردار ادا کیا۔

ابن فرناس کے متعلق ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے اڑنے کی کوشش بھی کی۔ اس نے اڑنے کے لیے ایک غلاف تیار کیا جس میں پَر اور متحرک بازو لگے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے تیار کردہ غلاف کی مدد سے خود اڑنے کا خطرہ مول لیا اور ایک غلاف اور مصنوعی پروں کے ساتھ ایک بلند چٹان سے کود پڑا، لیکن اس کی پرواز زیادہ کامیاب ثابت نہ ہو سکی۔ نیچے اترتے ہوئے وہ زخمی ہو گیا اور کئی دن تک مرہم پٹی کراتا رہا۔ اس کے مخالفین پرواز میں اس ناکامی کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس نے پرندوں کی اڑان کا مطالعہ کرتے وقت اس چیز پر غور نہیں کیا کہ وہ نیچے آتے ہوئے اپنی دم کو کیسے استعمال کرتے ہیں۔ ابن فرناس کی اس پرواز کا ذکر عربی اور ہسپانوی تحریروں میں اکثر ملتا ہے۔

ابن فرناس نے اپنے گھر میں ایک سیارگاہ بھی بنا رکھی تھی، جس میں چاند ستاروں اور بجلی کی گرج چمک کا ماحول مصنوعی طور پر پیدا کیا گیا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے بعض تنگ نظر عناصر کی جانب سے اس پر کفر کی تہمت بھی لگائی جاتی رہی، لیکن وہ ابن فرناس کی مقبولیت کو گھٹانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ابن فرناس نے ایک خاص قسم کا گھڑیال بنایا اور اسفیر یعنی کرۂ فلکی بھی ایجاد کیا۔ بلور کوہی (Rock Crystal) کی دریافت بھی اسی سے منسوب کی جاتی ہے۔ جن کتابوں میں اس کی اختراعات کا ذکر کیا گیا تھا، وہ اب مکمل حالت میں دستیاب نہیں۔ لہٰذا اس بارے میں فیصلہ کرنا قدرے مشکل ہے کہ بلور کی دریافت میں اس کا کیا حصہ تھا۔ تاہم بلور کی دریافت ابن فرناس سے منسوب کرنے والوں میں E. Levi Proven,cal بھی شامل ہے، جسے ابن حیان کی تصنیف ''المقتبس'' تک رسائی حاصل تھی۔ ایک ماخذ کے مطابق ''المقتبس'' کے مصنف نے ابن فرناس کے کئی تذکرے اور اشعار شامل تحریر کیے۔ اسی ماخذ کے مطابق اس گمشدہ کتاب یعنی ''المقتبس'' کا ایک مخطوطہ حال ہی میں دریافت ہوا ہے۔ مشہور مؤرخین ابن سعید اور مقری کے مطابق ''وہ اندلس میں بلور کو ایجاد (دریافت) کرنے والا پہلا شخص تھا۔''

اس بیان سے کئی مطلب اخذ کیے جا سکتے ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ بلور کاٹنے کا طریقہ ابن فرناس ہی نے متعارف کرایا۔ اس سے یقیناً بلاد شرقیہ (خصوصاً مصر) کی کوارٹز کی برآمد پر بہت اثر پڑا ہوگا، کیونکہ اب یہ

حقیقت سامنے آ گئی تھی کہ بلور کوہ کو کاٹ کر وہاں استعمال میں لایا سکتا تھا، جہاں سے یہ نکالا جاتا تھا۔ اس اختراع کے باوجود شیشہ سازی کی صنعت پر کوئی اثر نہ پڑا، جو سنہ عیسوی سے کم از کم تین سو سال پہلے شروع ہوئی تھی۔ (معروف مسلم سائنسدان: ص ۱۵۱)

جابر بن حیان بن عبداللہ کوفی المعروف الصوفی (۷۲۱ھ ______ ۸۰۶ء)

جابر بن حیان طوس اور بعض کے نزدیک خراسان میں پیدا ہوا۔ اولین دور کے عربی علم الکیمیا کے ممتاز نمائندوں میں سے تھا۔ الفہرست جس کے صفحہ ۳۴۵ پر جابر کے قدیم ترین سوانح حیات محفوظ ہیں، لیکن الفہرست میں اس کی مشہور کنیت ابو موسیٰ نہیں دی گئی بلکہ ابو عبداللہ مذکور ہے، حالانکہ ابن الندیم نے خود لکھا ہے کہ الرازی (م ۳۱۳ھ/ یا ۳۲۳ھ/ ۹۳۵ء) اس کا حوالہ ہمیشہ ان الفاظ میں دیا کرتا تھا کہ ''ہمارے استاد ابو موسیٰ جابر بن حیان کا قول ہے............'' اس سوانح عمری سے اس کے واقعات زندگی ہی نہیں بلکہ ان افسانوی روایات کے بارے میں بھی یقینی طور پر پتا نہیں چلتا جو اس کے متعلق مشہور ہیں۔ دوسری طرف ابن الندیم یہ نظریہ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ جابر کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ جو تحریریں جابر سے منسوب ہیں ان میں امام جعفر الصادق رحمہ اللہ (م ۱۴۸ھ/ ۷۶۵ء) کے بارے میں اس قسم کے حوالوں سے کہ وہ اس کے استاد تھے، نیز ان حوالوں سے جن کا اشارہ برامکہ کی طرف ہے، اَلْجَلْدَکِی (م ۷۴۳ھ/ ۱۳۴۲ء) کی اس روایت کی تائید ہوتی ہے کہ وہ ابتدائی عباسی خلفا کا ہم عصر تھا۔ پھر جہاں تک اس کی تاریخی شخصیت کا تعلق ہے، ہوم یارڈ Holmyard کا کہنا ہے کہ اس کا باپ ''حیان نامی ازدی کوفے کا ایک عطار تھا......'' جس کا ذکر آٹھویں صدی کی ان سیاسی تحریکوں کے سلسلے میں آتا ہے جن سے بالآخر دولت بنی امیہ کا خاتمہ ہو گیا۔'' اس سے پتا چلتا ہے کہ بعض مؤخر ماخذ میں جابر کے لیے ازدی کی نسبت کیوں آئی ہے۔

اس امر سے تو اب کسی کو انکار نہیں کہ جابر کی تصانیف کی جو فہرست خود جابر کی اپنی تحریروں کے حوالے سے الفہرست میں دی گئی ہے بحیثیت مجموعی صحیح ہے، چنانچہ کئی ایک ایسی کتابوں کے اقتباسات جن کا صرف نام ہی معلوم تھا ان تحریروں میں مل گئے ہیں اور اب تک محفوظ ہیں۔ یہی تحریریں تھیں جن کی بدولت کراؤس (P.Kraus) نے اس کی جملہ تصانیف کی ایک تنقیدی تاریخ مرتب کی، مقابلہ کرنے کے بعد ان کے سنین و تواریخ کی تعیین کی اور یوں الفہرست میں دی ہوئی فہرست کی اصلاح کر دی۔ (اس کے مآخذ میں حل الرموز و مفاتیح الکنوز کو بھی شامل کر لینا چاہیے جس کا حوالہ شوق المستھام، طبع ھامر Ancient Alphabets: J.V. Hammer ۱۸۱۰ء، ص ۸۰، میں موجود ہے)۔

بایں ہمہ ان تحریروں میں جن اشخاص کا ذکر آیا ہے ان کے اسما سے ان کے زمانۂ تصنیف کا پتا نہیں چلتا۔ ان کی موجودگی کی قدیم ترین شہادت کچھ تو کیمیا گر ابن اُمَیْل (نواح ۳۵۰ھ/ ۹۶۱ء) اور جعل ساز ابن

وحشیہ (نواح ۳۵۰ھ/ ۹۶۱ء) کی تصنیفات سے ملتی ہے اور کچھ ابن الندیم کی الفہرست سے۔

جابر کی جملہ تصنیفات کو متعدد مجموعوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن میں اہم ترین یہ ہیں:

① کتب المائة والإثناعشر ، فن کیمیا گری میں جابر کے غیر مربوط مضامین، جن میں قدیم کیمیا گری کے کئی حوالے (زوسیموس (Zosimus) دیموقریطوس (Democritus) ہرمس (Hermes) اغاثودیمون (Agathodemon) وغیرہ) آ گئے ہیں۔

② کتابُ السبعین ، یعنی علم الکیمیا میں جابر کی تعلیمات کا مرتب و منظم بیان۔

③ کتب المائة والأربعة والأربعون یاکتب الموازین ، کیمیا گری اور جملہ علوم کی نظری اور بالخصوص فلسفیانہ اساس کا بیان۔

④ کتب الخمس مائة ، جو کتب الموازین کے بعض مسائل کی مزید تحقیق میں متفرق رسائل پر مشتمل ہیں۔

ان چاروں مجموعوں سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ جابری نظریے کا نشو ونما اور اس کی جملہ تصنیفات کی ترتیب بتدریج کن کن مراحل سے گزری۔ ان مجموعوں میں بعض چھوٹے چھوٹے مجموعوں کا بھی اضافہ کرنا پڑے گا جن میں ارسطو اور افلاطون کی کتابوں پر شرحوں کے حوالے سے کیمیا گری پر بحث کی گئی ہے۔ بقول لیبان (Lebon) جابر پہلا ماہر کیمیا ہے جس نے عمل تقطیر و تذویب وتحویل بیان کیا ہے۔ اس کے بعد فلسفہ، فلکیات ونجوم، ریاضیات اور موسیقی، طب اور سحر پر اس کے رسائل آتے ہیں اور آخر الامر مذہبی تصنیفات۔

یہ نہایت وسیع مجموعۂ تصانیف قدما کے ان جملہ علوم پر مشتمل ہے جو مسلمانوں تک پہنچے، لہٰذا یہ ایک ہی مصنف کا کام نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اس کی تاریخ تصنیف دوسری صدی ہجری/ آٹھویں صدی عیسوی کے نصف آخر ایسے قدیم زمانے میں بھی متعین نہیں کی جاسکتی۔ اس سلسلے میں جملہ حقائق کو سامنے رکھیے تو کہنا پڑے گا کہ یہ مجموعہ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے آخر اور چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی عیسوی کے شروع میں مرتب ہوا۔

جابر کی تصانیف سے جو مسئلہ سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے اس کا تعلق مذہب کی تاریخ سے ہے۔ جس طرح قدیم کیمیا گر، جہاں تک ہمیں ان کے متعلق معلومات حاصل ہیں، اپنے فن کی اساس مسیحی اَدْرِیّت باطنی علم یا مذاہب العرفان پر رکھتے تھے، اسی طرح جابر نے اپنے نظام علوم کی بنا مسلمانوں کے باطنی علم یا عرفان (اَدْرِیَّـــــتْ) پر رکھی ہے لیکن یہ وہ ابتدائی عرفان اور باطنی علم نہیں جس کی نشو ونما پہلی صدی ہجری/ ساتویں صدی عیسوی اور دوسری صدی ہجری/ آٹھویں صدی عیسوی کے شیعی حلقوں میں ہوئی جیسا کہ الحاد، یعنی ملل واہواء پر لکھنے والے مسلمان مصنفوں نے بیان کیا ہے، بلکہ یہ باطنی علم وعرفان وہ اتحاد پسندی ہے جو تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے آخر میں غالی شیعوں میں رائج تھی اور جو انقلابی سیاسی رجحانات کے ساتھ

مل کر خطرے کا باعث بنی۔

جابر کی مذہبی مصطلحات کا جائزہ لیا جائے تو قرامطہ سے اس کا بڑا گہرا تعلق نظر آتا ہے، چنانچہ جابر کے ہاں تو قرامطہ کے حوالے بھی ملتے ہیں جو ۲۶۰ھ/ ۸۷۳ء کے بعد منصۂ شہود پر آئے تھے۔ امام کو اب صامت کے بجائے ناطق کہا گیا ہے اور مراتب الحدود کے لیے بھی وہی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں جو قرامطیوں اور فاطمی اسمٰعیلیوں کے ہاں رائج تھیں (مثلاً باب، حجت، داعیٔ مطلق، سابق، تالی، لاحق، وغیرہ)، امام کے مخالفین (اضداد) کے عقیدے کو بھی نشو ونما دی گئی ہے اور تاریخ عالم کی تقسیم باعتبار سلسلۂ وحی کی گئی ہے، جس کا ظہور یکے بعد دیگرے سات مرحلوں میں ہوا اور آخری وحی وہ ہے جو جابری امام کو ہوئی۔ ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے شروع ہو کر نئے امام قائم تک ائمہ اسلام کی تعداد بھی سات ہے: حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ، محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ، علی رحمہ اللہ بن حسین رضی اللہ عنہ، محمد بن الباقر رحمہ اللہ، جعفر الصادق رحمہ اللہ، اسماعیل محمد بن اسمٰعیل نئے امام قائم۔ قرامطہ اور اسمٰعیلیہ کے برخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شمار ائمہ سبعہ میں نہیں ہوتا۔ وہ امام صامت ہیں، ایک مخفی الوہیت، جس کا رتبہ ناطق سے بلند تر ہے اور ساتواں امام دنیا میں انھی کی الوہیت کا مظہر ہے۔ اس لحاظ سے جابر کی تعلیم فرقہ نصیریہ سے مشابہ ہے اور انھی کی طرح جابر کے یہاں بھی اقانیم ثلاثہ کا تصور قائم ہے، یعنی عین علی رضی اللہ عنہ، میم محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اور سین سلیمان رضی اللہ عنہ۔ اس سلسلے میں جابر کا مشتہر امام، جسے وہ ماجد یا یتیم بھی کہتا ہے، میم اور سین کے مراتب سے گزرنے کے بعد براہ راست عین سے ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس نے دوسرے غالی شیعیوں اور بالخصوص نصیریوں کی طرح تناسخ ارواح کا عقیدہ بھی تسلیم کر لیا ہے (مصطلحات: تناسخ، ادوار، اکوار، نسخ، فسخ، رسخ، مسخ)۔

ثانیاً جابر کی تحریروں سے کچھ ایسے مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن کا تعلق دنیائے اسلام میں علوم کی تاریخ سے ہے۔ جابر کی جملہ تصنیفات میں حسب ذیل اصناف علوم کا مطالعہ کیا گیا ہے:

کیمیا گری جسے ہمیشہ سب پر مقدم رکھا گیا ہے، طب، نجوم (فلکیات)، سحر (طلسم و نیرنگ) علم خواص اشیاء اور ذوی الحیات کی مصنوعی نسل تکوین۔ پھر اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ قدیم علوم کی ان شاخوں کے متعلق ہماری معلومات ناقص ہیں جابر کی تحریروں سے یونانی علوم کے بعض دلچسپ پہلوؤں کو از سر نو اجاگر کیا جا سکتا ہے، جو عام خیال کے مطابق ضائع ہو چکے تھے۔ قدیم کیمیا گری کے بارے میں اس وقت ہمیں جو کچھ بھی معلوم ہے اس کے پیش نظر اس میں اور جابر کی کیمیا گری میں بنیادی فرق ہے۔ اس میں اس رہبانی رمز و کنایہ سے عمداً اجتناب کیا گیا ہے جس کی قدیم ترین مثالیں زوسیموس (Zosimus) وغیرہ کی نگارشات میں ملتی ہیں اور جس کی اصل مصری ہے۔ اس رمز و کنایہ کی تجدید مسلمانوں میں ابن اُمَیل، صاحب "مصحف جماعۃ الفلاسفۃ" (Turbaphiloso Phorum) الطغرائی اور الْجِلْدکی وغیرہ ایسے اکثر لوگوں نے کی ہے۔

جابر کی کیمیا گری ایک تجربی علم ہے، جو ایک فلسفیانہ نظیر پر مبنی ہے۔

یہ فلسفیانہ نظریہ زیادہ تر ارسطو کی طبیعیات سے ماخوذ ہے۔ جابر ارسطو کی اس تصنیف سے واقف تھا اور وہ اس کے جملہ حصوں، نیز اسکندر افرودیسی (Alexander) of Aphrodisias، ثامسطیوس (Themistius) سمبلیقیوس (Simplicius) فرفوریوس (Porphyry) وغیرہ کی شرحوں کے حوالے اکثر حُنَیْن بن اسحٰق (م 260ھ/ 873-874ء) اور اس کے تلامذہ کے ترجموں سے دیتا ہے۔ ہمیں اس میں افلاطون، ثاوفرسطس (Theophrastus)، جالینوس (Galen) اوقلیدس Euclid، بطلیموس Ptolemy، ارشمیدس Archimeds اور نام نہاد Plutarchus کی Placita Philosophorum وغیرہ کے اقتباسات بھی ملتے ہیں۔ ان میں متعدد ایسے بھی ہیں جن کی یونانی اصل ضائع ہو چکی ہے۔ کیمیا گری میں کسی اسلامی تصنیف سے قدما کی تصانیف کے بارے میں اتنے وسیع علم کا نہ تو اظہار ہوتا ہے اور نہ کسی کی حیثیت ایسی جامع ہے جیسی جابر کی تصانیف کی۔ اس اعتبار سے وہ رسائل اخوان الصفاء سے مشابہ ہیں، جن کا سرچشمۂ معلومات بھی وہی ہے جو جابر کا ہے۔

جابر کی علمی مصطلحات بلا استثناء وہی ہیں جن کی اختراع حنین بن اسحٰق نے کی تھی اور جو پھر اس امر کا ثبوت ہے کہ جابر کے مجموعہ تصنیفات کا تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی سے قبل مرتب ہونا ممکن نہ تھا۔

جابر کے علم کا بنیادی اصول میزان (توازن) ہے۔ اس اصطلاح میں کئی قسم کے تخیلات و تصورات سے کام لیا گیا ہے اور یہ جابر کے مختلف علمی نظریات میں مطابقت و موافقت پیدا کرنے کی قطعی شہادت ہے۔

میزان کے معنی ہیں:

① وزن یا ثقل نوعی (بحوالہ ارشمیدس)

② قدیم کیمیا گروں کا میزان، میزان اصحاب الکیمیاء القدامی، اس پیمانے کے معنوں میں جو اشیاء کے امتزاج میں استعمال ہوا۔

③ عربی ابجد کے ان حروف کے متعلق قیاس آرائی جن کا تعلق بنیادی طبائع اربع حَرَارتْ، بُرُودَتْ، رَطُوبَتْ، یُبُوْسَت سے ہے۔ اس میزان الحرف کا اطلاق نہ صرف عالم تحت القمر کی ہر شے پر، بلکہ عقل، روح و نفس، مادہ، مکان اور زمان جیسے ہر قسم کے مابعد الطبیعی وجود پر بھی ہوتا ہے۔ یہ ایک طرف تو نوفیثا غورثیت اور دوسری جانب جَفْر کے شیعی نظریات تھے جن سے جابر کا نظام علم مستعار ہے۔

④ میزان بذاتہٖ ایک مابعد الطبیعی اصول بھی ہے، یعنی جابر کی علمی وحدت کی علامت۔ اس لحاظ سے وہ مانویوں کے نظریۂ ثنویت کی ضد ہے۔ علاوہ ازیں یہ ان نوفلاطونی خیالات کے اثرات سے بھی خالی نہیں جن کا تعلق واحد اور وحدت سے ہے۔

⑤ میزان ان قرآنی حوالہ جات کی تلمیحاتی تاویل سے بھی ماخوذ ہے جو روز جزا میں وضع موازین

کے سلسلے میں مذکور ہیں۔ یہی خیال مسلمانوں کے ہاں اہل معرفت میں ملتا ہے اور اسی طریق سے جابر اپنے نظام علم کا سلسلہ اپنی مذہبی تعلیمات سے ملاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے جابر کی تصنیفات کو حرّانی ماحول کے وثنی علم و فضل سے گہرا تعلق ہے۔ صابئین نے بعض مابعد الطبیعی اصولوں سے جس طرح بحث کی ہے ان کو پیش کرتے ہوئے جابر صراحتاً ان کا نام لیتا ہے۔ اس کا نظام علم براہ راست ان ماخذ پر مبنی ہے۔ نام نہاد بلینوس الطّوانی (Ps. Appollonius of tyana) کتاب سرالخلیقۃ وغیرہ۔ یہ وہ موضوع تصنیفات ہیں جو محمد بن زکریا الرازی کے ایک حاشیے کے مطابق المامون کے عہد میں مرتب کی گئی تھیں اور "حرّانی" ادب کے بارے میں معلومات کا بہترین سرچشمہ ثابت ہوئی ہیں۔

جابر کا اپنا قول یہ ہے کہ اسے یہ علم اپنے استاد امام جعفر الصادق رحمہ اللہ سے ملا ہے اور اس کے سارے علوم اسی "معدن حکمت" کے رہین منت ہیں، ورنہ اس کی اپنی حیثیت تو محض ایک مرتب و مؤلف کی ہے۔ مذہبی اعتبار سے بھی وہ اپنا درجہ امام موصوف کے فوراً بعد قرار دیتا ہے۔ مزید برآں وہ بیان کرتا ہے کہ اس کا ایک استاد حربی الحمیری تھا، دوسرا ایک راہب اور تیسرا اُذْنُ الحِمَار نامی ایک شخص۔ خاندان برامکہ کے اکابر خالد، یحییٰ، اور جعفر، جن کے نام جابر نے اپنے کئی رسائل معنون کیے ہیں، نیز ایک شیعی خاندان یقْطِین کے افراد کا شمار امام جعفر الصادق رحمہ اللہ کے معاصرین میں کیا گیا ہے۔

لیکن ان سب بیانات کی حیثیت ایک افسانے سے زیادہ نہیں اور یہ اس داخلی شہادت کے سراسر خلاف ہیں جو اس کی تصنیفات سے ملتی ہے۔ علاوہ ازیں امام جعفر الصادق رحمہ اللہ کے شاگردوں میں، جیسا کہ شیعی تصنیفات سے پتا چلتا ہے، کسی جابر ابن حیان کا نام نہیں ملتا لہٰذا یہ محض ایک من گھڑت بات معلوم ہوتی ہے۔ پھر یہ بات بھی ہماری سمجھ میں آجاتی ہے کہ ان کتب و رسائل کے مصنف نے انھیں امام جعفر صادق رحمہ اللہ کے ایک شاگرد سے صرف اس لیے منسوب کیا کہ اکثر شیعی نگارشات میں امام جعفر الصادق رحمہ اللہ کو یونانی علم و فضل اور بالخصوص علوم باطنی کا نمائندہ تصور کیا جاتا ہے۔ مزید برآں وہ ساتویں امام اسمٰعیل کے والد تھے، جن کے ظہور کا ان تصنیفات میں اعلان ہوا۔

ابن الندیم کی الفہرست میں لکھا ہے کہ اس کے عہد میں ایسے شیعہ بھی موجود تھے جو جابر سے ان تصنیفات کی نسبت کو مشکوک سمجھتے تھے۔ ابو سلیمان المنطقی (م نواح ۳۷۰ھ/۹۸۰۔۹۸۱ء) ایسے فلسفی اور سائنس دان کی کتاب التعلیقات میں مذکور ہے کہ وہ جابر سے منسوب کردہ کتابوں کے مصنف کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ اس کا نام حسن بن النکد الموصلی تھا۔ اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ تصنیفات جابر کا مصنف کوئی فرد واحد نہیں تھا اور یہ کہ جابر کا سارا مجموعۂ کتب اپنی موجودہ شکل میں ایک خاصے طویل ارتقائے عمل کے بعد مرتب ہوا، تو بھی ہمیں اس بیان پر شک کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اس اعتبار سے یہ تقریباً ۳۳۰ھ/۹۴۲ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ہوگا۔ محمد محسن شیخ آغا بزرگ طہرانی نے جابر کی کتاب الرحمۃ کے آغاز میں مذکورہ حوالے سے ابو الربیع سلیمان بن موسیٰ

بن ابی ہشام کی ایک روایت نقل کی ہے کہ جب جابر نے ۲۰۰ھ میں بمقام طوس وفات پائی تو کتاب الرحمۃ اس کے سر کے نیچے رکھی ہوئی ملی۔ اس روایت نے جابر کی وفات کا مقام اور سن متعین کر دیا۔

(الذریعۃ الی تصانیف الشیعۃ ۲:۵۵)

آگے چل کر عربی کیمیا گری نے جابر کی تحریروں سے خاص اثر قبول کیا۔ متاخرین سب کے سب اس کی تحریروں کا حوالہ دیتے ہیں اور ان میں سے کئی ایک نے ان کی شرحیں بھی لکھیں۔ جابر کے مجموعہ تصانیف کی کئی کتابوں کا ترجمہ لاطینی میں بھی کیا گیا، البتہ وہ مشہور رسائل جو جابر شاہ عرب (Geber rex Arabum) سے منسوب ہیں وہ دراصل ایک مؤخر تنقیح وتہذیب پر مبنی ہیں، جو سترہویں صدی عیسوی کے ایک لاطینی مصنف کے ہاتھوں انجام پائی۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۷/۷،۸،۹)

ثابت ابن قرہ (۸۳۶ء ___ ۹۰۱ء)

ریاضی، فلکیات، میکانیات، طب اور فلسفے کا یہ عالم ۸۳۶ء میں عراق کے شہر حران میں پیدا ہوا۔ یہ علاقہ اس وقت ترکی میں ہے۔ ۱۸ر فروری ۹۰۱ء میں بغداد کے مقام پر اس کی وفات ہوئی۔

ثابت ابن قرۃ کا تعلق صابی مذہب سے تھا۔ یہ مذہب بابل کے ستارہ پرستوں سے چلا۔ چونکہ صابیوں کی اکثریت ستارہ شناس تھی، اس لیے ان کے ہاں بہت سے ہیئت دان اور ریاضی دان پیدا ہوئے۔ اہل یونان کے غلبے کے عرصے میں یہ یونانی زبان بولنے لگے اور انھوں نے یونانی نام بھی اختیار کر لیے۔ جب عربوں نے ان کا علاقہ فتح کیا تو یہ عربی بولنے لگے اور عربی نام بھی رکھ لیے۔ اگرچہ بڑی مدت تک یہ اپنے مذہب ہی پر کاربند رہے۔ ثابت کی اصل زبان سریانی تھی، لیکن وہ یونانی اور عربی بھی جانتا تھا۔ اس کی بیشتر سائنسی تصانیف عربی میں تھیں۔ کچھ سریانی زبان میں تھیں اور اس نے کئی یونانی کتابوں کا ترجمہ بھی عربی زبان میں کیا تھا۔

جوانی میں ثابت حران میں مبادلۂ زر کا (Money Exchange) کام کرتا تھا۔ موسیٰ بن شاکر کے تین بیٹوں میں سے ایک محمد بن موسیٰ بن شاکر، جو ایک ریاضی دان تھا، کا گزر حران سے ہوا تو وہ ثابت کی زبان دانی سے بہت متاثر ہوا اور اس کو بغداد آنے کی دعوت دی۔ بغداد جا کر ثابت کو تینوں بھائیوں کی رہنمائی حاصل ہوئی اور وہ ریاضی اور ہیئت کا عظیم عالم بن گیا۔ اس کی تصانیف میں سب سے زیادہ کام اس کی ریاضی کی کتابوں پر ہوا ہے اور اس دور میں جتنے اہم ریاضیاتی اکتشافات ہوئے ہیں، ان میں ان تصانیف کا بڑا حصہ ہے۔ ان اکتشافات میں عدد کے تصور کا مثبت حقیقی اعداد پر اطلاق، احصائے تکمیلی (Integral Calculus) اور کروی تکونیات (Spherical Trigonometry)، تجزیاتی ہندسہ (Analytical Geometry) اور غیر اقلیدسی ہندسہ (Non - Euclidean) شامل ہیں۔ فلکیات کے میدان میں ثابت ان لوگوں میں شامل

ہے، جنھوں نے پہلے بطلیموسی نظام میں اصلاحات تجویز کیں اور سکونیات (Statics) کا تو وہ بانی مبانی تھا۔ وہ ایک ممتاز طبیب اور عراق کے صابیوں کا رہنما تھا۔ اس نے اپنے علاقے میں اپنے ہم مذہبوں کے اثر ورسوخ کو خاصا بڑھایا۔ زندگی کے آخری سالوں میں ثابت عباسی خلیفہ المعتضد (دور حکومت ۸۹۲ء تا ۹۰۲ء) کے درباریوں میں شامل رہا۔ اس کا بیٹا سنان اور پوتے ابراہیم اور ثابت بھی مشہور ومعروف علماء میں سے تھے۔

ثابت نے ریاضی کی تقریباً تمام شاخوں میں کام کیا۔ اس نے ریاضی کی بہت سی قدیم کتابوں کا یونانی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ ان تراجم میں خاص اہمیت کی حامل ارشمیدس کی وہ تمام تصانیف ہیں، جن کا اصل متن یونانی زبان میں ناپید ہو چکا ہے، مثلاً اصول مسلمہ (Lemmata)، چھوتے ہوئے دائرے (On Touching Circles)، مثلثات (On Triangles) اور اپالونیس کی مخروطیات (Conics)۔ ثابت نے اقلیدس کے عناصر (Elements) اور بطلیموس کی المجسطی کی شرحیں بھی لکھیں۔

(معروف مسلم سائنسدان: ص ۱۹۳)

غیاث الدین ابوالفتح عمر ابن ابراہیم الخیامی المعروف بہ عمر خیام (۱۰۴۸ء ___ ۱۱۳۱ء)

۱۵ رمئی ۱۰۴۸ء کو ایران کے شہر نیشاپور میں پیدا ہوا اور ۴ ردسمبر ۱۱۳۱ء کو یہیں وفات پائی۔ وہ ایک خوبصورت شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر ریاضی دان بھی تھا اور اسے فلکیات اور فلسفے میں بھی کمال حاصل تھا۔

خیام کے والد کا نام ابراہیم تھا۔ ابراہیم یا اس کے آباؤ اجداد خیمہ سازی کے پیشے سے وابستہ تھے۔ ''عمر'' اس کا ذاتی نام تھا، جبکہ ''غیاث الدین'' کا خطاب اسے بعد میں ملا۔ ''النیشاپوری'' کا لقب اس نے اپنی جائے پیدائش کی نسبت سے اختیار کیا۔

بارہویں سے پندرہویں صدی عیسوی تک کے عربی مآخذ میں خیام کے بارے میں چند حوالے ملتے ہیں لیکن ان میں بعض کا آپس میں اختلاف ہے۔ ان مآخذ میں اس کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں بھی مختلف ہیں۔ ایک جگہ اس کا سنہ پیدائش ۱۰۱۷ء مرقوم ہے، حالانکہ سب سے زیادہ معتبر تاریخ پیدائش وہی ہے، جو سطور بالا میں درج ہے یعنی ۱۰۴۸ء۔ یہ تاریخ مشہور مؤرخ البیہقی (۱۱۰۶ء۔ ۱۱۷۴ء) نے دی ہے، جو خیام کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ اس نے اپنی تاریخ میں خیام کے زائچے سے متعلق ایک دستاویز بھی شامل کی ہے۔ خیام کی اغلب ترین تاریخ وفات کے لیے جزوی طور پر نظامی عروضی سمرقندی (۱۱۱۰ء۔ ۱۱۵۵ء) کے اس بیان کو بنیاد بنایا گیا ہے، جس میں اس نے خیام کے انتقال کے چار برس بعد اس کے مقبرے کی زیارت کا ذکر کیا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اس نے یہ زیارت ۵۳۰ھ (۱۱۳۵ء۔ ۱۱۳۶ء) میں کی۔ اس تاریخ وفات (۴ ردسمبر ۱۱۳۱ء) کی تصدیق پندرہویں صدی عیسوی کے ایک مصنف یار احمد تبریزی نے بھی کی ہے۔

خیام کی ولادت کے ضمن میں یہ بات مسلمہ ہے کہ وہ خراسان پر سلجوقیوں کے قبضے کے فوری بعد پیدا

ہوا۔ سلجوقیوں نے خوارزم، ایران اور آذربائیجان کے علاقے فتح کر لیے اور ان پر ایک عظیم ریاست کی بنیاد رکھی۔ اکثر ماخذ بشمول البیہقی اس بات پر متفق ہیں کہ خیام نیشاپور سے تعلق رکھتا تھا۔ تیرہویں، چودہویں صدی عیسوی کے ایک مؤرخ رشید الدین فضل اللہ کے مطابق اس نے نیشاپور میں ہی تعلیم حاصل کی۔ ایک دوسرے مصنف تبریزی کے مطابق اس نے لڑکپن اور جوانی کا زمانہ بلخ میں گزارا۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ سترہ سال کی عمر تک اس نے فلسفے پر مکمل عبور حاصل کر لیا تھا۔

وثوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خیام نے تعلیم کہاں سے حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد غالباً معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ ان تدریسی مصروفیات کی وجہ سے اسے اس قدر فراغت نہیں ملتی ہوگی کہ وہ اپنی توجہ سائنسی تحقیقات پر مرکوز کر سکے۔ اس دور میں جو علماء خود صاحب ثروت نہیں ہوتے تھے، انھیں کسی بااثر شخصیت کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا تھا۔ خیام کو بھی یکسوئی کی خاطر شاہی دربار سے وابستگی اختیار کرنا پڑی۔ اس صورت حال میں بھی کسی سکالر یا محقق کا پوری آزادی سے اپنی تحقیقات اور تخلیقات پر توجہ دینا ممکن نہیں ہوتا اور اس کے سرپرست کا رویہ اور درباری سیاستیں کسی نہ کسی طور اس کے کام پر ضرور اثر انداز ہوتی ہیں۔ خیام نے اپنے ''رسالتہ فی البراہین علی مسائل الجبر والمقابلتہ'' کے آغاز میں اس طرح کی زندگی کے مصائب پر بڑے بھرپور انداز سے روشنی ڈالی ہے:

''میں زمانے کی ناہمواریوں کے سبب پیش آنے والی رکاوٹوں کی وجہ سے اس قابل نہیں تھا کہ اپنے آپ کو علم الجبرا کے لیے وقف کر سکوں اور اس پر مسلسل توجہ دے سکوں۔ ہمیں تمام اہل علم حضرات سے محروم کر دیا گیا ہے، سوائے ایک گروپ کے جو چند ایک لوگوں پر مشتمل ہے۔ انھیں بہت مشکلات درپیش ہیں اور ان کو زندگی میں بس یہ دلچسپی ہے کہ وہ موقع ڈھونڈتے ہیں اور جب زمانہ سو رہا ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو اس اثنا میں سائنس کی تکمیل اور تحقیق کے لیے وقف کرتے ہیں کیونکہ ان لوگوں کی اکثریت، جو فلسفیوں کی نقالی کرتے ہیں، سچ کو جھوٹ سے خلط ملط کر دیتی ہے۔ یہ لوگ محض دھوکہ دیتے ہیں اور علم جتاتے ہیں۔ وہ سائنس کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں، اسے استعمال نہیں کرتے سوائے ہیچ اور مادی اغراض کے لیے۔ اگر وہ کسی ایسے شخص کو دیکھتے ہیں جو سچ کا متلاشی ہے اور حقیقت کو ترجیح دیتا ہے اور فریب اور ریاکاری کو چھوڑ کر جھوٹ اور ناحق کو جھٹلانے کے لیے حتی المقدور کوشش کر رہا ہے، تو وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے چڑاتے ہیں۔''

یہ بات قابل داد ہے کہ خیام نے اپنی کسی مجبوری کو آڑے نہیں آنے دیا۔ اس نے نامساعد حالات کے باوجود اپنا کام جاری رکھا اور ''مشکلات الحساب'' جیسی اہم اور مفید کتاب قلمبند کی۔ خیام کی یہ ریاضیاتی تصنیف تاحال دریافت نہیں ہو سکی۔ اس دوران اس نے الجبرے پر بھی ایک تصنیف رقم کی۔ اس کے علاوہ اس نے موسیقی پر ایک رسالہ ''القول علی اجناس التی بالاربع'' بھی لکھا۔

۱۰۷۰ء کے لگ بھگ خیام سمرقند پہنچا، جہاں اس نے قاضی القضاۃ ابوطاہر کی مصاحبت اختیار کی اور اس کی سرپرستی میں مکعب مساواتوں کے متعلق الجبرے کی ایک عظیم تصنیف قلمبند کی۔ اس تصنیف کے متعلق اس کے ذہن میں غالباً پہلے سے اسکیم موجود تھی۔ خاقان بخارا شمس الملوک کے دربار میں یا پھر اصفہان میں قیام کے دوران میں خیام نے اس تصنیف میں مزید اضافہ کیا۔ اصفہان میں اسے سلجوقی سلطان جلال الدین ملک شاہ اور اس کے وزیر نظام الملک نے مدعو کیا تھا اور یہاں اسے فلکیاتی رصد گاہ کی نگرانی پر مامور کیا گیا۔

خیام نے اصفہان میں تقریباً اٹھارہ سال قیام کیا۔ یہ دور غالباً اس کی زندگی کا سب سے زیادہ پرسکون اور خوشگوار دور تھا۔ رصدگاہ میں خیام کو اس دور کے بہترین ماہرین فلکیات کا تعاون اور ساتھ حاصل تھا۔ خیام کی رہنمائی میں اس کے رفقائے کار نے فلکیاتی جداول مرتب کیں، جو ''زیج ملک شاہی'' کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ان میں سے بیشتر جداول ضائع ہو چکی ہیں۔ اب صرف کسوفی محددات (Ecliptic Coordinates) اور سو سے زیادہ چمکدار ساکن ستاروں کی جداول دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ ایران میں مروج شمسی کیلنڈر کی اصلاح کا اہم کام بھی اسی رصدگاہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

خیام نے کیلنڈر کی اصلاح کا منصوبہ ۱۰۷۹ء کے لگ بھگ پیش کیا۔ بعد میں اس نے ''نوروز نامہ'' کے عنوان سے گذشتہ اصلاحات کی ایک تاریخ مرتب کی۔ خیام کی تجویز کردہ اصلاحات کا علم صرف نصیر الدین طوسی اور الغ بیگ کی فلکیاتی جداول میں شامل مختصر بیانات سے ہوتا ہے۔ نئے کیلنڈر کے لیے تینتیس (۳۳) برس کے دور کو بنیاد بنایا گیا اور اسے سلطان جلال الدین ملک شاہ کی نسبت سے ''سن مالکی'' یا ''سن جلالی'' کا نام دیا گیا۔ ہر دور کے چوتھے، آٹھویں، بارہویں، سولہویں، بیسویں، چوبیسویں، اٹھائیسویں اور تینتیسویں سال کو تین سو چھیاسٹھ دنوں پر مشتمل لیپ (Leap) کا سال قرار دیا گیا، جبکہ سال کی اوسط لمبائی ۳۶۵.۲۴۲۴ دن قرار پائی۔ اس لحاظ سے یہ اصل شمسی کیلنڈر سے ۰.۰۰۰۲ دن کا انحراف کرتا ہے اور اس کیلنڈر میں پانچ ہزار سال بعد ایک دن کا فرق نکلتا ہے۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہیں ہوگا کہ آج کل مروج گریگورین کیلنڈر کے اوسط سال کی لمبائی ۳۶۵.۲۴۲۵ دن ہے اور اس میں ایک دن کا فرق ۳.۳۳۳ سالوں بعد پیدا ہوتا ہے۔

خیام درباری منجم کی حیثیت سے بھی کام کرتا رہا، لیکن جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے وہ عدالتی نجومیات پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا۔ سرکاری فرائض کے ساتھ ساتھ خیام نے اپنی نجی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں اور ۱۰۷۷ء میں اقلیدس کے متوازی خطوط اور نسبتوں کے نظریے پر تبصرے تحریر کیے۔ خیام کی یہ تصنیف اور متذکرہ رسالہ اس کی اہم ترین سائنسی تصانیف میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس دور میں اس نے فلسفے پر بھی کام کیا اور ۱۰۸۰ء میں ''رسالۃ الکون والتکلیف'' لکھا اور اس کے ساتھ ''الجواب عن ثلاث مسائل: ضرورت التضد فی العالم والجبر والبقا'' کے طور پر شامل کیا۔ غالباً اسی دوران میں اس نے ایک وزیر معید الملک (دور وزارت ۱۰۹۵ء-۱۱۱۸ء) کے بیٹے کے لیے ''رسالۃ فی الکلیت الوجود''

بھی لکھا۔ اس کے دوسرے دو فلسفیانہ رسالوں "رسالۃ الضیاء العقلی فی الموضوع العلم الکلی" اور "رسالۃ فی الوجود" کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کب تحریر کیے گئے۔

۱۰۹۲ء میں ملک شاہ کی وفات اور اس کے وزیر نظام الملک کے قتل کے بعد ملک شاہ کی دوسری بیوی ترکان خاتون تخت پر بیٹھی اور اس کے ساتھ ہی خیام کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ترکان خاتون کے نظام الملک کے ساتھ جانشینی کے مسئلے پر اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ چونکہ خیام کا سرپرست نظام الملک تھا، اس لیے وہ بھی نئی خاتون حکمران کے عتاب کا شکار ہوا۔ رصدگاہ کی مالی امداد بند کر دی گئی اور اس کی سرگرمیاں معطل ہو کر رہ گئیں۔ کیلنڈر کی اصلاح کا کام بھی مکمل نہ ہو سکا۔ تنگ نظر ملاؤں کو، جو خیام کی آزاد خیالی کی وجہ سے اس سے پہلے ہی برہم تھے، دربار میں رسوخ حاصل ہوا اور انھوں نے خیام کو ہر ممکن ایذا پہنچانے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں اس کی شراب و شباب کے مضامین سے آراستہ رباعیاں خاص طور پر ہدف تنقید بنیں۔

صورت حال کی خرابی کے باوجود خیام نے سلجوقی دربار سے اپنی وابستگی برقرار رکھی، لیکن اسے اپنی سائنسی تحقیقات رک جانے کا بہت دکھ تھا۔ اس نے ملک شاہ کے جانشینوں کو رصدگاہ کی امداد کی بحالی پر آمادہ کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک پروپیگنڈہ مہم بھی چلائی۔ اس پروپیگنڈہ میں "نوروز نامہ" نے بہت اہم کردار ادا کیا، جس کا موضوع تحریر ایران میں نئے شمسی سال کی خوشی میں منایا جانے والا جشن تھا۔ اس میں خیام نے شمسی کیلنڈر کی تاریخ بیان کی اور جشن نوروز سے متعلقہ تقریبات کا ذکر کیا۔ اس نے قدیم ایرانی حکمرانوں کا ذکر خصوصاً بڑی تکریم سے کیا، جو علوم و فنون کے رسیا، تعمیرات کے دلدادہ اور علماء کی بہت عزت کرتے تھے۔

خیام نے اصفہان کو اس وقت چھوڑا جب ملک شاہ کا تیسرا فرزند سنجر ۱۱۱۸ء میں تخت نشین ہوا۔ اصفہان کو خیر باد کہنے کے بعد اس نے کچھ عرصہ مرو میں گزارا۔ یہ شہر سلجوقیوں کا دارالخلافہ تھا۔ "میزان الحکم" اور "فی القسطاس المستقیم" غالباً اس نے اسی شہر میں تحریر کیں۔ یہ دونوں کتابیں خیام کے ایک شاگرد المظفر الاسفیرزی کی تصانیف کے ساتھ ایک مجموعے میں یکجا کی گئی ہیں۔ اس مجموعے کا نام بھی "میزان الحکم" ہے اور اسے خیام کے ایک دوسرے شاگرد الخازنی نے مرتب کیا ہے۔ "میزان الحکم" میں خیام نے دوسری چیزوں کے علاوہ کسی بھرت میں شامل مختلف دھاتوں کے اوزانِ مخصوص کے ابتدائی تعین کی مدد سے بھرت میں موجود سونے اور چاندی کی مقداروں کے تعین کے مسئلے کا خالص جبری حل بھی پیش کیا ہے۔ "فی القسطاس" میں حرکی وزن اور متغیر پیمانوں کے حامل ترازو پر بحث کی گئی ہے۔ (معروف مسلم سائنسدان: ص ۱۳۱ تا ۶)

ابو عبداللہ و ابو جعفر محمد بن موسیٰ الخوارزمی (۲۳۲ھ ـــــ ۸۴۶ـ۸۴۷ء)

تاریخ طبری میں الخوارزمی کو المجوسی (مجوسی کی اولاد) اور القطربلی دجلہ کے مغرب میں بغداد کے قریب

ضلع قطربل کا باشندہ یا متوطن بھی لکھا گیا ہے۔اس کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں اور جو معلوم ہیں وہ بھی معتبر نہیں کیونکہ اکثر صورتوں میں پتا نہیں چلتا کہ ان کا تعلق اس سے ہے یا محمد بن موسیٰ ابن شاکر سے۔

الخوارزمی کی تاریخ پیدائش بھی معلوم نہیں۔تاریخ وفات بھی غیر قطعی ہے۔سوتر کی رائے میں اس کا انتقال ۲۲۰ھ/ ۸۳۵ء اور ۲۳۰ھ/ ۸۴۴ء کے درمیان ہوا اور نالینو کے نزدیک ۲۳۲ھ/ ۸۴۶۔۸۴۷ء کے بعد۔ الخوارزمی نے مامون کے عہد میں فروغ پایا۔وہ اس کے ہیئت دانوں میں شامل تھا اور اس کے عہد خلافت میں جب زمین کے درجات کی پیمائش کی گئی تو اس میں شاید وہ بھی شریک تھا۔مطالعے کا بیشتر وقت مامون کے کتب خانے میں گزارتا تھا۔ مامون نے اسے یونانی کتابوں کے جمع کرنے اور ان کے تراجم کروانے کا کام سپرد کیا تھا۔الخوارزمی نے ریاضیات، جغرافیہ، ہیئت اور تاریخ میں خوب خوب محنت کی اور کتاب التاریخ کے نام سے ایک تصنیف مکمل کی، جس کا ذکر المسعودی نے بطور ماخذ کیا ہے اور جس سے غالباً صاحب تاریخ طبری نے عہد مامونی ۲۱۰ھ/ ۸۲۵۔۸۲۶ء کے ایک واقعے کے متعلق اقتباس بھی لیا ہے۔

(دیکھئے نالینو al-Khuwarizmi: C.A. Nallino وغیرہ، ص ۱۲)

الخوارزمی کی تصنیفات بڑی اہم اور خود اس کی ذاتی تحقیقات کا نتیجہ ہیں جو اس کی حکیمانہ طبیعت اور علم کا ثبوت ہیں۔

ان تصنیفات کا تعلق اس زمانے سے ہے جب ابھی یونانی علوم وفنون کے ترجموں کا دور دورہ شروع نہیں ہوا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ الخوارزمی کی زندگی کا کچھ حصہ الحجاج کی معاصرت میں گزرا۔یہی وجہ ہے کہ جبر و مقابلہ میں اس نے جو خدمات سرانجام دیں ان میں زیادہ تر ہندوؤں، ایرانیوں اور مدرسۂ جندی شاپور کی تصنیفات سے کام لیا گیا ہے۔یونانی مآخذ کی حیثیت اس کے لیے ثانوی تھی۔البتہ ہیئت اور جغرافیے میں شاید صورت حالات قدرے مختلف ہے۔الخوارزمی کی تصنیفات کا ذکر الندیم کی الفہرست (ص ۲۷۵) اور ابن القفطی (ص ۲۸۶) میں موجود ہے۔ الفہرست میں الخوارزمی کے فوراً بعد سند بن علی کا ذکر آتا ہے۔لہٰذا کارپنسکی (Karpuniski) کو یقین تھا کہ الحساب الھندی، الجمع والتفریق اور الجبر والمقابلہ جنھیں سند سے منسوب کیا گیا، دراصل خوارزمی ہی کی تصانیف ہیں۔

ریاضیات میں اس کی اہم ترین تصنیف حساب الجبر والمقابلۃ (J.Ruska کی رو سے antegration and Equation for Processes of Calculation) ہے لیکن ان معنوں میں نہیں جو ہمارے نزدیک جبر و مقابلہ کے ہیں بلکہ اطلاقی (applied) حساب کا ایک مقدمہ، جس کی بنا متعدد حل شدہ مثالوں پر رکھی گئی۔علاوہ ازیں اس تصنیف میں طرح طرح کی معلومات شامل ہیں مثلاً:

① تکمیل (Integration) اور مساوات کا عمل، مساوات کی سادہ ترین شکلیں۔

② پیمائش اور مساحت۔

(۳) وارثوں کی از روئے وصیت تقسیم کے قواعد۔ لاطینی میں اس کتاب کا ترجمہ G.of Cremma اور R. of Chester وغیرہ نے کیا۔

لیکن غلط فہمیوں کی وجہ سے اور الخوارزمی کے تلفظ کے بگڑنے کے سبب طرح طرح کے الفاظ وضع ہونے لگے جن کی انتہا بالآخر الگورزم "algorism" پر ہوئی یعنی حساب لگانے کا کوئی متوالی طریقہ جو رفتہ رفتہ قاعدے کی صورت اختیار کر لے۔

جہاں تک شرحوں کا تعلق ہے سنان بن فتح، عبداللہ بن السید نانی، ابوالوفاء کے حوالے دیے جاتے ہیں۔ روزن (Rosen) نے ان کے علاوہ کسی المـــزیھفـی کا حوالہ بھی دیا ہے۔ الخوارزمی کی تصنیف سے نہایت گہرے اثرات مرتب ہوئے اور آگے چل کر ابو کامل شجاع بن اسلم نے صاف صاف لفظوں میں اس سے استفادہ کیا۔ $لا^۲ + ۱۰لا = ۳۹$ اور اس قسم کی مثالیں بار بار دہرائی جاتی ہیں مثلاً ابو کامل الکرخی، عمر الخیام اور عیسائی مصنفین لیونارڈ متوطن پیسا (Leonsrdo of Pisa) کی تصنیفات میں جو ظاہر ہے الخوارزمی سے متاثر ہوئے۔

حساب میں الخوارزمی کی ایک اور تصنیف ابھی تک محفوظ ہے مگر لاطینی ترجمے میں رسکہ (J. Ruska) کے نزدیک یہ کتاب الجمع والتفریق کے بالکل مطابق ہے۔

محمد بن ابراہیم الفزاری نے سدھانتا کا ترجمہ عربی میں کیا تھا اور وہ ''سند ہند عظیم'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ الخوارزمی نے سند ہند کے دو نسخے تیار کیے بلکہ اس سے پہلے شاید اس کا ملخص بھی۔ فلکی جدولوں کی جو کتاب اس طرح مرتب ہوئی، اس کا نام، جیسا کہ ابن یونس کا قول ہے، الخوارزمی نے فی زیج رکھا۔ زیجی تصنیفات کی طرح اس میں صرف جدولیں ہی موجود نہیں بلکہ فلکیات سے بھی بحث کی گئی ہے۔

ابن ابی اُصَیْبِعــہ کا بیان ہے کہ جداول میں الخوارزمی کی اس زبردست تصنیف کو مسلـــمــہ المجریطی نے از سر نو ترتیب دے کر پھر سے شائع کیا اور شاید یہی متن تھا جس کی اساس پر لاطینی میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اس تصنیف میں مثلثی جدولیں بھی موجود ہیں، جن میں لفظ جیب ہمیشہ gaib "djaib" کے لیے استعمال ہوا۔ حالانکہ ثابت بن قرہ کے یہاں اس کا حوالہ کبھی کبھی ہی ملتا ہے۔

لہٰذا بہت ممکن ہے الخوارزمی میں اس لفظ کا استعمال مسلمہ ہی نے کیا ہو۔ الخوارزمی نے اپنی کسی دوسری تصنیف میں شاید رؤیت ہلال سے بھی بحث کی ہے۔ یاقوت نے جسامت زمین کے متعلق ایک بیان کے سلسلے میں محمد بن موسیٰ الخوارزمی کو صاحب الزیج (کتاب الجداول کا مصنف) کہا ہے لیکن زیـــج میں ایسا کوئی بیان نہیں ملتا۔

الخوارزمی نے دو کتابیں اصطرلاب کے بارے میں بھی مدون کیں۔ کتاب العمل بالاصطرلاب (اصطرلاب کا طریقۂ استعمال) اور کتـاب عـمـل الاصطرلاب (اصطرلاب سازی کا فن) مگر ان میں

سے کوئی بھی محفوظ نہیں نہ عربی میں اور نہ لاطینی میں۔ الفرغانی کی کتاب فی صنعت الاصطرلاب بالهندسة (اصطرلاب سازی ہندسہ کی مدد سے) نسخۂ برلن، فہرست شمارہ ۵۷۹۰ میں کئی فلکی مسائل اصطرلاب کی مدد سے حل کیے گئے ہیں اور اس کا یہ حصہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے ''محمد بن موسیٰ الخوارزمی کہتا ہے.........''

دھوپ گھڑیوں کے متعلق الخوارزمی کی کتاب الرخامۃ کے متعلق ہمیں اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں کہ اس نے اس قسم کی ایک کتاب تصنیف کی۔

الخوارزمی نے نجوم کے بعض مسائل پر عملی پہلوؤں سے قلم اٹھایا، مثلاً ابو معشر کے بیان کردہ ایک قصے کے ماتحت اس نے اس امر کی تحقیق کی کہ محمد حضرت ﷺ کی ولادت مبارک کے وقت کواکب کے قرانات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آئندہ نبوت کے متعلق کہاں تک پتا چل سکتا تھا۔

المامون کے ایما پر الخوارزمی نے، شاید بعض دوسرے علما سے مل کر، افلاک اور کرۂ ارض کے نقشوں کی ایک اٹلس بھی تیار کی تھی۔ کتاب صورۃ الارض، جس کا نسخہ سٹراس برگ (Strassburg) میں محفوظ ہے یا جیسا کہ ابوالفداء اسے کتاب رسم الربع المعمور (کرۂ ارض کے آباد حصص کے نقشوں کی کتاب) کہتا ہے، اسی سے تعلق رکھتی ہے اور نالینو یہ ثابت کر چکا ہے کہ یہی وہ متن ہے جو نقشوں کے ساتھ ملحق تھا۔ نقشوں (دونوں نسخوں) کی تیاری میں اگرچہ بطلیموس کی Geography پیش نظر تھی مگر اس کی ترتیب اس نے اپنے انداز میں کی اور اس میں نئے اور مستقل اضافے بھی کیے۔

کتاب مذکور کا ایک نسخہ نالینو نے اطالوی زبان میں مرتب کیا اور اس کے جغرافیائی مواد کے متعلق، بالخصوص اسی مواد کے حوالے سے جو بطلیموس میں ملتا ہے، بڑی تحقیق و تفتیش سے کام لیا ہے۔ H.von Mzik نے بھی اس کتاب پر مکمل بحث کی ہے اور افریقہ سے متعلق حصے ترتیب دے کر اس کے ترجمے کے ساتھ تشریحات کا اضافہ بھی کر دیا ہے۔ (اردو دائرہ معارف الاسلامیہ: ۳۵/۹، ۳۶)

جعفر بن محمد ابو معشر البلخی (۷۸۷ء ___ ۸۸۶ء)

جعفر بن محمد ابو معشر البلخی کو انگریزی میں Albumasar کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ ۱۰/ اگست ۷۸۷ء کو بلخ میں یا اس کے نواح میں پیدا ہوا اور خاصی طویل عمر گزار کر عراق کے ایک شہر الواسط میں ۹/ مارچ ۸۸۶ء کو انتقال کر گیا۔ اس کی شہرت ایک ماہر نجوم کی حیثیت سے ہے۔ ابو معشر البلخی کی جائے ولادت یعنی بلخ ایک قدیم شہر تھا اور یہ وسط ایشیا کا ایسا شہر تھا جہاں یونانی تمدن کے آثار پائے جاتے تھے۔ ساسانیوں کے دور میں اسی جگہ اہل ایران کے ہندوستانیوں، چینیوں، تورانیوں اور شامیوں سے سماجی تعلقات استوار ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت (۶۴۴ء-۶۵۶ء) میں حضرت احنف بن قیس رضی اللہ عنہ نے اس شہر کو فتح کیا۔ اس وقت یہاں کی آبادی

میں زردشتیوں کے علاوہ ہندو، یہودی، بدھ، نسطوری، عیسائی اور مانوی مذاہب کے پیروکار شامل تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں سلطنت عباسیہ کے بہت سے فوجی افسر اور دانشور اس علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ ارباب علم و دانش سیاسی طور پر ایرانیت اور مذہبی لحاظ سے شیعیت سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، لیکن ان مذہبی رجحانات کے باوجود عباسیوں نے بغداد میں کتاب خانوں اور دارالتراجم کے قیام میں ان کے علم و دانش سے بھرپور استفادہ کیا اور انھیں یہ موقع فراہم کیا کہ وہ اپنے علوم کو عربی میں منتقل کر سکیں۔ یوں وہ اپنی علمی وراثت کو مسلمانوں کی روایت کا حصہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

ابومعشر بھی اہل خراسان کے ان دانشوروں میں سے تھا۔ وہ اپنے ہاں کی عقل و دانش کی برتری کا قائل تھا اور اس کا اظہار اس نے اپنی کتابوں ''کتاب اختلاف الزیجات'' اور ''کتاب الالوف'' میں بڑے پُر زور انداز میں کیا ہے۔ ساسانیوں کی سائنسی تحقیقات کا اسے براہ راست علم نہیں تھا، بلکہ اس سلسلے میں اس کی معلومات کا انحصار صرف تراجم پر تھا۔ اس نے اپنی علمی اور تہذیبی روایات سے جو کچھ حاصل کیا وہ واضح نہیں ہے۔ اس نے بڑی مہارت اور چابکدستی سے اپنے موروثی علم میں ان فکری رجحانات کی آمیزش کی جو ان دنوں بغداد کے علمی حلقوں میں رائج تھے۔ یوں وہ اس نظریے کا داعی بن گیا کہ تمام مختلف قوی نظامہائے فکر کی اصل ایک ہی ہے۔ یہ نظریہ ایک طرح فکری تاریخ میں نو افلاطونی نظریہ تجلّی (Emanation) کے مشابہ ہے، جس کو اس نے فلسفے کی رو سے حرانی لبادے میں قبول کر لیا۔ ابومعشر کا یہ نظریہ ایک اور بڑے ہی عجیب اور متناقض نظریہ اصطفائیت (Eclecticism) کو بھی جواز فراہم کرتا تھا۔ ابومعشر ایک ماہر نجوم تھا اور یہی وجہ ہے کہ اپنے نظریات کی وجہ سے کسی باز پرس یا گرفت سے محفوظ رہا۔ البتہ ایک بار اسے خلیفہ المستعین کے دور خلافت (۸۶۲ء-۸۶۶ء) میں کوڑے لگائے گئے لیکن اس کی وجہ اس کے مخصوص افکار نہیں تھے بلکہ علم نجوم میں اس کی گہری وابستگی تھی۔

ابومعشر نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بغداد میں خلیفہ المامون کے دور خلافت (۸۱۳ء-۸۳۳ء) کے شروع میں بطور محدث کیا۔ احادیث کے مطالعہ ہی کے ضمن میں اس نے قبل از اسلام عربی تقویم اور خلفائے راشدین کا بغور مطالعہ کیا۔ تقریباً ۸۲۵ء میں ابومعشر کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے اس کی علمی سرگرمیوں کا رخ تبدیل کر دیا۔ یہ واقعہ وہ تنازعہ تھا جو اس کے اور مشہور فلسفی ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی (۷۹۶ء-۸۷۳ء) کے مابین شروع ہوا اور اس نے بعد میں خاصی تلخی اختیار کر لی۔ الکندی بیک وقت افلاطون، ارسطو، شارحین ارسطو، نو افلاطونیوں، حران کے صابیوں کی ہرمیس (Hermes) اور اگاتھوڈیمن (Agathodemon) سے منسوب کتابوں اور بالعموم ریاضی کے علوم مثلاً حساب، جیومیٹری، موسیقی، ہیئت اور نجوم میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اس سے متاثر ہو کر ابومعشر کو فلسفیانہ استدلال کی تفہیم کے لیے علم ریاضی پڑھنے کا احساس ہوا۔ چنانچہ اس نے اپنی تمام تر صلاحیت نجوم کی فلسفیانہ اور تاریخی توجیہات بیان کرنے اور اس علم کی عملی افادیت کو واضح کرنے میں صرف کر

دی۔ اس کوشش میں اس نے ان تمام عقلی روایات سے استفادہ کیا جن کا وہ ذاتی طور پر وارث تھا۔ یہ روایات حسب ذیل ہیں:

① پہلوی، یونانی، ہندی، ایرانی روایت متعلقہ نجوم، ہیئت اور سحر جس کو بزرجمہر، اندرزگار، زردشت، ''زیج الشاہ'' ڈوروتھئیس (Dorotheus) اور ویلنس (Valens) نے محفوظ کیا تھا۔

② سنسکرت کی یونانی، ہندی روایات متعلقہ نجوم اور ہیئت جس کو اس نے وراہمی ہیرا (Varahamihira)، کنا کا (Kanaka)، ''سند ہند''، ''زیج الارکند'' اور آریا بھاٹا سے حاصل کیا۔

③ فلسفہ، نجوم اور ہیئت میں یونانی روایت جو ارسطو، بطلیموس اور تھیون (Theon) کے حوالے سے اس تک پہنچی۔

④ سریانی نوافلاطونی فلسفہ کواکب وسحر جو ابومعشر نے الکندی اور حرانیوں کی کتابوں سے حاصل کیا۔

⑤ ایرانی علماء کی ابتدائی ناتمام کوششیں جو انھوں نے علوم کی ترکیب میں کیں۔ ان علماء کے نمائندہ ماشاءاللہ، ابوسہل الفضل بن نوبخت، عمر بن فرخان الطبری اور ابو یوسف یعقوب القصرانی ہیں۔

ابومعشر کی شہرت بطور ماہر نجوم اپنے معاصرین میں اور بعد کے دور میں بھی بے حد زیادہ تھی۔ اس نے ایک ہندوستانی شاہزادے (شاید راشٹر کوٹا) کا زائچہ بنایا جو ۱۱؍جنوری ۸۲۶ء کو پیدا ہوا تھا۔ اس نے خلیفہ کے اقتدار کے خلاف بعض باغیوں کو مشورے دیے اور ۸۸۰ء۔ ۸۸۳ء میں بصرہ میں زنجیوں کے خلاف محاذ آرائی میں وہ خلیفہ الموفق کے ہمراہ رہا۔ دوسرے ابن القفطی کے مطابق اسلامی دنیا کے ماہرین نجوم کی طرح ''اثرات کواکب کے ضمن میں وہ مسلمانوں کا استاد تھا۔ (معروف مسلم سائنسدان: ص ۱۳۳)

البیرونی ابوالریحان محمد بن احمد (۹۷۳ء ___ بعد از ۱۰۵۰ء)

البیرونی کا نام ابوالریحان محمد بن احمد ہے۔ وہ ۶؍ستمبر ۹۷۳ء کو خوارزم میں پیدا ہوا۔ یہ شہر اب روس میں ہے۔ اس کا انتقال کب اور کہاں ہوا، اس کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن عام طور پر یہی لکھا جاتا ہے کہ وہ غزنی میں ۱۰۵۰ء کے بعد فوت ہو گیا۔ البیرونی کی شہرت کئی حوالوں سے ہے، لیکن اسے ہیئت، ریاضیات، جغرافیہ اور تاریخ کے موضوعات میں مستند عالم کی حیثیت حاصل ہے۔ صدیاں گزر گئیں، لیکن اب بھی البیرونی کی تحقیقات اور مطالعات میں تازگی پائی جاتی ہے اور دور حاضر کے ارباب تحقیق اور سائنس دان ان سے راہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔

البیرونی کی پیدائش اور ابتدائی نشوونما بحیرہ ارال (Aral) کے اس جنوبی علاقے میں ہوئی جو ازمنۂ قدیم اور قرون وسطیٰ میں خوارزم کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی جائے پیدائش کا نام خود اس کے نام کا حصہ ہے۔ اس علاقے کے دو مشہور شہروں میں سے ایک کا نام کاث (Kath) تھا اور البیرونی کی جہاں ولادت ہوئی، وہ

جگہ اس شہر کے ذرا باہر تھی اور اسی وجہ سے اسے البیرونی کہا جانے لگا۔

کاث کا محل وقوع خیوا کے شمال مشرق میں آمو دریا کے دائیں کنارے پر تھا۔ خوارزم کا دوسرا بڑا شہر خیوا کے شمال مغرب میں دریا کے مخالف کنارے پر جرجانیہ تھا جسے آج کل کونیہ ارگنج (Kunya-Urgench) کہا جاتا ہے اور یہ شہراب اس کے صوبہ ترکمانستان میں ہے۔ اس شہر میں بھی البیرونی نے اپنی ابتدائی زندگی کے کئی سال گزارے۔

البیرونی کے آباؤ اجداد اور بچپن کے حالات معلوم نہیں۔ کسی شاعر کی ہجو کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اسے (یعنی البیرونی کو) اپنے والد کی شخصیت کا بھی علم نہیں ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے، اس نے یہ کسی شعری ضرورت کے تحت کہا ہو۔ البیرونی نے بچپن ہی سے مختلف سائنسی علوم سیکھنا شروع کر دیے تھے۔ ان دنوں وہ خوارزم کے معروف ہیئت دان اور ریاضی دان ابونصر منصور کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھا۔ یہ اسی استاد کی تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ ابھی اس کی عمر سترہ برس تھی کہ اس نے ایک ایسا حلقہ ایجاد کر لیا جس پر نصف درجے تک کے نشانات لگے ہوئے تھے اور یہ نصف النہار کے وقت کاث میں ارتفاع شمس کے مشاہدہ کے لیے استعمال کیا گیا اور اس کی مدد سے اس نے زمینی عرض بلد نکالا۔ اپنے استاد کی نگرانی میں البیرونی نے تحقیق و مطالعہ کا کام جاری رکھا اور چار سال بعد اس نے ۱۵ ذراع (Cubic) قطر کا ایک حلقہ اور دیگر سامان پیمائش تیار کر لیا۔ یہ وہ وقت تھا جب صرف ۹۹۵ء کے راس السرطان (Summer Solstice) کا مشاہدہ ممکن تھا۔ البیرونی نے اس کی پیمائش آمو دریا کے پار کاث سے جنوب میں واقع ایک گاؤں میں کی۔ ابھی اس کی تحقیقات جاری تھیں کہ ملک میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ کسی کی جان و آبرو محفوظ نہ رہی۔ چنانچہ البیرونی اس بدامنی کی وجہ سے روپوش ہوگیا اور اپنے آبائی وطن سے ہجرت کر گیا۔

البیرونی نے اپنی کتاب ''تحریر الاماکن'' میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اسے بعض دنیاوی امور میں بہ امر مجبوری حصہ لینا پڑا۔ ان دنیاوی مصروفیات نے اس کے علمی اور سائنسی کام کو بہت متاثر کیا اور وہ دلجمعی اور انہماک سے اسے جاری نہ رکھ سکا۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیاوی مرتبے نے اس کے کئی حاسد بھی پیدا کر دیئے۔ ذیل میں چھ ایسے خانوادوں کا ذکر کیا گیا ہے، جن سے البیرونی کی چپقلش چلتی رہی:

① کاث کا سردار بنو عراق سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کو خوارزم شاہ کا قدیم لقب حاصل تھا۔ ابونصر اسی خاندان کا ایک شاہزادہ تھا۔ ۹۹۵ء میں جرجانیہ کے امیر نے اپنے اس سردار پر حملہ کر دیا۔ اس کو گرفتار کر کے قتل کر دیا اور خوارزم شاہ کا لقب اختیار کر کے تخت پر جا بیٹھا۔ حالات کی اس سنگینی نے البیرونی کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔

② ایک صدی سے زاید عرصے تک خوارزم شاہی خاندان سامانیوں کے زیر اثر رہا۔ سامانی خاندان زرتشت کا پیروکار تھا۔ بعد میں یہ خاندان مشرف بہ اسلام ہوگیا۔ یہ سامانیوں کا دارالحکومت تھا، جو خیوا

کے جنوب مشرق میں دو سو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اپنے زمانۂ عروج میں سامانی اس شہر سے ایک وسیع علاقے پر حکومت کرتے رہے جس میں موجودہ افغانستان، ماوراء النہر اور ایران شامل تھے۔ البیرونی کی جوانی کے زمانے میں یہ حکومت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنی ایک نظم میں سامانی سلسلے کے تقریباً آخری حکمران منصور ثانی (۹۹۷ء تا ۹۹۹ء) کا ذکر بطور اپنے سرپرست اول کے کرتا ہے۔

③ اُن دنوں مغرب میں آل بویہ کی حکومت عروج پر تھی۔ شروع میں اس سلطنت کا حدود اربعہ جھیل کیسپین کے جنوب کے مرتفع علاقے تک تھا۔ بعد میں مفتوحہ علاقوں کی شمولیت سے اس کی سرحدیں جنوب میں خلیج فارس تک پھیل گئیں حتیٰ کہ ۹۴۵ء تک عراق بھی اس سلطنت کے زیر نگیں آ گیا۔

④ سامانیوں اور بویوں کے علاقوں کے درمیان نہایت پرخطر محل وقوع رکھنے والی ریاست زیاریوں کی تھی، جس کا دارالحکومت جرجان تھا۔ یہ شہر جھیل کیسپین کے جنوب مشرقی کونے کے ذرا پیچھے واقع تھا۔

⑤ یہ متحارب حکمران خاندان جس خطرے سے دوچار تھے اور جس نے بالآخر ان سب کو ہڑپ کر لیا، وہ تیزی سے پھیلتی ہوئی غزنوی سلطنت تھی۔ غزنویوں کا مرکز وسطی افغانستان کے مشرقی حصے میں واقع شہر غزنہ تھا۔ سلطان محمود غزنوی کی عمر البیرونی سے دو سال زیادہ تھی۔ سلطان محمود غزنوی ایک ترک غلام زادہ اور اپنے خاندان کا دوسرا سب سے عظیم سلطان تھا جس نے ۱۰۲۰ء تک ایک ایسی ریاست قائم کر لی جس کا عرض شمالاً جنوباً ایک ہزار میل اور طول شرقاً غرباً دو ہزار میل تھا۔

⑥ تیزی سے رونما ہونے والی ان تبدیلیوں کا محور و مرکز بغداد کا عباسی خلیفہ تھا۔ اس کا کام تقریباً وہی تھا جو قرون وسطیٰ کے پاپائے اعظم کا ہوا کرتا تھا۔ اسلامی ممالک کے سلاطین خلیفہ سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ ان سلاطین کو تعظیمی القاب اور خلعت فاخرہ عطا کر کے ان کے شکوہ میں اضافہ کا باعث بنتے۔

یہ بات یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ ۹۹۵ء میں البیرونی نے ان میں سے کس ریاست کو خیرباد کہا اور کس ریاست کا رخ کیا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس وقت موجودہ تہران کے نزدیک شہر رے میں چلا گیا ہو۔ ''الآثار الباقیہ'' میں البیرونی نے مفلسی کی مصیبتوں کو ایک طنزیہ نظم میں بیان کیا ہے۔ اس میں وہ ذکر کرتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ رے میں رہ رہا تھا، جہاں اس کا کوئی شاہی سرپرست نہ تھا اور حالات نہایت تکلیف دہ تھے۔ ایک مقامی منجم نے اس کی غربت کی وجہ سے اس کے نظریات کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ بعد میں جب اس کے حالات، روبہ اصلاح ہوئے تو وہی منجم اس کی دوستی کا دم بھرنے لگا۔

بویہ شاہزادہ فخر الدولہ کے حکم پر ہیئت دان الخوجندی نے رے کے قریب پہاڑ پر ایک بڑا دیوار نما آلۂ سدس (Sixtant) تعمیر کیا۔ فخر الدولہ کے نام پر اس کو فخری آلۂ سدس کہتے تھے۔ اس کی مدد سے البیرونی نے

994ء میں انقلاب شمسی کا مطالعہ کیا اور ایک رسالہ لکھا جس میں اس آلے کی ساخت اور اپنے مشاہدات کی تفصیل لکھی۔ یہ معلومات شخصی طور پر الخوجندی سے حاصل کی گئیں۔ الخوجندی کا انتقال ۱۰۰۰ء میں ہوا، اس لیے یہ ثابت ہوتا ہے کہ البیرونی نے ۱۰۰۰ء سے قبل ہی اس سے استفادہ کیا ہوگا۔ یہ امر بھی قرین قیاس ہے کہ اس زمانے میں البیرونی گیلان کے صوبہ خزر میں موجود ہو۔ اس نے اپنی ایک کتاب زیاریوں سے وابستہ گیلان کے کمانڈر مرزبان بن رستم کے نام معنون کی ہے۔ وہ اپنی کتاب ''الآثار الباقیہ'' (سنہ تکمیل ۱۰۰۰ء) میں رقمطراز ہے کہ وہ اس سپہ سالار کے دربار میں رہا۔

البیرونی ۹۹۷ء میں واپس کاث پہنچا اور اسی سال 24 مئی کو اس نے وہاں چاند گرہن کا مشاہدہ کیا۔ اس نے ابوالوفا سے یہ طے کر رکھا تھا کہ بیک وقت وہ بغداد سے گرہن کا مشاہدہ کرے۔ ''تحدید الاماکن'' میں اس واقعہ کا صرف سن دیا ہوا ہے لیکن یہی تاریخ درست ہے کیونکہ اگلا گرہن کاث اور بغداد دونوں شہروں سے نظر نہیں آ سکتا تھا۔ یہ چاند گرہن ۱۷ نومبر ۹۹۷ء کو لگا۔ پیمائش کے دوران وقت کا جو تفاوت نظر آیا، اس کی مدد سے البیرونی اور ابوالوفا نے دونوں شہروں کے طول بلد کا فرق دریافت کیا۔

اسی سال سامانی حکمران منصور ثانی مسند نشین ہوا۔ البیرونی انھی دنوں اس حکمران کے دربار سے وابستہ ہوا تھا۔ اسی دوران میں جرجان کے زیاری حکمران قابوس کو اس کے ملک سے نکال دیا گیا۔ وہ فرار ہو کر بخارا پہنچا اور وہاں اپنا اقتدار واپس لینے کے لیے مدد چاہی۔ یہ مدد اسے حاصل ہوگئی۔ البیرونی یا تو اس کے ہمراہ واپس جرجان آیا یا اس کی آمد کے فوراً بعد پہنچا، کیونکہ ۱۰۰۰ء میں اس نے اپنی تصنیف ''الآثار الباقیہ'' کو قابوس کے نام سے معنون کیا۔

''الآثار الباقیہ'' البیرونی کی پہلی تصنیف نہ تھی کیونکہ اس میں وہ اپنی سات کتابوں کا ذکر کرتا ہے۔ یہ تمام کتابیں اس وقت نایاب ہو چکی ہیں۔ ان کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے کئی ایسے علوم کے لیے زمین ہموار کر لی تھی جن کی بعد میں اس نے آبیاری کی۔ ان سات کتابوں میں ایک اعشاری حساب دوسری اصطرلاب، تیسری فلکیاتی مشاہدات، تین کتابیں نجوم اور دو کتابیں تاریخ کے موضوع پر ہیں۔ اس زمانے میں مشہور فلسفی اور طبیب ابن سینا کے ساتھ حرارت اور نور کی ماہیت اور منتقلی کے موضوع پر خط و کتابت میں الجھ گیا۔ ''الآثار الباقیہ'' میں وہ ابن سینا کو ایک ''چھوکرا'' لکھتا ہے۔ اس مخاصمانہ مراسلت کے وقت البیرونی کی عمر بیس برس تھی، جبکہ ابن سینا کی عمر بیس برس سے بھی کم تھی۔

''تحدید الاماکن'' میں البیرونی نے لکھا ہے کہ اس نے خلیفہ مامون کی ہدایت پر زمینی خط نصف النہار (Meridian) کے ساتھ درجے کی پیمائش کی اور اس کے بعد اس عمل کو دہرانے کی خود ناتمام کوشش کی۔ اس کے لیے اس نے جرجان اور اغوز ترکوں کے علاقے (شاید بحر خزر کے مشرق میں صحرائی علاقہ) کے مابین ایک موزوں قطعۂ زمین کا انتخاب کیا، لیکن اس کے سرپرست (غالباً سلطان قابوس) کو اس تجربے میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔

زیاری دربار سے البیرونی کے تعلق کو یوں ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اس نے جرجان سے دو چاند گرہنوں کا مطالعہ کیا۔ ان میں سے پہلا چاند گرہن ۱۹ر فروری ۱۰۰۳ء اور دوسرا اسی سال ۱۴ر اگست کو لگا۔ آئندہ سال کے چاند گرہن کا مشاہدہ اس نے جرجانیہ سے کیا۔ یہ ۴ر جون ۱۰۰۴ء کو لگا تھا۔ ان تاریخوں کی درمیانی مدت میں وہ کسی وقت اپنے وطن واپس لوٹا اور خوارزم شاہ نے اس کی بڑی عزت و تکریم کی۔ اس کے مربی کا نام ابوالعباس مامون تھا۔ مامون اور اس کے ایک بھائی کی سلطان محمود غزنوی کی بہنوں سے شادی ہوئی تھی۔

بادشاہ کی داد و دہش سے البیرونی نے جرجانیہ میں ایک آلہ نصب کیا، جو خط نصف النہار کے مستوی میں لگایا گیا۔ یہ ایک بڑا سا حلقہ تھا جس کا نام البیرونی نے حلقہ شاہیہ رکھ دیا تھا۔ ''تحدید الاماکن'' اور ''القانون المسعودی'' میں مختلف جگہوں پر اس نے جرجانیہ میں کیے گئے پندرہ شمسی نصف النہار کے مشاہدات بیان کیے ہیں۔ ان میں پہلا ۷ر جون ۱۰۱٦ء کا راس السرطان اور دوسرا ۷ر دسمبر ۱۰۱٦ء کا راس الجدی کا مشاہدہ ہے۔ فارغ البالی کے اسی دور میں اس نے ارض پیمائی کے مسائل کے ترسیمی حل کے لیے ایک آلہ بھی بنایا، جو دس ذراع قطر کا ایک نصف کرہ تھا۔

اس دوران میں خوارزم کے سیاسی حالات مزید دگرگوں ہو گئے اور ان کی خرابی کا اثر البیرونی پر بھی ہوا۔ خلیفہ قادر باللہ نے مامون کو خاص لقب عطا کیا اور اپنے سفیر کو بھی اس کے پاس بھیجا۔ شاہ خوفزدہ ہو گیا کہ کہیں سلطان محمود اس بات سے ناراض نہ ہو جائے کہ اس نے خلیفہ کے لقب کو براہِ راست کیوں قبول کر لیا۔ چنانچہ اس نے البیرونی کو بھیجا کہ وہ سفارت کو راستے میں روک دے، جو کچھ وہ لا رہے ہیں ان سے وصول کر لے اور انھیں واپس بھیج دے۔

۱۰۱۴ء میں سلطان محمود غزنوی نے مامون کو حکم دیا کہ خطبۂ جمعہ میں اس کے نام کو بھی شامل کیا جائے۔ مامون نے اپنے وزراء اور امراء سے اس بارے میں رائے طلب کی، لیکن انھوں نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا، کیونکہ یوں خطبۂ جمعہ میں کسی کے نام کی شمولیت علاقائی خود مختاری کو ختم کرنے کے مترادف تھی۔ مامون خود محمود غزنوی کی حکم عدولی نہیں کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے اپنے امراء وغیرہ کو قائل کرنے کے لیے البیرونی کو ان کے پاس بھیجا۔ اس نے انھیں یہ یقین دہانی کرائی کہ شاہی تجویز محض ان کی وفاداری کو پرکھنے کے لیے پیش کی گئی تھی، ورنہ خطبے میں وہ کسی طرح کی تبدیلی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ان مذاکرات کی خبر جب محمود غزنوی کو پہنچی تو اس نے مامون کو سخت ڈانٹ پلائی اور اسے متنبہ کیا کہ وہ اپنے سرداروں کو قابو میں رکھے، ورنہ اسے یہ کام خود ہی کرنا پڑے گا۔ مامون نے محمود غزنوی اور اپنے امراء دونوں کو خوش کرنے کی یہ راہ نکالی کہ جرجانیہ اور کاث کی مساجد میں خطبۂ جمعہ میں سلطان کا نام شامل نہ کیا اور دوسرے شہروں کی مساجد میں اس نام کو شامل کر دیا۔ لوگوں نے مامون کے اس اقدام کو پسند نہ کیا۔ خوارزم کی قوم نے علم بغاوت بلند کر دیا اور مامون کو قتل کر دیا۔ حالات کو یوں بگڑتے ہوئے دیکھ کر محمود غزنوی نے اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ خوارزم پر حملہ کر دیا۔ اس

نے ،خوارزم شاہ کی بیوہ، جو اس کی اپنی بہن بھی تھی، کو ساتھ لیا، ۳ر جولائی ۱۰۱۷ء کو کاٹ کو فتح کیا، باغی سرداروں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد اپنے ایک افسر کو تخت پر بٹھا دیا اور حکمران خاندان کے زندہ افراد کو مختلف جیلوں میں بند کر دیا۔(معروف مسلم سائنسدان:ص ۵۶۷)

الکندی (۸۰۱ء___۸۶۶ء)

ابو یوسف یعقوب ابن اسحاق الصباح کی ولادت ۸۰۱ء کے لگ بھگ ہوئی اور اس نے ۸۶۶ء میں بغداد میں وفات پائی۔ اس کی وجۂ شہرت فلسفہ اور سائنس ہے۔

قدیم ماہرین کتابیات اور الجاحظ جیسے مصنفین نے الکندی کی زندگی کے بارے میں بہت سے قصے اور کہانیاں بیان کی ہیں، لیکن مستند اور معتبر روایات بہت کم ملتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی ولادت اور وفات کے سنین بھی حتمی طور پر معلوم نہیں۔ مختلف شواہد کو یکجا کرنے کے بعد مصطفےٰ عبدالرزاق متذکرہ بالا سنین ولادت و وفات کا تعین کرنے میں کامیاب ہو سکا۔

الکندی کا تعلق یمن کے ایک معزز اور محترم قبیلے کندہ سے تھا۔ اس نے حصول علم کا آغاز عراق کے شہر کوفہ سے کیا اور تکمیل بغداد میں ہوئی۔ یہ دونوں شہر اس عہد میں ثقافتی مراکز کا درجہ رکھتے تھے۔ بغداد ہی میں الکندی پر خلیفہ المامون کی نگاہ التفات پڑی۔ خلیفہ نے اسے اپنے دربار میں طلب کیا اور بغداد کے ''دارالحکمۃ'' میں اسے تعینات کر دیا۔ اسے یونانی کتب کے تراجم کی اصلاح کا فریضہ سونپا گیا جو بالعموم غلطیوں سے پر ہوتے تھے۔ المامون کے جانشین المعتصم نے الکندی کو اپنے بیٹے احمد کا اتالیق مقرر کیا جس کے نام سے الکندی نے کئی فلسفیانہ مضامین تحریر کیے۔

المعتصم کی وفات کے بعد دربار کے ساتھ الکندی کے تعلقات میں سرد مہری آ گئی اور الواثق کے عہد خلافت کے پورے عرصے میں یہ سرد مہری برقرار رہی۔ بہتری کی صورت اس وقت پیدا ہوئی جب الواثق کے بعد المتوکل نے کاروبار سلطنت سنبھالا۔ تاہم بہت جلد الکندی کو ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ماہرین ریاضیات موسیٰ اور منجم ابو معشر جیسے مخالفین کی سازشوں کا شکار ہو گیا۔ علاوہ ازیں معتزلہ کے ساتھ اس کی ہمدردی نے بھی اس کے لیے مشکلات پیدا کر دیں کیونکہ المتوکل معتزلہ کے سخت خلاف تھا اور وہ انھیں چن چن کر قتل کروا رہا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں الکندی زیادہ تر گوشہ نشیں رہا۔

بعض ماہرین کتابیات نے الکندی کو ''اولین عربی فلسفی'' کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ اس نے ہجری علوم کی ترویج و اشاعت میں بھرپور کردار ادا کیا۔ مزید یہ کہ اس نے عربی کی فلسفیانہ اور بعض صورتوں میں سائنسی اصطلاحات کی حتمی تشکیل و توضیح میں اہم حصہ لیا۔ اس کے ذہنی ارتقاء کا ایک خاص پہلو قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ کیا وہ یونانی زبان جانتا تھا؟ قدیم سوانح نگار اور ماہرین کتابیات مثلاً ابن ابی اُصیبعہ اور ابن القفطی رقمطراز ہیں

کہ الکندی نے یونانی فلسفیانہ اور سائنسی کتب کے تراجم کی مہم میں بڑا فعال کردار ادا کیا۔ تاہم اس کی معاونت سے جن کتابوں کے تراجم شائع ہوئے ہیں، ان کے تنقیدی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا کردار مترجم سے کم درجے کا تھا۔ ارسطو کی بعض کتابوں کے تراجم، جو حنین ابن اسحاق، ابو بشر متا، قسطا ابن لوقا، یحییٰ ابن عدی وغیرہ نے کیے اور اسی طرح اقلیدس، بطلیموس اور Eutocius کی کتابوں کے تراجم کے ضمن میں الکندی نے یا تو پہلے سے ترجمہ شدہ عربی متن کی اصلاح کی یا اس پر تبصرہ کیا اور یا پھر اس کا خلاصہ تحریر کیا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ یونانی زبان سے اس حد تک آشنا نہیں تھا کہ وہ ازخود تراجم کرسکتا۔ البتہ وہ عربی میں تراجم کی اصلاح و ترمیم کا کام کرسکتا تھا۔ بالخصوص فلسفیانہ اصطلاحات کی تشکیل و تفہیم میں اسے مقابلتاً زیادہ دسترس حاصل تھی۔

الکندی کی تقریباً پندرہ فلسفیانہ تصانیف محفوظ ہیں۔ اگرچہ ان کا انداز بیان عام طور پر پیچیدہ ہے، لیکن اس کے باوصف انھیں موضوعات کے لحاظ سے تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

الکندی کی کتاب "Book of First Philosophy" کے محض چار ابواب دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گئے ہیں۔ اس کا آغاز فلسفے کے دفاع سے ہوتا ہے (خصوصاً اس فلسفے کے دفاع سے جو یونانیوں کے زیر اثر پروان چڑھا۔) بعد میں الکندی محسوسات اور معقولات کے اختلاف پر بحث کرتا ہے اور اس حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے کہ حصول علم کے طریقہ ہائے کار کیا ہیں۔ پھر ابدیت اور جسم سے متعلق سوالوں پر گفتگو کرتا ہے۔ آخری دو ابواب میں وحدت و کثرت کی جدلیات کو مکمل طور پر پیش کرتے ہوئے "الواحد الحق" یعنی ذات حقیقی کے اثبات تک اظہار خیال کرتا ہے۔ اس متن کے ساتھ رسالۂ صداقت، رسالۂ اول اور کامل ہستی کو شامل کیا جاسکتا ہے جس میں تخلیق، سلسلۂ علل، عناصر خمسہ یعنی مادہ، صورت، مکان، حرکت اور زمان جیسے مباحث درج ہیں۔

الکندی نے تین رسائل اس بات کو ثابت کرنے کے لیے لکھے کہ عالم نہ صرف یہ کہ مکاں میں بلکہ زماں میں بھی محدود ہے۔ (اس نکتے پر اس نے یونانی فلسفیوں سے برملا اختلاف کا اظہار کیا ہے)۔ یہ رسائل درج ذیل ہیں:

(۱) کتاب رسالہ فی تناہی جرم العالم
(۲) کتاب رسالہ فی انہ لایمکن ان یکون جرم العالم بلانہایۃ
(۳) کتاب الفلسفۃ الاولی فیما دون الطبیعیات والتوحید

الکندی کی دو تحریریں کائنات کو اس کی ساخت اور تعلیل کی نمایاں مشمولہ اقسام کے لحاظ سے بیان کرتی ہیں۔ مندرجہ ذیل پانچ رسالے روح اور عقل کے بارے میں لکھے گئے:

(۱) کتاب رسالۃ فی ان النفس جوہر بسیط غیر دائر مؤثر فی الاجسام
(۲) کتاب رسالۃ ماہیۃ الانسان والعضو الرئیس منہ

(۳) کتاب رسالۃ فی خبر اجتماع الفلاسفۃ علی الرموز العشقیہ

(۴) کتاب رسالۃ فی ماللنفس ذکرہ وہی فی عالم العقل قبل کونہا فی العالم الحس

(۵) کتاب رسالۃ فی علت النوم والرؤیا وما یرمزبہ النفس

روح پر جو رسالہ افلاطون، ارسطو اور دیگر فلاسفہ سے متاثر ہو کر لکھا گیا وہ نہایت فلسفیانہ اور متصوفانہ پیرائے میں روح اور بدن کے تعلقات اور ان کی تقدیر کی وضاحت کرتا ہے۔ روح سے متعلق رسالہ روح کائنات کے بارے میں مختصر مگر مؤثر بحث پیش کرتا ہے۔اور خواب سے متعلق لکھا گیا رسالہ ان ہر دو مظاہر کی نفسیات اور عضویات بیان کرتا ہے۔ عقل پر رسالہ ارسطو کی عقلیات کی نوفلاطونی تشریح پر مبنی ہے۔ اداسی دور کرنے کے طریقے پر رسالہ اس بات کی سفارش کرتا ہے کہ مریض کو محض عالم عقل سے رابطہ استوار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس میں الکندی نے اس نظریے کا اظہار کیا ہے کہ اداسی کو عقلی جدلیات اور ایسے کردار کی معرفت دور کیا جا سکتا ہے جس میں توکل، تدبر اور اداسی کے حالات سے بچنے کی سبیل موجود ہو۔ یہ ایک ایسی نصیحت ہے جو قدیم علمائے اخلاق کے تتبع کے عین مطابق ہے۔

اس رسالے کے علاوہ تقریباً ایک سو آراء اور اخلاق سے متعلق مقولے ابو سلیمان السجتانی کی ''منتخب صوان الحکمۃ'' میں الکندی سے منسوب کیے گئے ہیں۔ ارسطو کی کتب کی تعداد پر رسالہ، اور ''تحصیل فلسفہ کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے؟'' پر کتاب بنیادی طور پر ارسطو کی تحریروں کی فہرست، انداز مطالعہ اور آیات قرآنی کی تفسیر پر مشتمل ہیں۔ اشیاء کی تعریف اور توضیح پر رسالہ دقیق مسائل پیش کرتا ہے کیونکہ اس میں تقریباً ایک سو ایسی تعریفیں ہیں جو الکندی کے باقی معروف رسائل سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

مذکورہ بالا کتب ماہرین کتابیات کی بیان کردہ فہرست کے محض ایک حصے پر مبنی ہیں۔ چنانچہ الکندی کے فکر کی مکمل اور متوازن تصویر پیش نہیں کی جا سکتی۔ نیز اس کی تحریریں، جو بہت زیادہ طویل نہیں ہیں، ان مفصل دلائل پر مشتمل ہیں جن میں لاتعداد تصورات سے کام لیا گیا ہے۔ لہٰذا ان سب کی تلخیص ناممکن ہے۔ تاہم معروف تصانیف کے چیدہ چیدہ موضوعات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ (معروف مسلم سائنسدان: ص ۱۱۹)

حکیم محمود احمد ظفرؒ کی دیگر کتب

تاریخ اسلام

دولت سفیانیہ

دولت مروانیہ

پیغمبر اسلام اور غزوات وسرایا

پیغمبر اسلام اور خلقِ عظیم

تاریخ پاکستان